مطالب القرآن

فی

دروس الفرقان

سورۃ الحج

علامہ غلام احمد پرویزؒ کے دیے گئے دروسِ قرآن

قرآنِ مجید کی تفسیر خود قرآنِ مجید سے

مدیر: پروفیسر ڈاکٹر منظور الحق

ادارہ طلوعِ اسلام رجسٹرڈ 25 بی گلبرگ 2 لاہور

مطالب القرآن

فی

دروس الفرقان

— سورۃ الحج —

علامہ غلام احمد پرویزؒ کے دیے گئے دروسِ قرآن

قرآنِ مجید کی تفسیر خود قرآنِ مجید سے

مدیر: پروفیسر ڈاکٹر منظور الحق

ادارہ طلوعِ اسلام رجسٹرڈ 25 بی گلبرگ 2 لاہور

جملہ حقوق محفوظ ہیں

نام کتاب	....	مطالب القرآن فی دروس الفرقان
دروس	....	از: جناب غلام احمد پرویز رحمۃ اللہ علیہ
ناشر	....	بزمِ طلوع اسلام، لاہور
زیر اہتمام	....	ادارہ طلوع اسلام 25بی 2 گلبرگ، لاہور
	....	فون نمبر 5714546-5753666
ایڈیشن اول	....	جنوری 2006ء
مطبع	....	باقر پرنٹنگ پریس، لاہور

ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ کی طرف سے شائع کردہ لٹریچر کی جملہ آمدنی قرآنی فکر کو عام کرنے پر صرف ہوتی ہے۔

سرٹیفیکیٹ تصحیح

انتساب

رسالت مآب خاتم النبیین ﷺ کے نام

جو کافۃ للناس اور رحمۃ للعالمین بن کر آیا اور اپنے ساتھ وہ نظام عدل و حریت لایا جو انسان کو دنیا بھر کی غلامی سے آزادی دلانے کا کفیل تھا۔ یہ پیغام کوئی انوکھا پیغام اور یہ تعلیم کوئی نئی تعلیم نہ تھی۔ صداقت جہاں کہیں بھی تھی اُسی کتاب مبین کا کوئی نہ کوئی ورق تھی جو محمد ﷺ کی وساطت سے دنیا کو ملی۔ روشنی جس مقام میں بھی تھی وہ اسی قندیلِ آسمانی کی کوئی نہ کوئی کرن تھی جو قلبِ نبوی ﷺ میں اتاری گئی۔ شامِ جاں نواز نے جہاں کہیں بھی عطر بیزی و عنبر فشانی کی وہ لالہ و یاسمین کی ان ہی پتیوں کی رہینِ منت تھی جن کا گلدستہ اس نبی آخر الزمان ﷺ کے مقدس ہاتھوں محرابِ کعبہ میں رکھا گیا۔ پیغامِ محمدی ﷺ کیا ہے؟ ان ہی اوراق کی شیرازہ بندی جنہیں حوادثِ ارضی و سماوی کی تیز آندھیوں نے صحنِ کائنات میں اِدھر اُدھر بکھیر دیا تھا۔ اور مقامِ محمدی ﷺ کیا ہے؟ ان ہی درخشندہ و تابندہ ذراتِ نادرہ کا پیکرِ حُسن و زیبائی جن کی حقیقی آب و تاب کو ان کے ستائش گروں کی غلو آمیز عقیدت کی رنگینیوں نے مستور کر رکھا تھا۔ وہاں یہ جو ہر الگ الگ پڑے تھے' یہاں یہ پیکرِ جلال و جمال ان سب کا حسین مجموعہ تھا۔ وہاں یہ الفاظ بکھرے ہوئے تھے' یہاں ایک ایسے عدیم النظیر مصرعہ میں آب و تاب سے موزوں ہوگئے تھے جو ضمیرِ کائنات میں قرنہا قرن سے پہلو بدل رہا تھا۔ وہ موتی تھے' یہ مالا تھی۔ وہ پتیاں تھیں' یہ پھول تھا۔ وہ ذرے تھے' یہ چٹان تھی۔ وہ قطرے تھے' یہ سمندر تھا۔ وہ ستارے تھے' یہ کہکشاں تھی۔ وہ افراد تھے' یہ ملت تھی۔ وہ نقطے تھے' یہ خطِ مستقیم تھا۔ وہ ابتداء تھی' یہ انتہا تھا۔

خلق و تقدیر و ہدایت ابتداست
رحمۃ للعالمینیؐ انتہا ست

خدائے جلیل نے اپنے بندوں سے جو کچھ کہنا تھا آخری مرتبہ کہہ دیا۔ شرفِ انسانیت کی تکمیل کے لیے جو قوانین دیئے جانے تھے وہ اپنی انتہائی شکل میں دیدیئے گئے۔ اس کے بعد انسان کو اپنی منزلِ مقصود تک پہنچنے کے لیے کسی دوسری مشعلِ راہ کی ضرورت اور کسی اور ہادئ طریقت کی احتیاج نہ رہی۔ اب انسانیت کے مقام بلند تک پہنچنے کے لیے وہی ایک صراطِ مستقیم ہے جس پر اس ذاتِ اقدس و اعظم ﷺ کے نقوشِ قدم جگمگ جگمگ کر رہے ہیں اور جنہیں دیکھ کر ہر دیدہ ور پکار اٹھتا ہے کہ

مقامِ خویش اگر خواہی دریں دیر
بحق' دل بند و راہ مصطفےؐ رو

[معراجِ انسانیت ص ۷۴ از۔ علامہ پرویز رحمۃ اللہ علیہ]

اسوۂ حسنہ

ہمارا ایمان ہے کہ جو شخص رسول اللہ ﷺ کے کسی ارشاد یا حضور ﷺ کے کسی عمل کی صداقت سے اِنکار کرتا ہے، ہمارے نزدیک وہ مسلمان ہی نہیں کہلا سکتا، اِس لیے کہ حضور ﷺ کے ارشادات و اعمالِ حیات سے تو وہ ماڈل ترتیب پاتا ہے جسے خدا نے ''اسوۂ حسنہ'' قرار دیا ہے۔ اِس اسوۂ حسنہ سے انکار، نہ صرف انکارِ رسالت ہے، بلکہ ارشادِ خداوندی سے انکار ہے۔اس انکار کے بعد، کوئی شخص مسلمان کیسے رہ سکتا ہے؟ اِسی بنا پر اللہ تعالیٰ نے اس اسوۂ حسنہ کو خود قرآن میں محفوظ کر دیا ہے۔

[طلوع اسلام۔اگست ۱۹۸۱ء]

قیصر و کسریٰ کے استبداد اور احبار و رھبان کی زنجیروں میں جکڑی ہوئی انسانیت کو آزادی سے ہم کنار کرنے والے قائدِ انسانیت ﷺ تجھ پہ لاکھوں سلام

خلق و تقدیر و ہدایت ابتدا ست

رحمۃ للعالمینی انتہا ست

[محمد اشرف ظفر]

بسم اللہ الرحمن الرحیم

فہرست مشمولات سورۃ الحج

مطالب القرآن فی دروس الفرقان

پیش لفظ

پہلا باب: سورۃ الحج (آیات 1 تا 10)

انبیائے کرام علیہم السلام کی بعثت کا مقصد معاشرے کی تشکیلِ نو کرنا ہوتا ہے 19
معاشرے کو از سرِ نو تشکیل کرنے کا طریقِ کار 20
آج کے دَور میں صرف رائے کو بدلا جاتا ہے، دلوں کو نہیں 21
تغیرِ نفس دل کی گواہی کا دوسرا نام ہے 21
ابلیس کا حربہ 22
عربی زبان میں اطاعت کا مفہوم ''بطیبِ خاطر'' ہوتا ہے 22
مخالفت کا سدِ باب خارجی انقلاب کے ذریعے ہوتا ہے 23
الساعۃ کا قرآنی مفہوم 23
مذہب اور دین میں فرق 24
قرآنِ حکیم اپنی موجودہ ترتیب میں ہی قرآن ہے 25
تقویٰ کا قرآنی مفہوم 26
زلزلۃ الساعۃ اور پہاڑ سے مراد 26
اس انقلاب (الساعۃ) کی کیا کیفیت ہوگی؟ 27
عربی کی جامعیت کے بعد پنجابی زبان بھی جامع زبان ہے 28
راہِ حیات میں لغزشیں اور لڑکھڑاہٹیں قدم قدم پر رکاوٹ کا باعث بنتی ہیں 29
شکست کا ذلت آمیز انجام: رونے کی بھی اجازت نہ تھی! 29
صداقت کا معیار دلیل و برہان پر ہوتا ہے 30
جھگڑے کی بنیادی وجہ سرکش جذبات اور مفاد پرستی ہوتی ہے 31
انسان کی مفاد پرستانہ خواہشوں کا نتیجہ ہمیشہ مایوسی ہوتا ہے 32
لفظ بعث کا قرآنی مفہوم 33
مکافاتِ عمل کا مفہوم 33
انسان کا ارادہ بذاتِ خود ایک عمل ہے 34
قرآنِ حکیم کا اندازِ بیان: ایک بدو کے لیے بھی ہے اور بڑے سے بڑے سائنسدان کے لیے بھی 36
رحمِ مادر میں ایک جرثومہ سے لے کر انسان کی پرورش تک کے مراحل 37
ایک غیر مرئی چیز کا لباسِ مجاز میں نمودار ہونا 38
ماں باپ کی اطاعت فرض نہیں، ان کے ساتھ حسنِ سلوک کا حکم ہے 39
پانی کے چند چھینٹے مردہ زمین کو حیات تازہ عطا کر دیتے ہیں 39
اقدارِ سماوی مردہ قوموں کو حیاتِ نو عطا کر دیتی ہیں 40
وحی کسی انسان کے اندر سے باہر نہیں آتی بلکہ یہ اوپر سے نازل ہوتی ہے 41
الحق کا نظام ثبات اور تغیر کے امتزاج سے ہی مربوط ہوتا ہے 41
الحق ہمیشہ محسوس نتائج پیدا کرتا ہے 42
زندگی مختلف پیکر بدلتی ہوئی ہر آن نئی نئی منازل طے کرتی رہتی ہے 43
زندگی مکافاتِ عمل کے ساتھ مشروط ہے 43

بغیر کسی راہنمائی کے جھگڑتے چلے جانا 'خزی' ہے 44
جب مادی تصورِ حیات شرِ مستطیر ہو جائے تو پھر معاشرے
کا تصورِ حیات بدل جاتا ہے 45
ظہورِ نتائج کے وقت قسمت کا لکھا لے کے نہ بیٹھ جانا 45
یہ تباہی و بربادی تو جوانی میں سنکھیا کھانے کا نتیجہ ہے 46
آخرت پر ایمان کے معنی 46

دوسرا باب: سورۃ الحج (آیات 11 تا 21)

حق کو ''اکراہ'' اور قوت کے زور پر نہیں منوایا جا سکتا 48
مخالفت کی انتہا کا علاج میدان جنگ میں اُترنا ہے 49
میدانِ بدر میں نبی اکرم ﷺ کے دل سے نکلنے والی ایک انمول دعا 50
جسدِ انسانی کا مہلک ناسور: تیسرے درجے کے منافقین کی جماعت 51
منافقین کے سلسلہ میں مذہبی پیشوائیت کا کردار' قرآن کے آئینہ میں 52
قرآن کی نظر میں مومن کی تعریف 53
عملی طور پر منافقین کی حالت 54
قرآنی معاشرے میں منافقت بتدریج کم ہوتی چلی جاتی ہے 55
ایک نفع کا دوسرے نفع کے ساتھ موازنہ 56
شرفِ انسانیت کو مادیت کے ترازو میں نہیں تولا جاتا 56
حیوان میں شعورِ ذات (عزتِ نفس کا احساس) نہیں ہوتا 57
اقبالؒ کے نزدیک رازِ قلندری کا مفہوم 58
عزتِ نفس کے بعد دین و دانش کی نیلامی 59
بدن کے بدلے جان کا سودا 59
فائدے کا حصول مگر بڑے نقصان کے ساتھ 60
بلندی (مقامِ انسانیت) سے پستی (مقامِ حیوانیت)
پہ گرنا چنداں مشکل نہیں 60
قرآنی تعلیم سے دُوری کی بنیادی وجہ ہمارے مروجہ تراجم ہیں 62
چوری کا مال بھینس پر کبھی اثرات نہیں ڈالتا 63
معاشرتی زندگی میں اقدارِ خداوندی کے اثرات اور تاریخ کا پیمانہ 63
غلط اور صحیح تراجم میں بین فرق 64
مناظروں کی سوچ کوئی تعمیری نتیجہ پیدا نہیں کرتی 66
ہم نے نتیجہ قیامت پر اٹھا رکھا ہے 67
تنہا عقل کے زور پر معاشرتی زندگی گزارنے کا نتیجہ 68
مذہب کی سطح پر سچائی کا ثبوت مل ہی نہیں سکتا 69
ہمارے ہاں کے غلط تراجم کی پیدا کردہ الجھنیں قرآن فہمی میں حائل ہیں 70
قرآنی قوانین میں انسانی رفعت اور عزت کا راز مضمر ہے 71
صحیح قانون کے ساتھ صحیح انسانی قوتوں کے ملاپ کا ثمر 72
عزت کیسے حاصل ہوتی ہے؟ 73
ہم کسی کو ذلیل نہیں کرتے: خدا کا فرمان 74
یتیم کا قرآنی مفہوم 74
مغربی جمہوریت کا ماحصل: عزت اس کی جو جتھے میں بڑا ہے 75
انسانوں نے اپنے ہاں عزت اور ذلت کا معیار بدل دیا ہے 75
دوسروں کی ضرورت' نشیب کا گڑھا' بارش اور انسانی ہوس:
ایک معاشی نشیب 77
جو ہر ذاتی وجہ تکریم ہے: اصول کی حیثیت اور اہمیت 78
انسانی معاشرے کی حالت' نبوت کا فریضہ اور اس کا مقامِ بلند 79
قوانینِ خداوندی کی صداقتوں کا انکار استبدادی سروں کو جھکا دے گا 81
ضابطہ قوانین کی ضرورت' اس کی اہمیت کا احترام اور صداقت 82
قانون شکنی کا علاج شمشیرِ خارہ شگاف (فولاد) ہے 82

تیسرا باب: سورۃ الحج (آیات 22 تا 29)

جہنم کی اصطلاح کی مختلف شکلیں اور نوعیتیں 84
قرآن حکیم کے نزدیک سزا کے تصور کی حقیقت 85
قانونِ ارتقاء اور قرآن 85
یورپ کے عام سائنسدانوں کی سوچ اور قرآنی تعلیم
میں ایک بنیادی فرق 86
جنت کے متعلق قرآن کا تصور 86
ایک مقام پر رک جانے کی وجہ سے ختم نہ ہونے والا احساس 87
لوہے کو چیر کر جانے والی شدتِ احساس کی کیفیت 87
جنت کا بیان تمثیلی انداز لیے ہوئے ہے اس کی کنہ و ماہیت
ہمارے تخیل سے باہر ہے 88
عربوں کی سرزمین اور سوچ کے مطابق جنت کی نعما کا تذکرہ 89
کشمیر میں حضرت بل کے اندر مولوی صاحب کا وعظ 90
عربوں کے ہاں پانی کی قدر و قیمت 91
ایرانی تہذیب اور جنت کا تمثیلی ذکر 92
ایران کے شہنشاہ انگریزوں کی طرح بنیوں کی قوم نہ تھی 94
ہمارے دَور کی میکاوَلی سیاست اور صراطِ الحمید میں فرق 94
حج کا مقصد اور حق و باطل کا تقابلی نظام 96
ملوکیت کی تعریف ہی یہ ہے کہ انسانوں کی انسانوں پر حکومت ہو 96
سیکولرازم سے زیادہ بدتر مذہبی پیشوائیت کی حکومت سیکولرازم
سے زیادہ بدتر ہوتی ہے 97
قریش کا معاشی اور معاشرتی مقام 97
مذہبی پیشوائیت کا تقدس 98
مذہبی پیشوائیت بھی سرمایہ داری کی ہی ایک قسم ہے 99
مملکت کا دار الخلافہ صرف شہر کا نام نہیں ہوتا بلکہ اس قوم کا
نظریاتی سمبل (علامت) ہوتا ہے 99
اگر مجاوروں سے درگاہیں چھین لی جائیں تو وہ یتیم ہو جائیں 100
حج اور عمرے کا بنیادی مقصدِ عظیم 100
سبیل اللہ بڑی ہی جامع اصطلاح ہے 100
سجدے کے معنی ہی نظامِ خداوندی کے سامنے سر جھکا دینا ہے 101
مسجدِ حرام پر کسی کی اجارہ داری نہیں ہو سکتی، یہ الناس
(نوعِ انسان) کے لیے وجہِ منفعت ہے 102
حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ہاتھوں کعبہ کی تعمیر کا مقصد 103
قرآنی حقائق سے دُوری مذہب کی بنیاد پر ہمارے ہاں
کے مروجہ تراجم ہیں 104
ہماری غلط نگہی کا نتیجہ اور کعبہ کے مرکزِ محسوس نظام کی خصوصیت 104
خداوندی نظامِ عدل و احسان کو قائم کرنے والوں کی
خصوصیت اور ان کے تدریجی مراحل 105
حضرت ابراہیم علیہ السلام کے تعمیرِ کعبہ کے حکم کا مقصد و مدعا 106
حج کے سلسلہ میں عالمِ انسانی کے لیے جائے امن کا اعلان 106
نوعِ انسانی کی بھلائی کے لیے آل ورلڈ مسلم کانفرنس کا اعلان 107
تعمیرِ کعبہ کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام کی پہلی دُعاء 108
حیوان سے بھی بدتر زندگی 109
روٹی کا حصول بھی مقصود بالذات نہیں 110
روٹی کا مسئلہ مویشیوں کے ذریعے حل کرو 110
جانور کو ذبح کرتے وقت اللہ اکبر کہنے کا مقصد 111
قرآنِ حکیم میں جانوروں کے لیے قربانی کا لفظ نہیں آیا 111
عاکف کا قرآنی مفہوم 112

چوتھا باب: سورۃ الحج (آیات 30 تا 39)

حج ایک عالمگیر کانفرنس کا نام ہے 114
قرآن میں قربانی کا لفظ قربانی کے جانوروں کے لیے آیا ہی نہیں 115
دین قدم قدم پر نتائج کو سامنے رکھتا ہے 115
مذہب میں جمود ہوتا ہے دین سراپا حرکت کا نام ہے 116
جسمانی حرکات وسکنات کا انسانی نفسیات سے گہرا تعلق ہے 116
حج کی تمام حرمات اور شعائر اللہ ایک بلند مقصد کے حصول کا ذریعہ ہیں 118
غیر اللہ کے نام پر منسوب کردہ نیاز کو قرآن بہ نصِ صریح
حرام قرار دیتا ہے 119
اوثان کا مفہوم اور ہمارے تراجم: ایک گمبھیر التباس 120
دین جب مردہ ہو جائے تو مذہب بن جاتا ہے 120
نصب العین سے دُور لے جانے والی حرکت سے بھی بچو
اور جمود سے بھی 121
ذاتِ خداوندی ہر چیز سے مستغنی ہے 122
تو جھکا جب غیر کے آگے، نہ تن تیرا، نہ من 123
مقامِ انسانیت سے گرے ہوئے انسان کی حالت 124
شرک انسان کو مقامِ انسانیت سے گرا دیتا ہے 124
نظامِ خداوندی کا مقصد انسانوں کے لیے دلوں کی
نرمی کے ساتھ سامانِ زیست کو عام کرنا ہے 126
اونٹ وغیرہ چڑھاوے کے نہیں بلکہ بلند مقصد کے حصول کا ذریعہ ہیں 127
دو دیوتاؤں کے باہمی معاملہ میں بےنطق وبے ہاتھ مجبور کی بےبسی 128
پوری کائنات زیرِ تسخیر لیکن کس مقصد کے لیے؟ 128
کروڑہا کروڑ مسلمان اور ان کے درمیان اتنا سا اسرائیل:
آخر غلطی کہاں ہے؟ 129
آخر حفاظت کے سلسلہ میں خدا کا یہ فرمان کیوں پورا نہیں ہوتا؟ 130

پانچواں باب: سورۃ الحج (آیات 39 تا 41)

اپنے تمام اعمال کو نتائج کے ترازو میں تولنا ہوگا 132
حقائق اور صداقتوں کو تسلیم نہ کرنے والے تباہ ہو جائیں گے 133
ہمارا مروّجہ حج اور اس کا نتیجہ 133
منشائے خداوندی کے مطابق حج کا نتیجہ کیوں نہیں نکل رہا؟ 134
مذہب انسان کو ہمیشہ فریب دیتا ہے 134
سر پھٹول ہر مذہب کا لازمی نتیجہ ہے 135
حج کسی یاترا کا نام نہیں تھا 135
نبی اکرم ﷺ کی روزِ قیامت شکایت: میری قوم نے قرآن کو چھوڑ دیا 135
رسولِ خدا ﷺ کی ایک ہی آواز: سوچا کرو 136
قرآنِ حکیم کی عظمت 137
حج کے موقع پر، اپنے تحفظ کے لیے، میدانِ جنگ کے لیے،
صف بندی کرنا ہوگی 137
بڑی بےباکی سے کہہ دیا جاتا ہے کہ قرآن میں ربط ہی نہیں 138
اسلام شمشیر سے نہیں، دل ودماغ کے اطمینانِ کامل سے
ایمان لانے کا عمل ہے 139
جنگ کی اجازت مظلوم ہونے کی شرط سے مشروط ہے 139
ہماری تاریخ کے افسانے 139
مودودی مرحوم کی خلافِ حقیقت تقریر 140
انسانی دنیا میں خدا کی ذمہ داری انسانوں کے ہاتھوں پوری ہوتی ہے 141
مدد اسی کی جو خدا کی مدد کرے گا 141
خدا کیسے مدد کرتا ہے؟ 142
میدانِ جنگ میں زندہ جاوید ہو جانے پر ایمانِ محکم 143

ایمانِ محکم کے ساتھ اپنی سرحدوں کو بھی پوری طرح مضبوط کرو 144
قرآن ہر انسان کو پرستش کی اور عقیدے کی ضمانت دیتا ہے 144
مظلوم کی نصرت خدا پر فرض ہو جاتی ہے 145
خدا کے زیرِ سایہ ہر مذہب کی عبادت گاہوں اور
پرستش گاہوں کی حفاظت 146
دینِ اسلام میں لوگوں کو اپنے اپنے عقیدے کی پوری پوری
آزادی حاصل ہوتی ہے 146
دوسروں کے حقوق قرآن نے قدم قدم پر واضح کر رکھے ہیں 147
مذہبی پیشوائیت کی طرف سے اسلامی مملکت کی تعریف 148
انڈیا میں سارداایکٹ کی مخالفت کیوں؟ 148
مسلمانوں کی تاریخ کا المیہ: تمام فرقوں کے علما کا غیر قرآنی متفقہ مطالبہ 149
مطالبہ پاکستان کی بنیادی شرط 150
مذہب کے نزدیک قرآن کی بیان کردہ چار اصطلاحوں کا ماحصل 151
ہمارا سارا وقت ان اصطلاحات کو سمجھانے میں ہی صرف ہو گیا 152
ابوالکلام آزاد کی غلط فہمی پر قرآنی دلیل 154
قرآن کریم کے نزدیک معروف حکم دینا ہے' وعظ کہنا نہیں ہے 155
باہمی مشورے کے بعد آخری فیصلہ خدا کی کتاب کے مطابق ہوگا 155
قرآنی معاشرہ کی صفات 156
مسلمان کی بات پر جھوٹ حیرت کی بات تھی 156
ایک عظیم رہنمائی: اے رسول ﷺ! ملکی معاملات میں صحابہ رضی اللہ عنہم
سے مشورہ کیا کرو 157
رسولِ خدا بھی اپنی رائے دوسروں پر زبردستی مسلط نہیں کرتے 158
مفتوحہ زمینوں کے متعلق حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا فیصلہ 159

چھٹا باب: سورۃ الحج (آیات 42 تا 51)

ایک اصولی چیز کا بیان 160
حق و باطل کی کشمکش ملک گیری کے لیے نہیں ہوتی 161
کسی کے دعویٰ کا ثبوت اس کی سابقہ زندگی کا عمل ہوتا ہے 163
منصب حاصل کرنے کے بعد محتاط رہنا مِنْ قَبْلِهٖ والی بات نہیں ہوتی 164
دعا کا قرآنی مفہوم 165
قرآن یعنی کلام اللہ میں ہر بات کا جواب موجود ہے 165
تنذیر کے سلسلہ میں آپ ﷺ کی مخالفت تو تھی' لیکن آپ ﷺ
کے کیریکٹر پر کوئی حرف گیری نہ تھی 166
تقسیم کے بعد ہندوؤں کی چھوڑی ہوئی دولت کی
لوٹ مار کا کیریکٹر پر اثر 167
لوٹ مار سے محنت کی عادت ختم ہو جاتی ہے اور پھر انسانی
صلاحیتیں زنگ آلود ہو جاتی ہیں 167
غور و فکر کی مختلف راہیں 168
قرآن کے نزدیک بستیوں سے مراد قومیں ہوتی ہیں 169
قرآنی موضوعات کو تبویب کی شکل میں پیش کرنے کی خوشخبری 170
اقوامِ گزشتہ کی داستانیں باعثِ عبرت ہیں 172
آرکیالوجی کا علم اور حقائق 172
چودہ سو سال پیشتر علم کے ایک عظیم شعبہ کی طرف توجہ 173
آخر آرکیالوجی کے علم سے ہوگا کیا؟ 174
سِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ کا مفہوم 174
سِیْرُوْا کے سلسلہ میں اہلِ تصوف کا عمل 174
یہ وحی کا کرشمہ ہے 176
خدا کا قانون اٹل ہے 177

قدرت کے دنوں کا حساب وشمار 177
قوموں کی تاریخ صدیوں میں مرتب ہوتی ہے 178
قوموں کی موت وحیات کے متعلق ایک اہم سوال 178
ہمارے کیے گئے شرعی فیصلوں کے تحت جنت میں
موتیوں کے گھر کا حصول 179
اشتہاری مجرم کی اندرونی مجبوری ومقہوری 179
پوری نوعِ انسانی کے لیے ایک تاکید لازم 180
دین اور مذہب میں فرق اور مذہبی پیشوائیت کی حالتِ زار 180
بغیر کسی معاوضہ کے راہنمائی کرنا نبیوں کی سنت ہے 181
قرآن انسان کو اس دنیا میں رہنا سکھاتا ہے 182
مغفرت کے معنی حفاظت کے ہوتے ہیں بخشش کے نہیں 182
رزق کا قرآنی مفہوم 183
اسلامی مملکت کے محسوس نشانات 183
اسلامی نظام کی کسوٹی نتائج ہوتے ہیں 184
عزت کی روٹی اور ذلت کی روٹی میں فرق 185

ساتواں باب: سورۃ الحج (آیات 52: اختلافِ قرأت)

زیر درس آیہ کریمہ کی اہمیت 187
پیاس کو ختم کرنے کے لیے پانی کا حصول ضروری ہے 187
اس آیت کا مروجہ مفہوم اور اس کا ماحصل 188
کوئی رسول یا کوئی نبی بغیر شریعت کے نہیں آتا تھا 189
اپنے بندوں کے متعلق خدا کا ابلیس کو چیلنج اور پھر خود شیطان کا اعتراف 190
کوئی نبی شیطان سے مغلوب نہیں ہوسکتا 190
حق کا باطل کے ساتھ مفاہمت چہ معنی دارد؟ 191
یہ تعلیم میری تعلیم نہیں یہ تصنیف میری تصنیف نہیں: خدا کی ہے 192
سیرت کی بلندی اصول پرستی پر مبنی ہوتی ہے 193
افسانوں کی عمارت اور ہمارے ہاں کی تفاسیر 193
روایات کی بناء پر نبی اکرم ﷺ کی طرف سے دیوی دیوتاؤں
سے شفاعت کی خواہش 194
مخالفین کی طرف سے جشنِ مسرت 194
ان چیزوں کو بیان کرنے کا میرا مقصد 195
اس آیت کا اصل مفہوم 196
آیات کی منسوخی کے متعلق ہمارا عقیدہ 197
پانچ سو آیات منسوخ کرنے کا فیصلہ علمائے کرام نے کیا 197
قرآنِ حکیم کے متعلق مختلف تصورات 198
وصیت کے متعلق روایات نے قرآنی آیات کو منسوخ کر دیا ہوا ہے 199
وحی کی دو قسموں کا عقیدہ یہودیوں کا عقیدہ تھا 199
چھ لاکھ حدیثوں میں سے 3 ہزار باقی رکھیں: کیوں؟ 200
احادیث قرآن کو منسوخ کرسکتی ہیں 202
یہ اگر قرآن جمع نہیں ہوا تھا تو پھر کونسا قرآن حفظ کیا گیا 202
قرآن کی ترتیب میں خدا کے ہاتھ کا سوال 203
سنیوں کی روایات کے مطابق صحائف میں تضاد تھا 205
قرآن کا ایک ایک حرف اپنی جگہ پہاڑ کی طرح محکم ہے 206
خدا تعالیٰ کا فرمان ایک طرف لیکن قرآت کا اختلاف دوسری طرف 206
الکافی کا بیان: آیات میں اختلاف 207
قرأتوں کی کتاب 209
ان اختلافات کی نوعیت 210
متضاد شکل میں آیات کا نزول بخاری کی روایات کے تحت
رسولِ خدا ﷺ کی گواہی 211

بخاری شریف کے مطابق قرآن سات زبانوں میں نازل ہوا تھا 211
شیعہ اور سنی حضرات کے مابین متعہ کا مسئلہ 212
قرأت سے مراد قرآن کا لہجہ نہیں بلکہ عبارت کا اختلاف ہے 213
قرأت کے متعلق مودودی رحمہ اللہ کا فرمان 214
حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے چھ زبانوں والے قرآن جلوا دیئے: کیوں؟ 215
نبوتِ باطلہ کا دعویٰ اور مطالبہ 216
حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہ کی قرأت کی بنیاد پر مرزا صاحب کا پہلا دعویٰ 216
ختم نبوت کے سلسلہ میں مقدمہ بہاولپور کا فیصلہ 217

آٹھواں باب: سورۂ الحج (آیات 52 تا 53)

خدا کے دین کا دارومدار قرآنی آیات کے صحیح مفہوم پر موقوف ہے 219
ابلیس ہو یا شیطان، وہ خدا کے مخلص بندوں پر اثر انداز ہو ہی نہیں سکتا 220
ملاوٹ کرنے والے یہ شیاطین کون تھے؟ 220
ملت اسلامیہ کے ساتھ پہلی سازش: قرآن تو محفوظ رہا
لیکن پانچ سو قرآنی آیات کو منسوخ کر دیا گیا 221
دوسری سازش: کچھ آیات قرآن میں شامل تو نہ ہوئیں
لیکن حکم انہی کا چلتا رہا 222
تیسری سازش: قرآن کریم کی مختلف قرأتوں کا عقیدہ وضع ہوا 222
چوتھی سازش: ہماری فقہ کا سارا مدار ان قرأتوں پر ہے 223
پانچویں سازش: سات زبانوں میں قرآن نازل کیا 224
تمام کے تمام محدثین ایرانی تھے: آخر کیوں؟ 225
المؤطا کو صحاح ستہ میں شامل ہی نہیں کیا گیا: کیوں؟ 226
چھٹی سازش: حدیثوں کے مجموعوں کو قرآن کے مثل قرار دیا گیا 226
کراچی سے علامہ عبدالوہاب کے فتوے کی وجہ: روایات بھی وحی ہیں 228
گوجرانوالا سے مولانا اسماعیل مرحوم کا فتویٰ:
حدیث کا انکار وحی قرآن کا انکار ہے 229
نبی اور رسول کسے کہتے ہیں؟ یہ ہوتا کیا ہے؟ 229
شیعہ حضرات کی چار کتابیں 230
الکافی میں امام کی Definition (تعریف) اور اس کے مضمرات 231
ساتویں سازش: سو سال کے بعد مجدد کا عقیدہ، امام مہدی کا عقیدہ 231
آٹھویں سازش: سنیوں کے تصورِ حیات میں وحی کی جگہ
کشف اور الہام کا عقیدہ 232
شیخ اکبر محی الدین ابن عربی کا دعویٰ:
ہمارا اور رسول اللہ کا مقامِ علم ایک ہی ہے 233
دین کے معاملے میں مختلف مجددوں کا کردار کیا رہا؟ ایک لمحۂ فکریہ 236
دین کو پروفیشن بنانے والے ظالم ہیں 238
صرف نیک نیتی حق وصداقت کا ثبوت نہیں ہوتی 238
عدو کا قرآنی مفہوم 239
قرآن کی ایک ایک آیت اپنی اپنی جگہ کوہِ گراں ہے 240
ختمِ نبوت شخصیت پرستی کا خاتمہ کر دیتی ہے 240

نواں باب: سورۂ الحج (آیات 54 تا 56)

دین کی بنیادی اساس 243
پہلی ہی کتاب کو کیوں نہ محفوظ رکھا گیا؟ 243
قرآن روایات کے تابع آ گیا 244
آج آیات اللہ کو محکم کرنے کا فریضہ امت کے سپرد ہے 245
آیات کو محکم کر دینے کی عملی شکل کیا ہوگی؟ 246
صرف فکری طور پر قرآن کو سمجھ لینا کافی نہیں 247
خدا انسان کو راہنمائی تو دیتا ہے، راستے پر نہیں چلاتا 247
تباہی ہمیشہ مختلف طریق سے بتدریج آتی ہے 248

قوم آہستہ آہستہ حالتِ عقیم میں پہنچ جاتی ہے 250
سابقہ دو' تین دروس کا نقطہ ماسکہ 250
آیات اللہ کیسے محکم ہوتی ہیں؟ 250
یوم الدین کا مفہوم 252
دینِ خداوندی انسان کو فریبِ نفس میں مبتلا نہیں کرتا 253
خدا کے فیصلے سے مراد خدا کی کتاب کا فیصلہ ہے 254
ہر نبی آیاتِ خداوندی کو محکم کرتا تھا 254
قرآن کے نزدیک شرک کا مفہوم 256
قرآن کے سلسلہ میں حضور ﷺ کا اعلان 256
وحدت کے بغیر امت امت نہیں رہتی اور دین مذہب میں بدل جاتا ہے 257
قرآن کے فیصلوں کا ایک ہی رنگ ہوتا ہے 258
مولانا کوثر نیازی کا مفتی محمود' مولانا شاہ احمد نورانی
اور مودودی صاحب کو چیلنج 258
علما حضرات کے نزدیک ''باجماعت'' کے معنی اپنی اپنی
علیحدہ علیحدہ نماز ہوتی ہے 259
انگلستان میں مسجد کے ٹکڑے کے حصول پر قتل و غارت گری 259
فرقوں کے لفظ کی بجائے مکتبِ فکر کے لفظ کا استعمال 260
ختم نبوت پر 1953ء میں منیر کمیٹی کی رپورٹ 261
خطرہ دراصل اپنے اپنے اسلام کا ہے 263
آئین اور قانون میں فرق: تغیر و تبدل کا حسین امتزاج 264
قرآن نے جزئیات خود متعین نہیں کیں 265
ملتِ اسلامیہ وہ ہوگی جو قرآن کو اپنا آئین تسلیم کرے گی 265
شخصیتوں کو مدار بنانے کا نتیجہ اللہ کی حاکمیت کا اُٹھ جانا ہے 267
امتِ واحدہ کا وہ نظام کیوں باقی نہ رہا؟ 267

دسواں باب: سورۃ الحج (آیات 56 تا 66)

سابقہ درس کا تسلسل 269
کفر اور ایمان میں فرق 270
آیاتِ خداوندی کو محکم کرنے کا نتیجہ: زندگی کی آسائشیں اور شادابیاں 271
جغرافیائی استقامت کے باوجود ہماری ہزار سالہ تاریخی زبوں حالی 272
خدا کے کہے ہوئے پر اعتبار نہ کرنا تکذیبِ دین ہے 273
مفاد پرستی کی بنا پر قرآنی نظام کو کوئی قوم برداشت نہیں کرتی 273
نظامِ خداوندی کی پہلی منزل: ہجرت 273
ہجرت کے باوجود مخالفت کی اصل وجہ قرآن یا وحی کے مطابق
نظام کا قیام ہے 274
فرعون کا بھی یہی کردار تھا 275
خدا کے ہاں مجاہدین کے مدارج 276
جنت بھی شہداء کے لیے آخری مقام نہیں ہے 277
شہید کا لفظ ہماری اصطلاح ہے' قرآن کی نہیں 277
انسانیت کی نشوونما کے لیے ضروریات کی کیفیت اور انداز 277
بڑے بڑے مقاصد میں کامیابی کا حصول حلیمی کے بغیر ممکن نہیں 278
قائداعظمؒ کے تحمل اور برداشت کا گاندھی کو ایک تاریخی جواب 279
قائداعظم رحمہ اللہ کے لیے ایک بہت بڑا کریڈٹ 280
حلیم اور علیم دونوں صفات ضروری ہیں 281
ظلم اور استبداد کے خلاف سینہ سپر ہونا فرض ہے 281
آیات اللہ کو محکم کرنے والی قوم کا فریضہ: اپنے اندر قوت پیدا کرنا 282
رات کی تاریکی کبھی مستقل طور پر نہیں رہ سکتی 283
الحق صرف خدا کے قوانین ہیں جو قرآن کریم میں ہیں 284
مروجہ نظامِ شریعت ہو یا نظامِ اسلام ہو' اسے الحق کی کسوٹی پر

پورا اترنا ہوگا 284
جس امت یا قوم میں فرقے ہونگے وہاں دین کا نشان تک نہیں ہوگا 286
طبعی زندگی کے لیے بارش کی طرح انسانیت کی
زندگی کے لیے تعلیمِ وحی لازم ہے 286
جنگِ بدر میں جوہرِ انسانیت کے پیکروں کا کردار 287
طبعی قوانین کی طرح انسانی زندگی کی قدر ومنزلت کے لیے
وحی کی اقدار سے آگاہی حاصل کرنا ہوگی 289
قوت کا سرچشمہ قوانینِ خداوندی میں مضمر ہے 289
وحی کے قانون کی افادیت کو سمجھانے کا طریق 290
رحمت اور راف کا مفہوم 291
قوموں کی حیات کا راز اقدار سماوی سے وابستہ ہے 291

گیارھواں باب: سورۃ الحج (آیات 67 تا 71)

دین کے معاملے میں دو بنیادی چیزوں کی وضاحت 294
باہمی مناظروں کے مابین ''اہم ترین مسائل'' کی حقیقت 295
غیر مسلم حکومت کے تابع دین کے احکامات کو قانونی شکل نہیں دے سکتے 295
مذہب کے تابع حج کا مقصد ومنتہا 297
مذہب کے سایہ میں معاشی نظام کا نتیجہ 298
فوج سے الگ ہونے والے سپاہی کا عمل 298
طور طریقوں میں فرق کو بنیاد بنا کر دین کی اصل کو نظر انداز نہ کرو 299
اصل نیکی تو دین کی نشوونما ہے 300
دین میں بنیادی چیز کی وضاحت: اَلْبِرُّ کا قرآنی مفہوم 301
سب سے پہلے طے کرنے والی بات 302
پرستش اور عبادت میں فرق 303
فاتحِ کلکتہ کی کہانی حقائق کی زبانی 303
سنی اور وہابیوں کا عدالت میں مقدمہ، ہائی کورٹ میں اپیل،
اور انگریزوں کی کونسل کا فیصلہ 304
مذہب میں فروعات کو ہی دین سمجھا جاتا ہے 304
تمام اہلِ مذاہب کے اجتماع کا نتیجہ: وہی ڈھاک کے تین پات 306
فیصلہ قیامت پر اٹھا رکھنے کا فائدہ: کچھ بھی نہیں 307
انبیاء کرام علیہم السلام کی بعثت اور سماوی راہنمائی کا منتہا 307
قرآنِ حکیم کو خالی الذہن ہو کر سمجھنا ہوگا 308
لفظ قیامت کی قرآنی اصطلاح کا مفہوم 308
رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کے دور کی انقلابی جماعت کی کیفیت 309
مذہبی فرقوں کے سلسلہ میں مفتی محمود صاحب کا اعلان 311
حکومتی سطح پر فرقہ بندی کی اجازت: خلافِ قرآن سوچ 311
فرقے کے لفظ کی بجائے مکاتبِ فکر کے لفظ کا استعمال:
ایک اور خود فریبی 312
مذہبی پیشواؤں کی اندرونی سوچ 312
فرقوں کو مٹانے کا طریق 313
صحیفہ کائنات میں کوئی اختلاف نہیں 314
کوئی حکومت بھی خامیوں سے مبرا قانون نہیں بنا سکتی 316
ہمارے ہاں مذہبی معاملات میں سوچنے والوں کو بولنے کی اجازت نہیں 317
قرآن کے متعلق مروجہ عقیدہ 318
فرقوں کے باہمی اختلافات کا نتیجہ: پھر کوئی مدد کو نہیں آتا 319

بارھواں باب: سورۃ الحج (آیات 67 تا 71)

مذہب میں سند کسی شخصیت کی رہینِ منت ہوتی ہے 320
آخر یہ مَا اَنْزَلَ اللّٰهُ کی مخالفت کیوں؟ 321
مخالفت کی اصل وجہ مذہب نہیں، دین تھا بلکہ دین کا نظام تھا 322

ہر سو قرآن کی مخالفت 323
مذہب کے خلاف مذہب نہیں لڑتا، مذہب ہمیشہ دین سے لڑتا ہے 324
مذہب کے اندر انسانی تصورات ومصروفیات 325
مولانا عبداللہ چکڑالوی کی غلط سوچ کا نتیجہ 325
آخر طلوعِ اسلام کی ہی مخالفت کیوں؟ 326
علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ کی فکر کے برعکس مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ
اور مولانا ابوالکلام آزادؒ کی سوچ 327
باطل کا قرآنی مفہوم 328
فکرِ قرآنی سے دُور رکھنے کی تکنیک: قرآن نہ سنو 329
جوق در جوق قاریوں کی آمد، سننے والوں کا شوق اور
قرآن کی آواز کو دبانے کا طریق 329
دنیا کی نوے فیصد آبادی کی سمجھ بوجھ 330
محمد علی جناح رحمۃ اللہ علیہ سے مخالفت کی وجہ 331
1941ء میں مسٹر منشی کو خدشہ 332
قائداعظمؒ کے نزدیک اسلامی حکومت کی امتیازی خصوصیت 333
مخالفت کی یہ شدت صرف رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم تک محدود نہ تھی 334
ہمارے ہاں کے غلط تراجم 335
حضرتِ شعیب علیہ السلام کی صلوٰۃ 335
شرک کے معنی ہیں کہ خدا کے نظام کے مقابلے میں
کوئی دوسرا نظام قائم کرنا 337
نبی اکرمؐ کا ارشاد ہے کہ میں کسی کیلیے نفع یا نقصان کا اختیار نہیں رکھتا 337
نظامِ خداوندی کے غیر متبدل اصولوں میں کوئی کمی بیشی نہیں ہو سکتی 338
خود ساختہ شریعت کفر سے زیادہ خطرناک ہوتی ہے 340
ظالم، کافر اور مشرک کے متعلق قرآنِ حکیم کی واضح وضاحت 341
قرآن کی بیان کردہ تشبیہات نہایت سادہ بھی ہوتی ہیں
اور بڑی پُر مغز بھی 343
اقتدار صرف اس کا ہے جو اس کائنات کو عدم سے وجود میں
لانے والا ہے 343
اقتدار کا دعویٰ کرنے والوں کی بے اختیاری کی حالت 344
اس قسم کے اقتدار کو تسلیم کرنے والوں کی سوچ کی پستی 344
مذہب میں خدا کا تصور 345
اِن چھوٹے خداؤں کا محاسبہ نہیں ہو سکتا 346

تیرھواں باب: سورۂ الحج (آیات 75 تا اختتام)

قرآن فہمی کے سلسلہ میں قرآنی تشبیہات کی اہمیت 348
دین کی بنیاد خدا کے صحیح تصور پر ہے 349
خدا کے تصور کو سمجھنے میں پیدا ہونے والی مشکلات 349
انقلابِ فرانس کا جذبہ محرکہ 350
ہمیں یہ سمجھنا ہوگا کہ خدا کیسے قوت کا سرچشمہ ہے 354
اقتدار کے سلسلہ میں مذہبی پیشوائیت کا دعویٰ 354
قرآن کا فرمان ہے کہ قوت کا سرچشمہ قانون ہوتا ہے 355
اب دیکھنا یہ ہے کہ قانون وضع کون کرے گا؟ 355
قانونِ فطرت کی نمود کا ثمر 355
انسانوں کو طاقت کا سرچشمہ بنانے والوں کے لیے لمحہ فکریہ 356
سرسیدؒ کو نیچری کے طور پر نیچری فرقہ قرار دیا گیا 357
کلمات اللہ اور سنت اللہ کا قرآنی مفہوم اور فرق 358
قوانینِ فطرت ہوں یا انسانی زندگی کے قوانین ہوں،
ان سب کو خدا نے اپنے کنٹرول میں رکھا ہے 358
انجن کو چلانے کی قوت اسٹیم میں ہوتی ہے، ڈرائیور میں نہیں ہوتی 359

خدا کے صحیح تصور کی اہمیت 359
قائداعظم رحمۃ اللہ علیہ کا فرمان: قانون کی قوت' قانون کی حکمرانی 361
قائداعظم رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ دس سال تک کام کرنے کی سعادت 362
انسانوں کی دنیا میں قوت کے نفاذ کا طریق کیا ہوگا؟ 362
انسانوں تک قوانین پہنچانے کا طریق ایک حکمت پر مبنی ہے 363
کائنات کے متعلق یورپ کا تصور 364
ذاتِ خداوندی ہر وقت علیم وخبیر ہے 364
ختمِ نبوت کے بعد کا طریق 365
لفظ رب کا عملی مفہوم 366
قوانینِ خداوندی کا رکوع اور سجدے کے ساتھ باہمی ربط 366
تغیرِ نفس کے بغیر قوت کے زور پر دنیا کی حالتِ زار 367
نبی اکرم ﷺ کا عہد زریں 368
نیک کاموں کا تصور اور مسلمان طبقے کی تباہ حالی 368
خیر خیرات کے لیے بھک منگوں کا مستقل وجود قائم ہوگیا 369
قوتِ گویائی کا کمال: الفاظ کا کرشمہ 369
خیرات کی تازہ روٹی باسی شکل اختیار کر لیتی ہے 370
عمل کے ننھے سے بیج کی وسعتیں 371
جہاد اور قتال کا مفہوم 372
امتِ مسلمہ کی حقیقت 373
فرقہ بندی کے لحاظ سے مسلمان کی پہچان: تباہی کا پیش خیمہ 373
خدا نے تمہارا نام صرف مسلم رکھا تھا تاکہ تم تمام اقوام عالم کی نگرانی کرو 375
ایک خدا' ایک رسول' ایک نظام' اور ایک امت 375

پیش لفظ

ادارہ طلوع اسلام لاہور کے لیے یہ امر باعث صد افتخار ہے کہ بزمِ طلوع اسلام لاہور نے محترم پرویزؒ کے پیش کردہ ہفتہ وار دروسِ قرآن کو قرطاس پر منتقل کرنے کے لیے جس پروگرام کا آغاز ''مطالب الفرقان فی دروس القرآن'' کے زیرعنوان جناب ڈاکٹر منظور الحق صاحب کی زیرنگرانی شروع کیا تھا۔ اس کے تحت اس سے پیشتر سورۃ النحل' سورۃ بنی اسرائیل اور سورۃ الکھف و مریم کی شکل میں الگ الگ تین جلدیں شائع ہو چکی ہیں اور اب اسی سلسلہ کو جاری رکھتے ہوئے بزم لاہور مذکورہ دروسِ قرآن کی مزید تین سورتیں یعنی سورۃ طٰہٰ' سورۃ الانبیاء اور سورۃ الحج پر مشتمل الگ الگ کم و بیش چار چار سو صفحات پر پھیلی ہوئی تین جلدیں فکر قرآنی سے آگہی رکھنے والے احبابِ ذوق سلیم کی خدمت میں پیش کرنے کی سعادت حاصل کر رہی ہے۔ یاد رہے کہ سورۃ الحج کے متعلق دروسِ قرآن کا آغاز 24 نومبر 1976ء کو اور اختتام 20 مارچ 1977 کو ہوا تھا۔

ان دروس میں حج کے مقاصد و مناسک' حج اور عمرہ میں فرق' قرآن سے پہلے کعبہ کی تولیت اور وہاں کی پیشوائیت باطلہ کے کردار کی بڑی تفصیل کے ساتھ تشریح کرتے ہوئے بتایا گیا ہے کہ عرب میں دو تین بڑے شہر تھے، مکہ کو ان میں مرکزی حیثیت حاصل تھی' قبائل جو صحراؤں میں رہتے تھے انہیں بدوی یا اعراب کہا جاتا تھا۔ عرب میں مکہ کی مرکزی حیثیت کعبہ کی وجہ سے تھی' کعبہ کے متولی قریش کے پاس باضابطہ کوئی حکومت نہ تھی' ان کی زندگی قبائلی زندگی ہی تھی گو مکہ جیسا شہر تھا لیکن وہاں زندگی قبائلی سطح ہی کی تھی' جس طرح سے پنچائتیں ہوتی ہیں' ابھی بادشاہت کا تصور نہیں تھا لیکن جسدِ انسانیت کے لیے تینوں جذامی قوتیں یعنی فرعونیت' قارونیت اور ہامانیت وہاں موجود تھیں۔ انسانوں پر انسانوں کی حکومت تھی لیکن اس کا نام ملوکیت یا بادشاہت نہیں تھا۔ وہاں نہ کوئی فوج تھی' نہ پولیس تھی' نہ قانون تھا' راستے تک بھی نہیں تھے' دن دیہاڑے قافلے لٹتے تھے' لوٹ مار پر ہی اکثر اس قوم کا گذارہ تھا۔ آمدنی کے کوئی باقاعدہ ذرائع نہیں تھے' جسے آج بھی غنیمت کہا جاتا ہے۔ وہ یہی مال مویشی تھے جو یوں ہاتھ آجاتے۔ غنیمت کا تو لفظ ہی غنم سے ہے یعنی بھیڑ بکریاں جو وہ لوٹ کے لے جاتے تھے۔

قریش کے متعلق تو قرآن کریم نے شہادت دی ہے کہ کعبہ کی تولیت کی بنا پر' سردی ہو یا گرمی' ان کے قافلوں کو کوئی نہیں لوٹتا تھا۔ (رحلۃ الشتاء والصیف، ۱۰۶-۲)

یعنی اس ملک میں جہاں کسی کا کوئی قافلہ محفوظ نہیں تھا وہاں ان کے قافلے رواں دواں چلتے رہتے، کسی کی جرأت نہیں تھی کہ ان قافلوں پر ہاتھ ڈالے' یہ لوگ مذہبی تقدس سے فائدہ اٹھاتے تھے' عربوں کے ہاں یہ عقیدہ مشہور تھا کہ جو قریش کعبہ کے متولی ہیں ان کی کسی چیز کو ہاتھ نہیں لگانا چاہیے اور تو اور جب لوگ حج کے لیے آتے تھے تو اپنے ساتھ مویشی لاتے تھے وہ چڑھاوے چڑھاتے تھے' وہاں جانور ذبح کرتے اور کھاتے تھے' وہ آتے ہوئے ان جانوروں کے گلے میں ایک پٹہ ڈال دیتے تھے جس پر لکھا ہوتا تھا کہ یہ کعبے

جا رہے ہیں۔غور فرمائیں مذہبی پیشوائیت سرمایہ داری کی کس قدر عجیب اور لطیف شکل ہے۔سرمایہ دار کو تو کچھ سرمایہ لگا کے آمدنی آتی ہے جب کہ یہ کچھ بھی Invest نہیں کرتے' کوئی سرمایہ نہیں لگاتے اور آمدنی چلی آ رہی ہے۔

یہ عجیب انڈسٹری ہے' قریش مکہ بھی تاجر تھے' مکہ ایک مرکزی منڈی تھا' پھر ان کے ہاں جو حج تھا' وہ صرف ان چیزوں کے لیے ہی رہ گیا تھا' اب بھی ہمارے ہاں میلوں پہ منڈیاں لگتی ہیں' آپ سمجھ لیں کہ حج ان کے ہاں سارے ملک کی سب سے بڑی منڈی تھی اور وہ جو چھوٹی چھوٹی منڈیاں لگتی تھیں تو وہ ان کے ہاں عمرہ کہلاتی تھیں۔

قرآن آیا اس نے دین کا تصور دیا' کعبہ تو اوّل دن سے بنایا ہی اس لیے گیا تھا کہ نوع انسانی کو پروردگار کی طرف سے رہنمائی عطا کی جائے' اس کے الجھے ہوئے معاملات و مسائل کو سلجھایا جائے' انسان پر انسان کی بجائے قوانین خداوندی کی حکمرانی ہو' بالفاظ دیگر کعبہ شروع سے اس پروگرام کا ایک مرکزی محسوس مقام تھا۔لیکن افسوس اس کی یہ حالت بگڑ گئی اور دین مسخ ہو کے مذہب بن گیا اور آخر کار دین کے جو شعائر تھے Symbols تھے' وہ آہستہ آہستہ بت پرستی میں تبدیل ہو گئے اور ان کی پرستش ہونے لگ گئی۔

اب صدیوں بعد حضور نبی اکرمؐ کے مقدس ہاتھوں سے مملکت خداوندی قائم ہو رہی تھی' فتح مکہ کی غرض یہ نہ تھی کہ رسولؐ اللہ کو اس مملکت کی بڑی ضرورت تھی یعنی یہ کہ ایک شہر اُن کے ہاتھ آ جائے۔عزیزانِ من! یہ بات تھی ہی نہیں بلکہ جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے حکومت خداوندی کا مرکز یہی وہ کعبہ تھا جسے پہلے دن سے اسی ہی غرض کے لیے بنایا گیا تھا۔اس لیے اس ساری کائنات کے مالک خدا نے اس کو اپنا گھر کہا اور نہ کائنات میں کونسا مقام ہے جو خدا کا نہیں ہے۔

سوچیے کہ کعبے کے مجاوروں سے اگر یہ درگاہ چھن جائے تو باقی ان کے پاس رہتا ہی کیا تھا۔یہ تھی اصل کشمکش یعنی وہ اسلام کے اس عادلانہ نظام کو متشکل نہیں ہونے دینا چاہتے تھے اور نہ ہی وہ یہ چاہتے تھے کہ کعبہ کی درگاہ کی تولیت کسی دوسرے کے ہاتھ میں چلی جائے کیونکہ اس امر سے ان کا کچھ بھی باقی نہیں بچتا تھا۔

اس تناظر میں قرآن نے کہا" **ان الذین کفروا یصدون عن سبیل الله والمسجد الحرام الذی جعلنه للناس سواء ن العاکف فیه والباد (22:25)**

یہ نظام جس کے حسین اور خوشگوار نتائج کا ذکر پہلے کیا گیا ہے کا مرکز کعبہ ہے۔یہ وہ واجب الاحترام مقام ہے جو تمام انسانوں کے لیے اطاعت خداوندی کا سرچشمہ قرار پائے گا۔اسے ہم نے نوع انسان کے لیے خواہ وہ یہاں کے رہنے والے ہوں یا باہر سے آنے والے ان سب کے لیے یکساں طور پر کھلا رکھا ہے۔لیکن یہ لوگ اس نظام عدل و احسان سے خود بھی سرکشی برتتے ہیں اور دوسرے لوگوں کو بھی اس کی طرف آنے سے روکتے ہیں۔جبکہ ان کی اس دھاندلی کو روک دینے کا وقت آ گیا ہے۔

قرآن نے کعبہ کو نوع انسانیت کے لیے بطور OpenCity کھلا شہر بتایا ہے۔**ومن یردفیه بالحاد بظلم نذقه من عذاب الیم (22:25)**

جس مقصد کے لیے ہم نے اسے متعین کیا ہے اس کے خلاف جو کوئی روش اختیار کرے گا تو ہم اس کو عذاب الیم دیں گے۔

الحج جس کا مادہ ح ج ج ہے کا معنیٰ ہے قصد کرنا' ارادہ کرنا۔اسی مادہ سے لفظ حجت یعنی دلیل ہے۔اسی لیے ابراہیمؑ سے کہا گیا کہ **و اذن فی الناس بالحج** (22:27)تم لوگوں میں اعلان کردو کہ وہ اپنے معاملات میں آخری دلیل وحجت کے لیے یہاں آیا کریں۔نوع انسانی میں اعلان کردو کہ جو متنازعہ فیہ معاملات ہیں ان کو لٹھ بازی سے' جنگ سے' شمشیر سے' جھگڑے اورلڑائی سے طے نہ کرو بلکہ اس مقام پہ آ ؤ' یہاں تمام معاملات کے فیصلے دلیل اور حجت کی رو سے ہوں گے۔خدا کے اس گھر کا مقصد یہ تھا۔

آپ دیکھیں گے کہ قرآن میں جہاں بھی کعبہ کا ذکر آیا ہے۔وہاں الناس کا ذکر ہے۔یعنی کعبہ کونوع انسانی کے لیے ایک مرکزی مقام بنانے کا ذکر ہے' نوع انسانی کے لیے ہدایت کا ذکر ہے۔نوع انسانی کے قیام یعنی اس کے اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کا ذکر ہے۔لہٰذا اس مقصد کے حصول کے لیےنوع انسانی کودعوت دی ہے کہ وہ آئیں اوراپنی آنکھوں سے دیکھیں کہ ان کی منفعت کے لیے کیا کچھ کیا جارہا ہے۔

سو ٔربوبیت عالمینی کے اس عظیم الشان پروگرام کی تکمیل اوراس کے استحکام کی خاطر یہ ضروری قرار پایا کہ کرہ ارض کے کونے کونے میں پھیلی ہوئی ملت اسلامیہ کے نمائندگان سال میں ایک بار اجتماعی طور پر کعبہ کے سائے میں جمع ہوں تا کہ اپنے اپنے دور کے تقاضوں کے پیش نظر حیاتِ اجتماعیہ کے مختلف عقدوں کا حل خدائے علیم وخبیر کی طرف سے عطا کردہ ضابطۂ حیات کی روشنی میں باہمی افہام وتفہیم کے تحت تلاش کرتے ہوئے اسے مربوط شکل میں پیش کریں' اور پھراسی مقصد کے تحت گاہے گاہے چھوٹی چھوٹی کانفرنسوں کا بھی انعقاد ہو جسے عمرہ کے نام سے ماسوم کیا جاتا ہے۔

برادران عزیز! یہ تھا حج کا وہ مقصدِ عظیم جس کے حصول کی خاطر کعبہ کونوع انسانی کے لیے مرکز بنانا مقصود تھا۔اقبال نے شاید انہیں حقائق کی بنیاد پر کہا تھا کہ:

مکے نے دیا خاکِ جنیوا کو یہ پیغام
جمعیّت اقوام کہ جمعیّت آدم ؟

اب دیکھنا یہ ہے کہ ملتِ اسلامیہ اس صراطِ مستقیم پر گامزن ہونے کے لیے اپنا رختِ سفر کب باندھتی ہے کہ جس کو دیکھنے کے لیے آسمان عالم صدیوں سے چشم براہ ہے۔

والسلام

شریف لون

چیئرمین ،ادارہ طلوع اسلام، لاہور

پہلا باب: **سورۃ الحج** (آیات 1 تا 10)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

الٓرٰ قف تِلْكَ اٰيٰتُ الْكِتٰبِ وَقُرْاٰنٍ مُّبِيْنٍ ۝١ رُبَمَا يَوَدُّ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا
لَوْ كَانُوْا مُسْلِمِيْنَ ۝٢ ذَرْهُمْ يَاْكُلُوْا وَيَتَمَتَّعُوْا وَيُلْهِهِمُ الْاَمَلُ
فَسَوْفَ يَعْلَمُوْنَ ۝٣ وَمَآ اَهْلَكْنَا مِنْ قَرْيَةٍ اِلَّا وَلَهَا كِتَابٌ
مَّعْلُوْمٌ ۝٤ مَا تَسْبِقُ مِنْ اُمَّةٍ اَجَلَهَا وَمَا يَسْتَاْخِرُوْنَ ۝٥ وَقَالُوْا
يٰٓاَيُّهَا الَّذِيْ نُزِّلَ عَلَيْهِ الذِّكْرُ اِنَّكَ لَمَجْنُوْنٌ ۝٦ لَوْ مَا تَاْتِيْنَا
بِالْمَلٰٓئِكَةِ اِنْ كُنْتَ مِنَ الصّٰدِقِيْنَ ۝٧ مَا نُنَزِّلُ الْمَلٰٓئِكَةَ اِلَّا بِالْحَقِّ
وَمَا كَانُوْٓا اِذًا مُّنْظَرِيْنَ ۝٨ اِنَّا نَحْنُ نَزَّلْنَا الذِّكْرَ وَاِنَّا لَهٗ
لَحٰفِظُوْنَ ۝٩ وَلَقَدْ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ فِيْ شِيَعِ الْاَوَّلِيْنَ ۝١٠

عزیزانِ من! آج نومبر 1976ء کی 21 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ الحج سے ہورہا ہے۔ یہ 22ویں سورۃ ہے اور ابتدا ہی سے آج کا درس شروع ہوگا: (22:1)۔

انبیائے کرام علیہم السلام کی بعثت کا مقصد معاشرے کی تشکیلِ نو کرنا ہوتا ہے

یہ عجیب حسنِ اتفاق ہے کہ حج کا مہینہ امروز وفردا میں شروع ہونے والا ہے اور ہمارے درس کا آغاز بھی سورۃ الحج سے ہورہا ہے۔ آپ کو یاد ہوگا کہ سابقہ سورۃ کی آخری آیات میں اُس ٹکراؤ کا ذکر تھا جو نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے عہدِ مبارک میں حق اور باطل کے نظاموں کے

درمیان ہو رہا تھا یا ہونے والا تھا۔ اب تو آپ اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ گئے ہونگے کہ حضراتِ انبیائے کرامؑ کا مقصدِ بعثت یہ ہوتا تھا کہ انسانی معاشرہ' جو غلط بنیادوں پر استوار ہو چکا ہے' اسے صحیح بنیادوں پر متشکل کیا جائے۔ اور صحیح بنیادوں سے مراد ہوتی تھی: وحی خداوندی کے مطابق' مستقل اقدار کے مطابق' خدا کے دیئے ہوئے اصول اور احکام کے مطابق' انسانی معاشرے کو متشکل کرنا۔ یہی دین ہے اور پھر اس حصولِ مقصد کی ہر کوشش جہاد ہے۔ یہ مقصد افہام و تفہیم سے حاصل کیا جاتا تھا یعنی انہیں ہر گوشے سے سمجھانے سے کہ تم نے اس معاشرے کو جن خطوط پر استوار کر رکھا ہے اس کا نتیجہ تمہارے لیے تباہی ہے' انسانیت کے لیے ہلاکت ہے۔ قبل اس کے کہ تم اس تباہی تک پہنچ جاؤ' اپنے آپ کو بچالو اور ان خطوط پر اپنے معاشرے کو متشکل کرلو۔ معاشرہ تو انہی انسانوں کا نام ہوتا ہے' جو وہاں بستے ہیں۔ وہ کہیں آسمان سے تو نہیں آتا۔ تو اپنے معاشرے کو بدلنے کے معنی یہ ہوتے ہیں کہ اپنے اندر اس قسم کی تبدیلی پیدا کرلو اور اس کے مطابق اپنے معاشرے کی ازسرِ نو تخلیق کرو۔

معاشرے کو ازسرِ نو تشکیل کرنے کا طریقِ کار

عزیزانِ من! ان خطوط پر ان کے اندر ایک تبدیلی پیدا کرنے کی بات تھی اور تبدیلی زبردستی پیدا نہیں کی جاسکتی۔ اسی لیے **لَآ اِکْرَاہَ فِی الدِّیْنِ** [1] (2:56) کے معنی ہی یہ ہیں کہ الدین کا معاشرہ زبردستی متشکل نہیں کرایا جاسکتا۔ اس سے تو انسانوں کے اندر ایک تبدیلی پیدا ہوتی ہے اور اس اندرونی تبدیلی کا ایک تقاضا یہ ہوتا ہے کہ وہ اپنی اس دنیا کو خدا کی وحی کے مطابق متشکل کر لیتے ہیں۔ یہ تو وہی عمل ہے جسے مثلاً آج کی اصطلاح میں Constitutional (آئینی) کہتے ہیں کہ آئینی طریقوں سے تبدیلی ہونی چاہیے۔ آئینی طریقوں کے مطابق تبدیلی بھی اصل میں خارج سے (From Without) ہی ہوتی ہے۔ میرے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ الدین کو زبردستی نہیں ٹھونسا جاتا۔ اس کے لیے آج کل ہمارے ہاں ایک اور اصطلاح آئی ہے، جس میں عوام کی رائے کو ہموار کیا جاتا ہے یعنی عوام کی رائے بدلی جاتی ہے۔ اس سے صرف ان کی رائے ہی کا بدلنا ہوتا ہے' دلوں کا بدلنا نہیں ہوتا۔

---

[1] الدین میں زبردستی نہیں ہے۔ اِسے' انسانوں کو' اپنے دل کی رضامندی سے' قائم اور اختیار کرنا ہے۔ عربی زبان میں اَلْکَرْہُ اور اَلْکُرْہُ سخت ناپسندیدگی اور مشقت کو کہتے ہیں۔ بعض علمائے لغت نے کہا ہے کہ جس کام پر خود تمہارا نفس ناخواستہ طور پر تمہیں مجبور کرے' وہ کُرْہٌ ہے اور جس پر کوئی دوسرا مجبور کرے' وہ کَرْہٌ ہے۔ امام راغب اصفہانی نے اپنی مشہور تصنیف ''المفردات فی غریب القرآن'' میں لکھا ہے کہ ''جو تکلیف کسی انسان پر خارج سے پہنچے اور اس پر زبردستی لادی جائے تو وہ کَرْہٌ ہے اور جو اسے خود اپنے آپ سے پہنچے وہ کُرْہٌ ہے۔'' ابن فارس نے اپنی کتاب ''مقاییس اللغۃ'' میں لکھا ہے کہ ''کُرْہٌ تو مشقت کو کہتے ہیں اور کَرْہٌ یہ ہے کہ تمہیں کسی بات کے کرنے کے لیے کہا جائے اور تم اسے بادل ناخواستہ کرو۔'' قرآن کریم میں طَوْعًا کے مقابلہ میں کَرْھًا آیا ہے (3:82)۔ ان نکات کی مزید تفصیل کے لیے دیکھیے: پرویزؒ: لغات القرآن (جلد نمبر ۳) ص۔ 1428

آج کے دَور میں صرف رائے کو بدلا جاتا ہے، دلوں کو نہیں

عزیزانِ من! آج کی دنیا میں تو دلوں کو بدلنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، خواہ اسے آپ آئینی طریق کار یعنی Constitutional کہیں، خواہ لوگوں کی آراء کا بدلنا کہیں، یہ سب کچھ خارجی ذرائع اور خارجی طور پر ہوتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ آج کی بدلی ہوئی رائے کل پھر آپ کے خلاف بدل جاتی ہے۔ روز فلور کراسنگ ہوتا ہے، اِدھر کا بندہ اُدھر چلا جاتا ہے۔ اُس نے اِس کے خلاف رائے دیدی۔ جنہوں نے کل انہیں منتخب کیا تھا، آج یہ اس کے خلاف ہوگئے۔ یہ ساری چیزیں اس لیے ہوتی ہیں کہ یہ سب کچھ کرایا جاتا ہے۔ بظاہر یہی کہا جاتا ہے کہ ہم اس میں کوئی زبردستی نہیں کرتے، کسی کے سر نہیں ٹھونستے لیکن زبردستی کے بھی تو مختلف طریقے ہوتے ہیں۔ جسے آپ طوعاً کہتے ہیں کہ از خود کوئی کہے اور کرے، وہ دل کی تبدیلی سے ہوتا ہے۔ قرآنِ کریم نے اس تبدیلی کی جو بنیاد قرار دی ہے وہ تغیرِ نفس ہے۔ کہا کہ **اِنَّ اللّٰہَ لَا یُغَیِّرُ مَا بِقَوۡمٍ حَتّٰی یُغَیِّرُوۡا مَا بِاَنۡفُسِہِمۡ** (13:11) خدا کسی قوم کی حالت کو نہیں بدلتا جب تک وہ قوم خود اپنی حالت کو نہ بدلے۔ یعنی خدا کسی قوم میں کوئی تبدیلی پیدا نہیں کرتا، قانونِ خداوندی کے مطابق کسی قوم میں صحیح تبدیلی پیدا نہیں ہوتی تاوقتیکہ اس قوم کی نفسیاتی کیفیت نہ بدل جائے۔ یہ بڑی عظیم چیز ہے جو قرآن نے کہی ہے۔ اسی کے معنی ہیں **لَاۤ اِکۡرَاہَ فِی الدِّیۡنِ** (2:56)۔ جب تک نفسیاتی تبدیلی نہیں ہوتی، ذہنیت نہیں بدلتی، دل و دماغ نہیں بدلتے، خیالات نہیں بدلتے، تقاضے اور خواہشات اور آرزوئیں نہیں بدلتیں، نصب العین حیات نہیں بدلتا، ایمان نہیں بدلتا۔ یہ وہی چیز ہے جسے کہتے ہیں کہ طاغوت پر ایمان کی بجائے خدا پر ایمان نہیں آتا۔ جب تک یہ تغیرِ نفس نہ ہو اُس وقت تک یہ حقیقت پیدا نہیں ہوتی۔

تغیرِ نفس دل کی گواہی کا دوسرا نام ہے

صحیح صداقت صرف خدا کے دیئے ہوئے قوانین کے اندر ہے، انسانوں کے خود ساختہ قوانین میں نہیں ہے۔ جب تک کسی کا دل اس کی گواہی نہیں دیتا اس وقت تک یہ تبدیلی پیدا نہیں ہوسکتی۔ سچ کہا تھا علامہ اقبالؒ (1877-1938) نے کہ

> تُو عرب ہو یا عجم ہو، ترا لا الٰہ الا
> لغتِ غریب، جب تک ترا دل نہ دے گواہی[1]

یہ دل کی گواہی ہے جسے تغیرِ نفس کہا جاتا ہے، جسے ذہنیت کا بدلنا کہا جاتا ہے۔ حضراتِ انبیائے کرام علیہم السلام جو انقلاب لاتے تھے وہ دلوں کی دنیا بدلتے تھے، نفسیاتی تبدیلی پیدا کرتے تھے اور اس داخلی تبدیلی کا فطری نتیجہ خارجی تبدیلی ہوا کرتا تھا۔ اس میں کسی قسم کا اکراہ نہیں ہوتا تھا، زبردستی نہیں ہوتی تھی۔

---

[1] اقبال رحمہ اللہ: بال جبریل، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، 1996، ص۔ 63

ابلیس کا حربہ

عزیزانِ من! زبردستی کے معنی صرف ڈنڈے کے زور سے ہی تبدیلی لانا نہیں ہے بلکہ جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے اس کے بیسیوں طریقے ہیں۔ اُن میں سے ایک یہ ہے جو ابلیس نے کہا تھا کہ دیگر طریقوں کے علاوہ میں انہیں آوازیں دے کر بھی بہکا دیا کرونگا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس دور میں ابلیس کا یہ حربہ بڑا کارگر ہو رہا ہے۔ یہ جتنے ذرائع ہیں جنہیں آپ ذرائع ابلاغ کہتے ہیں، دوسروں تک باتیں پہنچانے کے ذرائع کہتے ہیں، یہ اخبارات، یہ ریڈیو، یہ ٹی وی، یہ تقریریں، یہ جلوس، یہ بینرز، یہ ساری چیزیں ابلیس کا حربہ ہیں اور یہی ہیں وہ جو اس نے کہا تھا کہ مجھے کچھ اور کرنے کی ضرورت ہی نہیں پڑے گی، میں تو آوازیں دے دے کر ان کو بہکا دونگا۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس دور میں وہ بہت کامیاب ثابت ہو رہا ہے۔ یہ بھی زبردستی ہوتی ہے۔

عربی زبان میں اطاعت کا مفہوم ''بطیبِ خاطر'' ہوتا ہے

عزیزانِ من! انبیائے کرام علیہم السلام کے لائے ہوئے انقلاب میں زبردستی نہیں ہوتی، جبر نہیں ہوتا، اکراہ نہیں ہوتا۔ جو کچھ ہوتا ہے بطیبِ خاطر ہوتا ہے، دل کی رضامندی سے ہوتا ہے۔ اطاعت کے معنی ہی یہ ہوتے ہیں۔ آپ دیکھتے ہیں کہ جب درخت کو پھل لگتا ہے اور وہ ابھی کچا ہوتا ہے تو آپ کو اسے خود اتارنا پڑتا ہے، جھانپڑیں مار مار کے اتارنا پڑتا ہے۔ یہ بالکل اسی طرح ہوتا ہے جس طرح لڑ کے کچے بیر اتارا کرتے ہیں۔ لیکن، عزیزانِ من! جب کوئی پھل پک جاتا ہے تو وہ از خود نیچے آ جاتا ہے۔ یہ جو'' پکے ہوئے پھل کا از خود ٹہنی سے ٹوٹ کے نیچے آنا ہوتا ہے، عربی زبان کے اعتبار سے اسے اطاعت کہتے ہیں۔ اگر اس پھل کو ذرا بھی باہر سے ہلانا پڑ جائے تو عربی زبان کے لحاظ سے وہ اطاعت نہیں ہوگی، استبداد ہوگا، اکراہ ہوگا، جبر ہوگا۔

جب یہ انقلاب آتا ہے تو اس انقلاب کی مخالفت کرنے والی قوتیں اسے روکنے کے لیے ہر قسم کے حربے استعمال کرتی ہیں اور آخری حربہ وہ آجاتا ہے جس میں میدانِ جنگ میں آنا پڑتا ہے۔ اب وہاں پہنچ کر اس کا فیصلہ میدانِ جنگ میں ہوتا ہے یعنی ہوتا یوں ہے کہ ان کی طرف سے مخالفت ہوگی۔ اس مخالفت کی بھی ایک حد ہوتی ہے چنانچہ اگر یہ اس انقلاب کے داعی اس وقت بھی یہ کہیں کہ نہیں صاحب! ہمارا کام تو وعظ و نصیحت ہی کرتے جانا ہے، تو ظاہر ہے کہ یہ تو اس نظام کی شکست ہوگی۔ یہ قائم ہی نہیں ہو سکے گا۔ یہ وہ مقام ہے جہاں قرآن نے کہا ہے کہ ہم نے جہاں دلائل نازل کیے، قوانین نازل کیے، اس کے ساتھ شمشیر خارہ شگاف بھی نازل کی۔ یہ سورۃ الحدید کی آیت ہے جس میں کہا تھا کہ **لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ وَالْمِيْزَانَ لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ ۚ وَاَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ فِيْهِ بَاْسٌ شَدِيْدٌ وَّمَنَافِعُ لِلنَّاسِ وَلِيَعْلَمَ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ وَرُسُلَهٗ بِالْغَيْبِ ۭ اِنَّ اللّٰهَ قَوِيٌّ عَزِيْزٌ** (57:25)۔ (نظام ربوبیت کے) اس مقصد کے لیے خدا نے ایسا انتظام کیا کہ مختلف اقوام کی طرف اپنے رسولوں کو

واضح دلائل دے کر بھیجا اور رسول اپنے ساتھ ضابطہ قوانین بھی لایا۔ وہ اس ضابطہ قوانین کی رو سے ایسا معاشرہ قائم کرتے جس میں ہر شخص کا عمل ٹھیک ٹھیک نتیجہ مرتب کرے اور یوں لوگ عدل وانصاف پر قائم رہیں۔ اس معاشرہ کے استحکام کے لیے اس نے ضابطۂ قوانین کے ساتھ شمشیر خارہ شگاف (فولاد) بھی نازل کی ہے جس میں بڑی سختی ہے اور چونکہ یہ سختی عدل وانصاف کے نظام کے قیام اور مظلوموں کی حفاظت کے کام آتی ہے اس لیے یہ نوع انساں کے لیے مضرت رساں ہونے کے بجائے بڑی منفعت بخش ہوتی ہے۔ اس سے یہ بھی ظاہر ہو جاتا ہے کہ وہ کون سے وفا شعار بندے ہیں جو اس نظام خداوندی کی مدد کرتے ہیں جو اس کے رسولوں کے ہاتھوں متشکل ہوتا ہے حالانکہ اس کے درخشندہ نتائج ہنوز مرئی شکل میں ان کے سامنے نہیں آئے ہوتے اور وہ اپنے یقین محکم کی بنا پر اس کی خاطر ہر قسم کی قربانیاں کرتے ہیں۔ یوں خدا کا وہ نظام' جو اپنا غلبہ اور قوت رکھتا ہے' ان لوگوں کے ہاتھوں متشکل ہوتا ہے۔

مخالفت کا سدِ باب خارجی انقلاب کے ذریعے ہوتا ہے

عزیزانِ من! پچھلی دفعہ میں نے عرض کیا تھا کہ یہ وہ مقام ہے جہاں مدافعت کے لیے آپ کو قوت کی ضرورت پڑتی ہے۔ جب مخالفین اپنی مخالفت میں اس مقام تک اتر آئے تا کہ وہ اس نظام کو نا کام بنا دیں' اِسے استوار نہ ہونے دیں تو پھر آپ کو قوت کے ساتھ اس کی مدافعت کرنا پڑتی ہے۔ یہ وہ چیز ہے جسے آپ انقلاب کہہ کر پکارتے ہیں۔ وہ ذہنی انقلاب تھا جو مدافعت کے لیے میدان جنگ تک لے آیا۔ اور جنگ میں فتح کے بعد یہ خارجی دنیا کا ایک انقلاب ہے جہاں پہنچ کر پھر بلندیاں پستیوں میں اور پستیاں بلندیوں میں بدلا کرتی ہیں۔ قرآن کے الفاظ میں یہ وہ مقام آتا ہے جسے ''الساعۃ'' سے تعبیر کیا گیا ہے یعنی دوڑ کے آ جانے والی چیز۔ وہ جو ذہنی انقلاب ہوتا ہے' وہ لمبا عرصہ لیتا ہے۔ اس میں Convertion (تغیر) اندورنی تبدیلی ہوتی ہے' ان کے قلب و دماغ کی تبدیلی ہوتی ہے۔ لیکن جب وہ میدانِ جنگ تک میں آ جاتے ہیں تو یہاں قوت کا مقابلہ قوت کے ساتھ ہوتا ہے۔ وہ قوت پر آ جاتے ہیں اور جب یہ حق پر کی جماعت غالب آتی ہے تو اسکے بعد' وہ جو مخالفین کی جماعت تھی' ان کے لیے یہ کتنی بڑی تبدیلیاں واقع ہو جائیں گی: ان کی زمینیں چھنیں گی' ان کی مملکتیں چھنیں گی' ان کی جائیداد چھنے گی' ان کے خون بھی بہیں گے' ہوسکتا ہے کہ ان کو وطن بدر بھی کر دیا جائے۔ یہ ہے مخالفت کا سدِ باب جو خارجی انقلاب کے ذریعے ہوتا ہے۔

الساعۃ کا قرآنی مفہوم

عزیزانِ من! یہ متذکرہ بالا ساری چیزیں ہیں' جنہیں ''الساعۃ'' کی قرآنی اصطلاح میں کہا ہے کہ یہ وہاں واقع ہونگی۔ یہ ہے ''الساعۃ'' جسے آج کی اصطلاح میں آپ انقلاب کہتے ہیں۔ میں نے کہا ہے کہ آج کی اصطلاحیں صحیح قرآنی مفہوم پیدا نہیں کرسکتیں۔ یہ ہے جسے قرآنی اصطلاح میں الساعۃ بھی کہا گیا ہے' القیٰمۃ بھی کہا گیا ہے۔ میں پھر بار بار واضح کر دیا کرتا ہوں کہ یہ جو ہمارے ہاں مرنے کے بعد

کی زندگی ہے‘ جو مرنے کے بعد ہمارے ہاں اٹھ کھڑے ہونا ہے‘ جو مُردوں کا دوبارہ زندگی پالینا ہے‘ یہ بھی القیٰمۃ ہے‘ اسے بھی الساعۃ کہا گیا ہے۔لیکن قرآنِ کریم میں صرف اسی کے لیے یہ الفاظ نہیں آئے۔اس زندگی میں بھی‘ جہاں حق اور باطل کی کشمکش میں‘ یہ مقام آجاتا ہے‘ جہاں یہ تبدیلی قوت کے زور پہ ہوتی ہے‘ اس کے لیے لوگ اٹھ کھڑے ہوتے ہیں‘ اسے بھی الساعۃ اور القیٰمۃ کہا جاتا ہے۔اس کے نتیجے میں‘ وہ جو شکست خوردہ قوتیں ہوتی ہیں‘ وہ جہنم رسید ہوجاتی ہیں‘ اِسے اِن کی اس دنیا کی جہنم کہتے ہیں۔اس کے برعکس جو قوت کامیاب ہوکر حق کے نظام کا معاشرہ قائم کرتی ہے‘ اسے اس دنیا کی جنت کہا جاتا ہے۔اُس دنیا کی جنت اور اُس کی جہنم‘ تو وہاں مرنے کے بعد جی اٹھنے کی بات ہے۔اس دنیا کے اندر یہ چیزیں ہوتی ہیں۔اس بنیادی نقطہ کو یاد رکھیے۔قرآنِ کریم کو سمجھنے کے لیے ہر مقام پہ آپ اس چیز کو آنے والی قیامت‘ جو مرنے کے بعد ہے‘ پر ہی نہ اٹھا رکھیے آج کی قیامت پر بھی نگاہ رکھیے۔کیا ہی خوب کہہ گیا ہے اقبالؒ :

سخن ز نامہ و میزاں دراز تر گفتی

اقبالؒ واعظ سے کہتا ہے کہ تُو نے قیامت کا وہ میزان‘ وہاں کا اعمالنامہ اور وہاں کی ان چیزوں کے متعلق بڑی لمبی چوڑی باتیں کی ہیں اور تُو یہ باتیں کرتا رہتا ہے مگر

ہزار حیف نہ بینی قیامتِ موجود

افسوس یہ ہے کہ یہ جو اس وقت قیامت برپا ہے‘ اسے تیری نگاہ نہیں دیکھ رہی۔

مذہب اور دین میں فرق

عزیزانِ من! آج مذہب اور الدین کا ایک بنیادی فرق یہ بھی ہے کہ مذہب ہر نتیجے کو آنے والی قیامت‘ جو مرنے کے بعد کی ہے‘ پر اٹھا رکھتا ہے۔دین اس دنیا کے اندر بھی جو تبدیلیاں واقع ہوتی ہیں‘ یہاں بھی جو اعمال کے نتائج نکلتے ہیں‘ ان کا بھی پتہ بتا دیتا ہے۔اعمال کے نتائج کا مرتب ہونا اسی دنیا سے شروع ہوجاتا ہے۔دین بتا دیتا ہے کہ فلاں عمل کا یہ نتیجہ ہوتا ہے۔اس کے برعکس جس نتیجے کا کہا جائے کہ مرنے کے بعد قیامت ہی میں سامنے آئے گا اس کا کوئی عملی ثبوت یہاں نہیں ہوتا۔یہ مذہب کی دنیا میں ہوتا ہے لیکن اگر صحیح اعمال‘ جو قرآن کے پروگرام کے مطابق ہیں‘ جن کے متعلق اس نے کہا ہے کہ ان کا نتیجہ اسی دنیا میں ایک جنت بداماں معاشرے کی شکل میں سامنے آجاتا ہے تو ہم ہر وقت اسے دیکھ سکتے ہیں کہ ہمارے اعمال اور ایمان قرآن کے مطابق بھی ہیں یا نہیں۔اگر وہ نتائج قرآنِ کریم کے بتائے ہوئے نتائج کے مطابق برآمد ہو رہے ہیں تو پھر یہ اس کے مطابق ہیں‘ اگر نہیں ہو رہے تو پھر ہم کسی غلط فہمی میں مبتلا ہیں۔ہم نے اپنے آپ کو فریب دے رکھا ہے کہ یہ کچھ خدا کی منشا کے مطابق ہو رہا ہے۔ہمارے پاس اس کی کوئی شہادت نہیں ہے‘ کسی محسوس طور پہ ہم انہیں دیکھ نہیں رہے‘ ہمیں اس کا یقین نہیں آسکتا۔یہ صرف قبول کر لینے کی بات ہے اور اس قسم کا قبول کر لینا تو مخالف میں چار ہی دلائل

کے سامنے آنے سے کافور ہو کے رہ جاتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ اسے یونہی کیوں تسلیم کرلیا جائے؟ اِسی لیے تو آپ کی آج کی نسل مذہب سے برگشتہ ہو رہی ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جو چیز ان کو صرف اس طرح سے منوائی گئی تھی، جب مغرب کی سیکولرازم اس کے خلاف انہیں چار دلیلیں دیتی ہے، ان کا ایمان ختم ہو جاتا ہے۔ اصل میں ایمان ہوتا ہی نہیں ہے۔ ایمان تو یہ ہوتا ہے کہ علیٰ وجہ البصیرت ان چیزوں کی صداقت پر یقین ہو، ان کے نتائج محسوس طور پر سامنے آئیں اور وہ اس ایمان کی تقویت کا موجب بنتے چلے جائیں پھر انہیں اس سے ہٹانے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

عزیزانِ من! سابقہ آیات میں وہ مقام آ گیا تھا اور قرآنِ کریم کی سورتوں میں آپ دیکھیں گے کہ حضرات انبیائے کرام علیہم السلام اپنے نظام کی، اپنے پروگرام کی، ابتداً افہام و تفہیم سے کرتے ہوئے سمجھاتے چلے جاتے ہیں، دلائل و براہین اور تاریخی شہادات سے، بتاتے چلے جاتے ہیں کہ تمہارا یہ موجودہ نظام تمہیں تباہی کی طرف لیے جا رہا ہے۔ قبل اس کے کہ تمہارا یہ نظام اپنے ہاتھوں سے آپ ہی خودکشی کرلے،[1] اس میں تبدیلی پیدا کرلو۔ اس آنے والے وقت سے پہلے صحیح نظام متشکل کرلو۔ وہ انہیں سمجھاتے چلے جاتے ہیں۔ کچھ لوگ جنہیں سعید روحیں کہا جائے گا، ٹھنڈے دل سے ان چیزوں پہ غور کرتے ہیں۔ غور و فکر کے بعد وہ اس نتیجے پہ پہنچتے ہیں کہ بات یہ صحیح کہہ رہا ہے۔ وہ ان چیزوں پہ یقین لے آتے ہیں۔ ان میں تبدیلی واقع ہو جاتی ہے۔ Conversion (اندرونی تبدیلی) کے معنی یہی نہیں ہیں کہ انسان نے ایک دن صبح اٹھ کر، نہا دھو کر، کلمہ شہادت پڑھا، مسجد میں مولوی صاحب کے ہاتھ پہ اسلام لے آئے اور اخبار میں نکل آیا۔ تو یہ Conversion (اندرونی تبدیلی) ہو گئی۔ Conversion (اندرونی تبدیلی) کے تو معنی یہ ہیں کہ دل و دماغ کے اندر ایک تبدیلی پیدا ہو۔ دوسری طرف مخالف قوتیں ہوتی ہیں۔ وہ اپنی مخالفت میں بڑھتی چلی جاتی ہیں تا آنکہ ٹکراؤ کی صورت پیدا ہو جاتی ہے۔

قرآنِ حکیم اپنی موجودہ ترتیب میں ہی قرآن ہے

عزیزانِ من! اس تمہید کے بعد اب ہم سورۃ الحج شروع کرتے ہیں۔ آپ دیکھیے یہی نہیں ہے کہ قرآنِ کریم کی ایک سورۃ کی آیات میں ربط ہے، قرآنِ کریم تو جس ترتیب سے ہمارے سامنے آیا ہے وہ یہی ہے جو قرآنِ کریم میں ہے۔ حقیقت میں کسی اور ترتیب کا قرآن، قرآن ہی نہیں ہے۔ اس ترتیب میں جس میں یہ سورتیں آئی ہیں اگر آپ گہرائی میں اتر کے دیکھیں تو آپ کو معلوم ہوگا کہ ان کے اندر بھی ایک ربط ہے۔ آپ نے میرے مفہوم القرآن میں دیکھا ہوگا کہ جہاں آخری سورۃ ختم ہوئی ہے اگلی سورۃ کی ابتداء وہیں سے ہوئی ہے۔ آگے وہ یوں سلسلہ ملتا چلا جاتا ہے اور پھر آیات کے اندر تو اس قدر ربط ہے کہ جیسا ربط ایک لڑی کے موتیوں میں ہوتا ہے۔

---

[1] تمہاری تہذیب اپنے خنجر سے آپ ہی خودکشی کرے گی جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا، ناپائدار ہوگا۔ [اقبال رحمہ اللہ: بانگ درا، 1996، ص۔149]

تقویٰ کا قرآنی مفہوم

عزیزانِ من! سورۃ الحج کی ابتداء ہی اس آیت سے ہوتی ہے کہ **يَآ اَيُّهَا النَّاسُ اتَّقُوْا رَبَّكُمْ** (22:1)۔اس آیت کے عام ترجمے جو ہمارے ہاں کیے جاتے ہیں' ان میں اس کا ترجمہ یوں ہے کہ ''اے لوگو! اپنے رب کا تقویٰ اختیار کرو۔'' آپ سوچیے کہ ترجمے کی اس چیز نے آپ کے دل پر کیا اثر کیا کہ اپنے رب کا تقویٰ اختیار کرو۔اس کے برعکس اگر بات یہ ہو کہ ''اے نوعِ انسانی! تم اس ہلاکت سے بچو جو تمہارے غلط نظام کی وجہ سے آنے والی ہے اور اس کی حفاظت کا طریقہ **رَبَّكُمْ** ہے۔یعنی جو ربوبیت ہے وہ صرف خدا کے لیے کردو' کسی کو اپنا اَن داتا نہ سمجھو' کسی کو اپنا آقا نہ سمجھو' کسی کی محتاجی اپنے آپ پہ غالب نہ آنے دو' کسی کی محکومی اختیار نہ کرو۔ یہ **رَبَّكُمْ** ہے۔یعنی اس غلط نظام کی ہلاکت سے' جو آنے والا ہے' بچو اور اس کا بچنے طریقہ یہ ہے کہ اس ربوبیت کو اپنے خدا کے لیے مختص کردو۔ یہ ہے جو پہلا طریقہ ہے۔انہیں وارننگ دی جارہی ہے۔آج کی اصطلاح میں ان کی رائے کو ہموار کیا جارہا ہے' ان کے اندر یہ کہہ کے تبدیلی پیدا کی جارہی ہے کہ اپنے آپ کو اس آنے والی ہلاکت سے بچاؤ اور اس کے بعد کہا ہے کہ یاد رکھو! اگر نہ بچاؤ گے تو سن رکھو کہ **اِنَّ زَلْزَلَةَ السَّاعَةِ شَيْءٌ عَظِيْمٌ** (22:1)۔یہ ایک ایسے شدید انقلاب کی رو سے واقع ہوگا جو ہر شے کو اس کی جگہ سے ہلا دے گا۔

زلزلۃ الساعۃ اور پہاڑ سے مراد

عزیزانِ من! اُس غلط نظام کو بدلنے کے لیے واضح طور پر کہہ دیا کہ یاد رکھو! اگر بتائے ہوئے طریق پر اپنے اندر تبدیلیاں نہیں پیدا کرو گے تو وہ تباہی آئے گی جو بڑی ہی اکھیڑ دینے والی' زلزلہ انگیز' تباہی ہوتی ہے۔یہاں قرآنِ کریم کے الفاظ پہ غور کیجیے کہا کہ پھر زلزلۃ الساعۃ ہوگا۔زلزلہ [1] کے معنی ہوتا ہے ''کوئی شے اپنے ٹھکانے پہ باقی نہ رہے' پاؤں لڑکھڑائیں تو وہ بھی تزلزل ہے' اور پہاڑ لڑکھڑا جائیں تو وہ بھی تزلزل ہے۔'' پچھلی سورۃ میں آپ نے دیکھا تھا' جہاں کہا تھا کہ ''پہاڑ'' [2] بھی اپنے مقام سے سرک جائیں گے' روئی کے گالا [3] کی طرح اڑتے ہوئے دکھائی دیں گے۔تو یہ پتھر کے اور مٹی کے پہاڑوں کا ذکر نہیں ہو رہا تھا' بڑے بڑے سرداروں کا ذکر ہو

---

1. تاج العروس کے مؤلف محبّ الدین (وفات 1205ھ بمطابق 1791ء) نے اپنی اس لغت میں لکھا ہے کہ زَلْزَلَةٌ کے معنی ہیں ''کسی چیز کو تیزی کے ساتھ حرکت دے کر ہلا دینا یا اس کی جگہ سے ہٹا دینا۔'' اور ابنِ فارس (المتوفی 395ھ) نے اپنی کتاب ''مقاییس اللغۃ'' میں لکھا ہے کہ ''ہر وہ لفظ جس میں زاء کے بعد لام آتا ہے' اُس کے بنیادی معنی ہٹنے کے ہوتے ہیں۔گفتگو میں لغزش کر جانے یا اپنی رائے سے ہٹ جانے نیز غلطی کرنے کے لیے بھی یہ لفظ استعمال ہوتا ہے۔'' اس کی مزید تفصیل کے لیے دیکھیے: پرویزؒ: لغات القرآن (جلد دوم)' ص۔812
2. قرآنِ کریم نے ''جبال'' کا لفظ یہاں مجازی معنوں میں ''اکابرینِ قوم یا قوم کے بڑے بڑے سرداروں'' کے لیے استعمال کیا ہے۔
3. دھنی ہوئی روئی کا گُپّھا

رہا تھا' جنہوں نے سمجھ رکھا تھا کہ ہمارے پاؤں پہاڑوں کی طرح جمے ہوئے ہیں۔عزیزانِ من! سنو یہ تو ہماری ترجمانی ہے۔کہا کہ **اِنَّ زَلْزَلَةَ السَّاعَةِ** (22:1)۔یہ ایک ایسے شدید انقلاب (الساعۃ) کی رو سے واقع ہوگا جو ہر شے کو اس کی جگہ سے ہلا دے گا۔

عزیزانِ من! میں یہاں قرآن کی اس محفل میں ادبی لحاظ سے اور لسانی اعتبار سے' کوئی بہت ہی زیادہ گہری فنی گفتگو نہیں کیا کرتا لیکن جہاں بھی صوتی اعتبار سے کوئی لفظ آتا ہے' یعنی ایک ہی بات کہنے کے لیے کسی ایسے لفظ کا انتخاب ہوتا ہے کہ محض لفظ ہی کہنے سے وہ چیز سامنے آجاتی ہے تو میں اِس محفل میں اس کا ذکر خاص ضرور کرتا ہوں۔اب یہاں قرآن بتا یہ رہا ہے کہ وہ جو اس طرح انقلاب (الساعۃ) آیا کرتا ہے' اس کے لیے یاد رکھو! کہ اس سے زندگی کے ہر گوشے میں تزلزل پیدا ہو جاتا ہے' ہر شے اپنے اپنے مقام سے ہٹ جاتی ہے' پستیاں بلندیوں میں اور بلندیاں پستیوں میں تبدیلی ہو جاتی ہیں' پہاڑ اپنے مقام سے سرک جایا کرتے ہیں۔آپ قرآن کریم کے وہ الفاظ دیکھیے: **اِنَّ زَلْزَلَةَ السَّاعَةِ شَیْءٌ عَظِیْمٌ** (22:1)۔دیکھا آپ نے' کیا الفاظ ہیں! ان الفاظ میں نرمی اور حلیمی نہیں ہے۔ان میں جمالیّت نہیں ہے۔ان میں جلال ہے اور جلال ہی ہونا چاہیے: **اِنَّ زَلْزَلَةَ** (22:1)۔عربی جاننے والے جانتے ہیں کہ یہ بات کوئی یونہی نہیں کہی جارہی۔یہ ایک حقیقت ہے جسے بیان کیا جارہا ہے۔یہ کیا حقیقت ہے؟ کہا کہ اپنے معاشرہ کو صحیح خطوط پر متشکل کر لو۔اگر تم از خود ایسا نہ کرو گے تو یاد رکھو کہ **اِنَّ زَلْزَلَةَ السَّاعَةِ شَیْءٌ عَظِیْمٌ** (22:1)۔یہ ایک ایسے شدید انقلاب کی رو سے واقع ہو گا جو ہر شے کو اس کی جگہ سے ہلا دے گا۔

اس انقلاب (الساعۃ) کی کیا کیفیت ہوگی؟

عزیزانِ من! یہاں کہا ہے کہ اس آنے والے انقلاب (الساعۃ) سے جو تزلزل پیدا ہوگا' یاد رکھو! وہ بڑی عظیم شے ہے اور آگے اِس کا نقشہ کھینچ دیا ہے کہ پھر ایسے وقت میں کیا ہوگا یا کیا ہوتا ہے۔یہاں کہنا یہ ہے کہ ''اس وقت دہشت اور سراسیمگی کی شدت ہوتی ہے''۔ یہ کیفیت ان الفاظ میں بیان کی جارہی ہے۔کہا کہ **یَوْمَ تَرَوْنَهَا** (22:2)۔اس آیت میں پہلے **تَرَوْنَهَا** پر ذرا غور کیجیے۔یہ لفظ اُس مقام پہ آتا ہے جہاں کوئی شے محسوس طور پر سامنے آجائے' وہ شے ذہنی طور پہ نہ ہو' اور نہ ہی ایسا ہو کہ وہ شے محض تمہارے ذہن کے اندر ہی ہو بلکہ وہ نتائج تم محسوس طور پر سامنے دیکھ لو جیسا کہ میں نے کہا ہے کہ اس وقت سراسیمگی' دہشت اور خوف کی شدت اپنے انتہائی (عروج) Climax پر ہوگی۔سوال یہ ہے کہ اس وقت کیا ہوگا؟ کہا کہ **تَذْهَلُ کُلُّ مُرْضِعَةٍ عَمَّآ اَرْضَعَتْ وَ تَضَعُ کُلُّ ذَاتِ حَمْلٍ حَمْلَهَا** (22:2)۔دودھ پلانے والی مائیں اپنے دودھ پیتے بچوں کو دودھ پلانا بھول جائیں گی اور اس کا انہیں قطعاً احساس نہیں ہوگا اور حاملہ عورتوں کے حمل ساکت ہو جائیں گے۔عزیزانِ من! اس قسم کے الفاظ زبانوں میں محاورے کے طور پر استعمال ہوتے ہیں اور ان کے یہ معنی حقیقی نہیں ہوتے کہ واقعی دودھ پلانے والی نے اپنے بچے کو دودھ پلانا چھوڑ دیا اور حمل ساکت ہو گیا۔یہ الفاظ

محاورۃً ہوتے ہیں۔ ہمارے ہاں بھی ایسے محاورے ہوتے ہیں۔ عربی زبان میں بھی ہوتے ہیں اور پھر عربی زبان تو محاورے کی زبان ہے۔ اس میں اس قسم کے محاورے ہیں۔ ہمارے ہاں اردو کا محاورہ تو اس وقت میرے ذہن میں نہیں آ رہا البتہ پنجابی میں ہمارے ہاں یہی الفاظ ہیں۔ ہمارے ہاں عورتیں یہ کہا کرتی ہیں اور اب تو پنجابی بولنے والی ہمارے ہاں کی یہ بوڑھی عورتیں بھی نہیں رہیں۔ میری خوش بختی تھی کہ میں نے اس ماں کی آغوش میں پرورش پائی' جس کی زبان ٹھیٹھ پنجابی تھی اور پھر Typical خاص نوعیت کی ٹھیٹھ پنجابی وہاں سے سیکھی۔ ہمارے ہاں یہ چیز تھی' ہمارے ہاں کی عام عورتیں اس کیفیت کو یوں بیان کرتی ہیں: ایہو جئی کہا پے گئی۔ [1] اب میں ''کہا پے گئی'' کا ترجمہ بھی کیا کروں۔ عربی میں تو کر سکتا ہوں اور کسی زبان میں نہیں کر سکتا۔

عربی کی جامعیت کے بعد پنجابی زبان بھی جامع زبان ہے

عزیزانِ من! جذبات کے اظہار کے لیے یہ نہ کہیے کہ میں پنجابی ہوں' اس لیے یہ کہہ رہا ہوں۔ جذبات کے اظہار کے لیے' عربی کے بعد اگر میں نے کسی زبان کو جامع دیکھا ہے تو وہ پنجابی زبان ہے۔ یہ زبان جذبات کے اظہار کے لیے بہترین ذریعہ (Source) ہے۔ ''ایتھے تے ایئی ''کہا پے گئی'' پئی ماواں نے بچیاں نوں وی نئیں پچھیا۔'' [2] یہ بعینہ وہ بات ہے کہ سراسیمگی کا وہ عالم ہوگا جس میں دودھ پلانے والی مائیں' اپنے دودھ پیتے بچوں تک کو بھول جائیں گی اور اس کا انہیں قطعاً احساس نہیں ہوگا۔ دودھ پینے والے بچے کو چھاتی سے الگ کرنا انتہائی سراسیمگی کی بات ہے۔ اِسی طرح خوف اور ہراسانی سے حمل کا ساکت ہو جانا ہے۔ اِس عمل (Process) کی تائید یہ ڈاکٹرز کرتے ہیں جنہوں نے یہ ثابت کیا ہے کہ اعصاب پر اگر پریشانی کا اثر ہو تو اس سے Abortion (اسقاطِ حمل) ہو جاتا ہے۔ اس سراسیمگی' خوف اور ہراسانی سے یہ کیفیت ہوگی اور اس سے آگے ایک اور دلچسپ بات ہے کہ **وَ تَرَی النَّاسَ سُکٰرٰی** (22:2)۔ تم لوگوں کو یوں دیکھو گے جیسے نشے میں لڑکھڑائے جا رہے ہیں' کوئی قدم اپنے مقام پہ ٹک نہیں رہا۔ وہ یوں دکھائی دیں گے جیسے نشے میں مدہوش ہوں۔ یہ ایک انتہائی نشے کے عالم کی کیفیت ہوتی ہے جس میں لڑکھڑاہٹ کی انتہا ہوتی ہے۔ لیکن اس عالم مدہوشی میں حیرت کی بات یہ ہوگی کہ **وَمَا ھُمْ بِسُکٰرٰی** (22:2)۔ انہوں نے نشہ نہیں پیا ہوا ہوگا:

ہے ریاض ایک رندِ مست خرام
نہ پیے اور جھومتا جائے

---

[1] ایک ایسی جان جوکھم کی سی مصیبت و بپتا کی للکار مچ گئی

[2] یہاں تو وہ جان جوکھم کی سی مصیبت و بپتا کی للکار مچی کہ ماؤں نے اپنے بچوں تک کو نہیں پوچھا

عزیزانِ من! یہ تو شاعری تھی۔ جھومنے کی بات نہیں ہے۔ یہاں تو وہ لغزشیں ہیں' وہ لڑکھڑاہٹیں ہیں' جو قدم کو اپنے مقام پہ ٹکنے نہیں دیتیں۔

راہِ حیات میں لغزشیں اور لڑکھڑاہٹیں قدم قدم پر رکاوٹ کا باعث بنتی ہیں

ہاں تو اُس شدید انقلاب کے واقع ہونے کی رو سے تو یوں نظر آئے گا گویا کہ لوگوں نے نشے پیے ہوئے ہیں حالانکہ نشہ نہیں پیا ہوا ہوگا۔ درحقیقت کوئی نشے میں نہیں ہوگا۔ تو سوال یہ ہے کہ یہ کیفیت کس عمل کا نتیجہ ہوگی؟ اس کے لیے کہا کہ **وَلٰكِنَّ عَذَابَ اللّٰهِ شَدِيْدٌ** (22:2)۔ یہ کچھ خدا کے عذاب کی شدت کا نتیجہ ہوگا۔ جب ان کے غلط اعمال کی بنا پر ہلاکت سامانیاں سامنے آئیں گی تو ان کی شدت کا یہ عالم ہوگا کہ کسی کے ہوش وحواس برقرار نہیں رہیں گے۔ صاحب! کیا آپ نے کبھی ان الفاظ اور اس منظر پر غور فرمایا؟ اب اگر ہم اسے قیامت پر اٹھا رکھتے ہیں' تو عزیزانِ من! یہاں ہم پہ اس کا کچھ اثر نہیں پڑتا۔ لیکن یہ تو یہاں اِس دنیا میں انقلاب برپا ہونے کا ایک منظر ہے جو سامنے لایا گیا ہے ورنہ یہ مناظر ایسے نہیں ہیں کہ فی الواقعہ تاریخ میں ہمارے سامنے نہ آئے ہوں۔ تاریخ ایسے مناظر کی شہادت دیتی ہے۔

شکست کا ذلت آمیز انجام: رونے کی بھی اجازت نہ تھی!

عزیزانِ من! نبی اکرم ﷺ کے زمانے کی تاریخ تو قرآن کے اندر بھی محفوظ ہے۔ وہ جو آپ ﷺ کا ان مخالفین قریش کے ساتھ ٹکراؤ ہوا ہے' اس میں یہ تمام کیفیتیں سامنے آگئی تھیں۔ یہ جو قریش کے خلافِ توقع بدر کی پہلی ہی جنگ[1] ہوئی ہے' وہ ایسی ہی جنگ تھی۔ ان قریش کو اس جنگ بدر میں شکست ہوئی۔ اس کے بعد ذرا تاریخ میں پڑھیے کہ مکے میں ان قریش پہ کیا گزری تھی۔ پہلی ہی چیز جو قریش کے سرداروں نے آ کر طے کی تھی' وہ یہ تھی کہ ہمارے جتنے بھی عزیز رشتہ دار اس جنگ میں مر گئے ہیں یا قتل ہو گئے ہیں' ان پر کوئی نوحہ نہیں کیا جائے گا' رویا نہیں جائے گا کیونکہ اس طرح باقی قومیں یہ سمجھیں گی کہ ہمارا واقعی بڑا نقصان ہوا ہے اور ہمیں بڑا غم ہوا ہے۔ اس کا قطعاً

---

[1] جنگ بدر: سترہ رمضان 2ھ (مطابق 13 مارچ 624ء) کی صبح بدر کے میدان میں دو صفیں ایک دوسرے کے سامنے نبرد آزما تھیں۔ ایک طرح نبی اکرم حضرت محمد ﷺ کی معیت میں قدسیوں کی جماعت جس میں جانثاروں کی کل تعداد 313 نفوس پر مشتمل تھی اور بے سروسامانی کا یہ عالم تھا کہ ان کے ساتھ کل دو گھوڑے تھے۔ مقابلہ میں قریش بڑے کروفر اور شان وشوکت سے نکلے تھے' ہزار سپاہیوں کی جمعیت' سو سواروں کا رسالہ' تمام رؤسائے قریش (باستثنائے ابولہب) شریک فوج۔ رسد کا یہ انتظام کہ دس دس اونٹ روزانہ ذبح ہوتے تھے۔ دونوں فوجیں باہم گرگتھم گتھا ہوگئیں۔ تھوڑے ہی عرصہ میں سردارِ لشکر عتبہ بن ربیعہ' اس کے بیٹے ولید اور بھائی شیبہ کی لاشیں میدان میں تھیں۔ ابوجہل کہ جس کی عداوت وسرکشی کی داستانیں ضرب المثل بن چکی تھیں' انصار کے دونو جوان بھائیوں (معوذ اور معاذ) کی تلوار سے پیوست زمین ہوگیا۔ سرداران لشکر کے قتل سے قریش کے حوصلے پست ہوگئے اور انہوں نے ہتھیار ڈال دیئے۔ مسلمانوں میں سے 14 مجاہدین نے شہادت پائی۔ کفار کے قریباً 70 آدمی قتل اور اسی قدر گرفتار ہوئے۔ [پرویزؒ: معراج انسانیت' ادارہ طلوع اسلام' کراچی' 1949' ص: 524 ,516-517]

اظہار نہیں ہوگا۔ اگلی تیاری تک خاموش رہا جائے گا۔ اب اگر اپنے عزیز ترین کی موت پر یہ حکم لگ جائے کہ رویا بھی نہیں جائے گا تو یہ اس شے کا اظہار ہے کہ یہ چیز ان پر بڑی سخت گزری ہے۔ تاریخ میں ایک واقعہ لکھا ہوا ہے کہ اس شکست کے کوئی چھ مہینے بعد ایک سردار نے کہیں سے رونے کی آواز سنی تو اس نے اپنے غلام یا ملازم سے کہا کہ دیکھنا! میرا خیال یہ ہے کہ رونے کی اس بندش کو اٹھا دیا گیا ہے' دیکھ کر آؤ' اور معلوم کر کے مجھے اصل حقیقت سے آگاہ کرو تا کہ میں بھی تو دل بھر کر رو سکوں۔ لہٰذا وہ گیا اور اس نے آ کر کہا کہ جی نہیں' وہ تو فلاں عورت ہے' اس کا ایک اونٹ گم ہو گیا ہے' وہ اس لیے رو رہی ہے۔ اس پر اس نے چار شعر کہے ہیں کہ اے اس قوم کے فیصلہ کرنے والو! اونٹ کی گم گشتگی پر تو رونے کی اجازت ہے لیکن میرے بیٹے کی گم گشتگی پر مجھے رونے کی بھی اجازت نہیں دی جا رہی۔ یہ ہوتا ہے جسے کہتے ہیں: **زلزلة الساعة**' ایک ایسا شدید انقلاب جو ہر شے کو اس کی اپنی جگہ سے ہلا کر رکھ دے۔

صداقت کا معیار دلیل و برہان پر ہوتا ہے

عزیزانِ من! بات تو ان سے بڑی صاف کہی جاتی ہے کہ خدا کے یہ قوانین بالکل صاف' سیدھے اور واضح ہیں لیکن **وَمِنَ النَّاسِ مَنۡ يُّجَادِلُ فِى اللّٰهِ بِغَيۡرِ عِلۡمٍ وَّ يَتَّبِعُ كُلَّ شَيۡطٰنٍ مَّرِيۡدٍ**(22:3)۔ ایسے لوگ بھی ہیں جو بلا علم و بصیرت' اس باب میں یونہی جھگڑے نکالتے رہتے ہیں۔ یہ اس لیے کہ یہ لوگ محض اپنے سرکش جذبات کے پیچھے چلتے رہتے ہیں اور نہیں سمجھتے کہ ان کی یہ روش انہیں کس طرح زندگی کی سعادتوں سے محروم کر دیتی ہے۔ لوگوں کی یہ کیفیت ہے کہ آپ انہیں بلاتے ہیں اور ان سے کہتے ہیں کہ **هَاتُوۡا بُرۡهَانَكُمۡ اِنۡ كُنۡتُمۡ صٰدِقِيۡنَ** (2:111)۔ جذبات سے الگ ہٹ کر علم و بصیرت کی رو سے بات کریں۔ اپنے دعوے کی تائید میں دلائل و براہین پیش کریں۔ میں دلیل اور برہان سے بات کرتا ہوں لہٰذا اگر تم اس کی مخالفت کرتے ہو تو اس کے لیے تم بھی اپنے دلائل پیش کرو۔ آپ دیکھ رہے ہیں کہ افہام و تفہیم کا یہ کتنا معقول طریقہ ہے' کتنا Rational (استدلالی) اور Reasonable (معقولی) طریقہ ہے کہ میں بھی دلیل پیش کرتا ہوں' تم بھی دلیل پیش کرو۔ دھاندلی کا تو کام نہیں ہے۔ لیکن قرآن کہتا ہے کہ ان کی کیفیت یہ ہے کہ نہ ان کے پاس علم ہے' نہ دلیل ہے یہ تو محض **يُجَادِلُ** (22:3)۔ جھگڑا کرتے ہیں اور جھگڑا بھی **بِغَيۡرِ عِلۡمٍ** (22:3)۔ بلا علم و بصیرت۔ اب آپ سوچ لیجیے کہ وہ شخص کہ جس کے پاس علم و دلیل و برہان کچھ بھی نہ ہو اور وہ جھگڑا کیے چلا جائے تو پھر وہ جھگڑا کس قسم کا ہوگا۔ لہٰذا قرآن کہتا ہے کہ آخر یہ لوگ جھگڑا کیوں کرتے ہیں؟ کیا واقعی انکا علم' ان کی دلیل' انہیں اس نتیجے پہ پہنچاتی ہے کہ یہ غلط بات کرتا ہے اور وہ خود صحیح بات کرتے ہیں جبکہ قرآنِ حکیم کا کہنا یہ ہے کہ بات یہ نہیں ہے۔ وہ خالص جذبات پرست ہیں۔ وہ اپنی مفاد پرستیاں چھوڑنا نہیں چاہتے' اس کی وجہ سے جھگڑا کرتے ہیں۔

جھگڑے کی بنیادی وجہ سرکش جذبات اور مفاد پرستی ہوتی ہے

عزیزانِ من! جھگڑے کی بنیاد نہ علم ہے، نہ دلیل ہے اور نہ ہی برہان ہے۔ اسے مجادلہ ❶ تو نہیں بلکہ دھاندلی کہا جائے گا۔ سوال یہ ہے کہ آخر یہ دھاندلی، یہ خواہ مخواہ اکھاڑ پچھاڑ کیوں؟ اس کا جواب دیا کہ اس کی وجہ یہ ہے کہ **بِغَيْرِ عِلْمٍ** (22:3)۔ یہ اپنے سرکش جذبات کا، اپنی مفاد پرستیوں کا، اتباع کرتے ہیں۔ بظاہر یہ نظر آتا ہے کہ اس سے بڑا فائدہ حاصل ہوتا ہے لیکن قرآن نے کہا ہے کہ اس اکھاڑ پچھاڑ پہ ان کی نگاہ نہیں گئی۔ عزیزانِ من! یہاں قرآن نے ایک لفظ لکھ دیا۔ وہ ہے شیطان۔ پہلے تو یہ ہے کہ كُلَّ شَيْطٰنٍ (22:3) یہ ہر مفاد پرستانہ جذبہ، اپنی ہی ہر قسم کی بیباکانہ خواہشیں ہیں جن کا انسان اتباع کرتا ہے۔ سوال یہ ہے کہ انسان ان کا اتباع کیوں کرتا ہے؟ اس لیے کہ خواہشات اور ان مفاد پرستیوں میں اسے اپنا فائدہ نظر آتا ہے، ذہنی لذت ہوتی ہے، قلبی تسکین ملتی ہے، مادی مفادات حاصل ہوتے ہیں۔ بہرحال اِس اتباع سے یہی مقصود ہوتا ہے جبکہ قرآن نے ان تمام چیزوں کے نتائج کو ایک ہی لفظ میں سمو دیا ہے۔ کہا کہ انہیں یہ پتہ نہیں کہ ان کا آخرالامر کیا نتیجہ ہوگا؟ **مَرِيْدٍ** ❷ (22:3) ہے۔ کہا کہ زندگی کی خوشگواریوں سے محرومیاں ہونگی۔ قرآن نے اس ایک لفظ میں یہ ساری بات کہہ دی۔ یہ میم کے زبر کے ساتھ **مَرِيْدٍ** ہے۔ ہمارے ہاں مُرید ہوتے ہیں۔ لفظ تو اس کے لیے مُرید ہی ہوتا ہے۔ عام طور پہ آپ نے ہمارے ہاں پنجابی مُرید کو سنا ہوگا۔ مَرید ہی کیندے نیں، تے گل سچی کیندے ہیگے نیں ❸۔ جی ہاں وہ ہوتے ہی یہی ہیں۔ حضرت صاحب کہتے ہی یہ ہیں کہ یہ جو اللہ نے تمہیں دیا ہے وہ ہمیں دیدو، تمہیں اللہ اور دے گا۔ تو کیا یہ بات ہوئی کہ اللہ تمہیں تو اور دے گا مگر ہمیں نہیں دیگا۔ توں تے سانوں دے، تے تینوں اللہ دے گا۔ تے محرومی تے آپئے ہوگئی۔ اے مَرید ہی ہوندے نیں، مُرید نہیں

---

❶ ابن فارس (المتوفی 395ھ) نے اپنے لغت ''مقاییس اللغۃ'' میں لکھا ہے کہ اَلْجَدَلُ کے بنیادی معنی ہیں ''کسی چیز کا لمبا اور مستحکم ہونا۔ جھگڑے کو جَدَلٌ گفتگو کی درازی کی وجہ سے کہتے ہیں۔'' امام راغب اصفہانی (المتوفی 502ھ) نے اپنے شہرہ آفاق لغت ''المفردات فی غریب القرآن'' میں لکھا ہے کہ اَلْجِدَالُ کے معنی ''ایسی گفتگو کرنے کے ہیں جس میں طرفین ایک دوسرے سے بازی لے جانے اور غلبہ حاصل کرنے کی کوشش کریں اور اس طرح خواہ مخواہ بات کو بڑھاتے چلے جائیں۔ اسے پچھاڑ دینا بھی کہتے ہیں۔''

❷ مُرِيْدٌ کا مادہ ''م ر د'' ہے۔ تاج العروس اور انگریزی میں عربی کے مشہور لغت Lane`s Lexicon کے مطابق شیطان کے معنی ہے: (ا) خدا کی رحمتوں سے دور، زندگی کی خوشگواریوں سے محروم اور (۲) سیدھی راہ چھوڑ کر غلط راستے پر چلنے والا، سرکش اور عبرانی زبان میں شیطان کے معنی رکاوٹیں پیدا کرنے والے کے ہیں۔ سرکش شعلہ صفت اور تخریبی نتائج پیدا کرنے والا۔ مَرَدَ، يَمْرُدُ کے معنی ہیں ''سرکش کرنا، عادی ہو جانا۔'' امام راغب اصفہانی نے اپنے لغت ''المفردات فی غریب القرآن'' میں لکھا ہے کہ یہ لفظ شَجَرَةٌ مَرْدَاءُ سے ماخوذ ہے۔ اس کے معنی ہیں وہ درخت جس کے پتے نہ ہوں۔ ان معانی کے اعتبار سے اس کا مفہوم ہوگا: وہ جو ہر قسم کی بھلائیوں اور خوش گواریوں سے محروم ہو، خیر سے عاری ہو۔

❸ مَرید ہی کہتے ہیں مگر بات سچی، مبنی برصداقت، کہتے ہیں۔

ہوتے ❶۔مُر ید ہوتا ہے جسے آپ ارادت مند ❷ کہتے ہیں اور مَر ید ہوتا ہے جو محروم ہو۔جیہڑا اپلے ہووے اووی دے جاوے تے مَر ید تے ایسے ہی ہویا۔❸ بہر حال یہ تو ایک لفظی بات تھی۔

انسان کی مفاد پرستانہ خواہشوں کا نتیجہ ہمیشہ مایوسی ہوتا ہے

عزیزانِ من! قرآن کہتا ہے: **کُلَّ شَیۡطٰنٍ مَّرِیۡدٍ** (22:3)۔تمام سرکش جذبات کے پیچھے چلنے والے' اپنی ذاتی مفاد پرستانہ خواہشوں کی پیروی کرنے والے' زندگی کی سعادتوں سے محروم رہتے ہیں۔کیا بات ہے قرآن کی! زندگی کے ہر گوشے میں ان کی اپنی ذاتی مفاد پرستانہ خواہشیں ہیں' یہ ان کے پیچھے چلتا ہے اور سمجھتا یہ ہے کہ اس سے بہت کچھ حاصل ہوگا۔یہ نہیں جانتا کہ آخرالامر انکا نتیجہ محرومی ہوگا مَرید❹ ہوگا۔ **کُتِبَ عَلَیۡہِ اَنَّہٗ مَنۡ تَوَلَّاہُ فَاَنَّہٗ یُضِلُّہٗ وَیَہۡدِیۡہِ اِلٰی عَذَابِ السَّعِیۡرِ** (22:4)۔بہرحال' یہ ہمارا قانون ہے کہ جو شخص بھی (وحی خداوندی کے بجائے) اپنے سرکش جذبات یا مفاد پرست رفقاء کا اتباع کرے گا' وہ غلط راستے پر جا پڑے گا جو اسے تباہیوں کے جہنم کی طرف لے جائے گا۔اسے یاد رکھیے کہ یہ کوئی ہنگامی یا وقتی بات نہیں ہے کہ کبھی وہ اس قسم کے جذبات کا اتباع کرتا ہے اور کبھی وہ اُس قسم کے جذبات کا اتباع کرتا ہے۔یہ تو **کُتِبَ** ہے یعنی یہ تو ہمارا ابدی مقرر کیا ہوا قانون ہے کہ جو بھی اپنی بیباکانہ مفاد پرستیوں کی اطاعت کرے گا' انہی کے پیچھے چلے گا' انہیں اقدارِ خداوندی کے ساحلوں کے اندر محدود و محصور نہیں کرے گا' اس کا یہی نتیجہ نکلے گا۔یہ ہمارا اٹل قانون ہے۔یہ **کُتِبَ** ہے۔آپ دیکھیے کہ یہ وہی ہے جسے آپ ''لکھ دیا ہوا'' کہتے ہیں۔میں ''لکھ دیا ہوا'' اس لیے ترجمہ نہیں کیا کرتا کہ اس سے وہ ہمارے ذہن میں قسمت کا لکھا آ جاتا ہے۔کتاب کے معنی ہی ''قانون'' ہوتا ہے' کتب کے معنی ہی ہوتا ہے: ''قانون مقرر کر دینا'' کہا کہ اس کے متعلق ہمارا قانون یہ ہے کہ جو شخص بھی اپنے ذاتی مفاد پرستانہ جذبات ہی کو اپنا نصب العین حیات بنا لے اور انہیں بیباک چھوڑ دے' انہیں وحی خداوندی کے ساحلوں کے اندر محدود نہ رکھے' وہ خود بھی گمراہ ہو جائے گا اور جو شخص بھی ایسوں کے ساتھ اپنی دوستی رکھے گا' رفاقت رکھے گا' ساتھی بنے گا' وہ بھی گمراہ ہو جائے گا' صحیح راستے پہ نہیں چلے گا۔اور انجام کار وہ دونوں اُس راستے پہ جا پڑیں گے جو انہیں تباہیوں اور بربادیوں کے جہنم کی طرف لے جائے گا۔انسانیت کی ساری تاریخ اس پہ گواہ ہے۔

---

❶ تو تو ہمیں دے' تجھے اللہ دے گا۔تو اس طرح محرومی تو خود ہی آ گئی۔یہ مَرید ہی ہوتے ہیں' مُرید نہیں ہوتے۔

❷ معتقد' اعتقاد رکھنے والا۔مطیع

❸ جو کچھ اپنے پاس ہے وہ بھی دے جائے تو اس طرح وہ مَرید (محروم) تو ایسے ہی ہو گیا۔

❹ بھلائیوں اور خوشگواریوں سے محرومی

لفظ بعث کا قرآنی مفہوم

عزیزانِ من! جہاں بھی اور جس قوم نے بھی صحیح خطوط' صحیح اقدارِ خداوندی کو چھوڑا اور اپنی ہی مفاد پرستیوں کا اتباع کیا' آخرالامر وہ تباہیوں اور بربادیوں کے جہنم میں جا گری۔ ساری تاریخ اس پہ شاہد ہے۔ یہ کُتِب ہے۔ اب آگے دو چیزیں آتی ہیں۔قرآن کریم میں ایک لفظ ''بعث'' آیا ہے۔اس کا مادہ ''ب ع ث'' ہے۔اس کے بنیادی معنی ہوتے ہیں ''کسی کے راستے میں جو رکاوٹیں ہوں ان کا دُور کر دینا۔''اس لیے اب ہمارے ہاں کی موجودہ عربی زبان میں یہ لفظ آزادی کے لیے بھی استعمال ہو رہا ہے۔آپ کے ہاں بھی یہ جو عراق کی بعث پارٹی ہے' وہ ''ب ع ث'' ہی ہے۔اس کے معنی ہی آزادی پسند پارٹی ہے۔ بعث کے لفظی معنی یہ ہوتے ہیں۔اب یہ لفظ قرآنِ کریم میں اس دنیا کے لیے بھی آیا ہے اور آخرت کے لیے بھی آیا ہے۔حق کے نظام قائم کرنے والی جماعت کے راستے میں جو رکاوٹیں پیدا کی جاتی ہیں' ان کے ہٹا دینے کا نام بھی بعث ہے۔اور مرنے کے بعد وہ جو حیاتِ نو عطا ہوتی ہے' وہ جو بظاہر اس حیات نو کے راستے میں بھی جو رکاوٹیں نظر آتی ہیں کہ اس مردہ انسان میں زندگی کا کوئی نشان' کوئی آثار ہی نہیں رہا اور یہ کہ یہاں جو واقعی مر گیا ہو' اُسے تو اس دنیا میں دوبارہ زندگی ملتی ہی نہیں' تو اس سے یہ جو تمہارے ذہن میں آتا ہے کہ یہ مردہ ہے' اس کے زندہ ہونے کے راستے میں بے شمار موانع ہیں' ان موانع کو دُور کر کے اُسے جو از سرِ نو زندگی عطا کر دینا ہے' اس کے لیے بھی قرآن میں بعث کا لفظ آیا ہے یعنی یہ لفظ حیات بعد الممات کے لیے بھی آیا ہے۔اور اس دنیا میں مردہ انسان تو ہم کم کہتے ہیں مگر مردہ اقوام تو ہم روز کہتے ہیں۔مردہ اقوام کی آزادی حاصل کرنے کے راستے میں جو موانعات آتے ہیں' ان کا دُور ہو جانا اور اس طرح انہیں حیاتِ نو مل جانا' قرآن میں اس کے لیے بھی لفظ بعث آیا ہے۔ یہ لفظ دونوں ہی معنوں میں آ جائے گا' جیسے الساعۃ اور القیٰمۃ کے الفاظ ہیں جن کے معنی میں نے پہلے عرض کیے ہیں۔ بعث اس دنیا کے لیے بھی ہوگا اور آخرت کے لیے بھی۔اسی طرح یہ بھی ابدی قانون ہے کہ جو بھی اپنے ہی خواہشات کا بیبا کانہ اتباع کرتا ہے' آخر کار اس کا انجام بھی تباہی و بربادی ہوتا ہے۔

مکافاتِ عمل کا مفہوم

عزیزانِ من! اس تباہی و بربادی کی اصل بنیاد یہ ہے کہ اپنی خواہشات کے اتباع کو قانونِ خداوندی کی حدود میں نہ رکھنے والا خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل (Law of Requital) پر ایمان نہیں رکھتا۔مکافاتِ عمل کے معنی یہ ہیں کہ انسان کا ہر کام' حتیٰ کہ قرآن کی رو سے ہر ارادہ' ایک نتیجہ رکھتا ہے اور یہ نتیجہ مرتب ہو کر رہتا ہے۔ وہ نتیجہ اس دنیا میں بھی محسوس شکل میں سامنے آ سکتا ہے اور اگر ایسا نہ ہو' اسمیں لمبا وقفہ پڑنا ہو' وقت زیادہ لینا ہو' اور اس کی موت آ جائے' تو اس سے اس نتیجہ پر کچھ فرق نہیں پڑتا کیونکہ زندگی اسی طرح سے آگے چلتی ہے' اور وہ عمل اس کا نتیجہ پیدا کر کے رہے گا۔ یہ ہے وہ ایمان جسے آپ ایمان بالآخرۃ کہتے ہیں۔اصل میں یہ مکافاتِ عمل پر ایمان

ہے کہ میرے ہر کام نے ایک نتیجہ پیدا کرنا ہے: غلط کام نے میرے لیے تباہ کن نتیجہ پیدا کرنا ہے' صحیح کام نے خوشگوار نتیجہ پیدا کرنا ہے۔ میں ہزار تدبیریں کرلوں کہ غلط کام کے نتیجے سے بچ جاؤں' مثلاً رشوت دے کر' سفارش بہم پہنچا کر' یونہی چھپ چھپا کر' کوئی کام اس طرح کر کے کہ کسی کو پتہ نہ چلے' مگر اس غلط کام کے نتیجہ سے بچ نہیں سکوں گا۔ اگر بالفرض میں سمجھ بھی لوں کہ میں بچ گیا تو وہ اُس کام کے نتیجہ سے اس دنیا کی سزا سے' اس دنیا کی گرفت سے ہی بچنا ہوگا لیکن خدا کے قانونِ مکافاتِ عمل سے نہیں بچ سکتا۔ قرآن کریم میں خدا کہتا ہے کہ تمہارے دل کے ارادے پر بھی ہماری نگاہ ہوتی ہے' وہ بھی نتائج پیدا کرتے ہیں۔ اس نتیجے سے تم بچ نہیں سکتے۔ دل کے ارادے جو ابھی محسوس شکل میں باہر نہ آئے ان پر تو دنیا کی کوئی عدالت بھی اُسے جرم قرار نہیں دیتی۔ آج کسی کے گھر میں بھی بیٹھے ہوئے ہزار سوچتے رہیں' کہ اگر یہ کہیں ادھر چلا جائے تو میں یہ چیز چرا کے چلا جاؤں۔ اتنا آپ گھنٹہ بھر بیٹھے ہوئے بھی کیوں نہ دل ہی دل میں کہتے رہیں موجودہ قانون کی رو سے یہ جرم نہیں ہے' نہ کوئی عدالت اس پہ سزا دے گی' نہ کوئی پولیس والا پکڑے گا' البتہ اگر آپ اس کی گھڑی چرا کے جیب میں ڈال کے باہر چلے گئے تو یہ جرم ہوگا کیونکہ آپ کے ارادے کا عمل میں آنا اسے جرم ثابت کرتا ہے مگر قرآن کہتا ہے کہ دل میں گزرنے والا خیال تک اس قانون کی گرفت میں آجاتا ہے۔ اس لیے انسان کا ارادہ' دل میں گزرنے والا خیال' بذاتِ خود ایک عمل ہے اور اس پر قانونِ مکافاتِ عمل لاگو ہوتا ہے۔

انسان کا ارادہ بذاتِ خود ایک عمل ہے

عزیزانِ من! قانونِ مکافاتِ عمل کی رو سے تو ارادہ بھی خود ایک عمل ہے' وہ بھی نتیجہ پیدا کرتا ہے۔ لہٰذا سوال یہ ہے کہ انسان کس طرح اس کے نتیجے سے بچے؟ آپ اِس دنیا میں تو کسی نہ کسی طرح سے اس محسوس شکل میں نکلنے والے نتیجہ سے بچ سکتے ہیں کیوں کہ یہاں عمل کو پکڑنے والا قانون تو خود انسان کا ہی بنایا ہوا ہوتا ہے۔ اس قانون کی آنکھوں میں دھول جھونک کر تو آپ بچ سکتے ہیں لیکن اس غیر محسوس عمل کے نتیجے سے بچنے کا تو کوئی سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ یہ ہے ایمان بالآخرۃ۔ عمل پہلے سرزد ہوتا ہے' اس کا نتیجہ بعد میں نکلتا ہے۔ یہ ہے آخرت جسے آپ اخروی زندگی بھی کہتے ہیں۔ یہ ایمان ذہن میں رکھیے کہ اس جسم کے مرنے کے بعد کی زندگی ہی اصل زندگی ہے' اور کچھ نہیں۔ اس دنیا کی زندگی تو صرف اس جانچ کے لیے ہے کہ آیا آپ اس زندگی کے حقدار بھی بنتے ہیں۔

عزیزانِ من! بات دراصل دُور نکل جائے گی' وہ کسی اور لیول (سطح) پہ گفتگو کرنے کی بات ہے ورنہ جسے آپ ٹائم یا وقت کہتے ہیں' اس کے متعلق بھی اب جس قدر تحقیق ہوئی ہے وہ یہ ہے کہ جسے ہم آج' آنے والا کل' اور گزرا ہوا کل (Present اور Future اور Past) کہتے ہیں' وہ کچھ شے ہی نہیں ہوتی۔ جب آدمی سو جاتا ہے تو اس کے نزدیک نہ امروز (آج کا دن) رہتا ہے' نہ گزرا ہوا کل یعنی نہ فردا (آنے والا کل) رہتا ہے' نہ Yesterday (گزرا ہوا کل) نہ Present day (آج) نہ Tomorrow (آنے والا کل) ہوتا

ہے۔ خیر' یہ بات اور ہوگئی۔ [1] مگر آج کی تحقیق یہ ہے کہ وقت کے تسلسل میں ''آج اور کل'' کا سوال نہیں ہے۔ یہ تو ساری سمجھنے کی بات ہے کہ زندگی مسلسل چلتی ہے۔ یاد رکھیے! زندگی کا یہ اتنا لمبا دن ہوتا ہے کہ اس میں ''آج اور کل'' کا سوال نہیں ہوتا۔ وہ جو یہاں آنے والی زندگی ہے اُسے سمجھنے کے لیے ہم اُسے ''آخرت کی زندگی'' یا مستقبل کی زندگی یا آنے والی زندگی کہتے ہیں۔ زندگی مسلسل چلتی ہے۔ یہ جوئے مسلسل ہے۔ اُس کا تسلسل (Continuum) ہے۔

قانونِ مکافاتِ عمل کے معنی یہ ہیں کہ انسان کا نظر آنے والا عمل تو رہا ایک طرف' یہاں تو انسان کا ہر ارادہ بھی اپنا نتیجہ مرتب کرتا ہے۔ قرآنِ کریم نے کہا کہ **یَـٰٓأَيُّهَا النَّاسُ** (22:5)۔ اے نوعِ انسان! یہاں خطاب عالمگیر دنیائے انسان کو ہے۔ اب یہاں جو شخص اقدارِ خداوندی کو نظر انداز کر کے محض اپنی مفاد پرستیوں کے پیچھے چلتا ہے' وہ فرد ہو یا قوم ہو' یا نظام ہو' وہ اسی مفروضے یا غلط فہمی کی بنا پہ چلتا ہے کہ میں غلط کاموں کے نتائج سے بچنے کی تدبیریں کرلوں گا تو وہ مجھے بچا لیں گی۔ اگر کسی کو یقین ہو جائے کہ اگر اس نے یہاں گھڑی چرائی اور وہاں جو پولیس والا بیٹھا ہے اُسے پکڑ لے گا تو وہ کبھی نہیں چرائے گا اور جسے معلوم ہو کہ وہ جو باتیں کر رہا ہے' اس نے کہیں ٹیپ ریکارڈر رکھا ہوا ہے' وہ ریکارڈ ہوتی ہیں تو پھر وہ وہاں بھی کوئی سازش کی بات نہیں کرے گا لیکن شرط یہ ہے کہ صرف اسے یہ یقین ہو کہ میں اس سے پکڑا جاؤں گا۔ یہ ہے ایمان بالآخرت' یہ ہے ایمان مکافاتِ عمل۔ اگر اسے اس کا یقین ہے تو انسان غلط روشِ زندگی کو ترک کر دے گا۔

---

[1] اس باب میں انیسویں صدی تک نیوٹن (Newton 1642-1727) کے نظریہ کو غیر متبدل سمجھا جاتا تھا جس کی رو سے زمان (Time) اور مکان (Space) کو تمام کائنات میں یکساں اور مطلق (Uniform and Absolute) قرار دیا جاتا تھا لیکن اس کے بعد آئن سٹائین (Einstein 1879-1955) نے اس نظریہ کو باطل قرار دیا اور اس کی جگہ یہ بتایا کہ مکان اور زمان کی حیثیت مشاہدہ کرنے والی کی پوزیشن کی حیثیت سے اضافی (Relative) ہوتی ہے: ہر مشاہدہ کرنے والے کی کائنات اپنی اپنی ہے۔ دنیائے فکر میں نظریۂ اضافیت (Theory of Relativity) نے کسقدر مقبولیت حاصل کر لی ہے اس کا اندازہ اس سے لگایئے کہ قریب قریب ہر شعبہ علم اس سے متاثر ہو چکا ہے۔ اس سے اتنا ہی تسلیم نہیں کیا گیا کہ زمان و مکان کی حیثیت اضافی ہوتی ہے بلکہ یہ بھی کہ مکان (Space) اور زمان (Time) الگ الگ چیزیں نہیں ہیں۔ اس سے فاصلوں کا تصور صرف ابعاد ثلاثہ (Three Dimensions) سے کیا جاتا تھا یہ ثابت کیا گیا کہ چونکہ طول حرکت کے ساتھ بدلتا جاتا ہے اس لیے ہر ایک پیمائش میں مکانی فاصلہ (Space Distance) کے ساتھ زمان کے وقفہ (Time Interval) کو بھی ملحوظ رکھنا چاہیے۔ اس لیے اب ابعاد ثلاثہ نہیں بلکہ چار ہیں۔ اسی تصور کی رو سے اب ابعاد کا نام (Space-Time Continuum) قرار پا گیا۔ پھر یہ ثابت کیا گیا کہ اجسام کی حرکت مختلف Space Frames (مکانی حالتوں) اور Time-Frames (زمانی حالتوں) میں مختلف ہوتی ہے۔ اس نظریہ کی رو سے نیوٹن کا نظریہ کشش ثقل (Law of Gravity) باطل قرار پا گیا۔ تحققات جدیدہ کی رو سے آج مادی' اجسام روشنی کی لہریں' مربوط حوادث (Inter-Related Events) یا منجمد خیالات (Condensed Thoughts) خیال کیے جانے لگے ہیں جن میں تسلسل (Continuum) ہے اور زندگی مادہ کی پیداوار نہیں۔ اس کا تعلق غیر مرئی عالم (Unseen World) سے ہے۔

عزیزانِ من! جیسا ہمارا روز کا مشاہدہ ہے' جسے پکڑے جانے کا یقین ہو' وہ کبھی جرم نہیں کرتا۔ اسی طرح جسے خدا کے اس قانون پر ایمان ہو کہ ہر برا عمل' خواہ وہ دل میں گزرنے والا خیال ہی کیوں نہ ہو' نتیجہ مرتب کرے گا اور وہ نتیجہ مجھے بھگتنا ہے تو پھر جرم کرنے کا سوال ہی نہیں ہے۔ جرم کرنا تو ایک طرف رہا وہ جرم کا خیال تک بھی دل میں نہیں لائے گا۔ اسی کو تو نفسیاتی تبدیلی کہتے ہیں۔ اور جو کچھ کیا جا رہا ہے اس کے بارے میں کہا کہ **يَـآيُّهَـا الـنَّـاسُ اِنْ كُنتُمْ فِىْ رَيْبٍ مِّنَ الْبَعْثِ** (22:5)۔ اے نوعِ انسان! تم اس قسم کی روش اس لیے اختیار کرتے ہو کہ زندگی بس اسی دنیا کی زندگی ہے' موت سے انسان کا خاتمہ ہو جاتا ہے' اس لیے کامیابی اسی کا نام ہے کہ جس طریق سے بھی ہو سکے' اس دنیا کے زیادہ سے زیادہ مفاد حاصل کر لیے جائیں۔ اِن سے کہو کہ اگر تم مرنے کے بعد کی زندگی کے بارے میں اس لیے شک وشبہات میں ہو کہ ایسا ہونا تمہیں (نظر بظاہر) محال دکھائی دیتا ہے کہ تمہارے اعمال کے نتائج مرتب کرنے میں جو رکاوٹیں حائل ہیں وہ ہٹا دی جائیں گی اور تمہیں از سرِ نو زندگی مل جائے گی تو ذرا اس ایک حقیقت پر غور کرو۔ عزیزانِ من! اب یہ چیز بہت گہرے غور وتفکر کی محتاج ہے۔

قرآنِ حکیم کا اندازِ بیان: ایک بدو کے لیے بھی ہے اور بڑے سے بڑے سائنسدان کیلیے بھی

قرآن تو ایک عام بدو سے بھی گفتگو کرتا ہے اور آئن سٹائن (Allert Einstein: 1879-1955) سے بھی باتیں کرتا ہے۔ وہ محسوس مثالوں کے ذریعے سمجھاتا ہے اور مثالیں ایسی دیتا ہے کہ انہیں عام آدمی بھی سمجھ لے اور بڑے سے بڑا مفکر بھی اس پہ غور کرے۔ یہاں قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ ذرا تم اپنی موجودہ زندگی پہ تو غور کرو' سوچو تو سہی کہ ایک وقت تھا: **لَمْ يَكُنْ شَيْـًٔا مَّذْكُوْرًا** (76:1)۔ جب تم کوئی قابلِ ذکر شے ہی نہیں تھے' کسی شکل میں بھی تمہارا وجود نہیں تھا' تم ایسی کوئی شے ہی نہیں تھے جو از خود موجود ہوتی۔ کیا یہ بات تمہارے ذہن میں آئی؟ فرمایا کہ جاؤ اور بڑے بڑے سائنسدانوں سے پوچھو کہ آیا یہ بات ٹھیک ہے۔ اس وقت تم تو ایک طرف رہے' اس کائنات کا بھی وجود نہیں تھا۔ زندگی' جسے آپ لائف کہتے ہیں' کا بھی وجود نہیں تھا۔ کہا کہ ان سے پوچھ لو کہ کیا یہ بات صحیح ہے یا نہیں؟ تمہیں اس پہ تو کبھی تعجب نہیں آتا کہ تم پر کبھی ایک وقت ایسا بھی گزرا ہے جب تم کوئی ایسی شے نہ تھے جو از خود موجود ہوتی ہے' اس وقت تو تم موجود ہی نہیں تھے۔ آج تم اس طرح سامنے کھڑے ہوئے ہو: ایک بنے بنائے ہوئے انسان' چلتے پھرتے' اپنے آپ کو ''میں'' کہنے والے۔ اس پر تو تمہیں تعجب نہیں آتا۔ تمہیں اس پہ تعجب آتا ہے کہ اگر اس بنے بنائے انسان' اگر اس میں سانس نہیں رہے گا' تو پھر دوبارہ سانس کیسے آئے گا؟ یعنی اس پہ تمہیں بڑا تعجب آتا ہے۔ اس پہ کیوں تعجب نہیں آتا کہ ایک وقت وہ بھی تھا جب تم تھے ہی نہیں اور آج موجود ہو۔ سوچیے' عزیزانِ من! بات دراصل یہ نہیں کہ تمہیں تعجب آتا ہے۔ سچ یہ ہے کہ اسے ماننے کو جی ہی نہیں چاہتا۔ **اِنْ كُنْتُمْ فِىْ رَيْبٍ مِّنَ الْبَعْثِ فَاِنَّا خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ تُرَابٍ** (22:5)۔ اگر تم مرنے کے بعد کی زندگی (بعث) کے بارے میں شک وشبہات میں ہو کہ ایسا ہونا تمہیں (نظر بظاہر) مشکل دکھائی دیتا ہے تو ذرا اس حقیقت پر غور کرو کہ ہم نے تمہاری پیدائش کی ابتدا بے جان

مادہ (Inorganic Matter) سے کی۔ اس طرح ذرا اپنی ابتدا تو ملاحظہ فرمائیے۔ یہ جتنے تمہارے ہاں کے ریسرچ اسکالرز (علمائے تحقیق) اور 'سائنٹسٹ' (سائنسدان) ہیں' ان سے پوچھیے۔ وہ کہیں گے کہ اِس کائنات کا تو پتہ نہیں' مگر جب یہ کرہ ارض وجود میں آیا تو اس کی ابتداء ایک Inanimate Matter ❶ (بے جان مادہ) کی تھی' یعنی ایک ایسے مادے کی جس میں زندگی نہیں تھی۔ بات بھی یہی ہے۔ اور یہ تمہارے ہاں بھی مشہور ہے کہ انسان کو مٹی سے پیدا کیا۔ تم اسے مانتے ہو۔ تم روزمرہ کی بات کرتے ہو تو مٹی میں تو زندگی نہیں ہوتی۔ بڑے سے بڑے ریسرچ اسکالر (محقق) سے پوچھیے۔ وہ بھی کہے گا کہ ابتدا میں جو کرہ ارض تھا وہ ایسا ہی مادہ تھا جو ذی حیات نہیں تھا' اس میں لائف (زندگی) نہیں تھی۔ عزیزانِ من! وہاں سے بات شروع ہوئی۔ میں اس وقت قرآن کی یہ کڑیاں بیان نہیں کر رہا۔ سوال یہ ہے کہ بے جان مادے میں زندگی کی نمود کیسے ہوئی؟ اس کا اولیں جرثومہ یعنی لائف سیل کیسے بنا؟ قرآن ان تمام کڑیوں کو دوسری جگہ بیان کرتا ہے' اس مقام پہ انہیں درمیان میں چھوڑ دیتا ہے کہ یہ عام آدمی کے سمجھنے کی بات نہیں تھی۔ یہاں کہا کہ یہ تو تم بھی کہتے ہو کہ **خَلَقْنٰكُمْ مِّنْ تُرَابٍ** (22:5)۔ تمہیں تراب ❷ سے پیدا کیا۔ یہ تم بھی مانتے ہو کہ انسان کو مٹی سے پیدا کیا' انسان مٹی کا پتلا تھا۔ پھر کاروانِ حیات مختلف منازل طے کرتا اُس منزل میں آ پہنچا جہاں **ثُمَّ مِنْ نُّطْفَةٍ** (22:5)۔ افزائش نسل بذریعہ تولید (Procreation) ہوتی ہے یعنی پھر اس کے بعد تم دیکھتے ہو کہ مرد اور عورت کے اختلاط سے' رحمِ مادر میں حمل قرار پاتا ہے۔ **ثُمَّ مِنْ عَلَقَةٍ ثُمَّ مِنْ مُّضْغَةٍ مُّخَلَّقَةٍ وَّغَيْرِ مُخَلَّقَةٍ** (22:5)۔ پھر وہ ایک جونک کی سی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ پھر متشکل اور غیر متشکل گوشت کے ایک ٹکڑے میں تبدیل ہو جاتا ہے۔

رحمِ مادر میں ایک جرثومہ سے لے کر انسان کی پرورش تک کے مراحل

عزیزانِ من! رحمِ مادر میں جنین عجیب عجیب ہیئت بدلتا ہے۔ گیہوں کی سی شکل ہے' پھر گوشت کے لوتھڑے ❸ (مُضْغَةً) کی متشکل

---

❶ پرویزؒ نے مفہوم القرآن کے صفحہ 751 کے فٹ نوٹ پر اس بے جان مادہ کو Inorganic Matter بھی کہا ہے۔ بہرحال یہ تھا تو غیر نامیاتی مادہ ہی' جس میں زندگی نہیں تھی۔

❷ اَلتَّرْبُ' اَلتُّرْبُ مٹی کو کہتے ہیں۔ اس کی جمع اَتْرِبَةٌ اور تِرْبَانٌ آتی ہے اور تاج العروس کے مطابق مَتْرَبَةٌ کے معنی ''مسکنت' افلاس' فاقہ'' ہیں اور ذَا مَتْرَبَةٍ (90:16) کے معنی ''خاک آلود' حاجت مند' مصیبت زدہ'' ہیں۔ تاج العروس ہی کے مطابق عُرُبًا اَتْرَابًا (56:37) کے معنی ہیں ''ایسے ساتھی جو عادات و اطوار میں ایک دوسرے سے مماثل ہوں' ملتے جلتے ہوں یعنی ہم گل' ہم مزاج' ہم خیال''۔

❸ مُضْغَةٍ (گوشت کے لوتھڑے) کی دو صورتیں (Form) ہوتی ہیں: (۱) مُخَلَّقَةٍ اور (۲) غَيْرِ مُخَلَّقَةٍ۔ عربی لغت محیط المحیط کے مطابق مخلق کے معنی ہیں: مکمل شدہ' متشکل یا ہموار کیا ہوا اور بمطابق مقاییس اللغۃ وہ جسے سدھا کر ٹھیک کر دیا گیا ہو اور غَيْرِ مُخَلَّقَةٍ وہ جو نا تمام ہو' غیر متشکل ہو۔ اس لیے اس کا مطلب ہے کہ مُضْغَةٍ یا تو پورا بچہ بن جاتا ہے اور یا نا تمام رہ کر گر جاتا ہے۔

اور غیر متشکل فارم میں تبدیل ہو جاتا ہے: سوال یہ ہے کہ یہ ساری تبدیلیاں کس مقصد کے لیے آتی ہیں؟ عزیزانِ من! کیا کہوں ترجمے سے کچھ بھی نہیں بیان کیا جاسکتا۔ اس کے فوراً بعد کہا کہ **لِّنُبَيِّنَ لَكُمْ** (22:5)۔ اس کا عام ترجمہ یہ ملے گا'' تاکہ خدا تمہیں کھول کر بیان کرے۔'' اس سے اس کا واضح مفہوم سمجھ میں نہیں آتا۔ اس کے معنی ہوتے ہیں'' جو چیز غیر محسوس ہو' کہیں چھپی ہوئی ہو' اس کو ظاہر کر دینا' نمایاں کر دینا' غیر محسوس شکل سے محسوس شکل میں سامنے لے آنا''۔ اس طرح یہاں کہا کہ وہ جو اولیں جرثومہ حیات ہے یعنی That First Crystal یا Life Cell ہے' وہ اولین جرثومۂ حیات خوردبین سے بھی نظر نہیں آتا۔ وہ اتنا باریک ہوتا ہے لیکن اس کے اندر یہ پورے کا پورا انسان اپنی ان تمام صلاحیتوں کے ساتھ چھپا ہوا بیٹھا ہوتا ہے۔ کہا کہ یہ ساری تبدیلیاں رحمِ مادر میں اس لیے ہوئیں کہ وہ جو مضمر اور چھپی ہوئی صلاحیتیں (Potentialities) تھیں' نمایاں ہو کے سامنے آجائیں۔ یہ ان مراحل میں سے اس لیے گزرتا ہے کہ نطفہ میں جس قدر مضمر (چھپے ہوئے' خوابیدہ) امکانات (Possibilities) موجود تھے' وہ بتدریج (Step by Step) نشوونما پاتے ہوئے ظہور میں آجائیں۔ یہ ہے **لِّنُبَيِّنَ لَكُمْ** (22:5)۔ اس میں ''ل'' صرف فائدہ کے لیے ہے۔ اسے ل نافع کہتے ہیں۔ کہا کہ ان امکاناتِ مضمر کا نشوونما پا کر' ظہور میں آجانا' تمہارے فائدے کے لیے ہے' یہ تمہارے حق میں تھا کہ وہ جو ایک جرثومے کے اندر چھپی ہوئی صلاحیتوں والا ایک انسان بیٹھا تھا وہ محسوس شکل میں سامنے آجائے:

کبھی اے حقیقتِ منتظر! نظر آ لباسِ مجاز میں ❶ (اقبال رحمہ اللہ)

ایک غیر مرئی چیز کا لباسِ مجاز میں نمودار ہونا

عزیزانِ من! حقیقت غیر مرئی ہوتی ہے' Invisible (نظر نہ آنے والی) ہوتی ہے' اس کا لباسِ مجاز میں آنے کا مطلب' اس کا نمود میں آنا ہوتا ہے تاکہ اس کی چھپی ہوئی صلاحیتیں نمود میں آجائیں۔ یہی حالت انسان کی ہے۔ یہاں کہا کہ اس لیے یہ تبدیلیاں تمہارے اندر ہی اندر ہو رہی تھیں۔ اس پہ تو تمہیں تعجب نہیں ہوتا۔ اس کے بعد قرآنِ کریم نے کہا کہ **وَنُقِرُّ فِي الْأَرْحَامِ مَا نَشَاءُ إِلَىٰ أَجَلٍ مُّسَمًّى** (22:5)۔ وہ جنین ہمارے قانونِ مشیت کے مطابق' کچھ وقت کے لیے رحم کے اندر رہتا ہے۔ اسے یوں سمجھو کہ پھر اس جنین کو رحم کے اندر ایک وقتِ معین کے لیے رکھا جاتا ہے۔ **ثُمَّ نُخْرِجُكُمْ طِفْلًا** (22:5)۔ پھر تم ایک جیتے جاگتے بچے کی شکل میں دنیا میں آجاتے ہو' بالکل ایک بچے کی طرح نرم و نازک۔ آپ بچے میں دیکھیے کہ اس کی شکل و ہیئت تو انسان کی ہو گئی ہوتی ہے مگر ابھی انسانی صلاحیتیں اس کے اندر مضمر ہوتی ہیں' وہ تو بولنا بھی نہیں جانتا' ان چیزوں کا علم بھی نہیں رکھتا۔ اسے ایک طفل کی حیثیت سے

---

❶ کبھی اے حقیقتِ منتظر! نظر آ لباسِ مجاز میں — کہ ہزاروں سجدے تڑپ رہے ہیں مری جبینِ نیاز میں
(اقبال: بانگِ درا' نیشنل بک فاؤنڈیشن' اسلام آباد' 1996ء ص 294)

پیدا کیا ہے۔ **ثُمَّ لِتَبْلُغُوْٓا اَشُدَّكُمْ** (22:5)۔پھر تم آہستہ آہستہ اپنی جوانی کی عمر تک پہنچتے ہو۔ **وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّتَوَفّٰى** (22:5)۔تم میں بعض جوانی کے عالم میں ہی انتقال کر جاتے ہیں یعنی بعض کی قبل از وقت ہی وفات ہو جاتی ہے۔ **وَمِنْكُمْ مَّنْ يُّرَدُّ اِلٰٓى اَرْذَلِ الْعُمُرِ** (22:5)۔اور بعض بوڑھے ہو کر، عمر کی نکمی حالت کی طرف لوٹ جاتے ہیں۔عزیزانِ من! اسے یوں سمجھو کہ تم میں سے بعض ایسے ہیں جو بڑھاپے کی عمر تک پہنچتے ہیں جو عمر کی نکمی حالت ہے۔بڑھاپے کی عمر میں جا کر کیا ہوتا ہے؟ کہا کہ یہ طبعی زندگی ہے۔بڑھاپے کی عمر میں تو کیفیت یہ ہوتی ہے کہ **لِكَيْلَا يَعْلَمَ مِنْۢ بَعْدِ عِلْمٍ شَيْـًٔا** (22:5)۔انسان سمجھ بوجھ حاصل کرنے کے بعد، پھر بے سمجھی کی طرف چلا جاتا ہے۔زندگی کے ابتدائی وقت میں جو علم حاصل کیا تھا، معلومات حاصل کی تھیں، بڑھاپے میں آ کے حافظہ اتنا کمزور ہو جاتا ہے کہ وہ علم بھی جاتا رہتا ہے۔یہ تغیر و تبدل تمہارے سامنے ہوتے چلے جاتے ہیں۔

ماں باپ کی اطاعت فرض نہیں، ان کے ساتھ حسنِ سلوک کا حکم ہے

عزیزانِ من! ضمناً یہ عرض کر دوں کہ یہ جو کہا جاتا ہے کہ جوان لڑکوں پر ساری عمر ماں باپ کی اطاعت فرض ہے قرآن میں یہ بات کہیں نہیں آئی اور اس بات کی تردید موجود ہے کہ جس بڑھاپے کی عمر میں خدا کہتا ہے کہ جو کچھ انہیں پہلے آتا تھا، یہ وہ بھی بھول گئے تو اس عالم میں کیا آپ سمجھتے ہیں کہ ان کے فیصلے اُن پر وارد ہوتے رہیں یا واجب ہو جائیں یا اُن پر ان کی اطاعت فرض ہو جائے جن کی صلاحیتوں کی نمود تو ابھی بڑھتی ہے، جن کی صلاحیتیں پھولتی پھلتی ہیں، شباب کے عالم میں ہیں۔صلاحیتوں کے شباب کے عالم والے کیلیے بڑھاپے کے فیصلوں کی اطاعت فرض قرار دینا، کسی کے مذہب میں تو ہو سکتا تھا لیکن ابراہیم خلیل اللہ کی سیرت میں یہ نہیں ہو سکتا تھا۔یہ وہ ابراہیم، خلیل اللہ ہیں جس نے اپنے باپ کو کہہ دیا تھا کہ اے باپ! یہ کیا کر رہے ہو، اپنے ہی ہاتھ سے مورتی بناتے ہو، پھر اس کے سامنے جھک جاتے ہو، تمہیں اتنی بھی سمجھ نہیں ہے۔

پانی کے چند چھینٹے مردہ زمین کو حیات تازہ عطا کر دیتے ہیں

عزیزانِ من! ہاں تو بات ہو رہی تھی کہ یہ تو خود تمہارے اپنے تخلیقی مراحل کی مثال ہے۔اس کے بعد تم اپنے سے باہر کی دنیا کی طرف دیکھو۔تمہیں اس پر تعجب ہو رہا ہے کہ مردہ قوم کیسے زندہ ہو جائے گی؟ تم بدر کے میدان [1] کو ذہن میں لاؤ۔ایک طرف [1] 320 کے قریب ناتواں، ضعیف جن کے پاس ساز و سامان بھی نہیں ہے، جو اپنے گھروں سے نکال دیئے گئے ہیں۔تم یہ سمجھ رہے ہو کہ انہیں یہ شوکت، ثروت، حشمت اور زندگی کیسے ملے گی اور پھر تم یہ سمجھتے ہو کہ جو یہاں مرجاتا ہے اس کو حیاتِ تازہ کیسے مل جائے گی؟ سو اس کے

---

[1] یہ اشارہ جنگ بدر کی طرف ہے۔

لیےتم ایک مثال دیکھو: **وَ تَرَى الْأَرْضَ هَامِدَةً** (22:5)۔اس بنجر زمین کی حالت پر غور کرو کہ وہ کس طرح خشک اور ویران (ہامدۃ)[1] پڑی ہوتی ہے۔اُس میں زندگی اور نمو کا نشان تک دکھائی نہیں دیتا۔زندگی کی کوئی نشانی یا علامت تک اس میں نہیں ہوتی۔یہ بالکل مردہ زمین ہوتی ہے۔ **فَإِذَآ أَنزَلْنَا عَلَيْهَا الْمَآءَ اهْتَزَّتْ وَرَبَتْ وَ أَنۢبَتَتْ مِن كُلِّ زَوْجٍۭ بَهِيجٍ** (22:5)۔پھر جب ہم اس پر بارش برساتے ہیں' تو وہ اچانک لہلہانے لگتی ہے اور اس کی روئیدگی روز بروز ابھرتی چلی جاتی ہے۔اس طرح (اس زمین مردہ سے) خوش نما مناظر کی ایک دنیا ظہور میں آ جاتی ہے۔دوسرے الفاظ میں اسے یوں سمجھو کہ آسمان سے پانی کا ایک چھینٹا پڑتا ہے تو لہلہاتے پھول' سبزیاں ترکاریاں' اور درختوں کی نمود ہو جاتی ہے' ہر طرف روئیدگی نکل آتی ہے۔پانی کے چھینٹے پڑنے سے پیشتر ساری زمین کو کھود کر دیکھو' کیا نیچے کہیں مداری کے تھیلے کی طرح یہ چھپے ہوئے رکھے تھے کہ ہم نے یوں جھرلو پھیرا' اور اس کے بعد کہا: نکل آ مداریہ! اور وہ مداری نکل آیا۔کہا کہ یہ کچھ کہیں نیچے تھا ہی نہیں۔یہ جو اوپر سے پانی برسا ہے' اُس کے قطروں کو لے کر Analysis (تجزیہ) کر کے دیکھو' کہیں ان کے اندر بھی یہ آم اور سنگترے اور کھجوریں اور یہ پھل اور پھول لگے ہوئے نہیں ہیں' اِس زمین مردہ میں یہ کہیں بھی نہیں' ہیں۔کہا: یہ کچھ ہر روز تمہارے سامنے ہوتا ہے تو اس قسم کی مردہ زمین پہ اگر ایک چھینٹا آسمانی حیات آور پانی کا پڑتا ہے تو یہ ساری چیزیں جو مضمر حالت میں اس زمین کے اندر موجود تھیں' جو اس طرح اس زمین کے اندر Latent (مخفی) تھیں بس اتنا ہی ہوا ہے کہ آسمانی حیات آور پانی سے ان کی نمود ہو گئی ہے۔

اقدار سماوی مردہ قوموں کو حیاتِ نو عطا کر دیتی ہیں

عزیزانِ من! یہاں یہ بتایا ہے کہ ہمارا ایک قانون ہے' اس کے تابع' جو چیز مضمر ہوتی ہے' وہ مشہود ہو جاتی ہے۔پہلے وہ چیز Potential Form (مخفی صورت) میں ہوتی ہے پھر وہ ظاہر ہو جاتی ہے۔یہ کچھ ہر روز تمہارے سامنے ہوتا ہے۔اگر آسمان سے آئے ہوئے پانی کے چند قطروں سے زمینِ مردہ کو حیاتِ تازہ مل جاتی ہے' تو جو مردہ قوم اپنی تمدنی زندگی کو آسمانی اقدار کے تابع لے آئے' تو کیا تم یہ کہتے ہو کہ اس میں زندگی پیدا نہیں ہو سکتی اور کیا تم یہ کہتے ہو کہ جس جسم میں سانس باقی نہ رہے یا اس کی ہڈیاں گل سڑ جائیں تو اس میں حیاتِ تازہ نہیں آ سکتی؟ کیا تم یہ نہیں سمجھتے کہ مردہ زمین سے زیادہ مردہ تو قوم نہیں ہوتی؟ اس لیے یاد رکھو! جس طرح بارش سے زمین مردہ لہلہا اٹھی ہے' اسے حیاتِ نو مل جاتی ہے' اسی طرح اقدارِ سماوی (Cosmic Values) یعنی اقدارِ خداوندی مردہ اقوام کو حیاتِ نو عطا کر دیتی ہیں۔

---

[1] اَلْهُمُوْدُ۔آگ کا بجھ جانا۔تاج العروس میں ہے کہ اَلْهُمُوْدُ فِی الْاَرْضِ کے معنی ہیں: ''زمین میں زندگی کا باقی نہ رہنا یعنی نہ اس میں درخت و سبزہ ہو' نہ اس پر بارش برسی ہو۔'' خشک اور ویران۔

وحی کسی انسان کے اندر سے باہر نہیں آتی بلکہ یہ اوپر سے نازل ہوتی ہے

عزیزانِ من! ہم نے ابھی ابھی آسمانی حیات آور پانی کا ذکر کیا ہے۔ یہ جو سماء [1] کا لفظ ہے' یہ ہے اصل چیز۔ پانی کے لیے بھی ہمیشہ اس نے یہی کہا ہے کہ یہ آسمان کی بلندیوں سے آتا ہے اور وحی کے متعلق بھی یہی چیز ہے کہ یہ اوپر سے آنے والی چیز ہے۔ جسے ہم انسان کے اندر سے باہر آنے والی چیز کہتے ہیں یہ وہ نہیں ہے۔ یہ خارج سے آنے والی چیز ہے۔ آنسوؤں سے زمینِ مردہ کو حیاتِ تازہ نہیں ملتی' آسمان کے پانی سے ہی ملتی ہے۔ یہاں قرآن نے کہا ہے: **ذٰلِکَ** (22:6)۔ یہ سب اس لیے ہوجاتا ہے کہ **بِاَنَّ اللّٰہَ ھُوَ الْحَقُّ** (22:6)۔ خدا کی ہستی ایک حقیقتِ ثابتہ (Established Fact) ہے اور اس کا قانون ہمیشہ ٹھوس تعمیری نتائج مرتب کرتا ہے۔ اسے یوں سمجھو کہ وہ ایک Absolute Reality (حقیقتِ مطلق) ہے۔ جسے تم خدا کہتے ہو یا اس کا قانون کہتے ہو' وہ افسانے نہیں ہیں' وہ ذہنی اور خیالی بات نہیں ہے۔ وہ الحق ہوتی ہے جو باہر کی دنیا میں' محسوس شکل میں' Reality (حقیقت) کی حیثیت اختیار کرے۔ ذہنی اور قیاسی بات کو عرب کبھی حق نہیں کہتے تھے۔ یہ قوم کس بلا کی تھی! حقیقت کے لیے اس کا محسوس ہونا ضروری تھا' جس کے لیے وہ کہتے تھے کہ وہ چیز حقیقت بن کے سامنے آ گئی۔ وہ الحق کہتے ہی اس وقت تھے جب وہ شے محسوس شکل میں سامنے آ جائے۔ جو کچھ ذہنی طور پر' نظری طور پر' Academically یا Theoretically' (نظری طور پر) Abstract (غیر محسوس) طور پر' آپ کے ذہن میں ہے' جب وہ محسوس شکل میں سامنے آتی ہے تو اس وقت وہ اسے حق کہتے تھے۔ پھر وہ اٹل چیز کو حق کہتے تھے' جس میں تغیر نہ ہو' وہ اپنے مقام پہ اٹل کھڑی رہے اور جو اس کے ساتھ لگا ہے' اس میں حالات کے مطابق جنبش ہو' حرکت و تغیر ہوتا رہے۔ یہ عجیب چیز ہے۔

الحق کا نظام ثبات اور تغیر کے امتزاج سے ہی مربوط ہوتا ہے

عزیزانِ من! میں اس قوم کی کیفیت کا کیا عرض کروں! حق کے یہ معنی بھی ہیں کہ جو اپنے مقام پہ اٹل کھڑی رہے مگر جو کچھ اس کے

---

[1] امام راغب اصفہانی نے اپنی مشہور تصنیف ''المفردات فی غریب القرآن'' میں لکھا ہے کہ ''ہر چیز اپنے سے نچلی چیز کی نسبت سے سماءٌ کہلاتی ہے اور اپنے سے اوپر کی چیز کی نسبت سے ارض کہلاتی ہے۔'' نیز بادل اور بارش کو بھی سماء کہتے ہیں۔ تاج العروس نیز ابن قتیبہ القرطین جلد دوم صفحہ 28 پر لکھا ہے کہ پودے اور سبزے کو بھی سماء کہتے ہیں کیونکہ وہ زمین سے اونچا ہوتا ہے۔ پرویزؒ نے اپنی لغات القرآن جلد دوم صفحہ 904 پر لکھا ہے کہ ارض وسماء کے معنی پستیاں اور بلندیاں ہیں۔ جب ارض کو سماء کے مقابل لایا جائے گا تو سماء سے مفہوم ''کائناتی زندگی اور اس کا نظام ہوگا۔'' اور ارض سے مراد انسان کی معاشرتی' معاشی اور تمدنی زندگی۔'' نیز سماء یا سمٰوٰت سے مراد محض اجرام فلکی ہی نہیں ہوں گے بلکہ فضا کی بلندیوں میں پھیلی ہوئی تمام توانائیاں مثل ایتھر اور ایٹم وغیرہ بھی ہوں گے۔ یعنی فضا مع اپنے مشمولات کے۔ قرآنِ کریم میں جہاں جہاں ارض وسماء کے الفاظ آئے ہیں سیاق وسباق پر غور کرنے سے بآسانی سمجھ میں آ جائے گا کہ اس جگہ سماء میں بلندی کا پہلو ہے اور ارض میں پستی۔ خواہ وہ محسوس اشیاء میں ہو خواہ منصب اور مرتبہ کے لحاظ سے اور خواہ کائناتی قوانین کے مقابلہ میں انسان کی معاشرتی زندگی ہو جسے اس نے اپنی مفاد پرستی میں ڈھال رکھا ہے۔

ساتھ لگا ہے انہیں حالات کے مطابق حرکت وتغیر ہوتا رہے''۔ میں نے پہلے بھی بتایا تھا کہ اب جو ہمارے دروازے ہیں ان میں ساکٹ لگے ہوئے ہوتے ہیں' قبضے لگے ہوئے ہوتے ہیں جس سے وہ دروازے یوں گھومتے ہیں۔ پرانے زمانے کے جو دروازے ہوتے تھے انہیں شاید آپ نے پرانے گھروں میں دیکھا ہو۔ گاؤں میں پہلے بھی ہوتے تھے۔ ان میں ہوتا یہ تھا کہ دروازوں کی اوپر اور نیچے کی ایک ایک چول ہوتی تھی اور ایک چوکھٹ ہوتی تھی۔ وہ چول اس چوکھٹ کے اندر یوں ٹکی ہوئی ہوتی تھی کہ دروازہ اس کے اندر حرکت کرتا تھا۔ ضرورت کے وقت بند کیا' ضرورت کے وقت کھول دیا۔ یہ حرکت کرتا تھا۔ اور یہ جو اندر نیچے چوکھٹ ہوتی تھی وہ اپنی جگہ جمی ہوئی ہوتی تھی۔ چوکھٹ گر جائے تو دروازہ نیچے آ گرتا تھا۔ اس قسم کی چوکھٹ' جو اپنے مقام پہ غیر متبدل ہو' ہلے نہیں' جمی رہے' لیکن حالات کے تقاضے کے مطابق آپ اس میں جو دروازہ فٹ کریں' وہ جامد نہ ہو' وہ آپ کی ضرورت کے مطابق ہلتا رہے' حرکت کرتا رہے' بند ہوتا رہے' کھلا رہے۔ اگر دروازہ جامد ہو جائے تو عزیزانِ من! وہ دروازہ ہی نہیں رہتا۔ اگر کھلا ہے تو بند نہ ہوا اور اگر بند ہے تو کھلے نہیں تو وہ دیوار ہو گیا۔ اس طرح دروازے کے کارآمد ہونے کیلیے دو چیزیں ضروری ہیں۔ ایک تو یہ کہ چوکھٹ ایسی ہو کہ جس کے اندر وہ دروازہ جما ہوا رکھا ہو' اور دوسرے یہ کہ وہ دروازہ منجمد نہ ہو جائے' جامد نہ ہو جائے' اس میں حرکت ہو۔ یہ ہے' عزیزانِ من! نظامِ خداوندی۔ خدا کی دی ہوئی غیر متبدل اقدار کی ساکٹ کے اندر آپ کی تمدنی زندگی کے دروازے کا پٹ' وہ اپنے مقام پر غیر متبدل رہے گا' ضرورت کے مطابق اس میں حرکت ہوتی رہے گی' جیسی آپ کی ضرورت ہو۔ رات کو بند کرنے کی ضرورت ہے بند کر دیجئے' صبح کھولنے کی ضرورت ہے کھول دیجئے' آدھا کھول دیجئے' چوتھائی کھول لیجئے' پورا بند کر لیجئے۔ یہ تو متحرک رہے گا۔ یہ اپنے مقام پہ غیر متبدل رہے گا۔ ثبات اور تغیر کے اس حسین امتزاج سے جو نظام قائم ہوتا ہے' وہ نظام الحق پر مبنی ہوتا ہے۔ یہ الحق سمجھانے کے لیے ساری مثالیں تھیں۔

الحق ہمیشہ محسوس نتائج پیدا کرتا ہے

عزیزانِ من! یہاں کہا کہ یہ کچھ کیوں ہوتا ہے؟ قرآن کریم کے الفاظ ہیں **ذٰلِکَ** (22:6)۔ یہ اس لیے ہوتا ہے کہ **بِاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ** (22:6)۔ اس کے قوانین حق ہیں' محسوس نتائج پیدا کرتے ہیں' غیر متبدل ہیں لیکن انسان کی زندگی کے تقاضوں کے مطابق جو نمود ہوتی ہے' اس میں تغیر وتبدل ہوتا چلا جاتا ہے۔ حق کے معنی یہ ہیں۔ اب اسی تصور کو دوسری مثال سے سمجھیے۔ قرآن میں مشاورت کا حکم ہے۔ حضورِ نبی اکرم ﷺ کے زمانے میں مشاورت کا ایک طریق تھا۔ آج ہمارے دَور کے حالات کے تقاضے کچھ اور ہیں۔ مشاورت کے طریق بدل جائیں گے۔ حق اپنی جگہ قائم رہے گا یعنی مشاورت رہے گی۔ دروازے کا جو پٹ ہے وہ کھلا بند ہوتا رہے گا۔ کہا کہ یہ اس لیے ہے کہ وہ الحق ہے۔ اور دوسری بات یہ ہے کہ **وَاَنَّهٗ يُحْيِ الْمَوْتٰى** (22:6)۔ اور یہ اس لیے ہے کہ جسے تم مردہ کہتے ہو' وہ اس کو بھی زندگی عطا کر سکتا ہے کیونکہ زندگی الحق ہے' خدا کی عطا کردہ ہے۔ اس کی نمود کے پیکر بدلتے ہیں۔ کبھی وہ اولیں

جرثومہ ہوتا ہے۔ The First Life Cell (اولین جرثومہٗ زندگی) جسے Naked Eye (خالی آنکھ) دیکھ بھی نہیں سکتی اور وہی نشو ونما پا کے اِن تمام رعنائیوں اور صلاحیتوں کا پیکر انسان سامنے آ جاتا ہے۔

زندگی مختلف پیکر بدلتی ہوئی ہر آن نئی نئی منازل طے کرتی رہتی ہے

عزیزانِ من! لائف (زندگی) کبھی اس طرح متحرک سامنے آتی ہے، کبھی آگے بڑھتی Potential Form (مخفی صورت) کے اندر چلی جاتی ہے۔ فرق تو تمہاری نگاہوں کا ہے۔ الحق تو اپنے مقام پہ قائم ہے۔ اور اگلی بات یہ ہے کہ یہ یونہی جسے ہم ......الل ٹپ...... کہتے ہیں واقع نہیں ہو جاتی **وَاَنَّهٗ يُحۡىِ الۡمَوۡتٰى** (22:6)۔ وہ بے جان اشیاء کو جاندار بناتا ہے اس لیے مردوں کو زندگی عطا کر دینا اس کے لیے کچھ بھی مشکل نہیں کیونکہ **اَنَّهٗ عَلٰى كُلِّ شَىۡءٍ قَدِيۡرٌ** (22:6)۔ اس نے ہر بات کے لیے قانون مقرر کیا ہے، قاعدے مقرر کیے ہیں، اقدار مقرر کی ہیں، اور اس پہ اسے پورا پورا کنٹرول حاصل ہے۔ انہی قوانین کی رو سے دنیا میں مردہ اقوام کو زندگی ملتی ہے۔ لہٰذا یاد رکھو کہ **وَّاَنَّ السَّاعَةَ اٰتِيَةٌ لَّا رَيۡبَ فِيۡهَا** (22:7)۔ یہ انقلاب تو آ کر رہے گا، اس میں کوئی شک وشبہ نہیں۔ وہ انقلاب آ کر ضرور رہے گا جس کی رو سے اس جماعت کو جسے تم اپنی ظاہر بین نگاہوں سے کمزور اور مردہ دیکھتے ہو، حیاتِ نو عطا ہو گی۔ اس میں کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں۔ بارش برسے گی تو زمین سے روئیدگی کی نمود ہو گی، **لَّا رَيۡبَ فِيۡهَا** (22:7)۔ دونوں زندگیوں کے اندر اس انقلاب کے آنے میں کسی قسم کے شک وشبہ کی گنجائش نہیں۔ یہاں بھی یہ الساعۃ آتے رہیں گے، مرنے کے بعد کی زندگی میں بھی یہ صورت ہو گی۔ **وَاَنَّ اللّٰهَ يَبۡعَثُ مَنۡ فِى الۡقُبُوۡرِ** (22:7)۔ اسی طرح اس میں بھی کسی شک وشبہ کی گنجائش نہیں کہ خدا مردوں کو بھی زندگی عطا کر دے گا۔

عزیزانِ من! محاورے کے اعتبار سے اس دنیا کی مردہ قوموں کو لے لیجیے، ان میں زندگی آ ئے گی، وہی جو اولیں قوم ان کے سامنے تھی اس میں زندگی آئے گی۔ اخروی حیات کے متعلق لے لیجیے، اس میں بھی حیاتِ نو آئے گی، ایسا کچھ کرنا اس کے لیے کچھ بھی مشکل نہیں ہے۔ مکافاتِ عمل سے مفر نہیں ہے۔ بات تو اس نے یہی کہی ہے، ورنہ اگر یہ محض Academic Nature (علمی نوعیت وماہیت) کا ہی سوال ہو تو یہاں زندگی یوں چلی آئی ہے اور پھر مرنے کے بعد بھی زندگی یونہی چلی آئے گی۔ زندگی تو اس وقت بھی معرضِ وجود میں آ گئی جب کچھ بھی نہیں تھا۔ اب تو کچھ نہ کچھ تو ہے پھر اس سے کیوں نہ حیاتِ نو عطا ہو۔ ذرا سوچو تو!

زندگی مکافاتِ عمل کے ساتھ مشروط ہے

عزیزانِ من! اصل شے تو یہ ہے کہ الساعۃ سے ہمارے اپنے اعمال وافکار وکردار پر کیا اثر پڑتا ہے۔ وہ اسی صورت میں ہے جب یہ دیکھا جائے کہ زندگی مکافاتِ عمل کے لیے ہے۔ ہمارے اعمال کے نتائج مرتب کرنے کے لیے یہ بات ہو رہی ہے۔ یہ مکافاتِ عمل ضروری چیز ہے۔ یہاں کہا ہے کہ یہ واقعہ ہے، اس میں کیا شبہ ہو سکتا ہے! یہاں بھی یہ چیز پیدا ہو سکتی ہے، زندگی تو مسلسل چلتی ہے۔ اگر

اعمال کے نتائج کا مرتبہ ہونا یہاں نہ ہوگا تو کوئی بات نہیں' یہ اس کے بعد آگے چل کے ہو جائے گا لیکن ہوگا ضرور۔ اِس کے باوجود **وَمِنَ النَّاسِ مَنْ يُّجَادِلُ فِي اللّٰهِ بِغَيْرِ عِلْمٍ وَّلَا هُدًى وَّلَا كِتٰبٍ مُّنِيْرٍ** (22:8)۔ بعض لوگوں کی حالت یہ ہے کہ نہ اُن کے پاس علم وبصیرت کی کوئی روشنی ہے' نہ کسی طرح کی صحیح راہنمائی اور نہ ہی کوئی ایسا ضابطہ حیات جو انہیں تاریکیوں سے نکال کر روشنی کی طرف لے جائے۔ لیکن اس کے باوجود وہ قوانین خداوندی کے بارے میں جھگڑے نکالتے ہیں۔

بغیر کسی راہنمائی کے جھگڑتے چلے جانا' خزی ❶ ہے

عزیزانِ من! یہاں پھر وہی بات آئی ہے کہ ہم یہ دلائل دے رہے ہیں' یہ شہادات پیش کر رہے ہیں لیکن لوگوں کی کیفیت یہ ہے کہ وہ دھاندلی سے' جھگڑتے چلے جا رہے ہیں' نہ اُن کے پاس کوئی انسانی علم ہے' ذاتی علم ہے' نہ کوئی پہلے کی خدا کی دی ہوئی جو وحی تھی' وہ ہے۔ ان کے پاس اس کی مقرر کی ہوئی کوئی راہنمائی یا ہدایت نہیں ہے اور نہ ہی ان کے اپنے پاس کوئی ایسی کتابِ منیر ہے جو روشنی دینے والی ہو۔ راستہ چلانے کے لیے کچھ نہیں' بغیر علم جھگڑتے چلے جاتے ہیں۔ **ثَانِيَ عِطْفِهٖ لِيُضِلَّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ** (22:9)۔ (ایسے آدمی سے بات کرو تو وہ اسے توجہ سے سننے اور معقولیت سے جواب دینے کے بجائے نخوت وتکبر کے عالم میں عجیب انداز سے) منہ پھیر کر چل دیتا ہے اور (اتنا ہی نہیں کہ خود ہی غلط راستے پر چلتا ہے بلکہ) دوسرے لوگوں کو بھی اللہ کے راستے سے بھٹکاتا ہے۔ اِسے دوسرے الفاظ میں یوں سمجھیے کہ معقول بات کیجیے تو جواب دینے کی بجائے یا جھگڑیں گے یا پہلو بدل کے چل دیں گے اور یہ پہلو بدل کے چل دینا اس سے بھی زیادہ بُری حرکت ہوتی ہے یعنی آپ معقول بات کر رہے ہوں اور وہ ذرا سی ہنسی اڑا کے یوں چل دیتے ہیں۔ سوال یہ ہے کہ یہ کاہے کے لیے ہے؟ جواب دیا کہ **لِيُضِلَّ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ** (22:9)۔ خود بھی اس طرح حق سے اعراض برتو اور دوسروں کو بھی گمراہ کر دو۔ اس طرح سے آپ کے ہاں کے سارے واعظ' لیڈر' راہنما' قائد عملِ طریقت' العلم کے بغیر آپ کو کسی راہنمائی کی دعوت دیتے ہیں۔ العلم تو خدا کی کتاب' قرآنِ عظیم' کے علاوہ کہیں نہیں ہے۔ عزیزانِ من! یاد رکھیے! وہ خود بھی غلط راستے پہ چلتے ہیں اور دوسروں کو بھی غلط راستوں پر چلاتے ہیں' اس میں ان کا اپنا مفاد ہوتا ہے۔ یہ ان کے ساتھ پروفیشنل (پیشہ ور) بن گئے ہوتے ہیں۔ یہاں کہا ہے کہ اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ کچھ وقت کے لیے تو انہیں اس سے مفاد حاصل ہو جاتے ہیں لیکن **لَهٗ فِي الدُّنْيَا خِزْيٌ وَّ نُذِيْقُهٗ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ عَذَابَ الْحَرِيْقِ** (22:9)۔ ایسے لوگوں کے لیے دنیاوی زندگی میں ذلت ورسوائی اور قیامت کے دن جھلسا دینے والا عذاب ہے۔ یعنی ان کا حال بھی تاریک ہوتا ہے اور مستقبل بھی۔ اس طرح انہیں کچھ پیش پا افتادہ مفاد وقتی طور پہ حاصل ہو سکتا ہے لیکن آخر الامر' یہاں بھی خزی ہے' ذلت کی زندگی ہے۔ آج تو ہمارے ہاں یہ بات سمجھ میں نہیں آتی' اب تو معیار ہی بدل گئے ہیں' ورنہ ناجائز طریقوں سے دولت وثروت

---

❶ ذلت ورسوائی

حاصل کرنے والے یا حرام کے طریقے پر جائیداد بنانے والے معاشرہ کے اندر بھی بڑی ذلت کی نگاہ سے دیکھے جاتے تھے۔ جہاں بھی اقدار کا کوئی تصور باقی نہ ہو قرآن کے الفاظ میں یہ خزیٌ ہے۔

جب مادی تصورِ حیات شرِ مستطیر ❶ ہو جائے تو پھر معاشرے کا تصورِ حیات بدل جاتا ہے

عزیزانِ من! ہماری اتنی عمر کا ہو جانا بھی خدا کی برکت ہے۔ مگر آج ہماری دقت یہ ہے کہ ہمارا ماضی اس ماحول سے وابستہ ہے جس میں ہم نے اپنے ماحول میں شر مستطیر والی یہ چیز دیکھی ہے۔ اپنے بچپن میں بھی نہیں، خاصی عمر تک، یہ چیز موجود تھی کہ ہمارے معاشرے میں، محلے میں، گلی میں، صحن میں، اگر کوئی شخص غلط طریق پر دولت جمع کر لیتا تھا تو کوئی اسے عزت کی نگاہ سے نہیں دیکھتا تھا۔ ہمارے ہاں یہ مشہور تھا کہ جی! دولت بڑی ہے، مگر معاف رکھیے گا، کہتے تھے کہ دولت تے کنجراں کول وی بڑی ہوندی ہیگی اے۔ ❷ ہمارے گھروں میں یہ لفظ کہا جاتا تھا کہ محض دولت کا کسی کے ہاتھ آ جانا اسے واجب العزت نہیں بنا دیتا۔ دیکھو کہ دولت کس طریقے سے حاصل کی گئی ہے۔ ایسے صاحب دولت کو ذلت کی نگاہ سے دیکھا جاتا تھا۔ ہاں تو میں نے کہا ہے کہ جب وہ شرِ مستطیر ❶ ہو جائے جیسا قرآن نے (76:7) میں کہا تھا کہ برائی تو Epidemic (وبا) کی طرح ہو جاتی ہے جو اڑتی ہوئی لگتی چلی جاتی ہے۔ معیار بدل جاتے ہیں تو پھر قوم وہیں تباہ ہو جاتی ہے۔ جب قوم اس مقام پر پہنچ جائے کہ عزیزانِ من! کوئی غلط کو غلط کہنے والا نہ رہے، یا یہ کہنے کی جرأت کرنے والا نہ رہے تو بس پھر قوم ختم ہو جاتی ہے، تباہ ہو جاتی ہے۔ کچھ نہ ہو، غلط کا احساس تو ہو پھر تو اس کی تصحیح کی شکل پیدا ہو سکتی ہے اور اگر کارواں کے دل سے احساسِ زیاں ❸ چلا جائے تو پھر اسے حیات نو نہیں مل سکتی۔ عزیزانِ من! احساسِ زیاں کے معنی یہ ہیں کہ ہمارے ہاں عزت کا جو معیار ہے مگر وہ بدل جائے تو پھر اسے حیاتِ نو نہیں مل سکتی۔

ظہورِ نتائج کے وقت قسمت کا لکھا لے کے نہ بیٹھ جانا

عزیزانِ من! اب آگے یہ بات آتی ہے کہ یہ جو کچھ ہم نے کہا ہے یہ ایسا ہی ہوتا ہے، اس لیے اُسے بتا دیا جائے گا کہ **ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتْ يَدٰكَ** (22:10)۔ یہ سب تیرے اپنے اعمال کا نتیجہ ہے۔ یہ **خِزْيٌ فِي الدُّنْيَا** (5:33) ہے، یہ دنیا میں ذلت و رسوائی ہے۔

---

❶ يُوْفُوْنَ بِالنَّذْرِ وَيَخَافُوْنَ يَوْمًا كَانَ شَرُّهٗ مُسْتَطِيْرًا (76:7)۔ یہ لوگ، نوعِ انسانی کی عالمگیر ربوبیت کی ذمہ داری، برضا و رغبت اپنے سر پر لیتے ہیں، اور پھر اُسے نہایت خندہ پیشانی سے پورا کرتے ہیں۔ انہیں بروقت اس کا احساس رہتا ہے کہ اگر ایسا نہ کیا گیا تو معاشرہ ایسی شکل اختیار کر لے گا جس میں چاروں طرف شر پھیل جائے گا۔ (ہر طرف فساد ہی فساد رونما ہو جائے گا۔ ساری فضا اس سے متاثر ہو جائے گی۔ اس کی چنگاریاں اڑ کر دور دور تک پہنچ جائیں گی۔ یہ ہے شرِّ مستطیر)

❷ دولت تو بے غیرتوں کے پاس بھی بہت ہوتی ہے۔

❸ وائے ناکامی متاعِ کارواں جاتا رہا کارواں کے دل سے احساسِ زیاں جاتا رہا۔

جب تم دیکھو کہ تمہیں ذلت اور خواریاں آئیں گی تو اس وقت یہ کہنے کے لیے نہ بیٹھ جانا کہ جی! قسمت کا لکھا[1] تھا' اللہ تعالیٰ کو ایسا ہی منظور تھا' ایسا ہی ہوگیا۔ قرآن کہتا ہے کہ یہ بات نہیں ہے' اللہ تعالیٰ کو یونہی یہ چیزیں منظور نہیں ہوتیں کہ وہ کسی کو ذلیل کردے۔ اس نے تو خود کہہ دیا ہے کہ پہلے یہ دیکھیے کہ **اَنَّ اللّٰهَ لَيۡسَ بِظَلَّامٍ لِّلۡعَبِيۡدِ** (22:10) خدا اپنے بندوں پر کبھی ظلم اور زیادتی نہیں کیا کرتا۔ وہ اپنے اعمال کا نتیجہ بھگتتے ہیں۔ خدا اس طرح دھاندلی سے یہ کچھ نہیں کیا کرتا۔

یہ تباہی و بربادی تو جوانی میں سنکھیا کھانے کا نتیجہ ہے

عزیزانِ من! خدا کے لیے یہ زیبا ہی نہیں ہے کہ وہ انسانوں کو ظلم' دھاندلی اور ناانصافی سے جسے چاہے ذلیل کردے اور جسے چاہے عزت بخش دے۔ ہمارے ہاں تو البتہ یہی کچھ ہوتا ہے۔ اور اس کے ثبوت کے لیے یہ آیت پیش کردی جاتی ہے کہ **تُعِزُّ مَنۡ تَشَآءُ وَ تُذِلُّ مَنۡ تَشَآءُ** (3:26)۔ اور پھر اس آیت کا یہ ترجمہ کردیا جاتا ہے کہ ''وہی جسے چاہے ذلت دے' جسے چاہے عزت دیدے'' یہاں کہا ہے کہ یہ نہیں ہے' تو سوال یہ ہے کہ پھر یہ کیسے ہے؟ قرآن کریم کے الفاظ تو یہی ہیں۔ یہاں سورۃ الحج میں ذلت یا عزت کے متعلق کہا ہے کہ **ذٰلِكَ بِمَا قَدَّمَتۡ يَدٰكَ** (22:10)۔ یہ تمہارے اپنے اعمال کا نتیجہ ہے۔ وہ اعمال جو تم نے کیے تھے یہ اس کا نتیجہ ہے۔ بس فرق اتنا ہی ہے کہ وہ اعمال ذرا پہلے کیے تھے' ان کا نتیجہ بعد میں آ کے نکلا ہے۔ نتیجہ انہی کا نکلا ہے۔ وہ جو جوانی کے زمانے میں سنکھیا کھایا کرتے تھے کہ صاحب! اس سے چہرے پہ سرخی آ جاتی ہے' خون میں حدت پیدا ہوجاتی ہے' اب اس بڑھاپے کے زمانے میں جو ہڈیاں ٹوٹ رہی ہیں تو یہ اس سنکھیا کھانے کا ہی نتیجہ ہے۔

آخرت پر ایمان کے معنی

عزیزانِ من! یہاں قرآن ہمیشہ **قَدَّمَتۡ** کا ایک لفظ استعمال کرتا ہے۔ کہتا ہے کہ **وَلۡتَنۡظُرۡ نَفۡسٌ مَّا قَدَّمَتۡ** (59:18) ہمیشہ اس بات کا خیال رکھو کہ تم نے مستقبل کی خوش گواریوں کے لیے کیا ہے۔ اس لیے جو پہلے کرتے ہو' اس کے عواقب پہ نگاہ رکھا کرو' کرنے سے پہلے اس کے نتیجے پہ نگاہ رکھا کرو۔ یہ بڑی عجیب چیز ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ کام پہلے ہوجاتا ہے اور اس وقت فوری طور پر یہ نظر نہیں آتا کہ یہ جو کچھ کیا ہے تو کیا اسکا نتیجہ ہلاکت ہوگا؟ کہا ہے کہ پہلے کام ہوتا ہے' بعد میں اس کا نتیجہ ہوتا ہے' ہمیشہ اس نتیجے پہ نگاہ رکھا کرو۔ اسے ہی آخرت پر ایمان کہتے ہیں۔ عزیزانِ من! کیے ہوئے کام کا نتیجہ بعد میں نکلنا ہے۔ یہ ہے حقیقت ثابتہ۔ سوال یہ نہیں ہے کہ وہ نتیجہ اسی زندگی میں نکلتا ہے یا اس کے بعد اگلی زندگی میں جا کے نکلتا ہے۔ وقت کا تو سوال ہی نہیں ہے' ٹائم کا Question (سوال) نہیں

---

[1] چاہے تم پاؤں گھسو یا کہ رکھو سر بسجود — بات پیشانی کی جو ہے' سو پیش آنی ہے۔

ہے۔ اصل میں ایمان یہ ہے کہ ''میں جو کچھ کر رہا ہوں' اس کا نتیجہ بعد میں نکلنا ہے۔'' کہا کہ یہ جو کچھ اس وقت ہوا ہے' خدا نے دھاندلی سے نہیں کیا' ہم تو ایسا کیا ہی نہیں کرتے۔ **بِمَا قَدَّمَتْ یَدٰکَ** (22:10) یہ وہی ہے' جو پہلے تیرے اپنے ہی ہاتھوں نے تیرے لیے بھیج دیا تھا۔ کیا بات ہے الفاظ کی! یہ تو ہم وہاں سے اٹھا کے بھی نہیں لائے' تیرے اپنے ہی ہاتھوں نے' یہ تو پہلے ہی تیرے لیے بھیج دیا تھا۔ کہیں بھی آپ نے باہر جانا ہو اور اس سفر کے لیے بڑے انتظامات کرنے ہوں تو پہلے دو ایک آدمی بھیج دیتے ہیں کہ وہاں جا کر یہ کچھ انتظام کیا کرو۔ ہراول دستے لشکروں میں بھی ہوتے ہیں' یہ پہلے جا کے کچھ کرنے والے ہوتے ہیں۔ یہاں قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ اس میں باہر کے آدمیوں کی ضرورت نہیں ہے جو تم اس وقت' آج کرتے ہو' جب تم منزل پہ پہنچتے ہو' تو وہ وہاں پہلے سے موجود ہوتا ہے۔ کیا بات ہے! تم بعد میں وہاں پہنچتے ہو اور یہ جو پہلا بھیجا ہوا تھا' یہ وائرلیس کے ذریعے جاتا ہے' یہ پہلے وہاں موجود ہوتا ہے۔ ہم کچھ نہیں کرتے یہ تمہارے ہی ہاتھوں کا لایا ہوا ہوتا ہے جو کچھ اُس وقت تمہارے سامنے آتا ہے۔

عزیزانِ من! آگے بات ایک اور گوشۂ زندگی کی آ رہی ہے کہا کہ **مَنْ یُّجَادِلُ فِی اللّٰہِ** (22:3)۔ وہ خدا کے صاف' واضح اور سیدھے قوانین میں یونہی جھگڑے نکالتا ہے' دھڑلے سے مخالفت کرتا ہے' حقیقت سے انکار کرتا ہے۔ یہ بھی زندگی کا ایک پہلو ہے۔ جس میں وہ زبان سے کہے چلا جاتا ہے کہ یہاں اسلامی مملکت ہے' قانونِ سنت ہے' شریعت کے مطابق ہے' ہم مسلمان بھی ہیں' قرآنِ کریم پر اور حضور ﷺ پہ ہمارا ایمان بھی ہے۔ وہ یہ کچھ کہتا چلا جا رہا ہے مگر اس کا عمل اس کے بالکل خلاف ہوتا چلا جا رہا ہے۔ ایک پہلو یہ بھی تو ہے۔ اور اس کے آگے ایک پہلو یہ بھی آتا ہے کہ ذرا اپنی طرف تو آ ؤ۔ تم سن کر کے بڑے خوش ہوئے تھے' عزیزانِ من! یہاں بات قریش کے مخالفین کی ہو رہی ہے۔ وہ جھگڑا کرتے تھے' گو ہمارا آج تو اس سے تعلق ہی کچھ نہیں لیکن یہ جو اگلی بات قرآن کہتا ہے' اس کے متعلق بھی تو ہم نے یہی فرض کر رکھا ہے کہ یہ ان منافقین کا ذکر ہے جو مدینے میں ہوا کرتے تھے۔ یعنی مکے میں وہ جھگڑنے والے بھی وہاں ہوا کرتے تھے مدینے میں یہ منافق بھی وہاں ہوا کرتے تھے یہ سب کچھ وہاں ہوتے تھے۔ جہنم میں بھی وہی جانے والے ہیں' ہم نہیں ہیں۔ اس قرآن میں ان لوگوں کا ذکر ہے' ہمارا کچھ بھی ذکر نہیں ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ تم کون ہو؟ اس کے جواب میں یہ کہتے ہیں کہ ہم اس کے حبیب کی امت ہیں۔ جنت ہمارے لیے لکھی ہوئی ہے۔ تو زندگی کا یہ جو اگلا پہلو ہے کہ زبان سے کہتے جا رہے ہو کہ خدا پہ ایمان ہے' محمد ﷺ کی رسالت پہ ایمان ہے' آخرت پہ ایمان ہے مگر کرتے اس کے خلاف ہو تو قرآن کریم نے اس پہلو کے متعلق واضح طور پر کہا ہے لیکن عزیزانِ من! اب درس کا وقت پورا ہوا۔ اسے ہم آئندہ درس میں لیں گے۔ ہم سورۃ الحج کی آیت 10 تک آ گئے' 11 ویں آیت سے ہم پھر آئندہ لے لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ط اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ط

❀❀ ...... ❀❀❀ ...... ❀❀

دوسرا باب: **سورۃ الحج** (آیات 11 تا 21)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

وَمَا يَاْتِيْهِمْ مِّنْ رَّسُوْلٍ اِلَّا كَانُوْا بِهٖ يَسْتَهْزِءُوْنَ ⑪ كَذٰلِكَ نَسْلُكُهٗ فِيْ
قُلُوْبِ الْمُجْرِمِيْنَ ⑫ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِهٖ وَقَدْ خَلَتْ سُنَّةُ الْاَوَّلِيْنَ ⑬ وَلَوْ
فَتَحْنَا عَلَيْهِمْ بَابًا مِّنَ السَّمَآءِ فَظَلُّوْا فِيْهِ يَعْرُجُوْنَ ⑭ لَقَالُوْٓا اِنَّمَا
سُكِّرَتْ اَبْصَارُنَا بَلْ نَحْنُ قَوْمٌ مَّسْحُوْرُوْنَ ⑮ وَلَقَدْ جَعَلْنَا فِي السَّمَآءِ
بُرُوْجًا وَّزَيَّنّٰهَا لِلنّٰظِرِيْنَ ⑯ وَحَفِظْنٰهَا مِنْ كُلِّ شَيْطٰنٍ رَّجِيْمٍ ⑰ اِلَّا مَنِ
اسْتَرَقَ السَّمْعَ فَاَتْبَعَهٗ شِهَابٌ مُّبِيْنٌ ⑱ وَالْاَرْضَ مَدَدْنٰهَا وَاَلْقَيْنَا
فِيْهَا رَوَاسِيَ وَاَنْۢبَتْنَا فِيْهَا مِنْ كُلِّ شَيْءٍ مَّوْزُوْنٍ ⑲ وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِيْهَا
مَعَايِشَ وَمَنْ لَّسْتُمْ لَهٗ بِرٰزِقِيْنَ ⑳ وَاِنْ مِّنْ شَيْءٍ اِلَّا عِنْدَنَا
خَزَآئِنُهٗ ۡ وَمَا نُنَزِّلُهٗٓ اِلَّا بِقَدَرٍ مَّعْلُوْمٍ ㉑

عزیزانِ من! آج نومبر 1976ء کی 28 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ الحج کی آیت 11 سے ہو رہا ہے: (22:11)۔

حق کو ''اکراہ'' اور قوت کے زور پر نہیں منوایا جا سکتا

آپ کو معلوم ہے کہ حق و باطل کی علمبردار جماعتوں کے درمیان ٹکراؤ کی بات پیچھے سے چلی آ رہی ہے۔ پہلے کشمکش کی تھی اور پھر اس

کا آخری درجہ، آخری Stage (منزل) وہ ٹکراؤ، تزاحم اور تصادم ہے جو کہ فیصلہ کن مرحلہ ہوتا ہے۔ اس میں جیسا کہ میں نے عرض کیا تھا یہ بات نہیں ہے کہ حق کو بزورِ شمشیر منوایا جاتا ہے۔ حق کو تو اکراہ کے ساتھ منوایا ہی نہیں جا سکتا۔ حق اپنے آپ کو خود منوا لیتا ہے۔ وہ ہمارے قوتِ بازو کا محتاج نہیں ہوتا۔ اکراہ اور قوتِ بازو سے تو دھاندلی کو منوایا جاتا ہے۔ حقیقت کو تو اس طرح سے نہیں منوایا جاتا اور اگر اُسے زبردستی منوایا جائے تو وہ حقیقت نہیں رہتی۔ اس کے لیے تو دل و دماغ کی کامل رضامندی کا ہونا ضروری ہے۔

عربی زبان میں اطاعت کے بنیادی معنی یوں سمجھیے کہ اگر درخت پہ کچی کھجور ہو تو اسے توڑنے کے لیے جھانپڑ کی ضرورت ہوتی ہے یہ ہے جسے دھاندلی کہتے ہیں، یہ ہے جسے اکراہ کہا جاتا ہے۔ اور جب وہ کھجور پک جاتی ہے تو از خود ٹپک پڑتی ہے۔ یہ جو اس کھجور کا اپنی رضامندی سے، پختگی کے بعد، پک کر، خود نیچے گر جانا ہے، اسے عرب اطاعت کہتے تھے۔ جھانپڑ سے تو اطاعت ہو ہی نہیں سکتی۔ اب یہ جو ہم تصادمات دیکھ رہے ہیں اور یہ جو کہا جاتا ہے کہ اسلام بزورِ شمشیر پھیلا، لڑائیاں ہوئیں اور جہاد کیا، یہ سب حقیقت سے بے خبری کی دلیل ہیں۔ قوم تو رہی ایک طرف، قرآن تو کسی ایک فرد کو بھی اس کی اجازت نہیں دیتا کیونکہ اس طرح سے حقیقت منوانا حقیقت کے مقصد کو پامال کرنا ہے۔ کچی کھجور ہوتی ہے۔ لہٰذا ہوتا یہ ہے کہ حق کی علمبردار یہ جماعت، صرف حق پر مبنی نظام کے قانون، اصول اور اقدار [1] کو بغیر جبر و اکراہ کے پیش کرتی ہے۔

مخالفت کی انتہا کا علاج میدان جنگ میں اُترنا ہے

عزیزانِ من! حق پر مبنی قوانین، اصول اور اقدار کو بغیر کسی قسم کے جبر و اکراہ کے پیش کرنے سے جن قوتوں کے مفادات پر اثر پڑتا ہے، وہ اس کے راستے میں مزاحمت پیدا کرتی ہیں۔ اگر یہ مزاحمت صرف یہاں تک ہی رہے کہ وہ ان چیزوں کو آگے پھیلنے نہ دیں، تو خیر یہ قابلِ برداشت ہے لیکن اگر اِس کی صورت وہ ہو جو ہمیں تاریخ میں پہلی دفعہ ملتی ہے تو پھر حق کی اس علمبردار جماعت کو میدانِ جنگ میں اترنا پڑتا ہے۔ تاریخ میں ملنے والی اس صورتِ حال میں ہوا یہ تھا کہ اس مٹھی بھر جماعتِ مؤمنین کی ساری متاعِ حیات صرف تین سو افراد تھے جو بالآخر مکہ سے گھر بار چھوڑ کے یہ کہتے ہوئے مدینے چلے گئے تھے کہ لو بابا! ہم چھوڑ کے چلے جاتے ہیں۔ اور اس زمانے کے جو سواری کے ذرائع تھے اس اعتبار سے مکے اور مدینے کا، اس زمانے کا فاصلہ، بھی ذرا ملاحظہ فرمائیے گا۔ وہ یہ سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر وہاں

---

[1] یہ حق پر مبنی نظام کے قانون، اصول اور اقدار وہ بنیادی حقائق ہیں جنہیں مستقل اقدار (Permanent Values) یا ابدی صداقتیں (Eternal Truths) کہا جاتا ہے اور جو نا قابلِ تغیر و تبدل ہوتے ہیں۔ انہیں عقل و فکر اور دلائل و براہین کی بنا پر بطور مسلمہ حقیقت کے ماننا ایمان کہلاتا ہے۔ ایمان Faith نہیں، Conviction کا نام ہے۔ (پرویزؒ: نظام ربوبیت، 1989، ص۔ 143 فٹ نوٹ) انسانی جسم کی پرورش اور خارجی کائنات سے متعلق قوانین کو قوانین فطرت (Laws of Nature) کہتے ہیں۔ یہ قوانین بھی غیر متبدل اور عالمگیر ہیں۔ ان کے مطابق سلسلہ کائنات سرگرم عمل ہے۔

چلے گئے۔ اب ان قریشِ مکہ سے کوئی تعلق نہیں' کوئی مزاحمت نہیں' کوئی تصادم نہیں' لیکن یہ ہیں کہ یورش کر کے' اپنی پوری قوتوں کے ساتھ' مدینے پہ حملہ آور ہونے کے لیے چلے گئے۔ پھر اُدھر سے اس کی مدافعت ہوئی ہے تو اس مقام پہ یہ بات آ جاتی ہے کہ حق کی اس علمبردار جماعت کو میدان جنگ میں اترنا پڑتا ہے اور پھر وہاں یہ چیز ہوتی ہے۔

میدانِ بدر میں نبی اکرم ﷺ کے دل سے نکلنے والی ایک انمول دعا

عزیزانِ من! جب بدر [1] کے میدان میں پورے ایک ہزار افراد کی مسلح فوج کے سامنے یہ تین سو تیرہ جانثار افراد جن کے پاس تلواریں بھی پوری نہیں تھیں' صفیں آراستہ ہوگئیں تو حضور ﷺ نے دعا کی۔ تاریخ بتاتی ہے کہ حضور ﷺ ایک طرف تشریف لے گئے۔ نہایت والہانہ انداز میں' جذب وکیف کے عالم میں جب کہ حضور ﷺ کی چادر مبارک کندھے سے گر گر پڑ رہی تھی' کہا اور اُس دعا کے فقرے وہ اصول ہیں جنہیں دین کہا گیا ہے کہ یا اللہ! ہم تو جانیں دینے کے لیے آ ہی گئے۔ یہ جان آخری چیز ہے اور ہم اسے لے کر آ گئے ہیں۔ اس جان سے زیادہ تو کسی کا کچھ نقصان ہو ہی نہیں سکتا لیکن جرأتِ عرض معاف ہو تو یہ گزارش کیے دیتا ہوں کہ اگر یہ قریب تین سو افراد کی مٹھی بھر جماعت آج یہاں ختم ہوگئی تو چونکہ اس کے ساتھ نبوت بھی ختم ہو جاتی ہے' تو پھر قیامت تک تیرا نام لینے والا کوئی نہیں رہے گا۔ تیرا نام! [2]

ہم تو جیتے ہیں کہ دنیا میں ترا نام رہے
کہیں ممکن ہے کہ ساقی نہ رہے' جام رہے! [3]

---

[1] سترہ رمضان 2ھ مطابق 13 مارچ 624ء کی صبح بدر کے میدان میں دو صفیں ایک دوسرے کے سامنے نبرد آزما تھیں۔ یہ دو صفیں' جو ایک دوسرے کے مقابل شمشیر بکف کھڑی تھیں' ان کا ملک ایک تھا' زبان ایک تھی' رنگ ونسل ایک تھا' حسب ونسب ایک تھا۔ اس کی وجہ افتراق یہ تھی کہ قرآن کی رو سے قوموں کی تشکیل کس طرح ہوتی ہے' وہ وجہ تفریق وعلت تقسیم تھی' ایمان! ایک طرف حضرت ابوبکر رضی اللہ عنہ تھے تو دوسری طرف مقابلہ میں ان کا بیٹا۔ اِدھر حضرت حذیفہ رضی اللہ عنہ تھے تو صفِ غنیم میں ان کا باپ عتبہ۔ اِدھر حضرت عمر رضی اللہ عنہ تھے تو اُدھر آپ کا ماموں جس کے خون سے آپ کی تلوار رنگین تھی۔ اِدھر حضرت علی رضی اللہ عنہ تھے تو مخالف صف میں ان کے بھائی عقیل تھے' نہیں! اور آگے بڑھیے' اِدھر خود محمد ﷺ تھے تو سامنے صف میں آپ کے حقیقی چچا (حضرت) عباس' اور آپ کے داماد ابوالعاص! اِدھر ام المومنین حضرت سودہ رضی اللہ عنہا تھیں تو سامنے ان کے عزیز سہیل بن عمر۔ یہ تھی وہ حقیقی تقسیم جو وطن' رنگ' نسل کی غیر فطری حدود سے ماوراء تھی۔ حبش کا رہنے والا بلال رضی اللہ عنہ اپنوں میں سے تھا لیکن حقیقی چچا عباس غیروں میں سے۔ روم کا صہیب یگانہ تھا لیکن حقیقی بیٹا بیگانہ۔ (پرویزؒ: معراج انسانیت 1949' ص۔ 517)

[2] آپ ﷺ خشوع اور والہانہ جذب وانہماک سے بحضور رب العزت عرض کرتے ہیں کہ
''یا اللہ! اگر یہ مٹھی بھر جماعت مٹ گئی تو پھر قیامت تک تیری عبودیت اختیار کرنے والا کوئی نہیں رہے گا۔'' (پرویزؒ: معراج انسانیت' ادارہ طلوع اسلام کراچی' 1949' ص۔ 519)

[3] اقبالؒ: شکوہ' بانگِ دار' نیشنل بک فاؤنڈیشن' اسلام آباد' 1996' ص۔ 177

یہ بات تھی کہ ہم تو جانیں دیدیں گے۔ بہر حال یہ وہ مقام ہے، جہاں انہیں میدانِ جنگ میں جانا پڑتا ہے۔ یہ یورش کر کے خود وہاں نہیں گئے بلکہ وہی حملہ کرنے کے لیے یہاں تک پیچھے آئے۔ تو میں نے عرض کیا ہے کہ یہ ہوتا ہے وہ مقام جہاں انہیں میدانِ جنگ میں آ کر اپنے سر ہتھیلیوں پہ رکھ کر مقابلہ کرنا ہوتا ہے۔ اس لیے کہ اگر اس وقت یہ جماعت نہ رہے تو پھر دنیا میں حق کی آواز بلند کرنے والا کوئی نہیں رہے گا۔

جسدِ انسانی کا مہلک ناسور: تیسرے درجے کے منافقین کی جماعت

عزیزانِ من! یہ حق و باطل کی دو جماعتیں تھیں، جن کا تذکرہ چلا آ رہا تھا، ایک کھلا ہوا کفر اور دوسرا کھلا ہوا ایمان۔ اور اب اس کے بعد گیارھویں آیت میں ایک تیسری جماعت کا ذکر ہے۔ یہ وہ جماعت ہے جو کھلے ہوئے دشمن، کھلے ہوئے کافران، سے بھی بدتر درجے کی ہے۔ قرآنِ کریم میں آپ دیکھیے گا جہاں کفر اور ایمان کے متعلق آیات ہیں، ان سے کہیں زیادہ آیات منافقین کے متعلق ہیں۔ یہ جسدِ انسانی کا بڑا ہی گہرا ناسور ہوتا ہے۔ یہ ایسا کینسر ہوتا ہے، جس کمبخت کا پتہ ہی نہیں چلتا تا آنکہ منافقین کا یہ طبقہ، جماعتوں کے اندر بالکل ہلاکت آمیز انداز میں باہر آ جاتا ہے۔ ان کی حالت یہ ہے کہ وہ **وَمِنَ النَّاسِ مَنۡ يَّعۡبُدُ اللّٰهَ عَلٰى حَرۡفٍ فَاِنۡ اَصَابَهٗ خَيۡرُ ۨ اطۡمَاَنَّ بِهٖ وَاِنۡ اَصَابَتۡهُ فِتۡنَةُ ۨ انْقَلَبَ عَلٰى وَجۡهِهٖ** (22:11)۔ قانونِ خداوندی کی اطاعت کرتے ہیں لیکن اس طرح گویا وہ کنارے پر کھڑے ہیں۔ اگر دیکھتے ہیں کہ اس قانون کی اطاعت میں فائدہ ہے تو اس پر مطمئن رہتے ہیں لیکن اگر اس سے انہیں کسی قسم کا نقصان ہوتا ہے تو وہ اس سے بلا تامل منہ پھیر لیتے ہیں۔ اس طرح قرآن کہتا ہے کہ جماعتوں کے اندر یہ گروہ سب سے زیادہ خطرناک ہوتا ہے۔ یہاں "**علی حرف**"[1] آیا ہے۔ حرف کا مطلب ہے: دیوار پہ بیٹھے ہوئے، کنارے پہ کھڑے ہوئے۔ اس کا یہ مطلب ہوا کہ خدا کی اطاعت کرتے ہوئے ان کی نگاہ دونوں طرف ہوتی ہے۔ یہاں کہا ہے کہ اگر ذاتی فائدہ اِدھر جھک جانے میں ہے، تو اِدھر ہو جاتے ہیں اور اگر کچھ مفاد اُدھر نظر آتا ہے تو اُدھر ہو جاتے ہیں۔ اس اِدھر اور اُدھر کے متعلق دوسری جگہ قرآن نے کہا ہے کہ **اِنَّ الۡمُنٰفِقِيۡنَ يُخٰدِعُوۡنَ اللّٰهَ وَهُوَ خَادِعُهُمۡ** (4:142)۔ یہ منافقین اللہ کو دھوکا دینا چاہتے ہیں، حالانکہ یہ اپنی اس روش سے، خود اپنے آپ کو دھوکے میں رکھتے ہیں۔ اس طرح یہ وہ جماعت ہے جو ہر وقت دھوکا اور فریب دینے کی فکر میں رہتی ہے۔ لیکن یہ خدا کو کیا دھوکا دیں گے، یہ تو اپنے آپ کو دھوکا دیتے ہیں۔ یہ لوگ خود فریبی میں مبتلا ہوتے ہیں اور **مُذَبۡذَبِيۡنَ بَيۡنَ ذٰلِكَ** (4:143)۔ اِن کی اس روش سے انہیں وہ اطمینان حاصل ہی نہیں ہو سکتا جو یقین محکم کا لازمی نتیجہ ہوتا ہے۔ یہ پریشان خاطر، حواس باختہ، درمیان میں لٹکے رہتے ہیں۔ نہ اِدھر کے، نہ اُدھر کے۔

---

[1] حَرۡفٌ۔ کسی چیز کا سرا، کنارہ یا حد۔ تاج العروس میں یہ جملہ دیا ہے: فُلَانٌ عَلٰى حَرۡفٍ مِّنۡ اَمۡرِهٖ۔ پھر اس کا یہ مطلب دیا ہے: "وہ شخص اپنے معاملے میں ایک کنارہ پر کھڑا Sitting on the fence انتظار کر رہا ہے کہ جس طرف جانے میں اُسے فائدہ نظر آئے اُسی طرف چلا جائے۔

منافقین کے سلسلہ میں مذہبی پیشوائیت کا کردار' قرآن کے آئینہ میں

عزیزانِ من! آپ کو معلوم ہے کہ ان منافقین میں سب سے نمایاں طور پر قرآن نے جن کا ذکر کیا ہے وہ کون ہیں؟ سنیے! یہ مذہب پرست طبقہ ہے۔ آپ حیران ہونگے' قرآن کہتا ہے کہ **وَاِذَا قَامُوۡۤا اِلَى الصَّلٰوةِ قَامُوۡا كُسَالٰى** (4:142)۔ جب یہ طوعاً وکرہاً اجتماعِ صلوٰۃ میں شریک ہوتے ہیں تو اس لیے نہیں کہ اِس سے قوانین خداوندی کی یاد تازہ کر لی جائے۔ وہ تو یوں ہے کہ صلوٰۃ کے لیے آتے بھی ہیں' ساتھ کھڑے بھی ہوتے ہیں لیکن ان کا انداز دیکھنے کے لائق ہوتا ہے۔ میں نے آپ کو بتایا تھا کہ اس انداز کے لیے دوسری جگہ **سَاهُوۡنَ** (107:5) آیا ہے یہاں تو **كُسَالٰى** (4:142) آیا ہے۔ یہ بڑی جامع چیزیں ہیں' قرآن کے یہ الفاظ بار بار آتے ہیں' قرآن انہیں بار بار دہراتا ہے۔ اِس تکرار سے بات ذہن نشین بھی ہو جاتی ہے اور جو نو وارد حضرات ہوتے ہیں ان کی معلومات میں اضافہ بھی ہو جاتا ہے۔ دین کا ہر حکم' اس کا ہر اصول' اس کا ہر قاعدہ' اپنا نتیجہ رکھتا ہے۔ لہٰذا دین کے نظام کے پروگرام کا ایک رکن وہ بھی ہے جسے صلوٰۃ کہتے ہیں۔ اب زبان کے اعتبار سے دیکھیے کہ کیسے سمجھایا جا رہا ہے۔ ❶ کمان (اَلسَّهْوَةُ) اور اس میں نیچے تانت (اَلْکسل) ❷ ہوتی ہے۔ اب اگر کمان کے ساتھ تانت لگی ہوئی ہو تو پھر اس میں سے تیر نکلتا ہے۔ لیکن اگر کمان بھی ہو' تانت بھی ہو' اور تیر بھی ہو لیکن تانت کمان کے ساتھ نہ لگی ہوئی ہو تو پھر کیا ہوتا ہے؟ چیزیں تو تینوں نظر آتی ہیں یعنی کمان بھی' تانت بھی' اور تیر بھی۔ قرآن کہتا ہے کہ اگر تانت کمان کے ساتھ نہ لگی ہو تو پھر کیا یہ تیر کہیں ٹھکانے پہ بھی لگ سکے گا؟ اس حالت میں تو اس میں سے تیر نکل ہی نہیں سکتا۔ اس لیے قرآن کہتا ہے کہ منافقت کی نماز اس کمان کی طرح ہے جس کی تانت کمان سے الگ رکھی ہوئی ہو۔ عزیزانِ من! یہ قرآن ہے' یہ عربی مبین زبان تھی اور یہی زبان اس قرآن کی متحمل ہو سکتی تھی۔ **يُرَآءُوۡنَ النَّاسَ** (4:142)۔ محض دکھانے کے لیے اجتماعِ صلوٰۃ میں شریک ہوتے ہیں کہ ہم بھی تمہاری جماعت میں شامل ہیں۔ اس طرح عزیزانِ من! آپ دیکھ رہے ہیں کہ بالکل سیدھے قیام بھی ہو رہا ہے' رکوع بھی ہو رہا ہے' سجدہ بھی ہو رہا ہے' دعا بھی مانگی جا رہی ہیں' قرآت بھی بڑی بلند آواز سے ہو رہی ہے بلکہ حروف حلق کے نیچے سے بھی نکالے جا رہے ہیں' کمان بھی ہے' تانت بھی ہے' نہایت اعلیٰ درجے کے فرسٹ کلاس تیر بھی ہیں۔ ان میں

---

❶ اَلسَّهْوَةُ کے لفظ کے بارے میں ''تاج العروس'' اور ''المفردات فِیْ غَرِیْبِ الْقُرْاٰنِ'' اور ''محیط الحیط'' جیسی معروف لغات میں یہ لکھا ہے کہ ''آسانی سے کھینچنے والی کمان کو اَلسَّهْوَةُ کہتے ہیں۔'' ابن فارس نے ''مقاییس اللغۃ'' میں لکھا ہے کہ ''اس مادہ کے بیشتر معانی کا تعلق غفلت اور سکون سے ہے۔ جَاءَ سَهْوًا رَّهْوًا وہ بڑے سکون کے ساتھ آیا۔

❷ اَلْکِسْلُ کے بارے میں ''تاج العروس'' اور ''المفرداتُ فِیْ غَرِیْبِ الْقُرْاٰنِ'' میں یوں لکھا ہے کہ ''اَلْکِسْلُ۔ روئی دھننے کی کمان کی تانت جو کمان سے الگ کر دی گئی ہو۔'' اس معنی کے لحاظ سے (4:142) کا مطلب ہے کہ ''منافقت برتنے والے نظامِ صلوٰۃ میں شریک تو ہوتے ہیں لیکن اس انداز سے کہ کمان الگ ہے اور تانت الگ۔ یعنی ظاہری طور پر یہ سب کچھ ہو رہا ہے لیکن نتیجہ کچھ مرتب نہیں ہوتا۔

سے ایک ایک دیکھ لیجیے کہ **یُرَآءُوْنَ النَّاسَ** (4:142)۔ یہ تمام چیزیں دکھائی دے رہی ہیں مگر **وَلَا یَذْکُرُوْنَ اللّٰہَ اِلَّا قَلِیْلًا** (4:142)۔ ان کے سامنے قانونِ خداوندی نہیں ہوتا۔ بس اب تو پھر معاملہ ختم ہوگیا۔ اب انہوں نے تانت بھی الگ رکھی' کمان بھی الگ رکھی' تیر بھی الگ رکھا۔ آگے آیا ہے کہ اس اجتماعِ صلوٰۃ سے مقصد یہ تھا کہ **یَذْکُرُوْنَ اللّٰہَ** (4:142)۔ قانون خداوندی کی یاد تازہ کر لی جائے۔ مگر یہاں تو اجتماعِ صلوٰۃ کے بعد ذکر کی' اور الا اللہ کی ضربیں بھی لگتی ہیں۔ پوچھا کہ تمہاری یہ کیفیت کیوں ہے؟ پھر کہا کہ **مُذَبْذَبِیْنَ بَیْنَ ذٰلِکَ لَآ اِلٰی ھٰٓؤُلَآءِ وَلَآ اِلٰی ھٰٓؤُلَآءِ** (4:143)۔ ان کی اس روش سے انہیں وہ اطمینان حاصل ہی نہیں ہوسکتا جو یقینِ محکم کا لازمی نتیجہ ہوتا ہے۔ یہ پریشان خاطر' یہ مخبوط الحواس' درمیان میں لٹکے رہتے ہیں' نہ ادھر کے نہ اُدھر کے۔

عزیزانِ من! ان منافقین سے مخاطب ہوکر کہا جارہا ہے کہ اے کم بختو! ایمان نہیں لاتے تو کفر ہی اختیار کرلو' کچھ طبعی فائدے تو ہوجائیں گے' کچھ دنیاوی مفاد تو مل جائیں گے۔ شعلہ مستعجل ہی سہی' تھوڑے سے وقت کے لیے ہی سہی' ہنگامی مفاد ہی سہی' کچھ تو حاصل ہوجائے گا لیکن دراصل ایمان میں پختگی تو ایک طرف رہی کفر میں بھی ان کی پختگی نہیں۔ نہ ادھر کے ہیں نہ اُدھر کے ہیں۔ کیا بات ہے مذبذین[1] کی! تذبذب کا لفظ تو ہمارے ہاں بھی استعمال ہوتا ہے۔ کبھی آپ نے مکھی کی طرف دیکھا۔ اُس کا تو پتہ ہی نہیں چلتا کہ یہاں سے اڑے گی تو کہاں جا بیٹھے گی۔ یہ ہر آن اڑنے کی فکر میں ہوتی ہے۔ اس کا کوئی متعین مقام نہیں ہوتا' کوئی متعین رخ نہیں ہوتا' اب یہاں بیٹھی ہے' تھوڑی ہی دیر میں اُدھر آ بیٹھی ہے۔ یہیں سے یہ لفظ مذبذبین نکلا ہے۔ اسے یکسوئی نہیں ہوتی' نہ اِدھر نہ اُدھر۔ اسی طرح ان منافقین کی یہ کیفیت ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ یہ لوگ جماعتوں کے لیے سب سے زیادہ خطرناک ہوتے ہیں۔ وہ جسے آپ یقین کی پختگی کہتے ہیں' وہ ان میں نہیں ہوتی۔ ہاں یہ ہوسکتا ہے کہ ایک بات غلط ہو لیکن آپ جہالت کی وجہ سے' لاعلمی کی وجہ سے' اسے صحیح سمجھ کے' اس پہ یقین رکھیں۔ اس سے آپ یکسو تو ہوگئے' مگر ہر شخص جو آپ سے واقف ہے' وہ جانتا ہے کہ یہ کیا مانتا ہے' اور یہ کیا کرے گا۔ یہ بڑی چیز ہے کہ ہر شخص کو دوسرے کے متعلق یہ معلوم ہو کہ اگر فلاں بات ہوئی تو اس کا Reaction (ردِ عمل) کیا ہوگا۔

قرآن کی نظر میں مومن کی تعریف

قرآنِ کریم نے اللہ تعالیٰ کے ضابطۂ قوانین کے حقائق کو مان کر اپنی زندگی کا نصب العین بنانے والوں کو مومن کہا ہے۔ ہمارے ہاں تو مومن کا ایک ہی ترجمہ ہوا ہے۔ وہ ہے: Believer (اعتقاد رکھنے والا)۔ اس کے لیے To believe (اعتقاد رکھنا) ہم نے Verb

---

[1] ذُبَابٌ۔ مکھیاں۔ مکھیوں کو ذُبَابٌ اس لیے کہا جاتا ہے کہ انہیں ہٹایا اور دُور کیا جاتا ہے یا اس وجہ سے کہ انہیں ایک جگہ قرار نہیں ہوتا۔ اس مادہ (ذ ب ب یا ذ ب ذ ب) میں یہ دونوں مفہوم پائے جاتے ہیں۔ ابن فارس کی ''مقاییس اللغۃ'' میں لکھا ہے کہ اس مادہ کے بنیادی معنی اضطراب وحرکت کے ہیں۔ امام راغب اصفہانی نے اپنی تالیف ''المفرداتُ فِیْ غَرِیْبِ الْقُرْاٰنِ'' میں لکھا ہے کہ یہ لفظ ہر حرکت واضطراب (ترددا ور ڈھلمل یقین) کے لیے آتا ہے۔

(فعل) استعمال کرلیا اور اس سے آگے کچھ ذہن میں نہیں آتا کہ یہ کیا چیز ہے جسے Believe (اعتقاد رکھنا) کہتے ہیں یا مان لینا کہتے ہیں۔ٹھیک ہے کہ یہ کسی صداقت پہ یقین کر لینا بھی ہے' لیکن مومن کے تو معنی امن دینے والا بھی ہے۔قرآن نے تو خود خدا کو بھی المومن کہا ہے۔اگر مومن کے معنی صرف ایمان لانے والا ہو تو پھر خدا کے متعلق کیا کہیں گے کہ وہ کس پہ ایمان لاتا ہے۔ہم تو خدا پہ ایمان لاتے ہیں۔مومن کا تو مادہ ہی امن (ا م ن) ہے۔مومن عالمِ انسانیت کے امن کا ذمہ دار ہوتا ہے۔المومن وہ ہوتا ہے جس کے ہاتھوں سے دوسرے اطمینان سے رہیں' کہیں کہ اس کی طرف سے مجھے خطرہ نہیں ہے۔اور کتنا خوشگوار و دل خوش کن ہے وہ معاشرہ جس میں ایک مومن کو دوسرے مومن کے متعلق یہ یقین ہوتا ہے کہ مجھے اس سے خطرہ نہیں اور اس سے بڑھ کر ہر انسان کو اسکے متعلق یقین ہوتا ہے کہ اس سے مجھے خطرہ نہیں۔اس میں مومن ہی نہیں بلکہ مومن و کافر' دنیا کے تمام انسان' اس کے اندر موجود ہیں تو مومن کی تو شان یہ ہوگی کہ اس کے متعلق ہر ایک کو یقین ہو کہ اس سے مجھے خطرہ نہیں۔یہ یقین کیسے ہوسکتا ہے؟ اس سے کہ ہر انسان کو یہ معلوم ہو کہ یہ کبھی نہیں مکرے گا۔ جیسے ہم کہتے ہیں کہ یہ آدمی بڑا با اصول ہے' ہمیں پتہ ہے کہ یہ ایسا نہیں کرے گا' اس پہ اعتبار کرو' یہ کبھی نہیں مکرے گا۔[1] آپ دیکھتے ہیں کہ اس سے کتنا اطمینان اور امن ہوسکتا ہے۔انسان کو ایسے شخصوں سے معاملہ کرتے وقت بڑا امن ہوتا ہے' اطمینان ہوتا ہے کہ یہ ایسا نہیں کرے گا۔یہ معلوم ہے کہ اس کا فلاں معاملے پہ Reaction (ردِّعمل) کیا ہوگا۔یہ تو ایک فرد کی بات ہے۔اگر ایک قوم ہو' مومنین کی ایک جماعت ہو' تو پھر ساری دنیا کی اقوام کو یہ معلوم ہوگا کہ فلاں معاملے میں اس قوم کا Reaction (ردعمل) کیا ہوگا۔انہیں یقین ہوگا کہ یہ قوم دھاندلی نہیں کرے گی۔انہیں یقین ہوگا کہ اگر انہوں نے معاہدہ کرلیا تو اس پہ استوار رہیں گے۔انہیں یقین ہوگا کہ اگر انہوں نے کسی بات کے متعلق بھی اقرار کرلیا تو پورا کریں گے۔آپ سوچیے کہ اس قوم کے ہاتھوں دوسری اقوام اور عالمِ انسانیت کس طرح امن میں رہے گی۔

عملی طور پر منافقین کی حالت

عزیزانِ من! منافقین جس بھی جماعت میں ہوں' اس جماعت کے افراد کو بھی یقین نہیں ہوتا کہ یہ آنِ واحد میں کیا کردیں گے۔ ان میں کا ہر فرد ساتھ چلا جارہا ہے' آپ کو ہر لمحے اسکی طرف دیکھنا پڑتا ہے کہ آستیں میں خنجر تو نہیں چھپا ہوا۔آپ کسی ایسے شخص کے ساتھ دس قدم چل کے دیکھیے' جس پہ آپ کو یقین نہ ہو' بلکہ ذہن میں یہ ہو کہ پتہ نہیں یہ کس وقت وار کردے گا۔آپ دیکھیں گے کہ آپ پہ کیا گزرتی ہے۔جماعتوں کے اندر یہ افراد ہیں جو کسی قسم کا کسی کو امن اور چین لینے ہی نہیں دیتے' دل کا اطمینان اٹھ جاتا ہے۔اپنے اس ساتھی کی طرف سے ہر وقت آپ کو خطرہ محسوس ہوتا رہتا ہے خواہ وہ وار نہ ہی کرے۔کہا کہ ان کی کیفیت یہ ہے کہ ان کا Reaction ردِعمل'

---

[1] اقرار کرکے انکار کرنا۔

بندھا ہوا نہیں ہوتا' مقرر نہیں ہوتا' محکم یقینی نہیں ہوتا' ہر آن غیر یقینی کی صورتِ حال ہوتی ہے۔ **لَآ اِلٰی هٰٓؤُلَآءِ وَ لَآ اِلٰی هٰٓؤُلَآءِ** (4:143)۔ یہ یکسو ہو کر اِدھر کے اور نہ ہی یکسو ہو کر اُدھر کے رہتے ہیں۔ سچ تو یہ ہے کہ آپ کو معلوم ہی نہیں کہ یہ اِدھر کے ہیں یا اُدھر کے ہیں' وقت پہ یہ کیا کریں گے۔ کچھ پتہ نہیں کہ ان کا حصول کیا ہے۔ اگر انہیں ادھر فائدہ نظر آتا ہے تو وہ اِدھر ہو جاتے ہیں اور اگر اُدھر بھی فائدہ نظر آتا ہے تو وہ اُدھر منہ کر لیتے ہیں۔ بظاہر یہ نظر آتا ہے کہ ایسے لوگ دونوں طرف سے فائدہ اٹھا لیتے ہیں۔ یہی کہا کرتے ہیں کہ یہ ٹھیک ہے کہ اِدھر سے بھی لو اور اُدھر سے بھی مارو۔ یہ لوگ موقع پرست (Opportunist) ہوتے ہیں۔ قرآن کہتا ہے کہ یہ ان کی غلط نگہی ہے کہ اس طرح سے دوہرا فائدہ ہوتا ہے۔ ان کی حال کی زندگی بھی تباہ ہو جاتی ہے اور مستقبل کی بھی۔ دنیا میں بھی خسارہ اور آخرت میں بھی۔ اِس روش کا یہ نتیجہ ہوتا ہے کہ **خَسِرَ الدُّنْيَا وَ الْاٰخِرَةَ** (22:11)۔ آخرت کا نقصان تو بہت بڑی چیز ہے' اسی دنیا کے اندر بھی جب فریب دہی کا نقاب اٹھتا ہے تو اس وقت دیکھیے' اس کی کیفیت کیا ہوتی ہے۔ یہ معاشرے کا ذلیل ترین فرد ہوتا ہے۔ **ذٰلِكَ هُوَ الْخُسْرَانُ الْمُبِيْنُ** (22:11)۔ اور یہ خسارہ ایسا کھلا ہوا ہے (جس کے لیے کسی دلیل و برہان کی ضرورت نہیں۔ اس لحاظ سے) کہا کہ ذرا اس نقصان پہ نگاہ ڈالیے' کتنا کھلا ہوا نقصان ہے لیکن منافق تو اس کو سمجھتا ہی نہیں' وہ تو اپنی بڑی کاریگری سمجھتا ہے کہ اُسے بھی دھوکا دیا' اِسے بھی دھوکا دیا۔ صاحب! یہ ہے وہ جماعت جس سے قرآنِ کریم نے شروع سے آخر تک بہت زیادہ محتاط رہنے کی تاکید کی ہوئی ہے۔ کھلے ہوئے دشمن کے متعلق تو آپ کو معلوم ہے کہ یہ اُسکی طاقت ہے' یہ اُس کے ارادے ہیں' یہ اُس کے عزائم ہیں' یہ اس کی تدابیر ہیں۔ آپ انکی مدافعت کا سامان کر سکتے ہیں لیکن یہ جو آپ کو آستین میں خنجر چھپائے ہوئے ملتا ہے' جو آپ کو بظاہر دوست کی طرح ملتا ہے' آپ کو اُس سے موافقت کا سامان کرنے میں بہت ہی دقت پیش آتی ہے' آپ اس سے دھوکا بھی کھا جاتے ہیں۔ یہ جو جماعت کے اندر منافق ہیں' یہ طبقہ سب سے زیادہ نقصان دہ ہوتا ہے' اور جوں جوں کسی جماعت کے اندر یقین کمزور ہوتا چلا جاتا ہے' منافقت بڑھتی چلی جاتی ہے۔ اس دور میں تو یہ مرض وبائی مرض کی طرح پھیل چکا ہے۔ صاحب! ساری ہی فضا اس سے بھر گئی ہے۔ جب دوسرے مقامات آئیں گے تو میں گناؤں گا کہ قرآن کریم کیا کہتا ہے۔

قرآنی معاشرے میں منافقت بتدریج کم ہوتی چلی جاتی ہے

عزیزانِ من! قرآن کہتا یہ ہے کہ جس معاشرے کے اندر عام روش یہ ہو کہ ہر کام قاعدے اور قانون کے مطابق ہوتا چلا جائے تو وہاں منافقت کم ہوتی چلی جاتی ہے۔ جب افراد کو یقین ہو کہ یہ کام قاعدے اور قانون کے مطابق ہو جائے گا تو یہ یقین بجائے خویش اس قانون کے محکم ہونے کی ایک دلیل بن جاتا ہے اور اگر وہ قاعدے اور قانون کے خلاف ہوتا چلا جائے' دھاندلی ہوتی چلی جائے تو یہ افراد جن کے ہاتھوں دھاندلی ہوتی ہے ان کا تو احترام جاتا ہی ہے' خود قانون کا احترام بھی نگاہوں سے اٹھ جاتا ہے۔ ہر شخص یہ کہتا ہے کہ نہیں'

صاحب! قاعدے اور قانون سے کیا بنتا ہے۔ دیانتدار بن کے بھی ہم نے دیکھ لیا۔ کیا ہوتا ہے؟ ہم نے نقصان ہی اٹھایا۔ یقین کمزور ہوتا چلا جاتا ہے' منافقت بڑھتی چلی جاتی ہے۔ پھر اس کے بعد اگر دنیا میں اُس جماعت کا وجود قائم ہو جائے جو قانون کا عملاً احترام سکھا دے تو وہ دوسروں کے امن کی خود ضامن ہو جاتی ہے۔ یہ ہے وہ معاشرہ جو قرآن قائم کرتا ہے۔ اِس کے برعکس منافقین کی دھوکا دہی کی یہ ذہنیت اس لیے پیدا ہوتی ہے کہ انہیں قوانینِ خداوندی کی محکمیت پر یقین نہیں ہوتا چنانچہ جب انہیں ان قوانین کی اطاعت سے بزعم خویش نقصان ہوتا دکھائی دیتا ہے' تو قرآن کہتا ہے کہ ان کی کیفیت یہ ہو جاتی ہے کہ **يَدْعُوا مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَا يَضُرُّهٗ وَمَا لَا يَنْفَعُهٗ ذٰلِكَ هُوَ الضَّلٰلُ الْبَعِيْدُ** (22:12)۔ وہ خدا کو چھوڑ کر دوسری قوتوں کو پکارنے لگتے ہیں حالانکہ حقیقت یہ ہے کہ انہیں اس کی مقدرت ہی نہیں ہوتی کہ کسی کو نفع یا نقصان پہنچا ئیں۔ کیا اس سے بڑی گمراہی کوئی اور بھی ہو سکتی ہے؟ نہیں قطعاً نہیں ہو سکتی۔ قرآن کی اگلی آیت میں ہے اور ہمارا روزمرہ کا تجربہ بھی ہے کہ اس طرح خدا کو چھوڑ کر دوسری قوتوں کے مطابق عمل کرنے سے کچھ مفاد تو حاصل ہو ہی جاتے ہیں اور یہ جو قرآن نے کہا ہے کہ یہ چیز ان کے اقتدار کی نہیں ہوتی' دھاندلی کی ہوتی ہے' جو کسی کو وہ نفع پہنچا دیتے ہیں اس قسم کے ان منافقین کی تائید کرنے والے لوگ ان کے پشت و پناہ بننے والے' انہیں فائدے پہنچا دیتے ہیں جبکہ یہ قاعدے اور قانون کے مطابق فائدہ نہیں پہنچا ہوا ہوتا۔

ایک نفع کا دوسرے نفع کے ساتھ موازنہ

قرآن نے' عزیزانِ من! اگلی بات عجیب کہی ہے کہ **يَدْعُوا لَمَنْ ضَرُّهٗٓ اَقْرَبُ مِنْ نَّفْعِهٖ** (22:13)۔ یہ ایسی قوتوں کو پکارتے ہیں جن کا نقصان' اُن کے نفع سے زیادہ قریب ہوتا ہے۔ سو کتنے ہی بُرے ہیں ان کے یہ کارساز اور کتنے بُرے ہیں ان کے یہ رفیق! اب یہاں یہ نہیں کہا ہے کہ نفع ہوتا ہی نہیں ہے۔ کہا یہ ہے کہ ذرا اِس نفع کا جو حاصل ہوا' اور اُس قیمت کا جو ادا کی گئی' موازنہ کر کے دیکھیے اور پھر دیکھیے کہ نفع زیادہ ہوا یا نقصان زیادہ ہوا۔ اب اس موقع پر موازنہ کرنے کے لیے اگر آپ کا لیول فزیکل (طبعی) زندگی کا مفاد ہی ہے تو پھر تو آپ یہ کیا کہیں گے کہ نہیں' صاحب! نفع زیادہ ہی ہے۔ اتنا بڑا ٹھیکہ مل گیا' پرمٹ مل گیا' لائسنس مل گیا' الاٹمنٹ ہو گئی' اور اس میں میرا خرچ کیا آیا ہے بس یونہی ایک دفعہ دعوت ہی کی تھی اور کیا ہوا تھا' اور اتنا خرچ ہو گیا تو نفع تو زیادہ ہو گیا لیکن قرآن تو بہت دُور جاتا ہے۔ اور ڈنکے کی چوٹ کہتے ہے کہ انسانیت کے شرف و مجد کو مادیت (Materialism) میں نہیں تولا جا سکتا۔

شرفِ انسانیت کو مادیت کے ترازو میں نہیں تولا جاتا

عزیزانِ من! قرآن کہتا یہ ہے کہ اگر ایک انسان اپنی انسانیت کی قیمت پر کوئی فیصلہ کرے تو ہر وہ فائدہ' جو اسے اس طرح منافقت اور غلط طریقے سے حاصل ہو گا' اس کے لیے اسے اپنے شرفِ انسانیت میں سے کچھ نہ کچھ بیچنا پڑے گا۔ اور دنیا میں ہر وہ فائدہ جو شرفِ

انسانیت کو بیچ کر حاصل کیا جائے گا اُس میں نقصان زیادہ ہے اور فائدہ کم ہے۔ قرآن عجیب چیزیں کہہ جاتا ہے۔ فائدے اور نقصان کے کچھ پیمانے بھی تو ہونے چاہئیں۔ ٹھیک ہے' روپوں کے پیمانے سے ماپیں گے تو آپ کو فائدہ ہی فائدہ نظر آئے گا لیکن وہ کہتا ہے کہ ذرا پیمانوں کو بدل کے تو دیکھیے۔ اگر تُو انسان کہلاتا ہے' تو یاد رکھ! کہ انسانیت بھی تو اپنی کوئی قیمت رکھتی ہے۔ جب بھی تو نے اسے بیچا تو جو بھی دنیا کا تو فائدہ اٹھائے گا' تو وہ انسانیت کے پیمانے پر نقصان کا سودا ہوگا' نفع کا سودا نہیں ہوگا۔ وہ تو یہ کہتا ہے کہ

اگر یک ذرّہ کم گردد زانگیزِ وجود من

بایں قیمت نمی گیرم حیاتِ جاودانے را

اگر میرے شرفِ انسانیت سے ایک ذرہ بھی کہیں کم ہوتا ہے تو اس کی قیمت میں اگر مجھے حیاتِ جاوید ملے تو میں وہ بھی لینے کو تیار نہیں ہوں۔

عزیزانِ من! شرفِ انسانیت کا اگر ایک ذرہ بھی کم ہو جائے اور اس کے عوض مجھے حیاتِ جاوداں مل جائے تو میں وہ بھی لینے کو تیار نہیں۔ [1] پگدی نئیں مینوں' جنوں کیندے نیں نا پنجابی اچ۔ نئیں بھئی! اے نئیں پگدا سودا سانوں' مہنگا پیندا اے۔ [2] اور اسے آپ سوچ لیجیے۔ یہ تو الگ بات ہے کہ پھر آہستہ آہستہ' ایک غلط معاشرے کے اندر احساسِ زیاں ہی جاتا رہتا ہے۔ انسانیت کی جو قدر و قیمت ہے' وہ ختم ہو جاتی ہے۔ انسان حیوان کے لیول (سطح) پہ آ جاتا ہے۔ حیوان میں عزتِ نفس کا احساس و شعور نہیں ہوتا۔ اس کے نزدیک فائدہ اور نقصان صرف طبعی ہوتا ہے' کسی حیوات کے اندر عزتِ نفس کا احساس نہیں ہوتا۔ یہ تو انسانی سطحِ زندگی ہے' جہاں یہ شعور' یہ احساس' بیدار ہوتا ہے۔ یہ عزتِ خویش وہی ہے جسے شعورِ نفس' Self Consciousness' کہتے ہیں۔

حیوان میں شعورِ ذات (عزتِ نفس کا احساس) نہیں ہوتا

حیوانات [3] میں صرف Simple Consciousness ہوتا ہے' Self Consciousness (شعورِ ذات) نہیں ہوتا۔

---

[1] اقبالؒ کے نزدیک زندگی کا مقصود تحفظ و استحکام خودی ہے۔ نیک اعمال وہ ہیں جو خودی کو مستحکم کرتے ہیں اور برے اعمال وہ ہیں جن سے خودی میں ضعف اور اضمحلال پیدا ہوتا ہے۔ حیاتِ جاوید خودی کے استحکام سے حاصل ہوتا ہے۔

[2] یہ وہی ہے جسے پنجابی میں کہتے ہیں کہ ''مجھے وارا نہیں کھاتا''' نہیں' بھائی! یہ سودا ہمیں وارا نہیں کھاتا۔ ہمیں مہنگا پڑتا ہے۔

[3] میکانکی تصورِ کائنات کی رو سے (ا) مادی ذرات (Particles) اور توانائی (Energy) کسی نہ کسی طرح وجود میں آ گئے تھے (ب) ان کے امتزاج سے مادی اشیاء مرتب ہو گئیں اور مادے (Matter) کے ارتقاء (Evolution) سے کسی نہ کسی طرح زندگی ظہور میں آ گئی (ج) زندگی نے اپنے ارتقائی منازل طے کیے تو اس میں کسی نہ کسی طرح سادہ شعور (Simple Consciousness) پیدا ہو گیا اور اس کے مزید ارتقاء سے شعورِ ذات (Self Consciouness) پیدا ہو گیا۔ اور اب کہتے ہیں کہ زندگی مادہ کی پیداوار نہیں۔ بے شمار مسائل ایسے ہیں کہ جنہیں سائنس حل کرنے کی کوشش تک بھی نہیں کر سکی۔ وہ مسائل جن کے آگے عصرِ حاضر کا سائنسدان اپنے تمام علوم و فنون کے آلات و ادویات کے باوجود ایسا ہی بے بس دکھائی دیتا ہے جیسا زمانہ قدیم کا کوئی وحشی یا چار برس کا بچہ۔

اُن میں عزت نفس کا احساس نہیں ہوتا بلکہ ان کے ہاں تو عزتِ نفس کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ اوناں نے منہ مارنا' پنج ست ڈنڈے وی پے جان تاں کی اے۔ ایدھروں ہکیا اُدھر جا کے فیر منہ ماردتا۔ گالیاں وی پے جن تاں کی اے' اُدھر گئے' فیر منہ ماردتا۔ ❶ ان کے پیش نظر تو فقط چارے کو ہی منہ مارنا ہے۔ یہ جو کچھ ہو رہا ہے' وہ طبعی چیز ہوتی ہے' عزتِ نفس نہیں ہوتی لیکن اگر انسانیت کا معیار آپ کے سامنے ہے تو پھر تو کیفیت یہ ہو جاتی ہے کہ

پانی پانی کر گئی مجھ کو قلندر کی یہ بات
تو جھکا جب غیر کے آگے' نہ تن تیرا نہ من

(اقبالؒ: بالِ جبریل۔1996' ص۔53)

پھر تو ستیاناس ہو گیا۔ یہ شخص ❷ **خَسِرَ الدُّنْيَا وَالْاٰخِرَةَ**(22:11) کا ترجمہ کر جاتا ہے۔

اقبالؒ کے نزدیک رازِ قلندری کا مفہوم

عزیزانِ من! ''جاوید کے نام'' میں اقبالؒ نے لکھا تھا کہ:

خودی نہ بیچ غریبی میں نام پیدا کر ❸

خودی نہ بیچ کہہ کر بتایا تھا کہ یہی وہ چیز ہے جسے رازِ قلندری کہا جاتا ہے۔ قلندر کے معنی ''شرفِ انسانیت کا احساس رکھنے والا'' کے ہیں۔ عزیزانِ من! اگر شرفِ انسانیت کو بیچ کر مفاد حاصل کیے جاتے ہیں تو نقصان ہی نقصان ہے اور قرآن یہ کہہ رہا ہے کہ اس طرح سے

---

❶ انہوں (حیوانات) نے تو جلدی جلدی کھانا ہی ہے خواہ انہیں ڈنڈے بھی پڑیں تو بھی کوئی پرواہ نہیں۔ یہاں سے ہٹایا تو ادھر جا کر کھانے لگے خواہ انہیں گالیاں بھی دی جائیں تب بھی انہیں تو جلدی جلدی کھانا ہی ہے۔

❷ علامہ ڈاکٹر محمد اقبال رحمہ اللہ (1938 - 1877) مفکر اسلام۔

❸ جب لندن میں جاوید اقبال کے ہاتھ کا لکھا ہوا پہلا خط آیا تو ڈاکٹر محمد اقبالؒ (1938 - 1877) نے ''جاوید کے نام'' کے عنوان سے اپنی ایک نظم لکھی جس کے مقطع کا دوسرا مصرعہ یہ ہے پوری نظم یوں ہے:

دیارِ عشق میں اپنا مقام پیدا کر — نیا زمانہ' نئے صبح و شام پیدا کر
خدا اگر دلِ فطرت شناس دے تجھ کو — سکوتِ لالہ و گل سے کلام پیدا کر
اٹھا نہ شیشہ گرانِ فرنگ کے احساں — سفالِ ہند سے میناؤ جام پید اکر
میں شاخِ تاک ہوں' میری غزل ہے میرا ثمر — مرے ثمر سے مئے لالہ فام پید اکر
مرا طریق امیری نہیں' فقیری ہے — خودی نہ بیچ' غریبی میں نام پیدا کر!

(بالِ جبریل' نیشنل بک فاؤنڈیشن' اسلام آباد' 1996ء' ص۔۱۶۳۰)

تمہیں جو بھی فائدہ پہنچانے پہ آمادہ ہوگا' یاد رکھو! وہ شرف انسانیت کی یہ قیمت لے کر تمہیں فائدہ دیگا' اس کے بغیر نہیں۔ شرفِ انسانیت میں قیمت کا یہ سوال نہیں ہے کہ وہ رشوت میں تم سے روپے لے۔ قیمت تو مختلف انداز سے لی جاتی ہے۔ دراصل یہ ایک Tendency (رجحان) ہے۔ جس میں انسان کو ذلیل کر کے انتہائی خوشی محسوس کی جاتی ہے۔ آجکل کی سائیکولوجی (علم نفسیات) اس رجحان کو نکھار کر سامنے لا رہی ہے۔ اس میں یہی نہیں ہوتا کہ انسان دوسرے سے مال چھینتا ہے' یہ بھی نہیں ہوتا کہ دوسرے کو جان سے مار دیتا ہے' نہیں' ایسا نہیں بلکہ ہوتا یہ ہے کہ اسے ذلیل کر کے خوش ہوتا ہے۔ اس میں انتہائی خوشی یہ ہوتی ہے کہ زندہ بھی رکھا جائے' اور ذلیل بھی کیا جائے۔ ہر شخص جو قاعدے قانون کے خلاف دھاندلی سے کسی کو فائدہ پہنچا رہا ہوتا ہے' وہ اور کوئی قیمت نہیں بھی لیتا لیکن اسکی عزت کی قیمت تو مانگتا ہی ہے۔ جب شرفِ انسانیت کا یہ احساس مٹ جائے' تو انسان حیوانی سطح کی زندگی گزارنے لگتا ہے۔ وہ افراد ہوں یا گروہ ہو جن میں پھر یہ احساس ہی باقی نہیں رہتا تو وہ حیوان کے لیول (سطح) پہ آجاتے ہیں۔ قرآن کہتا ہے کہ اگر انسانیت کی سطح زندگی کو بیچ کر حیوانی سطح پہ چلے گئے' تو دنیا میں اس سے بڑا کوئی اور نقصان نہیں ہوگا۔ اس لیے قرآن کہتا ہے۔ **يَدۡعُوۡا لَمَنۡ ضَرُّهٗۤ اَقۡرَبُ مِنۡ نَّفۡعِهٖ ؕ لَبِئۡسَ الۡمَوۡلٰى وَلَبِئۡسَ الۡعَشِيۡرُ** (22:13) یہ ایسی قوتوں کو پکارتے ہیں جن کا نقصان' ان کے نفع سے زیادہ قریب ہوتا ہے' سو کتنے برے ہیں ان کے یہ کارساز اور کتنے بُرے ہیں ان کے یہ رفیق! اس لیے قرآن نے واضح کر دیا کہ اس قسم کا آدمی' جو تمہاری عزتِ نفس خرید کے' تمہیں فائدہ پہنچا دیتا ہے' اس قسم کے آدمی کا آقا ہونا تو ایک طرف رہا ہے' اسکا تو دوست ہونا بھی وجہ لعنت ہے' یہاں لفظ دوست بھی نہیں آیا ہے۔ عشیر ہی آیا ہے' یعنی اس قسم کے آدمی کا محض ساتھی ہونا بھی وجہ ذلت ہے۔ ذرا دیکھیے تو وہ ان سب کی کیا قیمت دیتا ہے! یہ صورت ہے۔

عزتِ نفس کے بعد دین و دانش کی نیلامی

عزیزانِ من! جب عزتِ نفس کا احساس نہیں رہتا تو بقول اقبالؒ (1938ء-1877ء) انسان دین و دانش کو بھی بڑی سستی قیمت کے عوض بیچ دیتا ہے۔ اسے یوں سمجھو کہ بدن کو زندہ رکھنے کے لیے وہ جان بیچ دیتا ہے۔ اس کے برعکس خدائی قاعدے اور قانون کے مطابق عزتِ نفس دینے میں دین و دانش کی نیلامی نہیں ہوتی کیونکہ اُسے معلوم ہے کہ جو رب العلمین ہے' وہ روٹی بھی دیتا ہے' جان بھی بخشتا ہے اور جو عزتِ نفس کے عوض روٹی دیتا ہے' وہ جان نکال لیتا ہے' باقی صرف بدن (Physical Body) کی زندگی ہوتی ہے' شرفِ انسانیت نام کی کوئی شے نہیں ہوتی۔

بدن کے بدلے جان کا سودا

عزیزانِ من! اب سوچیے! کیا اب اس آیت کے معنی سمجھ میں آئے؟ جو عزتِ نفس' شرفِ انسانیت کو بیچ کر مفادات حاصل کرتے ہیں اُن کے متعلق قرآن نے کہا ہے کہ **يَدۡعُوۡا لَمَنۡ ضَرُّهٗۤ اَقۡرَبُ مِنۡ نَّفۡعِهٖ** (22:13) یہ ایسی قوتوں کو پکارتے ہیں جن کا نقصان'

ان کے نفع سے زیادہ قریب ہوتا ہے۔اس طرح قرآن نے واضح کر دیا کہ اے انسان! جب تو خدا کے ان قاعدوں اور قوانین کو چھوڑ کر کسی کے پاس منفعت حاصل کرنے کے لیے جاتا ہے' تو یاد رکھ! وہ تجھے کچھ دے تو دے گا لیکن ذرا اس پیمانہ انسانیت سے حساب کر کے دیکھ کہ اُس سے نقصان کتنا ہوا' تو نے اس کے مقابلے میں اس کی کتنی بڑی قیمت ادا کی اس کے برعکس اگر تم خدا کے قاعدے کے مطابق یہ منفعت چاہو تو اِنَّ اللّٰهَ يُدۡخِلُ الَّذِيۡنَ اٰمَنُوۡا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جَنّٰتٍ تَجۡرِىۡ مِنۡ تَحۡتِهَا الۡاَنۡهٰرُ (22:14) خدا انہیں ایسی زندگی عطا کر دیتا ہے جس کی شادابیوں میں کبھی فرق نہیں آتا۔لیکن اس کے لیے شرط یہ ہے کہ وہ قوانین خداوندی کی محکمیت پر یقین رکھیں اور ان کے مطابق ایسے کام کریں جن سے ان کی ذات کی صلاحیتیں بیدار ہوں اور انسانی معاشرے کے بگڑے ہوئے کام سنوریں تو پھر یہ معاشرہ قائم ہوتا ہے۔اس کی خوشحالیاں اور خوشگواریاں خزاں نادیدہ ہوتی ہیں۔اسی طرح ایمان کے ہاتھوں خدا کے پروگرام کے مطابق کام کرنے سے جو کچھ حاصل ہوتا ہے اس میں عزتِ نفس برقرار رہتی ہے' تکریم انسانیت برقرار رہتی ہے۔ درحقیقت اس پروگرام کے سانچے (Model) میں اِنَّ اللّٰهَ يَفۡعَلُ مَا يُرِيۡدُ (22:14) یہ سب کچھ خدا کے اس قانونِ مکافات کے مطابق ہوتا ہے جسے اس نے اپنی منشاء اور ارادے کے مطابق ایسا بنایا ہے۔

فائدے کا حصول مگر بڑے نقصان کے ساتھ

عزیزانِ من! اب تم یہ کہو گے کہ صاحب! یہ پیمانے کس قسم کے ہیں کہ ذرا عزتِ نفس بیچ دیجیے تو اس کا جو فائدہ حاصل ہوگا وہ بڑے ہی نقصان کا ہوگا' اگر ان کے مطابق کام کیجیے تو نقصان میں بھی فائدہ ہوگا' تو یہ پیمانے کیسے ہیں اور کیوں ہیں؟ ان کے لیے کہا کہ یہ پیمانے تمہارے مقرر کردہ نہیں ہیں۔یہ اس خدا کے مقرر کردہ ہیں جس نے تمہیں حیوانی سطح زندگی سے انسانی سطحِ زندگی پہ پہنچایا ہے۔اب سوال یہ ہے کہ انسانی سطح پہ یہ شعور کیوں ہے؟ یہ احساس کیوں ہے' اور درمیان میں یہ عزتِ نفس کہیں سے کیوں آ گئی؟ خدا قرآن کریم میں کہتا ہے کہ تم یہ ''کیوں'' نہیں پوچھ سکتے' یہ شعور' احساس اور عزتِ نفس تمہارے پیدا کردہ نہیں ہیں۔ہم تمہیں حیوان کی سطح سے بلند کر کے انسان کی سطح پر لائے ہیں' ہم نے تمہیں احسنِ تقویم بنایا ہے۔یہ ہماری مشیت کا پروگرام تھا کہ حیوان سے اوپر ہماری ایک اور مخلوق ہو جس میں عزتِ نفس ہو' شرفِ انسانیت کا احساس ہو' جس کے اندر اسکے پیمانے (Measures) مختلف ہو جائیں گے۔اب اگر تم کہو کہ صاحب! یہ خوامخوہ کے لیے ایسے پیمانے مقرر کر دیئے۔گھوڑے گدھے کی طرح انسان بھی اسی طرح سے چرتے پھرتے' تو ٹھیک ہی ہوتا۔ ذرا سوچو تو! تم پھر بلندی سے پستی پر ہی آنا چاہتے ہو۔کیوں؟

بلندی (مقامِ انسانیت) سے پستی (مقامِ حیوانیت) پہ گرنا چنداں مشکل نہیں

عزیزانِ من! کہا کہ انسان کے گھوڑے گدھے کی طرح چلنے' چرنے اور پھرنے کے اس سلسلہ میں تم نہیں پوچھ سکتے۔یہ ہمارا

پروگرام تھا۔ ٹھیک ہے، تمہیں یہ چیز" نئیں پگدی' جنوں کیندے ہیگے نے۔"[1] جاؤ' حیوانی سطح پر چلے جاؤ' تمہیں کوئی روک نہیں ہے بلکہ اس میں تو بڑی آسانی ہے۔ قرآن نے تو اسے آواز دینا کہا ہے' پہاڑ کی چوٹی سے پتھر کا چھوڑ دینا کہا ہے۔ پتھر کو وہاں قائم رکھنا یا آگے لے جانا مشکل ہوتا ہے' اس کا نیچے گرانا تو مشکل ہی نہیں ہوتا۔ اسی طرح حیوانی سطح پہ اترنا چاہو تو ایک منٹ میں اتر سکتے ہو۔ چنداں مشکل نہیں ہے۔ اس لیے تم جاؤ' اتر جاؤ' ہم سے یہ کیوں کہتے ہو کہ ہمیں انسانی سطح پہ کیوں پیدا کر دیا؟ نہیں ماننا تو نیچے اتر جائیے۔

عزیزانِ من! آج اترے ہوئے ہی تو پھرتے ہیں۔ اگر تمہیں اس پہ یقین نہیں آ رہا کہ عزت و ذلت کے یہ پیمانے نہیں ہیں' بلکہ پیمانہ صرف دولت کا ہے اس لیے کہتے ہو کہ منفعتیں ہاتھ آ جاتی ہیں' تو پھر باقی سب کچھ ہو جاتا ہے۔ عزت بھی مل جاتی ہے' چوہدراہٹ بھی مل جاتی ہے۔ وہ روز یہی کچھ کہتے اور کرتے ہیں' کہ صاحب! پیسہ ہووے تے سب کچھ ہونداہیگا اے۔ اور پیسہ نہ ہو تو آدمی چرخے دی مانند اے۔[2] لہٰذا اُن کے قول کے مطابق آج کے اس دور میں عزت و شرف کی جانچ کا پیمانہ دولت ہی رہ جاتا ہے جس کے پاس زیادہ دولت ہوتی ہے وہی زیادہ قابلِ عزت واحترام ہوتا ہے۔ اس سلسلے میں کہا کہ اگر یہی چیز تمہارے ذہن میں رچی بسی ہے کہ یہ اقدار' یہ پیمانے، یہ اصول، یہ شرفِ انسانیت' یہ قاعدے اور یہ قانون' سب لغو ہیں تو پھر سنو: **مَنۡ كَانَ يَظُنُّ اَنۡ لَّنۡ يَّنۡصُرَهُ اللّٰهُ فِى الدُّنۡيَا وَالۡاٰخِرَةِ فَلۡيَمۡدُدۡ بِسَبَبٍ اِلَى السَّمَآءِ ثُمَّ لۡيَقۡطَعۡ فَلۡيَنۡظُرۡ هَلۡ يُذۡهِبَنَّ كَيۡدُهٗ مَا يَغِيۡظُ** (22:15) اگر کوئی شخص یہ سمجھتا ہے کہ انسانی اعمال کی نتیجہ خیزی میں' کسی خارجی قانون اور اصول کو کوئی دخل نہیں اور جو لوگ یہ کہتے ہیں کہ حال اور مستقبل کی خوشگواریاں' خدا کی نصرت' یعنی اس کے قانون کے مطابق چلنے سے حاصل ہوتی ہیں' وہ غلطی پر ہیں' تو اسے چاہیے کہ اپنے تمام مادی ذرائع کو کام میں لا کر سماوی اقدار (قوانینِ خداوندی) سے اپنا رشتہ منقطع کرے (یُذۡهِبَنَّ)[3] اور پھر دیکھ لے کہ کیا اس کی اس تدبیر سے وہ حقائق واقعی کالعدم ہو جاتے ہیں' جن کے تصور سے اس کا خون کھولتا تھا؟ عزیزانِ من! ایسا ہونا ناممکن ہے۔ قوانینِ خداوندی کی صورت ایسی نہیں ہے کہ تم انہیں مانو تو وہ اثر انگیز ہوں اور اگر انہیں ماننا چھوڑ دو تو تمہارے معاملات سے ان کا کوئی تعلق باقی نہ رہے۔ انسانی معاملات' بہرحال' ان کے تابع رہیں گے' خواہ انہیں کوئی مانے یا نہ مانے۔ انسان ان سے اپنا رشتہ منقطع کر ہی نہیں سکتا۔ یہ ان سے بھاگ کر کہیں جا ہی نہیں سکتا' نہ اس دنیا میں' نہ اگلی' بعد کی' دنیا میں۔

---

[1] جسے کہتے ہیں کہ وارا نہیں کھاتی۔

[2] دام بنائے کام۔ پیسہ ہو تو سب کچھ ہو جاتا ہے اور اگر پیسہ نہ ہو تو انسان دربدر پھرتا ہے' بے یار و مددگار' بے کاہ و کو:

پیسہ ہی رنگ و 'بو' پیسہ ہی مال ہے پیسہ نہ ہو تو آدمی چرخے کی مال ہے

[3] صاحبِ کشاف نے "زمخشری کی تفسیر" میں لکھا ہے کہ اَذۡهَبَهٗ کے معنی ہیں: "اس کو زائل کر دیا' دُور کر دیا' ناپید کر دیا" "تاج العروس میں لکھا ہے کہ اگر ذَهَبَ کے ساتھ عَنۡ آئے تو اس کے معنی چھوڑ دینے کے ہوتے ہیں اور اگر اِلٰی آئے" تو اس کے معنی متوجہ ہونے کے ہوتے ہیں۔"

قرآنی تعلیم سے دُوری کی بنیادی وجہ ہمارے مروجہ تراجم ہیں

عزیزانِ من! مندرجہ بالا آیت کا عام ترجمہ ایسا کیا جاتا ہے جس سے بات سمجھ میں نہیں آتی۔ عام طور پہ یہ کہا جاتا ہے کہ یہ آیت قرآن کریم کی مشکل آیات میں سے ہے۔ یہ اس لیے ہے کہ ہم اپنے ہاں عربی کے الفاظ کو اردو میں لے آئے ہیں' تو اردو کے وہ الفاظ عربی کے ان الفاظ کے وہ معنی دیتے ہی نہیں ہیں جو اُن عربی الفاظ کے ہوتے ہیں' پھر اس پر طرہ یہ کہ ہم اردو الفاظ کے ان معنی کی رو سے مفہوم سمجھنا چاہتے ہیں۔ تو وہ آج اس میں فٹ نہیں بیٹھتا۔ وہیں سے مشکل پیدا ہو جاتی ہے۔ اگر ہم عربی زبان سے یا عرب کے ان محاوروں سے معنی پوچھیں تو بات آسان ہو جاتی ہے۔ اس آیت کا عام ترجمہ تو یہ کیا جاتا ہے کہ جسے یہ خیال ہو کہ اللہ دنیا اور آخرت میں اس کی مدد نہیں کرے گا' تو چاہیے کہ وہ اپنے آپ کو کسی ذریعے سے آسمان پر لے جائے' پھر اسے قطع کردے' پھر دیکھے کہ اس کی یہ کوشش و تدبیر اس چیز کو دُور کر دیتی ہیں' رد کر دیتی ہے' جس پر وہ غیظ میں ہے یا جو اسے ناگوار ہے۔'' اس ترجمے سے بات سمجھ میں نہیں آتی۔

عزیزان من! آپ بھی بتایئے کہ اس ترجمے سے آپ کیا سمجھے؟ اگر آپ اس آیت سے کچھ بھی نہ سمجھتے تو پھر بھی بات بہتر ہوتی لیکن اس ترجمہ سے آپ ایسا غلط سمجھے کہ بیڑہ ہی غرق ہو گیا۔ اگر کچھ نہ سمجھتے تو صرف یہ ہوتا کہ انہیں قرآن کے متعلق معلومات نہیں ہیں۔ مگر یہاں اس آیت کے ترجمے سے یہ معلومات ہوئیں کہ صاحب! ''باتاں پوندا پیا اے۔ اے تے بجھارتاں پوندا پیا ہیگا''۔ اے بڑی بری ہے جیہڑی سمجھ اچ اوندی اے۔''❶ یہ جو آج آپ کے دین سے' قرآن سے' برگشتہ ہوئے پھر رہے ہیں' یہ وہ نہیں ہیں جنہیں کچھ نہیں سمجھ میں آیا تھا۔ یہ تو وہ ہیں جنہیں سمجھ میں یہ آیا تھا کہ صاحب! یہ قرآن تو ایسی کتاب ہے جس میں کوئی بات ہی پلے نہیں پڑتی۔ عزیزانِ من! یہ چیزیں نقصان کرتی ہیں۔

ہاں تو بات یہ چلی آ رہی ہے کہ نفع اور نقصان کے پیمانے مختلف ہیں' اور پھر غلط انداز' غلط قاعدے' غلط طریقے اور غلط تدابیر کے ذریعے تم جو کچھ حاصل کرتے ہو' اس پر بہت خوش ہو۔ اس کے بعد یوں کہتے ہو کہ نہیں صاحب! ہم نے دیکھ لیا ہے کہ غلط طریقے استعمال کرنے سے کچھ نہیں بگڑتا' موج ہی موج ہوتی ہے۔ کہاں کے یہ قاعدے' کہاں کے یہ قانون؟ یہ دیانتداری لیے پھرتے ہیں' اصول لیے پھرتے ہیں' بھلا بتاؤ تو سہی کہ انہیں ان سے کیا ملا؟ کچھ نہیں۔ اس کے برعکس روز یہ دیکھ لیجیے کہ شبا شب ملیں (Industries) بنائیں۔ اب موج کرتے ہیں۔ ان کا کچھ بھی نہیں بگڑتا۔ صاحب! یہ دن بدن پھولتے پھلتے چلے جاتے ہیں۔ شرفِ انسانیت کو بھلا کر تمہارے ذہن میں روز یہ خیال پیدا ہوتا ہے اور پھر جوں جوں یہ معاشرہ غلط اور غلط کاری میں ذرا لمبا ہوتا جاتا ہے۔ یہ خیال پختہ ہوتا چلا جاتا ہے کہ ہاں صاحب! اس غلط کاری سے کچھ پکڑ دکڑ نہیں ہوتی۔ اصل چیز یہی ہے کہ صاحب! جس طرح سے بھی ہو: کماؤ اور کھاؤ۔ عزیزانِ من! بات یہ ہے کہ یہ چیز بڑی مغالطہ آفریں ہے۔ طبعی زندگی کے قوانین کا نتیجہ' طبعی طور پر' Physically سامنے آتا

---

❶ یہ (قرآن تو) بجھ بجھول (بجھارت) ہے' یہ تو محض بجھارتیں ڈالتا ہے' جو کچھ سمجھ میں آتا ہے وہ کوئی اچھی بات نہیں ہے۔

ہے اور جلدی آ جاتا ہے۔ آگ میں ہاتھ ڈالیے' جل جاتا ہے۔ ایک منٹ میں پتہ چل جاتا ہے کہ آگ جلانے والی چیز ہے۔ سخت پیاس میں پانی پیجیے تو آپ کی پیاس بجھ جاتی ہے۔ آپ کو معلوم ہوجاتا ہے کہ پانی پیاس بجھانے والا ہے' زندگی دینے والی چیز ہے۔ سنکھیا کھائیے' ہلاکت ہوجاتی ہے' فوراً محسوس ہوجاتا ہے لیکن چوری کا گھی کھانے سے بھی ہلاکت ہوجاتی ہے مگر محسوس نہیں ہوتا۔ یہ اس لیے ہے کہ ہم اس کا احساس پھر انہی حیوانی پیمانوں سے کرتے ہیں۔ انسانی پیمانوں (Measures) سے اسے جانچتے ہی نہیں اسی لیے مغالطے میں رہتے ہیں اور سمجھتے ہیں کہ چوری کے اس گھی کے کھانے سے کوئی نقصان نہیں ہوا۔

چوری کا مال بھینس پر بھی اثرات نہیں ڈالتا

عزیزانِ من! یہ ٹھیک ہے کہ اگر آپ اپنی گائے یا بھینس کو چوری کا دودھ بھی پلاتے چلے جائیں یا اپنی نیک کمائی کا پلاتے چلے جائیں تو وہاں اس کا دودھ صحت کے لحاظ سے ایک ہی اثر کرے گا۔ بیل اپنے مالک کے کھیت سے جا کے چارہ چر لے یا غیر کے کھیت سے چر لے' بیل کے اندر جا کے یہ چارا کوئی فرق نہیں پیدا کرے گا۔ Physical Laws (طبعی قوانین) میں اقدار کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔ اقدار تو انسانی ذات (Human Personality) پہ اپنے اثرات مرتب کرتی ہیں۔ O اور H2 [1] کے ایٹموں سے اگر دریپا سنگھ اور ہری داس لیبارٹری میں تجربہ کرے گا تو پانی کا ایک سالمہ (Molecule) پیدا ہوجائے گا۔ اگر یہی کام عبدالرحمٰن کرے گا' تو وہ بھی وہی قطرۂ آب پیدا ہوگا۔ Physical Laws (طبعی قوانین) میں اقدار نہیں آتیں' اقدار کا سوال تو انسانی زندگی میں آتا ہے۔

معاشرتی زندگی میں اقدارِ خداوندی کے اثرات اور تاریخ کا پیمانہ

قدرت نے انسانی زندگی کا کچھ ایسا انداز رکھ دیا ہے کہ یہاں جس قسم کا معاشرہ ہوتا ہے' اس قسم کے نتائج پیدا ہوتے ہیں۔ فرد بیچارہ معاشرے کے اندر بڑا ہی مجبور ہوجاتا ہے۔ ہم غلط معاشرے میں فرد کو دیکھتے ہیں' وہ دیانتدار بنتا ہے لیکن بددیانت دوکاندار اس بیچارے کا کاروبار چلنے ہی نہیں دیتے۔ دفتروں کے اندر ذرا آجکل دیانتدار بن کے دیکھیے' انسان کی زندگی دوبھر ہوجاتی ہے۔ آہستہ آہستہ انسان غیر شعوری طور پہ اس نتیجے پہ پہنچ جاتا ہے کہ نہیں صاحب! یہ اصول' یہ قانون' یہ قاعدے' کوئی شے ہی نہیں ہیں۔ اصل میں مشکل یہ ہے کہ یہ کیسے پتہ چلے کہ غلط نظام' غلط معاشرہ' آخرالامر تباہ کن ہوتا ہے؟ یہ صرف تاریخ سے پتہ چلتا ہے۔ تاریخ کا دَور بڑا لمبا ہوتا ہے۔ اس کے نتائج صدیوں میں جا کے برآمد ہوتے ہیں' دنوں میں نہیں ہوتے' لمحوں میں نہیں ہوتے۔ وہ جو خدا کا ایک ایک دن ہزار ہزار سال کا ہوتا ہے' وہ تاریخ کے ادوار (Periods) ہیں۔ اب یہ قرآن کا چیلنج ہے کہ ایسا ہی ہوتا ہے اور دنیا بھر کی تاریخ اس کا بین ثبوت ہے۔ قرآن تو ایک حقیقت یا اصول بیان کرتا ہے۔ اس کے بعد دلوں میں جو شکوک ابھرتے ہیں فوراً ان کا ازالہ ساتھ کے ساتھ کر دیتا ہے۔ غلط

---

[1] o۔ یہ آکسیجن (گیس) کا ایک ایٹم' H2= ہائیڈروجن (گیس) کے دو ایٹم

معاشرے میں یہ شک ابھرتا ہے کہ دیانتدار بننے سے کچھ نہیں بنتا' نقصان ہی نقصان ہوتا ہے۔قرآن کہتا ہے کہ جس کو یہ خیال دامن گیر ہو کہ نہیں' صاحب! یہ اصول' یہ قاعدے' یونہی ہیں' ان سے کوئی نصرت نہیں ملتی' اس سے کہا ہے کہ اس معاشرے سے کہو کہ اس میں ترقی کرتا چلا جائے' آسمان کی بلندیوں تک بھی پہنچ جائے' اور اپنے آپ کو ان اقدار سے' ان اصولوں سے' منقطع کر لے' اس کے بعد پھر دیکھ لے کہ اس کا انجام کیا ہوتا ہے؟ اس کا جواب تاریخ کے اوراق میں واضح طور پر ملے گا۔اس سلسلے میں کہا **وَكَذٰلِكَ اَنْزَلْنٰهُ اٰيٰتٍۭ بَيِّنٰتٍ** (22:16)۔اس طرح سے' ہم نے یہ کھلے کھلے دلائل' تمہارے سامنے پیش کر دیئے ہیں۔یہ روشن اور واضح براہین ہیں جن کی تائید کے ساتھ ہم نے اس ضابطۂ قوانین کو نازل کیا ہے۔ ہم تو دھاندلی سے قرآن بھی نہیں منوانا چاہتے۔اس کے لیے دلائل ہیں' بینات ہیں' نشانیاں ہیں' علامات ہیں' اصول ہیں' اقدار ہیں' اور بڑے واضح ہیں' جو ہم نے بیان کر دیئے ہیں لیکن **وَاَنَّ اللّٰهَ يَهْدِيْ مَنْ يُّرِيْدُ** (22:16)۔اس سے راہنمائی اسی کو مل سکتی ہے جو راہنمائی حاصل کرنے کا خواہش مند ہو۔جو شخص اپنی آنکھیں بند کر لے' اسے سورج کی روشنی کیا فائدہ دے سکتی ہے؟

غلط اور صحیح تراجم میں بین فرق

عزیزانِ من! یہاں پھر وہی الفاظ آ گئے: مَنْ يُّرِيْدُ' مَنْ يَّشَآءُ یہ تو وہی بات ہے جو ہمارے ہاں اکثر آتی ہے کہ مَنْ يَّشَآءُ اور مَنْ يُّرِيْدُ کے معنی ہیں کہ ''اللہ تو اسے ہدایت دیتا ہے' جس کو ہدایت دینے کا وہ ارادہ کرے''۔لو! پھر یہ سارے آیات و بینات کاہے کے لیے ہیں؟ انہوں نے کہا کہ کہہ رہا ہے کہ ہم نے واضح دلائل دیئے ہیں۔ان باتوں کے لیے سارے دلائل بھی پیش کر دیئے' وضاحت سے بیان کر دیا' اقوامِ سابقہ کی شہادات بھی پیش کر دیں' اصول بیان کر دیئے۔اب کہا کہ آزما کے دیکھ لیجیے اور اس کے بعد کہا کہ ''بھئی! پھر ہدایت تو وہی ہے' جسے ہم دینا چاہیں''۔ جو مرضی کرلوتسی۔تے آ سارا سلسلہ کاہدے لئی فیر؟[1] قرآن کریم نے اس کا جواب دیا کہ **مَنْ يُّرِيْدُ** (22:16)۔ جو ہدایت لینے کا ارادہ رکھتا ہے' ہدایت تو اسے ہی مل سکتی ہے۔ جو ہدایت لینے کا ارادہ ہی نہیں رکھتا' ہدایت لینا ہی نہیں چاہتا' اسے ہدایت کیسے مل سکتی ہے؟ اگر اصول واضح ہوں' بینات ہوں' کتنے ہی عمدہ محکم قوانین ہوں' کتنی ہی تاریخی شہادات بھی کیوں نہ ہوں' جو انہیں لینا ہی نہیں چاہتا' جو صحیح اقدار اختیار کرنا ہی نہیں چاہتا' وہ ان صحیح اقدار کو کیسے اختیار کرے گا؟ انہیں اختیار کرنے کے لیے تمہارا ارادہ ہونا ضروری ہے۔اب وحدتِ قانون کے اعتراف کی راہ میں سب سے بڑی رکاوٹ مذہبی گروہ بندیاں ہیں۔اس کی وجہ سے انسان اپنی آنکھوں پر اس طرح تعصب کی پٹیاں باندھ لیتا ہے کہ ہزار دلائل و براہین کے باوجود اسے صحیح راستہ دکھائی نہیں دیتا۔ لہٰذا اس قسم کے لوگوں کا باہمی اختلاف یوں نہیں مٹ سکتا۔اس کے لیے کہا کہ **اِنَّ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَالَّذِيْنَ هَادُوْا وَ الصّٰبِئِيْنَ وَالنَّصٰرٰى وَالْمَجُوْسَ وَالَّذِيْنَ اَشْرَكُوْٓا اِنَّ اللّٰهَ يَفْصِلُ بَيْنَهُمْ يَوْمَ الْقِيٰمَةِ اِنَّ اللّٰهَ عَلٰى كُلِّ**

---

[1] جو آپ کی مرضی ہے کر دیکھو۔تو پھر یہ سارا سلسلہ کس لیے ہے؟

شَیۡءٍ شَہِیۡدٌ (22:17)۔ جماعتِ مومنین ہو یا یہودی وصابئین [1] ہوں یا نصاریٰ [2] مجوسی [3] ہوں یا عرب کے مشرکین ہوں۔ ان کے اختلافی معاملات میں فیصلہ کی اب ایک ہی صورت ہے اور وہ یہ کہ یہ اپنے اپنے طریق پر عمل پیرا رہیں۔ جب نتائج سامنے آئیں گے تو بات واضح ہو جائے گی کہ کون خدا کے مقرر کردہ راستے پر گامزن ہے اور کون غلط راستے پر چل رہا ہے۔ خدا کی نگاہوں سے کچھ بھی پوشیدہ نہیں' اس لیے ہر ایک کے عمل کا صحیح صحیح نتیجہ سامنے آجائے گا۔ اسی بات کو دوسرے الفاظ میں یوں بھی کہہ سکتے ہیں کہ اب دنیا میں تم دیکھو گے کہ صحیح انداز پہ چلنے والے بھی ہیں اور غلط انداز پہ چلنے والے بھی ہیں۔ اسی طرح صحیح اور غلط انداز پہ چلنے والی قومیں بھی ہیں۔ وہ قومیں بھی

---

[1] تاج العروس کے مؤلف نے لکھا ہے کہ "اَلصَّابِئُوۡنَ ایک دین سے نکل کر دوسرے دین میں داخل ہونے والے ہیں" لیکن محیط المحیط کے مؤلف کے نزدیک "یہ نصاریٰ کا ایک فرقہ تھا جو ستاروں کی اس طرح تعظیم کرتا تھا جس طرح مسلمان کعبہ کی تعظیم کرتے ہیں"۔ محیط المحیط کے مؤلف کے ہی حوالے سے بعض کا خیال ہے کہ یہ ستارہ پرست یعنی مشرک قوم تھی۔ علامہ محمد عبدہؒ کی شہرہ آفاق تفسیر المنار میں صاحب المنار کا بھی یہی خیال ہے۔ اگرچہ انہوں نے بھی لکھا ہے کہ یہ ایک مستقل ملت ہیں جو مشہور انبیاء پر ایمان رکھتے ہیں لیکن ان کے عقائد بڑے مبہم ہیں"۔ امام راغب اصفہانی نے اپنی مشہور تصنیف "المفردات فی غریب القران" میں یہ بھی لکھا ہے کہ "اَلصَّابِئُوۡنَ حضرت نوحؑ کے دین کی پیروی کرنے والی قوم تھی"۔

پرویزؒ (1985-1903) نے اپنی تصنیف لغات القرآن جلد دوم میں لکھا ہے کہ "ہیسٹنگز کے انسائیکلو پیڈیا آف ریلیجنز اینڈ ایتھکس کے مقالہ نگار کا خیال ہے کہ یہ درحقیقت الکیسائی (Elkesaites) فرقہ کا دوسرا نام ہے۔ یہ یہودیوں سے نکلا ہوا' ایک فرقہ تھا جسے پہلی صدی عیسوی کے قریب فروغ حاصل ہوا۔ گناہوں کو دھونے کے لیے پانی میں بپتسمہ لینا یا غسل کرنا ان کا امتیازی نشان تھا۔ اسی جہت سے عرب انہیں "مغتسلہ" کہتے تھے۔ یہودیوں کے ایسینی فرقہ نے اس جدید مذہب کو زیادہ قبول کیا۔ بعض محققین کا خیال ہے کہ Sampsenes (سیمپسینی) یا Sampsites (سینپسائی) فرقہ جو چوتھی صدی عیسوی میں بحرمیت (Dead Sea) کے قرب وجوار میں پایا جاتا تھا' الکیسائی ہی تھا۔ یہ لوگ خدائے واحد پر ایمان رکھتے تھے اور ہاتھ منہ دھو کر یا غسل کر کے اس کی پرستش کرتے تھے۔ اس لفظ کے لغوی معنی "سورج کی مانند" ہیں۔ کہا جاتا ہے کہ الکیسائی علم نجوم جانتا تھا۔ اس لیے اس فرقہ کو ستاروں سے خاص دل چسپی تھی۔ ظاہر ہے کہ نزولِ قرآن کے وقت' عرب اس فرقہ سے اچھی طرح واقف تھے اور انہیں "صـابئین" کے نام سے پکارتے تھے۔ شاید اس لیے کہ یہ مشہور تھا کہ الکیسائی نے اپنی الہامی کتاب کو اپنے جس جانشین کے سپرد کیا تھا اس کا نام Sobiai (صوبیائی) تھا۔ ممکن ہے اسی سے انہیں Sabians (صابین) کہا جاتا ہو یا ان کے پانی میں بپتسمہ لینے کی وجہ سے۔ ارامی زبان میں اس سے یہی مفہوم ہے۔ ص۔ ۱۰۰۱"

[2] نصاریٰ: حضرت عیسیٰؑ کے متبعین بخلاف ھود (2:111) (اس کا) واحد نَصۡرَانِیٌّ ہے (3:66) یہودی کے بالمقابل۔ نَصۡرَانٌ اور نَصۡرَانِیٌّ دونوں کی جمع نصاریٰ ہے۔ (پرویزؒ: لغات القرآن جلد چہارم' 1961ء' ص۔ 1627)۔

[3] اَلۡمَجُوۡسِیَّۃُ۔ ایک قدیم مذہب جس کی تجدید جناب زرتشت (Zoroaster) نے کی تھی۔ اس مذہب کے ماننے والوں کو مجوس کہتے ہیں۔ (اس کی تصدیق تاج العروس اور محیط المحیط نے بھی کی ہے)۔ زرتشت کے بعد جب اس مذہب کی شکل بگڑی تو اس میں خیر و شر کے لیے اہرمن و یزداں کی دو مستقل قوتوں کو تسلیم کیا گیا۔ قرآن کریم میں اَلۡمَجُوۡس (22:17) کا ذکر یہودیوں' نصرانیوں اور صابیوں کے ساتھ آیا ہے۔ اس لیے کہ اس زمان میں اس مذہب کے پیرو موجود تھے جس سے عرب اچھی طرح واقف تھے۔ اب اس سے عام طور پر پارسی مراد لیے جاتے ہیں جو جناب زرتشت کے متبعین ہیں۔ ابن فارس نے (اپنی تصنیف مقاییس اللغۃ) میں کہا ہے کہ یہ فارسی زبان کا لفظ ہے۔ (پرویزؒ: لغات القرآن جلد چہارم' 1961' ص 1525)

ہیں جو یکلخت مذہب کو چھوڑ چکی ہیں، وہ بھی ہیں کہ جنہوں نے دین کو مذہب میں تبدیل کرلیا ہے، ان کے ہاں وہی صلوٰۃ رہ گئی ہے، جس میں کمان (اَلسَّھْوَۃُ) بھی ہے، تانت (اَلْکِسْلُ) بھی ہے، تیر بھی ہے، مگر نتیجہ کچھ نہیں۔ کہا کہ یہ سارے گروہ ہیں۔ اب مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم (1958ء-1888ء) کے الفاظ میں یہ آیا ہے کہ ''عالمگیر سچائیاں تمام مذاہب میں یکساں پائی جاتی ہیں''[1] تو پھر اللہ تعالیٰ کا بار بار یہ کہنا کہ جب تک تم اس قرآن کو نہیں مانو گے، صحیح ہدایت پہ نہیں پہنچ سکو گے' کاہے کے لیے ہے؟ وہی فرقہ وارانہ بندش ہے، کمہیاری اپنا ای پانڈا سوار دی اے۔[2] یہاں کہا کہ یہ بات نہیں ہے۔

مناظروں کی سوچ کوئی تعمیری نتیجہ پیدا نہیں کرتی

عزیزانِ من! قرآن کہتا ہے کہ یہ بات مناظروں سے طے نہیں ہوسکتی۔ آپ ساری عمر آریوں[3] سے بھی، عیسائیوں سے بھی،

---

1. اس کا انگریزی ترجمہ Are All Religions the Same? کے نام سے چھپ کر منظر عام پر آ چکا ہے۔
2. کمہاری ہمیشہ اپنے ہی برتنوں کو اچھا کہتی ہے اور دوسروں کے مال کو رد کرتی ہے۔
3. قدیم تاریخ ہند میں قیاسات کا رخ اس طرف جاتا ہے کہ کسی ابتدائی زمانہ میں وسط ایشیا میں ایک قوم رہتی تھی جس کا ایک حصہ مشرق کی طرف بڑھا اور کوہ ہندوکش کے راستے ہندوستان میں داخل ہوئے۔ انہوں نے یہاں کے اصل باشندوں کو مفتوح و مغلوب کیا اور گنگا و جمنا کی وادیوں میں سکونت پذیر ہوگئے۔ ان کا نام آریا تھا۔ سیامک (جسے ایران اپنا پیغمبر مانتے تھے) کا دوسرا نام ''پارسا'' تھا۔ اسی کے نام پر ایران کا نام پارس ہوا۔ سیامک کے بعد ہوشنگ کو پیغمبری ملی، جس کا دوسرا نام ''ایران شاہ'' تھا لہٰذا فارس کا دوسرا نام ایران مشہور ہوا اور اس ملک کے رہنے والے ایرانی یا ایرین یا آریا سے موسوم ہوئے۔ ایران میں قدیم زمانہ کے بعض ایسے کتبے ملے ہیں جن میں ایرانی بادشاہوں کے ساتھ آریا کا لفظ لکھا ہوا ہے۔ مثلاً شاہ گستاسپ کے نام کے ساتھ۔ اسی طرح قدیم یونانی مورخ ہیروڈوٹس (Herodotus C. 484 BC-C. 425 BC) نے ایران کے کئی بادشاہوں کے نام کے ساتھ آریا کا لفظ لکھا ہے۔ بعض مستشرقین کا خیال ہے کہ لفظ آریا کا مصدر ''آر'' سے نکلا ہے جس کے معنی کاشتکار کے ہیں۔ بہرحال لفظ آریا کی تحقیق کے متعلق خیالات مختلف ہوں تو ہوں لیکن یہ قیاس قریب قریب متفق علیہ ہے کہ یہ قوم وسط ایشیا سے نکل کر انہی راستوں سے ہندوستان آئی تھی۔ ان کے ہاں وید مروج تھی۔ ایک تحقیق یہ بھی ہے کہ آریہ دراصل سمیری قوم کے قبائل تھے جو کالڈیہ (بابل، میسوپوٹیمیا) میں رہتے تھے اور 4000 اور 3000 ق م کے قریب وہاں سے ہو کر سندھ اور جنوبی پنجاب کی طرف آئے۔ ایشیائے کوچک؛ فنشیا وغیرہ میں ان کی بڑی بڑی آبادیاں تھیں۔ ایک خیال یہ بھی ہے کہ زمانہ قبل از تاریخ کے مصر بھی آریہ تھے۔ بعض مستشرقین کا خیال اس طرف بھی گیا ہے کہ آریہ دراصل بنی اسرائیل کے گم گشتہ قبائل میں سے ہیں۔ جب بخت نصر نے بیت المقدس کو تباہ کیا تو یہودیوں کو غلام بنا کر اپنے ساتھ بابل لے گیا۔ وہاں قریب ستر برس تک رہے۔ جب بیت المقدس کی ازسرنو تعمیر ہوئی تو ان بارہ قبائل میں سے صرف دو اہم قبیلے واپس آ کر متمکن ہوئے، باقی دس قبائل ادھر اُدھر منتشر ہو چکے تھے۔ ان قبائل کو تاریخ ''گم گشتہ قبائل'' قرار دیتی ہے کیونکہ آج تک یقینی طور پر معلوم نہیں ہوسکا کہ یہ قبائل کہاں گئے۔ بعض ان کا سراغ امریکا کے اصل باشندوں اور میکسیکو تک لگاتے ہیں۔ بعض کا خیال ہے کہ افغانستان اور سرحد کے پٹھان یہی گم گشتہ قبائل تھے۔ لیکن اب تحقیق کا رخ اس طرف آ رہا ہے کہ یہ گم گشتہ قبائل ہندوستان کے آریہ ہیں۔ ہندوستان کے برہمن حضرت ابراہیمؑ کی اولاد میں سے ہیں اور اپنے قدیم آبائی مذہب سے برگشتہ ہوگئے تھے۔ براہمن اپنے آپ کو برہما کی اولاد کہتے ہیں۔ محققین کا خیال ہے کہ برہما دراصل ابراہیم (حضرت ابراہیم علیہ السلام) ہی ہیں۔ بہرحال یہ سب تاریخی قیاسات ہیں۔ نہ ابھی تک یہ معلوم ہوسکا ہے کہ آریہ قوم کا اصلی وطن کونسا تھا اور نہ ہی یہ کہ یہ ہندومت کہاں سے چلا اور کیا کیا بنتا رہا۔ (حوالہ: پرویزؒ: معراج انسانیت' 1949ء ص ص 101-65)

مناظرے کرتے چلے آ رہے ہیں۔ آجکل تو یہ دور ختم ہو گیا۔ ہمارے ابتدائی دور میں مناظروں کا بڑا زور ہوا کرتا تھا۔ مناظرہ جیت کے آئے ہیں' جلوس نکل رہا ہے: فاتح کلکتہ زندہ باد۔ ہم نے دلی میں دیکھا کہ ایک بہت بڑے مولوی صاحب' علامہ صاحب ہیں' ان کا جلوس نکل رہا ہے' نعروں کی آوازیں آ رہی ہیں کہ: فاتح کلکتہ' زندہ باد۔ یا اللہ! کلکتہ تو انگریز کے دور سے ابھی تک اسی طرح موجود ہے' وہاں یہ فاتح کلکتہ کیسے چلے آ رہے ہیں؟ ہم نے پوچھا کہ صاحب! کیا صورت ہوئی؟ کہنے لگے: جی' وہ مولانا صاحب ہیں۔ کلکتے میں' حنفیوں کے ساتھ ان کا مباحثہ ہوا تھا۔ یہ اہلحدیث تھے تو وہاں انہوں نے مناظرہ جیتا لیکن اس مناظرے میں ان سے ذرا کوئی تیزی ہو گئی۔ امام اعظم کو کوئی گالیاں دیدیں۔ اُنہوں نے دعویٰ کر دیا۔ انہیں چھ مہینے کی قید ہو گئی۔ کہنے لگے کہ اب یہ قید سے چھوٹ کے آئے ہیں۔ اب ان کا جلوس نکل رہا ہے: فاتح کلکتہ۔

ہم نے نتیجہ قیامت پر اٹھا رکھا ہے

عزیزانِ من! مذہب ہی کے حوالے سے اب اگلی ایک بات آ گئی کہ یوں تو فیصلہ نہیں ہو سکتا۔ فیصلہ کیسے ہو گا؟ صاحب! مذہب پرست طبقے کو آ گے اور بات ہاتھ آ گئی۔ یہاں اسی آیت (22:17) میں لکھا ہوا ہے۔ **يَفۡصِلُ بَيۡنَهُمۡ يَوۡمَ الۡقِيٰمَةِ** (22:17)۔ کہ جی! قیامت کے دن فیصلہ ہو گا۔ ''تے جی سانوں فائدہ کی پہنچا اوہدا۔''[1] او یہاں تو سب اپنے اپنے مذہب اور اپنی اپنی روش پہ مگن رہے۔ قرآن خود کہتا ہے کہ **كُلُّ حِزۡبٍۢ بِمَا لَدَيۡهِمۡ فَرِحُوۡنَ** (30:32)۔ سب اپنی اپنی روش میں مگن ہیں۔ وہ سمجھتے ہیں کہ یہ بالکل ٹھیک ہے اور اگر مرتے دم تک یہی رہا اور جب تک دنیا قائم ہے یہی قصہ رہا کہ باطل پرست اپنی روش میں مگن' حق پرست اپنی روش پہ مگن فیصلہ کن کوئی بات ہو ہی نہیں رہی تو مرنے کے بعد قیامت میں جا کے اگر یہ فیصد ہو بھی گیا کہ جناب! یہ صحیح مذہب تھا' یہ صحیح دین تھا۔ اس کا جھنڈا بلند ہو گا' باقی سرنگوں ہو جائیں گے' تو اس کا فائدہ کیا ہوا؟ اس دنیا میں تو باطل اسی طرح فروغ پا تا رہا' جیسا حق۔ حق تو بلکہ سر نگوں رہا۔ وہی بات ہے کہ ہم نے قیامت' صرف اس قیامت کو سمجھ لیا ہے' جو مرنے کے بعد آنے والی ہے۔ قرآن کی رو سے یہ بات نہیں ہے۔ یہ قیامت کیا ہے جس میں یہ فیصلہ ہو گا؟ عزیزانِ من! یہیں چار آیتیں آ گے چلیے۔ یہی سورۃ الحج کی آیت 56 ہے۔ قرآن نے کہا کہ اس وقت تو معاشروں کے نظام یہ ہیں کہ معاملات کے فیصلے انسانوں کے بنائے ہوئے قوانین کی رو سے ہوتے ہیں' ان کے بنائے ہوئے نظام کی رو سے ہوتے ہیں' ان کے خود وضع کردہ پیمانوں کی رو سے ہوتے ہیں۔ یہ پیمانے' یہ ترازو انسانوں کے خود ساختہ قانون ہیں جس کی وجہ سے حق اور باطل کا فیصلہ ہی نہیں ہو پاتا۔ باطل کی تائید میں جب 51 ووٹ آ جائیں تو وہی حق ہو جاتا ہے۔[2] یہاں جو

---

[1] تو حضور! ہمیں اس کا کیا فائدہ ہوا!

[2] یہاں اشارہ جمہوری طرزِ حکومت میں اکثریت کے فیصلوں کی طرف ہے۔

ہر ایک کو مذہبی آزادی بھی ہے' اور اپنے اپنے طور پہ اپنے اپنے مذہب کے پابند ہیں۔ اور مذہب کے متعلق یہ فیصلہ ہے کہ اس کا نتیجہ قیامت میں نکلنا ہے۔ اس کیوجہ سے ہر ایک اپنے اپنے معاملے میں خوش ہے۔ اگر غلط اور صحیح کے نتائج یہاں برآمد ہونے شروع ہو جائیں تو فیصلہ ہو جائے گا۔ سوال عیسائیت' یہودیت اور مسلمانوں کے ''مذہب'' کا نہیں ہے۔ سوال تو نظام کا ہے۔ ایک نظام خدا کے قوانین کے تابع اور دوسرا انسانوں کے خود ساختہ قوانین کے ماتحت ہے۔ ایک نظام کا دوسرے انسانوں کے بنائے ہوئے نظاموں سے ٹکراؤ ہے' ان کا آپس میں تقابل ہے۔ کہا کہ یہ جو ان کے آپس میں متنازع امور کے فیصلے ہیں کہ حق کونسا ہے اور باطل پہ کون ہے' اس کا فیصلہ اس دن ہوگا جب **اَلْمُلْکُ یَوْمَئِذٍ لِّلّٰہِ** (22:56)۔ قوت و اقتدار' سب کا سب' قانونِ خداوندی کو حاصل ہوگا اور تمام امور کے فیصلے اس (ضابطہ...... قرآن) کے مطابق ہوں گے۔ جب یہ دَور آئے گا' ان متنازع امور...... کہ حق کون ہے؟ اور باطل پہ کون ہے؟...... کے فیصلے ہو جائیں گے۔

تنہا عقل کے زور پر معاشرتی زندگی گزارنے کا نتیجہ

عزیزانِ من! جب سارا اقتدار قوانینِ خداوندی کے ہاتھ میں ہوگا تو **یَحْکُمُ بَیْنَھُمْ** (22:56)۔ اسی قانون کے مطابق یہ ہوگا' اسی کے مطابق پھر یہ فیصلہ ہوگا۔ خدا کے ہاں معیار اور پیمانہ تو یہ مقرر ہے اور قرآن بار بار اس کا ذکر کرتا ہے اور کہتا ہے کہ **وَالْاَمْرُ یَوْمَئِذٍ لِّلّٰہِ** (22:56)۔ اس دور میں قوت و اقتدار' سب کا سب' قانونِ خداوندی کو حاصل ہوگا' تمام امور کے فیصلے اس ضابطہ (قرآن) کے مطابق ہوں گے۔ اس سلسلہ میں قرآن کا کہنا یہ ہے کہ انسان جتنا جی چاہے اپنے ذاتی عقل و فکر کی رو سے' جتنے معاشرے قائم کرنا چاہتا ہے' کرتا چلا جائے' وہ نقصان ہی اٹھاتا چلا جائے گا۔ تجربے پہ تجربے کرتا چلا جائے گا Trial & Error (سعی و خطا) ہوتی چلی جائے گی۔ آخر الامر انسانوں کو اسی پہ پہنچنا ہوگا کہ صحیح انسانی معاشرہ تو وہی ہے جو اقدارِ انسانیت کو سامنے رکھتے ہوئے قائم کیا جائے گا۔ اسے ہی کہتے ہیں قوانینِ خداوندی۔ لہٰذا جب فیصلے کا معیار یہ ہو جائے گا تو اس وقت **یَحْکُمُ بَیْنَھُمْ** (22:56)۔ اسی قانون کے مطابق پھر یہ فیصلہ تمہارے سامنے آ جائے گا کہ کونسا نظام حق کا نظام ہے' اور کونسا نظام باطل کا نظام ہے۔ **فَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فِیْ جَنّٰتِ النَّعِیْمِ o وَالَّذِیْنَ کَفَرُوْا وَکَذَّبُوْا بِاٰیٰتِنَا فَاُولٰٓئِکَ لَھُمْ عَذَابٌ مُّھِیْنٌ** (22:56-57)۔ جو لوگ اس ضابطہ کی صداقت پر یقین رکھتے ہیں اور اس کے متعین کردہ صلاحیت بخش پروگرام پر عمل پیرا ہو رہے ہیں' انہیں زندگی کی خوشحالیاں اور شادابیاں نصیب ہوں گی۔ اور جو لوگ ان قوانین سے انکار کر رہے ہیں اور انہیں جھٹلا رہے ہیں' انہیں ذلت آمیز سزا ملے گی۔ اس طرح قرآن کریم نے دونوں گروہ گنا دیئے۔ اس وقت یہ ہوگا کہ صحیح قوانین کو ماننے' ان قوانین کی صداقتوں پہ یقین رکھنے والا گروہ از حد کامیاب و کامران ہوگا۔ اس کے خلاف چلنے والا بری طرح سے ناکام ہوگا۔ یہ فیصلہ اس وقت ہوگا۔

مذہب کی سطح پر سچائی کا ثبوت مل ہی نہیں سکتا

عزیزانِ من! اس طرح کے فیصلے مناظروں سے نہیں ہو سکتے۔ اصل تو یہ ہے کہ مذہب کا آج تک فیصلہ ہی نہیں ہوا کہ فلاں مذہب سچا ہے اور فلاں مذہب جھوٹا ہے۔ کچھ دلائل دے لیجیے۔ اپنے ہاں الفاظ ہی الفاظ ہیں' شاعری ہے' کرتے چلے جائیے۔ اب قرآن آیا' یہ تو فوراً ہی نظامِ کائنات کی طرف توجہ مبذول کر دیتا ہے۔ کہتا ہے کہ اگر یہ دیکھنا ہو کہ شکل وصورت' رنگ و بو اور اعتقاد و مسالک کے اختلاف کے باوجود' ایک ہی قانونِ خداوندی سب پر کس طرح نافذ ہوتا ہے تو اس کے لیے خارجی کائنات پر غور کرو **اَلَمۡ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ يَسۡجُدُ لَهٗ مَنۡ فِى السَّمٰوٰتِ وَمَنۡ فِى الۡاَرۡضِ وَالشَّمۡسُ وَالۡقَمَرُ وَالنُّجُوۡمُ وَالۡجِبَالُ وَالشَّجَرُ وَالدَّوَآبُّ** (22:18)۔ وہاں نظر آ جائے گا کہ کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے- چاند' سورج' ستارے' پہاڑ' درخت' جاندار مخلوق یہ سب کس طرح قانونِ خداوندی کے سامنے سرِ تسلیم خم کیے ہیں۔ یوں کائنات کی ہر شے قانونِ خداوندی کے سامنے جھکی ہوئی ہے۔ تفصیل میں جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ وہ تو "**اَلَمۡ تَرَ**" کہتا ہے۔ تم دیکھتے نہیں ہو۔ وہ تو محسوس مثال دے کر سمجھا رہا ہے کہ دیکھو! ہے کہیں گنجائش کہ ان میں کہیں ذرا بھی اس قانون کی خلاف ورزی ہو جائے۔ کھیتی پہ کتنی ہی محنت کی جائے لیکن اگر کہیں ذرا سی اس کے قانون کی خلاف ورزی ہو جائے' وقت پہ پانی نہ دیا جائے' زیادہ دیدیا جائے' نتیجہ سامنے آ جاتا ہے۔ کائنات کی ہر شے اس کے سامنے جھکی ہوئی ہے۔ یہ ہر شے **لَهٗ مَنۡ فِى السَّمٰوٰتِ** (22:18) ہے۔ آسمان کے اجرامِ فلکی میں' ارض میں' چاند سورج ستارے پہاڑ درخت' دواب' یہ ساری حیوانی زندگی' سب کی سب اس کے قوانین کے سامنے جھکی ہوئی ہے۔ باقی رہے انسان تو سوال یہ ہے کہ انسان جو اسی کائنات کا حصہ ہے' کیا اس کے قوانین کی حدود سے باہر رہ سکتا ہے؟ یہ کس طرح ہو سکتا ہے؟ فرق اتنا ہے کہ انسان کے علاوہ باقی مخلوق' قوانینِ خداوندی کی اطاعت پہ مجبور ہے اور انسان کو اس کا اختیار دیا گیا ہے کہ یہ چاہے تو ان قوانین کے مطابق زندگی بسر کرے اور چاہے اپنے لیے دوسرا راستہ اختیار کر لے۔ یہ اس اختیار وارادہ کا نتیجہ ہے کہ **وَكَثِيۡرٌ مِّنَ النَّاسِ** (22:18)۔ اکثر انسان قوانین خداوندی کا اتباع کرتے ہیں اور اکثر ان کی خلاف ورزی کرتے ہیں۔ اس طرح سب انسان نہیں بلکہ ان میں سے بھی اکثریت ان کی ہے جو اس کے قوانین کے سامنے جھکے ہوئے ہوتے ہیں۔ "**وَكَثِيۡرٌ**" کے معنی اکثریت نہیں ہوتا یہ ان معنوں میں آتا ہے جن معنوں میں ہم کہتے ہیں کہ some of them یعنی ان میں سے کچھ یہ کرتے ہیں۔ عربی زبان میں "بعض" کے معنوں میں بھی یہ لفظ آتا ہے اور یہیں یہ بات صاف ہو گئی۔ اسے پھر کہہ دوں کہ قرآن کہتا ہے کہ **كَثِيۡرٌ مِّنَ النَّاسِ وَكَثِيۡرٌ حَقَّ عَلَيۡهِ الۡعَذَابُ** (22:18)۔ اکثر انسان' قوانینِ خداوندی کا اتباع کرتے ہیں اور اکثر ان کی خلاف ورزی کرتے ہیں۔ جو خلاف ورزی کرتے ہیں' وہ اس کی سزا بھگتتے ہیں اور وہ سزا یہ ہے کہ ان کی زندگی ذلت و رسوائی کی زندگی ہوتی ہے۔ عزیزانِ من! اس آیت میں کثیر کے معنی یہ نہیں ہیں کہ اکثریت جھکی ہوئی بھی ہے اور اکثریت گمراہ بھی

ہے۔ وہ تو بے معنی بات ہوجاتی ہے کیونکہ اکثریت تو ایک طرف ہوتی ہے۔ عربی مبین میں کثیر کے معنی یہ ہوتا ہے "ان میں سے کچھ ایسا بھی کرتے ہیں، کچھ کی یہ بھی کیفیت ہوتی ہے"۔ اشیائے کائنات میں تو کبھی یہ نہیں ہوتا، وہاں تو ہر نوع اپنے اپنے فرائض کی سرانجام دہی میں قانونِ خداوندی کا اتباع کرتی ہے۔ یہ کبھی نہیں ہوتا کہ کچھ میں اپنے فرائض کی انجام دہی ہو اور کچھ میں نہ ہو۔ البتہ انسانوں میں یہ ہوتا ہے، بعض ایک طرف ہوجاتے ہیں بعض اس کے خلاف بھی چلنے لگ جاتے ہیں لیکن اس بات کو یاد رکھیے! کہ بنیادی اصول یہ ہے: **وَ مَنْ يُّهِنِ اللّٰهُ فَمَالَهٗ مِنْ مُّكْرِمٍ** (22:18)۔ اور جس پر قانونِ خداوندی کی خلاف ورزی سے ذلت وخواری کا عذاب مسلط ہوجائے اسے کوئی عزت وتکریم عطا نہیں کرسکتا۔

ہمارے ہاں کے غلط تراجم کی پیدا کردہ الجھنیں قرآن فہمی میں حائل ہیں

عزیزانِ من! ہمارے ہاں کے غلط ترجمہ کی پیدا کردہ الجھنوں سے قرآن کریم کے تصوراتِ حیات ابھر اور نکھر کر سامنے نہیں آتے۔ اکثر وپیشتر ان تراجم سے ابہام پیدا ہوجاتا ہے۔ اس آیت کے ترجمہ میں بھی صورت حال کچھ ایسی ہی ہے۔ اس کا عام ترجمہ یہ کیا جاتا ہے کہ یاد رکھو! کہ جسے اللہ ذلیل کردے، اسے پھر کوئی عزت نہیں دے سکتا اور آگے یہ ہے کہ **اِنَّ اللّٰهَ يَفْعَلُ مَا يَشَآءُ** (22:18)۔ اللہ جو چاہتا ہے کرتا ہے۔ یہ ہوگیا اس کا ترجمہ۔ اب انسانوں میں سے کچھ صحیح بھی چلتے ہیں اور کچھ غلط چلنے والے بھی ہوتے ہیں۔ پھر یہ ہے کہ **حَقَّ عَلَيْهِ الْعَذَابُ** (22:18)۔ خدا کا عذاب ان کے اوپر مسلط ہوجاتا ہے۔ آگے یہ بھی ہوگیا۔ اب یہ چیز کہ جسے ہم ذلیل کردیں، اسے کوئی عزت نہیں دے سکتا اور پھر یہ کہ ہم جو چاہتے ہیں کرتے ہیں۔ یہاں میں یہ بات پھر دہرا دوں کہ بات یہ نہیں ہے کہ اس ترجمے سے کچھ بھی سمجھ میں نہیں آیا۔ بات یہ ہے کہ جو سمجھ میں آیا وہ بڑا ہی غلط ہے اور پھر اس میں مزید الجھاؤ کے لیے ہمارے ہاں یہ مشہور ہے کہ **تُعِزُّ مَنْ تَشَآءُ وَتُذِلُّ مَنْ تَشَآءُ** (3:25) جسے چاہے عزت بخش دے اور جسے چاہے ذلت۔ اللہ تعالیٰ نے جی، عزت اور ذلت تے اونے اپنے ہتھ اچ رکھی ہوئی ہیگی اے۔ [1] یہ ایک ہی آیت نہیں ہے۔ اس معاملے میں بے شمار آیات سامنے آئیں گی۔ جب تبویب القرآن [2] چھپ کر آپ کے سامنے آجائے گا تو پھر دیکھئے گا کہ اس معاملے کی کتنی ہی آیات ہیں۔ درس میں تو ایک آدھ آیت ہی سامنے لائی جاسکتی ہے۔ عزت اور ذلت کے معیار کے لیے ہے کہ **مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعِزَّةَ** (35:10) جو بھی تمہارے ہاں عزت حاصل کرنا چاہتا ہے۔ اسے ذہن بھی رکھیے کہ یہاں آیت ہے: **مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعِزَّةَ** (35:10) یعنی جو بھی عزت حاصل کرنا چاہتا ہے۔ ہمارے ہاں تو عزت کے معنی صرف Respect ہی رہ گیا ہے۔ عربی زبان میں عزت اور ذلت یہ نہیں ہوتی جسے Grace

---

[1] اللہ تعالیٰ نے عزت اور ذلت تو اپنے ہاتھ میں رکھی ہوئی ہے (جسے چاہے جو بھی دے دے)۔

[2] یہ نومبر 1976ء کی 28 تاریخ کو کہا گیا ہے۔ یہ کتاب زیورِ طباعت سے آراستہ وپیراستہ ہوکر منظر عام پر آچکی ہے۔

(لطف وکرم) اور Disgrace کہتے ہیں۔عربی زبان میں عزت کے معنی ہیں ''قوت واقتدار اور اس کے ساتھ جو Respect (ادب لحاظ) آتی ہے۔'' اور ذلت کے معنی ہوتا ہے ''اقتدار سے محرومی' مسکینی۔ پھر اس محرومی و مسکینی سے جو ذلت آتی ہے''۔ یہ ان عام معنوں میں بھی آتا ہے۔اسے کہہ دیجیے **مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعِزَّةَ** (35:10) جو قوم' قوت اور غلبہ' عزت و تکریم کی حیاتِ تازہ سے بہرہ اندوز ہونا چاہتی ہے' اسے سمجھنا چاہیے کہ **فَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ جَمِيْعًا** (35:10) غلبہ وقوت سب قوانینِ خداوندی کے اتباع سے حاصل ہو سکتے ہیں۔اِس طرح پوری کی پوری عزت' قوت' اقتدار اور Respect (ادب لحاظ) صرف قوانینِ خداوندی کے اتباع سے مل سکتی ہے۔

قرآنی قوانین میں انسانی رفعت اور عزت کا راز مضمر ہے

عزیزانِ من! اس آیت (35:10) میں دو چیزیں کہی گئی ہیں۔ یہ عجیب وغریب چیزیں ہیں۔کہا کہ ایک تو خدا کے قوانین ہیں۔ان قوانین میں یہ چیز موجود ہے کہ ان کے اتباع سے انسان کو رفعت اور بلندی حاصل ہوتی ہے کیونکہ یہ قوانین بذاتِ خود حق پر مبنی ہوتے ہیں۔اس لیے انسان کو رفعت و بلندی پر لے جانے کی' انسان کے عروج وارتقا کی بات ان کے اندر ہی موجود ہوتی ہے۔لیکن سنئے عزیزانِ من! کتنی گہرائی میں قرآن جاتا ہے! کہا ہے کہ اس سلسلہ میں اس بنیادی حقیقت کو یاد رکھنا چاہیے کہ عروج وارتقا...... بلندیوں کی طرف جانے...... کے لیے دو چیزیں ضروری ہیں۔ایک تو **اِلَيْهِ يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ** (35:10) ایسا تصورِ حیات یا نظریۂ زندگی (آئیڈیالوجی) جس میں بڑھنے' پھولنے' پھلنے اور خوشگوار نتائج پیدا کرنے کی صلاحیت ہو۔عزیزانِ من! اس آیت میں طیب کا لفظ آیا ہے۔طیب کے معنی ہوتے ہیں ''صحیح نظریۂ زندگی'' جبکہ ہمارے ہاں تو طیب کا ترجمہ پاک کیا جاتا ہے جس سے بات سمجھ میں نہیں آتی لیکن میں کہونگا کہ آپ سوچیے کہ قرآن طیب کے مقابلے میں تو خبیث (3:179; 5:100; 8:37) کا لفظ لاتا ہے۔وہ نتائج سے بات سمجھاتا ہے۔طیب اس درخت کو کہتے ہیں جو نہایت عمدہ خوشگوار پھل دے اور خبیث' وہ درخت ہوتا ہے جو پھل ہی نہ دے۔اس طرح **الْكَلِمُ الطَّيِّبُ** (35:10) کے معنی ہیں وہ نظریۂ زندگی جس میں پھل دینے کی صلاحیت ہے' ثمر بار ہوسکتا ہے' نتیجہ آور ہوتا ہے۔خدا کے جتنے بھی مقرر کردہ قوانین اور نظریاتِ حیات ہیں' ان میں پھل دینے کی صلاحیت ہے۔بعض وہ بیج ہیں جنہیں لیتے وقت بھی کسان دیکھتا ہے کہ نہیں' صاحب! اینوں تے کیڑا لگا ہویا ہیگا اے۔ [1] اس بیج پہ کتنی ہی محنت کی جائے' وہ فصل اُگ ہی نہیں سکتی۔اس بیج کے اندر نقص ہوتا ہے۔اگر بیج صالح ہوتا ہے' جس میں پھل دینے کی صلاحیت ہوتی ہے' اسی پہ محنت کی جائے گی تو بار آور ہوگا۔خدا نے کہا کہ یہ جو خدا کے دیئے ہوئے نظریاتِ حیات ہیں' یاد رکھو! یہ وہ بیج ہیں' جن کے اندر اگنے کی' بڑھنے کی' پھولنے کی' پھلنے کی' پھل دینے کی' صلاحیت ہے۔اس صلاحیت کی وجہ سے **اِلَيْهِ يَصْعَدُ** (35:10) وہ خدا کی مقرر کردہ منزل کی طرف بڑھتا ہے' خود بڑھتا ہے' اس میں یہ صلاحیت ہے

---

[1] اس (بیج۔Seed) کو تو کیڑا لگا ہوا ہے۔

لیکن یاد رکھیے! عروج وارتقا...... بلندیوں کی طرف جانے کے لیے......دوسری ضروری چیز یہ ہے کہ **وَالْعَمَلُ الصَّالِحُ يَرْفَعُهُ** (35:10) اس کے ساتھ صلاحیت بخش اعمال بروئے کار لائے جائیں جو اس نظریہ حیات کو اوپر اٹھائیں۔ اس طرح بات یہ ہوئی کہ اس نظریۂ زندگی کے ساتھ اس انسان کی صحیح کوشش شامل ہو جائے تو پوچھو نہیں کہ اُس اوپر اٹھنے کی رفتار میں کتنی تیزی آ جاتی ہے۔ یہاں یہ بات ذہن میں رکھیے کہ خدا کی طرف سے عطا کردہ نظریۂ زندگی میں اس کی صلاحیت ہوتی ہے کہ وہ بغیر کسی خارجی سہارے کے خود بخود بلند ہوتا چلا جائے لیکن اس کی یہ رفتار انسانی حساب شمار کی رو سے بہت سست ہوتی ہے۔ جب انسانی اعمال اسے سہارا دیتے ہیں تو اس کی رفتار تیز ہو جاتی ہے۔

صحیح قانون کے ساتھ صحیح انسانی قوتوں کے ملاپ کا ثمر

عزیزانِ من! یہ عربی زبان ہے۔ اس میں یہاں "يَصْعَدُ اور يَرْفَعُهُ" کے الفاظ آئے ہیں۔ اب اگر ہم انہیں اردو کے الفاظ سمجھ کر ان کے معنی لیں تو ان کے یہ اردو میں معنی یہی کریں گے "بلند ہوتا ہے" لیکن عربی جاننے والے جانتے ہیں کہ صعود اور يَرْفَعُهُ میں فرق کیا ہوتا ہے۔ ❶ **يَصْعَدُ الْكَلِمُ الطَّيِّبُ وَالْعَمَلُ الصَّالِحُ يَرْفَعُهُ** ❶ اگر صحیح پھل دینے والا بیج ہو اور اس کے ساتھ کوششیں قانون کے مطابق ہوں یعنی اس کے ساتھ انسان کی صحیح قوتیں، کوششیں، صالح اعمال شامل ہوں تو پوچھو نہیں کہ پھر قانون کے مطابق وہ کس طرح سے ہزار ہزار سال کا جو ان کا ایک ایک دن ہے، لمحوں اور دنوں میں بدل جاتا ہے۔ عزیزانِ من! جب خدا کے کلمۂ طیب کے ساتھ، محمد رسول اللہ ﷺ والذین معہ رضی اللہ عنہم کے اعمال صالحہ آئے تھے تو دنیا نے دیکھ لیا تھا کہ وہ صعود کس طرح ارتقاء میں بدلا ہے۔ تئیس سالہ زندگی کا عرصہ بھی تاریخ میں کوئی عرصہ نہیں ہوتا ہے، یہ تو آنکھ جھپکنے کا عرصہ ہے، آنکھ جھپکتے ہی وہ انقلاب برپا کیا کہ عزیزانِ من! آج تک تاریخ میں اس کی کوئی مثال نہیں ملتی۔ غیر مسلموں سے پوچھیے، وہ بتائیں گے کہ اگر عملِ صالح اس کے ساتھ مل جائیں تو وہ یوں آنکھ جھپکتے ہی ہو جاتا ہے۔ اگر یہ نہ ہوں تو پھر وہ اپنی ہی رفتار سے چلتا رہتا ہے، ہزار سال میں کہیں جا

---

❶ محیط المحیط اور تاج العروس میں لکھا ہے کہ صَعَدَ یا صُعُودٌ کے معنی ہیں "بلند ہونا، دُور تک چلے جانا، اوپر چڑھنا اور رَفَعَ یا يَرْفَعُ کے معنی "بلند کرنا مادی چیز کو بھی اور ناموری اور شہرت کے لیے مرتبہ کو بھی یعنی درجات کی بلندی۔ مگر اس کے بنیادی مفہوم میں شدت یا مبالغہ پایا جاتا ہے یعنی جو کام کرنا اسے تیزی، قوت اور شدت سے کرنا"۔ اسی لیے پرویزؒ نے اپنی لغات القرآن جلد سوم ص 1024 پر لکھا ہے کہ "الیه یصعد الکلم الطیب "خوشگوار نظریۂ حیات، خدا کے مقرر کردہ قانون کے مطابق، بلند ہوتا چلا جاتا ہے۔ وَالْعَمَلُ الصَّالِحُ يُرْفَعُهُ (35:10) عمل صالح......صلاحیت بخش عمل......اسے بہت تیزی سے بلند کرتا ہے، بہت تیزی سے پروان چڑھاتا ہے۔ یعنی خدا کے مقرر کردہ صحیح نظریاتِ زندگی میں اس کی صلاحیت ہوتی ہے کہ وہ بلند ہوتے جائیں اور عام حالات میں وہ خدا کے کائناتی قانون کے مطابق بلند ہوتے رہتے ہیں۔ لیکن اگر ان کے ساتھ انسانوں کے اعمال صالحہ شامل ہو جائیں تو ان کے ذریعے وہ بہت تیزی سے پروان چڑھ جاتے ہیں۔

کے ایک دن پورا ہوتا ہے۔ یہ تاریخی سال ہوتا ہے' یہ تاریخی وقفہ ہوتا ہے۔ اور وہ جو انسانی کوششوں سے ہوتا ہے وہ اس کے پروگرام کے مطابق ہوتا ہے تو وہ تاریخ نے دیکھ لیا۔ یہ ہے **مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعِزَّةَ فَلِلّٰهِ الْعِزَّةُ جَمِيْعًا** (35:10)۔ جو قوم قوت اور غلبہ' عزت وتکریم کی حیاتِ تازہ سے بہرہ اندوز ہونا چاہتی ہے' اسے سمجھ رکھنا چاہیے کہ غلبہ اور قوت سب قوانینِ خداوندی سے حاصل ہو سکتے ہیں۔

عزت کیسے حاصل ہوتی ہے؟

عزیزانِ من! جو عزت چاہتا ہے اُسے کہا ہے کہ یاد رکھو! قانونِ خداوندی کے اتباع سے ہی یہ مل سکتی ہے اور آگے اس کا طریقہ بتا دیا کہ صحیح نظریہ زندگی خدا کا عطا کردہ ہے' اس کے ساتھ انسان کا اپنا عملِ صالح شامل ہو تو پھر دیکھو کہ عزت کیسے حاصل ہوتی ہے۔ اب وہ جو ہمارے ہاں عام تصور آ گیا ہے کہ خدا جسے چاہتا ہے دیتا ہے۔ یہ ''چاہتا ہے'' والی بات نہیں ہے۔ بات یہ ہے کہ ''جو لینا چاہتا ہے۔'' یعنی **مَنْ كَانَ يُرِيْدُ الْعِزَّةَ** (35:10) جو بھی قوت' غلبہ' عزت' تکریم لینا چاہتا ہے' جو بھی اس کا ارادہ کرتا ہے' اسے یہ مل جاتی ہے۔ ''جو بھی ارادہ کرتا ہے۔'' یہ ہے اس کا مفہوم۔ اب یہ تو ہوگئی عزت اور آگے وہی چیز ہے جہاں وہ لفظ آیا ہے کہ **يُهِنِ اللّٰهُ** (22:18) اس لفظ ''ھ و ن''......جس کا مادہ ہے......کے معنی ذلت لیے جاتے ہیں' کسی کو نیچے کی طرف لے جانا کیے جاتے ہیں۔ آیئے بتائیں کہ اس کے کیا اصول ہیں۔ یہاں جو کہا ہے اس کے لیے ہمارے ہاں ترجمہ ہوا تھا کہ جس کو خدا ذلیل کرتا ہے' اس کو کوئی عزت نہیں دے سکتا۔ اب دیکھیے کہ سورۃ الفجر میں کیا کہا ہے۔ سنیے! عزیزانِ من! حقیقت یہ ہے کہ جب انسان وحی کی روشنی سے منہ موڑ لیتا ہے اور عقل وفکر سے کام لینا چھوڑ دیتا ہے تو قانون کا تصور ہی اس کی نگاہوں سے اوجھل ہو جاتا ہے۔ قانون کے تصور سے مراد یہ ہے کہ انسان کو جو کچھ پیش آتا ہے وہ اس کے کسی نہ کسی انفرادی یا اجتماعی عمل کا نتیجہ ہوتا ہے۔ جس کے سامنے یہ حقیقت نہ ہو وہ یہ سمجھتا ہے کہ جو کچھ ہوتا ہے یونہی اتفاقیہ واقع ہو جاتا ہے۔ اس کی اس غلط نگہی کا نتیجہ یہ ہے کہ **فَاَمَّا الْاِنْسَانُ اِذَا مَا ابْتَلٰىهُ رَبُّهٗ فَاَكْرَمَهٗ وَنَعَّمَهٗ فَيَقُوْلُ رَبِّيْٓ اَكْرَمَنِ** (89:15)۔ جب کسی کی زندگی خوشگوار پہلو بدلتی ہے تو وہ یہ نہیں دیکھتا کہ یہ خوشگواریاں کن اسباب کا نتیجہ ہیں۔ وہ کہتا ہے کہ ''یہ خدا کا فضل ہے وہ جسے عزت چاہتا ہے عزت اور آسائش عطا کر دیتا ہے۔'' یعنی اس کے ہاں کوئی قاعدہ قانون مقرر نہیں۔ اس طرح جب انسان کو خوشحالیاں' خوشگواریاں مساعد حالات میں یہ کچھ ملتا ہے' پھولا نہیں سماتا' یہ ھٰذا من فضل ربی کہہ کر پھولتا چلا جاتا ہے' پھر اگلی بات یہ کہی کہ **وَاَمَّآ اِذَا مَا ابْتَلٰىهُ فَقَدَرَ عَلَيْهِ رِزْقَهٗ فَيَقُوْلُ رَبِّيْٓ اَهَانَنِ** (89:16) اور جب اس کی زندگی دوسرا پہلو بدلتی ہے۔ اور اس پر رزق کی تنگی ہو جاتی ہے' تو وہ یہ نہیں سوچتا کہ یہ اس کی غلط روش کا نتیجہ ہے۔ وہ چیخنے چلانے لگ جاتا ہے کہ خدا نے مجھے خواہ مخواہ ناحق بلاسبب ذلیل وخوار کر دیا کہ صاحب! میں نے تو کچھ بھی نہیں کیا تھا۔ ٹھیک ہے جی! جسے وہ چاہے' ذلیل کر دے اور جسے چاہے عزت دیدے۔ یعنی اب بات یہ ہوئی کہ جب اس کی زندگی دوسرا پہلو بدلتی ہے اور اس پر رزق کی تنگی ہو جاتی ہے تو وہ یہ نہیں سوچتا

کہ یہ اس کی کس غلط روش کا نتیجہ ہے۔ وہ چیخنے چلانے لگ جاتا ہے کہ خدا نے مجھے خواہ مخواہ ناحق' بلا سبب ذلیل وخوار کر دیا لیکن خدا یہ کچھ نہیں کرتا۔

ہم کسی کو ذلیل نہیں کرتے: خدا کا فرمان

عزیزانِ من! اگر قرآنِ کریم کے نسخے آپ کے سامنے ہیں تو قرآن کا انداز دیکھیے گا اور پھر عربی زبان کا اسلوب بیان بھی دیکھیے گا کہ وہ یہاں اگلی ہی آیت کے شروع میں کَلَّا (89:17) کہہ کر کیا کہہ جاتا ہے۔ اسے کہا کہ: رک جاؤ' ٹھہر جاؤ' تم غلط کہتے ہو' قطعاً یہ بات نہیں ہے۔ کَـــلَّا (89:17) عربی کا ایک لفظ ہے۔ یہاں اس کے معنی ہیں کہ قطعاً یہ بات نہیں ہے' یہ غلط ہے' ہم یونہی کسی کو ذلیل نہیں کیا کرتے۔ پھر کہا کہ کیا تمہیں پتہ ہے کہ تمہاری تکریم تم سے کیوں چھن گئی؟ سنیئے عزیزانِ من! کہ کیسے عزت وتوقیر چھنتی ہے۔ کہا کہ بَـلْ لَّا تُـكْـرِمُـوْنَ الْيَتِيْمَ (89:17)۔ تمہاری کیفیت یہ تھی کہ معاشرے میں جو تنہا رہ جاتا تھا' تم اسے ذلت کی نگاہ سے دیکھا کرتے تھے' اس لیے ذلیل ہو رہے ہو۔ جو'' تنہا رہ جاتا تھا'' کہہ کر قرآن بڑی بات کہہ گیا ہے۔ اسے پھر دہرا دوں کہ یہاں کہا ہے کہ ایسا سمجھنے والوں سے کہو کہ یہ غلط ہے۔ خدا کسی کو یونہی بلا وجہ ذلیل وخوار نہیں کیا کرتا۔ تم جو یوں ذلیل ہوئے ہو تو اس کی وجہ یہ ہے کہ تم نے ایسا معاشرہ قائم کر رکھا تھا جس میں ان لوگوں کی عزت وتوقیر نہیں ہوتی تھی جو تنہا رہ جائیں۔ وہی قابلِ عزت سمجھا جاتا تھا جس کی پارٹی زیادہ مضبوط ہو۔ جس کا جتھا طاقتور ہو۔ یہ ہے تمہاری ذلت ورسوائی کی اصل وجہ۔

یتیم کا قرآنی مفہوم

ہمارے ہاں تو یتیم کا ترجمہ ہو گیا: جس کے ماں باپ مر جائیں۔ عربی زبان میں تو یہ انہی کو نہیں کہتے۔ انہیں اس لیے یتیم کہتے ہیں کہ وہ تنہا رہ جاتے ہیں۔ عربی زبان میں یتیم ''تنہا'' کو کہتے ہیں' ہمارے ہاں بھی تو آپ کو پتہ ہے کہ دُرِّ یتیم ایک اصطلاح چلی آتی ہے۔ شاعروں کو پتہ ہے کہ جس سیپ میں سے ایک ہی موتی نکلتا ہے وہ بڑا ہی قیمتی ہوتا ہے تو یتیم کے معنی ہوتا ہے: تنہا' یگانہ' اکیلا رہ جانے والا۔ یہاں قرآن نے کہا ہے کہ بَـلْ لَّا تُـكْـرِمُوْنَ الْيَتِيْمَ (89:17)۔ جو معاشرے میں تنہا رہ جاتا تھا' تم اس کی عزت نہیں کرتے تھے۔ تمہارے ہاں عزت اور ذلت کا معیار کیا تھا؟ عزیزانِ من! یہ تھا جتھے کا بڑا ہونا' گروہ کا بڑا ہونا' پارٹی کا بڑا ہونا۔ آپ دیکھیے گا قرآنِ کریم نے جہاں جہاں مخالفین کا ذکر کیا ہے اس میں یہ کہا ہے کہ وہ یہ کہتے تھے کہ ہمارے پاس دولت بھی ہے اور ہمارا جتھا بھی بہت بڑا ہے۔ ذہن میں یہ تھا کہ یہ شاید انسان کا قبائلی دور تھا۔ جب Tribal (قبائلی) زندگی تھی تو ہر Tribe (قبیلہ) میں جو افراد کی نفری یا تعداد ہوتی تھی۔ وہ بڑا Count (وزن) کرتی تھی۔ جس قبیلے کے افراد زیادہ تعداد میں ہوں' وہ بڑا طاقتور قبیلہ گنا جاتا تھا۔ تو ذہن میں آیا کہ یہ قبائلی زندگی کے متعلق ہے۔ لیکن نہیں' ایسا نہیں ہے۔ یہ تو:

بدل کے بھیس زمانے میں پھر سے آتے ہیں ❶

مغربی جمہوریت کا ماحصل: عزت اس کی جو جتھے میں بڑا ہے

عزیزانِ من! آج بھی وہی معیار ہے۔ جس کی پارٹی زیادہ بڑی ہوتی ہے اسی کو عزت مل رہی ہوتی ہے اسی کو قوت مل رہی ہوتی ہے اسی کو اقتدار مل رہا ہوتا ہے اور بڑی پارٹی کا یہ چکر کاٹتے کاٹتے انسان سیاست میں آیا ہے۔ یہ کمبخت مغربی سیاست کی جمہوریت ہے۔ یہ تو وہی قبائلی زندگی ہے یعنی جس کی پارٹی تعداد کے لحاظ سے زیادہ ہو جائے اسی کے ہاتھ میں اقتدار آ جائے۔ یہ ہے نظامِ جمہوریت کہ جس میں ''بندوں کو گنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے''۔ ❷ یعنی نہایت دیانتدار شریف النفس انسان کا بھی ایک ہی ووٹ اور جو دنیا بھر کی بدمعاشیاں کر کے بیٹھا ہوا ہے اس کا بھی ایک ووٹ۔ گدھا گھوڑا دونوں برابر۔ یہ وہی ہے جو اقبال (1877-1938) نے کہا تھا کہ بندوں کو گنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے۔ اور گنتی میں پھر جو نہی اکیاون ہوئے وہی جتھا بڑا وہی پارٹی تعداد بڑھی نفری بڑھی وہی قبائلی زندگی کا تصور آج بھی ہے۔ ہم نے صرف الفاظ ہی بدلے ہیں۔ نتیجہ اس کا یہ ہوتا ہے کہ پھر ہر شخص یہ چاہتا ہے کہ وہ بڑی پارٹی کے ساتھ جا ملے۔ یہ نہیں ہے کہ جو شریف النفس انسان ہیں ان کے ساتھ جا کے ملیں کیونکہ ہم نے معیار اپنے ہاں وہ اکثریت والا مقرر کر دیا ہے۔ اس کے بعد یتیم یعنی فرد کا الگ تنہا رہنا تو ایک طرف وہ جو Minority (اقلیت) میں پارٹی رہ جاتی ہے اس کو بھی کچھ نصیب نہیں ہوتا اور فرد جو اس معاشرے میں تنہا رہ جاتا ہے اسے کیا ملے گا؟

جیسا کہ میں کہا کرتا ہوں کہ اس غلط معاشرے کے اندر تو ہم میں سے ہر ایک یتیم ہے۔ جس پہ مصیبت پڑتی ہے وہ تنہا اس کی مصیبت ہوتی ہے۔ عزیزانِ من! وہ جو ہم جنازے میں مردے کو دس آدمی ساتھ مل کر قبرستان لے جاتے ہیں تو وہ اس لیے ہے کہ اگر پڑا رہے تو بدبو سے ہماری جان عذاب میں آ جائے مردے کی لاش متعفن ہو جائے۔ اس لیے ہم جا کے اکٹھے مل کر اُسے دفنا آتے ہیں۔ اب تو معاشرے میں ہر فرد تنہا رہ جاتا ہے۔

انسانوں نے اپنے ہاں عزت اور ذلت کا معیار بدل دیا ہے

عزیزانِ من! قرآنِ کریم نے ہی کہا ہے کہ تمہارے ہاں عزت و ذلت کا معیار یہ ہو گیا تھا کہ جس کا جتھا بڑا ہوتا تھا جس کی تعداد

---

❶ یہ شعر نماز کے عنوان سے ''ضربِ کلیم'' میں یوں ہے۔

بدل کے بھیس پھر آتے ہیں ہر زمانے میں　　　اگرچہ پیر ہے آدم جواں ہیں لات و منات

(اقبال: ضربِ کلیم نیشنل بک فاؤنڈیشن اسلام آباد 1996، ص-60)

❷ جمہوریت اک طرزِ حکومت ہے کہ جس میں　　　بندوں کو گنا کرتے ہیں تولا نہیں کرتے (اقبال: ضربِ کلیم نیشنل بک فاؤنڈیشن اسلام آباد 1996 ص 171)

اورنفری زیادہ ہوتی تھی' اس کی عزت ہوتی تھی۔ جو تنہا رہ جاتا تھا تم اس کی عزت نہیں کرتے تھے۔ اس کے برعکس معیارِ خداوندی یہ تھا کہ **اِنَّ اَكْرَمَكُمْ عِنْدَ اللّٰهِ اَتْقٰكُمْ** (49:13)۔ میزانِ خداوندی کی رو سے' عزت اور تکریم کا صرف ایک معیار ہے اور وہ یہ کہ تم میں سے کس کی زندگی قوانینِ خداوندی سے زیادہ مطابق ہے' کون ان کی زیادہ اطاعت کرتا ہے۔ جس کی زندگی زیادہ سے زیادہ اس معیار پر پوری اترتی ہے وہی سب سے زیادہ واجب التکریم ہے' خواہ وہ مرد ہو یا عورت یا کسی خاندان یا کسی قبیلے میں پیدا ہوا ہو۔ یہاں معیار فضیلت ذاتی جوہر اور سیرت وکردار کی بلندی ہے۔ تعداد نہیں ہے۔ جس کے جوہرِ ذاتی زیادہ بلند ہیں وہی زیادہ قابلِ عزت ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ چیخ رہے ہو' رو رہے ہو کہ صاحب! ہم ذلیل ہو گئے' خدا نے ہمیں یونہی ذلیل کر دیا۔ انہیں کہا کہ خدا کسی کو یونہی ذلیل نہیں کرتا۔ تمہارے ہاں عزت اور ذلت کا معیار تعداد کی زیادتی ہو گیا تھا۔ وجہ تکریمِ انسان' شرفِ ذاتی' شرفِ انسانیت' نہیں رہا تھا۔ جب یہ کچھ ہو جائے تو اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ جہاں چار ممبر اکٹھے ہوئے ہیں Floor of The House کراس کر کے دوسری طرف جا نکلے۔ عزیزانِ من! دوسرے دن یہ جو Majority (اکثریت) والے ہوتے ہیں' وہ Minority (اقلیت) میں آ جاتے ہیں اور اس طرح فلور کراس کرنے والے اوپر پہنچ جاتے ہیں۔ اس طرح اکثریت والوں کی ساری عزت' سارا اقتدار ذلت میں بدل جاتا ہے لیکن اگر جوہرِ ذاتی عزت کا معیار ہوں تو عزیزانِ من! اسے کوئی نہیں چھین سکتا۔ کہا: تم نے یہ کیا تھا اس لیے یہ بات ہوئی۔ اب یوں رو رہے ہو کہ تم نے کیا کیا تھا۔ آؤ' میں بتاؤں کہ تم کیا کرتے تھے؟ **وَلَا تَحٰٓضُّوْنَ عَلٰى طَعَامِ الْمِسْكِيْنِ** (89:18) اور اس معاشرے میں یہ نہیں ہوتا تھا کہ جس کی چلتی گاڑی' کسی حادثہ کی وجہ سے رک جائے تو تم ایسا انتظام کرو کہ وہ سامانِ زیست سے محروم نہ رہنے پائے۔ صاحبِ استطاعت لوگ نہ خود اس کی مدد کرتے تھے' نہ دوسروں کو اس کی ترغیب دلاتے تھے۔ اس طرح ہوتا یہ تھا کہ جو شخص محنت کرنے سے معذور ہو گیا تھا' حرکت حیات سے رک گیا تھا' تم نہ خود اس کی روٹی کا انتظام کرتے تھے' نہ معاشرے میں یہ کہتے تھے کہ ان کا انتظام زیادہ ضروری ہے۔ اس کے برعکس تمہارا رویہ یہ تھا کہ بھوکا مرتا ہے تو مرنے دیجیے۔ اور اب کہتے ہو کہ تم کیا کرتے تھے؟ تمہارا کیا قصور تھا؟ عزیزانِ من! سنتے جائیے کہ معاشرے میں ذلت کس طرح سے آتی ہے اور معاشرہ کس طرح ذلیل ہو جاتا ہے۔ کہا کہ **وَتَاْكُلُوْنَ التُّرَاثَ اَكْلًا لَّمًّا o وَتُحِبُّوْنَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّا** (89:19-20)۔ تم کرتے یہ تھے کہ جو کچھ تمہارے باپ دادا سے تمہارے قبضے میں آ جاتا' اُسے بھی سمیٹ کر کھا جاتے اور اس کے ساتھ ایسی تدابیر کرتے رہتے کہ دوسروں کا مال بھی' اِدھر اُدھر سے سمیٹ کر' تمہاری ہی طرف کھنچ کر چلا آئے جیسے وادی کا تمام پانی نشیب زمین کی طرف بہہ کر آ جاتا ہے۔ یعنی تم نے ایسا نظامِ سرمایہ داری قائم کر رکھا تھا کہ جس میں چھوٹے چھوٹے سرمائے بڑے سرمایہ کے اندر جذب ہوتے چلے جائیں اور اس طرح دولت چند افراد کے پاس مرتکز ہو کر رہ جائے۔ اس قسم کا نظام کبھی قائم نہیں رہ سکتا۔ یہ وجہ ہے کہ تم اس قدر ذلیل وخوار ہو گئے ہو۔ ہمارے ہاں سے عزت وتکریم نہ یونہی اندھا

دھند ملتی ہے، نہ اندھا دھند چھنتی ہے۔ وہ بھی انسان کے اپنے ہی اعمال کا نتیجہ ہوتا ہے اور یہ بھی اس کی اپنی کرتوتوں کا انجام۔ اسے پھر سن لو کہ باپ جائیداد پیدا کر گیا۔ Industrialist (صنعت کار) تھا' کارخانے لگا گیا' وافر دولت پیدا کر گیا۔ سارا کچھ پتہ نہیں اس نے بھی کس طرح سے کیا اور یہ اس کا بیٹا ہے جو گل چھرے اڑا رہا ہے۔ قرآن کہنے لگا کہ وہ سارے کا سارا سرمایہ تمہا بیٹھے بٹھائے تمہارے پاس آ گیا' تم' Millionaire (کروڑ پتی) کے بیٹے ہونے کی جہت سے معزز بن گئے' یوں تم نے عزت حاصل کی تھی اور یہ ساری چیزیں تو اضافی ہیں' آ بھی سکتی ہیں' چلی بھی جائیں گی۔ اس کے یوں آنے سے اگر معزز بن گیا تو چلے جانے سے تم ذلیل ہو گئے اور یہ جو تمہارا جوہرِ ذاتی تھا' وہ تو نہ یوں آتا ہے' نہ یوں جاتا ہے۔ وہ تو محنت سے حاصل کیا ہوا ہوتا ہے۔ اسے پھر کوئی چور نہیں لے جا سکتا۔ قرآن کہنے لگا کہ ایک تو یہ چیز تھی۔

دوسروں کی ضرورت' نشیب کا گڑھا' بارش اور انسانی ہوس: ایک معاشی نشیب

عزیزانِ من! دوسری چیز کے لیے کہا کہ **وَتُحِبُّونَ الْمَالَ حُبًّا جَمًّا** (89:20) اور تمہاری کیفیت یہ تھی کہ یہ نہیں تھا کہ تمہیں ضرورت کے لیے جتنا درکار ہو' اتنا ہی لے کر' اسے اپنے لیے کافی سمجھو۔ نہیں' ایسا نہیں تھا۔ یہاں لفظ ''جما'' آیا ہے۔ ''جما'' وہ ''گڑھا ہوتا ہے جو نشیب میں ہوتا کہ بارش برسے تو اِدھر اُدھر سے برسا ہوا سارا پانی اس کے اندر آ کر جمع ہو جائے۔'' تمہارے ہاں روپے کی' دولت کی' ہوس ایسے تھی جیسے ''جما'' یعنی نشیب میں واقع وہ گڑھا جس میں اِدھر اُدھر سے ساری دولت پانی کی طرح آ کر جمع ہو جائے۔ پانی تو اپنا لیول (سطح) برابر رکھتا ہے۔ تم اپنے معاشرے میں معاشی نشیب پیدا کر لیتے ہو تا کہ دوسروں کا پانی یعنی روپیہ پیسہ بھی اسی میں آ جائے۔ ''رڑ کے سارا' جیہڑا ایہگا' اے تہاڈے ای اوہدے اچ آوے۔''[1] یعنی مایا کو مایا ملے کر کر لمبے ہاتھ۔[2] اس میں یہ سسٹم ہوتا ہے۔ یہاں قرآن کریم نے کہا ہے کہ تم نے نظام ایسا بنایا تھا کہ ساری دولت سمٹ کے' ساری کی ساری' تمہارے ہی نشیب کی طرف آتی چلی جائے۔ دیکھ رہے ہیں' عزیزانِ من! بظاہر یہ کچھ کرنے والوں کو بڑی عزت مل رہی ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ یہ جو تم آج رو رہے ہو کہ ذلت کیوں نصیب ہو گئی' اس کی وجہ یہ ہے کہ تم نے معاشرہ ہی ایسا بنا لیا تھا۔ ایک طرف تو بتایا کہ جو عزت حاصل کرنا چاہے' اس کے لیے وہ طریقہ ہے۔ وہ اسے یوں حاصل کر سکتا ہے۔ دوسری طرف بتایا کہ اگر یہ معاشرہ اس انداز کا ہو جائے گا تو یاد رکھیے! اس کا نتیجہ' جلدی نہیں' تو بدیر سہی' یہ ہوگا کہ اس معاشرے کو برپا کرنے والی قوم ذلیل ہو کے رہے گی۔ یہاں کہا کہ خدا نے تمہیں یونہی ذلت نہیں دی۔ یہ تمہارے اعمال کا اور اس نظام کا فطری نتیجہ ہے جو تم نے برپا کر رکھا تھا اور اب وارن (Warne۔ متنبہ) کیا ہے **وَمَنْ يُّهِنِ**

---

[1] دوسروں کا سارا مال' بہتا ہوا تمہارے ہی پاس آ جائے۔

[2] مایا کو مایا ملے کر کر لمبے ہاتھ — تلسی داس گریب کی کوئی نہ پوچھے بات

اللّٰہُ فَمَالَہٗ مِنْ مُّکْرِمٍ (22:18) اور جس پر قانون خداوندی کی خلاف ورزی سے ذلت وخواری کا عذاب مسلط ہو جائے' اسے کوئی عزت وتکریم عطا نہیں کر سکتا۔ عزیزانِ من! اب معنی سمجھ میں آ گئے کہ جسے اس قانونِ خداوندی کی رو سے ذلت نصیب ہو' دنیا میں کوئی اس کو عزت نہیں دے سکتا۔ اسے عزت اسی صورت میں مل سکتی ہے کہ وہ پھر قانونِ خداوندی کے مطابق عزت حاصل کرے ورنہ یہ عزت وتکریم مل نہیں سکتی۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ اگر کوئی اس طریقے کے سوا کوئی دوسرا طریقہ اختیار کرے اور کہے کہ اس طرح سے یوں عزت و تکریم مل جائے گی تو کہا کہ یاد رکھو! اسے عزت نہیں ملے گی' عزت وتکریم تو قانونِ خداوندی کی اطاعت کے ساتھ وابستہ ہے۔ اور اب یہاں آیا ہے کہ **اِنَّ اللّٰـہَ یَفۡعَلُ مَا یَشَآءُ** (22:18)۔ خدا کے یہ قوانین' جن کے مطابق عزت وتکریم اور ذلت وخواری کے فیصلے ہوتے ہیں' اس کی مشیت کے مطابق مرتب ہوئے ہیں۔ اس میں کوئی دخیل نہیں ہو سکتا۔ عزیزانِ من! قوانین خارجی کائنات سے متعلق ہوں یا انسانی زندگی سے' سب خدا کے متعین کردہ ہیں' کسی اور کے نہیں۔ یہ بڑا ہی اہم نکتہ ہے۔

جوہر ذاتی وجہ تکریم ہے: اصول کی حیثیت اور اہمیت

اب سوال یہ ہے کہ یہ جوہرِ ذاتی ہی وجہ تکریم کیوں ہے؟ یہ تو ایک اضافی چیز ہے۔ کہا کہ اسے ذہن نشین کر لو کہ یہ ہمارے اصول ہیں' ہمارے قانون ہیں۔ فطرت کا قانون بھی تو تم دیکھ رہے ہو کہ گندم از گندم بروید جو زِ جو۔ [1] وہاں تو تم یہ کیوں نہیں کہتے کہ خدا نے یہ کیوں کر دیا کہ گیہوں سے گیہوں ہی پیدا ہو اور جو سے جو ہی پیدا ہو۔ یہ کیوں کر دیا؟ وہاں تو تم نہیں پوچھتے' یہاں تم پوچھتے ہو کہ یہ قانون کیوں مقرر کر دیئے؟ اِسے یاد رکھو کہ انسانیت کے لیے یہی قانون تھا جو ہم نے مقرر کر دیا ہے۔

عزیزانِ من! دیکھنے میں تو دنیا میں مذاہب کئی ایک ہیں لیکن درحقیقت **ھٰذٰنِ خَصۡمٰنِ اخۡتَصَمُوۡا فِیۡ رَبِّہِمۡ** (22:19)۔ انسانی گروہ دو ہی ہیں۔ ایک وہ جو خدا کے قانونِ ربوبیت کی صداقت پر ایمان رکھتا ہے۔ دوسرا وہ جو اس سے انکار کرتا ہے۔ انہی دو میں باہمی کشمکش (Mutual Conflict) ہوتا ہے۔ یوں تو دنیا میں تم انسانوں کی مختلف قسمیں دیکھو گے' مختلف انواع دیکھو گے' مختلف گروہ دیکھو گے' مختلف پارٹیاں اور مذاہب دیکھو گے۔ مگر اصل میں گروہ دو ہی ہیں۔ ایک گروہ وہ ہے جو عزت اور ذلت کے اپنے خود ساختہ پیمانے اپنے سامنے رکھتا ہے' دوسرا گروہ وہ ہے جو دوسرے پیمانے رکھتا ہے۔ بس دنیا میں یہ دو ہی گروہ ہیں' انسانیت انہی دو گروہوں میں بٹی ہوئی ہے۔ اب قرآن نے ایک گروہ کے بارے میں کہا کہ **فَالَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا** (22:19)۔ وہ جو لوگ قوانین خداوندی کی صداقت سے انکار کرتے ہیں' اپنے ہی بنائے ہوئے غلط پیمانے رکھنے والے ہیں۔ **قُطِّعَتۡ لَہُمۡ ثِیَابٌ مِّنۡ نَّارٍ** (22:19) ان کا

---

[1] (یہ مثل ہے کہ) گندم سے گندم اگتا ہے اور جو بونے سے جَو۔ جیسا کرو گے ویسا بھرو گے۔

انجام تباہی اور بربادی کے سوا کچھ نہیں ہوگا۔ وہ عذاب جس کے شعلے دلوں کو لپیٹ لیتے ہیں ان کی شخصیت [1] کو ٹکڑے ٹکڑے کر دے گا۔

عزیزانِ من! اب جب شخصیت کی بات آئی ہے تو پھر وہی ان کے ترجمے ہمارے ہاں آئیں گے: جن میں یہ ترجمہ کیا گیا ہے کہ ان کے لیے آگ کے کپڑے قطع کیے جائیں گے۔ ''ثیاب'' کے لیے عام طور پہ لفظ کپڑے کے لیے لیا جاتا ہے اسی لیے حضورؐ پہ جو سورۃ مدثر یا مزمل نازل ہوئی ہے، تو ان سورتوں میں سے سورۃ المدثر میں ہے کہ **وَثِيَابَكَ فَطَهِّرْ** (74:4)۔ اور اپنی سیرت و کردار (شخصیت) کو نہایت پاکیزہ بنا اور اس دعوت و تحریک کو ہر قسم کے ناپسندیدہ عناصر سے پاک و صاف رکھ۔ **يَآ أَيُّهَا الْمُزَّمِّلُ** (73:1) اے رسولؐ! فریضہ رسالت کی عظیم ذمہ داری کا بوجھ اٹھانے کے بعد، تیرے لیے پہلا قدم یہ ہے کہ تو ایسے رفقائے سفر تیار کرے جن میں کامل ہم آہنگی اور یک رنگی ہو، تاکہ یہ کارواں، شاداں و فرحاں، منزلِ مقصود کی طرف بڑھتا چلا جائے۔ عزیزانِ من! اس قسم کا عمل تزمیل سالارِ کاروں کا اولین فریضہ ہوتا ہے۔ یہاں کیا خوب بات آ گئی! بہرحال سورۃ مزمل اور مدثر کی یہ بات کسی اور جگہ سہی۔ سورۃ المدثر میں کہا یہ تھا کہ: **يَآ أَيُّهَا الْمُدَّثِّرُ ۝ قُمْ فَأَنذِرْ** (74:12) اے وہ کہ جس کے ذمے عالم انسانیت کو سنوار کر ایک جہانِ نو کو وجود میں لانے اور اس طرح حق کے نظام کو ہر باطل نظام پر غالب کرنے کا انقلابی پروگرام ہے۔ بات تم تک پہنچ گئی ہے۔ اسے لے کے بیٹھے نہ رہو، اٹھ اور عالمِ انسانیت کو آگاہ کر دے کہ جس روش پہ تم چلے جا رہے ہو، وہ ذلت کی اور تباہی کی ہے۔ لہٰذا اٹھ! اور خود فراموش انسانوں کو ان کے غلط روشِ زندگی کے تباہ کن نتائج سے آگاہ کر۔

انسانی معاشرے کی حالت، نبوت کا فریضہ اور اس کا مقامِ بلند

عزیزانِ من! عمل تزمیل [2] اور تدثیر [3] رسالت ہے۔ اگر ان اقدار کو سمجھ لیا جائے تو پھر پوچھو نہیں کہ اس کی ذمہ داریاں کتنی بڑھ

---

[1] الثوب۔ تاج العروس، محیط المحیط نیز ابن قتیبہ (القرطین جلد۲ ص۔۱۹۰) میں لکھا ہے کہ اَلثَّوبُ کپڑے کو کہتے ہیں۔ اس کی جمع ثِیَابٌ ہے اور ثَوَّابٌ کپڑا بیچنے والے کو کہتے۔ نیز عرب عام طور پر ثیاب کے لفظ سے ''انسان کی شخصیت'' مراد لیتے تھے۔ چنانچہ وہ کہتے ہیں فُلَانٌ دَنِسُ الثِّیَابِ یعنی وہ شخص بڑی خبیث فطرت کا ہے۔ اس کی ''شخصیت'' بڑی خراب ہے۔ تاج العروس میں لکھا ہے کہ ثَابَ کے معنی جمع ہونے کے ہیں اس لیے بھی کہ عربوں میں جب لوگوں کو جمع کرنا مقصود ہوتا تھا تو ایک آدمی کسی اونچی جگہ کھڑا ہو کر کپڑ ہلاتا۔ اس لیے تَثْوِیبٌ کے معنی ہیں ''لوگوں کو آواز دے کر بلانا، اکٹھا کرنا'' چنانچہ صبح کی نماز میں اَلصَّلٰوۃُ خَیْرٌ مِّنَ النَّوْمِ پکارنے کو تثویب کہتے ہیں۔ پرویزؒ نے اپنی لغات القرآن جلد اول میں مختلف لغات کے حوالوں کے بعد لکھا ہے کہ ثواب کا مفہوم نتائج اعمال بھی ہے، یعنی اعمال کے نتائج یعنی قانون مکافات کی رو سے اعمالِ انسانی کا نتیجہ مرتب ہونا۔ (ص ۴۰۹)

[2] وہ عمل جس میں ایسے رفقائے سفر تیار کیے جائیں جن میں کامل ہم آہنگی اور یک رنگی ہو تاکہ وہ عظیم ذمہ داری کا بوجھ اٹھا سکیں۔

[3] وہ عمل جس سے عالمِ انسانیت سنور جائے، چمنِ عالم میں بہار آ جائے، شجرِ ہستی کے پھول کھل اٹھیں اور ایک ایسا جہانِ نو وجود میں آ جائے جس میں حق کا نظام باطل پر غالب ہو۔

جاتی ہیں۔ کس انداز میں کہا ہے کہ **قُمْ فَاَنْذِرْ o وَرَبَّکَ فَکَبِّرْ** (74:2-3) اٹھ اور خود فراموش انسانوں کو ان کی غلط روش زندگی کے تباہ کن نتائج سے آگاہ کر۔ اور خدا کے نظامِ ربوبیت کو اس طرح متمکن کردے کہ کبریائی (Sovereignty) صرف اسی کے لیے ہو۔ اس سے خود تمہیں بھی دنیا میں بڑائی حاصل ہو جائے گی۔ اس لیے وہ کچھ کیا کر جس سے عظمت' بڑائی' اقتدار اور بلندیاں صرف خدا کے قانون کے لیے رہ جائیں۔ یہ نظام قائم کر اور اس کے لیے اب پروگرام دیا جا رہا ہے۔ اور وہ یہ ہے کہ: **وَثِیَابَکَ فَطَھِّرْ** (74:4)۔ اس کے لیے ضروری ہے کہ اپنی سیرت و کردار (شخصیت) کو نہایت پاکیزہ بنایا جائے اور اس دعوت و تحریک کو ہر قسم کے ناپسندیدہ عناصر سے پاک صاف رکھا جائے۔ اب ہمارے ہاں تو اس کا یہ ترجمہ کیا جاتا ہے کہ اپنے کپڑے پاک صاف رکھ۔ اگلی آیت ہے کہ **وَالرُّجْزَ فَاھْجُرْ** (74:5)۔ اس قسم کے رفقاء کو اپنے ساتھ لے اور ان کی ایسی تربیت کر کہ ان کی سیرت میں پختگی پیدا ہو جائے' جس سے وہ اس بارِ عظیم کو آسانی سے اٹھا سکیں اور ان کے پائے استقلال میں کہیں لغزش نہ آنے پائے۔ وہ اس بوجھ کو لے کر اٹھیں تو ان کی ٹانگیں لڑکھڑا نہ جائیں۔ مگر ہمارے ہاں اس کا پھر وہی ترجمہ کیا جاتا ہے کہ اپنی پلیتیوں کو دُور کردے۔ معاذاللہ۔ آپ کہتے ہیں کہ کچھ نہیں سمجھتے۔ بس انہوں نے ثیاب کے معنی کپڑے اور **فَطَھِّرْ** کے معنی ''کپڑے پاک رکھا کر'' لے لیے۔ یعنی پہلے یہ کہا ہے کہ **قُمْ فَاَنْذِرْ o وَ رَبَّکَ فَکَبِّرْ** (74:2-3)۔ اٹھ ان کے غلط روشِ زندگی کے تباہ کن نتائج سے انہیں آگاہ کر اور خدا کے نظام ربوبیت کو اس طرح متمکن کر کہ کبریائی صرف اسی کے لیے ہو۔ اندازہ لگاؤ جو پروگرام دیا گیا ہے اور یہ ہیں جو اس پروگرام کی تکمیل کے لیے یہ کہتے ہیں کہ کپڑے دھولیا کر۔ یاللعجب! عزیزانِ من! یہ پروگرام ہے۔ کبریاء کے معنی حکومت اور مملکت کے ہیں۔ اس کا مفہوم آج کی اصطلاح میں حاکمیتِ اعلیٰ (Sovereignty) ہے۔ یہ اس کی حاکمیتِ اعلیٰ کے قیام کا پروگرام ہے۔ ''ثیاب'' انسان کی پوری کی پوری شخصیت کو کہتے ہیں۔ Personality پوری شخصیت کو کہتے ہیں۔ ابتداءً اٹھ کے کون دوسرے کو کہے گا؟ اس کے لیے پہلی شرط یہ ہے کہ اپنی Personality (شخصیت) کو پاکیزہ اور مطہر بنا کے رکھ۔ پھر آگے دوسرے کو کہو۔ عزیزانِ من! یہ چیز Mechanically (میکانکی طور پر) نہ کہنے کی ہے' نہ سمجھنے کی۔ یہ تو اپنے اندر پہلے ایک تغیر واقع کرنے کی بات ہے تاکہ آگے جا کر رسول کی بات کوئی اثر کر سکے جبکہ جسے منتخب کیا گیا تھا اس کی اتنی عظیم Personality (شخصیت) کے باوجود اس کو یہ کہا گیا ہے کہ **قُمْ** اُٹھ۔ تو شرط عائد کر دی کہ پہلے اپنی شخصیت کو مطہر اور پاکیزہ بنالے' پھر اٹھ کے بات کر۔ یہاں وہ بات کہی کہ جو لوگ قوانینِ خداوندی کی صداقت سے انکار کرتے ہیں' وہ تباہی و بربادی کے اس عذاب میں دھر لیے جائیں گے جس میں **قُطِّعَتْ لَھُمْ ثِیَابٌ مِّنْ نَّارٍ** (22:19)۔ ان کی پوری کی پوری شخصیت' ان کی پوری کی پوری Personality' جہنم کی آگ میں جھلس رہی ہو کہا کہ **نَارُ اللّٰہِ الْمُوْقَدَۃُ o الَّتِیْ تَطَّلِعُ عَلَی الْاَفْئِدَۃِ** (104:6-7)۔ یہ خدا کے قانونِ مکافات کی بھڑکائی ہوئی وہ آگ ہے جس کے شعلے دلوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیتے ہیں یعنی یہ وہ آگ ہے جس کے شعلے دلوں کو لپیٹ لیا کرتے ہیں۔ کہا کہ یہ جو اس طرح سرفرازیوں سے شاداں و فرحاں یوں سر اوپر ابھارے

ہوئے چلے جارہے ہیں' اور یہ جو غلط معیاروں کے مطابق' طرّہ بازیوں کی عزت حاصل کیے ہوئے یوں چلے آ رہے ہیں' جب صحیح معاشرہ آئے گا تو پھر اس وقت تم ان کی حالت دیکھو گے کہ **یُصَبُّ مِنۡ فَوۡقِ رُءُوۡسِهِمُ الۡحَمِيۡمُ** (22:19)۔ان کے سر' جو اس وقت نحوت وتکبر میں یوں اٹھ رہے ہیں' شدتِ عذاب انہیں جھکا دے گی۔عزیزانِ من! بات تو انہیں یہ کہنی تھی کہ یوں ان کے سر جھک جائیں گے۔

قوانینِ خداوندی کی صداقتوں کا انکار استبدادی سروں کو جھکا دے گا

قوانینِ خداوندی کی صداقت کے انکار کرنے والوں کے سر کیسے جھکیں گے؟ اس کے لیے قرآن کریم نے ایک عجیب چیز بتائی ہے۔وہ یہ ہے کہ اگر کسی کے سر کے اوپر کھولتا ہوا پانی ڈال [1] دیا جائے تو وہ سر خود بخود ہی جھک جاتا ہے۔اسی آیت میں نارٍ [2] (آگ) کا ذکر آ رہا تھا۔اس آگ کے ذریعے یہ کہا کہ یوں سمجھ لیجیے کہ اکڑے ہوئے چلا جا رہا ہے' یوں اوپر سے کسی نے کھولتا ہوا پانی اس پہ ڈال دیا' وہ خود ہی یوں جھک جاتا ہے۔قرآن کہتا ہے کہ یوں ہو جائے گا۔آگے کہا کہ **يُصۡهَرُ بِهٖ مَا فِىۡ بُطُوۡنِهِمۡ وَ الۡجُلُوۡدُ** [3] (22:20)۔ان کے ظاہر و باطن کی سختیوں کو پگھلا دیا جائے گا۔اس کے ذریعے جو کچھ ان کے اندر ہے اسے گلا دیا اور پکا دیا جائے گا۔ان کی شدت' سختی اور قوت پگھلا دی جائے گی۔ہمارے ہاں اس کا ترجمہ ہوتا ہے کہ جو کچھ ان کے پیٹوں میں ہے اور جو ان کی کھالیں ہیں' گل جائیں گی۔او تے مُردے نوں باہر رکھو' تے تاں وی گل جاندیاں ہیگیاں۔ [4] یہاں کہا ہے کہ **بُطُوۡنِهِمۡ وَ الۡجُلُوۡدُ** (22:20)۔جو کچھ ان کی داخلی دنیا میں ہے' جو کچھ انکی ظاہری دنیا کے اندر ہے' وہ سارے کا سارا گل سڑ کے فنا ہو جائے گا۔اس وقت یہ ظلم واستبداد میں حدود فراموش ہو رہے ہیں اور دلائل و براہین کی رو سے اپنی روش چھوڑنے کے لیے تیار نہیں اس لیے اس کے سوا اب چارہ نہیں کہ **وَلَهُمۡ مَّقَامِعُ مِنۡ حَدِيۡدٍ** (22:21)۔انہیں اسی روشنی سے بزور روکا جائے اور اس طرح ان کا زور توڑ دیا جائے گا۔اب یہ وہ مقام آیا کہ یوں نہ باز آنے

---

1. صَبَّ الۡمَآءَ ۔اس نے اوپر سے پانی گرا دیا۔اس سلسلے میں تاج العروس اور المفردات فی غریب القرآن میں لکھا ہے کہ صُبَّ الرَّجُلُ ۔آدمی مٹا دیا گیا۔ يُصَبُّ مِنۡ فَوۡقِ رُءُوۡسِهِمُ الۡحَمِيۡمُ (22:19)۔ان کے سروں کے اوپر سے کھولتا ہوا پانی گرایا جائے گا' ان کے اکڑے ہوئے سروں کو جھکا کر ان کی قوتوں کو پراگندہ و منتشر کر دیا جائے گا۔دوسری جگہ ہے کہ ثُمَّ صُبُّوۡا فَوۡقَ رَاۡسِهٖ مِنۡ عَذَابِ الۡحَمِيۡمِ (44:48)۔وہاں اس کے سر پہ' جسے وہ اس طرح اٹھا کر چلتا ہے' کھولتا ہوا پانی ڈالا جائے گا' جس سے ساری سرکشی پگھل کر نکل جائے گی۔
2. تاج العروس میں لکھا ہے کہ ''نار'' کے معنی ہیں: شعلے کی لپٹ' علامت اور نشانی اس لیے کہ عرب اپنے اونٹوں کو گرم لوہے سے داغ دے کر نشان لگایا کرتے تھے۔نارٌ میں نفرت اور وحشت کا پہلو ہے۔پرویزؒ نے اپنی لغات القرآن جلد چہارم (ص ۱۶۷۲) میں لکھا ہے کہ عَذَابُ النَّارِ تخریبی اعمال کے تباہ کن نتائج کا نام ہے۔یعنی انسانی اعمال کے وہ تباہ کن نتائج جن سے متاعِ حیات جل کر راکھ کر ڈھیر ہو جائے۔
3. ابن فارس نے اپنی تصنیف مقاییس اللغۃ میں لکھا ہے کہ اَجۡلَاد وَجُلُود کے بنیادی معنی قوت اور صلابت (سختی) کے ہوتے ہیں۔
4. وہ تو اگر مُردے کو باہر ہی رکھ دیں تو بھی گل سڑ جاتی ہیں۔

والوں' یوں نہ رکنے والوں' کے لیے لوہے کے گرز ہونگے' جن سے رکیں گے۔ان کے لیے کہا کہ'' لُک جا لُک جا'' جانے میری! اے گرزاں والے آئے نی''۔ ❶ عزیزانِ من! اب وہ مقام گرزاں والوں کا ہی ہوتا ہے۔

ضابطہ قوانین کی ضرورت' اس کی اہمیت کا احترام اور صداقت

قرآن نے کہا تھا کہ ہم نے رسول بھیجے۔کیا پروگرام تھا؟ نظامِ ربانی قائم کرنا تھا۔کہا کہ **لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ** (57:25)۔اس مقصد کے لیے خدا نے اپنے رسولوں کو مختلف اقوام کی طرف واضح دلائل دے کر بھیجا۔ عزیزانِ من! سنیئے' کیا تدریجی مراحل ہیں؟ ہم نے رسول بھیجے' اور انہیں Reasonably , Rationally، عقل وبصیرت کی رو سے حقیقت کو تسلیم کرنے کے لیے دلائل دیئے پھر **اَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ** (57:25)۔ ہر رسول اپنے ساتھ ضابطۂ قوانین بھی لایا۔یعنی اسے ہم نے ضابطہ قوانین دیا۔ اس قانون کے مطابق' دلائل سے Conversion (تبدیلی) ہورہی ہے' جو دلائل سے Convert (تبدیل) نہیں ہوا' جو اس قانون سے Convert (تبدیلی) نہیں ہوا' آپ اس سے زبردستی نہیں منواتے ہیں کیونکہ جو زبردستی منوانا ہوتا ہے' اس میں سے نکلنے کی راہیں نکلتی ہیں۔دیکھیے یہاں کیا ہوتا ہے؟ بَيِّنٰتٍ کی رو سے پہلے قانون کا احترام سکھایئے' قانون کی حقیقت اور صداقت کا یقین دلایئے' والکتٰب یعنی پھر کتاب آتی ہے۔انہیں قانون دیدیا' ضابطہ قانون دیا۔کاہے کے لیے دیدیا؟ قانون' ضابطہ' فوجداری ضابطہ' ہزاروں سینکڑوں کی تعداد میں قانون کی کتابیں ہیں۔قانون کیا کام کرتا ہے؟ **وَالْمِيْزَانَ** (57:25)۔اور اس کے ساتھ میزانِ عدل نازل کی تاکہ **لِيَقُوْمَ النَّاسُ بِالْقِسْطِ** (57:25)۔اس ضابطۂ قوانین کی رو سے ایسا معاشرہ قائم کریں جس میں ہر شخص کا عمل' ٹھیک ٹھیک نتیجہ مرتب کرے اور یوں لوگ عدل وانصاف پر قائم رہیں۔

قانون شکنی کا علاج شمشیرِ خارہ شگاف (فولاد) ہے

عزیزانِ من! کتاب یعنی ضابطۂ قوانین' ضابطہ حیات دینے کا مقصد یہ ہے کہ عدل ہو۔ اس کے مقابلے میں کہا کہ یہ سب کچھ ہم نے کیا۔اب وہ قوتیں رہ گئیں جو سرکشی برتیں گی' اس کے باوجود قانون توڑیں گی' مقابلہ کریں گی' صحیح قانون نہیں رائج ہونے دیں گی۔ کہا کہ جہاں ان لوگوں کے لیے بیّنٰت بھی فیل ہوگئیں' قانون بھی فیل ہوگیا' عدل کی میزانوں سے بھی ان لوگوں نے اس طرح پھسل کر نکلنا شروع کردیا' انہوں نے سرکشی میں آگے بڑھنا شروع کردیا تو اس کے لیے **اَنْزَلْنَا الْحَدِيْدَ** (57:25)۔ہم نے شمشیر خارہ شگاف (فولاد) بھی اس کے ساتھ ہی نازل کی ہے۔یہ ہے وہ مقام جہاں کہا ہے کہ **وَلَهُمْ مَّقَامِعُ مِنْ حَدِيْدٍ** (22:21)۔انہیں

---

❶ اے میری جان! کہیں چھپ جا! کہیں جائے پناہ ڈھونڈ لے۔یہ گرزوں والے آدھمکے ہیں۔

اس روش سے بزور روکا جائے اور اس طرح ان کا زور توڑ دیا جائے۔ یہاں ''مقامع'' کا لفظ آیا ہے۔ یہ مَقَامِعُ گرز [1] نہیں ہوتا۔ یہ ہر وہ چیز ہے' ہر وہ بات ہے' ہر وہ قوت ہے جس سے کسی سرکش کو اس کی سرکشی سے روک دیا جائے' مستبد اور ظالم کو مغلوب کر کے اسے بے بس بنا دیا جائے اور اس طرح مظلوموں کو اس کے ظلم سے محفوظ کر دیا جائے۔ اسے کہتے ہیں کہ قلع قمع کر دیا۔ ہمارے ہاں بھی لفظ قمع ہے۔ وہ یہی چیز ہوتی ہے۔ یعنی کسی کو قوت سے روک دینا۔ یہ اس مقام پہ پہنچ گئے تھے کہ بیّنٰت' دلائل اور Reasoning (دلائل و براہین استدلال) ان کی کھوپڑی میں سماتی نہیں تھیں۔ قانون کا احترام جانتے ہی نہیں تھے۔ عدل کے متعلق بھی ہزار تجویزیں سوچتے تھے کہ کس طرح سے اس کو بھی ہم رد کر جائیں گے ہے۔ یہ وہ مقام جہاں کہا کہ **اَنْزَلْنَا الْحَدِیْدَ** (57:25)۔ شمشیر خارہ شگاف (فولاد) بھی نازل کی تا کہ یہ روک تھام محض وقتی اور ہنگامی نہ ہو بلکہ ایسا انتظام ہو کہ **كُلَّمَآ اَرَادُوْٓا اَنْ يَّخْرُجُوْا مِنْهَا مِنْ غَمٍّ اُعِيْدُوْا فِيْهَا وَذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِيْقِ** (22:22)۔ یہ جب بھی اس عذاب سے گھبرا کر نکل بھاگنے کی کوشش کریں تو انہیں پھر وہیں دھکیل دیا جائے اور کہہ دیا جائے کہ جاؤ! اس عذاب کا مزہ چکھو جو تمہارا سب کچھ جلا کر' اسے راکھ کا ڈھیر بنا دے گا۔ یہ شمشیر خارہ شگاف (فولاد) کا وہ مقام آ جائے گا جس میں یہ داخل ہونگے۔ وہاں سے ہزار نکلنا چاہیں گے' نکل نہیں سکیں گے۔

عزیزانِ من! سورۃ الحج کی آیت 21 تک آ گئے' 22 ویں آیت سے آئندہ لیں گے۔ میرا جی تو چاہتا تھا کہ آج حج کی یہ آیت بھی ہمارے سامنے ہے۔ حج کا وہ مقام بھی آ گیا ہوا ہے۔ میرا ذہن تھا کہ آج کعبہ و حج پر قرآنی نقطہ نگاہ سے کچھ عرض کروں گا۔ لاؤڈ اسپیکر کے نہ ہونے کی وجہ سے' میں کچھ تھک سا گیا ہوں۔ اگلے اتوار کو وہ آیتیں جو حج کے متعلق ہیں اور اب وہ سامنے بھی آ رہی ہیں' ان پر بات ہوگی۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّآ ط اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ط

❀❀ ...... ❀❀❀ ...... ❀❀

---

[1] گرز۔ ایک ہتھیار جو اوپر سے گول' موٹا اور نیچے سے پتلا ہوتا ہے۔

تیسرا باب: **سورۃ الحج** (آیات 22 تا 29)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

وَاَرْسَلْنَا الرِّيٰحَ لَوَاقِحَ فَاَنْزَلْنَا مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَسْقَيْنٰكُمُوْهُ ۚ وَمَآ
اَنْتُمْ لَهٗ بِخٰزِنِيْنَ ﴿٢٢﴾ وَاِنَّا لَنَحْنُ نُحْيٖ وَنُمِيْتُ وَنَحْنُ الْوٰرِثُوْنَ ﴿٢٣﴾ وَلَقَدْ
عَلِمْنَا الْمُسْتَقْدِمِيْنَ مِنْكُمْ وَلَقَدْ عَلِمْنَا الْمُسْتَاْخِرِيْنَ ﴿٢٤﴾ وَاِنَّ رَبَّكَ
هُوَ يَحْشُرُهُمْ ؕ اِنَّهٗ حَكِيْمٌ عَلِيْمٌ ﴿٢٥﴾ وَلَقَدْ خَلَقْنَا الْاِنْسَانَ مِنْ
صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ ﴿٢٦﴾ وَالْجَآنَّ خَلَقْنٰهُ مِنْ قَبْلُ مِنْ نَّارِ
السَّمُوْمِ ﴿٢٧﴾ وَاِذْ قَالَ رَبُّكَ لِلْمَلٰٓئِكَةِ اِنِّيْ خَالِقٌۢ بَشَرًا مِّنْ صَلْصَالٍ مِّنْ
حَمَاٍ مَّسْنُوْنٍ ﴿٢٨﴾ فَاِذَا سَوَّيْتُهٗ وَنَفَخْتُ فِيْهِ مِنْ رُّوْحِيْ فَقَعُوْا لَهٗ سٰجِدِيْنَ ﴿٢٩﴾

عزیزانِ من! آج دسمبر 1976ء کی 26 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ الحج کی آیت 22 سے ہو رہا ہے: (22:22)۔

جہنم کی اصطلاح کی مختلف شکلیں اور نوعیتیں

سابقہ دو اتوار درس کا ناغہ رہا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ 12 تاریخ کی اتوار میری طبیعت ناساز تھی اور 19 تاریخ کو قائداعظمؒ (1876-1948) کے جشنِ ولادت کی تقریب میں ہم نے ایک جلسہ عام کیا تھا۔ تو تجدیدِ یادداشت کیلیے عرض کر دوں کہ پچھلی آیات میں یہ آ رہا تھا کہ یہ لوگ جو اس طرح سے اس حق پر مبنی نظام کی مخالفت کر رہے ہیں' انہیں آخرالامر شکست ملے گی اور وہ بڑی ہی ذلت آمیز شکست ہوگی۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے کہ قرآنِ کریم اس قسم کی بڑی ذلت آمیز شکست کی سی چیزوں کو جہنم کی اصطلاح سے تعبیر کرتا ہے۔ اس لحاظ سے اس دنیا کے اندر ذلت' خواری' شکست اور بے کسی کی زندگی یہاں کا جہنم ہے اور اس کے بعد زندگی تو آگے بھی

چلتی ہے پھر آخرت کا جہنم ہے۔ایک تو اسی سلسلے میں پچھلی آیات میں اس کی تفاصیل آ رہی تھیں۔اسی سلسلے میں زیرِ نظر آیت میں یہ کہا کہ كُلَّمَآ اَرَادُوْٓا اَنْ يَّخْرُجُوْا مِنْهَا مِنْ غَمٍّ اُعِيْدُوْا فِيْهَا وَذُوْقُوْا عَذَابَ الْحَرِيْقِ (22:23)۔یہ جب بھی اس عذاب سے گھبرا کر نکل بھاگنے کی کوشش کریں گے تو انہیں پھر وہیں دھکیل دیا جائے گا اور کہہ دیا جائے گا کہ جاؤ! اس عذاب کا مزہ چکھو جو تمہارا سب کچھ جلا کر راکھ کا ڈھیر بنا دے گا۔

قرآن حکیم کے نزدیک سزا کے تصور کی حقیقت

عزیزانِ من! بات یہ چلی آ رہی ہے کہ وہ جب بھی ارادہ کریں گے کہ اس عذاب سے نکل جائیں تو وہ نکل نہیں سکیں گے۔انہیں پھر اس میں دھکیل دیا جائے گا۔تو اب اس سے تو یہ ایک بات صاف ہوگئی کہ وہ جو ہمارے ہاں عام تصور ہے کہ جہنم میں کچھ عرصہ سزا بھگتنے کے لیے ڈالے جائیں گے اور سزا کی مدت ختم ہو جائے گی تو پھر وہاں سے نکال کے جنت میں بھیج دیئے جائیں گے۔قرآن کریم کی رو سے یہ تصور صحیح نہیں ہے۔مگر پھر بھی بعض اسے سزا کے طور پہ کہتے ہیں۔بعض یہ کہتے ہیں کہ وہ گناہوں کی آلائشیں دھونے کے لیے جہنم میں ڈالے جائیں گے جیسے دھوبی کپڑوں کو بھٹی چڑھا دیتا ہے تو اس طرح وہ بھی بھٹی چڑھانے والی یہ ایک مثال دیدیتے ہیں کہ جب وہاں آلائشیں صاف ہو جائیں گی تو پھر جنت میں بھیج دیا جائے گا۔گویا تصور یہی ہے جو چلا آ رہا ہے کہ بہرحال جہنم اتنی سی مدت کے لیے ہے' خواہ اسے سزا کہیے یا جب کہ وہ اسے Sanatorium کہا کرتے ہیں' آپ بھی اسے علاج کے لیے سینوٹوریم کہیے، ہسپتال کہیے، وہاں بھیجا جائے گا۔قرآنِ کریم کی رو سے یہ تصور صحیح نہیں ہے۔اصل میں جب سزا کا یہ تصور ذہن میں آئے تو پھر تو واقعی کچھ مدت متعین کرنی پڑتی ہے۔ابدی طور پہ بجز اس کے کہ کسی کو پھانسی دیدی جائے تو موت سے وہ ختم ہو جائے۔اس کے برعکس قرآن میں تو لکھا ہے کہ وہاں موت نہیں آئے گی۔تو جو یہاں کی سزا کا تصور ہے اگر اس کے مطابق وہاں کے جہنم کو لیا جائے تو وہ واقعی اس سے یہی ذہن میں آتا ہے کہ کچھ تو مدت ہونی چاہیے لیکن قرآن تو اس سے بہت بلند لے جاتا ہے اور یہ وہ مقامات ہیں جہاں خاص طور پر بڑی ہی گہری سوچ و بچار کی ضرورت ہوتی ہے۔

قانونِ ارتقاء اور قرآن

عزیزانِ من! یہاں سزا کا سوال نہیں ہے۔یہ زندگی تو اپنے ارتقائی منازل طے کرتی ہوئی آگے بڑھی جا رہی ہے۔یہاں بھی ارتقا کا یہی قانون ہے جو خدا کا مقرر کردہ ہے کہ جو نوع اپنے اندر اتنی صلاحیت پیدا کر لیتی ہے کہ وہ زندہ رہے اور آگے بڑھے تو وہ تو آگے بڑھ جاتی ہے اور جس میں یہ صلاحیت نہیں ہوتی' وہ یا تو ختم ہو جاتی ہے اور یا وہیں رک جاتی ہے اور جامد ہو جاتی ہے' آگے نہیں بڑھ سکتی۔وہ اسی حالت کے اندر رہتی ہے۔یہ ہے وہ قانونِ ارتقا جسے قرآن نے بھی بیان کیا ہے اور آج اس زمانے میں زندگی کے متعلق جس قدر تحقیقات ہوئی ہیں' وہ قرآنِ کریم کی اسی صداقت کی شہادات بہم پہنچاتی ہیں اور یہی چیز ہے جو قرآن بیان کرتا ہے۔

یورپ کے عام سائنسدانوں کی سوچ اور قرآنی تعلیم میں ایک بنیادی فرق

یورپ کے عام سائنسدان یہاں تک تو ان سے متفق ہیں یا یہ کہیے کہ قرآن کی صداقتیں ان کی تائید کرتی ہیں مگر اس مقام سے آگے دونوں کے راستے مختلف ہو جاتے ہیں۔ سائنسدان زندگی کو اسی دنیا تک محدود سمجھتے ہیں' اس طبعی زندگی تک کے ارتقا کے تو وہ قائل ہیں لیکن اس کے بعد وہ زندگی ہی کو ختم کر دیتے ہیں تو مزید ارتقا کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا' لیکن قرآنِ کریم زندگی کو یہیں ختم نہیں کرتا۔ وہ زندگی کو آگے بھی لے جاتا ہے اور جب آگے لے جاتا ہے تو پھر یہی قانونِ ارتقا وہاں بھی کارفرما ہوتا ہے۔ اس زندگی میں جو انسان اپنی ذات کی اتنی نشوونما کر لیتا ہے کہ وہ اس سے اگلی بلند زندگی یا بلند زندگی کی منزل طے کرنے کے قابل ہو جائے' تو وہ تو Promote ہو کے آگے چلے جاتے ہیں' اگلی جماعت میں چڑھ جاتے ہیں۔ یوں کہہ لیجیے کہ جن کی نشوونما ایسی نہیں ہو پاتی' جن میں زندگی کی اگلی بلند منزل کی سطح پر زندگی بسر کرنے کی صلاحیت پیدا نہیں ہوتی تو وہ روک دیئے جاتے ہیں' وہ آگے نہیں بڑھ سکتے۔ یہ قانونِ ارتقا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ قرآن کریم نے جہنم کے لیے جحیم کا لفظ استعمال کیا ہے یعنی رک جانے والی چیز یا اسے روک دینے والی چیز کہا گیا ہے۔ زندگی وہاں رک جاتی ہے' وہ آگے نہیں بڑھتی اور یہی اس کا جحیم ہوتا ہے۔ قرآن کریم کی رو سے فرد یا قوم جس مقام پر رک جائے' وہ جحیم ہے۔ زندگی تو ایک جوئے رواں سے جسے رواں دواں آگے بڑھتے چلے جانا چاہیے۔ جونہی اس کی روانی بند ہوئی' وہ جوئے رواں نہ رہی' جوہڑ بن گئی اور اس میں سڑاہنڈ پیدا ہونی شروع ہو گئی۔ یہ اس کی جہنم ہے۔ یہ مقام انسانیت کی قربان گاہ ہے۔ خدا کے قانون ربوبیت کا منشا یہ ہے کہ انسان کی مضمر صلاحیتوں کی نشوونما ہو۔ انسانیت برومند اور ثمر بار ہو۔ ایسا معاشرہ جس میں انسانیت نشوونما پائے' جنتی معاشرہ ہے۔ اس کے مقابلے میں وہ معاشرہ جس میں انسانیت ذبح ہو جائے اور جل کر راکھ کا ڈھیر بن جائے' جہنمی معاشرہ ہے۔ اس کے لیے عربی لفظ جحیم ہے جس کے معنی روک دینا ہے یعنی وہ مقام جس پر انسانیت کی نشوونما رک جائے۔

جنت کے متعلق قرآن کا تصور

عزیزانِ من! جنت کے متعلق قرآن کریم کا تصور (Concept) یہ ہے کہ جنت بھی آخری مقام نہیں ہے۔ وہاں بھی زندگی کی ارتقائی منازل کا کہا گیا ہے کہ اہلِ جنت کی پیشانیوں کا نور' ان کے اگلے راستے' روشن کرتا چلا جائے گا۔ [1] تو وہ تو آگے بھی راستے ہیں' جنہیں یہ روشن کرتا ہوا چلا جائے گا۔ اِلٰی رَبِّکَ الْمُنْتَھٰی (53:42)۔ انسانی زندگی کا منتہیٰ و مقصود یہ ہے کہ اجتماعی طور پر نظامِ

---

[1] یَوْمَ تَرَی الْمُؤْمِنِیْنَ وَالْمُؤْمِنٰتِ یَسْعٰی نُوْرُھُمْ بَیْنَ اَیْدِیْھِمْ (57:12)۔ تو دیکھے گا کہ مومن مردوں اور عورتوں کی پیشانیوں کا نور ان کے آگے آگے چل رہا ہوگا تاکہ ان کی زندگی کی تمام راہیں جگمگا اٹھیں۔

ربوبیت کا قیام ہو جائے۔ اس نے کہا ہے کہ وہ تو ایک عجیب چیز ہے اور وہ یہ ہے کہ اس کا منتہیٰ جنت نہیں بلکہ وہ تو اس راستے میں زندگی کی ایک منزل ہے، جس میں مزید ارتقائی منازل طے کرنے کیلیے ذرائع موجود ہونگے، زندگی آگے بڑھے گی، اگلی منازل طے کرے گی۔ ہم زندگی کی اس سطح پہ نہیں کہہ سکتے کہ وہ زندگی کس قسم کی ہوگی، وہ منازل کیسے طے کی جائیں گی لیکن قرآن سے اتنا واضح ہے کہ زندگی مزید ارتقائی منازل طے کرے گی اور جن میں یہ صلاحیت نہیں ہوگی وہ روک دیئے جائیں گے۔ اسے جحیم یا جہنم کہا جاتا ہے۔

ایک مقام پر رک جانے کی وجہ سے ختم نہ ہونے والا احساس

عزیزانِ من! یہ جو باقیوں کے مقابل میں رک جانے کا احساس ہے، یہ ہے اصل شے جسے قرآن "غم" کہہ کر پکارتا ہے۔ یہ وہ حزن وکرب ہے جو چارسو کسی پہ چھا جائے اور اس سے نکلا نہ جا سکے۔ نیز وہ پیچیدہ مسئلہ ہے جس کا حل نظر نہ آئے۔ یہاں کہا ہے کہ **يَخْرُجُوا مِنْهَا مِنْ غَمٍّ** (22:22)۔ جب وہ ارادہ کریں گے کہ اس غم [1] سے نکل جائیں تو وہ اس سے نکل نہیں سکیں گے۔ یہ دراصل طالبعلموں کو فیل ہو جانے کا وہ غم ہوتا ہے جس میں انہیں معلوم ہوتا ہے کہ دوبارہ چانس نہیں ملے گا، آخری چانس تھا جو ختم ہو چکا اور وہ اس میں فیل ہوئے اور پھر اگر طبیعت بھی حساس ہو تو ایک مقام پہ رک جانے کی وجہ سے نہ ختم ہونے والا احساس انہیں جس تحیر و التباس میں مبتلا کر دیتا ہے اور وہ جس تنگی و تاریکی میں ڈوب جاتے ہیں، وہ ہے اصل حزن وکرب جو ہر چارسو چھایا ہوا ہوتا ہے جس سے نکل بھاگنا ممکن نہیں۔

لوہے کو چیر کر جانے والی شدتِ احساس کی کیفیت

عزیزانِ من! قرآن نے کہا ہے کہ یہاں تو تم لوگ، اپنے مختلف قسم کے Excuses، بہانوں، اور معذرتوں سے اپنے احساسات کی شدت کی قوت کو دبا دیتے ہو لیکن وہاں تو کیفیت ایسی ہوگی کہ **فَبَصَرُكَ الْيَوْمَ حَدِيدٌ** (50:22)۔ تمہاری نگاہیں ایسی ہو جائیں گی جیسے وہ لوہے کے ٹکڑوں سے بھی آر پار ہو جائیں، تو وہاں تو یہ چیز چھپ نہیں سکے گی۔ وہ محسوسات کی تمام دیواروں کو چیر کر، سابقہ زندگی کے اعمال کے غیر محسوس اور غیر مرئی نتائج تک بلا روک ٹوک پہنچ رہی ہوں گی تو اس طرح وہ سب تیرے سامنے بے نقاب ہوگا۔ یہ جو احساس کی شدت ہے اس کے لیے قرآن نے یہ کہا ہے کہ یہ وہ غم ہوگا کہ جس میں وہ گرے ہونگے اور اگر وہ چاہیں کہ اس غم سے نکل

---

1. اَلغِمَامَۃُ اس چھینکے کو کہتے ہیں جو اونٹ وغیرہ کے منہ پر چڑھا دیتے ہیں تا کہ وہ کچھ کھا نہ سکے۔ نیز اس کپڑے کو جس سے اونٹنی کی آنکھیں باندھ دی جاتی ہیں۔ اس سے اَلْغَمّٰی اس مصیبت کو کہتے ہیں جس سے انسان نکل نہ سکے۔ نیز وہ پیچیدہ مسئلہ جس کا حل نہ نظر آئے اور اَلْغَمّٰی غبار اور تاریکی کو۔ نیز جنگ کی شدت جو قوم پر چھا جائے۔ اَلْغُمَّۃُ تحیر والتباس کو کہتے ہیں، نیز تاریکی و تنگی کو۔ تاج العروس اور محیط المحیط نے یہی معانی لکھے ہیں۔ سورۃ یونس میں ہے کہ لَا يَكُنْ اَمْرُكُمْ عَلَيْكُمْ غُمَّةً (10:71)۔ تمہارا معاملہ تم پر مشتبہ اور حیران کن نہ رہے۔

جائیں تو نکل نہیں سکیں گے۔ لہٰذا یہ وہ کیفیت ہے جس کے متعلق کہا ہے کہ **نَارُ اللّٰهِ الْمُوْقَدَةُ o الَّتِیْ تَطَّلِعُ عَلَی الْاَفْئِدَةِ** (104:7)۔ جہنم کی بھڑکائی ہوئی وہ آگ ہے کہ جو دلوں کو لپیٹ لیا کرتی ہے' وہ تو دلوں کو لپیٹنے والے شعلے ہیں۔ یہ تو خدا کے قانونِ مکافات کی بھڑکائی ہوئی آگ ہے جس کے شعلے دلوں کو اپنی لپیٹ میں لے لیتے ہیں۔ اسی لیے یہاں اسے غم سے تعبیر کیا ہے۔ قرآنِ کریم نے تو یہی کہا ہے کہ اس سے نکلنے کا سوال ہی نہیں پیدا ہوتا۔ یہ زندگی کا بڑا Scientific 'سائنسی طریق ہے' جو قرآنِ کریم نے پیش کیا ہے اور باقی دنیائے مذاہب کی کتابیں تو اپنی اصلی شکل میں نہیں ہیں اس لیے ان کی جو Original 'اصلی کتابیں' ہونگی ان میں تو یہی تصور ہوگا لیکن جو ان کے ہاں کی' اس وقت کی' مسخ شدہ کتابیں ہیں ان میں وہی جیل خانے کا سا تصور ہی ہے' سزا کا ہی تصور ہے کہ وہاں داخل کرنا اور پھر وہاں سے نکال لینا' جبکہ وحی کا بیان کردہ ابدی اور حقیقی تصور آج صرف آپ کو قرآنِ کریم میں ملے گا اور یہ وہ تصور ہے جس کی فطری اور Scientific (سائنسی) معیار کی تحقیقات تائید کرتی ہیں جو قرآن نے بتا رکھا تھا۔ باقی رہا یہاں کا جہنم تو اس میں تو ہمارا مشاہدہ یہ ہے کہ اس جہنم کے اندر سے اگر کوئی نکلنا بھی چاہے' تو اسے باہر جانے کیلیے پاسپورٹ ہی نہیں ملتا۔ دوسری مملکتیں اس کی اجازت ہی نہیں دیتیں۔ لہٰذا اسے وہیں رہنا پڑتا ہے۔ بہرحال قرآنِ کریم نے یہ کہا ہے کہ اگر اس غم سے نکلنے کا ارادہ بھی کریں گے تو نکل نہیں سکیں گے۔ اس کے مقابلے میں دوسرا گروہ مومنین کا ہے۔ اس کے متعلق بتایا ہے کہ **اِنَّ اللّٰـهَ يُدْخِلُ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَ عَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ جَنّٰتٍ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ يُحَلَّوْنَ فِيْهَا مِنْ اَسَاوِرَ مِنْ ذَهَبٍ وَّلُؤْلُؤًا وَّلِبَاسُهُمْ فِيْهَا حَرِيْرٌ** (22:23)۔ یہ لوگ اپنے ایمان اور اعمال صالح کی بنا پر ایسے معاشرہ میں رہیں گے جس کی شادابیوں پر کبھی خزاں نہیں آئے گی۔ (انہیں حکومت کی سرداریاں ملی ہوں گی۔ جن کے نشانات) سونے کے کنگن' موتیوں کے دروازے اور حریر واطلس کے ملبوسات ہوں گے۔

جنت کا بیان تمثیلی انداز لیے ہوئے ہے اس کی کنہ وماہیت ہمارے تخیل سے باہر ہے

عزیزانِ من! عام سادہ الفاظ میں تو اس کا ترجمہ ہمارے سامنے ہے کہ ایمان و اعمالِ صالح کا نتیجہ جنت کی زندگی ہوگی۔ وہ جنت عام ترجمے میں یہ ہے کہ جس کے نیچے نہریں بہہ رہی ہونگی' وہاں انہیں کنگن پہنائے جائیں گے: سونے کے کنگن' موتیوں کے ہار' ریشمی لباس۔ اب یہ چیزیں یہاں بھی آئی ہیں۔ دوسرے مقامات پر بھی اسی قسم کی چیزیں آئیں گی۔ قرآنِ کریم نے خود یہ بتایا ہے کہ جنت کا یہ سارا بیان تمثیلی بیان ہے' یعنی مثال کے طور پر بیان کیا گیا ہے۔ فی الحقیقت وہ بات نہیں ہے مثلاً **مَثَلُ الْجَنَّةِ الَّتِیْ وُعِدَ الْمُتَّقُوْنَ تَجْرِیْ مِنْ تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ** (13:35)۔ وہ جنت کہ جس کا وعدہ متقیوں سے کیا جاتا ہے' اس کی مثال یوں سمجھو کہ ایک باغ ہے جس میں پانی کی ندیاں جاری ہیں تو جو کچھ بھی جنت کے متعلق آئے گا وہ تمثیلی انداز ہے' مثال کے طور پہ بات سمجھائی گئی ہے اور بات ہے بھی ٹھیک۔ اس سے زندگی کی اگلی 'اسٹیج' اگلی منزل کی حقیقت کا اندازہ ہم اپنے شعور کی موجودہ سطح پر لگا ہی نہیں سکتے کہ درحقیقت اس کی کنہ و

ماہیت اور حقیقت ہے کیا؟ رحمِ مادر کے اندر تو بچے کو لاکھ سمجھاؤ کہ باہر کی کائنات کیسی ہے' اس کے ذہن میں آ ہی نہیں سکتا۔ اس کے لیے اس کائنات کی حقیقت کا ذہن میں آنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوسکتا۔ اصل یہ ہے کہ یہ جو ہماری موجودہ زندگی کی اسٹیج ہے اس میں ہم زمان ومکان کی حدود میں گرے ہوئے ہیں۔ ان محدودات کے اندر ہی عام ذہن سوچ سکتا ہے۔

عربوں کی سرزمین اور سوچ کے مطابق جنت کی نعما کا تذکرہ

عزیزانِ من! زندگی کی موجودہ سطح پر زمان اور مکان' Time & Space' کی حدود کے اندر ہمارا ذہن محدود ہے۔ وہ ان محدود چیزوں کے اندر ہی سوچ سمجھ سکتا ہے۔ جب بھی اس کا تخیل وتصور آئے گا تو محدود چیزوں کے اندر ہی آئے گا۔ کسی محدود (Finite) شے میں لامحدود (Infinite) کے متعلق تصور آ ہی نہیں سکتا۔ اس سے اگلی زندگی تو بہر حال ان حدودات (Limits) سے تو آگے ہے اور ان سے ماورا بھی ہے۔ اس لیے قرآن نے کہا ہے کہ تمہارا موجودہ شعور اس کی کنہ وحقیقت کو نہیں پا سکتا۔ اسے بس مثال سے سمجھو۔ اب جب کوئی بات مثال سے سمجھانی ہو تو سیدھی سی بات یہ ہے کہ وہ بات اسے اُس مثال سے سمجھائی جائے گی جو اس کے تجربے اور مشاہدے میں ہوگی۔ اسی طرح وہ جو اولیں مخاطب قوم ہوگی اس کے ذہن میں زندگی کی بلند ترین نعمتوں' آسائشوں' رعنائیوں' شادابیوں' آرام و سکون اور حسن کا جو تصور اس کے ذہن میں ہوگا' وہی بیان کیا جائے گا۔ اب اگر عربوں ❶ کو یہ بتا دیا جاتا کہ صاحب! وہاں تمہیں مکان ملیں گے جیسے ''تاج محل'' ❷ ہوتا ہے تو وہ اس قسم کے تاج محل سے کیا سمجھتے کہ قرآن کیا کہہ گیا ہے۔ عربوں کی زندگی' سخت گرم ملک' ریگستان

---

❶ نقشہ پر نگاہ ڈالیے۔ محل وقوع کے اعتبار سے عرب کے مشرق میں خلیج فارس' جنوب میں بحیرۂ عرب اور مغرب میں بحیرۂ قلزم واقعہ ہے۔ اس اعتبار سے اسے جزیرہ نمائے عرب کہا جاتا ہے۔ لیکن اس کے شمال میں دریائے دجلہ اور فرات بہتے ہیں۔ عربوں جیسی آب نادیدہ اور عطش گزیدہ قوم کے نزدیک دریا بھی سمندر سے کم نہیں ہوتا۔ چنانچہ ان کے ہاں جس جگہ بھی کچھ پانی جمع ہو وہ بحر کہلاتا تھا۔ وہ دریا کو بھی کبھی بَحرٌ اور کبھی یَمٌّ کہہ کر پکارتے تھے۔ اسی لیے وہ اپنے ملک کو جزیرہ نما نہیں بلکہ جزیرۃ العرب کہتے ہیں۔ ظہورِ اسلام سے قبل عرب کبھی ایک مملکت بنا ہی نہیں تھا۔ وہاں کی پیشتر آبادی خانہ بدوش قبائل پر مشتمل تھی۔ جن کا نظام (سیدھا سادہ) قبائلی تھا۔ ان کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ یہ کبھی کسی کے محکوم نہیں ہوئے تھے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی سب سے بڑی کمزوری یہ تھی کہ یہ اجتماعی زندگی کے تصور تک سے ناآشنا تھے۔ اسلام نے صرف انہیں اجتماعی زندگی سے آشنا کیا بلکہ پورے ملک کو ایک مملکت میں تبدیل کر دیا اور جب یہ ملک ایک مملکت بنا تو اس کا وجود ایران اور روم (بازنطین) دونوں کی نگاہوں میں کھٹکنے لگا۔ (حوالہ پرویزؒ: شاہکار رسالت 1987' ص ص۔ 164-163)

❷ تاج محل آگرہ (ہندوستان) میں سترھویں صدی عیسوی کی پانچویں دہائی میں شہنشاہ ہند' شاہ جہاں' نے اپنے اور اپنی رفیقہ حیات 'ممتاز محل' کے مقبرے کے لیے بنوایا تھا۔ یہ دنیا کی خوبصورت ترین عمارات میں شمار ہوتا ہے اور اسلامی فن تعمیر کا ایک بہترین نمونہ ہے۔ اسے سفید سنگ مرمر سے بنایا گیا ہے۔ یہ سنگ مرمر ہی کے 300 فٹ مربع پلیٹ فارم پر بنا ہے۔ اس کی عمارت 130 فٹ مربع پر محیط ہے۔ اس کی گنبد نما چھت 80 فٹ بلند ہے اور اندرونی حصہ نہایت ہی قیمتی پتھروں سے مرصع ہے۔

(The Illustrated Encyclopaedia of Knowledge (Volume 18), The Educational Book Guild Inc UK,1955, P. 4511)

جیسے صحرا میں، تھی جہاں میلوں تک کہیں سرسبزی کا نام ونشان نہ تھا۔ان کے تصور میں سب سے زیادہ آرام دہ آسائش کی چیز باغات ہو سکتے تھے۔اور باغات بھی کیا' جہاں کہیں کھجور کے چار درخت کھڑے ہوتے تھے، وہ اسے باغ کہا کرتے تھے۔ وہی ان کے نزدیک غنیمت تھا۔اسے تو بس یوں سمجھو کہ کہیں تھوڑا سا نخلستان ہوا' پانی جمع ہوا' اس کے گرد ذرا ذرا سی گھاس ہوئی' دو چار درخت اُگے تو بس یہ ان کی جنت بن گئی۔ موج ہوگئی۔اُن کے نزدیک اس کا نام جنت تھا۔عزیزانِ من! جنت کے معنی ہی باغ ہیں۔ وہ وہاں کچھ وقت کے لیے ٹھہرے' پانی خشک ہوا' خانہ بدوش' اپنا گھر کندھے پہ رکھا' اور چل دیئے۔اب انہیں اگر یہ بتایا جائے کہ بھئی! اتنے گھنے باغات ہونگے' یہاں سے وہاں تک درختوں کے سائے ہوں گے' جھومتی ہوئی شاخیں ہونگی' شاخوں پہ لدے ہوئے پھل' ان کے نیچے ہوں گے' اس قسم کا پانی رواں ہوگا جو کبھی خشک ہی نہ ہو' پت جھڑ بھی نہ ہو' ان کے ہاں وہ درخت ہر موسم میں پھل دیتے چلے جائیں تو پھر وہ زندگی کے دیئے جانے والے تصور کو صحیح طور پر سمجھ پائیں گے پھر تو یوں ہوگا کہ جیسے ان کے لیے راوی اس زندگی کے لیے عیش لکھتا ہے کہ ہر طرف ٹھنڈک ہی ٹھنڈک ہوگی۔ یہ انہیں سمجھانے کا انداز تھا۔

کشمیر میں حضرت بل کے اندر مولوی صاحب کا وعظ

عزیزانِ من! میں نے کشمیر میں دیکھا کہ حضرت بل کے اندر واعظ کہہ رہا تھا کہ اُدھر جنت میں جائیں گے تو وہاں ٹھٹھرنے والی ٹھنڈک ونڈک کچھ نہیں ہوگی' گرم گرم کمرے ہونگے' اس کے اندر آگ ہوگی' انگیٹھیاں ہونگی' بڑے مزے ہونگے' تمہیں بڑے اچھے اچھے لحاف ملیں گے۔اس کے برعکس اگر انہیں کہا جائے کہ وہاں ٹھنڈ ہوگی' ٹھنڈا پانی ہوگا' ٹھنڈی ہوائیں چلیں گی' سایہ ہی سایہ ہوگا تو اس پر وہ کیا کہیں گے؟ یہی کہ ایتھے ای فیر ساڈے لئی کی آ' بھائی صاحب![1] عزیزانِ من! جو اولیں مخاطب قوم ہوتی ہے اس کے مزاج کے مطابق تمثیلی انداز دیا جاتا ہے۔یعنی ان اہلِ عرب کو یہی سمجھایا جا سکتا تھا کہ وہاں اعلیٰ درجے کی کھجوریں ہونگی' انگور ہونگے اور چونکہ طائف میں انار بھی ہوا کرتے تھے اس لیے کہا کہ وہاں انار ہونگے' اس طرح کہا کہ وہاں جنت میں یہ کچھ ہوگا۔اب اگر ہم اولین مخاطب ہوتے تو اس کی جگہ اگر ہمیں یہ کچھ کہا جاتا کہ صاحب! تمہیں وہاں ایسا عمدہ لنگڑا ثمر بہشت ملے گا' مزا آ جائے گا تو ٹھیک ہے۔ہم بات اپنے ماحول اور تجربے ومشاہدے کی بنا پر بہتر طور پر سمجھ پاتے۔اس کے برعکس اگر ان اہل عرب کو کہا جاتا کہ صاحب! نہایت اعلیٰ درجے کا شیریں آم ملے گا' تو وہ عرب پوچھتے: حضور! یہ ہوتا کیا ہے؟

---

[1] بھائی صاحب! وہاں پھر ہمارے لیے کیا ہے؟ (کچھ بھی نہیں)

عربوں کے ہاں پانی کی قدر و قیمت

عزیزانِ من! عربوں کے ان حالات وکوائف کے پیشِ نظر اگر وہاں درخت کا ذکر ہے تو اس کے نیچے آبِ رواں کا تذکرہ ہے۔ میں نے کہا ہے کہ ان بیچاروں کا تصور بحر ❶ مت دیکھیے آج تو ہم سمجھتے ہیں کہ بحر سمندر کو کہتے ہیں مگر عربوں کے ہاں اگر کہیں بھی تھوڑا سا گڑھا کھود لیا جاتا اور اس میں پانی جمع ہو جاتا تو وہ اسے بحر کہتے تھے۔ ہمیں تو بہرحال دریا کے بعد نہر کا پتہ ہے کہ یہ ایک چھوٹا سا دریا ہوتا ہے۔ ان کے ہاں اگر کوئی ذرا سی نالی بھی بن جاتی تو وہ اسے نہر کہہ دیتے تھے۔ اے ایہو ای آ جنوں پنجابی اچ کھال کیندے نیں۔ اے زمینداراں دی کھیتاں نال جیہڑی ہوندی ہیگی اے' ❷ وہ اتنی سی نالی کو جس میں اگر پانی رواں ہے تو اسے نہر کہے دیتے تھے۔ گڑھے میں اگر کہیں پانی کھڑا ہو گیا ہے تو اسے نہر ❸ کہہ دیتے تھے۔ یعنی ان کو تو پانی کی اتنی قلت تھی کہ ان کے نزدیک کہیں تھوڑی سی جگہ میں پانی کا جمع ہو جانا بھی سمندر تھا اور اس کا رواں ہو جانا نہر تھی۔ یہ ہے وہ جسے یہ عرب **تَحْتِهَا الْاَنْهٰرُ** (22:23) کہتے تھے۔ سمجھ میں نہیں آتا کہ اگر نیچے نہریں بہہ رہی ہوں۔ ''تے درخت کتھے اُگے ہوئے ہوں گے فیر۔'' ❹ تو میں یہ عرض کر رہا تھا کہ یہ جو اولیں مخاطب قوم ہوتی ہے اس کے ذہن' فکر' تصور' تخیل' کے مطابق مثال دی جا سکتی ہے۔ اب اگر آپ بچوں کو کوئی مثال سمجھائیں تو Meta-Physics (مابعد الطبیعات) ❺ میں آپ ان سے کوئی بات نہیں کر سکتے۔ تو یہ ہے قرآنِ کریم کا وہ تمثیلی انداز جس میں اس نے ان عربوں کو جنت کی بات سمجھائی ہے۔ ان عربوں کا سب سے پہلے جو رابطہ پڑتا تھا وہ ایرانیوں کے ساتھ تھا۔ یہ وہاں آتے جاتے بھی تھے۔ آج تو یہ ایران' ❻ بہت سمٹ گیا ہے۔ اس زمانے میں ایران کی یہ مملکت' اُدھر موجودہ بغداد تک کے علاقے تک پھیلی ہوئی تھی اور

---

❶ ابن درید نے اپنی لغت ''کتاب الاشتقاق'' میں لکھا ہے کہ کثیر پانی بَحرٌ کہلاتا ہے۔ بحر دراصل اس جگہ کو کہتے ہیں جہاں بہت سا پانی جمع ہو جائے۔ تاج العروس اور انگریزی زبان میں عربی کے مشہور لغت لین لکسیکان (Lane`s Lexicon) نے بھی ان معانی کی تائید کی ہے۔

❷ یہ وہی ہے جسے پنجابی زبان میں کھالہ (Water Course) کہتے ہیں' یہ جو زمینداروں کی فصلوں کے پاس ہوتا ہے (جو ان فصلوں کو سیراب کرتا ہے)

❸ لین کے عربی لغت (Lane`s Lexicon) کے مطابق عربی زبان میں نہر اس پانی کو کہتے ہیں جو دو ساحلوں کے درمیان بہہ رہا ہو۔ اس میں دریا' ندی' نہر' نالے سب ہی آ جاتے ہیں' جن سے کھیت یا باغات سیراب ہوتے ہیں۔ پرویزؒ نے اپنی لغات القرآن جلد چہارم میں لکھا ہے کہ ''باغات میں نہریں رواں ہونے'' سے مراد زندگی کی شادابیاں اور سرفرازیاں ہیں۔ تاج العروس میں لکھا ہے کہ اَلنُّھُرُ بمعنی نَھَرٌ کے اور نَھَرٌ معنی وسعت و فراخی اور روشنی بھی ہیں اور اَلنَّھِیرُ کے معنی ہیں کثیر اور وافر۔

❹ پھر درخت کہاں اُگے ہوئے ہوں گے؟

❺ فلسفے کا وہ شعبہ جو بنیادی اصولوں بشمول وجودیات (علم الوجود)' کونیات (علم کائنات) علمیات (نظریہ علم) پر بحث کرتا ہے۔

❻ خطۂ ایران: فارس اور مادیا کی الگ سلطنتیں ایک زمانہ سے موجود تھیں۔ لیکن کیخسرو (ذوالقرنین) کے زمانہ 528-557 ق م میں یہ دونوں سلطنتیں مل کر ایک عظیم الشان سلطنت کی شکل میں صفحہ تاریخ پر ابھریں۔ کیخسرو (ذوالقرنین) کے عہد میں فارس کی دولت وسطوت نے برق رفتاری سے عروج حاصل کیا اور دارا کے زمانے (485-521 ق م) میں اپنے انتہائی عروج پر جا پہنچی۔ اس کے بعد سکندر اعظم کے حملہ 333 ق م نے [باقی اگلے صفحے پر]

اِدھر شام کے علاقوں کی یہ ساری سرحدیں مملکتِ ایران کی تھیں۔ وہاں تک ان عربوں کا روزمرہ کا آنا جانا تھا۔ اُن کے ساتھ اِن کے روابط تھے۔ اصل تو یوں ہے کہ اس زمانے میں تہذیب اور دولت وثروت میں دو ہی مملکتیں تھیں: بازنطینی ❶ مملکت اور ایران کی مملکت۔ ان ایرانیوں کا معیارِ زندگی بلند ترین تھا۔ قرآن نے اگر انہیں بتانا ہوتا کہ جنت کی زندگی میں کیا ہوگا تو پہلی بات تو یہ کہتا کہ اس میں اس قسم کی صحرا کی زندگی کی تپش نہیں ہوگی' بلکہ باغات ہونگے' فراوانی سے پانی رواں ہوگا' طرح طرح کے پھل ہونگے' گھنے باغات ہونگے تو انہیں فراوانی وسرفرازی کی ہی مثال میں وہی کچھ بتانا تھا جو وہ مملکتِ ایران میں' اپنے اس واسطے کے حوالے سے جانتے' پہنچانتے تھے اور قرآن نے یہی کچھ تمثیلی انداز میں دیا۔

ایرانی تہذیب اور جنت کا تمثیلی ذکر

عزیزانِ من! ایران کی تہذیب میں بلند ترین مقام اہل اساورہ کا تھا۔ اساورہ کنگن پہننے والے کو کہتے تھے۔ یہ لوگ شہنشاہِ ایران کے مقربین تھے۔ آج جو انہیں باڈی گارڈ کہتے ہیں' اس زمانے میں یہ نورتن تھے صرف وہی لوگ کنگن پہن سکتے تھے دوسرے لوگ نہیں

[گزشتہ سے پیوستہ] --

فارس کی بڑھتی ہوئی ترقی کو روک دیا۔ اس کے قریب ایک سو سال بعد (249 ق م) میں پارتھین نے فارس میں ایک نئی سلطنت کی بنیاد ڈالی۔ یہ سلطنت تاریخ میں ایک ممتاز حیثیت لیے نظر آتی ہے۔ سلطنتِ روما کے ساتھ اس کے مسلسل تصادم وتزاحم نے اسے کمزور کردیا۔ 212ء میں اردشیر نے علمِ بغاوت بلند کیا اور پارتھین سلطنت کو ختم کر کے فارس میں ایک نئی سلطنت کی بنیاد ڈالی جو تاریخ میں ساسانی سلطنت کے نام سے مشہور ہے۔ یہ ایران کی سلطنت کا چوتھا دور ہے۔ اس نے مذہب زرتشت کو ازسرنو رائج کیا۔ ساسانی خاندان کے زمانہ میں فارس کی سلطنت پھر بہت وسیع ہوگئی۔ مصر کو فتح کرلیا۔ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے زمانہ میں نوشیرواں کا پوتا' خسرو پرویز تخت نشین تھا۔ اس کے زمانہ میں ان کی فتوحات کا سلسلہ یروشلم کی مقدس دیوار تک جا پہنچا تھا۔ 624ء میں ہرقل نے ایران پر کامیاب حملہ کیا۔ ظہورِ اسلام کے وقت ساسانی خاندان ہی ایران پر حکمران تھا۔ خسرو پرویز کے مرنے کے بعد مملکت میں سخت تباہی پھیل گئی۔ اس کے بیٹے شیرویہ نے کل آٹھ ماہ حکومت کی۔ اس کے بعد اس کے بیٹے اردشیر نے ڈیڑھ سال حکومت کی۔ اسے ایک افسر نے قتل کردیا اور وہ خود بادشاہ بن بیٹھا۔ چند روز بعد درباریوں نے اسے قتل کر کے جواں شیر کو تخت نشین کیا۔ وہ ایک برس کے بعد مرگیا۔ جب 13ھ میں حضرت عمر رضی اللہ عنہ کے زمانے میں یزدگرد ایران کے تخت پر بیٹھا تو رُستم اس کا وزیراعظم اور وزیرجنگ تھا۔ ایران کا دارالسلطنت مدائن تھا۔

❶ ظہورِ اسلام کے وقت' خلیج فارس کے اس پار مجوسیوں کی قدیم اور عظیم سلطنت ایران تھی اور شمال میں عیسائیوں کی وسیع مملکت (بازنطین)۔ رومن ایمپائر (مملکتِ روم) قدیم دنیا کی وسیع وعریض اور نہایت متمدن مملکت تھی۔ قیصر قسطنطین (Constantine) نے عیسائیت قبول کر کے' بازنطین کو اپنا دارالخلافہ بنایا جو قسطنطنیہ کے نام سے مشہور ہوا۔ چوتھی صدی عیسوی میں سلطنت روما دو حصوں میں بٹ گئی تو مغربی حصے کا دارالخلافہ روم (Rome) قرار پایا اور مشرقی حصے کا قسطنطنیہ۔ اس مشرقی مملکت کو بازنطینی حکومت بھی کہتے ہیں اور اسی سے مسلمانوں کو واسطہ پڑا تھا۔ ویسے مورخین کبھی انہیں رومی کہہ دیتے ہیں اور کبھی بازنطینی۔ بعثتِ نبوی ﷺ کے زمانے میں ہرقل' بازنطینی مملکت کا شاہنشاہ تھا۔ شام' فلسطین' اور مصر وغیرہ کے علاقے سب اس کے زیرنگین تھے۔ حدودِ شام پر قدیم عربی قبائل بستے تھے' جنہوں نے مذہب عیسائیت اختیار کرلیا تھا۔ انہی قبائل کے روساء ہرقل کی طرف سے ان علاقوں کے حکمران تھے۔ انہیں غسانی کہا جاتا تھا۔ مسلمانوں کے جس قدر تصادمات ان علاقوں میں ہوئے' وہ بالواسطہ ہرقل کے ساتھ تھے کہ وہی اس سرزمین کا شاہنشاہ تھا' لیکن بلاواسطہ غسانی حکمرانی سے ہوئے جو وہاں ہرقل کی نیابت کرتے تھے۔

پہن سکتے تھے۔ یہ لوگ اکبر کے نورتنوں کی طرح' شاہنشاہ کے سفیرِ خاص تھے اور اساورہ کہلاتے تھے۔ ایران میں بادشاہ کے تقرب اور عزت وعظمت کا سب سے بڑا نشان سونے کا کنگن ہوتا تھا۔ جنہیں یہ نشان مرحمت ہو جاتا وہ اہلِ اساورہ کہلاتے تھے۔ اس کے ساتھ ہی انہیں پہننے کے لیے حریر واطلس کا لباس اور گلے میں ڈالنے کے لیے موتیوں کی ایک مالا دے دی جاتی تھی۔ یہ وہاں کے مقربین کا بلند ترین مقام ہوتا تھا۔ اب قرآن ان عربوں کو تمثیلی انداز میں عزت وعظمت' جنت اور جنت کی آسائشوں کے تصور کے متعلق سمجھانا چاہتا ہے کہ وہ فردوسی ❶ کے الفاظ میں' سوسمار ❷ کھاتے اور اونٹنیوں کا دودھ پیتے تھے۔ یہ سوسمار ایک جانور ہے جسے گوہ کہتے ہیں۔ اس کے اوپر بڑے بڑے کانٹے ہوتے ہیں۔ انہیں صحرا میں اسی قسم کا کوئی جانور مل سکتا تھا' وہ عرب اسے کھایا کرتے تھے۔ وہ جوٹڈیاں آتی ہیں' یہ انہیں بھی کھایا کرتے تھے۔ اس قوم کو قرآن کریم نے یہ بتایا کہ یاد رکھو! تمہیں جنت ملے گی۔ اس کے لیے پہلے تو یہ بتایا کہ اس جنت میں آسائشوں

---

❶ یہ اس واقعہ کی طرف اشارہ ہے جو حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے حضرت سعد رضی اللہ عنہ کو لکھا تھا کہ جنگ شروع کرنے سے پہلے اسلامی آئین کے مطابق یزدگرد (شاہنشاہ ایران) کے سامنے صلح کی شرائط پیش کر دی جائیں اور اس مقصد کے لیے مدائن (جو ایران کا دارالسلطنت تھا) سفیر بھیجے جائیں۔ یزدگرد کو سفراء کی آمد کی اطلاع ملی تو اس نے خاص طور پر دربار کو آراستہ کیا اس نے محسوس کیا کہ اتنی عظیم مملکت کے سفیروں کے شایانِ شان' اہتمام تزک واحتشام کرنا چاہیے لیکن جب سفیروں کا وفد وہاں پہنچا تو ان کی حالت یہ تھی ستے ہوئے چہرے' کندھوں پر بوسیدہ چادریں' ہاتھوں میں چابک' پاؤں میں موزے' دبلے پتلے گھوڑوں پر سوار' جو خاک اڑاتے چلے آ رہے تھے۔ یزدگرد باور نہیں کر سکتا تھا کہ اس مملکت کے یہی سفیر ہیں۔ اُسے ان سے بات کرنا بھی گوارا نہ تھا۔ لیکن جب اس کے اہل دربار نے اس پر زور دیا تو وہ طوعاً وکرہاً ان سے ملنے کے لیے آمادہ ہو گیا۔ وفد دربار میں پہنچا تو ان کے رئیس نے حسبِ معمول شاہنشاہ ایران سے کہا کہ یا تو اسلام قبول کر کے ہم میں سے ہو جاؤ یا اسلامی مملکت کے اقتدار کی برتری تسلیم کر لو تا کہ تم بھی محفوظ رہو اور تمہارا ملک اور باشندے بھی۔ اور اگر یہ بھی قبول نہیں تو پھر تلوار کے فیصلے کا انتظار کرو۔

یزدگرد نے یہ سنا تو غصہ کے مارے آگ بگولا ہو گیا۔ کہنے لگا کہ تم وحشی اور بدتہذیب عرب (فردوسی کے الفاظ میں) سوسمار کھانے اور اونٹوں کا دودھ پینے والے گنوار اور تمہاری جرأتوں کا یہ عالم! کیا تم بھول گئے ہو کہ تم ذرا سی سرکشی اختیار کیا کرتے تھے تو ہم (ایرانی) خود تمہارے مقابلے کیلیے نہیں نکلا کرتے تھے (ہم اسے باعثِ ننگ وعار سمجھتے تھے)۔ اپنے سرداروں سے کہہ دیا کرتے تھے اور وہ تمہاری گوشمالی کر کے تمہیں سیدھا کر دیتے تھے۔ اب اگر تم لوگوں کو بھوک اور افلاس نے تنگ کر کے آمادہ بہ جنگ کر دیا ہے تو ہم تمہارے روٹی کپڑے کا انتظام کر دیتے ہیں۔ جاؤ! آرام سے بیٹھو' کیوں اپنی جان کے لاگو ہو رہے ہو۔

رئیسِ وفد نے یزدگرد کی باتوں کو نہایت سکون اور اطمینان سے سنا اور اس کے بعد کہا تم نے ہماری پہلی حالت کے متعلق جو کچھ کہا ہے وہ بالکل ٹھیک ہے۔ ہم اس سے بھی زیادہ جاہل اور زبوں حال تھے لیکن خدا کی کتاب اور اُس کے رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی تعلیم وتربیت نے ہمارے اندر جو انقلاب برپا کر دیا ہے تمہیں اس کا علم نہیں۔ ہم اب ایک اور ہی قوم ہیں:

نگاہِ کم سے نہ دیکھ ان کی کج کلاہی کو　　یہ بے کلاہ ہیں سرمایۂ کلاہ داری　　(حوالہ: پرویزؒ: شاہکار رسالت۔ عمر فاروق۔ ادارہ طلوع اسلام، لاہور' 1987' ص ص۔ 176-175)

❷ سوسمار۔ گوہ

کا یہ سامان ہوگا' ثروتیں اور دولتیں اس انداز کی ہوں گی' جو ایران میں اُن کے سامنے تھیں۔

ایران کے شہنشاہ انگریزوں کی طرح بنیوں کی قوم نہ تھی

عزیزانِ من! اہلِ اساورہ کا یہ شاہی قرب تھا۔ اسی لیے انہیں شاہنشاہ کی طرف سے سے جڑاؤ کنگن ملتا تھا جو اس عہدے کی علامت تھا کہ اسے پہننے والا مقرب بادشاہ ہے۔ انگریز سر (Sir) کا خطاب دیدیتے تھے یہ تو نبیوں کی قوم تھی کہ ''پیسہ ویسہ دینا نہ پئے' خطاب ای دے کے ٹرخا جاندے سن''[1] وہ لوگ یہ نہیں کرتے تھے۔ وہ جو اساورہ ہیں' وہ تو ایران کے شہنشاہ کے مقرب ترین باڈی گارڈ یعنی نورتن تھے۔ ان کی نشانی یہ تھی کہ جڑاؤ کنگن' موتیوں کی مالا' اور حریری ریشم کی خلعت۔ تو قرآن کریم نے مثال کے طور پر' تمثیلی طور پہ' بات بتائی ہے کہ جَنّٰتٍ تَجۡرِیۡ مِنۡ تَحۡتِهَا الۡاَنۡهٰرُ (22:23)۔ ایسا معاشرہ جس کی شادابیوں پر کبھی خزاں نہیں آئے گی' رواں پانی اور خزاں ناآشنا درخت ہوں گے اُكُلُهَا دَآئِمٌ (13:35)۔ اس کے پھل وقتی نہیں' دائمی ہوں گے' انہیں حکومت کی سرفرازیاں حاصل ہوں گی' جن کے نشانات یُحَلَّوۡنَ فِیۡهَا مِنۡ اَسَاوِرَ مِنۡ ذَهَبٍ وَّلُؤۡلُؤًا وَلِبَاسُهُمۡ فِیۡهَا حَرِیۡرٌ (22:23)۔ سونے کے کنگن' موتیوں کے ہار' اور حریر و اطلس کے ملبوسات۔ انہیں سمجھانے کے لیے مثال ایران کے بڑے بڑے وزرا کے حریری اطلس کی ہی دی کہ تمہاری پوشاک ایران کے مقربین کی سی ہوگی۔ دوسری جگہ ہے کہ بیٹھنے کے لیے لب جو بچھے ہوئے قالین ہونگے۔ یہ وہی چیزیں ہیں جو ایران میں ہوتی تھیں: تو اب آپ سمجھ لیجیے کہ کہدیا ہے کہ مَثَلُ الۡجَنَّةِ الَّتِیۡ (13:35)۔ اس جنت کی مثال یوں سمجھو کہ۔ اب یہ بات صاف ہوگئی کہ ان الفاظ کی رو سے یہ نہیں ہے کہ انہیں واقعی وہاں اس قسم کے کنگن پہنا دیئے جائیں گے اور اس قسم کے موتیوں کا ہار گلے میں ڈال دیا جائے گا اور یہ حریری اور ریشم کے کپڑے پہنائے جائیں گے۔ یہ سمجھانے کا تمثیلی انداز ہے۔ آگے کہا کہ وَهُدُوۡۤا اِلَی الطَّیِّبِ مِنَ الۡقَوۡلِ وَهُدُوۡۤا اِلٰی صِرَاطِ الۡحَمِیۡدِ (22:24)۔ یہ اس لیے ہے کہ انہیں ایسے نظریہ حیات کی طرف راہ نمائی ملی تھی جو نہایت پاکیزہ اور خوشگوار ہے۔ انہیں اس راستے پر چلایا گیا تھا جو درخور[2] ہزار حمد و ستائش ہے۔

ہمارے دور کی میکاؤلی سیاست اور صراطِ الحمید میں فرق

عزیزانِ من! یہ اس لیے ہے کہ انہوں نے جو زندگی گزاری ہے اس میں ان کی راہنمائی خوشگواریوں کے اس راستے کی طرف کی گئی تھی جو صِرَاطِ الۡحَمِیۡدِ (22:24)۔ ہے یعنی ہر قدم پہ موجب حمد و ستائش ہے۔ یہ اس راستے پہ چل کے آئے تھے۔ اس لیے یہ اس منزل پہ آ پہنچے۔ آپ نے غور فرمایا کہ اُنہیں یہ منزل جسے جنت کہا گیا ہے' کیسے ملی ہے؟ کہا کہ صِرَاطِ الۡحَمِیۡدِ (22:24)۔ انہیں

---

1. پیسہ نہ دینا پڑے' ویسے ہی خطاب دے کر چلتا کریں۔
2. درخور: لائق۔

رہنمائی دے کر اس راستے پر چلایا گیا تھا' جو لائق ہزار حمد وستائش ہے۔ ہم صرف صراط المستقیم کی ہی دعا مانگتے ہیں' یہی دعا ہمیں سکھائی گئی ہے۔ یہ بھی ٹھیک ہے۔ اسی صراط المستقیم کا دوسرا پہلو (Aspect) صراط الحمید بھی ہے۔ الحمید تو خدا کی صفات میں سے ایک صفت (Attribute) بھی ہے۔ یہ راستہ بھی صرف خدا کی طرف لے جانے والا ہے۔ اسے بھی قرآن نے **صِرَاطِ الْحَمِیْدِ** (22:24)۔ کہا ہے۔ یعنی خود وہ راستہ بھی جو خدا کی طرف لے جاتا ہے باعثِ حمد وستائش ہے۔ اس کے برعکس ہمارے ہاں مکیاوَلی [1] سیاست ہے۔ اس میں مشہور ہے کہ

Means are justified by the ends achieved

یعنی منزل تک پہنچنے کے لیے کسی قسم کا بھی راستہ اختیار کرلو' سب جائز ہو جاتا ہے' خواہ وہ اپنی ذات میں جائز ہو' یا ناجائز ہو' خواہ حرام ہو یا حلال۔ یہ سب جائز ہے مگر اس کے لیے شرط (Condition) یہ ہے کہ تمہیں وہ مقصد حاصل ہو جائے۔ عزیزانِ من! یہ ہے ہمارے ہاں کی اس دَور کی سیاست۔ باالفاظ دیگر زندگی یہ ہے کہ تم کسی بھی طریقے سے اپنا مقصد حاصل کرلو تو ہر طریقہ جائز ہو جائے گا بشرطیکہ مقصد میں کامیابی ہو جائے۔ قرآن کہتا ہے کہ غلط راستہ صحیح گاؤں کی طرف پہنچا ہی نہیں سکتا۔ جو منزل ہے' جس گاؤں تم نے جانا ہے' غلط راستہ اس گاؤں کی طرف نہیں پہنچا سکتا' راستے کا صحیح ہونا مقدم ہے۔ وہ کہتا ہے کہ صحیح راستہ ہی صحیح منزل تک پہنچا سکتا ہے۔ یہاں راستے میں اور منزل میں کوئی تفریق نہیں ہے۔ یہ نہیں ہے کہ جائز اور ناجائز' غلط اور صحیح' جس قسم کا بھی جی چاہے راستہ اختیار کرلو' اگر وہ تمہیں منزل تک پہنچا دے تو وہ راستہ صحیح ہو گیا۔ وہ کہتا ہے کہ یہ غلط ہے۔ راستے کا صحیح ہونا نہایت ضروری ہے اور اسی لیے قرآنِ کریم نے کہیں صراط المستقیم کی دعائیں سکھائیں اور کہیں اسے صراط الحمید کہا ہے۔ صراط کے معنی راستہ کے ہیں اس لیے خود راستہ بھی ایسا ہونا چاہیے۔ تو یہ غلط بات ہے کہ ہم کوئی Means (ذرائع) اختیار کرلیں یا جس قسم کے جی چاہے ذرائع اختیار کرلیں' اور اگر وہ ذرائع ہمیں کامیابی سے ہمکنار کر دیتے ہیں تو پھر سارے راستے جائز قرار پا جاتے ہیں۔ یہ سراسر غلط ہے۔ اس صراط کو بھی صراط مستقیم اور صراطِ حمید ہونا چاہیے۔ راستے اور منزل میں کوئی فرق نہیں ہے۔ قرآن کے پروگرام کی رو سے' عزیزانِ من! بلیک مارکیٹنگ (Black Marketing)

---

[1] میکیاوَلی سیاست کا مالہ وماعلیہ کچھ یوں ہے۔ معاشیات کی دنیا کا بنیادی تصور یہ ہے کہ جو کچھ معاشی طور پر صحیح ہے وہ اخلاقی طور پر بھی صحیح ہے۔ اس تصور حیات کے مطابق اقوام میں جس قسم کا سیاسی نظام قائم ہوگا وہ بالکل صحیح ہے۔ وہ سیاسی نظام جس میں ہر قوم اپنی معاشی مرفہ الحالی (Economic Growth) کی فکر میں ہوگی اور اس مقصد کے حصول کے لیے ہر طریق کار کو جائز اور مناسب خیال کرے گا۔ یہ ہے وہ نظامِ سیاست جس کی داغ بیل مکیاوَلی (Machiavelli 1469-1527) نے رکھی اور جو اس وقت سے آج تک تمام مغربی اقوام کی سیاست کا عروۃ الوثقی ہے۔ اس میں ''قوت اور فریب'' (Force and Fraud) وہ دو عمود ہیں جن پر اس کی ساری عمارت کھڑی ہوتی ہے۔ اس رو سے مقصدِ پیش نظر کا حصول تمام سیاسی تگ وتاز کا منتہیٰ ہوتا ہے خواہ اس کے لیے کوئی طریق اختیار کرلیا جائے۔ اس لیے کہ طرق وذرائع کے جائز وناجائز کا معیار ان کے نزدیک فقط یہ ہے کہ ان سے مقصد حاصل ہو گیا یا نہیں۔ جن ذرائع سے مقصد حاصل ہو گیا وہ جائز جن سے مقصد حاصل نہ ہوا وہ ناجائز۔ یہ ہے اس سیاست کا نقطہ نظر۔

اور سمگلنگ (Smuggling) سے روپیہ کما کر حج کر آنا جنت میں نہیں پہنچا سکتا کیونکہ راستہ غلط ہے۔ اس کے برعکس قرآن کریم یہ کہتا ہے کہ **اِنَّ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا وَيَصُدُّوۡنَ عَنۡ سَبِيۡلِ اللّٰهِ وَالۡمَسۡجِدِ الۡحَـرَامِ الَّذِىۡ جَعَلۡنٰهُ لِلنَّاسِ سَوَآءَ ۨالۡعَاكِفُ فِيۡهِ وَالۡبَادِ‌ وَمَنۡ يُّرِدۡ فِيۡهِ بِاِلۡحَـادٍۢ بِظُلۡمٍ نُّذِقۡهُ مِنۡ عَذَابٍ اَلِيۡمٍ** (22:25)۔ یہ نظام جس کے حسین و خوشگوار نتائج کا ذکر اوپر (22:23-24) میں کیا گیا ہے' اس کا مرکز کعبہ ہے۔ یہ وہ واجب الاحترام مقام ہے جو تمام انسانوں کے لیے اطاعتِ خداوندی کا سرچشمہ قرار پائے گا۔ اسے ہم نے تمام نوعِ انسان کے لیے خواہ وہ یہاں کے رہنے والے ہوں' یا باہر سے آنے والے' یکساں طور پر کھلا رکھا ہے۔ (اس کے دروازے دنیا کے ہر ستائے ہوئے انسان کے لیے یکساں طور پر کھلے ہیں اور سب اس کی منفعت بخشیوں میں شریک ہیں) لیکن جو اس میں ظلم و زیادتی کے ساتھ حق کی راہ سے ذرا بھی اِدھر اُدھر ہٹے گا' اسے الم انگیز سزا دی جائے گی۔ یہ لوگ اس نظامِ عدل و احسان سے خود بھی سرکشی برتتے ہیں اور دوسروں کو بھی اس کی طرف آنے سے روکتے ہیں۔ (ان کی اس دھاندلی کو کب تک برداشت کیا جا سکتا ہے؟ وقت آ گیا ہے کہ ان کی روک تھام کی جائے تاکہ انسانیت ان کے جور و ستم سے امن میں رہے۔)

حج کا مقصد اور حق و باطل کا تقابلی نظام

عزیزانِ من! اب ہم کعبہ کے واجب الاحترام مقام پہ آ گئے ہیں جو تمام انسانوں کے لیے اطاعتِ خداوندی کا سرچشمہ قرار پاتا ہے۔ ہمیں یہاں سے پیچھے لوٹنا پڑے گا۔ آپ کو یاد ہوگا کہ بارہ تاریخ سے پہلے پانچ تاریخ کا درس تھا جو میں نے کعبے اور حج کے متعلق مختص کر دیا تھا۔ میں نے بتایا تھا کہ قرآن کی رو سے کعبہ کیا ہے' اور حج سے مقصود کیا ہے اور اسی لیے کہا تھا کہ اس کے بعد جو ساری آیات ہمارے سامنے آئیں گی' کعبے اور حج ہی سے متعلق ہیں' تو ان کی تشریحات تو میں نے اس پورے ایک درس میں کر دی تھیں۔ اب یہ جو آیتیں سامنے آئی ہیں تو وہ پوری تفصیل تو سامنے نہیں آئے گی' وہ تو بیان کی جا چکی ہے۔ اسی لیے تو میں نے وہ پورا درس اس کے لیے وقف کر دیا تھا تاکہ جب یہ چیزیں دوبارہ آئیں تو پھر ایک ایک آیت پہ مجھے رک کر یہ سب کچھ دوبارہ نہ سمجھانا پڑے۔ یہ حق اور باطل کی ایک کشمکش چلی آ رہی تھی۔ یہ حق اور باطل کیا تھا؟ دراصل یہ ایک غلط نظام تھا جو خطۂ عرب میں' ان عربوں کے ہاں' یا قریش کے ہاں' قریش کے ہاتھوں مسلط ہو رہا تھا۔

ملوکیت کی تعریف ہی یہ ہے کہ انسانوں کی انسانوں پر حکومت ہو

عزیزانِ من! جب ہم عرب کہتے ہیں تو اس سے مراد جزیرہ نمائے عرب ہے۔ اصل میں وہاں آباد خطہ یہی تھا جسے آپ مکہ کہتے ہیں۔ اس جزیرہ نمائے عرب میں دو تین ہی تو سارے شہر تھے۔ وہاں اب بھی دو چار ہی تو شہر ہیں۔ اُس زمانے میں تو یہی ایک شہر آبادی کا

مرکز تھا' باقی تو قبائل تھے' جو صحراؤں میں رہتے تھے' جنہیں اب بدوی یا اعراب کہا جاتا ہے۔ شہری زندگی مکہ کے انہی لوگوں کی تھی۔ ان دو تین شہروں میں مکہ ایک مرکزی مقام رکھتا تھا اور پھر سارے ہی عرب میں مکہ کو مرکزی حیثیت کعبے کی وجہ سے' کعبے کی تولیت کی وجہ سے تھی جبکہ قریش کے پاس باضابطہ کوئی حکومت نہیں تھی' کوئی مملکت نہیں تھی۔ ابتدائی دور کی قبائلی زندگی ہی تھی۔ گو کہ مکہ جیسا شہر بھی تھا لیکن زندگی ابھی قبائلی قسم کی تھی جس طرح سے پنچائتیں ہوتی ہیں۔ ابھی بادشاہت کا تصور نہیں تھا لیکن وہ جو جسدِ انسانیت کے جذام کی تین چیزیں ہیں: فرعونیت' قارونیت' اور ہامانیت یہ تینوں وہاں موجود تھیں۔ انسانوں کی انسانوں پر حکومت تھی لیکن اسکا نام ملوکیت یا بادشاہت نہیں تھا۔ اب اس کا نام بادشاہ رکھ لیجیے تو وہ ملوکیت ہو جاتی ہے اور اگر سیکولر جمہوری رکھ لیجیے تو وہ ملوکیت نہیں رہتی۔ قرآن کی رو سے یہ Form of Government کوئی شے نہیں ہے۔ بنیاد یہ ہے کہ انسانوں کی انسانوں پر حکومت۔ اس کی کوئی بھی شکل کیوں نہ ہو' وہ قرآن کی رو سے یکسر استبداد ہے' استحصال ہے' لعنت ہے' فرعونیت ہے۔ حکومت صرف خدا کے احکام کی ہوگی۔ یہ اسلام ہے اور یہی جائز ہے۔ تو پہلی چیز تو یہ تھی کہ قریش کے ہاں بادشاہت تو نہیں تھی لیکن حکومت بہر حال انسانوں کی ہی انسانوں کے اوپر تھی۔ خدائی احکام تو ان کے پاس تھے ہی نہیں۔

سیکولرازم سے زیادہ بدتر مذہبی پیشوائیت کی حکومت سیکولرازم سے زیادہ بدتر ہوتی ہے

عزیزانِ من! انسانیت کے لیے دوسری لعنت مذہبی پیشوائیت ہے۔ یہ انسانوں کی حکومت خدا کے نام پہ ہوتی ہے۔ یہ سیکولرازم سے بھی بدتر چیز ہے۔ سیکولرازم میں انسان دوسرے انسانوں پر یہ کہہ کے حکومت کرتے ہیں کہ ہم جن قوانین کی رو سے حکومت کرتے ہیں وہ ہمارے بنائے ہوئے ہیں۔ ان کی جگہ الٹ کے دوسرے انسان آ جاتے ہیں' وہ ان قوانین کو منسوخ کر سکتے ہیں' ان کی جگہ دوسرے قوانین ہو سکتے ہیں لیکن اگر یہ کہا جائے کہ ہم جو قانون نافذ کرتے ہیں' یہ خدا کی طرف سے ہے' تو یہ تو بدلا ہی نہیں جا سکتا' اس کے خلاف کہیں اپیل ہی نہیں ہو سکتی۔ اسے کہتے ہیں تھیا کریسی یا مذہبیت یا مذہبی پیشوائیت یا ہامانیت۔ جسدِ انسانیت کا یہ جذام وہاں مسلط تھا۔

قریش کا معاشی اور معاشرتی مقام

عزیزانِ من! کعبہ کی تولیت صرف اتنی ہی نہیں تھی کہ وہ ایک مقامِ درگاہ تھا' جہاں نذرانے چڑھتے تھے' چڑھاوے چڑھتے تھے۔ یہ کچھ بھی ہوتا تھا' مگر اس کے ساتھ ہی یہ چیز بھی تھی کہ وہ قریش کعبے کی تولیت کی بنا پر پورے ملک میں ایک مقامِ معزز رکھتے تھے۔ خود قرآن نے اس کی شہادت دی ہے کہ عربوں کا سا ایک ملک تھا جہاں نہ کوئی باقاعدہ بادشاہت تھی' نہ کوئی فوج تھی' نہ کوئی پولیس تھی' نہ کوئی قانون تھا۔ راستے تک بھی نہیں تھے۔ دن دیہاڑے قافلے لٹتے تھے۔ یعنی لوٹ مار پہ ہی تو اس ساری قوم کا گزارا تھا۔ وہاں کھیتی باڑی بھی نہیں ہوتی تھی' کوئی ذرائع پیداوار نہیں تھے' آمدنی کے کوئی ذریعے نہیں تھے۔ اسی لیے آج بھی جسے آپ ''غنیمت'' کہتے ہیں' وہ یہی مال مویشی

ہیں جو یوں ہاتھ آ جائے۔ انہیں ہی وہ غنیمت کہتے ہیں۔ ان کے ہاں غنیمت کیا تھا؟ وہ ہی غنیمت تھا۔ غنیمت تو "غنم" سے ہے۔ یعنی لوگوں کی بھیڑیں بکریاں۔ یہی بھیڑ بکریاں وہ لوٹ کے لے جاتے تھے' دوسرے لوگ تو وہاں محفوظ ہی نہیں ہوتے تھے۔ یہ تھا ان کے ہاں کا جسدِ انسانیت کا تیسرا جذام: قارونیت۔

مذہبی پیشوائیت کا تقدس

عزیزانِ من! عربوں کے قریش کے متعلق قرآن کریم نے یہ شہادت دی ہے کہ **رِحْلَةَ الشِّتَآءِ وَالصَّيْفِ** (106:2)۔ ان کے قافلوں کو سردی ہو یا گرمی' کوئی نہیں لوٹتا۔ کعبے کی تولیت کی بنا پہ تمہارا یہ مقام ہے کہ اس ملک میں جہاں کسی کا کوئی قافلہ محفوظ نہیں' تمہارے قافلے سردی اور گرمی ہر موسم میں رواں دواں چلتے رہتے ہیں' کسی کی ہمت نہیں ہوتی کہ ان قافلوں پہ ہاتھ ڈال دے۔ آپ نے دیکھا ہے کہ یہ لوگ مذہبی تقدیس سے کتنا فائدہ اٹھاتے تھے۔ اب بھی جہاں جہاں مذہبی تقدس ہوتا ہے ان چیزوں میں کوئی ہاتھ نہیں ڈال سکتا۔ مشہور ہوتا ہے کہ چور پیر جی کی گھوڑی چرانے کے لیے گیا۔ گھوڑی چرا کر رسا ہاتھ میں لیا تو وہ اندھا ہو گیا۔ پھر جب گھوڑی باندھ دی تو نظر آنے لگ گیا۔ پھر گھوڑی پکڑی تو پھر اندھا ہو گیا۔ جہاں تقدس ساتھ شامل کر دیا جائے تو یہ چیزیں ہوتی ہیں۔ عربوں کے ہاں بھی یہ عقیدہ مشہور تھا کہ یہ جو قریش تولیتِ کعبہ کے متولی ہیں ان کی کسی چیز کو ہاتھ نہیں لگانا چاہیے یعنی اور تو اور یہ لوگ حج کے لیے آتے تھے۔ وہ اپنے ساتھ مویشی جانور لاتے تھے۔ وہاں آ کے وہ چڑھاوے چڑھاتے تھے' وہاں جانور ذبح کرتے تھے' کھاتے تھے' وہ آتے ہوئے ان کے گلے میں ایک پٹہ ڈال دیتے تھے جس پہ یہ لکھا ہوا ہوتا تھا کہ یہ کعبے جا رہے ہیں۔ قرآن نے کہا ہے کہ **حَتّٰى يَبْلُغَ الْهَدْيُ مَحِلَّهٗ** (2:196)۔ اس **هَدْيٌ** [1] یا **هَدِيٌّ** سے مراد وہ جانور ہے جسے مکہ میں (حج کی تقریب) پر ذبح کیا جائے۔ اس سلسلے میں قرآن نے خانہ کعبہ کو **بِالْبَيْتِ الْعَتِيْقِ** (22:29) کہا ہے۔ کعبے کی طرف جانے والے یہ تحفے کے جانور تھے جن کے گلے میں وہ پٹہ ڈال دیتے تھے یہ ان کی نشانی ہوتی تھی۔ یہ بالکل ویسے ہی ہے جیسے سانڈ وغیرہ وقف ہو جاتے ہیں' منت مانی جاتی ہے' وہ کسی کی نذر ہو جاتے ہیں۔ پھر انہیں کوئی چھیڑتا تک نہیں ہے۔ اسی طرح سے ان جانوروں کو ایک پٹہ ڈال دیتے تھے جس سے یہ معلوم ہوتا تھا کہ بھئی! یہ کعبے کی طرف جا رہے ہیں۔ انہیں کوئی نہیں چھیڑتا تھا۔ تو مذہبی پیشوائیت کی بناء پر قریش کو یہ احترام و تقدس حاصل تھا۔

---

[1] ابنِ فارس نے اپنی کتاب مقاییس اللغۃ میں لکھا ہے کہ ھدٰی کے بنیادی معنی دو ہیں: (۱) راستہ بتانے کے لیے آگے بڑھ جانا اور (۲) ہدیہ اور تحفہ بھیجنا۔ ھَادٍ جو اصل میں ھَادِیٌ تھا' ہر چیز کے اگلے حصے کو کہتے ہیں کیونکہ وہ دُور سے نظر آ جاتا ہے۔ اس لیے جانور کی گردن پر اَلْھَادِیُ کا اطلاق ہوتا ہے کیونکہ وہ باقی بدن سے آگے ہوتی ہے۔ اس اعتبار سے ھَدْیٌ اور ھَدِیٌّ اس جانور کو کہتے تھے جو حج کے موقع پر بیت اللہ میں ذبح کرنے کے لیے لے جاتے تھے کیونکہ اس جانور کو آگے آگے رکھا جاتا تھا۔

مذہبی پیشوائیت بھی سرمایہ داری کی ہی ایک قسم ہے

عزیزانِ من! جسدِانسانیت کا یہ تیسرا جذام یعنی مذہبی پیشوائیت بھی سرمایہ داری ہی کی ایک قسم ہے اور بڑی عجیب' بڑی ہی لطیف قسم ہے۔ سرمایہ دار کو تو کچھ سرمایہ لگا کے کچھ آمدنی آتی ہے' یہ کچھ بھی Invest (لگانا) نہیں کرتے اور آمدنی چلی آ رہی ہے۔ یعنی یہ عجیب انڈسٹری ہے۔ پھر انہی میں سے قریش مکہ کے یہ تاجر تھے۔ تاجر بھی ایسے کہ جن کے قافلے یہاں سے وہاں تک محفوظ تھے۔ مکہ ایک مرکزی منڈی تھا۔ پھر یہ جو ان کے ہاں حج تھا' یہ انہی چیزوں کے لیے رہ گیا تھا۔ اب بھی ہمارے ہاں میلوں پہ منڈیاں لگتی ہیں۔ آپ یہ سمجھ لیجیے کہ یہ سارے ملک کی سب سے بڑی منڈی تھی۔ اور وہ جو چھوٹی چھوٹی منڈیاں لگتی تھیں تو وہ عمرہ کہلاتی تھیں اور وہ جو سالانہ ایک بڑی منڈی لگتی تھی وہ ان کے ہاں حج کہلاتا تھا۔ اسی طرح وہ جانور اور یہ ساری چیزیں وہاں لیے چلے آ رہے تھے۔ لیکن یہ تھا سب مذہب کے تقدس کی بنا پر۔

مملکت کا دارالخلافہ صرف شہر کا نام نہیں ہوتا بلکہ اس قوم کا نظریاتی سمبل (علامت) ہوتا ہے

عزیزانِ من! اصل شے ان جانوروں کا آنا' ذبح ہونا' منڈی کا لگنا ہی نہیں تھا۔ اصل شے اسلام کا آنا تھا۔ اسلام آیا۔ اس نے دین کا تصور دیا۔ اس نے کہا کہ جو اس مقصد کے لیے مملکت ہے اس میں خدا کے احکام اور قوانین عملاً نافذ ہوں۔ اب ہر مملکت کا ایک مرکزی مقام ہو گا۔ جیسا میں نے کہا تھا کہ جب بھی آپ آج ماسکو [1] کہتے ہیں تو اس سے مراد کوئی ایک شہر نہیں ہوتا۔ اس سے مراد کمیونزم کا نظریہ' اس کا منبع' یا سرچشمہ ہوتا ہے۔ جب آپ واشنگٹن کہتے ہیں تو اس کے معنی ایک شہر نہیں ہوتا۔ اسی طرح جب مکہ کہا جاتا تھا یا کعبہ کہا جاتا تھا تو اس سے مراد وہ پتھروں کا ایک مقام نہیں ہوتا تھا۔ ویسے اگر آج بھی اسے جا کے دیکھیے تو مکان کی حیثیت سے تو اس کا کوئی مقام ہی نہیں ہے۔ اس کے مقابلے میں وہاں جا کے ان بادشاہوں کے محلات دیکھیے' خدا کے گھر میں تو بس اللہ ہی اللہ ہے تو مقصد اس کے پتھر' اس کی اینٹیں' یا جو کچھ بھی وہ تھا' نہیں تھا۔ قرآن نے ان چیزوں کو شعائراللہ کہا ہے یعنی نظامِ خداوندی کے 'Symbols' علامات۔ ویسے میں نے کہا ہے کہ جھنڈا کسی مملکت کی علامت ہوتا ہے۔ جھنڈا کیا ہوتا ہے؟ وہ تو ایک ڈنڈا ہے۔ اس پہ ایک کپڑا لگا ہے۔ لیکن آپ جانتے ہیں کہ اس جھنڈے کا احترام کتنا کیا جاتا ہے۔ تو کعبے کی حیثیت سے جو یہ اب ایک مملکت قائم ہو رہی تھی' جس میں قوانینِ خداوندی کو عملاً نافذ ہونا تھا' کعبہ اس کا مرکزی محسوس مقام تھا۔ پہلے دن سے یہ بنایا ہی اس مقصد کے لیے گیا تھا۔ اس کی حالت بگڑ گئی تھی۔ دین مسخ ہو کے مذہب بن گیا تھا' جو دین کے شعائر تھے' Symbols تھے' وہ آہستہ آہستہ بت پرستی میں تبدیل ہو گئے تھے۔ ان کی پرستش ہونے لگ گئی تھی۔ اب حضورِ نبی اکرم ﷺ کے مقدس ہاتھوں سے مملکتِ خداوندی قائم ہو رہی تھی۔ اس ملک میں پہلے ہی دن سے کعبہ کو

---

[1] یاد رہے کہ یہ بات 26 دسمبر 1976ء کو کہی گئی تھی۔

وہی مرکزی مقام حاصل ہونا تھا جس مقصد کے لیے اسے بنایا گیا تھا۔

عزیزانِ من! فتح مکہ اس لیے نہیں تھا کہ اس کی رسول اللہ ﷺ کو اور اس مملکت کو بڑی ضرورت تھی تا کہ ایک شہر ان کے ہاتھ میں آ جائے۔ یہ بات نہیں تھی۔ حکومتِ خداوندی کا مرکز یہی کعبہ بن سکتا تھا کیونکہ پہلے ہی دن سے یہ بنایا ہی اسی غرض کے لیے تھا۔ اسی لیے اس ساری کائنات کے مالک خدا نے اس کو اپنا گھر کہا تھا ورنہ کائنات میں کونسا مقام ہے جو خدا کا نہیں ہے۔ یہ تھی کعبہ کی حیثیت۔

اگر مجاوروں سے درگاہیں چھین لی جائیں تو وہ یتیم ہو جائیں

عزیزانِ من! قریش اپنی تولیّت کی اس درگاہ کو چھوڑنا نہیں چاہتے تھے اور نہیں چاہتے تھے کہ مدینے کی مملکت ان کے ہاتھ سے نکل جائے۔ جیسا کہ میں نے کہا ہے اس کوٹھے کی کوئی ایسی قیمت نہیں تھی مگر سطوت اور جاہ وجلال کی دنیا میں یہ مسلّم تھا کہ اسی کی وجہ سے تو قریش کو یہ سارے مفاد حاصل تھے۔ اگر مجاوروں سے یہ درگاہیں چھین لی جائیں تو اس کے بعد ان کا مقام ہی چھن جاتا ہے۔ پھر تو یوں ہے کہ گویا:

پھرتے ہیں میر خوار کوئی پوچھتا نہیں [1]

تو آپ سوچیے کہ کعبے کے مجاوروں سے اگر یہ درگاہ چھن جائے تو باقی ان کے پاس کیا رہتا ہے۔ یہ تھی اصل کشمکش۔ وہ اسلام کے اس نظام کو وہاں مسلط نہیں ہونے دینا چاہتے تھے۔ وہ اس کعبے کی درگاہ کو کسی دوسرے کی تولیت میں نہیں جانے دینا چاہتے تھے۔ اس کے چلے جانے سے ان کا کچھ بھی نہیں بچتا تھا۔

حج اور عمرے کا بنیادی مقصدِ عظیم

عزیزانِ من! اب اس پس منظر میں قرآن کی ان آیات کو دیکھیے۔ اس کعبے کو اس مملکتِ خداوندی نے اپنی تولیت میں لینا تھا۔ اسے اس مملکت کا مرکزی مقام بنانا تھا۔ اس مملکت کے نمائندوں نے مملکت کے امور پہ گفت وشنید کے لیے، فیصلے کرنے کے لیے، مشاورت کے لیے جمع ہونا تھا۔ یہ حج تھا اور پھر سال بھر میں چھوٹی چھوٹی کانفرنسیں کرنی تھیں، وہ عمرہ تھا۔ وہ مقام بطور ایک جگہ تو وہی رہا، مگر اس مقام کی ساری حیثیت بدل گئی۔ قریش یہ نہیں چاہتے تھے۔ اس ساری حق وباطل کی کشمکش کی بنیادی وجہ یہی تھی۔

سبیل اللہ بڑی ہی جامع اصطلاح ہے

عزیزانِ من! اب اس تناظر میں سنیے کہ یہ آیت کیا ہو گی؟ کہا کہ **اِنَّ الَّذِیۡنَ کَفَرُوۡا وَ یَصُدُّوۡنَ عَنۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ وَ الۡمَسۡجِدِ الۡحَرَامِ الَّذِیۡ جَعَلۡنٰہُ لِلنَّاسِ سَوَآءَ ۨالۡعَاکِفُ فِیۡہِ وَ الۡبَادِ** (22:25)۔ یہ نظام، جس کے حسین وخوشگوار

---

[1] میر (1723-1810ء) کا یہ پورا شعر یوں ہے:

پھرتے ہیں میر خوار کوئی پوچھتا نہیں — اس عاشقی میں عزتِ سادات بھی گئی

نتائج کا ذکر (22:23-24) میں کیا گیا ہے' کا مرکز کعبہ ہے۔ یہ وہ واجب الاحترام مقام ہے جو تمام انسانوں کے لیے اطاعتِ خداوندی کا سرچشمہ قرار پائے گا۔ اسے ہم نے نوعِ انسان کے لیے' خواہ وہ یہاں کے رہنے والے' ہوں یا باہر سے آنے والے یکساں طور پر کھلا رکھا ہے۔ یہ لوگ اس نظامِ عدل و احسان سے خود بھی سرکشی برتتے ہیں اور دوسرے لوگوں کو بھی اس کی طرف آنے سے روکتے ہیں۔ ان کی اس دھاندلی کو کب تک برداشت کیا جا سکتا ہے؟ وقت آ گیا ہے کہ ان کی روک تھام کی جائے تاکہ انسانیت ان کے جور و ستم سے امن میں رہے۔ یہاں سوال یہ ہے کہ یہ لوگ کیا کرتے ہیں؟ کہا کہ **يَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ** (22:25)۔ وہ راستے جو خدا کی طرف جانے والے ہیں' ان میں روک بن کے بیٹھ جاتے ہیں' انسانیت کو ان راستوں پر چلنے نہیں دیتے۔ سبیل اللہ کی یہ اصطلاح بڑی بلند اور جامع ہے۔ ہر وہ راستہ' ہر وہ ذریعہ' ہر وہ ممکن شکل' جو حکومتِ خداوندی کے قیام میں مدد و معاون ہو' وہ سبیل اللہ ہے۔ کشمکش یہ تھی **يَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ** (22:25)۔ یہ لوگ اس کے راستے میں روک بن کے کھڑے ہو گئے تھے کہ یہ بات نہیں ہو گی کہ کسی انسان کی حکومت باقی نہ رہے' انسان کی پیشوائیت باقی نہ رہے' انسانوں کی سرمایہ داری باقی نہ رہے۔ یہ جو جدوجہد ہو رہی تھی یہ لوگ اس کے راستے میں رکاوٹ بنتے تھے اور اس کے لیے Symbolically' علامت کے طور پر' وہ لوگ مسجد الحرام یعنی کعبہ کی طرف آنے نہیں دیتے تھے۔

کفار کی اس بے پناہ مخالفت کا واحد مقصد اس نظامِ عدل و احسان کے مرکز کی مخالفت تھا۔ اب یہ معنی نہیں ہیں کہ یہ جو کوٹھا تھا اس کی طرف لوگوں کو نہیں آنے دیتے تھے۔ جس نظام کا مرکز اس نے بننا تھا وہ اسے اس نظام کا مرکز نہیں بننے دینا چاہتے تھے۔ یہی اصلی وجہ نزاع تھی۔ اسی لیے قرآن کریم نے کہا تھا کہ **يَصُدُّوْنَ عَنْ سَبِيْلِ اللّٰهِ** (22:25)۔ یہ سبیل اللہ میں روک بن کر کھڑے ہیں' اس نظامِ عدل و احسان کی طرف آنے نہیں دیتے۔ یہ ہر اس راستے' ذریعے' اور اس نظام کی ترویج کی ہر ممکن شکل و صورت کو' جو حکومت خداوندی کے قیام میں مددگار بنے' روکتے ہیں۔

سجدے کے معنی ہی نظامِ خداوندی کے سامنے سر جھکا دینا ہے

عزیزانِ من! ''اب تو ہمارے ہاں مسجد دے معنی مسیت رہ گئے نیں صرف''۔ [1] یعنی وہ جگہ جہاں پانچ وقت جا کر نماز پڑھی جاتی ہے۔ اس کا باقی کوئی مصرف نہیں ہے۔ مسجد کا لفظ تو سجدے سے نکلا ہے۔ سجدے کے معنی ہی ہیں: احکامِ خداوندی کے سامنے سر جھکا دینا۔ مسجد وہ مقام تھا جہاں احکامِ خداوندی کے سامنے سر جھکانے کے متعلق تمام معاملات طے ہوتے تھے۔ یہ اتنی واجب الاحترام جگہ تھی۔ مقام کعبے کو اسی لیے مسجد کہا گیا ہے۔ اس کا مقصد ہی یہ تھا کہ وہاں یہ دیکھا جائے کہ نوعِ انسانی احکامِ خداوندی کے سامنے کیسے سرِ تسلیم خم کرتی ہے۔ یہ وہ سجدہ تھا جو نماز میں کرتے ہیں اور کیا یہ لوگ اس قسم کے سجدے سے روکتے ہیں کہ یہ نہ ہونے پائے؟ اب آپ نے

---

[1] اب تو ہمارے ہاں مسجد کے معنی صرف ''مسیت'' یعنی وہ عمارت جہاں نماز پڑھی جائے رہ گئے ہیں۔

سمجھ لیا کہ اس کا پہلا مقام کیا ہو گیا۔ یہ جو انہوں نے اپنی اس قسم کے سجدے سے وہاں Manoply (اجارہ داری) قائم کر رکھی ہے' اجارہ داری بنا رکھی ہے کہ یہ ان قریش کی ملکیت ہے' انہی کے قبضے میں رہے گی' انہی کی تولیت میں رہے گی' یہی یہاں رہیں گے' باہر والا کوئی آ کے یہاں اپنا تسلط نہیں جما سکتا' اس کی بجائے قرآن نے اس کے متعلق کہا کہ **جَعَلْنٰهُ لِلنَّاسِ سَوَآءَ نِالْعَاكِفُ فِيْهِ وَالْبَادِ** (22:25)۔ یہ تمام نوعِ انسانی کے لیے' خواہ وہ یہاں کے رہنے والے ہوں' یا باہر سے آنے والے' یکساں طور پر کھلا رکھا ہے۔ اس کے دروازے دنیا کے ہر ستائے ہوئے انسان کے لیے یکساں طور پر کھلے ہیں اور سب اس کی منفعت بخشیوں میں شریک ہیں۔

مسجدِ حرام پر کسی کی اجارہ داری نہیں ہو سکتی' یہ الناس (نوع انسان) کے لیے وجہِ منفعت ہے

عزیزانِ من! یہاں کہا ہے کہ کعبہ کو نوعِ انسانی کے لیے Open City (کھلا شہر) کی حیثیت سے Declare (اعلان کرنا) کریں گے۔ یہ ساری دنیا کے لیے یکساں طور پر کھلا ہو گا خواہ وہ یہاں کے رہنے والے ہوں یا باہر کی دنیا کے ہوں۔ یہ سب کے لیے Open City (کھلا شہر) ہو گا۔ کیا بات ہے! اس ایک تبدیلی سے قریش کی وہ ساری خود ساختہ اجارہ داری چھن جاتی تھی کیونکہ جب کعبے کی Monoply (اجارہ داری) نہ رہے' درگاہوں کے مجاوروں کو ہٹا دیا جائے' تو اس سے آپ دیکھتے ہیں کہ پھر وہ کتنا بڑا Change (تغیر) آ گیا۔ یہاں قرآن کریم نے اسے **لِلنَّاسِ** کہا ہے یعنی پوری نوعِ انسانی کے لیے اس کی یکساں حیثیت ہو گی۔ سب اس کی منفعت بخشیوں میں شریک ہوں گے۔ یہ **سَوَآءَ نِالْعَاكِفُ فِيْهِ وَالْبَادِ** (22:25)۔ ہے یعنی وہ یہاں کے رہنے والے ہوں یا باہر کے لوگ ہوں' یہ سب کے لیے یکساں ہے اور منفعت بخش ہے۔ اسی سے ہمارے ہاں بھی ایک مسئلہ آیا تھا۔ مسئلہ تو فقہ کا تھا لیکن وہ ایک حدیث پہ مبنی ہے کہ مکے کے مکانوں کا کرایہ نہیں لیا جاتا تھا۔ لیکن آج ان چیزوں کو کیوں سامنے آنے دیا جائے؟ اس سے اجارہ داروں کے مفاد پر زد پڑ جاتی ہے۔ بہر حال وہ تو بلند ترین بات تھی جو قرآن نے کہی کہ اس پہ اور اس کی چیزوں پہ Monoply یا اجارہ داری نہیں ہو سکتی۔ یہ نہ قریش کا گھر ہے' نہ عجم کا ہے' نہ عرب کا ہے' نہ کسی قوم کا ہے' یہ **بَيْتِ الْعَتِيْقِ** (22:29) ہے' یہ خدا کا گھر ہے اور جب خدا سب کا سانجھا خدا ہے تو اس کا گھر بھی سب کے لیے کھلا ہو گا' یہ پوری نوعِ انسانی کے لیے یکساں طور پہ کھلا ہوا رہے گا۔ **وَمَنْ يُّرِدْ فِيْهِ بِاِلْحَادٍ بِظُلْمٍ نُّذِقْهُ مِنْ عَذَابٍ اَلِيْمٍ** (22:25)۔ جو اس سیدھی سی بات کے اندر ٹیڑھا پن پیدا کرنا چاہے گا اور یہ جو ہم نے سب کے لیے راستے کھلے رکھے ہیں' ان میں بند لگانا چاہے گا' جس مقصد کے لیے ہم نے اس کو متعین کیا ہے' اس کے خلاف کوئی مقصد اس میں کرے گا تو یاد رکھو کہ ہم اس کو عذاب الیم دیں گے۔ اور کیا آپ کو پتہ بھی ہے کہ بظاہر یہ یونہی ایک پتھروں کی چار دیواری کا ایک کوٹھا تمہیں نظر آتا ہے اس کی حقیقت کیا ہے؟

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ہاتھوں کعبہ کی تعمیر کا مقصد

عزیزانِ من! بظاہر پتھروں کی چار دیواری کے اس کوٹھے کی حقیقت کو قرآن کریم نے اس آیت میں واضح کر دیا کہ یہ نظامِ خداوندی کا مرکز ہے۔ **وَاِذۡ بَوَّاۡنَا لِاِبۡرٰهِيۡمَ مَكَانَ الۡبَيۡتِ اَنۡ لَّا تُشۡرِكۡ بِىۡ شَيۡـًٔا** (22:26)۔اس مرکز نظام خداوندی کی تاسیس ابراہیمؑ کے ہاتھوں عمل میں آئی تھی تا کہ انسانوں کے لیے محکومیت صرف خدا کی رہ جائے۔اس میں کسی اور کو شریک نہ کیا جائے۔اسی لیے تو ابراہیم کے ہاتھوں اس کی بنیاد رکھائی گئی تھی۔اب سوال یہ ہے کہ یہ بنیاد کس مقصد کے لیے تھی؟ کہا تا کہ قوانینِ خداوندی کے علاوہ کسی اور قانون کی اطاعت نہ کی جائے کیوں کہ یہ شرک ہوگا۔اب دیکھ لیجیے کہ وہ ایک مکان تعمیر کرا رہا ہے' ایک کمرہ تعمیر کرا رہا ہے۔ بظاہر یہ تو وہی پتھروں کا' اینٹوں کا' گارے کا' ایک کوٹھا سا ہی ہے۔اس میں تو یہ بات نہیں تھی کہ یہ کیا چیز ہے؟ عزیزانِ من! اس کوٹھے سے مقصد یہ تھا کہ قوانین واحکامِ خداوندی کے ساتھ انسانوں کا کوئی حکم نہ ملا دیا جائے۔ یہ شرک ہو جائے گا۔اس مقصد کے لیے یہ مکان بنایا جا رہا تھا۔ تو اب ظاہر ہے کہ محض مکان بنا دینے سے تو یہ مقصد حاصل نہیں ہوسکتا۔ وہ مقام تو کسی نظام کا ایک محسوس مرکز بنتا تھا۔ وہ نظام یہ تھا کہ **اَنۡ لَّا تُشۡرِكۡ بِىۡ شَيۡـًٔا** (22:26)۔انسانوں کے لیے محکومیت صرف خدا کی رہ جائے' اس میں کسی اور کو شریک نہ کیا جائے اور اس کے بعد کہا کہ **وَّطَهِّرۡ بَيۡتِىَ لِلطَّآئِفِيۡنَ وَالۡقَآئِمِيۡنَ وَالرُّكَّعِ السُّجُوۡدِ** (22:26)۔اور ہم نے اسے کہا تھا کہ وہ اس مرکز کو' انسانوں کے خود ساختہ تصورات و معتقدات سے پاک اور صاف رکھ کر' اس جماعت کی تنظیم و تربیت کے لیے مخصوص کر دے جس کا فریضہ زندگی یہ ہے کہ وہ تمام اقوامِ عالم کی نگرانی و پاسبانی کرے' نظام عدل و انصاف کو قائم رکھے' اور قوانینِ خداوندی کے سامنے سر تسلیم خم کر کے ان کی پوری پوری اطاعت کرے۔یہی وجہ تھی جو ہم نے ان سے یہ سب کچھ کہہ دیا تھا۔ یہاں اس ''اپنے گھر'' کے لیے طَهِّرۡ کا لفظ آیا ہے۔ویسے طَهِّرۡ کے معنی ہوتے ہیں کہ ''جو چیزیں اس کے شایانِ شان نہ ہوں' انہیں اس سے دور ہٹا دینا۔''[1] پاکیزگی بھی اسی لیے ہوتی ہے کہ نجاست کو دُور ہٹا دیا جاتا ہے۔عزیزانِ من! اس لفظ کے بنیادی معنی یہی ہوتے ہیں' کہ جو چیزیں اس کے شایانِ شان نہ ہوں' انہیں اس سے دُور ہٹا دیا جائے۔حضرت ابراہیم علیہ السلام کے ہاتھوں پتھروں سے بنوائے جانے والے اس ایک کوٹھے کو اب ''بیتی'' کہا جا رہا ہے کہ یہ ''ہمارا گھر ہے''۔اس گھر کو پاکیزہ رکھیں۔عزیزانِ من! ہمیں اس لفظ کے یہی معنی کرنے ہونگے۔اس گھر میں دوسرے معتقدات رکھنا اور ان پر عمل کرنا شرک ہے۔ پہلے کہا کہ اس میں کسی قسم کے شرک کی آلودگی نہ آنے پائے۔ اور یاد رکھیے!

---

[1] تاج العروس نے ان معانی کی تائید کی ہے کہ قرآن کریم میں طہارت کا لفظ صرف جسمانی پاکیزگی کے لیے ہی نہیں استعمال ہوا بلکہ اس میں قلبی اور ذہنی پاکیزگی بھی شامل ہے' جن کا ظاہر و باطن پاکیزہ ہو' جو قلب و نگاہ کی پاکیزگی کے مالک ہوں' جو اپنے ذہن کو تمام تعصبات سے خالی رکھیں' جو اپنے دلوں کو تمام ذاتی رجحانات و میلانات سے منزہ رکھیں' جن کا ذہن غیر قرآنی تصورات کی آماجگاہ نہ ہو۔تفصیل کے لیے دیکھیے: پرویزؒ: لغات القرآن جلد سوم' 1961ء ص ص۔1093-1094۔

اسے دہرا دوں کہ توحید خالص احکامِ خداوندی کی اطاعت کا نام ہے۔ کفران تمام قوانین سے انکار کا نام ہے۔ اور شرک یہ ہے کہ کچھ وہ قانون لے لیے جائیں اور کچھ اپنے قانون اس میں ملا دیئے جائیں' اسے دوسرے الفاظ میں یوں کہیں گے کہ شخصی قوانین (Personal Laws)' شریعت کے مطابق ہونگے اور Public Laws (حکومت کے قوانین) مملکت کے ہوں گے جبکہ فرمانِ الٰہی یہ تھا کہ **وَطَهِّرْ بَيْتِيَ لِلطَّآئِفِيْنَ وَالْقَآئِمِيْنَ** (22:26)۔ یہ ''گھر'' شرک کی آلودگی سے پاک اور صاف رکھا جائے گا: طآئفین کے لیے بھی اور قائمین کے لیے بھی۔

قرآنی حقائق سے دُوری مذہب کی بنیاد پر ہمارے ہاں کے مروجہ تراجم ہیں

عزیزانِ من! ہمارے ہاں قرآنی الفاظ کے عام لفظی ترجمے کر دیئے گئے ہیں۔ اب دیکھیے کہ لفظ طائفین اور قائمین کے عام لفظی ترجمے ہو گئے ''طواف کرنے والے اور قیام کرنے والے'' اور کہہ دیا کہ یہ ''میرا گھر'' ان کے لیے ہے۔ اسی طرح **وَالرُّكَّعِ السُّجُوْدِ** کو رکوع کرنے والے اور سجدہ کرنے والے کہہ دیا جبکہ اس کا بہت ہی اہم مقصد تھا کہ شرک کی آلودگی نہ آنے پائے۔ میں نے عرض کیا ہے' عزیزانِ من! کہ جب دین مذہب میں تبدیل ہو جاتا ہے تو پھر

رہ گئی رسمِ اذاں روحِ بلالؓ نہ رہی ❶

پھر رسومات باقی رہ جاتی ہیں۔ اب یہاں یہ جو کہا ہے کہ تم میرے گھر کو پاک رکھو' پاکیزہ رکھو' صاف رکھو' تو ان ''رسمِ اذاں'' کے پرستاروں نے کہا کہ یہ تو ہو گیا غسلِ کعبہ' اور دوسری یہ چیز تھی کہ شرک نہ آنے پائے تو اس کے لیے کہا کہ اب اس میں کوئی بت نہیں رکھا جا سکتا' اور وہ جو ذہنوں' دلوں' اور آستینوں کے اندر چھپے ہوئے بت ہیں' وہ تو سب کے سب ساتھ ہونگے' صرف پتھر اور مٹی کا بت نہیں رکھا جائے گا کیونکہ یہ شرک ہے' یہ گھر طائفین اور قائمین کے لیے رکھا جائے گا۔ اس طرح اب طآئفین طواف کرنے والے ہو گئے اور قآئمین نماز میں کھڑے ہونے والے ہو گئے' الرکع ہو گئے۔ رکوع میں جانے والے' اور السجو د سجدہ میں جانے والے۔ بس اس سے سارا مقصد حل ہو گیا۔ **یاللعجب !!**

ہماری غلط نگہی کا نتیجہ اور کعبہ کے مرکزِ محسوس نظام کی خصوصیت

عزیزانِ من! اس گھر یعنی خانہ کعبہ کو اس اہتمام سے بنوایا گیا' خدا نے اِسے اپنا گھر کہا' اس کے لیے کتنی بڑی کشمکش ہوئی' یعنی اگر یہی چیز تھی کہ وہاں ذرا طواف کرنا تھا' رکوع اور سجود ہی کرنا تھا تو اس قسم کا گھر مدینے میں کیوں نہیں بن سکتا تھا۔ وہاں بھی تو مسجد بنی ہوئی

---

❶ رہ گئی رسم اذاں' روح بلالی نہ رہی فلسفہ رہ گیا' تلقینِ غزالی نہ رہی
اقبال: جواب شکوہ در بانگ دار' نیشنل بک فاؤنڈیشن' اسلام آباد' 1996' ص 213)

تھی۔ وہاں یہ سب کچھ ہوتا تھا۔ کیا ان مساجد کے اندر' جو مدینے میں تھیں' قیام نہیں ہوتا تھا؟ کیا وہاں رکوع نہیں ہوتا تھا؟ کیا سجود نہیں ہوسکتے تھے؟ قرآن کریم نے یہاں طآئفین کا لفظ استعمال کیا ہے۔ میں نے آپ کو بتایا تھا کہ عربی زبان میں ''طائف راتوں کو پہرہ دینے والے' نگہبانی کرنے والے' نگرانی کرنے والے ہوتے ہیں۔'' اس امت کو کہا تھا کہ **شُھَدَآءَ عَلَی النَّاسِ** (2:143)۔ وہ تمام اقوام عالم کے اعمال کے محاسب ونگران ہو۔ اس امت کا' اس قوم کا یہ فریضہ ہے۔ کیونکہ **کُنْتُمْ خَیْرَ اُمَّةٍ اُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ** (8:109)۔ تم بہترین قوم ہو۔ تمہیں ہم نے نوعِ انسانی کی بھلائی کے لیے پیدا کیا ہے اور بھلائی کی ایک بات یہ ہے کہ **شُھَدَآءَ عَلَی النَّاسِ** (2:143)۔ تم تمام نوعِ انسانی کے اعمال کی نگرانی کرو۔ سوال یہ تھا کہ تم کس انداز کی نگرانی کرو؟ اس کے جواب میں کہا کہ طآئفین (22:26) کی یعنی یہ کہ خلقِ خدا آرام سے سوئے اور تم پہرے دو تا کہ انہیں کسی قسم کا خطرہ لاحق نہ ہو۔ عزیزانِ من! طائف پہرہ دینے والے کو کہتے ہیں لیکن ہمارے ہاں طواف کا قرآنی مفہوم اوجھل ہوکر رہ گیا ہے۔ قرآن نے کعبے کے متعلق یہ کہا تھا کہ اس سے مقصود ہی یہ ہے کہ اس سے **قِیَامًا لِّلنَّاسِ** (5:97)۔ نوعِ انسانی مقام بلند کو حاصل کر سکے' یعنی تمام نوعِ انسان اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کے قابل ہو سکے اور کوئی فرد یا قوم کسی دوسرے فرد یا قوم کی محتاج نہ رہے۔ اور جو اس نظام کو قائم کرنے والے تھے' قرآن کریم نے انہیں القائمین کہہ کر پکارا ہے۔

خداوندی نظامِ عدل واحسان کو قائم کرنے والوں کی خصوصیت اور ان کے تدریجی مراحل

عزیزانِ من! اب یہ جو اس نظام کو قائم کرنے والے ہیں' اس کی حفاظت کے لیے پہرہ دینے والے ہیں' ان کی اپنی بھی کوئی خصوصیت ہونی چاہیے کیونکہ ہر قسم کا انسان یہ کچھ نہیں کر سکتا' نہ یہ امت اس قسم کے انسانوں مجموعہ تھی۔ اس لیے بتایا کہ اس قسم کے لوگوں کی پہلی خصوصیت یہ ہے کہ وہ راکعین اور ساجدین ہونے چاہئیں۔ اگرچہ رکوع اور سجود کے بنیادی معنی تو جھک جانا ہی ہیں لیکن قرآنِ کریم نے ان دو چیزوں کو الگ الگ بیان کیا ہے۔ اور وہ جو رکوع میں سجدہ کی شکل تجویز کی ہے تو وہ پوری کی پوری نہیں ہوتی' وہ تو جھکاؤ ہوتا ہے۔ اور وہ بھی آدھا سا جھکاؤ ہوتا ہے۔ اس کا Complete Surrender' مکمل جھکاؤ تو سجدے میں جا کے ہوتا ہے۔ یہ محکومیت کا وہ دَور ہوتا ہے جس میں زندگی ابھی عبوری دَور میں ہوتی ہے' اس نظام کے قیام کا دور ابھی شروع نہیں ہوا ہوتا' جس میں قوانینِ خداوندی کی کامل اطاعت کی جائے۔ یہ عبوری دَور (Interim Period) کہلاتا ہے۔ اس عبوری دور کے اندر یہ کچھ ہوگا کہ جہاں تک حالات اجازت دیں گے' قوانینِ خداوندی کی اطاعت کی جائے گی۔ پھر آگے بڑھا جائے گا تآنکہ کامل اطاعت کیلیے حالات مساعد ہو جائیں۔ یہ جو عبوری دَور کے اندر اس قسم کی اطاعت ہے' میں سمجھتا ہوں کہ اسے قرآن نے رکوع سے تعبیر کیا ہے اور آخری دور وہ ہو جائے گا جس میں کامل اطاعت ہو جائے گی۔ یہ ہے جسے سجدہ کہا ہے۔ قرآن نے بتایا ہے کہ نبی اکرم ﷺ کی مملکت

مدنی زندگی کے اندر تھی۔ یہ ابھی حالتِ رکوع میں تھی۔ جب کعبہ آپ کی تحویل میں آیا ہے اور وہ اس نظام کا مرکز بنا ہے تو یہ سجدے کی حالت تھی' جو آگے آئے گی۔

حضرت ابراہیم علیہ السلام کے تعمیر کعبہ کے حکم کا مقصد و مدعا

عزیزانِ من! خدا کہتا ہے کہ ابراہیمؑ سے ہم نے کہا تھا کہ ہمارے لیے ایک گھر بناؤ' جو بالکل انسانی تصورات' تخیلات' قوانین' اور احکام سے پاکیزہ ہو۔ اسے خدا کی حکومت کا مرکز بناؤ۔ پھر کہا کہ یہ **قِیَامًا لِّلنَّاسِ** (5:97)۔ ہے یعنی یہ نوعِ انسانی کی منفعت کے لیے بنایا گیا ہے تاکہ نوع انسانی اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کے قابل ہو سکے' کوئی فرد یا قوم' کسی دوسرے فرد یا قوم کی محتاج نہ رہے۔ پھر کہا تھا کہ **وَمَنْ دَخَلَهٗ كَانَ اٰمِنًا** (3:96)۔ جو شخص بھی اس مرکز میں داخل ہو جائے' اسے ہر طرف سے امن و سلامتی حاصل ہو جائے گی۔ دوسرے الفاظ میں یوں کہیے کہ جو یہاں آ جائے گا' جو اس میں داخل ہو جائے گا' اسے امن مل جائے گا' اسے کوئی خطرہ نہیں ہوگا۔ میں نے اس درس میں بتایا تھا کہ سارے قرآن میں جہاں بھی کعبہ اور حج آیا ہے وہ الناس کے لیے آیا ہے۔ یہ بڑا عجیب نکتہ ہے کہ کعبہ اور حج الناس کے لیے ہے۔ قرآن کا مقصد ہی عالمگیر انسانیت کی برادری بنانا ہے۔ قرآن کریم نے تو پہلے ہی کہا ہے کہ **كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً** (2:213)۔ پوری نوعِ انسانی ایک امتِ واحدہ ہے۔ یہ ہے قرآن کا Ultimate Goal یعنی مقصدِ منتہا۔ اسی لیے ابراہیمؑ سے کہا کہ مکان بناؤ۔ اس کے بعد کہا کہ **وَاَذِّنْ فِی النَّاسِ بِالْحَجِّ** (22:27)۔ تم لوگوں میں اعلان کرو کہ وہ اپنے معاملات میں آخری دلیل و حجت [1] (فیصلہ) کے لیے یہاں آیا کریں۔ یہاں کہا کہ اب تمام عالمِ انسانی میں اعلان کر دو۔ یہاں الناس کا لفظ آیا ہے۔ کہا کہ **وَاَذِّنْ فِی النَّاسِ** (22:27)۔ نوع انسان میں اعلان کر دو۔ کیا اعلان کرو؟ جواب میں کہا کہ **بِالْحَجِّ** (22:27)۔ وہ اپنے معاملات میں آخری دلیل و حجت یعنی فیصلہ کے لیے یہاں آیا کریں۔

حج کے سلسلہ میں عالم انسانی کے لیے جائے امن کا اعلان

عزیزانِ من! اب ہمارے لیے تو حج وہ خاص تصور رہ گیا ہے جو آج مروّج ہے۔ اس لفظ کا خود مادہ...... ح ج ج...... حُجَّتُ اور دلیل ہے۔ اس لیے کہا کہ نوعِ انسانی میں اعلان کر دو کہ جو متنازع فیہ معاملات ہیں' ان کو لٹھ بازی سے' جنگ سے' شمشیر سے' جھگڑے سے

---

[1] اَلْحَجُّ. ارادہ کرنا۔ قصد کرنا، تاج العروس میں لکھا ہے کہ حَجَجْتُ فُلَانًا. میں نے اس کا ارادہ کیا۔ بعض علمائے لغت نے کہا ہے کہ اس کے معنی کسی باعظمت شے کا قصد کرنا یا بکثرت قصد کرنا ہیں۔ قرآنی دلائل و احکام کو اَلْحُجَّةُ الْبَالِغَةُ (6:150) کہا گیا ہے۔ محیط المحیط میں ہے کہ اَلْحَجُّ کے معنی روکنا بھی ہیں۔ حُجَّةٌ دلیل کے معنوں میں آتا ہے۔ المحیط میں لکھا ہے کہ دلیل کو بَیِّنَةٌ اس لیے کہتے ہیں کہ اس سے بات واضح اور صاف ہو جاتی ہے اور اَلْحُجَّةُ اس لیے ہے کہ اس سے فریق مقابل پر فتح حاصل ہو جاتی ہے۔ (وہ اس سے رک جاتا ہے)

اور لڑائی سے طے نہ کرو بلکہ اس مقام پہ آ ؤ یہاں تمام معاملات کے فیصلے دلیل وحجت کی رو سے ہونگے۔ [1] خدا کے اس گھر کا مقصد یہ تھا۔ اس لیے کہا کہ **وَاَذِّنۡ فِی النَّاسِ بِالۡحَجِّ یَاۡتُوۡکَ رِجَالًا وَّعَلٰی کُلِّ ضَامِرٍ یَّاۡتِیۡنَ مِنۡ کُلِّ فَجٍّ عَمِیۡقٍ** (22:27)۔ تم ان لوگوں میں اعلان کردو کہ وہ اپنے معاملات میں آخری دلیل وحجت (فیصلہ) کے لیے یہاں آیا کریں- دنیا کے دور دراز گوشوں سے' لمبی لمبی مسافتیں طے کرتے' یا پیادہ یا ایسی سواریوں پر جو سفر کی مشقت سے تھک کر چور ہوجائیں۔ اگر تم نے انسانوں کو یہ اطمینان دلا دیا کہ یہاں ان کے معاملے دھاندلی سے طے نہیں ہونگے' دلیل وحجت کی بنا پہ ہونگے۔تو پھر اس کے بعد آواز دے کے دیکھو کہ کس طرح لوگ جوق درجوق بھاگے ہوئے چلے آتے ہیں: پیدل' سواریوں پہ' یہاں تک کہ اگر کسی کو مریل سی بھی اونٹنی ملی تو اس پہ چلے آئیں گے۔تم یہ اعلان تو کر کے دیکھو۔آج بھی' عزیزانِ من! اگر کوئی مقام ایسا ہو جس کا اعلان یہ ہو کہ **مَنۡ دَخَلَہٗ کَانَ اٰمِنًا** (3:96)۔جو یہاں پہنچ گیا' اسے پورا امن نصیب ہوگیا' اسے کوئی ستانے والا باقی نہیں رہے گا کیونکہ یہ **قِیٰمًا لِّلنَّاسِ** (5:95) ہے۔یہ اس لیے ہے تا کہ نوع انسان اپنے پاؤں پر کھڑے ہونے کے قابل ہو سکے۔کوئی فرد یا قوم کسی دوسرے فرد یا قوم کی محتاج نہ رہے۔اس سے وہ ہر قسم کے سہاروں سے بے نیاز ہوجائے گا۔آؤ' یہاں تمام معاملات' متنازع فیہ معاملات' دلیل وحجت کی بنا پہ طے ہونگے۔انسانوں کو یقین دلا دیجئے' عزیزانِ من! اور پھر دیکھیے اس آواز پر کس طرح انسان بھاگے آئیں گے قرآن یقین دلاتا ہے کہ **مِنۡ کُلِّ فَجٍّ عَمِیۡقٍ** (22:27)۔ ہر قسم کے راستوں سے لوگ' تمہاری طرف بھاگے ہوئے آئیں گے۔سوال یہ ہے کہ وہ کاہے کے لیے تمہاری طرف آئیں گے؟

نوعِ انسانی کی بھلائی کے لیے آل ورلڈ مسلم کانفرنس کا اعلان

عزیزانِ من! سنیے الناس کو دعوت دی جارہی ہے کہ اپنے معاملات میں آخری دلیل وحجت (فیصلہ) کے لیے یہاں آؤ۔وہ آئیں گے' تو پوچھا کاہے کے لیے آئیں گے؟ پھر خود ہی کہا کہ **لِیَشۡہَدُوۡا مَنَافِعَ لَہُمۡ** (22:28)۔ وہ یہاں اس لیے آئیں گے تا کہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں کہ تم ان کی منفعت کے لیے کیا کچھ کر رہے ہو' یہ نظام نوع انسان کی منفعت کے لیے کیا کچھ کر رہا ہے۔بس تم

---

[1] پرویزؒ نے اپنی لغات القرآن جلد دوم 1960ء ص ص۔475-474 پر لکھا ہے کہ ''حج' عالم اسلامی کا وہ عالمگیر اجتماع ہے جو اس امت کے مرکزِ محسوس (کعبہ) میں اس غرض کے لیے منعقد ہوتا ہے کہ ملت کے تمام اجتماعی امور کا حل قرآنی دلائل وحجت کی رو سے تلاش کیا جائے اور اس طرح یہ امت اپنے فائدے کی باتوں کو اپنی آنکھوں کے سامنے دیکھ لے۔ **لِیَشۡہَدُوۡا مَنَافِعَ لَہُمۡ** (22:28) تا کہ یہ اپنے فائدے کی باتوں کو اپنے سامنے محسوس شکل میں دیکھ لیں۔نظام کے قیام کے لیے مرکزی اجتماعات نہایت ضروری ہوتے ہیں۔غور کیجیے قرآن نے اس زمانے میں مشاورتی نظام (42:28) اور اس کے لیے اجتماعات کا تصور دیا جب ساری دنیا پر بادشاہی نظام مسلط تھا اور دنیا اسے خدا کی رحمت سمجھتی تھی اور بادشاہ کو ''ایشور کا اوتار'' اور خدائی اختیارات (Divine Rights) کا حامل خیال کرتی تھی۔صلوٰۃ کے مقامی اجتماعات سے لے کر حج کے عالمگیر اجتماع تک ہر اجتماع کی غرض یہ ہے کہ امت کے نمائندے باہمی مشاورت سے قرآنی نظام کے استحکام اور نوع انسان کی بہبود کے سامان وذرائع پر غور کریں''۔

الناس کو دعوت دو یہ تو صرف Convener (اجتماع کو منعقد کرانے والے) ہوں گے۔ اس اجتماعِ عظیم کے انعقاد کی ذمہ داریاں لینے والے اہتمام کرنے والے انتظام کرنے والے ہونگے۔ ساری نوعِ انسانی کو دعوت دو تاکہ وہ آکے دیکھیں کہ یہ نظامِ خداوندی نوعِ انسانی کے مفاد کیلیے کیا کچھ کر رہا ہے۔ یہاں لفظ ہے: لِيَشْهَـــدُوْا (22:28) آکر اپنی آنکھوں سے مشاہدہ کرو۔ یہ تھا حج کا اجتماع' عزیزانِ من! جس کے لیے کعبے کو مرکز بنایا تھا۔ کہا کہ ساری دنیا یہاں تک یوں چلی آئے گی' ہم اہتمام کرکے بھی آئیں گے۔ یہاں تو سیر بھر گیہوں بھی نہیں اُگتی۔ کھجوروں کے موسم میں چار کھجوریں ہوجاتی ہیں' کبھی کچھ کھجوریں کھا لیتے ہیں' باقی گٹھلیاں پیس پیس کے سارا سال گزارا کرتے ہیں۔ ''تے تسی تے سدی جان ڈبے ہوئے ہیگے او۔ سدا دین ڈبے ہو ساری دنیا نوں' تے ایتھے آ کے خیر کی کھان گے؟'' ❶ عزیزانِ من! قرآن ہے۔ کوئی گوشۂ عالم اس خبیر کی نگاہوں سے پنہاں نہیں رہتا۔ اتنے بڑے اجتماعِ عظیم کے لیے جو بلاوا بھیج دیا گیا ہے' کیفیت وہاں یہ ہے کہ Means of Communication (ذرائع مواصلات) تک نہیں۔ یہ تو تھا ہی نہیں کہ چلو جی! ہیلی کاپٹر کے ذریعے سے ہی وہاں Drop (اتار) کر دیا جائے گا۔ وہ اتنے انسانوں کے لیے کھانے کا کیا کریں گے؟ آپ کو یاد ہے کہ دوسرے مقام پہ ہے کہ حضرتِ ابراہیمؑ نے جب کعبہ بنالیا تو آپ سوچیے کہ کعبہ کی تعمیر ہے' معمار یہ دونوں باپ بیٹا ہیں۔ اس کے بعد حضرت ابراہیمؑ نے وہاں کعبے میں کھڑے ہو کے جو پہلی دعا مانگی تھی' وہ انہی اسباب و ذرائع کے لیے تھی۔ یہ کعبے میں پہلی دعا تھی۔

تعمیرِ کعبہ کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام کی پہلی دُعاء

عزیزانِ من! تعمیر خانہ کعبہ کے بعد حضرت ابراہیم علیہ السلام کی پہلی دعا یہ تھی کہ یا اللہ! میں نے ان بچوں کو اپنے یہاں بسا تو دیا ہے اور تو جانتا ہے کہ یہاں تو کھانے کو کچھ بھی نہیں ہوتا۔ یہ وادی' غیر ذی زرع (بے برگ و گیاہ) ہے۔ اس لیے خدا کے لیے ان کے کھانے پینے کا کچھ انتظام کر دینا۔ تعمیر کعبہ کے بعد یہ پہلی دعائے ابراہیمی علیہ السلام ہے۔ قرآن اس دنیا میں رہنا سکھاتا ہے۔ عزیزانِ من! یہ جوگیوں ❷ سنیاسیوں ❸ اور بھکشوؤں ❹ کا مذہب نہیں اور انکا بھی کیا؟ انہیں بھی تو کھانے کو کچھ چاہیے ہی ہوتا ہے۔ یہ الگ چیز ہے کہ یہ کمائیں اور کھائیں لیکن جب تک اس زمین پہ قدم ٹکے گا تو کھانے کا مسئلہ تو آپ کا پیدا ہوگا۔ تو میں نے کہا ہے کہ اس کی اہمیت دیکھ لی کہ کعبے کی تعمیر کے بعد پہلی دعا ہی یہ ہے۔ ہم دیکھ رہے ہیں کہ روٹی کے مسئلہ کو آج دنیا میں کتنی اہمیت حاصل ہو رہی ہے۔ فرق یہ ہے کہ یہاں انسان

---

❶ آپ تو بلائے جا رہے ہیں۔ دعوت عالم کل کو دیئے جا رہے ہیں' وہ یہاں آکر بھلا کھائیں گے کیا؟

❷ جوگی۔ عرفِ عام میں وہ مرد جس نے دنیا ترک کرکے فقیری لے لی ہو۔ ہندو فقیر۔

❸ سنیاسی۔ عام زبان میں ہندو فقیر جس نے دنیا کو چھوڑ دیا ہو۔ تارک الدنیا۔

❹ بھکشو۔ بدھ مت کا درویش۔

نے روٹی کو آخری مقصود قرار دیدیا۔ اب ساری دنیا کا مطالبہ بھی روٹی کپڑا مکان رہ گیا اور جوان کا اطمینان کراتے ہیں وہ بھی یہ کہتے ہیں کہ ہم تمہیں یہ دیدیں گے' یعنی اس سے آگے اب انسانیت کا کوئی نہ مقصد رہا' نہ کوئی مدعا رہا' نہ آرزو رہی' نہ خواہش رہی' نہ کوئی ان کا اور تقاضا پورا کرنے کی بات ہوئی۔ اگر قصہ یہاں تک لے لیا جائے تو بس انسانیت کا مقصد حل ہوگیا۔ یہ خالص حیوانی سطح کی زندگی ہے۔ وہ جو میں نے اپنے کنونشن ❶ کے خطاب میں کہا تھا کہ سوچیے کہ اگر یہی مقصد ہو تو کمہار اور گدھا دونوں ایک لیول (سطح) پہ آگئے یعنی اس گدھے کے لیے بھی تو گھاس کھانا اور سردی سے بچنا ہے۔ ''تے اوہدے تے جُل جیہڑی پوندے ہیگے نیں۔ کپڑا تے' کوٹھا' جیہدے اچ اونوں بندھ دے نیں''۔ ❷ یعنی اس کے لیے بھی روٹی کپڑا مکان' تو اس کمہار کے لیے بھی روٹی کپڑا مکان۔ تو یوں تو یہ دونوں برابر و یکساں ہوگئے۔ اس لیے تو قرآن کہتا ہے کہ **اُولٰٓئِکَ کَالۡاَنۡعَامِ** (7:179)۔ یہ لوگ انسان نہیں بالکل حیوان ہوتے ہیں۔ یعنی کمہار گدھے جیسے۔

حیوان سے بھی بدتر زندگی

عزیزانِ من! یہ حیوان سے بھی بدتر زندگی ہے۔ آگے قرآن کہتا ہے کہ **بَلۡ ھُمۡ اَضَلُّ** (7:179)۔ اس سے بھی بدتر' اس سے بھی زیادہ راہ گم کردہ۔ اس لیے کہ حیوان کم از کم اپنے جبلی تقاضوں کے مطابق تو چلتے ہیں اور اس قسم کے انسان ان حدود سے بھی بے خبر رہتے ہیں۔ اس مثال میں بدتر اس لیے کہ سارا دن تو دونوں گدھا اور کمہار یکساں طور پر وہ سب کچھ کرتے رہیں گے' جب شام کو گدھے کو باندھ دیا تو اسے اس کی فکر نہیں ہے کہ میرا گھاس کہاں سے آئے گا۔ اب اس کو' جو کمبخت ''اضل'' ہے' گدھے کی گھاس کی بھی فکر ہے' بچوں کی روٹی کی بھی فکر ہے۔ یعنی حیوانی سطح سے بھی گیا گزرا۔ میں نے کہا یہ ہے کہ روٹی مقدم شے ضرور ہے' مگر یہ مقصود بالذات نہیں ہے' منتہا نہیں ہے' یہ تو انسانی زندگی کا انسانیت کے بلند تقاضوں کو حاصل کرنے کا ایک ذریعہ (Mean) اسی لیے جہاں یہ چیز دعائے ابراہیمؑ آئی ہے کہ یا اللہ! یہاں ان کی روٹی کا انتظام کر' تو وہاں یہ بھی کہا گیا ہے کہ **لَعَلَّھُمۡ یَشۡکُرُوۡنَ** (14:37)۔ تاکہ مقصدِ بلند' جس کے لیے یہ کعبہ بنایا ہے' کے حصول میں جو محنت کریں تو انکی محنتیں نتیجہ خیز ہوں' اس کے لیے ہمیں روٹی کی ضرورت ہوگی۔ اب ہمارے ہاں **لَعَلَّھُمۡ یَشۡکُرُوۡنَ** کا ترجمہ بتادیا تاکہ یہ شکر کریں۔ تو روٹی بھیجیا کر۔ اے کھا کے کہن یا اللہ! تیرا شکر اے۔ ❸ چل بھئی! قصہ ختم ہوگیا۔ خس کم جہاں پاک

---

❶ اس خطاب کا عنوان تھا: روٹی کا مسئلہ۔ ادارہ طلوع اسلام' لاہور کی طرف سے یہ پمفلٹ کی صورت میں طبع ہو کر منظرِ عام پر آچکا ہے۔

❷ اس (گدھے) کے اوپر بھی ایک کپڑا سا ڈال دیتے ہیں۔ پھر اس کے لیے ایک مکان ہے جس میں اسے باندھ دیتے ہیں۔

❸ تو (اے اللہ!) روٹی بھیجتا رہ' تاکہ یہ کھا (پی) کر کہیں کہ اے اللہ! تیرا شکر ہے۔

روٹی کا حصول بھی مقصود بالذات نہیں

عزیزانِ من! یہ قرآن ہے گو کہ پہلی دعا روٹی کی سکھائی گئی ہے کہ یہ بڑی ضروری چیز ہے مگر ساتھ ہی یہ کہہ دیا کہ یہ مقصود بالذات نہیں ہے۔اس دعا کے اگلے لفظ ہیں: **لَعَلَّهُمْ** تا کہ اس''تا کہ'' میں یہ بتایا ہے کہ وہ مقصد کیا ہے۔ یہاں میں پھر وہی بات کہتا ہوں جو بار بار میں کہا کرتا ہوں کہ عزیزانِ من! اللہ توفیق دے تو اتنی سی عربی تو ضرور سیکھ لیجیے' یہ کچھ مشکل نہیں ہے' یہ تو انہوں نے خواہ مخواہ اسے مشکل بنا رکھا ہے کہ صاحب! سات سال تک اٹھارہ علوم کہیں حاصل کرو گے تو پھر کہیں تمہیں عربی سمجھ آئے گی۔ انہیں پھر بھی قرآن سمجھ نہیں آیا۔قرآن تو ان کے نصاب میں ہوتا ہی نہیں۔صرف سورۃ بقرۃ ہوتی ہے۔

عزیزانِ من! قرآن بڑا آسان ہے۔ اس تھوڑی سی عربی سے بھی یہ چیزیں آپ کو پتہ چل جائیں گی کہ یہ''**لَعَلَّهُمْ**'' کیوں آیا ہے۔کہا کہ روٹی کا صحیح انتظام کر دے لیکن یہ مقصود بالذات نہیں ہے یہ تو اس لیے ہے تا کہ یہ اس مقصد کو حاصل کر سکیں۔ایک لفظ صرف **لَعَلَّهُمْ** ہے جس سے مقصد کی طرف ذہن کو مبذول کر دیا۔یہاں کہا کہ **لِيَشْهَدُوْا مَنَافِعَ لَهُمْ** (22:28)۔وہ یہاں اس لیے آئیں کہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں کہ یہ نظام ان کی (یعنی نوع انسان کی) منفعت کے لیے کیا کچھ کر رہا ہے۔ ہاں! تو اگلی بات میں کہہ رہا تھا کہ پھر کیا کیا جائے؟اس کے لیے کہا کہ **وَيَذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ فِيْٓ اَيَّامٍ مَّعْلُوْمٰتٍ عَلٰى مَا رَزَقَهُمْ مِّنْۢ بَهِيْمَةِ الْاَنْعَامِ فَكُلُوْا مِنْهَا وَاَطْعِمُوا الْبَآئِسَ الْفَقِيْرَ** (22:28)۔اور ہم نے جو مویشی انہیں دے رکھے ہیں' انہیں اللہ کا نام لے کر' اس اجتماع کے مقررہ دنوں میں ذبح کریں اور ان کا گوشت خود بھی کھائیں اور (اگر وہاں کوئی) تکلیف زدہ محتاج ہو تو اسے بھی کھلائیں۔

روٹی کا مسئلہ مویشیوں کے ذریعے حل کرو

عزیزانِ من! روٹی کا مسئلہ مویشیوں کے ذریعے حل کرنے سے متعلق کہا کہ ان سے کہو کہ تم لوگ وہاں سے اپنا چلتا پھرتا ہوا رزق لے کے یہاں آیا کرو۔ چلتا پھرتا رزق کونسا ہے؟ یہی مویشی' جو فالتو تھے' لایا کرو۔قرآن میں دوسری جگہ ہے کہ ان کو لاؤ' ان کے اوپر سامان لادو' راستے میں ان سے کام لو تو یہاں آؤ' پھر یہاں آنے کے بعد انہیں ذبح کرو' پھر کھاؤ پیؤ۔ یہ جو مسئلہ تمہیں پریشان کرنے والا تھا وہ حل ہو جائے گا: کھاؤ پیؤ۔کہا کہ خود ہی نہیں کھاؤ پیؤ' یہ بیچارے جو یہاں کے رہنے والے ہیں' ان کو بھی کہاں نصیب ہوتا ہے' ان کو بھی ساتھ بلا لیا کرو یعنی حالانکہ یہ مہمان آئے تھے' یہ میزبان تھے۔یہاں مہمانوں سے کہا جاتا ہے کہ ان میزبانوں کو بھی بلا لیا کرو۔یہ بڑے غریب ہیں اس طرح **سَوَآءَ نِ الْعَاكِفُ فِيْهِ وَالْبَادِ** (22:25)۔یہ باہر کے رہنے والے اور یہاں والے یکساں ایک سطح پہ آ جائیں۔تو وہ یوں ایک سطح پہ آئے کہ یہ جانور ذبح کرو' ضیافتیں کرو' پکاؤ' کھاؤ۔یہاں تو پھر یہی کہا کہ یہ نہ ہو کہ تم پکاؤ کھاؤ'' تے اے

تہاڈے ول تکدے رہن۔ [1] ان کو بھی ساتھ بلا لیا کرو۔ یہ ہے' عزیزانِ من! مسئلہ جو آپ کے ہاں قربانی کا مسئلہ بن گیا۔ یہاں پھر وہی کہا کہ **یَذْکُرُوا اسْمَ اللّٰہِ** (22:28)۔ انہیں اللہ کا نام لے کر ذبح کرو۔ قرآن تو ہر بات میں بس ذرا سا رُخ یوں Fix (مقرر) کر دیتا ہے۔ بات کھانے پینے کی ہو رہی ہے۔ اس میں بھی یہ چیز ہے تا کہ قانونِ خداوندی تمہارے سامنے رہے۔ تو کاہے کے لیے یہ سب کچھ ہو رہا ہے؟ گوشت تو تم روز ہی کھاتے ہو' جانور کو ذبح بھی کرتے ہو۔ یہاں کہا کہ اس ذبح کرنے میں بھی اس مقصد کو اپنے سامنے رکھو۔ یہ ٹھیک ہے کہ اس کی ایک Formal (رسمی) شکل یہ بھی ہے کہ ذبح کرتے وقت اللہ کا نام لینا نہایت ضروری ہے لیکن یہ چیز صرف رسماً نہیں ہے اور اب تو یہ بھی معلوم نہیں کہ ہم جو صبح اٹھ کر گوشت لے آتے ہیں اس پہ وہ رسم بھی پوری کی ہوئی ہوتی ہے یا نہیں' اصل یہ چیز ہے۔ جب وہ مقام آئے گا تو میں بتاؤں گا کہ اس بارے میں قرآن کیا کہتا ہے۔

جانور کو ذبح کرتے وقت اللہ اکبر کہنے کا مقصد

عزیزانِ من! کہا یہ ہے کہ جانور کو لٹاؤ' ہاتھ میں چھری لو۔ وہ تمہارے قبضے میں آ گیا۔ قرآن کہتا ہے تم نے دیکھا کہ وہ کس طرح تمہارے قبضے میں آ گیا۔ تم نے مسخر کر لیا **سَخَّرَهَا لَکُمْ** (22:37)۔ تم اس کے اوپر چڑھ بیٹھے۔ وہ تمہارے زیر ہو گیا۔ ہاتھ میں چھری لے لی۔ اس کو ذبح بھی تم کر رہے ہو یعنی وہ بے بس اور محتاج اور تم غالب اور مسلط۔ ایسے وقت میں ہو سکتا ہے کہ ذہن کے اندر یہ آ جائے کہ ہم بڑے ہیں۔ کہا کہ اس وقت کہو: نہیں' ہم بڑے نہیں۔ اللہ اکبر! بڑا وہ ہے۔ عزیزانِ من! اصل بات یہ نہیں کہ اس طرح سے جانور حلال ہو جاتا ہے۔ یہ نہ کہو تو حرام ہو جاتا ہے۔ ان دو لفظوں میں کیا رکھا تھا۔ وہ مقام جہاں ہر قسم کا غلبہ وتکبر ہے' وہ مجسم ہے جو اوپر چڑھا ہوا ہے۔ اس کو نیچے گرایا گیا ہے' اس کے حلق پہ چھری پھیرنا ہے۔ اس سے بڑی چیز اور کیا ہو سکتی ہے۔ ایسے نازک مقام پہ یہ یاد دلانا: ''او تمہارے ذہن میں کہیں یہ بات نہ آ جائے کہ ہم بڑے ہیں' ہم سے بڑا کوئی نہیں ہے' قطعاً یہ بات نہیں۔'' **لِتُکَبِّرُوا اللّٰہَ عَلٰی مَا هَدٰکُمْ** (22:37)۔ تا کہ تم (اپنی طبعی ضروریات کی طرف سے بے فکر ہو کر) خدا کے اس ضابطۂ قوانین کو' جس سے اس نے تمہاری راہ نمائی کی ہے' دنیا کے تمام قوانین وضوابط پر غالب کر سکو۔ یہ ہیں چھوٹے چھوٹے نکات جو قرآن یوں حل کر کے رکھ دیتا ہے اور عزیزانِ من! اب تو یہ مسائل بن کے رہ گئے ہیں۔

قرآنِ حکیم میں جانوروں کے لیے قربانی کا لفظ نہیں آیا

عزیزانِ من! اب تو آپ کے ہاں یوں ہے کہ ہر شخص دو دو جانور ذبح کر کے وہاں پہنچتا چلا جائے۔ اس کا نام قربانی رکھ لیا۔ میں نے کہا ہے کہ یہ جو ذبح کرنے والے جانور ہیں عجیب بات ہے کہ قرآن میں ان کے لیے کہیں قربانی کا لفظ ہی نہیں آیا۔ اس عالمگیر اجتماع

---

[1] کہ وہ تمہیں صرف للچائی نظروں سے دیکھتے رہ جائیں۔

میں کھانے پینے کے لیے یہ کہا تھا اور مقصد مسائل حل کرنے کے لیے مشاورت تھا۔ یہ تھا وہ مقصد جس کے لیے قرآن نے یہ کچھ بتایا تھا۔ کہا کہ **ثُمَّ لْيَقْضُوْا تَفَثَهُمْ وَلْيُوْفُوْا نُذُوْرَهُمْ وَلْيَطَّوَّفُوْا بِالْبَيْتِ الْعَتِيْقِ** (22:29)۔ (کھائیں، پئیں بھی اور باہمی مشاورت سے وہ تدبیریں بھی سوچیں جن سے) ان کی ملی زندگی کی تمام کثافتیں دور ہو جائیں اور وہ ان ذمہ داریوں سے عہدہ برا ہو سکیں (جنہیں انہوں نے نوع انسان کی فلاح و بہبود کے لیے اپنے اوپر لے رکھا ہے) اور اس طرح پوری کی پوری امت اس مرکز کی نگہبان بن جائے جو دنیا میں انسانوں کی حریت و آزادی اور قوت و اقتدارِ خداوندی کا نشان (Symbol) ہے اور جسے اس باب میں شرفِ اولیت اور سبقت حاصل ہے۔

عزیزانِ من! یہ سارا کچھ بتایا۔ یہاں جمع ہو جاؤ، کھانے پینے کا یہ سامان کرو، مقصد سامنے رکھو۔ آگے عام ترجمہ ہے جس میں ہمیں بتایا جاتا ہے کہ پھر تم اپنی میل کچیل دُور کرو، اپنی نذروں کو پورا کرو۔ حج کے تیسرے دن بعد پھر حاجی صاحب ٹنڈ کرا دیں، یعنی حجامت بنوا سکتے ہو، میل نکال سکتے ہو، اب یہ سارا کچھ کر سکتے ہو۔ مگر یہ سب کچھ وہ تیسرے دن ہوتا ہے۔ اب یہ ترجمہ ہو گیا ہے کہ پھر تم تیسرے دن کے بعد اپنی میل کچیل دور کرو۔ یہاں لفظ آیا ہے: **تَفَثَ** ۔ جتنے بھی الجھاؤ پیدا ہو گئے ہوں، وہ **تَفَثَ** کہلاتے ہیں۔ ''گنجلاں پے گیاں نیں ہن''۔ [1] اور یہیں سے، جب بالوں میں وہ ''گنجل'' [2] پیدا ہوتی ہے، اسے بھی **تَفَثَ** کہتے ہیں۔ اس کے بنیادی معنی ''الجھاؤ پیدا ہو جانا''۔ ہوتے ہیں۔ گنجلاں پیدا ہو جانا۔ پھر اس سے اگلی چیز ان بالوں میں چیکٹ ہو جانا ہوتی ہے۔ کہا کہ یہ سارا کچھ کرو، کھانے پینے کا سامان کرو، اور اس سے مقصد یہ ہے کہ یہ جتنی گنجلیں [2] پیدا ہو گئی ہوئی ہوں، انہیں پھر وہاں بیٹھ کر، باہمی مشاورت سے، دُور کیا کرو۔

عاکف کا قرآنی مفہوم

قرآن نے حج کے لیے ایک لفظ **عَاكِفِيْنَ** کہا ہے۔ اور دوسرا لفظ **طَائِفِيْنَ** کہا ہے۔ آپ کو پتہ ہے کہ عاکف کس کو کہتے ہیں؟ یہ الجھے ہوئے بالوں کو کنگھی سے سنوارنے والا ہوتا ہے، اسے عاکف کہتے ہیں اور یہاں نوعِ انسانی کے جو اُلجھے ہوئے معاملات ہیں، ایسے الجھے ہوئے کہ ان مفاد پرستوں کی کوششوں نے ان میں چیکٹ پیدا کر دی، کسی طرح سے، سلجھ نہیں رہے، بابا کھانے پینے کا بھی سامان ہو گیا، یہ سب کچھ ہوا۔ تو اب یہاں یہ کرنے کا کام ہے کہ یہ جتنی بھی آلائشیں ہیں، جتنے الجھاؤ ہیں، جتنے گنجلاں پن ہیں، ان سب کو تم صاف کرو، گیسوئے کائناتِ انسانیت کو سنوارو۔ یہاں مشاطگی بھی کرو۔ سنوارو ہی نہیں، بلکہ ''گیسوئے تابدار کو اور بھی تابدار کرو'' [3] یہ کام کرو **وَلْيُوْفُوْا نُذُوْرَهُمْ** (22:29)۔ ان ذمہ داریوں کو پورا کرو جو نوعِ انسان کی فلاح و بہبود کے سلسلہ میں اپنے اوپر لے رکھی ہیں اب ''نذر'' تو ہمارے ہاں یہ ہوتا ہے کہ وہ منت مانی جاتی ہے۔ نذرِ اللہ، نیازِ حسین۔ قرآن نے دو چیزیں بتائی ہیں۔ ایک تو وہ چیزیں ہوتی

---

1. اب الجھاؤ پیدا ہو گئے ہیں۔
2. گنجلک، گانٹھ، گرہ، الجھن
3. گیسوئے تاب دار کو اور بھی تاب دار کر — ہوش و خرد شکار کر، قلب و نظر شکار کر — (اقبالؒ: بال جبریل 1996ء ص۔33)

ہیں کہ جو خود اس نے (اللہ تعالیٰ) واجب ٹھہرائی ہیں۔ انہیں کرنا ضروری ہوتا ہے اور اس سے بھی آگے بڑھ کر وہ چیزیں بھی ہوتی ہیں جو وہ فرد خود اپنے ذمے لے لیتا ہے۔ یہ جو از خود اپنے ذمے لے لینے والی بات یا ڈیوٹی یا فرض یا ذمہ داری ہوتی ہے' جو وہ رضا کارانہ طور پر اپنے اوپر لے لیتا ہے' وہ نذر کہلاتی ہے۔ یہ ہم نے تو کچھ بیان کر دیا' یہ کچھ کر بھی دیا لیکن اپنے طور پہ' جزئیات کے طور پر' چھوٹے چھوٹے معاملات میں' جو تم نے ان لوگوں سے کچھ معاہدے کیے ہوئے ہیں' کچھ اپنے اوپر ذمہ داریاں لے رکھی ہوئی ہیں کہ یہ بھی ہوگا' وہ بھی ہوگا' ان کو یہاں اب پورا کرو تا کہ جب یہاں سے یہ نوعِ انسان واپس جائے تو کوئی الجھی ہوئی شئے' کوئی متنازع فیہ شئے' کوئی ایسی بات' حل طلب نہ رہ جائے جس کو لے کے یہ آئے تھے اور وہ حل نہیں ہوئی۔ جو تم نے ان سے وعدے کئے تھے' وہ پورے نہیں ہوئے' جو ذمہ داریاں سنبھالی تھیں وہ یہاں پوری نہیں ہوئیں۔ **وَلۡيَطَّوَّفُوۡا بِالۡبَيۡتِ الۡعَتِيۡقِ** (22:29)۔ اور (اس طرح پوری کی پوری امت اس مرکز کی نگہبان بن جائے جو) دنیا میں انسانوں کی حریت و آزادی اور قوت و اقتدارِ خداوندی کا نشان (Symbol) ہے' اور جسے اس باب میں شرفِ اولیت اور سبقت حاصل ہے۔ [1] یہاں کعبے کو بیت الۡعَتِيۡقِ بھی کہا ہے۔ عتیق کے معنی ''آزاد'' کے ہوتے ہیں۔ اور یہ معنی ہیں جو کہ متقدم (پہلا) لیے جاتے ہیں۔ بعض اس کو پرانے کے معنوں میں بھی لیتے ہیں اور متقدم جو لیا جاتا ہے وہ اس لیے لیتے تھے کہ سب سے پہلے اگر کوئی انسان ہے تو ظاہر ہے کہ اس پر تو کسی دوسرے انسان کی حکومت نہیں ہوگی۔ یعنی اس کے معنی ''آزاد'' ہوتا ہے۔ اب یہ جو نظامِ خداوندی ہے، یہ جو مملکت ہے' اس کا جو مرکز ہے' اس کا جو Symbol (نشان) ہے' خود اس کو بیت الۡعَتِيۡقِ کہا ہے۔ تو وہ جو اس نظام کے لیے تمام دنیا کے انسانوں کے رجحانات اور خوراک سے آزاد ہوگا' وہ یہ کام کر سکے گا۔ اسی لیے اس کو بیت العتیق کہا ہے۔

عزیزانِ من! سورۃ الحج کی آیت 29 تک ہم آ گئے۔ یہی بیان جاری ہے اور آگے بھی اسی ردھم Rhythm۔ آہنگ اور اسی آہنگ کے ساتھ ساتھ چلے گا۔ اسی لیے اگلی آیت کا پہلا ہی لفظ **ذٰلِكَ** ہے۔ کیا بات ہے عربی زبان کی! اس کے معنی ہیں کہ یہ جو ہم نے پہلے کہا ہے وہی پھر اور آگے چلے گا۔ اس کے بعد کہا کہ: **وَمَنۡ يُّعَظِّمۡ حُرُمٰتِ اللّٰهِ** (22:30)۔ اسے ہم آئندہ درس میں لیں گے۔ آج ہم سورۃ الحج کی آیت 29 تک آ گئے ہیں۔

رَبَّنَا تَقَبَّلۡ مِنَّا ؕ اِنَّكَ اَنۡتَ السَّمِيۡعُ الۡعَلِيۡمُ ؕ

❀❀ ...... ❀❀❀ ...... ❀❀

---

[1] جس طرح صلوٰۃ میں رکوع و سجود اس اقرار کا محسوس مظاہرہ ہے کہ ہم قوانین خداوندی کی کامل اطاعت کرتے ہیں اور اس کے سوا کسی اور کی محکومیت اختیار نہیں کرتے' اسی طرح کعبہ کے گرد طواف اس حقیقت کے اعتراف کا محسوس مظاہرہ ہے کہ ہم اس نظامِ خداوندی کی' جس کا یہ مرکز ہے' سرفروشانہ حفاظت کریں گے اور امنِ عالم کے ضامن اور نگہبان رہیں گے۔ (پرویزؒ: مفہوم القرآن' ادارہ طلوع اسلام' لاہور' 1961' ص۔ 758)

چوتھا باب: **سورۃ الحج** (آیات 30 تا 39)

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِيْمِ

فَسَجَدَ الْمَلٰٓئِكَةُ كُلُّهُمْ اَجْمَعُوْنَ ۙ﴿۳۰﴾ اِلَّآ اِبْلِيْسَ ؕ اَبٰٓى اَنْ يَّكُوْنَ مَعَ
السّٰجِدِيْنَ ﴿۳۱﴾ قَالَ يٰٓاِبْلِيْسُ مَا لَكَ اَلَّا تَكُوْنَ مَعَ السّٰجِدِيْنَ ﴿۳۲﴾
قَالَ لَمْ اَكُنْ لِّاَسْجُدَ لِبَشَرٍ خَلَقْتَهٗ مِنْ صَلْصَالٍ مِّنْ حَمَاٍ
مَّسْنُوْنٍ ﴿۳۳﴾ قَالَ فَاخْرُجْ مِنْهَا فَاِنَّكَ رَجِيْمٌ ۙ﴿۳۴﴾ وَّاِنَّ عَلَيْكَ اللَّعْنَةَ
اِلٰى يَوْمِ الدِّيْنِ ﴿۳۵﴾ قَالَ رَبِّ فَاَنْظِرْنِيْٓ اِلٰى يَوْمِ يُبْعَثُوْنَ ﴿۳۶﴾ قَالَ
فَاِنَّكَ مِنَ الْمُنْظَرِيْنَ ۙ﴿۳۷﴾ اِلٰى يَوْمِ الْوَقْتِ الْمَعْلُوْمِ ﴿۳۸﴾ قَالَ رَبِّ بِمَآ
اَغْوَيْتَنِيْ لَاُزَيِّنَنَّ لَهُمْ فِي الْاَرْضِ وَلَاُغْوِيَنَّهُمْ اَجْمَعِيْنَ ۙ﴿۳۹﴾

عزیزانِ من! آج جنوری 1977ء کی 2 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ الحج کی آیت 30 سے ہو رہا ہے: (22:30) پچھلے ہفتے میری طبیعت پھر خراب ہوگئی۔ آج بھی ابھی تک اس کا اثر باقی ہے، ہمت کر کے آ تو بیٹھا ہوں اور جب تک ہمت ساتھ دے گی کچھ پیشِ خدمت کر سکوں گا۔ آواز پہ بھی اثر ہے۔ بہر حال چلیے! آپ کو اپنے کانوں سے کچھ تعاون کا کام لینا ہوگا۔

حج ایک عالمگیر کانفرنس کا نام ہے

عزیزانِ من! گزشتہ آیات میں حج کے اجتماعات کے اغراض و مقاصد، اس سلسلے میں مختلف مناسک وشعائر کا ذکر آ رہا تھا اور یہی

سلسلہ پیشِ نظر آیات میں بھی آگے چل رہا ہے۔ میں نے عرض کیا تھا کہ اسلامی نظام یا اسلامی مملکت کے بعد' باہمی مشاورت کے لیے جو عالمگیر کانفرنس منعقد کی جاتی تھی' اس کا نام حج تھا تاکہ وہاں دلیل وحجت کی بنا پر متنازع فیہ معاملات طے کیے جائیں۔ اس کے ساتھ ہی دیگر اقوامِ عالم کو بھی دعوت بھیجی جاتی تھی کہ وہ آئیں اور آکر اپنی آنکھوں سے دیکھیں کہ نوعِ انسانی کی منفعت کے لیے یہ نظام کیا کچھ کر رہا ہے۔

قرآن میں قربانی کا لفظ قربانی کے جانوروں کے لیے آیا ہی نہیں

عزیزانِ من! اب سوال یہ تھا کہ اتنا بڑا اجتماع ہو' دلیل وحجت کی بنا پر متنازع فیہ امور طے کرنے کے لیے ایک اتنی بڑی عالمگیر کانفرنس ہو تو ان کے کھانے پینے کا کیا انتظام ہو۔ اہلِ مکہ تو ان کی میزبانی نہیں کرسکتے تھے کیونکہ وہاں تو کچھ پیدا ہی نہیں ہوتا تھا۔ کھانے کے لیے اُن ہزار ہا یا لاکھوں کی تعداد میں باہر سے آنے والے مہمانوں کے لیے کیا انتظام کیا جائے تو ساتھ یہ کہہ دیا کہ یہ آنے والے اپنے کھانے پینے کا سامان ساتھ لے کر آئیں۔ یہ تھا جنہیں یہ قربانی کے جانور کہا جاتا ہے۔ اس سلسلے میں تو قربانی کا لفظ ہی قرآن میں نہیں آیا۔ ہاں یہ ضرور تھا کہ جانور ساتھ لائیں' راستے میں ان سے فائدہ اٹھائیں' یہاں آکر ان کو ذبح کریں' خود بھی کھائیں اور اہلِ مکہ کے جو محتاج ہوں' غریب ہوں' انہیں بھی ساتھ شریک کریں۔ یہ تھا مقصد۔ اسی سلسلے میں چند وہ رسومات بھی آجاتی ہیں' جنہیں مناسک کہا جاتا ہے اور یہی وہ مقام ہے جو گویا غور طلب بھی ہے اور وہ پھسلنی گھاٹی بھی ہے جہاں سے اقوام اکثر لغزشیں کھا جاتی ہیں۔ دین تو دنیا کی ہر قوم کی طرف آیا۔ قرآن کہتا ہے کہ ہم نے ہر زمانے میں' ہر قوم میں' اپنے انبیا کو بھیجا اور یہ بھی اس نے بتایا کہ ہر نبی وہی ایک دین پیش کرتا تھا۔ دین کی اصل وہی ہوتی تھی' مقامی حالات کے ماتحت ان کی شرائع میں فرق ہو جاتا تھا۔

دین قدم قدم پر نتائج کو سامنے رکھتا ہے

دین کی اصل وغایت شروع سے آخر تک ہمیشہ ایک ہی رہی ہے اور وہ یہی غایت تھی کہ کسی انسان کو حق حاصل نہیں کہ کسی دوسرے انسان پر اپنی حکومت چلائے۔ محکومیت صرف قوانینِ خداوندی کی ہوسکتی ہے اور کسی کی نہیں لیکن ان انبیا کے چلے جانے کے بعد انکا دین مذہب کی شکل اختیار کر لیتا ہے۔ دین کی غرض وغایت اور روح تو ختم ہو جاتی تھی اور وہ بے جان رسومات باقی رہ جاتی ہیں۔ دین میں ہر موقعہ پر یہ دیکھا جاتا ہے کہ جو کچھ ہم کر رہے ہیں' اس کا وہ نتیجہ مرتب ہو رہا ہے یا نہیں جس کے لیے ان چیزوں کو تجویز کیا گیا تھا۔ ہر مقام پر سوچنا ہوتا ہے' جائزہ لینا ہوتا ہے' پرکھنا ہوتا ہے' اس کا امتحان کرنا ہوتا ہے' نتائج سے اپنے اعمال کے صحیح اور غلط ہونے کا اندازہ لگانا پڑتا ہے۔ یہ سوچ' فکر' تدبر' غور' تو ذہنی حرکت ہے اور ویسے بھی زندگی تو حرکت کا نام ہے۔ اس حرکت کے بغیر زندگی جوہڑ بن کر رہ جاتی ہے۔

مذہب میں جمود ہوتا ہے دین سراپا حرکت کا نام ہے

عزیزانِ من! دین یکسر حرکت چاہتا ہے' ارتقا چاہتا ہے' آگے بڑھنا سکھاتا ہے۔ کسی مقام پر ذہنی طور پر کھڑے ہو جانا ہو تو یہ فکری جمود ہوتا ہے' آگے بڑھنے والی قوموں کے مقابلے میں ایسی قومیں پیچھے رہ جاتی ہیں۔ مذہب میں یہ حرکت ختم ہو جاتی ہے' ذہنی جمود طاری ہوتا ہے تو سوچنا چھوڑ دیا جاتا ہے۔ یہ کچھ کیوں کیا جاتا ہے؟ اس لیے کہ ایسا ہوتا چلا آ رہا ہے۔ کرنے والے کے پاس اس کی کوئی دلیل نہیں ہوتی۔ وہ کیوں کا جواب نہیں دیتا۔ کیوں کا جواب یہی ہوتا ہے کہ یہ یا تو شریعت کا حکم ہے یا یہ طریقہ اسلاف سے ذہنی جمود کے ساتھ ہی ہمارے ہاں مروج چلا آ رہا ہے۔ یہ جو دین کے مختلف عناصر ہوتے ہیں' وہ مذہب کی رسومات بن جاتے ہیں۔ ہر بات کو رسمی طور پر ادا کیا جاتا ہے اور چونکہ انسان کچھ نہ کچھ تو چاہتا ہے کہ تسکین ہو کہ میں کیوں کرتا ہوں' اس کیوں کے لیے ایک لفظ دیدیا جاتا ہے کہ اس سے ''ثواب'' ہوتا ہے۔ اس سے اطمینان ہو جاتا ہے۔ یہ یکسر جمود ہوتا ہے: ذہنی جمود' فکری جمود' زندگی کی ارتقائی منازل میں جمود اور سکوت۔ اس کا نام مذہب ہوتا ہے۔ مختلف قوموں کے اندر بھی جب دین ہوتا تھا تو اس قسم کے اجتماعات ہوتے تھے۔ جب وہ مذہب بن گیا' وہی چیز یاترا[1] ہو گئی۔ ہر مذہب میں اس قسم کا اجتماع ہوتا ہے خواہ وہ گردوارہ[2] میں ہو' خواہ وہ کسی دوسری جگہ ہو اور خواہ وہ یروشلم میں ہو۔ Pilgrimage کا لفظ' یاترا کا لفظ' یہ سارے دین کی اس اجتماعی مشاورتی کانفرنسوں کی جگہ' رسمی یاترا کی چیزیں بن جاتی ہیں۔ اس کے لیے یہ الفاظ استعمال میں آ جاتے ہیں: وہاں اکٹھا ہونا' اکٹھے ہو کے چند رسموں کا ادا کر لینا' یہی مقصود رہ جاتا ہے۔ ان کی ادائیگی سے اپنا اطمینان حاصل کر لیا جاتا ہے کہ اس سے ثواب ہو جاتا ہے۔ دین یہ نہیں کہتا۔

جسمانی حرکات وسکنات کا انسانی نفسیات سے گہرا تعلق ہے

عزیزانِ من! ایک چیز نہایت ضروری ہے۔ کہیں کوئی اجتماع ہو' کسی معاملے پہ غور وخوض ہو' اس میں بعض چیزیں محسوسات کے طور پر تو کرنی ہوتی ہیں۔ ان کی ادائیگی میں انسان کا اطمینان ہی نہیں کچھ اندر کا تقاضا بھی ہوتا ہے۔ جیسا کہ میں کئی دفعہ اس کی وضاحت کر چکا ہوں کہ ایک مقرر کو جو کچھ کہنا ہوتا ہے' وہ تو زبان سے' الفاظ کی رو سے' کہتا ہے لیکن آپ دیکھتے ہیں کہ اس کے جسم کی حرکات وسکنات اس کا کیسے ساتھ دیتی ہیں۔ اگر اسے روک دیا جائے کہ کسی قسم کی کوئی جنبش' کوئی حرکت' سرزد نہ ہونے پائے تو وہ پانچ منٹ تک تقریر نہیں کر سکتا اور کرتا ہے تو غیر مؤثر ہو کے رہ جاتی ہے۔ جسم کا جو بھی تقاضا ہو یا دل کا کوئی بھی تقاضا ہو' اگر کسی طرح سے بھی اس کی بظاہر نمود ہوتی ہے تو وہ جسم کی کسی حرکت کے ساتھ ہوتی ہے۔ یہ ایک بڑی گہری نفسیاتی کیفیت ہے۔ یہ نفسیات میں یا فلسفے میں ایک خاص Subject یعنی

---

[1] مقدس مقامات کی زیارت' مذہبی سفر' جاترا' مقدس مقامات کی زیارت کے لیے سفر۔

[2] سکھوں کا دھرم شالہ

مضمون ہے۔ دل کا تقاضا اور جسم کی حرکت متوازی چلتی ہے۔ دل کا تقاضا انسان کی آرزو یا خواہش' اور اس کے اظہار کے لیے محسوس حرکات' میں متوازیت ہوتی ہے۔ کسی کی تعظیم کے لیے آپ کے دل سے جذبہ ابھرتا ہے تو بے اختیار ہاتھ ماتھے کی طرف اٹھ جاتا ہے۔ غصے میں آپ کے چہرے کے اعصاب کچھ اور ہوتے ہیں' خوشی کا اظہار ہو تو کچھ اور انداز ہوتا ہے۔ خطرے کی آواز کان میں آئے تو تڑپ کے اٹھ جاتے ہیں۔ یہ عجیب چیز ہے کہ انسان کی دلی آرزو یا خواہش یا ارادہ یا تقاضا کی نمود' جسم کی کسی نہ کسی حرکت سے ہوتی ہے۔ یہ جو انسان کا اندرونی تقاضا ہے' محسوسات کے اندر اس کی نمود حرکت کے ساتھ ہوتی ہے۔ دین میں اس کی بھی رعایت رکھی جاتی ہے۔ اس مقصد کے لیے طواف تھا' راتوں کو پہرہ دینے والوں کو الطائف [1] کہتے ہیں اور اس امت کا فریضہ یہ بتایا تھا کہ **شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ** (2:143)۔ یہ نوعِ انسانی کی نگہبانی اور نگرانی کرے گی۔ نگرانی اور نگہبانی بڑے پیمانے پہ کرنے کی ایک چیز ہے کیونکہ ان کے نظام کا ایک مقصد انسانیت کی حفاظت' اس کی نگہبانی' اس کی نگرانی ہوگا تو اس مقصد کے لیے وہی ایک لفظ ''گھومنا'' ہے جس کے لیے طائف [1] کا لفظ ہے۔ یہ کعبے میں محسوسات کے طور پہ ہے جسے آپ مناسک کہتے ہیں۔ آپ آج اسے رسم کہتے ہیں۔ یہ اس انداز کی چیز ہوتی ہے۔ نماز میں بھی' آپ کے ہاں قیام ہے' رکوع ہے' سجود ہے۔ یہ مقصود بالذات نہیں ہیں۔ یہ ایک مقصد کے حاصل کرنے کا ذریعہ ہیں۔ وہ جو دل کے اندر خدا کے قوانین کے سامنے جھکنے کی ایک آرزو اٹھتی ہے تو جھکنے کے ساتھ ہی سر جھک جاتا ہے' جسم جھک جاتا ہے۔ ہمارے ہاں آج بھی سرِ تسلیم خم کرنا الفاظ ہیں۔ سر خم کیا جاتا ہے۔ تسلیم کرتے وقت بھی آپ سر خم کرتے ہیں۔ تو یہ جتنی محسوس حرکات ہوتی ہیں وہ انسان کی غیر محسوس آرزوؤں کا' خواہشات اور تقاضاؤں کی نمود کا ذریعہ بنتی ہیں لیکن یہاں بھی ہم پھر انہی رسوم پہ آ گئے۔ آج وہ آرزوئیں اور وہ خواہشات تو نہ رہیں' اور ان کے اظہار کے لیے جو محسوس علامات تھیں' وہ باقی رہ گئیں۔ اگر ایسا ہو جائے تو یہ مذہب ہو جاتا ہے۔ پھر انہیں رسم کے طور پر ادا کر دیا جاتا ہے اور پھر یہ رسم ہی باقی رہ جاتی ہے۔ ان رسومات کی ادائیگی کے لیے تو وقت' پیسہ' توانائی' سب صرف ہوتا ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ **اُولٰٓئِکَ الَّذِیْنَ کَفَرُوْا بِاٰیٰتِ رَبِّهِمْ وَلِقَآئِهٖ فَحَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ** (18:105)۔ ان کی تمام تگ و دو رائگاں جاتی ہے۔ یہ اعمال تو ہوتے ہیں مگر یہ ہوتے بے نتیجہ ہیں۔ ایسے بے نتیجہ ہوتے ہیں کہ **فَلَا نُقِیْمُ لَهُمْ یَوْمَ الْقِیٰمَةِ وَزْنًا** (18:105)۔ یومِ حساب ان کے لیے میزان بھی کھڑی نہیں کی جائے گی کہ تول کے دیکھ تو لیں کہ وہ کتنا ہے۔ جو کوئی جنسِ کاسد بیچنے کے لیے منڈی میں لے آئے تو کون اسے تولتا ہے۔ کچھ تھوڑی سی ناقص ہو تو اس کو تو پھر بھی کوئی دیکھ لے گا کہ ٹھیک ہے

---

[1] تاج العروس میں ''ط و ف'' کے مادے کے تحت لکھا ہے کہ الطائف۔ چوکیدار یا کوتوال جو رات کو حفاظت کے لیے پہرہ دے۔ اس میں یہ بھی لکھا ہے کہ اگرچہ یہ لفظ واحد ہے لیکن جمع کے لیے بھی آتا ہے۔ محیط المحیط میں لکھا ہے کہ طَافَ' اِسْتَطَافَ' تَطَوَّفَ' طَوَّفَ کسی چیز کے گرد بکثرت چلنے کو کہتے ہیں۔ اور الطّواف ایسا خادم ہے جو نہایت نرمی اور عنایت سے خدمت کرے۔

جی' سو فیصد نہیں' پچاس فیصد ہی سہی۔ پیمانہ ہی یہ ہے: **ثَقُلَتْ مَوَازِيْنُهٗ** (101:6)۔ **خَفَّتْ مَوَازِيْنُهٗ** (101:8)۔ قرآن نے کہا ہے کہ کچھ نہ کچھ تو اس جنس میں ہونا چاہیے اور اگر وہ دیکھنے میں ہی جنس کا سد نظر آتی ہے تو کسی نے بھی اس کے لیے میزان نہیں کھڑی کرنی' تو یہ جو مذہب میں رسومات بن جاتی ہیں یہی چیزیں ھواء اعمال ہیں جن کے متعلق قرآن کہتا ہے کہ **حَبِطَتْ اَعْمَالُهُمْ** (18:105)۔ ان کی تمام تگ و دو رائگاں جاتی ہے۔ ان کے تمام اعمال بے نتیجہ رہ جاتے ہیں۔ غور کیجیے! یہاں لفظ اعمال ہے۔ وہ عمل تو کرے یعنی کیوں کہیے کہ وہاں بے عملی نہیں ہوتی۔ یہ قوم کام کرتی ہے لیکن بے نتیجہ کام کرتی ہے۔ اسی لیے یہ خسر الدنیا والا خرۃ کہا ہے یعنی یہاں بھی نقصان ہوتا ہے' آخرت میں بھی نقصان ہوتا ہے۔ کیا ان رسومات کی ادائیگی میں تھوڑا نقصان ہوتا ہے؟ نہیں' بہت زیادہ نقصان ہوتا ہے۔

حج کی تمام حرمات اور شعائر اللہ ایک بلند مقصد کے حصول کا ذریعہ ہیں

عزیزانِ من! قرآنِ کریم میں ان امور کے متعلق' جنہیں ہم بظاہر رسومات کہتے ہیں' غرض و غایت بتائی ہے۔ کہیں انہیں **حُرُمٰتِ اللّٰهِ** کہا' کہیں شعائر اللہ کہا' یعنی اللہ کے متعین کیے ہوئے مقصد کی محسوس علامات۔ ان کے لیے تو لفظ ہی علامات آیا ہے' شعائر ہے Symbols (علامات) ہیں۔ یہ مقصود بالذات نہیں ہیں۔ اگر یہ سلطنت باقی نہ رہے' صرف آپ کا جھنڈا لہراتا رہے تو وہ جھنڈا ایک بانس اور چھوٹے سے کپڑے کا نام رہ جاتا ہے۔ زندہ سلطنت کے جھنڈے کی کیفیت کچھ اور ہوتی ہے۔ یہ چیزیں Symbols (علامات) ہوتی ہیں۔ ان آیات میں پیچھے سے یہی کچھ چلا آ رہا تھا۔ کہا کہ **ذٰلِكَ** (22:30)۔ یہ ہے مقصد اس اجتماع کا۔ یہ چیزیں ہیں جو ہم نے اس طرح سے بیان کی ہیں۔ پھر کہا کہ **وَمَنْ يُّعَظِّمْ حُرُمٰتِ اللّٰهِ فَهُوَ خَيْرٌ لَّهٗ عِنْدَ رَبِّهٖ** (22:30)۔ سو جو شخص بھی خدا کی مقرر کردہ پابندیوں کا احترام اور ان کی عظمت کا اعتراف کرے تو یہ چیز قانونِ خداوندی کی رو سے' اس کے لیے بڑی نفع بخش ہوگی۔ اس لیے ہم نے ان چیزوں کی تعظیم کا کہا ہے۔ یہ ایسے ہی باعثِ حرمت و تعظیم ہیں جیسے کہ جھنڈے کی تعظیم کی جاتی ہے' اسے بھی سلامی دی جاتی ہے' اس کپڑے اور بانس کو سلامی نہیں دی جاتی' اس مملکت کو سلامی دی جاتی ہے' اس کی شان و شوکت کو سلامی دی جاتی ہے جس کا Symbol (علامت) یہ جھنڈا ہوتا ہے۔ قرآن نے کہا کہ یہ حرمٰت اللہ ہیں' فی ذاتہ واجب التحریم نہیں ہیں۔ یہ حرمٰت اللہ یعنی خدا کے مقرر کردہ مقصد کی نشانیاں ہیں۔ اس لیے محسوس طور پر جو ان نشانیوں کی تعظیم کرتا ہے درحقیقت وہ خدا کے اس مقصد کی تعظیم کرتا ہے۔ اسے یاد رکھو' یہ بار بار کہا گیا ہے۔

عزیزانِ من! بات پیچھے سے چلی آئی تھی کہ یہ مویشی جانور اور یہ اونٹ اس عالمگیر اجتماع میں شمولیت کے وقت ساتھ لاؤ اور یہاں آ کے ان کو ذبح کرو۔ کھاؤ پیو۔ ہر مذہب میں' بتوں کے آستانوں پر' مقدس مقامات پر' جانوروں کا ذبح کرنا بھی چلا آ رہا ہے۔ اب یہاں بھی اس قسم کے اجتماع کے لیے کھانے پینے کا سامان دیا۔ بار بار اس کو دہرا دیا کہ کہیں اسے مقصود بالذات نہ سمجھ لینا کہ یہ جو قربانی دی جاتی

ہے'اس قربانی سے دیوتا راضی ہو جاتے ہیں' ان کی خوشنودی کے لیے یہ کچھ کیا جاتا ہے۔قرآن نے کہا کہ نہیں' **اُحِلَّتْ لَكُمُ الْاَنْعَامُ اِلَّا مَا يُتْلٰى عَلَيْكُمْ** (22:30)۔ہم نے تمہارے لیے سب مویشی حلال قرار دیئے ہیں۔بجز ان کے جن کا ہم نے پہلے ذکر کیا ہے' اور جو حرام قرار دیئے گئے ہیں یعنی وہی خنزیر' مردار' بہتا ہوا لہو' اور ہر وہ چیز جو خدا کے سوا کسی اور کی طرف منسوب کر دی جائے۔دیکھا' جب دین مذہب بنتا ہے تو وہ جو تین ❶ محسوس چیزیں تھیں وہ تو آج بھی مسلمان انہیں حرام سمجھتا ہے: خنزیر کو' لہو کو' مردار کو۔اور یہ جو چوتھی چیز تھی' اس کا تعلق انسان کے قلب سے تھا یعنی ہر وہ شے جسے خدا کے سوا کسی اور کی طرف منسوب کیا جائے' وہ ساری چیزیں حرام ہیں لیکن آج بھی انسان اسے مقدس بنائے ہوئے ہے۔اس میں ایک خاص تعظیم رکھی ہوئی ہے۔

غیر اللہ کے نام پر منسوب کردہ نیاز کو قرآن بہ نصِ صریح حرام قرار دیتا ہے

عزیزانِ من! ان تین حرام قرار دی گئی (خنزیر' لہو' مردار) کے بعد یہ چوتھی ہے' اس کا ذکر قرآن میں ہر جگہ کیا گیا ہے لیکن آج ہم دیکھتے ہیں کہ مسلمانوں کے ہاں یہی نہیں کہ غیر اللہ کی طرف منسوب کی ہوئی نذر نیاز جائز ہی ہو' یہ مقدس ہوتی ہے۔یہ جو نیاز کا دانہ یا نیاز کی جو چیزیں ہوتی ہیں ان میں ایک خاص تعظیم آ جاتی ہے' جنہیں قرآن بہ نصِ صریح حرام قرار دیتا ہے۔مگر یہاں آج وہ مقدس بن جاتی ہیں۔کہا بجز ان کے کہ جن کے متعلق ہم نے پہلے کہہ دیا ہے کہ یہ جانور تمہارے لیے حلال ہیں ٹھیک ہے' یہاں انہیں کو ذبح کرو' اتنا بڑا اجتماع ہے' یہ ان کے کھانے کا سامان ہے۔یہ کچھ کرو۔لیکن یہ نہ سمجھ لینا کہ کھانے پینے کی چیزوں کی پابندی کی احتیاط کر لی تو دین کا مقصد پورا ہو گیا۔اس کے لیے ایک اور چیز بھی ضرور ہے۔عزیزانِ من! بظاہر یہ چیز بہت بے جوڑ اور بے ربط نظر آتی ہے۔ملا بھی کہتا ہے کہ قرآن تو یہ یونہی لے آیا: اس کے بعد یہ کہہ دیا' اور اس کے بعد یہ جیسا کہ میں نے کہا ہے کہ اس قسم کی محسوس چیزوں کے ساتھ ہی توجہ ادھر دلا دی کہ دیکھنا' یہ دین کہیں مذہب نہ بن جائے۔سنیئے' عزیزانِ من! کہا کہ یہ جانور حلال ہیں' ان کو ذبح کرو' خود بھی کھاؤ' یہاں کے لوگوں کو بھی کھلاؤ لیکن ضروری ہے کہ **فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْاَوْثَانِ وَاجْتَنِبُوْا قَوْلَ الزُّوْرِ** (22:30)۔ہر اس شے سے بچو جو زندگی کی حرکت کو ساکن کر دینے والی ہو' جس سے ذہن میں جمود و تعطل طاری ہو جائے اور قوتِ عمل ساقط ہو جائے...... بت پرستی اس کی محسوس شکل ہے...... جب زندگی میں حرکت نہ رہے تو پھر اس کے ہر گوشے میں کثافتیں پیدا ہو جاتی ہیں۔اس کی صلاحیتوں کی نشو و نما رُک جاتی ہے۔زندگی حرکتِ پیہم اور جہدِ مسلسل کا نام ہے۔

---

❶ خنزیر' مردار اور بہتا ہوا لہو۔

اوثان کا مفہوم اور ہمارے تراجم: ایک گمبھیر التباس

عزیزانِ من! جب دین مذہب میں بدل گیا تو مذہب کی دنیا میں ہمارے ہاں اس آیت کے ترجمے ہوئے کہ **فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْاَوْثَانِ** (22:30)۔ بتوں کی ناپاکی سے بچو۔ آپ کو ہر جگہ یہ ترجمہ ملے گا۔ کسی قوم کی' کسی بھی مذہب والوں کی' کوئی کتاب لے لیجیے تو وہ قوم خواہ کتنی ہی ذلیل اور گندی کیوں نہ ہو' معاف رکھیے گا عزیزانِ من! میں یہ کہہ رہا ہوں کہ خواہ وہ بھنگی ہی کیوں نہ ہوں' بت انکا بھی بڑا صاف ہوتا ہے' وہ تو معبود ہوتا ہے۔ مگر یہاں اس کا ترجمہ یہ ہوتا ہے کہ بتوں کی ناپاکی سے بچو۔' اوثان وثن کی جمع ہے۔ بنیادی طور پر عربی زبان میں ''ہر وہ شے جو ایک مقام پہ کھڑی رہے' جمی رہے' جمود ہو' جس کی حرکت ساکن ہو جائے' اسے وثن کہتے ہیں'' میں نے کہا تھا کہ دین کا ہر وہ زندہ متحرک عنصر وثن میں آ کے جامد ہو جاتا ہے' اس میں حرکت نہیں رہتی۔ قرآن نے کہا کہ ان چیزوں کو رسم نہ بنا لینا کہ یہ ایک زندہ جاوید نظام کے عناصر کی بجائے مذہب کی رسوم بن جائیں کہ جن میں کوئی حرکت نہ رہے۔ جامد ہو کے رہ جائیں۔ اور ''رجس'' ہوتا ہے ''ایسا گندلا پن [1] جس سے Confusion Create (التباس پیدا ہونا) ہوتی ہے' اس میں گندلا پن [1] آ جاتا ہے' اس میں کثافت آ جاتی ہے۔'' ذہنی کثافت کے لیے بھی یہ لفظ آ جاتا ہے۔ کہا کہ ان چیزوں میں یہ نہ ہو کہ جمود پیدا ہو جائے' تعطل پیدا ہو جائے' یہ رسم بن کے رہ جائیں۔ اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تمہارے ذہن میں بھی صفائی نہیں رہے گی' کثافت پیدا ہو جائے گی۔ جمود سے بچو۔ زندگی نام ہی حرکت کا ہے۔

دین جب مردہ ہو جائے تو مذہب بن جاتا ہے

عزیزانِ من! زندہ اور مردہ میں فرق ہی یہ ہوتا ہے کہ زندہ میں حرکت کی کوئی نہ کوئی نشانی تو ہوتی ہے۔ قلب کی آخری حرکت بھی جب بند ہو جاتی ہے' تو پھر اسے مردہ کہتے ہیں۔ مردہ کسے کہتے ہیں؟ جس میں حرکت نہ رہے۔ دین جب مردہ ہوتا ہے تو مذہب بن جاتا ہے۔ اسی کو تو قرآن نے اوثان کہا ہے' وثن کہا ہے۔ اب بعد میں یہ لفظ بت کے لیے استعمال ہوا کیونکہ بت ایک جگہ پر جامد کھڑا ہوتا تھا۔ عرب جمود کی محسوس نشانی بت کو قرار دیتے تھے۔ انہوں نے جمود کا جو صحیح مفہوم تھا اسے تو ختم کر دیا اور بت اس کے معنی ہو گئے۔ **اَلرِّجْسَ** کے معنی کر دیئے ناپاکی۔ وہ جو ذہنی کثافت ہوتی ہے اسے ختم کر دیا اور ترجمہ ہو گیا: بتوں کی ناپاکی سے بچو۔ اس نے یہ کہا تھا کہ یاد رکھو! زندگی کا کام چلتا رہے گا' تو ندی رہے گی' جہاں یہ کھڑا ہو گیا' تعفن پیدا ہو جائے گا۔ بند پانی میں یہ زندگی جوہڑ بن جائے گی۔ اس نے یہ کہا تھا کہ **فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْاَوْثَانِ** (22:30)۔ اگر جمود طاری ہو گیا تو یاد رکھو' اس میں تعفن پیدا ہو جائے گا۔ زندگی کے اندر

---

[1] گدلا پن

جمود کے تعفن سے بچو، ذہنی کثافت سے بچو۔ یہ حرکت ہی ہے کہ جس سے کثافتیں مبدل بہ لطافت ہوتی ہیں، لیکن عزیزانِ من! دو ٹکڑے ہیں۔ پہلا ٹکڑا تو یہ ہے کہ جمود سے بچو، حرکت زندگی کا نام ہے لیکن اس کے ساتھ ہی قرآن ہے، عزیزانِ من! یہ کہا کہ حرکت اگر بلا تعین مقصد ہو تو وہ تو بگولے کا رقص ہو جاتا ہے۔ تو کیا ہر حرکت بامقصد ہوتی ہے؟ کہا کہ نہیں۔ ادھر کہا: جمود سے بچو۔ اور پھر کہا کہ وَاجْتَنِبُوْا قَوْلَ الزُّوْرِ ❶ (22:30)۔ ہر اس نظریہ سے بچو جو اسے صحیح راستہ سے ہٹا کر کسی دوسری طرف لے جانے کا موجب ہو۔ اب ہمارے لیے اس کا ترجمہ کیا جاتا ہے کہ جھوٹی بات سے بچو، بتوں کی ناپاکی سے بچو۔ اگر دیکھا جائے تو ان دونوں میں یہ کیا ربط ہے؟ دین کس قسم کی حرکت چاہتا ہے؟ اس کے لیے ایک نصب العین متعین کیا۔ اس نصب العین کے حصول کے لیے ناک کی سیدھ چل پڑے۔ یہ ہے وہ حرکت جو آپ کو منزلِ مقصود تک پہنچائے گی۔ اس کے لیے تو کہا کہ جمود سے بچو، ایک مقام پہ کھڑے ہو جاؤ گے تو ہزار سال تک کھڑے رہو گے، تم ایک قدم بھی اپنی منزل کی طرف آگے نہیں بڑھا سکو گے۔ اس لیے اس نصب العین کے مطابق اپنی زندگی میں حرکت رکھو، اس میں جمود نہ آنے دو۔

نصب العین سے دُور لے جانے والی حرکت سے بھی بچو اور جمود سے بھی

عزیزانِ من! زندگی میں حرکت ضروری ہے لیکن حرکت کے ساتھ ہی یہ بھی کہا کہ یاد رکھو ''زور'' نہیں۔ زور کے معنی ہوتا ہے ''کسی جگہ سے ٹکرا کے دوسری طرف نکل جانا''۔ اس لیے کہا کہ اس حرکت میں یہ نہ ہو کہ جو تمہارے ہاں کی خود ساختہ منزلِ مقصود ہے تم وہاں جا پہنچو۔ یا اس حرکت کا تعین ہی نہ کرو کہ وہ تمہیں منزل مقصود تک لے جائے۔ اور اگر متعین بھی کرو تو اس طرف نہ جاؤ جدھر جی چاہے نکل جاؤ۔ جمود سے بچو اور اس حرکت سے بھی بچو کہ جو تمہیں نصب العین کی طرف نہ لے جائے کسی اور طرف لے جا رہی ہو۔ اللہ اکبر! غور فرما رہے ہیں، عزیزانِ من! اور پھر قرآن ہے اگلی ہی آیت کے پہلے ہی دو لفظوں میں بات واضح کی۔ کہا کہ زندگی میں حرکت بڑی ضروری ہے۔ چلو، ضرور چلو، مگر یوں نہ چلو کہ نصب العین کی طرف سے اِدھر اُدھر رخ کر کے کوئی اِدھر مڑ گیا کوئی اُدھر مڑ گیا: حُنَفَآءَ لِلّٰهِ (22:31)۔ صحیح روشِ زندگی یہ ہے کہ انسان ہر طرف سے خیال ہٹا کر اپنی توجہات کا مرکز قوانینِ خداوندی کی اطاعت کو قرار دے۔ یہاں حَنَفَ کا لفظ استعمال کیا ہے۔ اس کے معنی ''ناک کی سیدھ چلے جانے'' کے ہوتے ہیں۔ اللہ کے مقرر کیے ہوئے نصب العین کی

---

❶ اَلْاَزْوَرُ۔ وہ جس کے سینے میں ٹیڑھا پن ہو، نیز کنکھیوں سے دیکھنے والے کو بھی کہتے ہیں۔ اسی سے اس لفظ کے معنی ایک طرف جھک جانے کے آتے ہیں۔ نیز سیدھے راستے سے ہٹ کر ایک طرف ہو جانے کے۔ ابن فارس نے اپنی کتاب مقاییس اللغۃ میں اس کے بنیادی معنی ''کسی طرف جھک جانے اور ایک طرف جانے'' کے لکھے ہیں۔ تاج العروس، محیط المحیط اور مقاییس اللغۃ میں لکھا ہے کہ زَوَّرَ عَنْهُ کے معنی ہیں ''وہ ایک طرف ہٹ گیا''۔ اسی سے اَلـزُّوْرُ جھوٹ کو کہتے ہیں۔ پرویزؒ نے اپنی لغات القرآن جلد دوم میں لکھا ہے کہ انسان کا ہر وہ قدم جو صراطِ مستقیم سے ہٹ کر کسی دوسری طرف جا پڑے زور میں آئے گا۔ (ص۔823)

طرف ناک کی سیدھ چلے جاؤ۔ اور اس سلسلے میں فَاجْتَنِبُوا الرِّجْسَ مِنَ الْاَوْثَانِ (22:30)۔ جمود سے بچ جاؤ۔ ساکن ہونے سے بچ جاؤ۔ حنفا چلو۔ زُور سے بچ جاؤ۔ نہ ادھر نکلو' نہ ادھر نکلو۔ چلو' اوثان کی اذیت سے بچ جاؤ۔ حنفا بھی کس طرح سے؟ وہ جو خدا نے خود کوئی مقصد متعین کر دیا' اس کی طرف سیدھے چلے جائیں۔ یہ ہے مقصد۔ لِلّٰهِ (22:31)۔ خدا کے مقرر کردہ نصب العین کی طرف۔ مزید اس کی وضاحت کر دی کہ غَيْرَ مُشْرِكِيْنَ بِهٖ (22:31)۔ اس میں کسی اور کی محکومیت کو شامل نہ کرو۔ یہی نہیں کہ خدا کے سوا کسی اور کا متعین کیا ہوا یا اپنا متعین کیا ہوا مقصد ہو بلکہ اس میں بھی کسی اور کی شرکت نہ ہو کہ کچھ اس کا ہو اور کچھ اس کا ہو۔ اس نصب العین میں تو ذرا سی بھی کوئی دوسری چیز ملا دی جائے تو پھر عزیزانِ من! یہ گدلا ہو جاتا ہے' توحید خالص باقی نہیں رہتی۔ اسی لیے کہا کہ حُنَفَآءَ لِلّٰهِ غَيْرَ مُشْرِكِيْنَ بِهٖ (22:31)۔ صحیح روشِ زندگی یہ ہے کہ انسان ہر طرف سے خیال ہٹا کر اپنی تمام توجیہات کا مرکز قوانین خداوندی کی اطاعت کو قرار دے اور اس میں کسی اور کی محکومیت کو شامل نہ کرے۔ یعنی عام زبان میں کہ شرک نہیں کرو۔ شرک کے متعلق ہمارے ذہنوں میں یہی ہے کہ بتوں کے سامنے جھکنے کا نام شرک ہے۔ بس یہ جو ہزار بت اپنے ذہنوں میں رہائش پذیر ہیں ان کی طرف کسی کی نگاہ نہیں جاتی۔ قرآنِ کریم میں آپ دیکھیے کہ شرک کس قدر ایک مانع چیز ہے۔ لہٰذا یہ سوچیے تو سہی کہ یہ شرک ظلمِ عظیم ہے۔ قرآن نے تو اس کی اتنی زیادہ شدت سے مخالفت کی ہے کہ کچھ یوں نظر آتا ہے کہ وہ ہماری زبان میں جسے کہتے ہیں کہ اللہ میاں اس غلط عمل کو تو دیکھ ہی نہیں سکتا جبکہ' عزیزانِ من! اگر آپ ہر انسان کو رب بنالیں گے تو اس کی ربوبیت میں تو کچھ فرق ہی نہیں آتا۔ وہ تو اس وقت بھی رب اور اللہ تھا جب تم میں سے دنیا میں کوئی بھی نہیں تھا اور اس وقت بھی وہ اسی طرح سے رہے گا حتیٰ کہ دنیا میں کوئی بھی نہیں رہے گا۔ مگر ساری دنیا اسے اللہ ماننے لگ جائے' تو بھی اس کی الوہیت کے اندر کوئی فرق نہیں پڑتا یا ساری دنیا اس کی ہستی کا انکار کر دے تو بھی اس کو کچھ فرق نہیں اِنَّ اللّٰهَ غَنِيٌّ عَنِ الْعٰلَمِيْنَ (3:96)۔ خدا تو تمام سے بے نیاز ہے' خدا کا کوئی کچھ نہیں بگاڑ سکتا' وہ اپنا ہی نقصان کرے گا۔

ذاتِ خداوندی ہر چیز سے مستغنی ہے

عزیزانِ من! خدا مستغنی ہے لہٰذا وہ جو شرک کی اتنی مخالفت کر رہا ہے تو اسلیے نہیں ہے کہ اس سے اس کا کچھ بگڑتا ہے۔ یہ اس لیے ہے کہ اس سے انسان کا کچھ نہیں بچتا۔ اسی لیے اسے ظلمِ عظیم کہا ہے۔ ظلم کے معنی ہوتا ہے ''جس شے کو جس مقام پہ ٹھیک ہونا چاہیے' وہ وہاں نہ ہو''۔ کہا کہ تم نے سوچا بھی ہے کہ مقامِ انسانیت کیا ہے؟ یہ تمام کائنات' اشیائے کائنات اور فطرت کی قوتیں' جسے اس نے ملائکہ کہا ہے' یہ تو آدم کے سامنے سجدہ ریز ہیں۔ تو مقامِ آدم کائنات کی تمام اشیاء سے بلند ہے اور یہ قوتیں یوں اس کے سامنے سجدہ ریز ہوئی ہیں اور یہ ان کے مقابلے میں بلند ہوا تو اس کا صحیح مقام یہ ہوا۔ اگر یہ اشیائے کائنات میں سے کسی کے سامنے جھک گیا تو ظلم ہو گیا۔ اسے اسی

مقام پہ رہنا چاہیے تھا۔ وہ اس مقام پہ نہ رہا' انسان نے اپنا صحیح مقام چھوڑ دیا۔ تمام انسانوں کو قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ **وَلَقَدْ كَرَّمْنَا بَنِيٓ اٰدَمَ** (17:70)۔ ہر ابنِ آدم یکساں طور پہ واجب التکریم ہے۔ اگر ایک انسان دوسرے انسان کے سامنے جھک گیا تو پھر بھی اس نے اپنا مقام چھوڑ دیا۔ لہٰذا دیکھا جائے تو یہی دو ہی عناصر ہو سکتے ہیں جن کے سامنے انسان جھکے گا: یا کائناتی قوتوں کے سامنے جیسے کہ دنیا میں آپ نے دیکھا یہ ہندوؤں کے دیوی اور دیوتا اور یہ سارا اصنامیات یا دوسرے انسان کے سامنے جھکا جو انسانوں کی دنیا میں ہوتا چلا آ رہا ہے' جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ اس سے انسان اپنے مقام سے نیچے گر گیا۔ شرک انسان کو اس کے اپنے مقام سے گرا کر اس کی تذلیل کا باعث بنتا ہے۔

تو جھکا جب غیر کے آگے' نہ تن تیرا' نہ من ❶

عزیزانِ من! شرک وجہ تذلیلِ انسانیت ہے۔ دین کا مقصد اور غایت انسان کو اس کے صحیح مقام سے روشناس کرانا اور اس پر قائم رکھنا ہے۔ جب بھی یہ اپنے مقام سے گرا اس کے لیے وجہ ذلت ہو۔ اسی کا نام شرک ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ جھکنا صرف اس کے قانون کے سامنے چاہیے۔ انسان سے بڑی نہ تو کائنات کی کوئی قوت ہوئی' نہ کوئی دوسرا انسان ہے۔ ایک ہی ہستی باقی رہ گئی' جسے خدا کہا جاتا ہے۔ لہٰذا خدا کے قوانین کے سامنے جھکنے سے انسان کی تذلیل نہیں ہوتی کہ یہ سب سے بڑا (اکبر) ہے جس کے سامنے یہ جھکا البتہ اس کے علاوہ جب دوسرے انسان کے سامنے جھکا تو اپنے جیسے کے سامنے جھکا اور اگر وہ فطرت کی قوتوں میں سے کسی کے سامنے جھکا تو پھر تو وہ قوتیں جو اس کے اپنے سامنے سجدہ کرنے والی تھیں یہ ان کے سامنے سجدہ کرنے لگ گیا تو یہ ہے شرک۔ سنیے کہ اس سلسلہ میں قرآن کیا کہتا ہے؟ کہا کہ **وَمَنْ يُّشْرِكْ بِاللّٰهِ** (22:31)۔ یاد رکھو! جو شخص خدا کے علاوہ کسی اور کی اطاعت کرتا ہے اور اس کے سامنے جھکتا ہے اس طرح وہ خدا کے ساتھ شرک کرتا ہے۔ اب خدا کے ساتھ شرک کے معنی آپ نے سمجھ لیے کہ جب انسان اس کے علاوہ کسی اور کے سامنے جھکتا ہے' تو یہ شرک ہوتا ہے۔ کہا کہ اس سے یوں سمجھیے اور یوں دیکھیے کہ قرآن انسان کو کیسے سمجھا رہا ہے۔ اس طرح جھکنے کے بارے میں یوں سمجھیے کہ جیسے **خَرَّ مِنَ السَّمَآءِ** (22:31)۔ انسان آسمان کی بلندیوں سے زمین کی پستیوں پہ آ گرا۔ خدا نے اسے اپنے مقام سے نہیں گرایا بلکہ انسان نے ہی اپنے آپ کو یوں پامال کر لیا ہے۔ لہٰذا جب یہ یوں گر گیا تو کیفیت اس کی کیا ہو گئی؟ کیا بات ہے! عزیزانِ من! کہا کہ **فَتَخْطَفُهُ الطَّيْرُ** (22:31)۔ جیسے (چڑیا کا بچہ اپنے گھونسلے سے نیچے زمین پر گر جائے تو) اسے چیل جھپٹ کر لے جائے۔

---

❶ پانی پانی کر گئی مجھ کو قلندر کی یہ بات — تو جھکا جب غیر کے آگے نہ تن تیرا' نہ من — (اقبالؒ)

مقامِ انسانیت سے گرے ہوئے انسان کی حالت

عزیزانِ من! یاد رکھیے کہ جب کوئی شخص خدا کے علاوہ کسی اور کی اطاعت کرتا ہے' اور اس کے سامنے جھکتا ہے تو وہ شرفِ انسانیت سے محروم ہو جاتا ہے۔ تو یوں سمجھیے کہ جیسے ایک چڑیا کا چھوٹا سا بچہ ہو اور وہ اپنے گھونسلے سے گر جائے تو قرآن کہتا ہے کہ وہ کسی کوے یا چیل کی جھپٹ میں آئے اور پھر وہ جھپٹ کر جہاں جی چاہے اس کو لے جائے۔ یعنی انسان جب اپنے مقامِ انسانیت سے گر جائے تو پھر ہر جھپٹنے والا اس کو جھپٹ کے لے جاتا ہے۔ یہ ہے شرک اور یہاں کہا کہ **اَوۡ تَہۡوِیۡ بِہِ الرِّیۡحُ فِیۡ مَکَانٍ سَحِیۡقٍ** (22:31)۔ یا یوں سمجھو کہ ایک سوکھے گھاس کا تنکا ہو' تیز ہوا کا ہر جھونکا جدھر جی آئے' اس کو اڑائے۔ اس کا تو اپنا کوئی وزن ہی نہیں رہتا۔ اپنا کوئی مقام ہی نہیں رہتا۔ کہا کہ شرک یہ کرتا ہے کہ اسے پرِ کاہ کی طرح اڑائے اڑائے پھرتا ہے اور کسی دور دراز گوشے میں جا پھینکتا ہے۔

شرک انسان کو مقامِ انسانیت سے گرا دیتا ہے

عزیزانِ من! تو اب آپ نے بات سمجھ لی کہ شرک بتوں کے سامنے جھکنے کا نام نہیں ہے۔ یہ تو قوانینِ خداوندی کے علاوہ کسی اور کے سامنے جھکنا ہے۔ یہ شرک ہے۔ خود اپنی خواہشات کے سامنے جھکنا بھی شرک ہے۔ ایک انسان کی' جو اپنے مقام کو چھوڑ کر' اس پستی پہ آ کے گر جاتا ہے تو اس کی یہ کیفیت ہو جاتی ہے کہ پھر وہ آسمان کی بلندیوں سے زمین کی پستیوں پہ آ گرا ہے۔ کس قدر وہ ضعیف و ناتواں ہو گیا کہ ہر صاحبِ قوت جس کا جی چاہے' جھپٹا مار کے لے جائے۔ اس کو ہر تیز ہوا کا جھونکا جدھر جی چاہے اڑائے پھرے۔ پھر اگلی آیت میں کہا کہ **ذٰلِکَ** (22:31)۔ یہ انجام ہوتا ہے غیر خداوندی قوتوں کے سامنے جھکنے کا۔ پھر کہا کہ سوچ لیجیے بات یہ ہے کہ **وَمَنۡ یُّعَظِّمۡ شَعَآئِرَ اللّٰہِ فَاِنَّہَا مِنۡ تَقۡوَی الۡقُلُوۡبِ** (22:32)۔ (اس کے برعکس) جو شخص خالصۃً نظامِ خداوندی کی اطاعت کرے گا اور اس کے اعتراف کے طور پر اس نظام کے نشانات (Symbols) کی تعظیم کرے گا تو یہ اس امر کا اظہار ہو گا کہ اس کے دل میں قوانینِ خداوندی کی نگہداشت کا احساس اور ان کا احترام موجود ہے۔ لیکن اگر ان نشانات کی تعظیم ہی مقصود بالذات بن جائے یا یہ چیز محض رسم بن کر رہ جائے تو یہ بات انسان کو دین کی حقیقت سے دُور لے جائے گی۔ اسے دوسرے الفاظ میں یوں سمجھو کہ یہ جو ہم نے شعائر کہہ دیئے ہیں' ان کی تعظیم کو یہ نہ سمجھ لینا کہ تم انسان انکے سامنے جھک گئے ہو' یہ **مِنۡ تَقۡوَی الۡقُلُوۡبِ** [1] ہے۔ یہ تو تمہارے دل کے اندر جو ایک خواہش کی نمود ہوئی ہے یہ تو صرف اس کے اظہار کا ایک محسوس ذریعہ ہے۔ آپ نے دیکھا کہ قرآن کس طرح بتاتا ہے کہ کہیں یہ دین مذہب میں نہ بدل جائے۔ کہیں یہ شعائر' یہ Symbols (نشانات)' مقصود بالذات نہ بن جائیں۔ یہ تو **تَقۡوَی الۡقُلُوۡبِ** (22:32) ہے یعنی یہ تو تمہارے دلوں کے اندر قوانینِ خداوندی کے متعلق ایک احترام ہے۔ اس کے کہنے کے مطابق تم نے انہیں بھی واجب الاحترام

---

[1] دل میں قوانین خداوندی کی نگہداشت کا احساس اور ان کا احترام

سمجھ لیا ہے حالانکہ یہ بجائے خویش کسی احترام کی مستحق نہیں ہیں۔

اب قرآنِ کریم نے یہ کہا کہ مکے میں اس عالمگیر اجتماع کے لیے جانور لیے آ رہے ہو۔ جیسا کہ میں نے پہلے کہا ہے کہ عربوں کے ہاں یہ حج تو قدیم زمانے سے چلا آ رہا تھا' کعبے میں بت بھی نصب تھے' ان بتوں کے ہاں قربانیاں بھی دی جاتی تھیں' ان قربانی کے جانوروں کو یہاں لایا جاتا تھا: ان جانوروں کو بھی مقدس سمجھا جاتا تھا' جیسے یہ ہندوستان والے اور جہاں جہاں بھی کسی بت کے نام پر کوئی جانور چھوڑا ہوا ہوتا ہے' وہ جانور مقدس ہو جاتا تھا۔ ہاں تو یہ جو مکے میں اس عالمگیر اجتماع کے لیے تم جانور لیے آ رہے ہو' ان کے متعلق کہا کہ انہیں یہاں ذبح کرو' کھاؤ پیو' یہ نہ سمجھ لینا کہ یہ مقدس ہو گئے۔ اس سلسلے میں اس حقیقت کو ایک مرتبہ پھر سن لو کہ تم جن جانوروں کو اس اجتماع میں کھانے پینے کے لیے ذبح کرو گے' ان کے متعلق یہ تصور نہ کر لینا کہ یہ بھی اسی قسم کی قربانی ہے' جیسے عام پرستش گاہوں میں کی جاتی ہے اور یہ جانور مقدس ہو گئے۔ بالکل نہیں۔ یہ عام جانور ہیں **لَكُمْ فِيهَا مَنَافِعُ إِلَىٰ أَجَلٍ مُّسَمًّى** (22:33)۔ جن سے تم دورانِ سفر سواری یا بار برداری کے سلسلے میں مختلف فائدے اٹھاتے ہو۔ جس طرح اور جانوروں سے کام لیتے ہو' اسی طرح ان سے بھی کام لو۔ وہ جانور جو بتوں کے نام پہ چھوڑے ہوئے ہوتے تھے' ان سے کوئی کام نہیں لیا جاتا تھا۔ یہاں کہا کہ ان میں کوئی چیز تقدیس کی نہیں آ گئی' یہ مقدس نہیں بن گئے' ان سے کام لو **ثُمَّ مَحِلُّهَا إِلَى الْبَيْتِ الْعَتِيقِ** (22:33)۔ انہیں یہاں (خانہ کعبہ میں) لا کر اپنی خوراک کے لیے ذبح کرو۔ بس اب ان کا کام اتنا ہی ہے کہ جب تک یہاں جمع ہو' تو ضرورت کے وقت ان کو ذبح کرو اور کھاؤ پیو۔ کہا کہ یہ جو ہم نے جانوروں کو ذبح کرتے وقت خدا کا نام لینے کا طریق بتایا ہے تو یہ خصوصیت تمہارے لیے نہیں۔ **لِكُلِّ أُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنسَكًا لِّيَذْكُرُوا اسْمَ اللَّهِ عَلَىٰ مَا رَزَقَهُم مِّن بَهِيمَةِ الْأَنْعَامِ** (22:34)۔ ہم نے ہر قوم کے لیے یہ طریق مقرر کر دیا تھا کہ وہ جانوروں کو ذبح کرتے وقت اللہ کا نام لیا کریں (22:67)۔ اب یہ چیزیں تمہیں رسم بن کے نظر آ رہی ہیں۔ مختلف مذاہب' مختلف اقوام میں درحقیقت Originally' شروع ہی میں' انہیں بھی یہی کچھ بتایا گیا تھا' جو آج تمہیں بتایا جا رہا ہے۔ یہ بھی دین میں اللہ ہی کا نام لینے کے لیے یہ سب کچھ کیا جا رہا تھا۔ بعد میں انہوں نے ان چیزوں کو اپنے ہاں مذہبی رسوم میں تبدیل کر لیا۔ ہر قسم کی جہالت اور ہر قسم کا شرک اس کے اندر آ گیا۔ یاد رکھو! یہ جو کچھ کہا جا رہا ہے' اسے کرتے وقت ایک حقیقت کو سامنے رکھو اور وہ یہ ہے کہ **فَإِلَٰهُكُمْ إِلَٰهٌ وَاحِدٌ** (22:34)۔ صرف خدا تعالیٰ کی ہی ایک قوت ہے جس کے سامنے جھکنا ہے۔ اس سے مقصود ہی یہ ہے کہ خدا کا صحیح تصور اور نکھرا ہوا تصور بروقت تمہارے پیش نظر رہے اور یہ حقیقت تمہاری نظروں سے اوجھل نہ ہونے پائے کہ تمہارے اوپر اقتدار و اختیار صرف خدائے واحد کا ہے اور کسی کا نہیں۔ **فَلَهُ أَسْلِمُوا** (22:34)۔ سو تم صرف اس کے قوانین کی اطاعت کرو۔ صرف اس کے سامنے جھکو' کسی اور میں کوئی تقدیس نہیں آ جاتی' کوئی شے وجہ تکریم نہیں بن جاتی۔ صرف اسی کے سامنے جھکو۔ یہ ہے دین کی وہ اصل جس میں کسی قسم کا تنازعہ نہیں ہو سکتا (22:67)۔ **وَبَشِّرِ الْمُخْبِتِينَ** (22:34)۔ سو جو لوگ اس اصلِ عظیم کے سامنے جھک جائیں' انہیں زندگی کے خوشگوار نتائج کی

بشارتیں سنا دو...... اور کھل کر کہہ دو کہ جو لوگ ایسا کرنے والے ہیں ان کو زندگی کے خوشگوار نتائج کی خوشخبری دو کہ اس نہج زندگی سے کہ انسان قوانینِ خداوندی کے علاوہ کسی اور کے سامنے نہ جھکے۔ اسکا نتیجہ زندگی کی سرفرازیاں ہیں خوشگواریاں ہیں۔ یہ وہ لوگ ہیں کہ **اَلَّـذِیۡنَ اِذَا ذُکِرَ اللّٰہُ وَجِلَتۡ قُلُوۡبُہُمۡ** (22:35)۔جن کے سامنے جب قانونِ خداوندی پیش کیا جاتا ہے تو اس کی خلاف ورزی کے تباہ کن نتائج کے تصور سے ان کے دل کانپ اٹھتے ہیں (8:2)۔ جب ان کے سامنے قوانینِ خداوندی آتے ہیں تو ان قوانین کے سامنے جھکنے کے لیے ان کے دل کے اندر ایک نرمی پیدا ہوتی ہے اور ہر مقام پر یہ سرفرازی سے گزر جاتے ہیں' کہیں بھی کسی اور کے سامنے نہیں جھکتے۔صرف مومن خدا کے حکم سے مجبور ہوتا ہے۔ جب اس کا قانون سامنے آتا ہے تو وہاں ان کا دل نرم پڑ جاتا ہے۔عزیزانِ من! یہاں الفاظ ہیں: **وَجِـلَـتۡ قُـلُـوۡبُـہُـمۡ** (22:35)۔ان کے دل میں ایک نرمی تو آتی ہے لیکن یہ نرمی اس قسم کی نہیں ہوتی کہ جس میں ''ہوجا لکھ مسیت دا۔ جیہڑا جی چاہے لتاڑ دا ای' تریا جاوے' تیرے اتوں لنگدا۔'' ❶ یہاں کہا کہ یہ بات نہیں ہے بلکہ یہ ہے کہ **وَالصّٰـبِـرِیۡنَ عَلٰی مَاۤ اَصَابَہُمۡ** (22:35)۔اس قانون پر چلنے کی راہ میں' انہیں جو جو دشواریاں پیش آتی ہیں ان کا نہایت ہمت اور حوصلہ سے مقابلہ کرتے ہیں اور ان کے پائے استقلال میں کبھی لغزش نہیں آتی۔

نظامِ خداوندی کا مقصد انسانوں کے لیے دلوں کی نرمی کے ساتھ سامانِ زیست کو عام کرنا ہے

عزیزانِ من! خدا کے متعین کردہ مقصد حیات کے حصول کے لیے زندگی پھولوں کی سیج نہیں ہے۔ روشِ حیات کے اس طریق پر جو بھی آفات آتی ہیں' یہ لوگ نہایت استقامت سے ان کا مقابلہ کرتے ہیں۔ ان کے دلوں میں نرمی پیدا ہو جاتی ہے۔اس نرمی کی وجہ سے یہ کہتے ہیں کہ اس سے ان میں بڑی استقامت پیدا ہو جاتی ہے۔ سوال یہ ہے کہ یہ سب کچھ کاہے کے لیے ہوتا ہے؟ اس کے قانون کے سامنے جھکنا اور باطل کے سامنے ڈٹ کے کھڑے ہو جانا' کاہے کے لیے ہے؟ کہا کہ **وَالۡمُقِیۡمِی الصَّلٰوۃِ** (22:35)۔ نظامِ صلوٰۃ قائم کرنے کے لیے اور اس کے ساتھ ہی کہا کہ **وَمِـمَّـا رَزَقۡـنٰـہُـمۡ یُنۡفِقُوۡنَ** (22:35)۔ نوعِ انسانی کے مفاد کے لیے جو بھی سامانِ زیست ہم نے دیا ہے اس کو کھلا چھوڑنے کے لیے۔ یہ سب کچھ اس کے لیے کیا جائے گا۔ پھر ادھر توجہ دلائی کہ یاد رکھو! یہ جو اونٹ ساتھ لیے آ رہے ہو انہیں اس اجتماع کے موقعہ پر ذبح کرنا ہے۔ان کے لیے یہ یاد رکھو کہ **وَالۡبُدۡنَ جَـعَـلۡـنٰـہَا لَکُمۡ مِّنۡ شَعَآئِرِ اللّٰہِ** (22:36)۔ وہ اونٹ بھی نظامِ خداوندی کے نشانات (Symbols) میں سے ہیں۔ یاد رکھو کہ ہر وہ شے جو کسی نہ کسی طریق سے اس نظام کی اقامت اور استحکام کا موجب بنتی ہے' اس کے شعائر میں شمار ہو جاتی ہے لیکن اس کا یہ مطلب نہیں ہے کہ اس طرح یہ جانور تمہارے

---

❶ مسجد کا نہیف و نزار تنکا بن کر رہ جاؤ' جس کا جی چاہے تمہیں روندتا چلا جائے' وہ تمہیں پاؤں تلے لتاڑتا چلا جائے اور اسے اس کی خبر تک بھی نہ ہو (کہ اس نے کیا کیا)۔

لیے مقدس بن جاتے ہیں۔

اونٹ وغیرہ چڑھاوے کے نہیں بلکہ بلند مقصد کے حصول کا ذریعہ ہیں

عزیزانِ من! اب یہ بھی یاد رکھو کہ یہ جو Symbols (نشانات) ہیں' یہ شعائر اللہ ہیں' قربانی کے اونٹ نہیں ہیں' چڑھاوے کے اونٹ نہیں ہیں۔ یہ تمہیں اس مقصد کے لیے کہا ہے کہ انہیں ساتھ لاؤ تاکہ اس عالمگیر اجتماع میں تم انہیں ذبح کر کے کھاؤ پیو۔ یہ صرف شعائر اللہ ہیں۔Symbols(نشانات) ہیں۔ **لَكُمْ فِيهَا خَيْرٌ** (22:36)۔ تمہارے فائدہ اٹھانے کی چیزیں ہیں یعنی تمہارے فائدے کے لیے ہیں۔ **فَاذْكُرُوا اسْمَ اللّٰهِ عَلَيْهَا صَوَآفَّ** (22:36)۔ انہیں اللہ کا نام لے کر' قطار در قطار' ذبح کرو۔ یہ تو تمہارے تابع تسخیر ہیں۔ اس زمانے میں اونٹوں کو کھڑا کر کے ذبح کیا کرتے تھے۔ گردن میں برچھا مارتے تھے۔ لٹا کر ذبح کرنا بڑا مشکل ہو جاتا تھا۔ وہ ذبح ہی ایسے کیا کرتے تھے۔ انہیں اسی طرح کہا کہ ان کو اس طرح سے ذبح کرو۔ **فَاِذَا وَجَبَتْ جُنُوْبُهَا فَكُلُوْا مِنْهَا وَاَطْعِمُوا الْقَانِعَ وَالْمُعْتَرَّ** (22:36)۔ جب وہ ذبح ہو کر کسی پہلوں پہ گر پڑیں تو ان کا گوشت خود بھی کھاؤ اور تکلیف زدہ اور ضرورت مندوں کو بھی کھلاؤ۔ یہ سب اس لیے ہے کہ **كَذٰلِكَ** (22:36)۔ یہ سب ہیں ہی اس مقصد کے لیے۔ آگے پھر وہی بات آ گئی کہ **سَخَّرْنٰهَا لَكُمْ** (22:36) انہیں ہم نے تمہارے تابع تسخیر کیا ہوا ہے۔ یہ کہیں بھی تمہارے دیوتا یا مقدس اصنام نہیں ہیں۔ یہ سب کچھ کاہے کے لیے ہے؟ کہا کہ **لَعَلَّكُمْ تَشْكُرُوْنَ** (22:36)۔ تاکہ تم (کھانے پینے کی طرف سے بے فکر ہو کر' اپنے بلند مقصد کے لیے) ایسی کوششیں کرو جو بھرپور نتائج مرتب کر سکیں۔ اب ہمارے ہاں تو پھر وہی ترجمہ کر دیا تاکہ تم شکر کرو۔ ❶ یہاں کہا ہے کہ یہ سب سامانِ زیست' کھانے پینے کا سامان' یعنی یہ جو کچھ ہم نے کہا ہے' یہ سب اس لیے ہے تاکہ مقصد کے حصول کے لیے تمہاری یہ کوششیں صحیح نتائج برآمد کر سکیں۔ شکر کے معنی ہوتا ہے بھرپور نتائج مرتب کرنا۔ ❶ اس حقیقت کو ایک مرتبہ پھر سمجھ لو کہ جانور تمہاری ضروریات پورا کرنے کے لیے ہیں۔ یہی ان کے اس موقع پر ذبح کرنے سے مقصود ہے۔ یہ اس لیے ہے کہ **لَنْ يَّنَالَ اللّٰهَ لُحُوْمُهَا وَلَا دِمَآؤُهَا** (22:37)۔ اللہ تک ان کا گوشت اور خون نہیں پہنچتا۔ لہٰذا کہیں یہ نہ سمجھ لیجیے گا کہ یہ بتوں کے آستان کے اوپر لا کے چڑھاوے چڑھا

---

❶ محیط المحیط میں ہے کہ اَلشُّكْرُ۔ اس مادہ کے اصل معنی بھر جانا اور اظہار کرنا ہیں۔ شَكَرَ فُلَانٌ۔ اس شخص نے دل کھول کر سخاوت کی اور لوگوں کو خوب دیا۔ صاحبِ تاج العروس (جناب محدب الدین الزبیدی الحنفی) کے نزدیک انسان کی طرف سے شکر کے معنی اطاعت وادائے فرائض نیز احسان مندی کے جذبات کا اظہار' اور خدا کی طرف سے شُكْرٌ کے معنی پورا پورا بدلہ دینا یا تھوڑے عمل کو بڑھا کر اجر دینا ہے۔ مثلاً اگر کوئی شخص اپنے آپ کو تنگی میں رکھ کر دوسرے کی تھوڑی سی مدد بھی کرتا ہے تو اس کی یہ قربانی' اس شخص کے مقابلہ میں زیادہ قیمتی ہوگی جو اپنی ضروریات سے زائد چیز دوسرے کو دے دے۔ ''تھوڑے عمل کا زیادہ اجر دینے'' کا یہ مطلب ہے۔ شکر ایسی کوشش جس کے بھرپور نتائج سامنے آ جائیں۔ ایسے بھرپور جیسے بقول صاحب تاج العروس ضَرَّةٌ شَكْرٰی بکری کے تھن دودھ سے بھرے ہوئے ہوں۔

رہے ہیں' قربانیاں کر رہے ہیں اور اللہ تعالیٰ ان کے خون سے' ان کے گوشت سے' خوش ہوگا۔ نہیں' بالکل نہیں۔ اس قسم کی کوئی بات نہیں ہے۔ **وَلٰکِنۡ یَّنَالُهُ التَّقۡوٰی مِنۡکُمۡ** (22:37)۔ اس کے ہاں تو صرف دیکھا جاتا ہے کہ تم اس کے قوانین کی کس حد تک نگہداشت کرتے ہو اور کس طرح نگہداشت کرتے ہو۔

دو دیوتاؤں کے باہمی معاملہ میں بے نطق و بے ہاتھ مجبور کی بے بسی

عزیزانِ من! خدا کو گوشت اور خون کی ضرورت نہیں ہے۔ اس کے نزدیک تو صرف یہ دیکھنا مقصود ہے کہ تم اس کے قوانین کی نگہداشت کس حد تک کرتے ہو۔ اس لیے قرآن میں بار بار آتا ہے کہ **کَذٰلِکَ سَخَّرَهَا** (22:37)۔ **سَخَّرَهَا** بار بار کہا ہے۔ مذہب میں پہنچ کے چڑھاوے کے یہی جانور سانڈھ دیوتا بن جاتے ہیں اور مقدس ہو جاتے ہیں اور پھر ان کو کوئی چھوتا تک نہیں' چھیڑتا تک نہیں۔ آپ کو یاد ہے جو میں نے سنایا تھا کہ مقدس ہونے میں مصیبت پڑ جاتی ہے۔ ہندوؤں کے ہاں سانڈھ بھی دیوتا ہوتا ہے۔ پیپل بھی دیوتا ہوتا ہے۔ لالہ جی نے دیوتا کے درشن کرنے کے لیے کہیں جانے کی بجائے اپنے ہی ہاں ایک طرف پیپل کا چھوٹا سا پودا لگا دیا اور گھر کے نوکر کو یہ کہہ دیا کہ اس کی حفاظت رکھنا کہ کہیں کوئی جانور اس کو کھا ہی نہ جائے۔ تو ایک دن اس نے دیکھا کہ وہ ٹنڈ منڈ ہو گیا ہے۔ اس نے بہت غصے میں نوکر سے کہا کہ تو نے یہ کیا کیا؟ تمہیں تو اس مقصد کے لیے تنخواہ دیتا ہوں کہ اس کی حفاظت کرو۔ تم کہاں چلے گئے تھے؟ وہ کہنے لگا کہ جی! گیا تو کہیں نہیں تھا۔ تو لالہ جی کہنے لگے کہ پھر یہ سب کچھ تیرے سامنے ہوا اور تو دیکھتا رہا۔ وہ کہنے لگا کہ جی' کیا کرتا' اِدھر سے سانڈھ دیوتا جی آئے' انہوں نے آ کے اسے منہ مارا۔ اور سانڈھ بھی دیوتا' پیپل بھی دیوتا' میں کسے مارتا؟ دیوتا کو تو کچھ نہیں کہا جا سکتا۔ یہ تو دو (2) دیوتاؤں کا باہمی معاملہ تھا۔ میں بے نطق و بے ہاتھ رہا۔ عزیزانِ من! کبھی سوچا کسی نے کہ اس سورۃ کی ان آیتوں میں ہر آیت کے آخر میں **سَخَّرَهَا** آتا ہے۔ کہا ہے کہ یہ جانور دیوتا نہیں بن جاتے۔ انہیں تو تمہارے لیے مسخر کیا گیا ہے۔ یہ تمہارے تابع تسخیر ہیں۔ کاہے کے لیے انہیں مسخر کیا ہے؟ اب لیجیے' پھر وہی بات آ گئی۔ اچھی بات ہے کہ یہ ساری کائنات ہمارے زیرِ تسخیر ہے۔ کوئی ہمارے اوپر نہیں' کوئی ہمارے سے اونچا نہیں' جس کو جی چاہے لتاڑ و' جس کو جی چاہے ذبح کرو' موج ہو گئی لیکن قرآن کہتا ہے کہ موج نہیں ہو گئی **سَخَّرَهَا لَکُمۡ** (22:37)۔ تمہارے لیے تو تمام کائنات بمعہ ان جانوروں کے مسخر کر دی ہے۔

پوری کائنات زیرِ تسخیر لیکن کس مقصد کے لیے؟

عزیزانِ من! قرآن کہتا ہے کہ تسخیرِ کائنات کا ایک مقصد ہے۔ اسے اس کے لیے کام میں لاؤ۔ اور وہ ہے کہ **لِتُکَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰی مَا هَدٰکُمۡ** (22:37)۔ تا کہ تم خدا کے ضابطۂ قوانین کو' جس سے اس نے تمہاری راہنمائی کی ہے' دنیا کے تمام قوانین وضوابط پر غالب کر سکو' تا کہ تم خدا کی بڑائی کو بروئے کار لاؤ۔ یہ ہے مقامِ انسانیت۔ ساری خدائی اس کے تابع تسخیر ہے۔ بہت بڑا مقام ہو گیا لیکن

یہ سب کس کے لیے ہے؟ اس لیے نہیں کہ تم دنیا میں فرعون اور نمرود بن جاؤ۔ لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰكُمْ (22:37)۔ یہ جو تمہیں ہم نے راہ نمائی دی ہے اس کی بنا پر خدا کا غلبہ اور اس کی کبریائی دنیا کے اندر مسلط کرو۔ یہ ہے اس کا مقصد۔ یہ اس لیے ہے کہ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ (6:153)۔ تا کہ تم ان احکام کو زندگی کے ہر گوشے میں اپنے سامنے رکھ سکو۔ اس کا کیا نتیجہ ہے؟ کہا کہ لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ (22:37)۔ تا کہ تم خدا کے ضابطہ حیات کو دنیا کے تمام قوانین وضوابط پر غالب کر سکو۔ میں نے آپ سے کہا تھا کہ یہ جواب ہمارے ہاں رسمِ اذاں صرف رسم بن گئی کہ ذبح کرتے وقت تکبیر کہنا ضروری ہوتا ہے۔ وہ کیا رہ گیا ہے بس یہ کہ بسم اللہ' اللہ اکبر۔ ''اے وی جیہدا جی کہوے تے کیہہ دوے ورنہ اوحساب ای کردا ہونداسی۔''❶ یہ جو کمیلے ❷ میں ذبح کرنے والا ہوتا ہے اور ''وہاں ہر جانور دا ریٹ مقرر ہوندا۔ اے تے اوئنال دیکھیا کردا تریا جاندا ہیگا۔''❸ عزیزانِ من! آپ نے دیکھا کہ مذہب میں رسم کیسے بنتی ہے۔ یہ تکبیر کا تصور یہاں سے آیا ہے کہ لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ (22:37)۔ یہاں اس سے آ گیا کہ اللہ کا نام لو اور تکبیر بسم اللہ' اللہ اکبر ہو گئی۔ دونوں ہی آ گئے۔ یہاں تکبیر بھی آ گئی اور اللہ بھی آ گیا۔ کہا کہ یہ سارا اس لیے تھا کہ اللہ کی حاکمیت اعلیٰ کو قائم کرو۔ لِتُكَبِّرُوا اللّٰهَ عَلٰى مَا هَدٰكُمْ (22:37)۔ یہ تمام ہدایات تمہیں اس لیے دی گئیں' ان کو مسخر اس لیے کیا گیا ہے کہ خدا کی کبریائی کو دنیا کے اندر مسلط کرو۔ وَ بَشِّرِ الْمُحْسِنِيْنَ (22:37)۔ اور جو لوگ اس طرح سے زندگی میں توازن برقرار رکھتے ہیں ان کو خوشخبریاں دو۔ وہ کائنات میں توازن برقرار رکھتے ہیں اور اس کے علاوہ کسی کے سامنے نہیں جھکتے۔ ان کا یہ مقام ہوا لیکن یہاں یہ نہیں ہے کہ وہ اکڑ کر یوں ہو گئے' تکبر سے ان کی گردن تن گئی۔ کہا کہ قطعاً نہیں توازن ہے۔ اسے احسان کہتے ہیں۔ توازن رکھنے میں جہاں کمی ہوتی ہے اسے پورا کر دیا جاتا ہے۔ ایسا کرنے والا ہی محسن ہوتا ہے۔ کہا کہ یہ کچھ کرو گے۔ نتیجہ اس کا کیا نکلے گا؟ کہا کہ اِنَّ اللّٰهَ يُدٰفِعُ عَنِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا (22:38)۔ یہ کرو گے تو پھر دنیا میں کوئی قوت تمہارا بال بیکا نہیں کر سکے گی کیونکہ قرآن نے کہا کہ اِنَّ اللّٰهَ يُدٰفِعُ (22:38)۔ ہم تمہاری حفاظت کریں گے۔ ہم تمہیں تمہارے دشمنوں کی دسترس سے دور رکھیں گے۔

کروڑ ہا کروڑ مسلمان اور ان کے درمیان اتنا سا اسرائیل: آخر غلطی کہاں ہے؟

عزیزانِ من! میں نے کہا تھا کہ گزشتہ بیس پچیس ❹ سال سے یہ کروڑ ہا کروڑ مسلمانوں' خالص مسلمانوں اور عربوں کی آبادی کے اندر' اتنا سا اسرائیل کا ناسور ہے۔ حج کے موقعہ پر اس کے خلاف دعائیں مانگی جاتی ہیں۔ حج کرنے والوں کی تعداد میں تو ہر سال دو دو تین

---

❶ یہ بھی جس کا جی چاہے تو کہہ دے' ورنہ وہ تو (ذہن میں) حساب کتاب ہی کرتا رہتا ہے۔

❷ کمیلا۔ (ہندی زبان کا لفظ ہے)۔ مذبح۔ بوچڑ خانہ۔ ذبح خانہ۔

❸ وہاں (ذبح خانے میں) ہر جانور (کو ذبح کرنے) کا نرخ مقرر ہوتا ہے۔ وہ تو حساب کرتا ہوا جانور ذبح کرتا چلا جاتا ہے۔

❹ یہ کچھ 1977ء کے پہلے ہی ماہ کی دو تاریخ کو کہا جا رہا ہے۔

تین لاکھ ❶ کا اضافہ ہو جاتا ہے۔ حج میں اور پھر خاص طور پہ عرفات کے میدان میں حج کے بعد یا حریمِ کعبہ میں دعاؤں پہ دعائیں مانگی جا رہی ہیں: ''یا اللہ اسرائیل دا بیڑہ غرق کر' اینوں تباہ کر دے۔'' ❷ یہ سارا کچھ ہے مگر وہ اسرائیل ہے کہ بڑھتا چلا جا رہا ہے۔ یہاں کہا تھا کہ اگر تم حج میں یہ کچھ کر لو گے تو تمہاری مدافعت ہمارے ذمہ ہو جائے گی۔ عزیزانِ من! یہ تو وہ وثن ہے جمود ہے کہ جو کچھ ہوتا چلا آ رہا ہے وہی کچھ ہم کرتے چلے جا رہے ہیں۔

آخر حفاظت کے سلسلہ میں خدا کا یہ فرمان کیوں پورا نہیں ہوتا؟

عزیزانِ من! اگر یہ مسلمانوں کا جم غفیر کسی ایک تقریبِ حج پہ بھی کھڑا ہو کر سوچتا کہ اس نے تو کہا تھا کہ یہ کچھ کر لو گے تو تمہاری حفاظت ہم کریں گے اور یہاں تو ہم کروڑوں کی تعداد کے اندر سارے مل کے بھی اتنوں کے سامنے ہماری حفاظت نہیں ہو رہی ہے۔ چیخ رہے ہیں' اسرائیل کے ہاتھوں رو رہے ہیں تو کہیں کوئی نقص ہے مگر وثن' جمود' سکوت' سوچنے نہیں دیتا۔ پھر ہر اگلے سال' اسی طرح سے حج ہوتا چلا جا رہا ہے' سال بھر اسی طرح سے عمرہ ہوتا چلا جا رہا ہے' اسرائیل کی خطرناک قوتیں بڑھتی چلی جا رہی ہیں۔ یہ ذمہ داری تو خدا نے اپنے اوپر لی ہے کہ اِنَّ اللّٰـهَ يُدٰفِعُ عَنِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا ہم حفاظت کریں گے۔ صرف ان کی جو ہمارے ضابطہ حیات پر ایمان لاتے ہیں' مگر اِنَّ اللّٰهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ خَوَّانٍ كَفُوْرٍ (22:38)۔ جو لوگ فلاح و بہبود انسانیت کے امین نہیں' جن پر کسی صورت میں اعتماد نہیں کیا جا سکتا اور جو نظامِ خداوندی کی صداقت سے بہ شد و مد انکار کرتے ہیں وہ خدا کے نزدیک کیسے پسندیدہ ہو سکتے ہیں؟ اس لیے یاد رکھو! جو غرض و غایت کا ہی انکار کر دے اور جن کی ان رسوم کی ادئیگی کے بعد ان کے اوپر اعتماد ہی نہ کیا جا سکے' یہ لوگ اس کے ہاں پسندیدہ نہیں ہیں۔ یہاں انہیں خَوَّانٍ ❸ كَفُوْرٍ (22:38) کہا ہے اور یہ کچھ کہنے کے بعد' عزیزانِ من! غور کیجیے پہلی دفعہ قرآن میں یہ آیت آئی ہے جہاں مسلمانوں کو جنگ کی اجازت دی گئی ہے۔ اُذِنَ لِلَّـذِيْنَ يُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا (22:39)۔ یہی وجہ ہے کہ ان لوگوں (یعنی جماعت مومنین) کو جن پر مخالفین کی طرف سے اس قدر مظالم توڑے گئے ہیں اور جن کے خلاف اب وہ میدانِ جنگ تک اتر آئے ہیں' دشمن کا مقابلہ کرنے کے لیے جنگ کی اجازت دی جاتی ہے۔ یہ ساری تیاریاں اس طرح سے کرنے کے بعد کہا کہ ہاں' اب

---

❶ یہ کچھ 1977ء کے پہلے ہی ماہ کی دو تاریخ کو کہا جا رہا ہے۔

❷ یا اللہ! اسرائیل کا بیڑا غرق کر دے۔ اسے تباہ و برباد کر دے۔

❸ تاج العروس میں ہے کہ خَانَ' يَخُوْنُ' خَوْنًا سے مراد یہ ہوتی ہے کہ جس شخص کو امانتدار سمجھا جائے وہ اپنی امانت اور عہد کا پاس نہ کرے۔ یہ دراصل اعتماد اور بھروسہ کو ضائع کر دینے کا نام ہے۔ چنانچہ کہتے ہیں کہ خَانَ الدَّلْوَ الرِّشَاءُ رسی نے ڈول سے وفا نہ کی اور درمیان سے ٹوٹ گئی جس کے سبب ڈول کنویں میں گر گیا اس لیے خَــوَّانٍ ہر ایسے شخص کو کہہ سکتے ہیں جس پر اعتماد اور بھروسہ نہ کیا جا سکے اور وہ دشمن بھی جو تمہاری حالت میں خرابی پیدا کرنے کی کوشش کرے۔

تمہیں اجازت دی جاتی ہے کہ تم بھی اب ان مخالفین کے خلاف میدانِ جنگ میں آ جاؤ گے کیونکہ **بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا** (22:39)۔ان لوگوں کے اوپر جن کو ہم اجازت دے رہے ہیں بڑے مظالم کیے ہیں۔ **وَاِنَّ اللّٰهَ عَلٰى نَصْرِهِمْ لَقَدِيْرُ** ۨ (22:39)۔ اللہ ان مظلوموں کی مدد کرنے پر پوری قدرت رکھتا ہے۔یعنی اب وہ وقت آ گیا ہے جو ہم کہیں گے کہ ہم ان کی نصرت کے اوپر قادر ہیں۔ یہ تو یہ کر لیں گے تو پھر، عزیزانِ من! بات اسی ضمن میں آ گے چلتی جا رہی ہے لیکن جیسا میں نے عرض کیا تھا کہ میں تھک گیا ہوں آ گے ہمت نہیں پڑ رہی۔ اس لیے، آج کے لیے، آپ سے اتنا ہی وقت لیتا ہوں۔ہم آیت 39 تک آ گئے ہیں، چالیس آیت سے آئندہ لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ط اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ط

❀❀ ...... ❀❀❀ ...... ❀❀

پانچواں باب: **سورۃ الحج** (آیات 39 تا 41)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

قَالَ رَبِّ بِمَآ اَغۡوَیۡتَنِیۡ لَاُزَیِّنَنَّ لَہُمۡ فِی الۡاَرۡضِ وَ لَاُغۡوِیَنَّہُمۡ اَجۡمَعِیۡنَ ﴿۳۹﴾ اِلَّا عِبَادَکَ مِنۡہُمُ الۡمُخۡلَصِیۡنَ ﴿۴۰﴾ قَالَ ہٰذَا صِرَاطٌ عَلَیَّ مُسۡتَقِیۡمٌ ﴿۴۱﴾

عزیزانِ من! آج جنوری 1977ء کی 9 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ الحج کی آیت 39 سے ہو رہا ہے: (22:39)۔

اپنے تمام اعمال کو نتائج کے ترازو میں تولنا ہوگا

آپ کو یاد ہوگا کہ سابقہ آیات میں حج کے اجتماع کی تفصیل چلی آ رہی تھی۔ میں بار بار یہ بیان کر چکا ہوں کہ قرآنِ کریم میں جتنے بھی اصول، قوانین یا احکام دیئے ہیں، ان کے ساتھ یہ بھی بتا دیا ہے کہ ''اگر یہ کرو گے تو اس کا یہ نتیجہ نکلے گا۔'' اس کی اہمیت یہ ہے کہ اگر ہم بزعمِ خویش قرآن کے کسی حکم کی واقعی تعمیل کریں تو اس کے بعد یہ دیکھنے کے لیے کہ واقعی اس حکم کی تعمیل، منشائے خداوندی کے مطابق ہوگئی ہے یا نہیں، تو اس کے لیے ایک محسوس معیار ہے۔ یہ نہیں ہے کہ ہم اپنے آپ کو تسلی دے لیں کہ ہاں صاحب! تعمیل ہوگئی، حاجیوں کا حج قبول ہو گیا، تیری نماز ہو گئی۔ یہ خود فیصلہ کرنے کی بات ہی نہیں ہے جس طرح جب بچے حساب کا سوال نکالتے ہیں تو اس کے بعد یہ ان کے اپنے فیصلہ کرنے کی بات نہیں ہوتی کہ جواب صحیح آیا ہے یا نہیں۔ کتاب دینے والے نے وہ جواب لکھا ہوتا ہے، اسے یہ دیکھنا ہوتا ہے کہ میرا یہ جواب اس کے ساتھ ملتا ہے یا نہیں۔ اگر ہر بچے کو یہ اجازت ہو کہ سوال نکالنے کے بعد جو بھی جواب آئے، وہ خود ہی سمجھ لے، اپنا اطمینان کر لے کہ جی، ٹھیک ہے تو اس کا نتیجہ وہ ہوگا جو آج آپ کی امت میں ہو رہا ہے کہ ہر ایک کا جواب صحیح ہے۔ اسی لیے تو قرآن نے کہا تھا کہ **كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ** (30:32)۔ ہر فرقہ سمجھتا ہے کہ جس طریق پر ہم چل رہے ہیں، وہی حق و صداقت کی راہ ہے اس لیے وہ اپنے آپ میں مگن ہو کر بیٹھ جاتا ہے۔ اصل تو یہ ہے کہ ہم نے اس ٹکڑے پہ کبھی غور ہی نہیں کیا کہ اس کے معنی کیا ہیں۔ پھر اس صورت میں اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ امت کا ہر بچہ اپنے اپنے جواب سے مطمئن ہو جاتا ہے کہ میں ٹھیک ہوں۔ دینِ خداوندی کی

بنیادی خصوصیت یہ ہے کہ اس نے اپنے ہر فارمولے کا نتیجہ، اپنے ہر حکم کا ایک محسوس نتیجہ، خود ہی بتا دیا ہے کہ آپ اپنے ہی ذہن میں طے کر کے مطمئن ہو کر نہ بیٹھ جائیں کہ کام مکمل ہو گیا الحمد للہ۔

عزیزانِ من! حج کی آیات چلی آ رہی ہیں اور ان آیات کے آخر میں آیت ہے کہ **اِنَّ اللّٰـهَ يُدٰفِعُ عَنِ الَّـذِيْنَ اٰمَنُوْا** (22:38)۔ خدا جماعتِ مومنین کی حفاظت اور مدافعت کرے گا۔ اس آیت میں یہ جو **عَـنِ الَّـذِيْـنَ** ہے، سوال یہ ہے کہ یہ کن سے خطاب ہے؟ پھر انہی الفاظ کے آگے یہ لکھا ہے کہ **اِنَّ اللّٰـهَ لَا يُحِبُّ كُلَّ خَوَّانٍ كَفُوْرٍ** (22:38)۔ جو لوگ فلاح و بہبودِ انسانیت کے امین نہیں، اُن پر کسی صورت میں اعتماد نہیں کیا جا سکتا اور جو نظام خداوندی کی صداقت سے بہ شد و مد انکار کرتے ہیں وہ خدا کے نزدیک کبھی پسندیدہ نہیں ہو سکتے۔

حقائق اور صداقتوں کو تسلیم نہ کرنے والے تباہ ہو جائیں گے

عزیزانِ من! وہ اشخاص جو تمہاری ان صداقتوں کا انکار کریں اور تمہاری خوشگواریوں کی جو حالت ہے، وہ انہیں بھی دیکھ نہ سکیں بلکہ یہ چاہیں کہ ان کو تبدیل کر کے تمہیں پھر ذلیل و خوار کر دیا جائے، تو ان سے خدا تمہاری مدافعت کرے گا، تمہیں محفوظ رکھے گا۔ اب اگر جو کچھ پیچھے حج کے متعلق کہا جا رہا ہے کہ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ آپ دنیا کی ہر اس قوم سے، ہر اس گروہ سے، ہر اس جماعت سے، جو آپ کی تخریب کے درپے ہے، اس سے محفوظ رہو گے تو پھر تو یہ حج خدا کی منشاء کے مطابق ہوا۔ اگر یہ نہیں ہے تو اس کے بعد دو ہی صورتیں ہونگی: یا تو یہ کہ معاذ اللہ خدا کا یہ جو کہا ہوا ہے، یہ غلط ہے...... معاذ اللہ...... وہ تو کہہ رہا ہے کہ **اِنَّ اللّٰـهَ لَا يُـخْلِفُ الْمِيْعَادُ** (3:8)۔ خدا کے قانون کے مطابق ہو گا اور خدا کے قوانین اٹل ہیں۔ **وَعْـدَ اللّٰهِ حَقًّا** (4:122)۔ خدا کا وعدہ ہے جو ٹھوس حقیقت بن کر سامنے آ جائے گا اور خدا سے بڑھ کر بات کا سچا کون ہو سکتا ہے؟ ہم کبھی وعدہ خلافی نہیں کرتے۔ ہماری ہر بات ہو کر رہتی ہے اور یا پھر دوسری بات یہ کہ وہ حج منشائے خداوندی کے مطابق نہیں ہے۔

ہمارا مروّجہ حج اور اس کا نتیجہ

عزیزانِ من! آپ یہی کہیں گے کہ نہیں، دیکھیے تو سہی، حج ان تمام ارکان و تعدیل و مناسک و شعائر و رسوم کے مطابق ہوتا ہے، جو ہمیں بتائے جاتے ہیں، جو کتابوں میں لکھے ہوئے ہیں، جو حج کرانے والے ہمارے ساتھ ساتھ پھر رہے ہوتے ہیں وہ جو کچھ کہتے ہیں، ہم کرتے ہیں، وہ جو الفاظ کہتے ہیں ہم بولتے ہیں اور اس کے بعد پھر عرفات کے میدان کے اندر بشارت مل جاتی ہے کہ حج قبول ہو گیا۔ تو ہمارے حج کے صحیح ہونے میں تو کوئی شبہ نہیں، پھر بھی ہماری حفاظت نہیں ہو رہی۔ ہم تو اسی عرفات کے میدان میں بیٹھے ہوئے ہیں، چیخ بھی رہے ہوتے ہیں کہ دنیا بھر کی قوتیں ہمارے درپے تخریب ہیں، ہم غیر محفوظ ہیں، ہم اپنی حفاظت نہیں کر سکتے، یہ سب کچھ کہہ رہے ہوتے

ہیں۔ پھر سوال یہ ہے کہ اگر حج کی قبولیت کی بشارت مل رہی ہوتی ہے تو پھر یہ چیز کیا ہوئی جو خدا نے یہ کہہ دیا ہے کہ خدا اہلِ ایمان کی حفاظت اور مدافعت کرے گا اور یہ بھی کہ خدا کبھی وعدہ خلافی نہیں کرتا' اس کی ہر بات ہو کر رہتی ہے۔ تو اب دونوں میں سے ایک ہی بات صحیح ہوسکتی ہے کہ یا تو یہ بات ہے کہ یہ خدا کے جو وعدے ہیں' یہ قرآنِ کریم نے برائے وزنِ بیت کہہ دیا ہے: ٹھیک ہے کہہ دیا ہے اس نے ......معاذ اللہ......عملاً ہم یہی کہتے ہیں' حج صحیح ہو رہا ہے جبکہ ہماری سیکورٹی' ہماری حفاظت کا سامان بھی نہیں ہو رہا یعنی اس طرح تو عملاً ہم یہ مانتے ہیں کہ خدا کے یہ وعدے یا یہ جو کچھ اس نے ہمیں گارنٹی دی تھی' یہ Surety' یہ ضمانتیں' یہ بس ٹھیک ہے'' کہہ ہی دیا ہوا ہے بس۔'' شاعروں کی طرح عملاً ہم یہی مان رہے ہیں۔

منشائے خداوندی کے مطابق حج کا نتیجہ کیوں نہیں نکل رہا؟

عزیزانِ من! انہیں بڑا غصہ آتا ہے جب ان سے کہا جائے کہ درحقیقت ہمارا قرآن پہ ایمان نہیں ہے' خدا پر ایمان نہیں ہے۔ اب اس کے برعکس دوسرا نتیجہ یہی ہوسکتا ہے کہ نہیں صاحب! ہمارا یہ حج وہ حج نہیں جس کا نتیجہ یہ ہونا تھا۔ اگر کہیں ایک دفعہ بھی حج یا سال بھر میں کسی وقت بھی اس آیت پر ایمان آ جائے تو پھر اگلے سال کے حج سے پہلے تو بیٹھ کے یہ سوچے کہ حج تو وہ قبول ہوگا جس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ دنیا کی ہر تخریب کار قوم کے مقابلے میں ہماری مدافعت ہوگی' ہماری حفاظت ہوگی۔ اگر حج کا یہ نتیجہ ہے' تو حج منشائے خداوندی کے مطابق ہو رہا ہے۔ اگر یہ نتیجہ نہیں ہے تو آپ بیٹھ کے سوچیں کہ کہاں غلطی ہے؟

مذہب انسان کو ہمیشہ فریب دیتا ہے

مذہب یونہی فریب دیتا ہے۔ وہ یہ سوچنے ہی نہیں دیتا کہ اگر ہمارا حج صحیح ہے تو پھر ہماری حفاظت کیوں نہیں ہو رہی' ہم کیوں ذلیل وخوار ہیں۔ وہ جن کے ہاں کروڑ ہا کروڑ روپیہ چلا جاتا ہے وہ ان دس بیس لاکھ حاجیوں کو سوچنے ہی نہیں دیتا۔ وہ ان کے کان میں کہہ دیتے ہیں کہ اس سے ثواب ہوتا ہے' قیامت میں جا کر نجات ہوتی ہے۔ یہ آپ کا ایک ذہنی اطمینان ہے حالانکہ اس نے تو کہا تھا کہ اِنَّ اللّٰہَ یُدٰفِعُ عَنِ الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡا ؕ اِنَّ اللّٰہَ لَا یُحِبُّ کُلَّ خَوَّانٍ کَفُوۡرٍ (22:38)۔ جو جماعتِ مومنین ایسا کرتی رہے گی' اللہ انہیں ان کے دشمنوں کی دسترس سے محفوظ رکھے گا۔ اس لیے کہ جو لوگ فلاح و بہبودِ انسانیت کے امین نہیں' جن پر کسی صورت میں اعتماد نہیں کیا جا سکتا اور جو نظامِ خداوندی کی صداقت سے بہ شدومد انکار کرتے ہیں' وہ خدا کے نزدیک پسندیدہ نہیں ہوسکتے۔ قرآن یہ یہاں کی بات کہہ رہا ہے' وہاں اگلی دنیا میں ہمیں مدافعت کی ضرورت کیا پڑے گی۔ وہاں قیامت کے میدان میں بھی اے ڈنڈا لے کے ساڈے پیچھے آ رہن گے کہ اسی دہائی دین ڈئے ہون گے کہ اللہ میاں کہے گا اوئے آ جاؤ' ساڈے تخت دے تھلے' ایتھے آ جاؤ۔ [1] وہاں مدافعت کے معنی کیا ہوں

---

[1] وہاں میدانِ حشر میں یہ ہمارے پیچھے لٹھ لیے پھر رہے ہوں گے۔ ہم آہ وفغاں کر رہے ہوں گے کہ اللہ کہے گا کہ جلدی سے میرے تخت کے نیچے آ جاؤ۔

گے مذہب یہ سوچنے ہی نہیں دیتا۔

سر پھٹول ہر مذہب کا لازمی نتیجہ ہے

عزیزانِ من! ہر مذہب ایک دوسرے کے ساتھ سر پھٹول میں بھی مصروف ہے اور ہر مذہب والا اپنی اس قسم کے رسوم ومناسک ادا کر کے مطمئن ہو جاتا ہے کہ مکتی ہو گئی' Salvation ہو گئی' نجات ہو گئی' ثواب ہو گیا۔ وہ ہر زور کی یاترا ہو یا وہ یروشلم کی زیارت ہو یا آپ کے حج کا بھی یہ Pilgrimage (زیارت کے لیے جانا) ہو' آپ سب اس سے کچھ کم مطمئن نہیں ہوتے! یہ تو وہی بات ہے جو قرآن کریم نے کہا تھا کہ فرقوں یا پارٹیوں میں بٹ جانے کے بعد حالت یہ ہو جاتی ہے کہ **كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ** (30:32)۔ ہر فرقہ سمجھتا ہے کہ جس طریق پہ ہم چل رہے ہیں' وہی حق وصداقت کی راہ ہے اس لیے وہ اپنے آپ میں مگن ہو کر بیٹھ جاتا ہے۔ یہ بات صرف مسلمانوں تک محدود نہیں ہے۔ ان کے ہاں بھی کبھی دین تھا جنہیں ہم اہلِ مذاہب کہتے ہیں۔ ان کے انبیاء بھی دین ہی لائے تھے۔ وہ بھی حج اسی قسم کا ہی لائے تھے جس کا نتیجہ قرآن نے یہ بتایا ہے۔ جب دین مذہب میں تبدیل ہوا ہے تو پھر حج' یاترا اور Pilgrimage (زیارت کے لیے جانا) میں تبدیل ہو گیا جس طرح ہمارا دین مذہب میں تبدیل ہو گیا۔

حج کسی یاترا کا نام نہیں تھا

عزیزانِ من! آج دین مذہب میں تبدیل ہو کر یہ کچھ بن چکا ہے۔ اب حج کر کے' ہر کوئی اپنے ہاں کے اس اجتماع سے مطمئن ہو کر گھر آ جاتا ہے کہ مکتی ہو گئی۔ جناب ٹھیک ہے کہ اسی طرح سے آپ کا اطمینان ہو گیا۔ غیر مسلم تو پھر بھی ایک حد تک قابلِ معافی ہیں۔ ان کے ہاں یہ آیت نہیں ہے کہ **اِنَّ اللّٰهَ يُدٰفِعُ عَنِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا** (22:38)۔ جو جماعتِ مومنین ایسا کرتی رہے گی' اللہ انہیں اُن کے دشمنوں کی دسترس سے محفوظ رکھے گا۔ غیر مسلم کی کتاب میں یہ آیت نہیں ہے اس لیے وہ اگر اپنے آپ کو اس فریب میں رکھتے ہیں یا مگن رہتے ہیں یا چلے آ رہے ہیں' تو بہر حال ان کے Behalf (کی طرف سے) اگر وکالت کی جائے تو ان سے کہا جائے گا: وہاں پوچھا ہی نہیں جائے گا' ان کے لیے تو میزان ہی کھڑی نہیں ہو گی لیکن ہم اس سے نہیں بچ سکتے۔ ہمارے ہاں تو خدا کی کتاب قرآنِ کریم بعینہ اسی صورت میں محفوظ ہے جس صورت میں رسولِ اکرم ﷺ ہمیں دے گئے تھے۔

نبی اکرم ﷺ کی روزِ قیامت شکایت: میری قوم نے قرآن کو چھوڑ دیا

عزیزانِ من! ہمارے لیے تو قرآنِ کریم میں ایک ہی فقرہ ہے جس سے ہماری حالت' ہمارے اعمال' ہمارے کام جھلکتے ہیں۔ جب ہم اس حالت میں آئیں گے تو قرآن میں ہے کہ وہاں خدا کا رسول ﷺ آواز دے گا کہ **يٰرَبِّ اِنَّ قَوْمِي اتَّخَذُوْا هٰذَا الْقُرْاٰنَ مَهْجُوْرًا** (25:30)۔ اے میرے نشو ونما دینے والے! یہی ہے میری وہ قوم' یہی ہے میری طرف اپنی نسبت کرنے والی وہ

قوم! جس نے اس قرآن کو چھوڑ دیا تھا' جس نے اس قرآن کو [1] اپنے خود ساختہ معتقدات کی رسیوں سے' اس طرح جکڑ دیا تھا کہ یہ آزادی سے دو قدم بھی چلنے کے قابل نہیں رہا تھا۔ انہوں نے اپنے آپ کو اس کے تابع رکھنے کے بجائے اسے اپنے مسلک و مشرب کے تابع رکھ چھوڑا تھا۔ عزیزانِ من! اس کے بعد تو میزان کھڑی کرنے کی ضرورت ہی باقی نہیں رہ جاتی۔ یہ تمہاری یہاں کی خود فریبیاں ہیں کہ حج قبول ہو گیا ہے۔ تو وہ حج تو وہاں کام ہی نہیں دے گا۔ اِس ایک ہی فقرہ نے بات صاف کر دی۔ یہ قرآن میں ہے کہ رسول اللہ ﷺ یہ جملہ اس قوم کے خلاف کہیں گے۔ عزیزانِ من! رسول ﷺ کہیں گے کہ اے رب! **اِنَّ قَوۡمِی اتَّخَذُوۡا ھٰذَا الۡقُرۡاٰنَ مَھۡجُوۡرًا** (25:30)۔ میری اس قوم نے قرآن چھوڑ دیا تھا۔ کیا بات ہے! کہ قرآن چھوڑ دیا تھا۔ آج یہ قوم قرآنِ کریم کو چھوڑی ہوئی ہے۔ یہ آیت چھوڑی ہوئی ہے۔ حج کی تمام تفاصیل' جو سورۃ حج میں' اتنے رکوع میں چلی آ رہی ہیں اگر اس قوم نے قرآن چھوڑا نہ ہوتا تو پہلی ہی بار' جب ادھر سے خطرہ محسوس ہوتا' وہاں کھڑے ہو جاتے کہ اس نے تو حج کے منشا و مقصد کے بارے میں یہ کچھ کہا ہوا ہے۔ دوسری بار اجتماع میں آتے ہی نہیں جب تک یہ نہ ہو جاتا' وہاں سے ہٹتے ہی نہیں۔ اِدھر تو قرآنِ کریم نے یہ کہا کہ رسول اللہ ﷺ ایک ہی آواز دیں گے کہ یہ ہے میری قوم کہ **اتَّخَذُوۡا ھٰذَا الۡقُرۡاٰنَ مَھۡجُوۡرًا** (25:30)۔ جس نے قرآن کو چھوڑ دیا تھا۔

رسولِ خدا ﷺ کی ایک ہی آواز: سوچا کرو

عزیزانِ من! رسول اللہ ﷺ نے ایک دوسری جگہ فرمایا کہ **اِنَّمَاۤ اَعِظُکُمۡ بِوَاحِدَۃٍ** (34:46)۔ میں تم سے ایک ہی بات کہنا چاہتا ہوں' صرف ایک بات۔ کوئی لمبی چوڑی بحث نہیں کرنا چاہتا' نہ ہی کوئی طول طویل لیکچر (درس) دینا چاہتا ہوں۔ میں تم سے صرف ایک بات کہنا چاہتا ہوں لیکن یہ بات بھاگتے دوڑتے چلتے ہوئے سننے کی نہیں ہے۔ یہ بڑی اہم بات ہے جو میں کہنا چاہتا ہوں: اَنۡ

---

[1] اَلۡھَجۡرُ۔ اَلۡھِجۡرَانَ۔ کسی چیز کو چھوڑ دینا' ترک کر دینا' قطع تعلق کر لینا۔ اسی سے ھَاجِرَاتٌ ہے' بری اور فحش باتیں۔ تاج العروس میں ہے کہ ایسی باتیں جنہیں ترک کر دینا چاہیے۔ بعض کے نزدیک تَھۡجُرُوۡنَ کے معنی بکواس کرنا ہیں۔ نیز تاج العروس ہی میں یہ ہے کہ جو گائے یا بھینس دوڑ جاتی ہو' اس کے پاؤں کے ساتھ ایک رسی باندھ دیتے ہیں اور اسی کا دوسرا سرا اس کے سینگ کے ساتھ (یا گلے میں) باندھ دیتے ہیں لیکن رسی اتنی چھوٹی رکھتے ہیں کہ جانور کا سر بہت جھکا رہتا ہے۔ وہ اس طرح یوں جکڑا جاتا ہے کہ آزادی سے ایک قدم بھی نہیں اٹھا سکتا۔ عرب گھوڑوں اور اونٹوں کو اسی طرح جکڑ کر باندھ دیتے تھے۔ اس طرح بندھے ہوئے جانور کو مَھۡجُوۡرٌ کہا جاتا ہے۔ اَلۡھِجَارُ اس رسی کو کہتے تھے جس سے انہیں اس طرح جکڑا جاتا تھا۔ پرویزؒ نے اپنی لغات القرآن جلد چہارم ص 1754 پہ لکھا ہے کہ ''رسول اللہ خدا سے فریاد کریں گے کہ مسلمانوں نے قرآن کریم کو اپنے خود ساختہ اعتقادات' خیالات' رسومات' روایات' قوانین' تفاسیر' وغیرہ کی رسیوں میں جکڑ کر مَھۡجُوۡرٌ بنا رکھا تھا جس سے وہ ایک قدم بھی آزادی سے نہیں اٹھا سکتا تھا۔'' بقول محمد راغب الحسن ''عربی لسانیات کے مطابق زمانہ نزولِ قرآن میں ''مَھۡجُوۡرٌ'' اُس اونٹ کو کہتے تھے جس کے چاروں پاؤں باندھ کر اسے حرکت کرنے سے روک دیا گیا ہو۔ القرآن کی حرکت اور ارتقاء کو بھی اسی طرح ''مَھۡجُوۡرٌ'' بنا دیا گیا۔ (مہجور قرآن' ص۔ 23)۔ اس کی مزید وضاحت کے لیے دیکھیے امام راغب اصفہانی کی مشہور تصنیف ''المفردات فی غریب القرآن'' اور پرویزؒ کی لغات القرآن (جلد چہارم) ص ص۔ 1754-1753)۔

تَقُوْمُوْا لِلّٰهِ مَثْنٰی وَ فُرَادٰی (34:46)۔تم خدا کے لیے ایک ایک' دو دو' کر کے کھڑ ہو جاؤ۔ میں کوئی لمبا چوڑا وعظ نہیں کہنا چاہتا۔ صرف ایک بات جو کہنا چاہتا ہوں۔ آپ کھڑے ہو گئے' کہا پھر سن لیجیے کہ ایک ہی بات کہنا چاہتا ہوں کہ تَتَفَكَّرُوْا (25:46) سوچا کرو۔ یہ سنتِ رسول اللہ ﷺ دے رکھی ہے۔ اس کا اتباع کرنا ہے۔ اتباعِ سنتِ رسول اللہ ﷺ کے اندر یہ کہنا کہ مونچھیں اتنے کٹاؤ کی ہیں ان مونچھوں کا تو مسئلہ ہی نہیں حل ہو رہا۔ تیرہ سو برس سے یہ مسئلہ ہی حل نہیں ہو رہا کہ داڑھی کی لمبائی کتنی ہو' سنتِ رسول اللہ ﷺ کے مطابق یہ کتنی ہونی چاہیے۔ قرآن کی رو سے رسول اللہ ﷺ نے یہ فرمایا کہ تَتَفَكَّرُوْا (25:46) سوچا کرو لیکن مذہب نے تو ہمیں سوچ ہی سے محروم کر دیا۔ اگر یہاں اتباعِ سنتِ رسول اللہ ﷺ اور تعمیلِ امرِ خداوندی ہو رہی ہوتی' اگر ہم سوچتے' اگر ہم یہاں آ کر کھڑے ہو جاتے کہ اللہ کا فرمان يُدٰفِعُ (22:38) ہے' یعنی اللہ' انہیں ان کے دشمنوں کی پہنچ سے محفوظ رکھے گا تو آج ذلیل و خوار نہ ہوتے۔

قرآنِ حکیم کی عظمت

عزیزانِ من! ساتھ میں دو ایک آیتیں آ رہی ہیں' ویسے تو میں نے کہا ہے کہ قرآن کی کونسی آیت ہے کہ جو ایسی نہیں ہے کہ کھڑے ہو کر اس پہ سوچا نہ جائے۔ اس میں عظیم تر حقائق مضمر نظر آئیں گے لیکن تسلسل اور واقعات کے اعتبار سے بعض آیتیں ایسی آ جاتی ہیں جو بڑی بنیادی چیزیں لیے ہوئے ہوتی ہیں۔ یہاں کہا کہ اِنَّ اللّٰهَ يُدٰفِعُ (22:38)۔خدا مدافعت کرے گا۔ چلیے' تسی اوتھے پھیرے لے آیا کرو' تے تہاڈی اسیں مدافعت کر دے جایا کراں گے۔ ❶ اگر یہ ہو جائے کہ تم تو وہی حج والی بات کر لیا کرو تمہاری حفاظت اور مدافعت ہم کیا کریں گے۔ جن کی حفاظت خدا کرے' انہیں اس کے بعد خود کرنے کی ضرورت کیا ہے۔ دیکھا آپ نے کہ ہم نے کس طرح قرآن کو اپنے اعتقادات و رسومات میں جکڑ کر رکھ دیا ہے۔ اگر قرآنِ کریم کے نسخے آپ کے سامنے ہیں' عزیزانِ من! تو سامنے رکھیے گا' دیکھیے گا قرآن بولتا کیسے ہے' یہ مدافعت کیسے کرے گا۔

حج کے موقع پر' اپنے تحفظ کے لیے' میدانِ جنگ کے لیے' صف بندی کرنا ہو گی

عزیزانِ من! سوال یہ ہے کہ قرآنی تعلیمات کے مطابق حج کرنے سے کیا ہو گا؟ اِسے سن لیجیے کہ مدافعت کیسے ہو گی؟ قرآن کریم نے کہا کہ اُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا (22:39)۔ ان لوگوں (یعنی جماعت مومنین) کو' جن پر مخالفین کی طرف سے اس قدر مظالم توڑے گئے اور جن کے خلاف اب وہ مخالفین میدانِ جنگ تک میں اتر آئے ہیں' دشمن کا مقابلہ کرنے کے لیے جنگ کی اجازت دی جاتی ہے۔ عزیزانِ من! اسے پھر سن لیجیے۔ کہا کہ تم لوگوں پہ بہت ظلم ہوا ہے' اتنے عرصے تک تمہیں روکے رکھا تھا۔ جو تم تیاریاں کر

---

❶ آپ اس کے گرد چکر لگاتے رہا کرو ہم تمہاری مدافعت کر دیا کریں گے۔

رہے تھے' آج تمہیں اجازت دی جاتی ہے کہ تم بھی ان کے مقابلے کے لیے میدانِ جنگ میں آ جاؤ۔ **وَاِنَّ اللّٰـهَ عَلٰى نَصْرِهِمْ لَقَدِيْرُ ۙ** (22:39)۔اللہ ان مظلوموں کی مدد کرنے کی پوری قدرت رکھتا ہے۔اللہ حفاظت کر رہا ہے۔یہ ساتھ ہی آیت ہے۔دیکھ لیا حج میں کیا کرنا تھا۔ان کو حج میں صف بندی کرنا تھی۔آپ نے حج میں جنگ کی Strategy (حکمتِ عملی) سوچنی تھی۔آپ نے حج میں ڈیفنس (دفاع) کے جس قدر بھی یہ سارے شعبے ہیں' ان کا انتظام کرنا تھا۔اس لیے کہ اس کی مدافعت کا' آپ کی مدافعت کا' جو اس نے ذمہ لیا ہے' اس کا طریقہ یہ بتایا ہے کہ تمہیں میدانِ جنگ میں نکلنا ہے' اتنی مضبوط کھری کھری صاف بات کہی ہے۔

بڑی بے باکی سے کہہ دیا جاتا ہے کہ قرآن میں ربط ہی نہیں

عزیزانِ من! قرآن ان کے ہاں بھی پڑھا جاتا ہے' دہرایا جاتا ہے۔یہ سب کچھ ہوتا ہے' تفسیریں بھی لکھی جاتی ہیں جبکہ قرآن کے متعلق بنیادی طور پر تو انہوں نے یہ کہہ رکھا ہے کہ اس میں کوئی ربط نہیں ہے۔ایویں کوئی گل کتھے کہہ دتی' کوئی کتھے کہہ دتی۔ [1] کہتے ہیں کہ ان آیات کا حج کے ساتھ کوئی ربط نہیں ہے' چل بھئی' کہہ دیا کہ یہ غیر مربوط کتاب ہے۔یا میرے اللہ! خدا کی یہ کتاب اور کتاب بھی آخری کتاب' اس کے بعد کوئی دوسری کتاب نہیں آئے گی۔میں کہا کرتا ہوں کہ بڑے لوگ تو خیر کوئی ہونگے اگر میرے جیسے ایک ناچیز قلمکار کی بھی پوری کتاب تو ایک طرف رہی کوئی چار فقروں کے متعلق کہہ دے کہ تمہاری کتاب میں وہ فقرے غیر مربوط ہیں' میں بھی کتاب پھاڑ کے پھینک دوں۔تصنیف کا سب سے بڑا نقص یہ ہوتا ہے کہ غیر مربوط ہوتی ہے۔مگر قرآنِ کریم کے بارے میں یہ لوگ بڑے فخر سے کہتے ہیں کہ جی' اس میں کوئی ربط ہی نہیں ہے۔پتہ ہے کیوں کہتے ہیں؟ یہ مَن کا چور ہے جو وہ کچھ کرنے نہیں دیتا جو قرآن کہتا ہے۔ورنہ ربط تو یہ بتاتا تھا کہ حج کی آیت کے ساتھ ہی یہ کہا ہے کہ مدافعت ہوگی' ساری دنیا سے مدافعت ہوگی جو خدا نے اپنے ذمہ لیا ہے' مگر ساتھ ہی یہ کہا ہے کہ ہمیں میدانِ جنگ میں نکلنا ہوگا۔ربط تو یہ کہتا تھا۔اب جو ان کے ہاں حج کو میدانِ جنگ سے کوئی تعلق ہی نہ ہو تو ان آیتوں کو کیا کہیں گے؟ یہی کہیں گے کہ ان میں ربط نہیں ہے یعنی تمہاری اپنی زندگی غیر مربوط نہیں ہے' وہ تو بالکل مربوط ہے لیکن قرآن کی ان آیات میں ربط نہیں ہے۔تسی تے لوٹے' تے مصلے' تے تسبیحاں' تے کھجوراں' لے کے ترے آؤ۔یہ تو تمہاری زندگی ہے۔مربوط تے ساری عمر فیر حاجی صاحب نال ناں دے رکھ لو۔اپنے سرکاری Deputation (وفد) میں جاؤ تو الحاج ہو جائے گا۔اپنے پیسیاں نال جاؤ تے حاجی خیر دین ہو جاؤ' تے اے مربوط ہوئی نا ساری گل۔ [2] حج کا ربط آخر تک اِن کے نزدیک غیر مربوط ہے' جب کہ قرآن کہتا

---

[1] بس ایسے ہی کوئی بات کہاں کہہ دی اور کوئی کہاں۔

[2] تم تو لوٹے' جاءِ نماز' تسبیحیاں' کھجوریں لے کر چلے آؤ۔یہ تو تمہاری زندگی ہے۔نام کے ساتھ حاجی لگا لو تو پھر نام کے ساتھ حاجی کا لفظ مربوط ہو جائے گا۔سرکاری وفد میں جاؤ تو الحاج۔اگر اپنے پیسے خرچ کر کے جاؤ تو پھر حاجی خیر دین بن جاتے ہو۔تو پھر یہ مربوط ہوئی نا ساری بات!

ہے کہ اُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا (22:39)۔جنہیں ظلم وستم کا نشانہ بنایا گیا' انہیں جنگ کی اجازت دی گئی ہے۔

اسلام شمشیر سے نہیں' دل و دماغ کے اطمینانِ کامل سے ایمان لانے کا عمل ہے

عزیزانِ من! قرآن کریم کے ایک ایک لفظ پہ غور کیجیے گا' دین اسلام اپنی تمام تر اکملیت کے ساتھ سمجھ میں آ جائے گا۔ بڑے فخر سے کہا جاتا ہے کہ اسلام شمشیر کے زور پر پھیلا۔ ہماری جنگیں اسلام پھیلانے کے لیے تھیں۔ کہنے والوں کو نہ یہ معلوم ہے کہ اسلام کسے کہتے ہیں' نہ یہ پتہ ہے کہ قبول کیسے کیا جاتا ہے؟ اسلام خدا کی طرف سے دی ہوئی ابدی صداقتوں کو دل و دماغ کے کامل اطمینان سے قبول کرنے کا نام ہے۔ یہ شمشیر کے زور سے کبھی بھی قبول نہیں کیا جا سکتا۔ یہ دل اور دماغ کی رضامندی کا معاملہ ہے' ورنہ اسے تو ایمان کہا ہی نہیں جا سکتا جسے دل و دماغ قبول نہ کریں۔ جنگ کی اس پہلی آیت میں یہ کہا جاتا ہے کہ اُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا (22:39)۔انہیں جنگ کی اجازت دی جاتی ہے جنہیں ظلم وستم کا نشانہ بنایا گیا۔اس آیت سے یہ پتہ چل رہا ہے کہ ان پر مخالفین کی طرف سے اس قدر مظالم توڑے گئے تھے' وہ مخالفین میدان جنگ تک اتر آئے تھے۔ جب یہ ہے کہ ہم اجازت دیتے ہیں تو نظر آتا ہے کہ یہ پہلی بار کی بات ہے۔

جنگ کی اجازت مظلوم ہونے کی شرط سے مشروط ہے

عزیزانِ من! جنگ کی سینکڑوں آیات ہیں۔ یہ پہلی آیت ہے جس میں ان لوگوں (یعنی جماعتِ مومنین) کو اجازت دی جا رہی ہے۔ وہاں یہ کہا جا رہا ہے کہ جنگ کی اجازت دی جا رہی ہے اور اس کی وجہ یہ بتائی ہے کہ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا (22:39)۔ان پہ بڑے ظلم ہوئے تھے۔ جنگ ان مظالم کی حفاظت کے لیے ہے' اسلام پھیلانے کے لیے نہیں ہے۔ اسی لیے کہا کہ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا (22:39)۔ انہیں جور وستم کا تختہ مشق بنایا گیا۔ یہ قرآن ہے' عزیزانِ من! پہلی دفعہ جنگ کی اجازت کی یہ آیت آ رہی ہے۔ اس جنگ کی لِمَ' وجہ جواز ساتھ ہی ایک لفظ میں دی جا رہی ہے کہ کہیں یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ ایک قوم جنگ کے لیے تیار کی جا رہی تھی کہ چلو صاحب! اب میدانِ جنگ میں چلو' اللہ اللہ کرتے چلے جاؤ' ہاتھ میں تلوار لو اور زُنّار [1] کاٹ کاٹ کے لادتے چلے جاؤ۔

ہماری تاریخ کے افسانے

عزیزانِ من! ہماری تاریخ رطب و یابس سے بھری پڑی ہے۔ اس تاریخ کے مطابق اورنگزیب کے متعلق کہتے ہیں کہ وہ جب تک روزانہ سوا من زُنّار روزانہ اکٹھے نہیں کر لیتا تھا' کھانا نہیں کھاتا تھا۔ آپ نے تو وہ زُنّار دیکھا نہیں ہوگا۔ زُنّار تلے سے سوتر [2] کا ایک

---

[1] زُنّار۔ وہ تاگا جو ہندو گلے اور بغل کے درمیان ڈالے رہتے ہیں' وہ تاگا یا زنجیر جو عیسائی' مجوسی اور یہودی کمر میں باندھتے ہیں۔

[2] سوتر۔ تسو کا سولھواں حصہ۔ اور تسو کہتے ہیں ڈیڑھ انچ کو۔ اس طرح ایک سوتر ڈیڑھ انچ کا سولھواں حصہ ہوا۔ اور یہ بنا 09۔ یا سوتر کا یعنی سوت کا۔

دھاگہ ہوتا ہے اور وہ گلے سے بغل کے درمیان تک باندھا ہوتا ہے۔ایک دو رتی سے لے کر زیادہ سے زیادہ ایک ماشے کے برابر اس کا وزن ہوتا ہوگا۔سوچیے تو سہی کہ ہر روز کھانے سے پہلے کتنے ہندوؤں کو قتل کر کے وہ سوا من زنار اکٹھے کر لیتا تھا۔پھر کھانا کھایا کرتا تھا اور زیادہ سے زیادہ اس کی سلطنت غالباً سولہ سو اٹھاون (1658) سے سترہ سو سات (1707) کے تک عرصے تک رہی اگر حافظہ غلطی نہیں کرتا' پھر وہ کوئی ایسے لوگ امپورٹ کرتے ہونگے کیونکہ یہاں والے تو دس سال میں ختم ہو جائیں گے' جی! یہ سارا کچھ کرنے کے باوجود پورے ہندوستان میں تو چھوڑ دیجیے کہ جب ہم نے تقسیم بھی کرائی ہے ❶ تو اس وقت بھی وہاں مسلمانوں کی آبادی پچیس ہی فیصد تھی۔ 75% اس وقت بھی غیر مسلم تھا اور جب وہاں سلطنت مغلیہ ختم ہوئی ہے سارے ہندوستان کو تو چھوڑ دیجیے' دلی اور آگرہ کو لے لیجیے جوان کے دارالسلطنت رہے تھے ہزار سال تک مسلمانوں نے یہاں حکومت کی تھی۔تو دارالسلطنت تو ایسا ہونا چاہیے تھا کہ جس کے اندر بہرحال مسلمان ہی بستے۔دلی اور اس کے سارے مضافات کو ساتھ ملا کے جو انگریز کے زمانے سے پہلے اس میں شامل تھے اس میں 30% مسلمان تھے تو اورنگ زیب کیسے سوا من زنار روزانہ ناشتے سے پہلے اکٹھے کیا کرتا تھا۔بہرحال مجھے ان سے غرض نہیں ہے' اورنگزیب بھگتے یا یہ کچھ کرے مگر ہماری تاریخ اس طرح کے افسانوں سے بھری پڑی ہے۔

مودودی مرحوم ❷ کی خلافِ حقیقت تقریر

عزیزانِ من! میں یہ کہہ رہا ہوں کہ یہ جو ہمارے ہاں کہا جا رہا ہے کہ اسلام شمشیر کے زور سے پھیلایا گیا تھا ان افسانوں کی حقیقت یہ ہے۔ہمیں ان افسانوں میں جانے کی ضرورت نہیں۔آپ کے ہاں کے تو بہت بڑے مفسر ❷ ہیں' ان کی جو پہلی کتاب فخر سے پیش کی جارہی ہے وہ الجہاد فی الاسلام ہے اِس کتاب میں یہ فخر سے کہہ رہے ہیں کہ تئیس سال نبوت کی زندگی میں......معاذ اللہ...... نبی اکرم ﷺ نے بھی بہرحال تیرہ سال تک خاموشی سے بیٹھ کے بھی تبلیغ کے ذریعے سے اسلام پھیلانے کی جو کوشش کی تو اُس سے چند ہی لوگ مسلمان ہوئے لیکن جب آپ ﷺ شمشیر لے کے اٹھے ہیں تو آپ دیکھیے چند سالوں کے اندر ایران' فلسطین اور روم زیرِ تسخیر آئے اور کروڑوں کی تعداد میں لوگ مسلمان ہوئے' تو کہو اسلام شمشیر کے زور سے پھیلا ہے یا تبلیغ کے زور سے پھیلا ہے۔یہ کچھ اس میں لکھا ہوا ہے۔بہرحال بات ہو رہی تھی کہ یہ پہلی آیت ہے جس میں جنگ کا کہا گیا تھا۔وہ بھی اس لیے کہ **بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا** (22:39)۔ان پر ظلم وستم کے پہاڑ توڑے گئے۔مخالفین میدانِ جنگ تک اتر آئے' پھر کہیں جا کر ان مخالفین کا مقابلہ کرنے کے لیے ان لوگوں (یعنی جماعتِ مؤمنین) کو جنگ کی اجازت دی۔پھر سوال یہ تھا کہ میدانِ جنگ میں خدا کیا کرے گا؟ اس کا قرآنِ کریم نے جواب دیا کہ **وَاِنَّ اللّٰهَ عَلٰى نَصْرِهِمْ لَقَدِيْرُ ۨ** (22:39)۔اللہ ان مظلوموں کی مدد کرنے پر پوری قدرت رکھتا ہے۔فرمایا کہ ہم ان کی مدد کریں گے۔

---

❶ یہ اشارہ 1947ء میں پاکستان بننے کی طرف ہے۔

❷ سید ابوالاعلیٰ مودودی رحمت اللہ علیہ (1903-1978)

انسانی دنیا میں خدا کی ذمہ داری انسانوں کے ہاتھوں پوری ہوتی ہے

عزیزانِ من! خدا نے جتنی چیزیں کہی ہیں کہ یہاں یوں ہوگا' اور یوں ہوگا تو اس سلسلے میں یاد رہے کہ خدا کا ہر وعدہ' اس کی ہر ذمہ داری' انسانی دنیا کے اندر انسانوں کے ہی ہاتھوں سے پوری ہوتی ہے۔ یہی انسان' جن کے ہاتھوں سے یہ ذمہ داریاں پوری ہوتی ہیں' یہ وعدے ایفا ہوتے ہیں' انہیں جماعتِ مومنین کہا جاتا ہے۔ انسانی دنیا میں' خدا کی ذمہ داریاں یا اس کے وعدے براہِ راست پورے نہیں ہوتے' وہ انسانوں کے ہاتھوں سے ہی پورے ہوتے ہیں۔ وہ انسان یا انسانوں کی جماعت' جو خدا کی ذمہ داریاں پوری کرنے کے لیے وجود میں آتی ہے' انہیں مسلمان کہتے تھے۔ ہمارے ہاں مسلمان کی یا امتِ مسلمہ کی یا جماعتِ مومنین کی یہ Definition (تعریف) ہے۔ تو کہا یہ سب کچھ یعنی یہ ذمہ داری' یہ نصرت' یہ فتح ان کے ہاتھوں سے ہوگی۔ **اِنَّ اللّٰہَ عَلٰی نَصۡرِہِمۡ لَقَدِیۡرٌ** (22:39)۔ خدا ان کی مدد کرے گا۔ چلیے' اتنی بڑی بات ہے کہ خدا مدد کرے گا۔ تو کیا ایسے ہی مدد کر دے گا کہ آپ مومن ہو گئے' کہہ دیا ہمارا اللہ پہ ایمان ہے۔ اس نے کہا ہوا ہے کہ ہم تمہاری مدد کریں گے تو ٹھیک ہے۔ ہم چلتے ہیں اور نصرت تو وہ مدد ہوتی ہے جس میں غالب آ جاتا ہے' دوسرا وہ کرے گا۔ یہ آیت ہے 39۔ اب آگے 40 ویں آیت شروع ہوگئی۔ 40 ویں آیت کے اندر اس نے کہا یعنی ہمیں بڑی خوشی تھی' بہر حال مدد تو ہماری کرے گا وہ تو بڑی بات ہے۔ زیادہ وقت تک ہمیں اس فریب میں بھی نہ رہنے دیا۔ 40 ویں آیت میں کہا ہے کہ **وَ لَیَنۡصُرَنَّ اللّٰہُ مَنۡ یَّنۡصُرُہٗ** (22:40)۔ سن رکھو! ہم اس کی مدد کریں گے جو پہلے ہماری مدد کرے گا۔ شرط یہی ہے کہ جو ہماری مدد کرے گا ہم اس کی مدد کریں گے۔ ساتھ ہی یہ کہہ دیا کہ یہ ذہن میں نہ آ جائے کہ اچھا خدا ہماری مدد کا محتاج ہے۔ کہا کہ **اِنَّ اللّٰہَ لَقَوِیٌّ عَزِیۡزٌ** (22:40)۔ ہم بڑی قوت والے' بڑے غلبے والے ہیں لیکن تمہاری دنیا کے اندر یاد رکھو' ہماری نصرت ان کے ساتھ ہوگی جو ہماری مدد کریں گے۔

مدد اسی کی جو خدا کی مدد کرے گا

سیدھی جی گل اے بھائی صاحب! اسیں تے سچی گل پہلاں کہہ دینے آں۔ [1] خدا کی مدد کی شرط کی کیا بات ہے! خدا وہ ہے جو قوی ہے' بڑی قوت کا مالک ہے' اس کی مدد یہ عاجز و ناتواں بندے کریں! یہ کیا بات ہوئی؟ عزیزانِ من! ہم 39 ویں آیت پہ ہیں اور میں نے 40 ویں آیت کی یہ تشریح کر دی۔ آپ ذرا دم لیجیے۔ قرآنِ کریم نے 41 ویں آیت میں بتا دیا کہ ہماری مدد کیسے کرو۔ لیکن ذرا ایک سیکنڈ ٹھہریئے اور یہ سنتے جایئے کہ جو اس کی مدد کرتا ہے تو پھر وہ کیسے اس کی مدد کرتا ہے' اس کی مدد میں ہوتا کیا ہے۔ لیکن ہوتا یہی ہے کہ پہلے اس کی مدد کرو اور پھر وہ تمہاری مدد کرے گا۔ یہ اگلی آیت میں آئے گا کہ پھر وہ تمہاری مدد کیسے کرتا ہے۔ بہت اچھا جی! وہ جو مدد

---

[1] بھائی جان! یہ سیدھی سادھی سی بات ہے۔ ہم تو سچی بات پہلے ہی کہہ دیتے ہیں (کہ مدد اسی کی ہوگی جو ہماری مدد کرے گا)۔

کرے گا تو پھر کرے گا کیا؟ ہم تو یہی سمجھتے ہیں کہ پھر وہ راوی کے کنارے سفید گھوڑیوں والے اور سبز پگڑیوں ❶ والے بھیج دیتا ہے۔ اور وہ ہوائی جہازوں سے گرنے والے بم لیتے ہیں اور ان پر مار کر کہندے نیں: او تیری ایسی کی تیسی۔ ماراینوں' آسمانوں آ جاندے نیں۔ ❷ اور پھر کبھی یہ کہ صاحب! بغداد سے وہ بڑے پیر صاحب جنید بغدادی تشریف لائے تھے۔ انہی افسانوں میں ایک یہ بھی کہا ہوا ہے کہ خود نبی اکرم ﷺ نے فرمایا تھا کہ میں وہاں جا رہا ہوں۔ ان سے یہ پوچھا گیا کہ آپ کہاں تشریف لے جا رہے ہیں تو کہا کہ میں وہاں (جہاں پاک و ہند کی 1965ء والی جنگ ہو رہی ہے) جا رہا ہوں۔ عزیزانِ من! اب مصیبت تو یہ ہے کہ یہ ساری باتیں اسی کم بخت گنہگار کے حصے میں آئی ہیں۔ اور کوئی ہے ہی نہیں جو یہ بتائے کہ ان افسانوں کی حقیقت کیا ہے۔ چلیے زندگی کے چند دن باقی رہ گئے ہیں ان میں انہی افسانوں پر سے پردہ ہٹا دوں۔ 1965ء کے بعد جب 1971ء میں پھر جنگ ہوئی تو 71ء میں ان سے پوچھا کہ سرکار! اب وہ بغداد والے' وہ مکے والے' وہ مدینے والے' سبز عمامہ والے' سفید گھوڑیوں والے کہاں گئے۔ کیوں نہ اوناں نے مار مار کے اوناں نوں سور بنا دتا؟ ❸ پتہ ہے جواب کیا ملتا تھا؟ کہنے لگے: ایناں دا تے روز حال ہی اے ہیگا۔ اوناں نوں ہور وی تے کم ہیگے نیں نا دنیا دے۔ ❹ لو! کیا شاعری ہو رہی ہے!

خدا کیسے مدد کرتا ہے؟

عزیزانِ من! سنیے وہ مدد کیسے کرتا ہے؟ میں آپ سے بار بار کہتا ہوں کہ ایک قرآن پہ ایمان لے آیئے' سارے مسائل حل ہو جاتے ہیں' ذہنی اشکال و ابہام دُور ہو جاتے ہیں' باتیں صاف ہو جاتی ہیں' دین ایک حقیقتِ ثابتہ بن جاتا ہے' کوئی مذاق نہیں رہتا' پھر ہنسنے کی بات نہیں رہتی۔ یاد رکھیے! وہ گھوڑیوں والے اور عماموں والے نہیں بھیجتا وہ تو کہتا ہے کہ **یٰۤاَیُّهَا الَّذِیۡنَ اٰمَنُوۡۤا اِنۡ تَنۡصُرُوا اللّٰهَ یَنۡصُرۡكُمۡ** (47:7)۔ اے جماعتِ مومنین! تم اچھی طرح سے سمجھ لو کہ اگر تم نے نظامِ خداوندی کے قیام میں مدد کی' تو خدا تمہاری مدد کرے گا۔ وہی الفاظ ہیں جو (22:40) میں آئے ہیں یعنی اگر تم خدا کی مدد کرو گے تو خدا تمہاری مدد کرے گا۔ سوال یہ ہے کہ وہ کیا کرے گا؟ کہا کہ **وَیُثَبِّتۡ اَقۡدَامَكُمۡ** (47:7) وہ میدانِ جنگ میں تمہارے پاؤں جما دے گا' تمہیں ثبات حاصل ہو جائے گا' تمہارے قدموں میں لغزش نہیں ہونے پائے گی۔ یہ ہے مددِ خداوندی۔ آپ سوچیے کہ کس چیز سے سپاہی کے پاؤں میں ثبات آتا ہے؟

---

❶ یہ پاک و ہند کی 1965ء کی جنگ کی طرف اشارہ ہے جس میں مذہب کے نام پہ یہ کہانیاں عام کی گئی تھیں کہ ایسے افراد نے ان بموں کو نیست و نابود کر دیا تھا۔ یہ پاک فوج کا کمال نہیں تھا۔

❷ ان بموں کو تباہ کر دیتے۔ ان بموں کو تباہ کرنے کے لیے وہ آسمانوں سے آ وارد ہوتے ہیں۔

❸ اب انہوں نے انہیں مار کر کیوں نہ تباہ و برباد کر دیا؟

❹ ان کا تو روز کا یہی حال ہے انہیں دنیا کے اور بھی تو کام ہیں جو نپٹانے ہیں۔

دو ہی چیزیں ہیں: ایک یہ کہ خدا کے یہ وعدے سچے ہیں۔ ہم حق وصداقت پر ہیں' یقیناً ہم کافروں پر غالب آئیں گے اور دوسرا یہ کہ اگر اس غلبے کے اندر انفرادی طور پر میری موت واقعہ ہو جائے گی' تو وہ موت نہیں ہے' میں زندہ وجاوید ہو جاؤں گا۔

میدانِ جنگ میں زندہ جاوید ہو جانے پر ایمانِ محکم

عزیزانِ من! یہ ایمانِ محکم ہے جو پاؤں میں ثبات پیدا کر دیتا ہے۔ خدا یہ کرے گا۔ اتنی سی بات ہے اِسی لیے کہا ہے کہ **وَيُثَبِّتْ اَقْدَامَكُمْ** (47:7) وہ تمہارے پاؤں جما دے گا۔ تمہیں ثابت قدم بنادے گا۔ یہ ہے خدا کی نصرت۔ ربط کی کڑیاں ملا لیجیے۔ تمام اجتماعاتِ حج کا مقصود ومطلوب یہ ہے کہ **اِنَّ اللّٰهَ يُدٰفِعُ عَنِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا** (22:38)۔ جو جماعت مومنین ایسا کرتی رہے گی اللہ انہیں ان کے دشمنوں کی دسترس سے محفوظ رکھے گا۔ اس سے تمہیں امن ہوگا۔ کوئی تمہاری طرف میلی آنکھ سے نہیں دیکھ سکے گا' یہ ہماری مدافعت ہوگی' تمہیں سیکیورٹی حاصل ہوگی۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا تھا کہ مومن کے لفظ کے معنیٰ ایمان والا ہونا تو ایک طرف رہا' یہ امن دینے والا ہے' یہ امن میں رہنے والا ہوتا ہے۔ یہ تو ساری امن کی بات ہے' خوف تو خدا کا عذاب ہے جس میں ہم مسلسل مبتلا ہیں: **فَاَذَاقَهَا اللّٰهُ لِبَاسَ الْجُوْعِ وَالْخَوْفِ** (16:112)۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ان پر بھوک اور خوف کا عذاب طاری ہو گیا۔ فارغ البالی کی جگہ فاقے آنے لگے اور ان کا امن' خطرات سے بدل گیا۔ قرآن نے کہا ہے کہ جس قوم سے ہم نعمتیں چھینتے ہیں' ان کو خوف اور بھوک کے عذاب میں مبتلا کر دیتے ہیں۔ وہ عذاب ہے' سیکیورٹی امن ہے۔ تو میں نے کہا ہے کہ آپ یہ کڑیاں ملا لیجیے کہ یہ سارے اجتماعات ہیں۔ حج آخری اجتماع ہے۔ آپ کے ہاں ارکانِ اسلام میں تو چھوٹے چھوٹے اجتماع آتے ہیں' یہ تو آپ کے ہاں صلوٰۃ[1] کے ضمن میں ہوتے ہیں۔ ان میں سب سے بڑا اجتماع تو حج کا اجتماع ہے۔ اسکا فکری نتیجہ' مدافعت' امن اور سیکیورٹی ہے۔ ساری دنیا میں قوتیں ایسی نہیں ہیں کہ اللہ میاں ان ساری کی ساری قوتوں کو پھونک مار کر ختم کر دے گا تو اس طرح ان کی مخالفت کی قوتیں سب مٹ جائیں۔ ان کے مقابلے میں وہ مخالفت کی قوتیں تو ہوں گی۔ اسی لیے تو کہا ہے کہ **اُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقٰتَلُوْنَ** (22:39)۔ انہیں جنگ کی اجازت دی گئی ہے' کیوں کہ **بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا** (22:39) انہیں ظلم وستم کی چکی میں پیسا گیا تھا۔

---

[1] قرآنِ کریم کی ایک خاص اصطلاح ''اقامتِ صلوٰۃ'' ہے جس کے عام معنی نماز قائم کرنا یا نماز پڑھنا کیے جاتے ہیں۔ لفظ صلوٰۃ کا مادہ ص۔ ل۔ و۔ ہے' جس کے بنیادی معنی کسی کے پیچھے پیچھے چلنے کے ہیں۔ اس لیے صلوٰۃ میں قوانینِ خداوندی کے اتباع کا مفہوم شامل ہوگا۔ بنا بریں' اقامتِ صلوٰۃ سے مفہوم ہوگا ایسے نظام یا معاشرہ کا قیام واستحکام جس میں قوانینِ خداوندی کے اتباع کا وسیع اور جامع مفہوم ہے۔ نماز کے اجتماعات میں قوانینِ خداوندی کے اتباع کا تصور محسوس اور سمٹتی ہوئی شکل میں سامنے آجاتا ہے۔ اس لیے قرآنِ کریم نے اس اصطلاح کو ان اجتماعات کے لیے بھی استعمال کیا ہے۔ قرآنی آیات پر تھوڑا سا تدبر کرنے سے واضح ہو جاتا ہے کہ کس مقام پر ''اقامتِ صلوٰۃ'' سے مراد اجتماعاتِ نماز ہیں اور کس مقام پر ''قرآنی نظام یا معاشرہ کے قیام واستحکام کے لیے قوانین خداوندی کے اتباع کا وسیع وجامع مفہوم۔''

ایمانِ محکم کے ساتھ اپنی سرحدوں کو بھی پوری طرح مضبوط کرو

عزیزانِ من! جو ظالم بن کر تمہارے اوپر چڑھ آئے گا' تمہیں اس کا مقابلہ کرنا ہوگا' ہم تمہاری مدد کریں گے۔ یہ مدد اس صورت میں کریں گے کہ تم پہلے ہماری مدد کرو گے۔ ہماری مدد صرف یہ ہوگی کہ میدانِ جنگ کے اندر تمہارے پاؤں جم جائیں گے۔ میدانِ جنگ میں' جس سپاہ کے پاؤں جمتے ہیں' کامیابی اس کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ سوال ہی نہیں ہے کہ اس کے پاؤں اکھڑ جائیں۔ سامان وذرائع کے لیے تو الگ حکم دیا ہوا ہے۔ کہا ہے کہ اپنی سرحدوں پر تم اس قدر سامان رکھو کہ اسے دیکھ کے ہی دشمن ڈر جائے' تمہاری طرف آنکھ اٹھا کے دیکھنے کی ہمت نہ کرے۔ سامان وذرائع کی تو یہ صورت ہے لیکن جسے ہم Man behind the gun (بندوق کے پیچھے آدمی کام کرتا ہے) کہتے ہیں' بات تو ساری اس آدمی کی ہے' اس سپاہی پہ ہے۔ اس سپاہی میں اگر یہ چیزیں ہوں کہ بڑے سے بڑے خطرے میں بھی اس کے پاؤں میں کبھی لغزش نہ آنے پائے' تو پھر اس کے بعد فتح وکامرانی اور نصرت میں شبہ ہی کیا رہ جاتا ہے۔ اسی لیے کہا کہ ہم مدد کریں گے کیونکہ **بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا** (22:39) اس جماعت پہ بڑے مظالم ہوئے تھے۔ یہاں مظالم کی یاددلائی جارہی ہے کہ **اَلَّذِيْنَ اُخْرِجُوْا مِنْ دِيَارِهِمْ بِغَيْرِ حَقٍّ** (22:40)۔ یہ وہ مظلوم ہیں جنہیں ان کے گھروں تک سے ناحق نکال دیا گیا۔ یہ وہ لوگ تھے کہ جب یہ تیرہ (13) برس تک مکے میں رہے تو یہ ان کو ستاتے رہے۔ یہ غریب لوگ اس قدر ستائے گئے اور اس کے بعد کیفیت یہ ہوگئی کہ انہیں ان کے گھروں سے ناحق نکال ہی دیا۔ ان کے ساتھ یہ سب کچھ کیا۔ پھر قرآن نے' عزیزانِ من! ایک عجیب بات کہی ہے کہ **اِلَّآ اَنْ يَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ** (22:40)۔ ان کا کوئی جرم نہیں تھا' انہیں صرف اس جرم کی پاداش میں نکالا کہ یہ کہتے تھے کہ ہمارا رب اللہ ہے۔ کہا کہ اس جرم کی پاداش میں انتہائی ظلم یہ ہوا۔ ان کے خلاف کوئی اور جرم نہیں تھا' جرم صرف یہ تھا کہ یہ کہتے تھے کہ ہمارا رب اللہ ہے۔ ان پہ اس قدر مظالم ہوئے کہ انہیں گھروں تک سے نکال دیا گیا۔ لیکن سرکش قوتیں اس کی اجازت نہیں دیتیں کہ کوئی اپنی مرضی کے مطابق کسی اور کو اپنا فرماں روا بنالے' کسی اور کو اپنا معبود بنالے۔ مذہب اس کی آزادی نہیں دیتا۔ یہ تو دین ہے جس میں اختیار وارادہ کارفرما ہوتا ہے' اس میں پرستش کی اور عقیدے کی آزادی ہوتی ہے۔ خواہ وہ پرستش یا عقیدہ باطل ہی کیوں نہ ہو۔ نظامِ دین میں عقیدے اور پرستش کی آزادی کو بنیادی حیثیت حاصل ہوتی ہے لیکن مذہب میں نہیں۔

قرآن ہر انسان کو پرستش کی اور عقیدے کی ضمانت دیتا ہے

عزیزانِ من! قرآن ہر مذہب کو پرستش کی' عقیدے کی' آزادی کی ضمانت دیتا ہے خواہ وہ باطل ہی کیوں نہ ہوں۔ یہیں سے ہی ایک بات نکلتی ہے اگرچہ کہ ان کا یہ جرم بتایا گیا ہے کہ یہ لوگ صرف یہ کہتے تھے کہ ہمارا رب اللہ ہے اور اس بنا پہ ان پہ ظلم کیا۔ اگر ایک ہندو کہتا ہے کہ ہمارا ایشور پرماتما ہے تو اس کے لفظی ترجمہ کی بنا پہ اگر اس کو ستایا جائے گا تو ہم ستانے والے اسی کیٹگری میں آجائیں گے۔

سوال یہ تو ہے نہیں کہ **یَقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ** (22:40)۔ میں عربی زبان کا جو ربنا اللہ تھا آپ اسے ہندی میں کہیے' سنسکرت میں کہیے' انگلش میں کہیے' کسی بھی زبان میں کہیے مفہوم و مطلب تو اس کا یہی ہے کہ ان کا کوئی جرم نہیں تھا' بجز اس سے کہ وہ کہتے تھے کہ ہمارا نشو ونما دینے والا اللہ ہے۔ یہ سرکش قوتیں اس کی کب اجازت دیتی ہیں کہ کوئی اپنی مرضی کے مطابق کسی کو اپنا معبود بنا لے۔ یہاں کوششیں اس پرانے باطل نظام کی جگہ ایک نیا حق پر مبنی نظام لانے کی ہو رہی تھیں جس کے آنے کے بعد ان کا کچھ بھی نہیں بچتا تھا اور یہ کوششیں سر توڑ ہو رہی تھیں۔ انہوں نے یہ سمجھ لیا تھا کہ نظام ربوبیت آنے کے بعد انہیں کوئی نہیں پوچھے گا۔ اسی لیے میں نے کہا کہ یہیں سے یہ بات صاف ہوتی ہے۔ **اِلَّآ اَنْ يَّقُوْلُوْا رَبُّنَا اللّٰهُ** (22:40)۔ ان کا جرم بجز اس کے کچھ نہیں تھا کہ یہ صرف یہ کہتے تھے کہ ہمارا نشو ونما دینے والا اللہ ہے۔

مظلوم کی نصرت خدا پر فرض ہو جاتی ہے

عزیزانِ من! بات یہ ہے کہ اگر آپ کسی کو اذیت دیتے ہیں تو یہ ظلم ہو جائے گا۔ جب یہ مظلوم ہو جائے گا تو اس مظلوم کی نصرت خدا پر لازم ہو جائے گی۔ اسی کی نیچے دی گئی تشریح بھی سن لیجیے۔ میں خود اپنے ذہن سے یہ نہیں کہہ رہا۔ قرآن سامنے رکھ کے اپنے ذہن سے کچھ کہنا تو بہت بڑا شرک ہے۔ اِس آیت کے اگلے ہی الفاظ تو اس طرف لے آئے۔ میرا تو بس اتنا ہی ہے کہ مجھے پچاس برس ہو گئے ہیں۔ میں ایک ایک آیت پہ' ایک ایک لفظ پہ کھڑا ہو کے سوچتا رہتا ہوں۔ اس سلسلے میں ارشادِ خداوندی ہے کہ **وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَّصَلَوٰتٌ وَّمَسٰجِدُ يُذْكَرُ فِيْهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِيْرًا** (22:40)۔ تم سوچو کہ اگر اللہ اس کا انتظام نہ کرتا کہ ایک گروہ کی روک تھام دوسرے گروہ کے ذریعے ہو سکے (اور وہ سرکش لوگوں کو بدلگام چھوڑ دیتا کہ وہ جو جی میں آئے کرتے چلے جائیں' تو اور چیزیں تو ایک طرف) کسی قوم کی عبادت گاہ تک بھی دنیا میں محفوظ نہ رہتی...... خانقاہیں' گرجے' یہودیوں کے معبد' مساجد' جن میں خدا کا نام کثرت سے لیا جاتا ہے...... سب کبھی کے ڈھائے جا چکے ہوتے۔ یعنی اس پر زور دے کر کہا کہ اگر ہم یہ اہتمام نہ کرتے' خدا یہ اہتمام نہ کرتا کہ زیادتی کرنے والے گروہ کی مدافعت دوسرے گروہ کے ہاتھوں سے نہ کراتا تو یہ سب کبھی کے ڈھائے جا چکے ہوتے۔ **دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ** (22:40)۔ تم سوچو کہ اگر اللہ اس کا انتظام نہ کرتا کہ ایک گروہ کی روک تھام دوسرے گروہ کے ذریعے ہو سکے۔ اس آیت میں وہی **دفع اللہ**[1] کا لفظ آیا ہے۔ وہاں (22:38) میں **اِنَّ اللّٰهَ يُدَافِعُ**

---

[1] تاج العروس اور مقاییس اللغۃ میں **دَفْعٌ** کے معنی ہیں: کسی چیز کو قوت سے دور کر دینا' ہٹا دینا۔ محیط المحیط میں لکھا ہے کہ **اَلدَّفْعُ** کے معنی ہیں کسی بات کو وارد ہونے سے پہلے ہی دور کر دینا اور **اَلدَّفْعُ** کے معنی ہیں اسے وارد ہونے کے بعد دور کرنا۔ تاج العروس میں لکھا ہے کہ جب دفع کے بعد الی آئے تو اس کے معنی سونپنے یا ادا کرنے کے ہوں گے اور جب اس کے بعد عَنْ آئے تو اس کے معنی حمایت کرنے یا حفاظت کرنے کے ہوتے ہیں جیسے اِنَّ اللّٰهَ يُدَافِعُ عَنِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْا (22:38) یقیناً اللہ (کا قانون) ان کی حفاظت کرتا ہے جو اس کی صداقت پر یقین رکھتے ہیں۔

عَنِ آیا ہے۔یعنی اللہ (کا قانون) ان کی حفاظت کرتا ہے۔اور (22:40) میں ہے کہ **وَلَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ** یعنی اس کا فاعل خدا خود ہے یعنی اگر خدا خود مدافعت نہ کرتا تو......سوال یہ ہے کہ یہ مدافعت کیسے ہوتی ہے؟ کہا کہ ایک گروہ کی مدافعت' دوسرے گروہ کے ہاتھوں سے۔وہ یہ مدافعت ہوتی ہے۔ یہاں کہا کہ اگر وہ ایسا انتظام نہ کرتا۔ سنیے' مدافعت' کن چیزوں کی کرانے کے لیے اس نے یہ انتظام کیا ہے؟ اس نے کہا ہے کہ اگر یہ نہ ہوتا تو یاد رکھو! راہبوں کی کوٹھڑیاں' عیسائیوں کے گرجے' یہودیوں کے صومعے اور ہیکل یعنی مختلف مذاہب کی عبادت گاہیں اور پرستش گاہیں مدت کی منہدم ہو چکی ہوتیں۔اگر ہر غیر مذہب والے کے ہاتھ میں قوت ہوتی تو وہ اٹھتا اور فریقِ مخالفت کی عبادت گاہوں کو' پرستش گاہوں کو' منہدم کر کے رکھ دیتا۔

خدا کے زیرِ سایہ ہر مذہب کی عبادت گاہوں اور پرستش گاہوں کی حفاظت

عزیزانِ من! قرآن نے یہ کہا ہے کہ ہم (اللہ) نے یہ اہتمام کیا ہے کہ اس قسم کے ظالم لوگوں کی مدافعت دوسروں سے کرائیں تا کہ یہ مندر' یہ گرجے' یہ صومعے' اور یہ کوٹھڑیاں محفوظ رہیں۔آخر میں ''مسیتاں داوی ذکر کردتا۔''[1] کہا کہ **وَمَسٰجِدُ يُذْكَرُ فِيْهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِيْرًا** (22:40)۔اور اسی طرح سے مساجد بھی باقی نہ رہتیں' جن میں اللہ کا نام بہت کثرت سے لیا جاتا ہے۔یہ ہے وہ غایت جس کے لیے مدافعت کا یہ انتظام کیا گیا ہے۔اب آپ یہ سوچیے کہ یہ دین' نظامِ اسلام ہے۔باقی تو مذاہب ہی ہیں' ان میں تو پرستش ہی ہوتی ہے۔یہ دراصل پرستش گاہیں ہیں۔خدا یہ کہہ رہا ہے کہ ہم نے یہ انتظام کر رکھا ہے کہ مختلف مذاہب کی پرستش گاہیں' جن میں بتوں کی پوجا ہوتی ہے' انسانوں کو خدا بنایا جاتا ہے اور ان کی پرستش ہوتی ہے' محفوظ رہیں۔خدا کہتا ہے کہ انہیں محفوظ رکھنے کا انتظام ہم نے اپنے ذمے لیا ہے اور اسی لیے ہم یہ کرتے چلے جائیں گے کہ اگر ایک گروہ سرکش اٹھے اور وہ کسی مندر کو ڈھانے چلے تو ہم نے انتظام کیا ہے کہ کوئی دوسرا گروہ ایسا اٹھا کھڑا کریں جو اس کی مدافعت کرے کہ ''نہیں'' یہ نہیں ہو سکتا۔قرآن تو ہر مذہب کو' اس کے ہر طریقِ پرستش کو' ہر پرستش گاہ کو' باطل قرار دیتا ہے۔لیکن پھر بھی اس کی پرستش گاہوں کی حفاظت کی ذمہ داری اپنے سر لیتا ہے۔

دینِ اسلام میں لوگوں کو اپنے اپنے عقیدے کی پوری پوری آزادی حاصل ہوتی ہے

عزیزانِ من! لوگوں کی' اہلِ مذہب کی' اپنی پرستش گاہوں کے ساتھ عقیدت وابستہ ہوتی ہے۔کسی کو زبردستی مسلمان نہیں بنایا جا سکتا۔خدا ان کی پرستش گاہوں کی حفاظت کر رہا ہے۔میں کہا کرتا ہوں' عزیزانِ من! کہ بحمد اللہ میں نے تو قریب قریب دنیا کے ہر بڑے مذہب کی کتاب کو خود پڑھا ہے' جس زبان میں بھی میں پڑھ سکتا تھا میں نے پڑھا ہے۔آپ کو دنیا کی کسی کتاب کے اندر یہ فقرہ نہیں

---

[1] مساجد کا بھی ذکر کر دیا۔

ملے گا' کہ خدا لوگوں کی پرستش گاہوں کی ذمہ داری اپنے سر لیتا ہے۔ اس کشادکا تو کوئی اہلِ مذہب تصور بھی نہیں کر سکتا کہ جن مذاہب کو وہ باطل قرار دیتا ہے' جن معبودوں کو وہ باطل قرار دیتا ہے' جس طریقِ پرستش کو وہ باطل قرار دیتا ہے' جن عبادت گاہوں کو وہ باطل قرار دیتا ہے' اگر کوئی انہیں بھی ڈھانے کے لیے اٹھتا ہے تو وہ اس کی حفاظت کرتا ہے۔ وہ کہتا ہے کہ اس کا طریقہ یہ نہیں ہے کہ انہیں ڈھا دیا جائے' یہ جہالت ہے' جس کی وجہ سے یہ لوگ اس چیز کو یوں سمجھتے ہیں۔ ان سے کہو کہ سوچیں' انہیں سمجھاؤ' ان تک یہ بات پہنچاؤ' ان کے ذہنی فکر کی جو کمی ہے وہ پوری کرواور جب یہ Convince (قائل) ہو جائیں کہ یہ غلط ہے تو وہ کہتا ہے کہ پھر انہیں اپنے ہاتھوں سے انہیں ڈھانے دو۔ قریش نے خود کعبے کے اندر سے بتوں کو نکال باہر پھینکا تھا۔ ان بتوں کو آپ نبی اکرم ﷺ نے نہیں توڑا تھا۔

دوسروں کے حقوق قرآن نے قدم قدم پر واضح کر رکھے ہیں

عزیزانِ من! اکثر کہتے ہیں کہ اسلامی مملکت میں دوسروں کے حقوق کیا ہونگے؟ ارے صاحب! حقوق کی لسٹیں تیار کرنے کی کیا ضرورت ہے! قرآنِ کریم کی ایک ایک آیت بتا رہی ہے کہ حقوق کیا ہونگے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ یہ چیزیں کس ربط و ترتیب سے آ رہی ہیں۔ آپ نے دیکھ لیا کہ حج کے اجتماع کی غرض و غایت کیا چلی آ رہی ہے' اس جماعت کی دنیا کے ہر خطرے سے مدافعت کس غرض کے لیے ہے؟ کیونکہ ان پہ ظلم ہوا ہے۔ ان کی ذمہ داری کیا ہے؟ کہ دنیا میں ہر مذہب کی پرستش گاہ' اور اس کے معبودوں کی حفاظت کریں۔ اگر اللہ یہ نہ کرتا تو یہ تو تباہ ہو چکے ہوتے اور سنیے کہا کہ **وَلَيَنْصُرَنَّ اللّٰهُ مَنْ يَّنْصُرُهٗ** (22:40)۔ جو جماعت بھی حق و انصاف کی مدافعت کے لیے اٹھے گی' اللہ کا قانون اس کی ضرور مدد کرے گا۔

یہاں سوال یہ ہے کہ خدا کس طرح مدد کرتا ہے؟ کہا کہ خدا اُس کی مدد کرتا ہے جو مساجد و منادر اور یہودیوں کے معبدوں اور خانقاہوں کو بچانے کے لیے' اٹھتا ہے۔ اس کام کے لیے اگر آپ سینہ سپر کھڑے ہو جاتے ہیں' تو خدا آپ کی مدد کرتا ہے۔ پھر کہا کہ **اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِیٌّ عَزِيْزٌ** (22:40)۔ یاد رکھو! خدا بڑی قوتوں کا مالک اور سب پر غالب ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ جب ہم کسی کی مدد کرتے ہیں تو اسے ذہن میں رکھیں کہ ہمارے جیسا قوت والا کوئی بھی اور نہیں ہے۔ اب جو قوم اٹھ کر دوسروں کے مذاہب و معابد کی حفاظت کرے گی' اسے دنیا میں کسی سے ڈرنے کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ مدافعت تو اس کی آپ ہی ہو گئی۔ پہلی بات تو یہ ہے کہ ان کے پاس اتنی قوت ہو گی کہ وہ دوسرے مذاہب کے خلاف اٹھنے والوں کی بھی مدافعت خود کر سکیں گے اور ان کو شکست دے سکیں گے۔ ظاہر ہے کہ اگر اتنی قوت ہو گی تو پھر اپنی مدافعت کیوں نہیں کر سکتے۔ یہ ابھی منفیانہ چیز تھی۔ خدا اس کی نصرت کرتا ہے' جو اس کی مدد کرتے ہیں۔ اب آگے اس کی مدد کی تفاصیل چلی آ رہی ہیں۔ پہلی چیز تو یہ آ گئی کہ انہیں قوت حاصل ہو گی تو پہلی بنیادی ذمہ داری یہ ہو گی کہ ''دنیا میں مذہب اور پرستش کی آزادی کو برقرار رکھیں گے۔'' آگے بڑھیے' عزیزانِ من! حج کی آیت بتائے چلی جا رہی ہے کہ مظلوموں کی یہ جماعت جو دنیا سے ظلم

وسرکشی کو مٹانے کے لیے اٹھی ہے اس کے متعلق کہا کہ اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِى الْاَرْضِ (22:41)۔ اگر ہم نے انہیں ملک میں حکومت عطا کر دی تو وہ تمکنت کا نظام رائج کریں گے جس سے انہیں اقتدار و استخلاف فی الارض حاصل ہوگا' قرآن کے الفاظ میں انہیں تمکن حاصل ہوگا' یہ وہی سیدھی سی بات ہے' جسے انگریزی میں Establish ہو جانا کہتے ہیں' اسی کا ترجمہ یہ تمکنت ہوتا ہے' تو کہا کہ وہ تمکنت کا ایک نظام رائج کریں گے۔ تمکن کا یہ لفظ ہمارے ہاں بھی استعمال ہوتا ہے۔ یہاں قرآن نے کہا ہے کہ اگر انہیں ملک میں تمکن حاصل ہو جائے [1] گا تو یہ ایک نظام رائج کریں گے۔ اس نظام کی تفصیل بعد میں بتاؤں گا۔ یہاں یہ یاد رہے کہ یہ وہی حج والی قوم ہے جس نے میدانِ جنگ میں نکلنا تھا' جس نے اس طرح سے مذاہب کی آزادی کے تحفظ کی ذمہ داریاں لینی تھیں۔ کہا کہ اگر انہیں تمکن حاصل ہو جائے گا تو یہ ایک نظام قائم کریں گے۔

مذہبی پیشوائیت کی طرف سے اسلامی مملکت کی تعریف

عزیزانِ من! اب یہ پوچھتے ہیں کہ اسلامی مملکت کسے کہتے ہیں؟ اس میں کیا ہوتا ہے؟ کہتے ہیں کہ جی! اِس میں نفاذِ شریعت ہوتا ہے۔ اس مملکت کا سب سے بڑا یہی مطالبہ ہوتا ہے جس پر سب سے بڑا نعرہ تکبیر بلند ہوتا ہے۔ اور وہ نفاذ شریعت یہ ہے: اتوار کی جگہ جمعہ کی چھٹی ہو جاتی ہے۔ کیا بات ہے صاحب! اس سے مملکت اسلامی ہوگئی کیونکہ جمعہ کی چھٹی ہو جائے گی۔ یہ اللہ کی شان ہے یعنی مذہبی پیشوائیت کی طرف سے اسلامی مملکت کی تعریف صرف یہ ہے کہ اس میں جمعہ کی چھٹی ہوتی ہے۔

انڈیا میں ساردا ایکٹ کی مخالفت کیوں؟

عزیزانِ من! ایک عجیب بات یہ ہے کہ اگر یہ لوگ کبھی کسی معاملے میں اسلامی نام کی طرف آتے بھی ہیں تو وہ بھی ایک غیر قرآنی قدم ہوتا ہے۔ استادِ مکرم پروفیسر مولانا اسلم جیراجپوری علیہ الرحمۃ مجھ سے کہا کرتے تھے جب کبھی بھی مختلف فرقوں کے علماء کا اجتماع ہوتا ہے' وہ ہمیشہ باطل پہ ہوتا ہے۔ اور جو بات میں ابھی بتا رہا ہوں' یہ اس زمانے کی بات ہے جب سارداا یکٹ انڈیا میں پاس ہونے لگا تھا۔ دراصل ایک ہندو نے پارلیمنٹ میں ایک بل پیش کیا تھا کہ نابالغ لڑکیوں کی شادی نہیں ہونی چاہیے۔ سارداا س شخص کا نام تھا۔ جس نے پارلیمنٹ میں یہ بل پیش کیا تھا۔ پارلیمنٹ میں یہ بل پاس ہوا۔ ذرا نئی Generation' (نسل) میرے بچے' کان کھول کے سن لیں۔

---

[1] قرآنِ کریم نے اپنی صداقت کے پرکھنے کے لیے تین معیار بتائے ہیں: (ا) اپنے دور کے علمی دلائل سے اس پر غور کرو۔ (ب) تاریخی شواہد سے دیکھو کہ سابقہ اقوام نے جب غلط روش اختیار کی تو اس کا نتیجہ کیا نکلا۔ (ج) استناجی طریق (Pragmatic Test) کے ذریعے اس کی صداقت کو پہچانو۔ استناجی طریق کے معنی یہ ہیں کہ اس نظام کو قائم ہو کر اپنے نتائج پیدا کرنے دو۔ نتائج سے خود بخود معلوم ہو جائے گا کہ اس کا دعویٰ سچا ہے یا نہیں۔ اسے اپنے دعویٰ کی صداقت پر اس قدر یقینِ محکم ہے کہ وہ استناجی طریق پر بڑا زور دیتا ہے۔

شاید انہوں نے یہ باتیں پڑھی بھی نہیں ہونگی' پھر اس کے بعد تو شاید انہیں یہ باتیں بتانے والا بھی کوئی نہیں ہوگا۔ ہم تو وہاں دلی میں تھے۔ یہ بل پارلیمنٹ میں پیش ہوا تھا کہ نابالغ لڑکیوں کی شادی نہیں ہونی چاہیے۔ مسلمانوں نے اس بل کی مخالفت کی تھی مگر پارلیمان میں نہیں۔ جب انہوں نے دیکھا کہ یہ بل تو آگے چلے گا تو اس بل کے خلاف ملک میں ایجی ٹیشن شروع ہوئی۔ اس ایجی ٹیشن کے لیے ہم نے یہ منظر دیکھا۔ وہاں دلی میں کرول ❶ باغ ایک مقام تھا جہاں جامع ملیہ اسلامیہ ہوا کرتی تھی' وہاں ان کا اجتماع تھا۔ تمام فرقوں کے یہ جتنے بھی بڑے بڑے علمائے کرام تھے یہ سارے وہاں جمع ہوئے اور ایک وفد ❷ بنا کر جلوس کی شکل میں حضورِ وائسرائے کے ہاں بازیابی کے لیے گئے تھے۔ مطالبہ یہ تھا کہ مسلمانوں کو اس سے مستثنیٰ رکھا جائے۔ مولانا اسلم جیراجپوری رحمۃ اللہ علیہ کی بڑی خوشگوار قسم کی طبیعت تھی۔ مجھے آج تک وہ منظر یاد ہے۔ ہم بھی بیٹھے ہوئے تھے۔ ان کے گھر میں تو یہ جلوس جا رہا تھا۔ اب یہ سوچ لیجیے' وہ علما چالیس پچاس یا سو کے قریب ہونگے۔ یہاں سے وہاں تک لائن بندھی ہوئی تھی۔ ان کی اتنی اتنی بڑی داڑھیاں تھیں۔ مجھے کہنے لگے کہ چوہدری ❸ صاحب! یہاں تو یہ بکھری ہوئی داڑھیاں چلی جا رہی ہیں۔ ذرا تصور میں لاؤ کہ اس کا ایک کمرہ ہو اور اس میں یہ سو داڑھیاں جمع ہو جائیں تو کمرے کا نقشہ کیا ہوگا اور اس کے بعد جو پھر انہوں نے مجھ سے ایک فقرہ کہا' وہ میں کبھی نہیں بھولوں گا۔

مسلمانوں کی تاریخ کا المیہ: تمام فرقوں کے علما کا غیر قرآنی متفقہ مطالبہ

عزیزانِ من! استادِ مکرم پروفیسر مولانا اسلم جیراج پوری علیہ الرحمۃ نے کہا کہ مسلمانوں کی تاریخ کا المیہ یہ ہے کہ ان کے فرقے ہمیشہ آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ دست و گریباں رہتے ہیں لیکن جب بھی مختلف فرقوں کا کبھی اجتماع ہوا ہے تو ہمیشہ باطل پہ ہوا ہے۔ آج مختلف فرقوں کے یہ سارے علماء اکٹھے ہو کے ایک مسئلے پہ یہ کہنے کے لیے جا رہے ہیں کہ یہ جو چیز ہے کہ ''نابالغ لڑکی کی شادی نہ ہو'' ہمیں اس سے مستثنیٰ رکھا جائے۔ یہ مسئلہ تمام فرقوں کے نزدیک متفق علیہ ہو گیا ہے۔ کہنے لگے کہ سوچو تو سہی۔ کہ یہ صرف ایک ہی واقعہ نہیں ہے میں تاریخ کے اندر تمہیں بتاؤں گا کہ جب بھی کبھی یہ اکٹھے ہوئے' ہمیشہ باطل پہ اکٹھے ہوئے ہیں اور اس کی نظیر تمہارے سامنے ہے۔ ہاں تو بات کچھ اور ہو گئی۔ یہ اکثر پوچھتے ہیں کہ جی! اسلامی مملکت کسے کہتے ہیں؟ قرآنِ کریم نے کہا کہ **اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِي الْاَرْضِ** (22:41)۔ جب انہیں زمین میں تمکن حاصل ہوگا' جب ان کی اپنی مملکت بنے گی' تو......عزیزانِ من! یہ پاکستان کی بنیاد کا مطالبہ تھا اور وجہ جواز اِس آیت کا وہ ٹکڑا ہے جو اس کے آگے ہے۔ یہ وہ ہے جسے Prerequisite Qualification (بنیادی شرط) کہتے ہیں' یہ اس کے لیے پہلی بنیادی شرط ہے' بالکل ایسے ہی جیسے نماز کے لیے وضو پہلی شرط ہوتی ہے۔

---

❶ یا قرول

❷ اس کی مزید تفصیل کے لیے دیکھیے: ڈاکٹر منظور الحق کی زیرِ نگرانی مرتب ہونے والی کتاب مطالب الفرقان فی دروس القرآن سورۃ بنی اسرائیل ص ص۔183 - 182

❸ غلام احمد پرویزؒ اس زمانے میں چوہدری صاحب کے نام سے پکارے جاتے تھے۔ جب آپ کراچی سے گلبرگ لاہور منتقل ہوئے تو راقم الحروف (ڈاکٹر منظور الحق) جب وہاں پہلی بار گلبرگ انہیں ملنے گیا تو پوچھنے پر اسے بھی یہی بتایا گیا کہ یہ چوہدری صاحب کی کوٹھی ہے۔

مطالبہ پاکستان کی بنیادی شرط

مطالبہ پاکستان کی بنیادی شرط ہی یہ تھی جسے قرآن کریم نے تمکن فی الارض کہا ہے۔ یہ تمکن اس صورت میں ہوسکے گا جب ان کی اپنی الگ مملکت ہوگی۔ یہ مفکر قرآن اقبالؒ (1877-1938) نے کہا تھا۔ آپ دیکھتے ہیں' عزیزانِ من! قرآن کس طرح فکر کی بات کر کے صحیح نتیجے پہ پہنچاتا ہے اور کس طرح اس چیز نے اس مفکرِ قرآن کو اس نتیجے پہ پہنچایا تھا۔ پھر تاریخ اس کے سامنے تھی۔ اور جیسا میں کہا کرتا ہوں کہ میں تو 1930ء کا پاکستانی ہوں جس وقت علامہ محمد اقبالؒ نے الہ آباد کے خطبہ میں یہ بات کہی تھی۔ ہم نے اسی زمانے میں بآوازِ بلند اس کی تائید کی تھی کہ قرآن کا یہی تقاضا ہے۔ اس وقت قرآنِ کریم کی یہ آیت ہمارے سامنے تھی۔ میں نے 1938ء سے ماہنامہ طلوعِ اسلام کا اجراء کیا۔ یہ جتنے بھی مذہب پرست مولوی تھے' جو پاکستان کی مخالفت کرتے تھے ان کے اعتراضات کا قرآنی جواب دیا۔ یہ عجیب وغریب جنگ تھی۔ اس کا نقطہ ماسکہ یہ بنیاد تھی جو اس آیت نے دی تھی۔ قرآن نے تمکن فی الارض کو لازمی اور ضروری شرط قرار دیا ہے۔ اور کہا ہے کہ تم تمکن فی الارض کے لیے اپنی مملکت حاصل کرو۔ اس نے یہ شرط قرار دی ہے۔ کہا کہ اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِی الْاَرْضِ (22:41)۔ جب وہ تمکن فی الارض کریں گے تو...... یعنی اگر تمکن فی الارض یا اپنی مملکت نہ ہو تو اگلی باتیں ہو نہیں سکتیں۔ ہم صرف ان اگلی باتوں کے لیے قرآن کی اس شرط کے مطابق تمکن فی الارض چاہتے ہیں۔ قرآن کہتا ہے کہ اگر یہ نہ ہوگا تو اگلی باتیں ہو نہیں سکیں گی۔ اب یہ تو تم بھی مانتے ہو کہ اگلی باتیں اسلام کا جزو ہیں' ان کے لیے تو تمکن فی الارض شرط ہے۔ یہ وجہ تھی' عزیزانِ من! کہ ہم نے پاکستان حاصل کیا۔ اس میں شبہ نہیں کہ جہاں تک شریعت کے علوم کا تعلق ہے' یہ حضرات مجھ سے بہرحال کہیں آگے تھے۔ مرحومین مولانا حسین احمد مدنی (1879-1957)' مفتی کفایت اللہ' مفتی احمد سعید علمائے دیوبند' اتنے بڑے بڑے شریعت کے علماء تھے لیکن قرآن ان کے سامنے نہیں تھا۔ یہ وہی بات ہے جو اس شخص [1] نے کہی تھی کہ

قلندر جز دو حرفِ لا الہ کچھ بھی نہیں رکھتا
فقیہ شہر قاروں ہے لغت ہائے حجازی کا

وہ جو قلندر [2] کے دو حرف تھے وہ تو ہمیں دعا دیتے ہوئے اس کے ساتھ ہوگئے کہ بیٹا! اب یہ چیزیں سنبھالو۔ وہ دو حرف یہی تھے' عزیزانِ من! کہ اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِی الْاَرْضِ (22:41) جب انہیں تمکن فی الارض ہوگا تو...... قرآن نے تمکن فی الارض شرط قرار دیا۔ خدا کہتا ہے کہ اسکے بغیر بات ہی نہیں ہوسکتی۔ کیا باتیں کہاں سے چلی جارہی ہیں! ان باتوں کو سن رکھیے' غنیمت ہے کہ آپ

---

[1] اقبالؒ: بال جبریل' نیشنل بک فاؤنڈیشن' اسلام آباد' 1996' ص۔ 54

[2] ڈاکٹر محمد اقبالؒ (1877-1938) ایک نابغہ شخصیت تھے۔ حقیقت میں وہ ایک مفکر قرآن تھے ان کی نگاہِ بصیرت نے قرآن کو [باقی اگلے صفحے پر]

حضرات ابھی سننے والے آ جاتے ہیں۔ اگر اپنے مقصد سے عشق نہ ہوتا' اِس عشق کا غم نہ ہوتا' تو پھر روز اس قسم کی باتیں کون کہتا' کون سنتا؟ عزیزانِ من! ''کون سننے والی بات'' بڑی ہی عجیب ہے۔ بہرحال قرآن نے کہا کہ **اَلَّذِيۡنَ اِنۡ مَّكَّنّٰهُمۡ فِى الۡاَرۡضِ** (22:41) تمکن فی الارض یا اپنی الگ مملک پہلی شرط ہے' عزیزانِ من! کبھی اس انتیس ❶ سال کے عرصے میں بھی آپ کے سامنے کوئی یہ آیت لایا ہے جسے اسلامی مملکت کہتے ہیں۔

مذہب کے نزدیک قرآن کی بیان کردہ چار اصطلاحوں کا ماحصل

تقاضائے پاکستان کیا تھا؟ ہم نے پاکستان کیوں مانگا تھا؟ آج سب بھانت بھانت کی بولیاں بولتے ہیں۔ ہم نے تمکن فی الارض یا اپنی الگ مملکت سے بات شروع کی تھی یعنی **اَلَّذِيۡنَ اِنۡ مَّكَّنّٰهُمۡ فِى الۡاَرۡضِ** (22:41) لیکن آگے جا کے بھانڈا پھوٹ گیا۔ وہ کہتے تھے کہ صاحب! آگے تو کہا ہوا ہے کہ یہ **اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوۡا بِالۡمَعۡرُوۡفِ وَنَهَوۡا عَنِ الۡمُنۡكَرِ** (22:41) ہے۔ لیجیے صاحب! قرآن نے آگے یہ بتایا ہے۔ مصیبت تو یہ ہو جاتی ہے کہ یہ اسے مذہب میں لے آتے ہیں تو ان کے عقیدے کے مطابق اس میں پہلی آیت کا اتنا حصہ منسوخ ہو جاتا ہے۔ اس کا لفظی ترجمہ کیا ہے کہ اب اگر انہیں تمکن حاصل ہوا تو یہ اقامتِ صلوٰۃ کریں گے' ایتائے زکوٰۃ کریں گے' امر بالمعروف کریں گے' نہی عن المنکر کریں گے۔ یہ چار اصطلاحیں ہیں۔ ان کے نزدیک اقامتِ صلوٰۃ کے معنی نماز پڑھنا' ایتائے زکوٰۃ کے معنی اڑھائی فیصد زکوٰۃ دینا ہے۔ یہ ان کے ہاں مذہب میں ہے کہ وہ 2.5%

[گزشتہ سے پیوستہ] جس طرح سمجھا بہت کم لوگوں کی رسائی وہاں تک ہوئی۔ اُن کی فکر کا ہر پہلو قرآن کی روشنی سے منور تھا۔ وہ مسلمانوں کی حالتِ زار پر تاحیات رنجیدہ خاطر رہا کرتے تھے۔ وہ تمام عمر مسلمانوں کو خوابِ غفلت سے بیدار کرتے رہے۔ کہتے تھے مسلمانوں کے لیے غلامی ہے ہی نہیں...... اس لیے علامہ اقبال کی تگ و دو یہی تھی کہ (اس کے تصورِ پاکستان کا) ہر پاکستانی صحیح معنوں میں مومن بنے' غلامی کو تیاگ دیں کیونکہ غلامانہ زندگی جہنمی زندگی ہے۔ یہ مسلمان کے شایانِ شان نہیں۔ مسلمان وہ ہیں جو قرآنی قوانین کے زیرِ سایہ زندگی بسر کریں۔ جو ایسا نہیں کرتے' وہ کافر ہیں' وہ ظالم ہیں' وہ فاسق ہیں۔ اسی لیے علامہ اقبالؒ نے الگ سرزمین کا سوچا تاکہ وہاں اسلام کا احیا ہو۔ اس کی بھرپور مخالفت ہوئی۔ انگریز اور ہندو تو تھے ہی مخالف' لیکن افسوسناک بات یہ ہے نیشنلسٹ علماء کی طرف سے بھی بھرپور مخالفت ہوئی۔ دیوبند کے مولانا حسین احمد مدنی نے کہا ہمیں کہیں جانے کی ضرورت نہیں ہے۔ کانگرس نے ہمیں مکمل یقین دلایا ہے کہ مسلمانوں کو ہر طرح کی مذہبی آزادی حاصل رہے گی۔ لہٰذا اسلام اس کی اجازت دیتا ہے۔ اس وقت علامہ اقبالؒ بسترِ مرگ پر پڑے تھے مگر انہوں نے کہا:

ملا کو جو ہے ہند میں سجدے کی اجازت ناداں یہ سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد

تب مولانا حسین احمد مدنی صاحب نے اپنی غلطی کا اعتراف کیا مگر جونہی علامہ کی آنکھیں بند ہوئیں مولانا پھر اپنے اسی راستے پر آ گئے۔ (حوالہ: جاوید ایم اے: حصولِ پاکستان کا مقصد' ماہنامہ صوت الحق' کراچی' اکتوبر 2004' ص۔ 34)

❶ یاد رہے یہ بات جنوری 1977ء کو کہی جا رہی ہے۔

سال کے بعد دیں گے۔امر بالمعروف' نھی عن المنکر تو ان کے ہاں ہر وقت زبان پہ ہوتا ہے' ہر مولوی بھی جو وعظ کہے وہ یہ کہتے تھے کہ یہ چیزیں جو ہیں یہ تو اپنی مملکت کے بغیر آج بھی ہمیں حاصل ہیں' انگریز کی غلامی میں ہمیں حاصل تھیں اور گانگریس نے تو ان کو یہ لکھ کر دیدیا تھا کہ متحدہ ہندوستان میں جو حکومت قائم ہوگی اس میں تمہیں یہ آزادی حاصل ہوگی۔ یہ لوگ یہ دلیل پیش کیا کرتے تھے۔عزیزانِ من! یہ وہ لوگ ہیں جن کے نام اس قدر دُور سے نظر آ رہے ہیں' وہ ہیں ابوالکلام آزاد[1] (1888-1958) حسین احمد مدنی (1879-1957) اور کفایت اللہ مرحومین۔ یہ کہتے تھے کہ بات تو آگے یہ ہے: اقامتِ صلوٰۃ' ایتائے زکوٰۃ' امر بالمعروف' نھی عن المنکر۔ جب یہ حضرات فٹا فٹ ان چاروں چیزوں کو مذہب میں لے آئے تو پھر ہر طرح سے انسان کو خود فریبی کی تسکینِ خویش حاصل ہو جاتی ہے۔اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ دین کی دو اصطلاحیں تھیں۔ جب دین مذہب میں بدلا تو اقامتِ صلوٰۃ کے معنی ہوئے نماز پڑھ لی اور ایتائے زکوٰۃ کے معنی ہوئے کہ 2.5% دیدیا اور وہ جو ہزار برس سے ان دو اصطلاحات کے یہی معنی مسلمانوں کے ذہن میں عام ہوتے گئے' راسخ ہو گئے' اور پھر ہمارے خلاف ہجوم اٹھ کے کھڑا ہو جاتا تھا اوتم کیا کہتے ہو؟ اگر اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ ہی کہہ رہے ہو تو وہ اس کے بعد بھی تو ہمیں حاصل ہے' آج حاصل ہے' پریکٹیکلی حاصل ہے' تم بھی نماز پڑھتے ہو' زکوٰۃ دیتے ہو۔ جب ہم ان سے کہتے کہ یہ بات تو ہم آگے چل کے کہیں گے' پہلے یہ کہو جو قرآن نے کہا ہے کہ اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِى الْاَرْضِ جب انہیں زمین میں اپنا تمکن حاصل ہو گا یعنی اپنی الگ مملکت حاصل ہوگی تو پھر یہ چیز ہوگی۔ وہ کہتے تھے کہ یہ آیت ابتدائی زمانے کی ہے کہ جب اسکے بغیر وہ نماز نہیں پڑھنے دیا کرتے تھے' بعد میں یہ آیت منسوخ ہوگئی۔ سیدھی جی گل اے۔[2] لو کرلو کیا کرتے ہو۔ نماز' روزے' زکوٰۃ کی اجازت ہے۔ ریزولیشن پاس کر دیا۔ اسی پہ اس بیچارے نے چیخ کے کہا تھا[3] کہ

ملا کو جو ہے ہند میں سجدے کی اجازت
نادان سمجھتا ہے کہ اسلام ہے آزاد

ہمارا سارا وقت ان اصطلاحات کو سمجھانے میں ہی صرف ہو گیا

عزیزانِ من! قرآنِ کریم کی روشنی میں یہ شخص (علامہ ڈاکٹر محمد اقبالؒ) کیا باتیں کہہ گیا ہے۔ بدبختی یہ ہے کہ وہ پاکستان کے وجود میں آنے سے پہلے چلا گیا۔ قرآن کا نقشہ اس کے ذہن میں تھا۔ اس تصور کو انہوں نے مار دیا۔ اس دوران میں ہماری ساری جنگ اقامتِ

---

1. آپ کا اصل نام احمد محی الدین ہے۔ حوالہ: مولانا ابوالکلام آزاد: قولِ فیصل' مکتبہ جمال' لاہور' 2000۔
2. یہ سیدھی سی بات ہے۔
3. علامہ ڈاکٹر محمد اقبال (1877-1938) جو اس وقت بسترِ مرگ پہ تھے۔

صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ' امر بالمعروف اور نہی عن المنکر کے قرآنی مفہوم سمجھانے میں ہی صرف ہو رہی ہے۔ یہ مسئلے نئے سرے سے ہمیں کھڑے کرنے پڑے کہ قرآن میں کوئی آیت منسوخ نہیں ہے۔ اب آپ سمجھتے ہیں کہ ہمیں وہاں اس کی ضرورتیں کیا پیش آئی تھیں کہ تمکن فی الارض شرط لا ینفک ہے اور پھر اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ تھا۔ انہیں سمجھایا گیا کہ یہ آیت منسوخ نہیں۔ یہ اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ تو صرف اپنی مملکت میں ہی ہو سکتا ہے۔ یہ تمکن فی الارض قرآن کی شرط ہے۔ خدا نے یہ شرط اس کے ساتھ عائد کر رکھی ہے۔ اگر کوئی چیز' جس کا نام تم اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ رکھ لو' غیروں کی مملکت میں بھی وہ ہو سکتی ہے' تو وہ نہ اقامتِ صلوٰۃ ہے' نہ ایتائے زکوٰۃ ہے۔ یہ تھے وہ مسائل جن پر ہمیں بار بار لکھنا پڑا۔ بہر حال اللہ تعالیٰ کے حضور بارگاہِ ایزدی میں سجدہ شکرانہ ادا کرتا ہوں کہ ایک ''طلوعِ اسلام'' ہی تھا جس نے اس تصورِ قرآن کو بار بار پیش کیا تھا۔ اس کے علاوہ کوئی دوسرا پرچہ ہی نہیں تھا۔ ایک ہی یہ فقیرِ بے نوا [1] تھا۔ اس کے پاس یہ پرچہ بھی کیا تھا' یہ ایک ہی شخص تھا جس پر ملازمت کی پابندیاں تھیں۔ کبھی کسی نام سے' کبھی کسی نام سے' لکھتا رہا۔ بات ہی یہ تھی اور مجھے یہ خوشی ہے کہ یہ چیزیں پہلے کبھی نہیں آئیں تھیں۔ انہوں نے مجبور کیا اور پھر یہ چیزیں منظرِ عام پہ آ گئیں۔ آج اللہ کا احسان ہے کہ ان کے مقابلے میں یہ عام چیز ہے۔ آج اقامتِ صلوٰۃ [2] اور ایتائے زکوٰۃ [3] کا مفہوم سمجھا جا سکتا ہے۔ اقامتِ صلوٰۃ وہ تمام فرائض ہیں جو خدا نے عائد کئے ہیں تاکہ تمام افرادِ معاشرہ ان احکام کے پیچھے پیچھے چلتے چلے جائیں اور اقامت صلوٰۃ ادا کرتے چلے جائیں۔ ایتائے زکوٰۃ تمام نوعِ انسانی کی ربوبیت اور پرورش کی ذمہ داری ہے۔ اور باقی رہا **اَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ**

---

1. یہ اشارہ خود پرویزؒ کا اپنی ہی طرف ہے۔
2. اقامتِ صلوٰۃ کے لیے ''میدان جنگ میں زندہ جاوید ہو جانے پر ایمان محکم'' کے عنوان کے تحت دیئے گئے فٹ نوٹ نمبر 1 ملاحظہ کیجیے۔
3. ایتائے زکوٰۃ کی اصطلاح میں ایتاء کے معنی ہیں دینا اور زکوٰۃ کے معنی ہیں نشوونما (Growth یا Development) یعنی نوعِ انسان کی نشوونما کا سامان بہم پہنچانا۔ اس نشوونما میں انسان کی طبعی زندگی کی پرورش اور اس کی ذات (Personality یا Self) کی نشوونما' یہ دونوں شامل ہیں۔ 22:41 سے ظاہر ہے کہ اسلامی مملکت کا فریضہ اقامتِ صلوٰۃ اور ایتائے زکوٰۃ ہو گا۔ اس میں ایتائے زکوٰۃ کا مطلب ''دوسروں کو نشوونما دینا'' ہے۔ اپنے افرادِ معاشرہ اور دیگر نوعِ انسان کی نشوونما کا سامان بہم پہنچانا۔ ایتائے زکوٰۃ (دوسروں کی نشوونما) کے مقصد کے لیے قرآنِ کریم نے نہ کوئی شرح مقرر کی ہے' نہ نصاب۔ تمکن فی الارض یعنی الگ مملکت کے قیام سے مقصد یہ ہے کہ اس مملکت کی تمام آمدن ''ایتائے زکوٰۃ'' کے مقصد کو پورا کرنے کا ذریعہ ہو گی۔ لیکن اس قسم کا اسلامی نظام بتدریج قائم ہو گا۔ جس عرصہ میں یہ ہنوز زیرِ تشکیل ہو گا' اس میں جماعت کے افراد سے (آج کی اصطلاح میں) چندے اور عطیے لیے جائیں گے یا ہنگامی ٹیکس عائد کیے جائیں گے۔ ان کے لیے قرآنِ کریم نے ''صدقات'' کی اصطلاح استعمال کی ہے۔ ہمارے ہاں عام طور پر ''صدقات'' اور ''زکوٰۃ'' کو مرادف المعنی سمجھا جاتا ہے حتیٰ کہ قرآنِ کریم نے ''صدقات'' کے خرچ کی جو مدات بتائی ہیں (9:60) انہیں بھی زکوٰۃ کے مصرف کی مدات سمجھا جاتا ہے۔ لیکن قرآنِ کریم نے ان اصطلاحات کو الگ الگ مفہوم کے لیے استعمال کیا ہے۔ (حوالہ: پرویزؒ: لغات القرآن جلد دوم' 1960' ص ص۔ 810 - 809)

اَلْمُنْکَرِ، جس کا نام انہوں نے وعظ رکھ لیا ہے ہم نے ان کا مفہوم متعین کیا۔ کہا کہ یہاں لفظ امر ہے۔ اس مملکت میں یہ حکم دیں گے، حکم کے ذریعے وہ کام ہوں گے اور پھر جس امر کے متعلق اس دوران میں جو کچھ میں نے لکھا ہے وہ قرآن کی رو سے تھا جس میں بتایا گیا تھا کہ یہ حکم ہے، یہ امر ہے۔ حکماً یہ چیز کریں گے۔ پھر ان کے ہاں بالمعروف آیا ہے جس کے متعلق انہوں نے کہا ہے کہ یہ کچھ مروجہ شرط ہے۔ ہم نے پھر کہا کہ یہ جو ال اسکے اوپر ہے یہ خاص احکام ہیں جو اپنی الگ مملکت میں چل سکتے ہیں۔ یہ بڑی عجیب باتیں تھیں، مگر یہ مخالفت پہ آمادہ تھے اور مخالفت کیے جا رہے تھے۔

ابوالکلام آزاد کی غلط فہمی پر قرآنی دلیل

عزیزانِ من! ہمیں یہ سمجھانا پڑا کہ المعروف کیا ہوتا ہے۔ اسی طرح المعروف [1] کے ساتھ المنکر [2] بھی سمجھانا پڑا۔ معروف تو وہی ہے جنہیں قرآن صحیح تسلیم acknowledge یا Recognise کرتا ہے۔ یہ دونوں اصطلاحات ''ال'' کے ساتھ ہیں۔ ہر چیز معروف

---

[1] ''معروف'' سے مراد ہیں وہ تمام امور جنہیں ایک قرآنی معاشرہ اپنے ہاں تسلیم (Recognise) کرلے۔ اور ''منکر'' وہ تمام باتیں جنہیں وہ صحیح تسلیم نہ کرے، جنہیں وہ Recognise نہ کرے۔ المعروف قرآنِ کریم کی جامع اصطلاح ہے، جس میں قرآنی نظام کے نافذ کردہ احکام وقوانین سے لے کر اس معاشرہ کے روزمرہ کے رسوم وآداب تک سب آجاتے ہیں۔ ظاہر ہے ان رسوم وآداب کے بنیادی اصول تو غیر متبدل رہیں گے کیونکہ وہ قرآنِ کریم نے متعین کردیئے ہیں لیکن ان کی شکل وصورت اور تفاصیل جزئیات زمانہ کے تقاضوں کے ساتھ بدلتی رہیں گی۔ لہٰذا ایک قرآنی معاشرہ جن آئین وآداب کو اپنے وقت میں Recognise (تسلیم) کرلے، وہ معروف ہوں گے، خواہ وہ پہلے سے موجود ہوں یا وہ انہیں خود تجویز کرے حتیٰ کہ کسی قوم یا ملک کے رسم ورواج کو بھی وہ اپنے ہاں رائج رہنے دے تو وہ بھی معروف کے ذیل میں آئیں گے۔ لیکن اس کے ساتھ اس شرط کو بھی پیش نظر رکھیے کہ ان میں سے کوئی چیز قرآنِ کریم کے اصول واحکام کے خلاف نہیں ہونی چاہیے۔ ایسی بات منکر کے ذیل میں آئے گی۔ (پرویز: لغات القرآن جلد سوم، 1961، ص۔ 1153)

[2] مختصراً یوں سمجھیے کہ قرآنی معاشرہ اپنی زندگی کے معمولات کے لیے قرآنِ کریم کے غیر متبدل اصولوں کی روشنی میں آئین وقوانین اور قواعد وضوابط مرتب کرتا ہے۔ جو باتیں اس طرح سے قابلِ قبول ٹھہرائی جاتی ہیں انہیں معروف کہا جاتا ہے۔ یعنی Recognise by the Society (جسے معاشرہ تسلیم کرے) اور جن باتوں کو ناپسندیدہ یا ناقابلِ قبول قرار دیا جاتا ہے انہیں منکر کہا جاتا ہے۔ قرآنِ کریم کی ان ہر دو جامع اصطلاحات (معروف اور منکر) کے تحت ایک اسلامی معاشرہ کے تمام محمود و نامحمود، معقول و نامعقول، مقبول و نامقبول، پسندیدہ اور غیر پسندیدہ امور آجاتے ہیں۔ اور اس تقسیم وتفریق کا معیار ہوتا ہے قرآنِ کریم کا غیر متبدل ضابطہ۔ یہ جو کہا جاتا ہے کہ معروف وہ ہیں جنہیں انسان کی ''فطرت'' پہچان لے کہ وہ صحیح ہے اور منکر وہ ہیں جن سے اس کی ''فطرت'' ابا (یا نفرت) کرے۔ تو یہ غیر قرآنی تصور ہے۔ انسان کے اندر کوئی ایسی چیز نہیں جو حق اور باطل کا امتیاز از خود کر سکے۔ اگر اس کے اندر کوئی ایسی چیز ہوتی (جیسے حیوانات میں جبلت 'Instinct' ہوتی ہے) تو اس کے لیے وحی کی ضرورت ہی نہ تھی۔ لہٰذا معروف وہ ہے جسے وحی قابلِ قبول قرار دے اور منکر وہ ہے جسے وہ ناپسندیدہ ٹھہرائے۔ ان میں مملکت کے قوانین وآئین سے لے کر معاشرہ کے تمام قواعد وضوابط اور رسوم ورواج سب آجاتے ہیں۔ وحی نے (بجز چند احکام) ان باتوں کی فہرستیں مرتب کر کے نہیں دیں۔ اس نے عام اصول دے دیئے ہیں جن کے ماتحت قرآنی معاشرہ اس قسم کی فہرستیں خود مرتب کرتا ہے۔ (پرویزؒ: لغات القرآن جلد چہارم، 1961، ص۔ 1662)

نہیں ہے۔ آپ کو یاد ہے میری ابوالکلام آزاد (1958 -1888) سے جو جنگ ہوئی تھی۔ اس نے کہا تھا کہ عالمگیر سچائیاں ہر مذہب میں یکساں طور پہ پائی جاتی ہیں۔ اگر ہر مذہب والا اپنے اپنے طور پر نیک عملی اور خدا پرستی کی زندگی اختیار کرلے تو وہ وہی ہے جو کچھ اسلام چاہتا ہے۔ اس کے بعد تو پھر وہ چیز آئی کہ صداقت کیا ہوتی ہے؟ اور جسے تم نیک عملی کہتے ہو' اس کی Definition (تعریف) کیا ہے؟ اس نے معروف کہا تھا۔ ویسے تو میں نے کہا ہے کہ یہ لوگ بڑے عالم تھے' لیکن اگر قرآن ذرا پیچھے ہٹ جائے تو ساری جہالت آ جاتی ہے۔ قرآن صرف معروف نہیں کہتا' المعروف کہتا ہے اور معروف اس کے اندر ہے باہر نہیں ہے۔ اس پر میرے مضامین موجود ہیں' ماہنامہ طلوعِ اسلام کی فائلیں موجود ہیں' انہیں موجود رکھیں' شاید آنے والے مؤرخ اس سے فائدہ اٹھائیں۔

قرآن کریم کے نزدیک معروف حکم دینا ہے' وعظ کہنا نہیں ہے

عزیزانِ من! قرآنِ کریم میں جس چیز کو معروف کہا گیا ہے' وہ معروف ہے اور جسے اس نے منکر کہا ہے' وہ منکر ہے۔ قرآنِ کریم کے نزدیک معروف ''حکم دینا ہے وعظ کہنا نہیں ہے۔'' یہ حکم دینا ہے۔ اسی کو قانون کہتے ہیں۔ یہ **وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ** (22:41) ہے۔ یہ ان چیزوں سے قانوناً روک دینا ہے جنہیں قرآن کریم تسلیم نہیں کرتا۔ یہ وعظ نہیں ہے۔ ہزار برس سے تم وعظ کہتے چلے آ رہے ہو۔ اس قوم کو اس وعظ سے کیا ملا۔ اس کا کیا نتیجہ نکلا اور آخر میں ایک ہی بات اس نے کہی جس کا ملخص یہ ہے کہ **وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ** (22:41)۔ آخرالامر ہر معاملہ کا فیصلہ قانونِ خداوندی کے مطابق ہوگا۔ یہ بڑی عجیب آیت ہے۔ سوال یہ ہے کہ تمام معاملات' جو کچھ بھی امور ہوں' ان کے متعلق تمہارا طریق کار کیا ہوگا؟

باہمی مشورے کے بعد آخری فیصلہ خدا کی کتاب کے مطابق ہوگا

عزیزانِ من! ذرا ''**وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ** '' الفاظ کو یاد رکھیے امور تو تمام معاملات ہی ہیں۔ مسلمانوں کی مملکت کے متعلق کہا یہ گیا ہے کہ **وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ** (42:38)۔ تمام امور کے فیصلے باہمی مشاورت سے ہوں گے' قوانینِ خداوندی کی حدود میں رہتے ہوئے ہوں گے۔ زندگی سے متعلق جتنے بھی امور سامنے آئیں گے تو پہلی چیز یہ ہوگی کہ وہ باہمی مشاورت سے کریں گے' باہمی مشورہ پہلی شرط ہوگا۔ تو کیا اگر بہت اچھا مشورہ ہو گیا تو مشورے کے بعد مغربی ڈیماکریسی ہوگی؟ کیا 51 کی رائے تسلیم کرلی جائے گی کہ وہ حق ہے؟ کہا کہ نہیں' مشورے کے بعد یہ **عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ** آخرالامر The end of this discussion **لِلّٰهِ** ہوگا۔ یعنی **وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ** (22:41)۔ یہ خدا کے حکم کے مطابق ہوگا۔ یہ چیز کہاں سے ملے گی؟ اس کے لیے اس نے کہا ہے کہ **وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ** (5:44)۔ جو بھی خدا کی کتاب کے مطابق فیصلہ نہیں کرتے' ان کو کافر کہا جاتا ہے۔ یہ آپ دیکھتے ہیں۔ **وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ** (22:41) یہ کیا چیزیں ہیں عزیزانِ من! یہ قرآن ہے۔ سوچا کرو۔ بات صاف ہوگئی کیونکہ یہ سارا

کچھ جو ہو رہا تھا اس کی غایت یہاں تت کڈ کے رکھ دتا۔ ❶ تمہاری مدافعت عملاً ہوگئی، تمہیں کوئی خطرہ نہیں ہوگا، تم مامون ہوگئے۔ مامون ہونا تو ایک سلبی Negative چیز ہے کہ بس اطمینان ہوگیا۔ یہ تو حیوانی زندگی ہے کیونکہ جب ہر حیوان کو اپنے خطرے کی طرف سے امن ہوجائے تو اس کے سامنے پھر زندگی کا کوئی اور مقصد نہیں رہتا۔ یہ امر اس لیے تھا کہ تمہیں دنیا میں مذہبی آزادی کو برقرار رکھنا ہے۔ یہ پہلی چیز ہے۔

قرآنی معاشرہ کی صفات

عزیزانِ من! مذہبی آزادی برقرار رکھنے کے بعد مثبت یہ ہے کہ تمہاری اپنی مملکت قائم ہو، اس میں اقامتِ صلوٰۃ ہو، تمام فرائض جو خدا کی طرف سے عائد کیے گئے ہیں کی ادائیگی کے لیے ایسا معاشرہ قائم کیا جائے گا کہ افراد اس کے پیچھے پیچھے خود بخود چلتے چلے جائیں۔ صلوٰۃ از خود چلنے کا نام ہوتی ہے۔ معاشرہ ایسا ہوتا ہے جس کے اندر یہ از خود چلتے ہیں جیسے آج اس معاملے کے اندر آدمی Unintentionally (غیر شعوری طور پہ) ہی جھوٹ بولتا ہے، خلافِ قانون کام کرتا ہے، رشوت دیتا ہے، یوں کر رہا ہوتا ہے۔ یہ روزمرہ کی بات ہے۔ اسی طرح اس معاشرے میں فرد از خود قرآنی احکامات کے مطابق چلے۔ آج تو ہمارے ذہن میں نہیں آتا کہ دیانت اور صداقت پر غیر شعوری طور پہ از خود کیسے چلا جائے۔ اگرچہ یوں کہیے کہ میں آخری عمر میں یہی کہا کرتا ہوں کہ بھائی صاحب! یہ ہماری خوش نصیبی ہے کہ ہمارا بچپن اس ماضی میں گزرا ہے کہ معاشرے کے اندر اس قسم کی بات کے ابھی کچھ نشانات ہیں جن کی بنا پر یہ بات سمجھائی جاسکتی ہے۔

مسلمان کی بات پر جھوٹ حیرت کی بات تھی

عزیزانِ من! مجھے آج تک اتنا یاد ہے کہ بچپن میں ہمارے محلے میں ہندو دوکاندار ہوتے تھے۔ ہم لوگوں کے ہاں مکان مسلمانوں کے ہوتے تھے اور دوکاندار، بڑے ساہوکار، ہندو ہوتے تھے۔ وہ ہم مسلمانوں کے بچوں کو میاں جی کہا کرتے تھے۔ ایک دن یونہی میں باہر نکلا۔ میں دوسری تیسری جماعت کا طالب علم تھا۔ مجھے یاد ہے کہ تختی میرے ہاتھ میں تھی۔ وہ ہندو دوکاندار، تیل بیچنے والا لالہ، بڑا اچھا تھا۔ جونہی میں نکلا تو اس نے کہا میاں جی! میاں جی! اے ذرا گل سن۔ ❷ میں کھڑا ہوگیا۔ وہ کہنے لگا کہ ویکھیا نا ہنیر خدا دا ❸۔ اس کے سامنے داڑھی والا ایک تیلی بھی کھڑا تھا۔ کہنے لگا کہ جی! یہ مسلمان ہو کے جھوٹ بولدے نیں۔ ❹ یہ جملہ ان کانوں نے سنا ہوا ہے۔

---

❶ یہاں اس (آیت) کا نچوڑ، لب لباب بتا دیا۔

❷ میری ذرا بات سنو۔

❸ دیکھنا اندھیر نگری چوپٹ راج

❹ یہ مسلمان ہو کر جھوٹ بولتے ہیں۔

عزیزانِ من! اسے تعجب ہو رہا تھا' کوئی اور وہاں نہیں تھا' صبح ہی کا وقت تھا' میں ہی نکلا تو اس نے اس کی شہادت دینے کے لیے اس تعجب سے مجھے ہی پکارا۔ میں یہ الفاظ ساری عمر نہیں بھول سکتا: اومیاں جی ویکھدے ہو قیامت آ گئی اے۔ اے مسلمان ہو کے جھوٹ بولدا پیا اے۔ ❶ جبکہ آج اگر کوئی ہمیں آ کے کہہ بھی دے کہ اس نے وہاں بات سچی کہی' دوسرا کہتا ہے کہ نہیں' کہیں منافقت ہی برتی ہوگی۔ ہاں خیر سنیئے اُس قرآنی معاشرے میں اقامت الصلوٰۃ از خود اس طرح سے چلے گا۔ معاشرے کی روش ہی ایسی ہوگی۔ عزیزانِ من! اب کچھ مشکل چیزیں نہیں۔ کبھی میں پھر بتاؤں گا اگر آپ کا ہر کام قانون قاعدے کے مطابق ہو اور ملک میں قانون و قاعدہ خدا کے اصولوں کے مطابق ہو تو کسی کو ضرورت کیا پڑی ہے کہ جھوٹ بولے' اور بے ایمانی کرے' اور لاقانونیت کرے۔ وہی بات جو میں کہا کرتا ہوں' یاد رکھو! وہی ضرب المثل کہ مینوں کی لوڑ پئی سی میں جھوٹ بولدا۔ جھوٹ بولدا اے آدمی' جے اونوں لوڑ پیندی اے جھوٹ بولن دی۔ ایویں نئیں بولدا۔ ❷ غلط معاشرے میں اسے قدم قدم پر لوڑ پیندی اے جھوٹ بولن دی۔ ❸ اقامتِ صلوٰۃ کے معنی ہیں ایسا معاشرہ قائم کر دینا جس میں کسی کو ''لوڑ ہی نہ پئے جھوٹ بولن دی۔'' ❹ جس میں از خود خدائی فرائض کے پیچھے پیچھے چلتا جائے اور اس سے مقصود ہے **اٰتَوُا الزَّكٰوةَ** یعنی نوعِ انسانی کی پرورش اور نشوونما۔ سوال یہ ہے کہ اس کام کے لیے معاشرے کا نظام کیسے قائم ہو؟ جواب دیا: امروا بالمعروف سے' یعنی ہر اس چیز سے جسے خدا معروف قرار دیتا ہے' صحیح Acknowledge (تسلیم) کرتا ہے۔ یہ امر بنے' یہ قانون بنے' یہ کچھ کرنے کے اصول ہونگے اور اس سے رکنے کی کیا چیز ہونگی؟ کہا کہ **وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ** یعنی جن جن چیزوں کو وہ قابلِ نفرت قرار دیتا ہے' ان سے قانوناً روکا جائے گا۔ کہا کہ تمہیں المعروف اور المنکر کی پوری قرآن کے اندر لسٹیں نہیں ملیں گی' بہت سے معاملات ایسے آئینگے' جن کے فیصلے آپ کو خود کرنے ہونگے۔ **وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ** اور وہ فیصلے خدا کے قانون کے مطابق ہوں گے۔ ان فیصلوں کو کرنے کے لیے تم آپس میں مشورہ کرو گے یعنی **اَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ** (42:38) اور یہ تو ایسی اہم چیز تھی کہ حضور نبی اکرم ﷺ سے فرما دیا کہ اے رسول ﷺ! ملکی حالات میں صحابہ رضی اللہ عنہم سے مشورہ کیا کرو۔

ایک عظیم رہنمائی: اے رسول ﷺ! ملکی معاملات میں صحابہ رضی اللہ عنہم سے مشورہ کیا کرو

عزیزانِ من! یہ بڑی اہم بات ہے کہ اے رسول! ملکی معاملات میں صحابہؓ سے مشورہ کر لیا کرو۔ آپ اتنی سی بات کا اندازہ لگایئے

---

❶ میاں جی! دیکھیں تو سہی کہ یہ کیا قیامت ہے کہ یہ مسلمان ہو کر جھوٹ بولتا ہے۔

❷ مجھے جھوٹ بولنے کی کیا ضرورت تھی۔ آدمی اس وقت جھوٹ بولتا ہے جب اسے جھوٹ بولنے کی ضرورت ہوتی ہے۔ ضرورت کے بغیر وہ جھوٹ نہیں بولتا۔

❸ جھوٹ بولنے کی ضرورت پڑتی ہے۔

❹ جھوٹ بولنے کی ضرورت ہی نہ پڑے۔

تو یوں نظر آتا ہے کہ حضور ﷺ سے جو کہا گیا کہ مشورہ کر لیا کرو' آج اگر کسی حضرت جی کے حجرے میں' ان کی صحبت میں' یا کسی بہت بڑے عالمِ دین کے سامنے' ان کے شاگرد یا ان کے مرید بیٹھے ہوئے ہوں تو کیا کسی کی جرأت ہے کہ وہ انہیں کوئی بات کہہ سکیں خواہ یہ بات مشورۃً ہی کیوں نہ ہو؟ نہیں' ایسا نہیں ہو سکتا۔ کیا مجال کہ کوئی ان کے خلاف کچھ کہہ دیں لیکن یہ تو قرآن کی بات ہے کہ ان کا آپس میں مشورہ ہوگا۔ حضور ﷺ کو حکم دیا گیا ہے۔ **شَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ** (3:159) ان سے مشورہ کرو۔ تو جن سے مشورہ کیا جائے گا' ان سے برابری کی حیثیت ہوگی' ان کو آزادی ہوگی کہ کھل کے آئیں خواہ وہ خلاف ہی کیوں نہ جائیں۔

رسولِؐ خدا بھی اپنی رائے دوسروں پر زبردستی مسلط نہیں کرتے

عزیزانِ من! یہ روایت سننے والا' جس پر ایمان لا کے یہ مسلمان ہوئے ہیں' جس کے فیصلے کے خلاف قرآن کہتا ہے کہ تمہارے دل کی گہرائیوں میں بھی کوئی کبیدگی نہ آئے' اس کا مقام یہ ہے لیکن پھر بھی وہ مشورہ کرتا ہے۔ اس کی کیفیت یہ ہے کہ اپنی رائے ٹھونستا نہیں ہے' مشورے کے لیے پیش کرتا ہے' انہیں اتنی جرأتیں دلا رکھی ہیں' انہیں اتنا بیباک کر رکھا ہے کہ وہ بیباکانہ اس کے خلاف مشورے دیتے۔ کہیں مذہب کی دنیا میں بھی یہ چیزیں سامنے آتی ہیں؟ کہیں آپ کو اس کی مثال نہیں ملتی' یہ ہے اسوہ رسول اللہ۔ یہ ہے اتباع سنتِ رسول اللہ ﷺ۔ عزیزانِ من! آپؐ سے کہا کہ **وَاَمْرُهُمْ شُوْرٰى بَيْنَهُمْ** (42:38)۔ باہمی مشورہ کرو۔ تو مشاورت کے بعد کیا ہو گا؟ کہا کہ **وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ** (22:41)۔ تمام معاملات کے فیصلے آخر الامر خدا کے قانون کے مطابق ہوں گے۔ اب نظر آ گیا کہ اگر یہ المعروف اور المنکر کی پوری لسٹیں' ساری تفصیلات' قرآن میں ہوتیں تو کوئی معاملہ باقی رہ ہی نہ جاتا کہ جس میں مشورے کی ضرورت پڑتی۔ تو نظر آیا کہ یہ المعروف اور المنکر کے لیے بہت سے امور ایسے آئینگے کہ جن کے متعلق ان لسٹوں میں تمہیں یوں نہیں ملے گا' Specifically متعین طور پر یہ حکم نہیں ملیں گے لیکن اس نے تمہیں ایسے بھی نہیں چھوڑ دیا۔ یہ امور آئیں گے اس لیے مشورہ کرو لیکن یہ للہ ہو جسے Controlled Democracy (منضبط جمہوریت) کہتے ہیں۔ کہا کہ مشورے کرو اور اللہ کے لیے کرو۔ اس میں اللہ کے معنی جیسا میں نے کہا ہے کتاب اللہ ہے۔ اس لیے کہا کہ کتاب اللہ کے مطابق فیصلے کرو۔ رسول اللہ ﷺ کو بھی یہ حکم دیا کہ تم انجام کار کتاب اللہ کے مطابق فیصلہ کرو۔ ان سے بھی یہ کہا کہ **مَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَا اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ** (5:44)۔ جو کتاب اللہ کے مطابق فیصلہ نہیں کرتے وہ کافر ہیں۔ اس لیے کتاب اللہ کے مطابق آخر میں فیصلے کیا کرو۔ یہ پورا نظام آ گیا تھا' غرض و غایت آ گئی' اسلامی مملکت کی اسلام کے متعلق یہ شرط قرار دیدی کہ اپنی آزاد مملکت کے بغیر اسلام کا تصور ہی نہیں ہوتا۔ اپنی الگ مملکت کے بغیر مذہب رہ سکتا ہے مگر دین نہیں رہ سکتا۔ اسلامی مملکت کے بنیادی فرائض اقامتِ صلوٰۃ' ایتائے زکوٰۃ' امر بالمعروف' نہی عن المنکر ہیں۔ یہاں پوری کی پوری لسٹیں Exhuast (پوری) نہیں ہو جاتیں۔ یہ پوری نہیں آ جاتیں' متعدد امور ایسے ہیں کہ اس کے عاقبۃ الامور

رہ جائیں گے جن کے اوپر باہمی مشورہ کرنا ہوگا۔ مشاورت کے بعد فیصلہ کن بات جو ہوگی وہ کتاب اللہ کے مطابق ہوگی۔ وہاں سے تمہیں حکم ملا کرے گا۔ اس کی اتنی اہمیت تھی۔

مفتوحہ زمینوں کے متعلق حضرت عمر رضی اللہ عنہ کا فیصلہ

عزیزانِ من! عہد فاروقی رضی اللہ عنہ (13-24 A.H بمطابق 634- 645 A.D) میں باہمی مشورے کا نیا سلسلہ سامنے آیا۔ یہ اس دَور کی بات ہے جب عراق کی مفتوحہ زمینوں کے متعلق فیصلہ کرنا تھا کیونکہ مشاورت کا حکم تھا۔ آپ حیران ہونگے کہ ایک مہینے تک میٹنگ ہوتی رہیں۔ آخری میٹنگ میں حضرتِ عمر رضی اللہ عنہ آئے اور بہت خوش تھے۔ کہنے لگے کہ میرے عزیزو اور دوستو! اللہ تعالیٰ کا بڑا احسان ہے کہ جو بات مہینے بھر تک غور وفکر کے بعد سامنے نہیں آئی تھی' آپ لوگ مشورہ کرتے تھے' میں سنتا تھا' لیکن میں ہر وقت اس فکر میں ڈوبا رہتا تھا کہ قرآن سے مجھے اس کے متعلق حقائق مل جائیں۔ اللہ کا احسان ہے کہ اس سلسلہ میں رات مجھے قرآن سے حقائق مل گئے اور پھر انہوں نے قرآن کی آیتیں پیش کیں اور کہا کہ بتاؤ کہ اس کے متعلق جو کچھ میں نے قرآن کا ایک مفہوم سمجھا ہے کیا آپ اس سے Agree (اتفاق) کرتے ہیں؟ انہوں نے کہا ہم Agree (اتفاق) کرتے ہیں۔ کہنے لگے کہ معاملے کا فیصلہ ہوگیا۔ عزیزانِ من! **وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ** (22:41) کہ ہر معاملہ کا فیصلہ قانونِ خداوندی کے مطابق ہوگا۔ اب آپ کی سمجھ میں یہ آیت آئی جس میں کہا تھا کہ **اَلَّذِيْنَ اِنْ مَّكَّنّٰهُمْ فِى الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّكٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْكَرِ وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ** (22:41)۔ (مظلوموں کی یہ جماعت جو دنیا سے ظلم اور سرکشی کو مٹانے کے لیے اٹھی ہے) اگر ہم نے انہیں ملک میں حکومت عطا کردی' انہیں اقتدار حاصل ہوگیا (تو یہ ظلم اور استبداد نہیں کریں گے)' یہ نظامِ صلوٰۃ قائم کریں گے (تاکہ تمام افرادِ معاشرہ' قوانینِ خداوندی کا اتباع کرتے چلے جائیں) یہ تمام نوعِ انسانی کو سامانِ نشو ونما بہم پہنچائیں گے۔ یہ ان احکام کو نافذ کریں گے جنہیں قانونِ خداوندی (قرآن) صحیح تسلیم کرتا ہے اور تمام ایسے امور سے روکیں گے جنہیں وہ جائز قرار نہیں دیتا۔ غرضیکہ (یہ ہر پیش آمدہ معاملہ کے متعلق دیکھیں گے کہ اس باب میں خدا کا قانون کیا کہتا ہے۔ اس طرح ان کی حکومت میں بحث وتمحیص اور باہمی مشاورت کے بعد' آخر الامر) ہر معاملہ کا فیصلہ قانونِ خداوندی کے مطابق ہوگا۔

سورۃ الحج کی آیت 41 تک ہم آ گئے' عزیزانِ من! 42 سے آگے چلیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّا ط اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ط

❀❀ ...... ❀❀❀ ...... ❀❀

چھٹا باب: **سورۃ الحج** (آیات 42 تا 51)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اِنَّ عِبَادِیْ لَیْسَ لَكَ عَلَیْهِمْ سُلْطٰنٌ اِلَّا مَنِ اتَّبَعَكَ مِنَ الْغٰوِیْنَ﴿۴۲﴾
وَاِنَّ جَهَنَّمَ لَمَوْعِدُهُمْ اَجْمَعِیْنَ﴿۴۳﴾
لَهَا سَبْعَةُ اَبْوَابٍؕ لِكُلِّ بَابٍ مِّنْهُمْ جُزْءٌ مَّقْسُوْمٌ﴿۴۴﴾
اِنَّ الْمُتَّقِیْنَ فِیْ جَنّٰتٍ وَّعُیُوْنٍؕ﴿۴۵﴾
اُدْخُلُوْهَا بِسَلٰمٍ اٰمِنِیْنَ﴿۴۶﴾
وَنَزَعْنَا مَا فِیْ صُدُوْرِهِمْ مِّنْ غِلٍّ اِخْوَانًا عَلٰى سُرُرٍ مُّتَقٰبِلِیْنَ﴿۴۷﴾
لَا یَمَسُّهُمْ فِیْهَا نَصَبٌ وَّمَا هُمْ مِّنْهَا بِمُخْرَجِیْنَ﴿۴۸﴾
نَبِّئْ عِبَادِیْۤ اَنِّیْۤ اَنَا الْغَفُوْرُ الرَّحِیْمُ﴿۴۹﴾
وَاَنَّ عَذَابِیْ هُوَ الْعَذَابُ الْاَلِیْمُ﴿۵۰﴾
وَنَبِّئْهُمْ عَنْ ضَیْفِ اِبْرٰهِیْمَ﴿۵۱﴾

عزیزانِ من! آج جنوری 1977ء کی 16 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ الحج کی آیت 42 سے ہو رہا ہے: (22:42)۔ اس قدر سردی کے باوجود آپ احباب کا درس کے لیے وقت پہ آ جانا' آپ کی قرآنِ کریم سے محبت کی دلیل ہے۔ اس پہ مجھے بڑی خوشی ہوئی ہے۔

ایک اصولی چیز کا بیان

سلسلہ کلام تک آنے سے پہلے میں ایک اصولی چیز پیشِ خدمت کر دوں کہ مذہب کی دنیا میں عام خیال یہی ہوتا ہے کہ یہ حضراتِ انبیائے کرام علیہم السلام کچھ عبادت' پرستش' پوجا پاٹ' Worship' بندگی کے طور طریق سکھانے کے لیے آتے تھے۔ وہ لوگوں کی خدا کے ساتھ لَو لگانے کے لیے آتے تھے۔ بس یہ ان کا مشن ہوتا تھا۔ اس لیے کہ وہ جو اب انبیاء کرام علیہم السلام کے اپنے آپ کو وارث کہتے ہیں' ان کا تو یہی مشن ہوتا ہے۔ انہوں نے اپنے آپ کو یہیں تک محدود کر لیا ہے۔ وہ کہتے یہ ہیں کہ بس انبیاء کرام علیہم السلام بھی اسی کے لیے آیا

تھے۔اس کے برعکس حقیقت یہ ہے کہ یہ حضرات صرف اس کے لیے مبعوث نہیں ہوتے تھے۔

عزیزانِ من! انبیاء کرام علیہم السلام یہ کہنے کے لیے آتے تھے کہ تم نے جو اپنے لیے یہ نظامِ زندگی وضع کر کے اختیار کر رکھا ہے' اس کا لازمی نتیجہ ہلاکت اور تباہی ہوتا ہے۔ اُس کی جگہ یہ نظام جو میں پیش کر رہا ہوں' اگر تم نے اسے اختیار کر لیا تو اس کے نتائج نہایت خوشگوار اور انسانیت ساز ہونگے۔ اُس سے اس زندگی میں بھی تمہاری تمدنی زندگی جنت بداماں ہو جائے گی اور زندگی یہیں ختم نہیں ہو جاتی' آگے چل کے بھی تمہیں خوشگواریوں کی جنت نصیب ہوگی۔ وہ ایک نظام کو تبدیل کرنے کے لیے آتے تھے۔ پہلے تو وہ انہیں Warn (تنبیہ) کرتے تھے۔ یہ انگریزی کا لفظ ہے یہ اس کے لیے صحیح لفظ ہے۔ قرآن بار بار انبیاء کرام کو نذیر کہتا ہے۔ ہر نبی اپنے آپ کو نذیر کہتا تھا۔ ابھی ہمارے سامنے یہ چیز آئے گی کہ اِنَّمَآ اَنَا لَكُمْ نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ (22:49)۔ میری حیثیت صرف اتنی ہے کہ میں تمہیں خدا کے قانونِ مکافات سے کھلے کھلے الفاظ میں آگاہ کرتا ہوں۔ وہ اپنے آپ کو نذیر کہتا تھا یہی وہ تنبیہ ہے جسے ہم Warning کہتے ہیں جس کا مطلب یہ ہے کہ تمہارے موجودہ غلط نظام کے نتائج تباہ کن ہونگے۔ اب چونکہ جن لوگوں نے وہ نظام قائم کر رکھا ہوتا تھا وہ اس وقت بڑی خوشحالیوں کی پینگیں جھول رہے ہوتے تھے انہیں اس نظام میں دولت' حشمت' ثروت' قوت اور اقتدار میسر ہوتا تھا تو وہ کہتے تھے کہ تم غلط کہتے ہو کہ اس نظام کا نتیجہ تباہی ہوگا۔ ہم تباہ نہیں ہو سکتے۔ تم دیکھتے نہیں ہو کہ ہمیں اس وقت کتنا کچھ حاصل ہے۔ اس کے جواب میں وہ انہیں یہ کہتے تھے کہ یہ جو کچھ تمہیں نظر آتا ہے' یہ تو اس سنکھیا کھانے والے کی طرح ہے کہ جب وہ کھاتا ہے تو ابتدا میں خون میں بڑی سرخی' حرارت اور قوت آجاتی ہے اور یہ سمجھا جاتا ہے کہ وہ بڑا صحت مند ہو گیا ہے لیکن آخر الامر اس کا Accumulative Effect (مجموعی اثر) تباہی ہوتا ہے۔ جب اس کا یہ Accumulative Effect (مجموعی اثر) تمہارے سامنے آئے گا تو تم دیکھو گے کہ تم تباہ اور برباد ہو جاؤ گے۔ اپنے آپ کو اس فریب میں نہ رکھو کیونکہ اس نظام میں تمہیں اِس وقت خوشحالیاں اور خوشگواریاں میسر ہیں اس لیے سمجھتے ہو کہ یہ نظام صحیح ہے۔ وہ یہ کہتے تھے۔ ان میں سے جو لوگ اس بات پہ کان دھرتے تھے کہ واقعی یہ نظام غلط ہے' صحیح نظام ہونا چاہیے' وہ اس پیغام دینے والے یا اس وارننگ (Warning۔تنبیہ) دینے والے کے ساتھ ہو جاتے تھے۔ اب ان انبیاء کرام کا اگلا قدم یہ تھا کہ وہ انہیں ساتھ لے کر' چھوٹے سے پیمانے پر ہی سہی' وہ نظامِ تمدن قائم کر کے دکھا دیں جس کا نتیجہ خوشگواریاں اور صحیح معنوں میں خوشحالیاں ہیں۔ یہ ساری کشمکش یہی ہوتی تھی' یہ آسمانی انقلاب کے داعی آیا ہی اس لیے کرتے تھے۔ آپ اس اصولی چیز کو ہمیشہ ذہن میں رکھیے۔

حق و باطل کی کشمکش ملک گیری کے لیے نہیں ہوتی

عزیزانِ من! اب اس اصول کو سامنے رکھنے کے بعد اس آیت پہ آیئے جہاں سے آج کے درس کی ابتداء ہوتی ہے۔ یہ سورۃ الحج کی 42 آیت ہے۔ سابقہ آیات میں اسی کشمکش کا ذکر تھا کہ یہ لوگ غلط نظام پہ مصر ہیں' تم انہیں اس کی دعوت دیتے ہو' یہ اس پہ کان نہیں دھرتے۔ اب تم اس نظام کو قائم کرنے کے لیے کوشش کر رہے ہو تو یہ اس کے راستے میں مزاحم ہو رہے ہیں' اسے قائم نہیں کرنے دیتے حتیٰ

کہ اب یہ تم پر حملہ آور ہو گئے ہیں، تمہیں ختم کر دینا چاہتے ہیں۔ اب اس مقام پہ تمہیں اجازت دی جاتی ہے کہ تم اپنی مدافعت کے لیے میدانِ جنگ میں نکل سکتے ہو۔ سوال یہ ہے کہ کاہے کے لیے میدانِ جنگ میں نکل سکتے ہو؟ کیا دشمن کی زمینوں پر، ان کے ملکوں پر قبضہ کرنے کے لیے نکل سکتے ہو؟ کہا کہ نہیں، اس کام کے لیے نہیں۔ اس کے برعکس آج کے ہمارے مفسرین کے الفاظ بھی سن لیجیے۔ کہتے ہیں کہ ان کی عورتوں کو......معاذ اللہ......لونڈیاں بنانے کے لیے میدانِ جنگ میں نکل سکتے ہو۔ ایسا نہیں ہے بلکہ یہ اس لیے ہے کہ یہ جو تمہارے راستے میں اس صحیح نظام کے قائم کرنے میں مزاحمت کرتے ہیں، وہ مزاحمت نہ رہے اور تم ایک ایسا نظام قائم کر سکو۔ اس لیے کہا کہ اَلَّذِیْنَ اِنْ مَّکَّنّٰهُمْ فِی الْاَرْضِ اَقَامُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتَوُا الزَّکٰوةَ وَاَمَرُوْا بِالْمَعْرُوْفِ وَنَهَوْا عَنِ الْمُنْکَرِ وَ لِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ (22:41)۔ اگر ہم نے انہیں ملک میں حکومت عطا کر دی، انہیں اقتدار حاصل ہو گیا (تو یہ ظلم اور استبداد نہیں کریں گے) یہ نظامِ صلوٰۃ قائم کریں گے (تا کہ تمام افرادِ معاشرہ قوانینِ خداوندی کا اتباع کرتے چلے جائیں)۔ یہ تمام نوعِ انسانی کو سامانِ نشو ونما بہم پہنچائیں گے۔ یہ ان احکام کو نافذ کریں گے جنہیں قانونِ خداوندی (قرآن) صحیح تسلیم کرتا ہے۔ اور تمام ایسے کاموں سے روکیں گے جنہیں وہ جائز قرار نہیں دیتا۔ غرضیکہ (یہ ہر پیش آنے والے معاملے کے متعلق دیکھیں گے کہ اس بات میں خدا کا قانون کیا کہتا ہے۔ اس طرح ان کی حکومت میں، بحث و تمحیص اور باہمی مشاورت کے بعد، آخر الامر) ہر معاملہ کا فیصلہ قانونِ خداوندی کے مطابق ہو گا۔

عزیزانِ من! یہ آیت پچھلے درس میں آ چکی ہے جس میں اس بات کی وضاحت کی تھی کہ جب تمہیں تمکن نصیب ہو گا، یا ان لوگوں کو جب زمین میں تمکن نصیب ہو گا یعنی ان کے ہاتھ میں اقتدار آئے گا، ان کا نظام قائم ہو گا، تو یہ قوانینِ الٰہیہ کو یہاں رائج کریں گے۔ یہ تھا وہ سارا مقصد۔ یہ تھا اس ساری کشمکش کا منتہیٰ و مقصود و مطلوب: تمام معاملاتِ زندگی پہ بحث و نظر کرو، مشورے کرو، سب کچھ کرو لیکن وَلِلّٰهِ عَاقِبَةُ الْاُمُوْرِ (22:41)۔ آخر الامر ان کا فیصلہ خدا کی منشاء کے مطابق کرو۔ اور یہ منشائے خداوندی یونہی ذہنی، Academic یا نظری نہیں ہے بلکہ یہ اس کی کتاب قرآنِ کریم کے اندر موجود ہے اسی لیے کہا کہ وَمَنْ لَّمْ یَحْکُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِکَ هُمُ الْکٰفِرُوْنَ (5:44)۔ جو آخر الامر معاملات کے فیصلے خدا کی کتاب کے مطابق نہیں کرتے، انہیں بھی کافر کہا جاتا ہے۔ یہ تھی ساری کشمکش۔ عزیزانِ من! جیسا میں نے ابھی عرض کیا ہے کہ یہ لوگ، اپنے اس غلط نظام کے اُس دور میں جس میں یہ نبی آتے تھے، خوشحالیوں کے جھولے جھول رہے ہوتے تھے، انہیں ہر قسم کی ثروت، دولت، اقتدار اور عزت حاصل ہوتی تھی، اس لیے وہ انہیں یہ کہتے تھے کہ تم غلط کہتے ہو کہ ہمارے اس نظام کا نتیجہ تباہی ہو گا۔ اس کا نام ہے تکذیب۔ وہ رسل کی تکذیب کرتے تھے۔ آپ سارے قرآنِ کریم میں دیکھیں گے کہ ہر نبی کے معاملے میں یہ کہا گیا کہ یہ تمہاری تکذیب کرتے ہیں۔

عزیزانِ من! ہمارے ہاں تکذیب کا ترجمہ یہ ہوتا ہے کہ ''یہ جھٹلاتے ہیں۔'' اس ترجمے کے بجائے یہ کہنا چاہیے کہ یہ لوگ کہتے ہیں کہ تم جو یہ کہتے ہو کہ ہمارے اس نظام کا نتیجہ تباہی ہے، یہ غلط ہے۔ اور میں ابھی عرض کرونگا کہ دونوں میں کتنا فرق ہے۔ آیت ہے: وَاِنْ

يُكَذِّبُوْكَ فَقَدْ كَذَّبَتْ قَبْلَهُمْ قَوْمُ نُوْحٍ وَّعَادٌ وَّثَمُوْدُ o وَقَوْمُ اِبْرٰهِيْمَ وَقَوْمُ لُوْطٍ o وَاَصْحٰبُ مَدْيَنَ وَ كُذِّبَ مُوْسٰى (22:42-44)۔اگر یہ لوگ (اس قدر وضاحت کے باوجود) تمہاری تکذیب کرتے ہیں (تو یہ کوئی نئی بات نہیں)۔ان سے پہلے تو میں بھی اپنے اپنے رسولوں کی تکذیب کر چکی ہیں (مثلاً) قوم نوح، قوم عاد، قوم ثمود، قوم ابراہیمؑ قوم لوط، مدین کے رہنے والے (قوم شعیب) اور اسی طرح موسیٰ علیہ السلام کی بھی تکذیب ہوئی۔ یہاں تمام انبیاء کا نام لے کر بتایا ہے کہ یہ تکذیب کرنا کچھ نئی بات نہیں ہے، نہ تمہارا پیغام کوئی نیا ہے، نہ ان کا ردِعمل نیا ہے۔ یہی پیغام تم سے پہلے تمام انبیاء کرام علیہم السلام لے کر آتے رہے اور اسی قسم کا ردِعمل ان کی مخالف قوم کا ہوتا رہا۔ان لوگوں نے بھی اپنے انبیاء کی اسی طرح تکذیب کی جس طرح یہ تمہاری تکذیب کر رہے ہیں۔ یہ جو ذہن میں تکذیب کرنے کا تصور ہے، اس کے معنی یہ یوں کرتے ہیں کہ یہ تمہیں جھوٹا کہتے ہیں۔اس سے ذہن کسی اور طرف چلا جاتا ہے اور یہ قرآنِ کریم کا اعجاز ہے کہ اس نے کس طرح ان دونوں چیزوں میں تمیز کر کے رکھ دی۔ میں کہتا ہوں کہ آپ دیکھیے کہ نبی اکرم ﷺ کا یا ایک نبی کا کردار، اس کی سیرت، اس کی صداقت کی بلندیاں، کس طرح جھلک رہی ہیں! قرآن کس طرح سے جھوٹ اور تکذیب کو واضح کرتا ہے! یہ دونوں الگ الگ باتیں ہیں۔

کسی کے دعویٰ کا ثبوت اس کی سابقہ زندگی کا عمل ہوتا ہے

عزیزانِ من! آپ کو معلوم ہے کہ جب نبی اکرم ﷺ نے دعویٰ نبوت پیش کیا تو ان لوگوں نے یہ کہا تھا کہ اس کا ثبوت کیا ہے کہ خدا کی طرف سے آپ کو وحی ملتی ہے، نبوت ملتی ہے اور اس میں آپ سچے ہیں۔ آپ کو یاد ہوگا اور اسے ہمیشہ یاد رکھیے کہ آپ ﷺ نے اس کا ایک ہی ثبوت پیش کیا تھا اور وہ وہیں نہیں تھا بلکہ یہ دنیا بھر میں تسلیم کیا گیا۔ آپ بھی اس اصول کو یاد رکھیے کہ اگر کوئی شخص، جو اس قسم کا دعویٰ کرنے والا ہے نبوت ہی کا نہیں، کسی بھی قسم کا بلند دعویٰ، کرنے کے لیے آپ کے سامنے آئے، تو اس کی صداقت کا ایک ہی ثبوت ہوگا اور وہ ہے جو حضور ﷺ نے اس کے جواب میں کہا تھا کہ تم مجھ سے اس کا ثبوت مانگتے ہو کہ میں اپنے دعویٰ نبوت میں سچا ہوں، جھوٹا نہیں ہوں، میں یہ جھوٹ نہیں کہہ رہا کہ خدا کی طرف سے وحی ملتی ہے، یہ کوئی جھوٹ کی بات نہیں ہے، اس کا ثبوت یہ ہے کہ **فَقَدْ لَبِثْتُ فِيْكُمْ عُمُرًا مِّنْ قَبْلِهٖ اَفَلَا تَعْقِلُوْنَ** (10:16)۔ میں تم میں کوئی اجنبی نہیں، نو وارد نہیں کہ تمہیں معلوم نہ ہو سکے کہ میرا کردار کیسا ہے۔ میں نے اس دعوائے نبوت سے پہلے تم میں ایک عمر بسر کی ہے۔ میری یہ زندگی تمہیں کس بات کی شہادت دیتی ہے؟ کیا اس کی کہ میں جھوٹا اور فریبی ہوں یا یہ کہ پاکباز اور سچا انسان ہوں؟ تم اس حقیقت پر غور کرو اور عقل وفکر سے کام لے کر سوچو کہ اگر یہ چیز مشیّتِ خداوندی کے مطابق نہ ہوتی اور خدا تمہاری طرف وحی کا یہ علم نہ بھیجنا چاہتا، تو میں یہ باتیں (اپنے جی سے گھڑ کر) کبھی تمہارے سامنے پیش نہ کرتا۔ کذب وافترا تو میری روشِ زندگی کے خلاف ہے۔ تم خود غور وفکر کے بعد بتاؤ کہ ایسی زندگی بسر کرنے والا کبھی ایسا جھوٹا ہو سکتا ہے۔ یہ

اپنے دعویٰ کو سچا ثابت کرنے کی کتنی بڑی تعدی ہے' کتنی بڑی جرأت ہے! اور یہ جرأت وہی کرسکتا ہے جس کی زندگی واقعی سپیدہ سحر کی طرح بے داغ گزری ہو۔ اس دعوے سے پہلے' Pre any one period' (کسی بھی ایک وقت میں) اس نے کوئی دعویٰ بھی نہیں کیا تھا: ابھی اس کو کوئی شہرت بھی نصیب نہیں ہوئی تھی' وہ کسی بات کا مدعی بھی نہیں تھا۔ عام لوگوں کی طرح زندگی بسر کر رہا ہے۔ وہ اپنے دعویٰ کی صداقت کی شہادت کے لیے اپنی اس زندگی کو پیش کر رہا ہے کہ میں نے تو تمہارے اندر اپنی زندگی بسر کی ہے۔ اس معیار کو یاد رکھیے۔

عزیزانِ من! اگر کوئی شخص بھی جو آپ کے سامنے کھڑا ہوا اسے کہیے کہ تم جو بھی دعویٰ کرتے ہو یا مطالبہ کرتے ہو' تم سینے پہ ہاتھ رکھ کر کہو کہ تمہاری سابقہ زندگی تمہارے دعوے کی شہادت دیتی ہے؟ میں سیاست میں تو آیا نہیں کرتا لیکن یہ ضرور کہتا ہوں کہ اگر آج کی سیاست کے انتخابات میں بھی کوئی امیدوار کھڑا ہو تو اُسے اتنی سی بات ہی کہیے کہ کیا تم چھاتی پہ ہاتھ رکھ کے یہ کہہ سکتے ہو کہ ''میں نے تمہارے اندر اپنی پوری زندگی بسر کی ہے' تم اس سے اندازہ لگا لو کہ میں کس قسم کا آدمی ہوں۔'' جو یہ کہنے کی جرأت کرے اور اس کے بعد پھر اسکی سابقہ زندگی اس کی شہادت دے کہ واقعی اس کی صداقت' امانت' دیانت' شرافت' قابلِ اعتماد ہے تو وہ ہے قابلِ اعتماد۔ یہاں قرآنِ کریم نے ''اس سے پہلے'' یعنی مِنۡ قَبۡلِهٖ (10:16) کی بات کی ہے اور یہ جانچ کا بڑا ہی اہم اور بنیادی معیار (Standard) ہے۔

منصب حاصل کرنے کے بعد محتاط رہنا مِنۡ قَبۡلِهٖ والی بات نہیں ہوتی

عزیزانِ من! یہ مِنۡ قَبۡلِهٖ [1] بڑی اہم چیز ہے۔ دعویٰ کرنے کے بعد یا اس قسم کے منصب حاصل کرنے کے بعد تو ہر شخص' اس قیادت کی حفاظت کے لیے' بڑا ہی محتاط رہے گا کہ کوئی ایسی بات نہ ہونے پائے کہ جس سے میری Popularity (شہرت) میں فرق آجائے۔ یہ احتیاط برتنے کا نتیجہ ہوتا ہے۔ اسے کیریکٹر نہیں کہتے۔ کیریکٹر کا ثبوت ''من قبلہ'' ہے کہ جب میں آپ لوگوں کی طرح ایک عام آدمی تھا' میری اس وقت کی زندگی تم دیکھو کہ کیسی تھی۔ وہ کیریکٹر ہوتا ہے۔ جس نے چالیس سال ایسی زندگی بسر کی ہو کہ ہر شخص یہ کہے کہ اس نے کبھی جھوٹ نہیں بولا' اس کے بعد یہ کیریکٹر (کردار) اس کا فطری نتیجہ ہے۔ اس پر وہ جرأت و بسالت [2] سے کہہ سکتا ہے کہ اَفَلَا تَعۡقِلُوۡنَ (10:16)۔ تم اس حقیقت پر غور کرو اور عقل و فکر سے کام لے کر سوچو۔ اسی لیے آپ ﷺ نے کہا ہے کہ عقل و فکر کی رو سے تم فیصلہ کرو کہ جس کی یہ روشِ زندگی ہو تو کیا پھر وہ شبا شب ایسا جھوٹا ہو جائے گا کہ صبح اٹھتے ہی وہ اس قدر فریب کار بھی بن جائے۔ یہ واقعی ناممکن ہے۔

عزیزانِ من! اب سیدھی سی بات یہ ہے کہ یہ نبی ﷺ جوان لوگوں کو یہ کہہ رہا ہے کہ تمہارا نظام تمہیں تباہی کی طرف لے جائے گا'

---

[1] کہ میں نے دعویٰ سے قبل تم میں ایک عمر بسر کی ہے۔

[2] بہادری' دلیری

وہ کہہ یہ رہا ہے کہ جو شاخِ نازک پہ آشیانہ بنے گا ناپائیدار ہوگا۔ اور قرآن کہہ رہا ہے کہ یُكَذِّبُوكَ (22:42) یہ تمہاری تکذیب کرتے ہیں۔ میں نے عرض کیا ہے کہ یہ جو ہمارے ہاں تکذیب کا ترجمہ ہے کہ ''یہ تمہیں جھوٹا کہتے ہیں'' یہ بالکل غلط بات ہے۔ بات یہ نہیں ہے۔ دیکھیے قرآن کیا کہتا ہے۔ اَلْكَذِبُ کے معنی ہیں: ''جانتے بوجھتے کسی چیز کے متعلق خلافِ حقیقت خبر دینا۔'' لیکن بعض کا خیال ہے کہ عمداً ہو یا سہواً' دونوں صورتوں میں كَذِبٌ کا لفظ بولا جائے گا۔ ''اَكْذَبَ الرَّجُلَ اس وقت کہتے ہیں جب کسی آدمی کو پکارا جائے اور وہ سوتے ہوئے کی طرح چپ سادھ لے اور كَذَّابَةٌ اس کپڑے کو کہتے ہیں جو مختلف رنگوں میں رنگا یا چھاپا جائے۔ اس طرح كِذْبٌ کے معنی ہیں ''کسی کی کوئی بات اگرچہ خارجی واقعہ کے عین مطابق ہو لیکن اگر اس میں اس کے دل اور زبان کی ہم آہنگی نہیں تو كِذْبٌ ہے۔ اور اگر کسی معاملہ میں دل اور زبان ہم آہنگ ہیں لیکن وہ بات واقعہ کے خلاف ہے تو اسے كِذْبٌ نہیں کہیں گے۔ وہ بات اس کے عدمِ علم پر محمول کی جائے گی۔

دعا کا قرآنی مفہوم

عزیزانِ من! جب کبھی بھی کوئی بات ذہن میں ایسی آتی ہے تو اسی وقت قرآن کے ہاں سے اس کا جواب ملتا ہے۔ دیکھیے قرآن نے دعویٰ کیا تھا کہ اُجِيْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ (2:186)۔ جب بھی کوئی شخص' اپنی راہنمائی کے لیے مجھے پکارتا ہے تو میرا قانونِ ہدایت' جو قرآن کے اندر محفوظ ہے' ان کی پکار کا جواب دیتا ہے۔ اور اُبھر کر سامنے آجاتا ہے۔ خدا نے یہ بات اپنے رسول ﷺ سے کہی ہے۔ قرآن کے الفاظ ہیں: وَاِذَا سَاَلَكَ عِبَادِيْ عَنِّيْ فَاِنِّيْ قَرِيْبٌ (2:186) اور جب میرے بندے میرے متعلق تم سے کچھ پوچھیں تو ان سے کہو: میں تمہارے بہت قریب ہوں' میں تو ہر پکارنے والے کی پکار کو سنتا ہوں۔ اب ہمارے ہاں اس کا ترجمہ و مفہوم یہ ہو گیا ہے کہ میں ہر ایک کی دعاؤں کو سنتا ہوں۔ پھر میں بس وہ سنتا ہی ہوں۔ ہر دعا قبول تو ہوتی نہیں' بس سن ہی لیتا ہوں۔ عزیزانِ من! بات یہ نہیں ہے۔ اس نے کہا تھا کہ ہر شخص جو اپنی کسی مشکل کے اندر' کسی کشاکش کے اندر' ذہنی کاوش کے اندر' کسی مسئلے کے متعلق' مجھ سے یہ پوچھتا ہے کہ اس کا جواب کیا ہے تو اس سے کہو کہ کہیں دور جانے کی ضرورت نہیں' میں اس سے قریب ہوں' لیکن اس قرب کا بھی ایک طریقہ ہے۔ وہ طریقہ تمہیں اپنانا ہوگا۔

قرآن یعنی کلام اللہ میں ہر بات کا جواب موجود ہے

عزیزانِ من! قرآنِ کریم میں خدا کہتا ہے کہ میری کتاب قرآنِ کریم میں ہر پکارنے والے کی پکار کا جواب موجود ہے۔ میں ہر پکارنے والے کے سوال کا اس کتاب کے ذریعے جواب دیتا ہوں۔ براہِ راست ہر ایک کو جواب نہیں دیتا۔ قرآن کو خدا نے کلام اللہ کہا ہے۔ یہ اس کا کلام ہے۔ خدا کا کلام جواب دیتا ہے۔ یہ قرآن کا اعجاز ہے' عزیزانِ من! بہرحال چھوٹا منہ' بڑی بات ہے' میں نے زندگی

بھر قرآن پہ غور کیا ہے۔اس ناچیز کا ذاتی تجربہ ہے کہ جب بھی اس قسم کی کوئی کشمکش آئی ہے' قرآن میں غور کی ضرورت ہے' فکر کی ضرورت ہے' قرآن سے جواب ملا ہے۔اس پچاس سال کے اندر کوئی ایسی بات نہیں ہے جس کا مجھے قرآن سے جواب نہ ملا ہو۔اس نے کہا ہے کہ **اُجِیْبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ اِذَا دَعَانِ** (2:186)۔جب بھی کوئی مجھ سے پوچھتا ہے کہ میرے سوال کا جواب کیا ہے' تو میں اُس کا جواب دیتا ہوں۔عزیزانِ من! یہ جواب دیتا ہے۔یہ بات تھی جو میں نے ابھی عرض کی کہ یہ مفسرین کہتے ہیں کہ ''تکذیب کرتے ہیں'' کے معنی ہیں کہ ''وہ جھوٹ کہتے ہیں۔'' دیکھیے قرآن کریم اس میں کیسے فرق کرتا ہے۔سورۃ الانعام کی آیت 33 میں بڑے لطیف پیرائے میں فرق کیا گیا ہے۔کہا کہ **قَدْ نَعْلَمُ اِنَّهٗ لَيَحْزُنُكَ الَّذِیْ يَقُوْلُوْنَ** (6:33)۔ہم جانتے ہیں کہ یہ جو کچھ کہتے ہیں' اس سے تمہیں اے رسول! کچھ ملال ضرور گزرتا ہے لیکن تمہیں اس میں ملول ہونے کی کوئی ضرورت نہیں۔اس لیے' سنیے' عزیزانِ من! کہا کہ **فَاِنَّهُمْ لَا يُكَذِّبُوْنَكَ وَلٰكِنَّ الظّٰلِمِيْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ** (6:33)۔یہ تجھے جھوٹا نہیں سمجھتے (جو یہ بات تم پر اس طرح گراں گزرے) یہ تو قانونِ خداوندی کو جھٹلاتے ہیں۔(حالانکہ ان کا دل اسے صحیح تسلیم کرتا ہے) اس لیے ان کی ان باتوں سے دل پر بُرا اثر لینے کی کوئی وجہ نہیں۔(اگر تم کسی سے کہو کہ سنکھیا مہلک ہوتا ہے اور وہ کہے کہ نہیں' وہ ممدِ حیات ہے تو اس سے اس کی جہالت پر افسوس تو ہو سکتا ہے' ضیق [1] اور ملال نہیں ہونا چاہیے۔اس سے اس فرق کو سمجھ رکھیں کہ یہ تمہیں جھوٹا نہیں کہتے۔تمہارے دل پہ تو اسکا حزن و ملول اس وقت ہونا چاہیے جب یہ تمہیں جھوٹا کہیں۔یہ تمہیں جھوٹا نہیں کہتے۔یہ قانونِ خداوندی کو نہیں مانتے اور کہتے ہیں کہ یہ قانونِ خداوندی غلط ہے۔عزیزانِ من! اسے سیرت کی بلندی کہتے ہیں کہ وہ جو وارننگ (تنبیہ) انہیں دے رہا ہے' اس کے متعلق تو وہ یہ کہتے ہیں کہ نہیں صاحب! یہ غلط ہے' یہ نہیں ہو سکتا مگر وہ جو کہتا ہے کہ سنکھیا کھاؤ گے تو ہلاک ہو جاؤ گے' اس پر وہ دوسرا کہتا ہے کہ نہیں نہیں صاحب! یہ تو ہم کھاتے ہیں۔یہ جو بات ہے کہ ایسا ہوتا ہے یہ غلط ہے یعنی یہ قانونِ خداوندی غلط ہے کہ سنکھیا کھانے سے ہلاکت ہو جائے گی۔وہ اس قانون کی تکذیب کرتے ہیں' تمہیں جھوٹا نہیں کہتے۔

تنذیر کے سلسلہ میں آپ ﷺ کی مخالفت تو تھی' لیکن آپ ﷺ کے کیریکٹر پر کوئی حرف گیری نہ تھی

عزیزانِ من! ایک داعی انقلاب کی سیرت ایسی ہونی چاہیے۔اتنے بڑے سخت مخالفین' جو اس کی اس قسم کی تنذیر کے متعلق تو کہہ رہے ہیں کہ نہیں یہ تنذیر غلط ہے' ہم نہیں مانتے' ایسا نہیں ہو سکتا لیکن اس کے باوجود وہ اس شخص کو نہیں کہتے کہ تم جھوٹے ہو۔ٹھیک ہے یہ بھی ہو سکتا ہے کہ تم یہ کہو کہ جی! یہ خدا کی طرف سے ہے۔ہمیں اس سے غرض نہیں کہ کس کی طرف سے ہے۔ہم یہ جانتے ہیں کہ یہ بات غلط ہے کہ ہمارے اس نظام کا نتیجہ تباہی ہو گا۔دیکھا! دونوں میں کتنا فرق ہو گیا۔یہ ہے جو قرآن کرتا ہے۔عزیزانِ من! تکذیب کا لفظ

---

[1] ضِیق: تنگی' دشواری۔جیسے ضِیق النفس' دمہ' سانس کا روگ اور ضِیق میں آنا (ہونا) عاجز آنا' مشکل میں پھنسنا ہے۔

آیا تو ذہن اس طرف گیا کہ وہ لوگ پھر اس داعی کے متعلق یہ ذہن میں رکھتے تھے کہ یہ جھوٹا ہے۔ وہ جو اپنے معاشرے کے اندر جھوٹا ہے اس کی تو کوئی بات قابلِ قبول نہیں ہوتی۔ پھر اس کا کیریکٹر، اس کی سیرت، کیا ہوئی کہ وہ قدم قدم پہ کہہ رہے ہیں: تُو جھوٹا ہے۔ دیکھیے قرآنِ کریم نے کیسے نکھار کر رکھ دیا کہ اس سے یہ اثر نہ لو، ہرگز یہ اثر نہ لو۔ کس قدر واضح الفاظ میں کہا کہ فَاِنَّهُمْ لَا يُكَذِّبُوْنَكَ (6:33)۔ یہ سمجھ رکھو کہ یہ تمہیں جھوٹا نہیں کہتے، یہ قانونِ خداوندی کے متعلق بات کہہ رہے ہیں کہ وَلٰكِنَّ الظّٰلِمِيْنَ بِاٰيٰتِ اللّٰهِ يَجْحَدُوْنَ (6:33)۔ یہ اس قانونِ خداوندی کے صحیح ہونے سے انکار کر رہے ہیں۔ وہ یہ کہہ رہے ہیں کہ یہ بات نہیں ہے کہ سنکھیا ہلاکت آفریں ہوتا ہے۔ وہ اس بات کے لیے اس کی تکذیب کر رہے ہیں۔ تمہیں جھوٹا نہیں کہہ رہے ہیں۔

عزیزانِ من! اب ہم پھر اسی آیت پہ آتے ہیں کہ اِنْ يُّكَذِّبُوْكَ (22:42)۔ اگر یہ تمہاری اس وارننگ کی، اس تنذیر کی، تکذیب کرتے ہیں ...... اب بات یوں آئے گی کہ یہ کہتے ہیں کہ یہ بات صحیح نہیں ہے، تم ہمیں وارن کر رہے ہو کہ میاں، تمہاری یہ دیوار گرنے والی ہے، گر جائے گی۔ دوسرا یہ کہتا ہے کہ نہیں، مجھے معلوم ہے یہ گرے گی نہیں، تو یہ اس کو جھوٹا نہیں کہہ رہا۔ تو یہ جو بات ہے کہ خدا کے قانون کے متعلق ان کا دعویٰ ہے کہ نہیں، یہ غلط ہے، اس کے نتائج یہ نہیں ہو سکتے، یہ بات کوئی نئی نہیں ہے۔ تم سے پہلے ہر رسول علیہ السلام نے آ کے یہی کچھ کہا اور ان لوگوں کی طرف سے اس کا ردِعمل ایسا ہی ہوا۔ یہ تو ہوتا ہی چلا آ رہا ہے، کوئی نئی بات نہیں ہے۔ اب یہ جو چیز ہے کہ انہیں کس معاملے میں مغالطہ لگتا تھا، کس بات میں وہ فریبِ نفس میں مبتلا رہتے تھے کہ غلط نظام کا نتیجہ بڑی خوشحالیاں ہیں، بڑی دولت ہے، بڑی ثروت ہے، اس کی مثال تو تقسیم کے بعد ہمارے سامنے ہے۔

تقسیم کے بعد ہندوؤں کی چھوڑی ہوئی دولت کی لوٹ مار کا کیریکٹر پر اثر

عزیزانِ من! ہماری بدقسمتی ہے کہ تقسیم کے بعد ہندو یہاں اتنا کچھ چھوڑ گیا اور ہم اس کا صحیح انتظامِ تقسیم نہ کر سکے، تو لوٹ مچ گئی۔ اس قوم کو لوٹ کی عادت پڑ گئی اور وہ جو عادت پڑی ہے تو ہڈیوں کے گودے تک میں سرایت کر گئی ہے۔ اب ہر شخص لوٹ کے ذریعے کچھ حاصل کرنا چاہتا ہے جناب! تو اب یوں جو لوٹنے کے بعد اتنا کچھ ان کو مل گیا، اگر ان سے کوئی یہ کہتا ہے کہ بھئی! یہ طریق بڑا غلط ہے، آخرالامر اس کا نتیجہ تباہی ہوتا ہے۔ لوٹنے والے آخرالامر کبھی کامیاب زندگی بسر نہیں کر سکتے۔ اس وقت ٹھیک ہے کہ تمہیں یہ کچھ میسر آ گیا ہے۔ لیکن تباہ ہو جاؤ گے تو یہ بات ان کی سمجھ میں نہیں آتی۔ وہ کہتے ہیں کہ یہ غلط بات ہے۔

لوٹ مار سے محنت کی عادت ختم ہو جاتی ہے اور پھر انسانی صلاحیتیں زنگ آلود ہو جاتی ہیں

عزیزانِ من! لُوٹ کی پہلی بات تو یہ ہوتی ہے کہ اُس قوم میں محنت کرنے کی عادت ہی نہیں رہتی۔ اور لوٹ کا یہ مال ختم ہو جاتا ہے۔ یہاں جب کبھی بھی کوئی صحیح نظام آ گیا، جس میں لوٹ نہیں ہوگی، تو سب سے پہلے تم بھوکے مرو گے، تمہیں تو محنت کی عادت ہی نہیں

رہی۔ تو لوٹ مار کی اس چیز سے انسان دھوکے میں آ جاتا ہے' اس میں وہ غلطی کھا جاتا ہے۔ قرآن نے ایک لفظ بتا دیا اور وہیں سے ساری بات واضح ہو جاتی ہے۔ کہا کہ وَكُذِّبَ مُوسٰى فَأَمْلَيْتُ لِلْكٰفِرِيْنَ ثُمَّ اَخَذْتُهُمْ (22:44)۔ اور اسی طرح موسیٰ علیہ السلام کی بھی تکذیب ہوئی۔ ہم نے ان سرکشی اختیار کرنے والوں کو پہلے اپنے قانونِ مکافات کے مطابق مہلت دی (کہ وہ اپنی غلط روش سے باز آ جائیں۔ لیکن جب وہ باز نہ آئے تو ہمارے قانون نے) انہیں اپنی گرفت میں لے لیا۔ یہاں یہ واضح کیا ہے کہ ہمارا قانونِ مکافات یہ ہے کہ ہم فوراً گرفت نہیں کرتے' ہم اس میں مہلت کا ایک وقفہ دیتے ہیں کہ اب بھی سنبھل جاؤ' اب بھی باز آ جاؤ' اب بھی ٹھیک ہو جاؤ۔ یہ مہلت کا درمیانی وقفہ ہوتا ہے۔ مہلت کا وقفہ تو ہم اس لیے دیتے ہیں کہ یہ ٹھیک ہو جائے اور اسی بنا پر یہ اپنے آپ کو دھوکے میں رکھتے ہیں کہ نہیں' یہ غلط ہے کہ اس کا نتیجہ تباہی ہوگا۔ بڑی عجیب بات ہے۔ تو اب پوچھا جا سکتا ہے کہ صاحب! اس نے مہلت کا یہ وقفہ رکھ دیا۔ اس کا تو یہ نتیجہ ہے۔ وہ کہتا یہ ہے کہ بجائے اس کے کہ اپنے ذہن میں یونہی فیصلہ کر لو کہ اس غلط نظام کا نتیجہ ہلاکت نہیں ہوگا' ذرا آؤ! بیٹھ کے غور و فکر سے سوچیں۔ اگر یہ اس معاملے پر سوچنے لگ جائیں تو یقیناً اس نتیجے پہ پہنچیں گے کہ واقعی لوٹ کا نتیجہ ہلاکت ہوتا ہے۔ آج میں نے لوٹ لیا ہے کہ مجھ میں لوٹ لینے کی قوت موجود ہے۔ اگر مجھ سے ذرا زیادہ قوت والا کوئی لوٹنے والا آ گیا تو وہ سارا ہی لوٹ کے لے جائے گا۔ انبیاء کرام علیہم السلام انہیں یونہی دھونس' دھاندلی اور دھمکی سے نہیں منوایا کرتے تھے کہ مانتے ہو یا نہیں مانتے۔ وہ ان سے کہا کرتے تھے کہ میں صرف یہ کہتا ہوں کہ تم جو اپنے ذہنوں میں یہ خیالات لیے بیٹھے ہو کہ تم کبھی اپنی اس غلط روشِ زندگی سے برباد نہیں ہو گے تم نے کبھی اس پہ غور و فکر بھی کیا ہے۔ کہا کہ ثُمَّ تَتَفَكَّرُوْا (34:46)۔ اس پر سوچا کرو۔

غور و فکر کی مختلف راہیں

عزیزانِ من! غور سے سنیے کہ وہ غور و فکر کی کون کون سی راہیں ہیں؟ آپ نے دیکھا کہ انبیائے کرام علیہم السلام کا دین کیا ہوتا تھا؟ وہ پیش کیا کرتے تھے؟ انداز کیا ہوتا تھا؟ سمجھاتے کیا تھے؟ یہ بات عقل و فکر سے ہی سمجھائی جا سکتی ہے۔ یہ واقعہ ہے کہ اس طرح لوٹنے سے آدمی شباشب Millionaire (کروڑ پتی) ہو جاتا ہے۔ جب وہ یہ بات کہتا ہے کہ آپ دیکھیے' ہم کل ہی بھوکے مرتے تھے' اب کچھ مل گیا ہے' تم صداقت امانت لیے پھرتے ہو' اس سے کچھ نہیں بنتا۔ وہ عملاً یہ چیز آپ کو بتاتا ہے کہ کل ہی ہمارے پاس' ہمارے باپ کے پاس' کچھ نہیں تھا۔ آج ہمارے پاس یہ سارا کچھ ہے اور یہ تو ایک امرِ واقع ہوتا ہے۔ آپ کیسے اس کی تردید کر سکتے ہیں۔ اس کے برعکس وہ غور و فکر کی دعوت دیتے ہیں کہ آؤ' ذرا سوچ کے دیکھیں کہ ''کیا یہ صحیح نظام ہو سکتا ہے کہ جس کے قابو میں' جس کی بھی کوئی چیز آئے' وہ لے اڑے اور یہ جائز قرار پا جائے؟'' عزیزانِ من! یہ لمبی چوڑی بحث نہیں ہے۔ دو ہی منٹ کے بعد یہ بات سمجھ میں آ سکتی ہے۔ آپ اپنے آپ سے پوچھتے ہیں کہ ''کیا یہ نظام صحیح ہو سکتا ہے کہ جس کا داؤ چلے وہ دوسرے کی' جس چیز کو چاہے' اڑا کے لے جائے اور وہ چیز اس کے

لیے جائز قرار پا جائے؟'' کیا اس سے تمہاری کوئی بھی چیز محفوظ رہ سکتی ہے؟ نہیں' قطعاً نہیں۔ سو آپ نے دیکھا کہ اس طرح سے کیسی عمدہ بات سمجھ میں آ جاتی ہے۔ لہٰذا خدا کے نبی یوں بار بار سمجھاتے تھے کہ **اَفَلَا تَعۡقِلُوۡنَ** (2:44; 2:76; 3:65; 6:32; 7:169; 37:138) بابا! جو میں کہتا ہوں ذرا اس پہ عقل وفکر سے سوچو' بات سمجھ میں آ جائے گی۔ تو یہ جو ساری تباہیاں آتی رہتی ہیں وہ ان کی اس وجہ کو نہیں مانتے کہ یہ اس لوٹ کھسوٹ کی وجہ سے آتی ہیں۔ قرآنِ کریم اسی طرف اشارہ کرکے کہتا ہے کہ **فَاَمۡلَیۡتُ** (22:44) تو انہوں نے انبیائے کرام علیہم السلام کی اس طرح سے تکذیب کی۔ لہٰذا اصل میں بات یہ تھی کہ ہم مہلت (Respite) دیا کرتے ہیں تا کہ وہ اپنی غلط روش سے باز آ جائیں۔ جب وہ اس سے باز نہیں آتے تو **ثُمَّ اَخَذۡتُهُمۡ** (22:44)۔ ہمارا قانون انہیں اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ اسے یوں سمجھو کہ مہلت کا وقفہ ختم ہو جاتا ہے۔ یہ وہی کچھ ہوتا ہے جیسے آہستہ آہستہ سنکھیا کھانے والے کا آخر میں جا کر Accumulative Effect (مجموعی اثر) ہوا کرتا ہے۔ یہ زہر کے Slow Poisoning (زہر کا دھیرے دھیرے اثر کرنا) کی سی ایک چیز ہوتی ہے۔ نہیں' بلکہ یوں کہو کہ یہ Slow poisoning (دھیرا زہر) ہی ہوتی ہے۔ آخر الامر اس کا نتیجہ تباہی و بربادی ہوتا ہے۔ اسی کے لیے کہا کہ **ثُمَّ اَخَذۡتُهُمۡ** (22:44)۔ خدا کا قانونِ مکافات انہیں اپنی گرفت میں لے لیتا ہے۔ اسے عام فہم زبان میں یوں کہو کہ پھر ہم اسکو جھپٹ لیتے ہیں۔ اب اُس کا انجام جاننا چاہتے ہو تو پھر تاریخ کے اوراق سے پوچھو کہ **فَكَيۡفَ كَانَ نَكِيۡرِ** (22:44)۔ اُن کے اس انکار اور سرکشی کا نتیجہ کیا نکلا؟ یہاں قرآنِ کریم نے واضح انداز میں کہا کہ پھر پوچھو کہ یہ جو خدا کے قوانین سے انکار کرتے تھے اور کہتے تھے کہ یہ غلط ہے: سنکھیے کا آخری نتیجہ ہلاکت نہیں ہوتا۔ کہا کہ ان سے پوچھو کہ کیسا رہا ہمارا دعویٰ اور کیسی رہی تمہاری تکذیب! پھر کہا کہ یہ بات صرف انہی کے ساتھ مختص نہیں ہے' تاریخ یہ بتائے گی کہ **فَكَاَيِّنۡ مِّنۡ قَرۡيَةٍ اَهۡلَكۡنٰهَا وَهِىَ ظَالِمَةٌ** (22:44)۔ کتنی ہی بستیاں تھیں' جن کے رہنے والوں کو' ہمارے قانونِ مکافات نے اپنی گرفت میں لے کر تباہ کر دیا' اس لیے کہ انہوں نے ظلم واستبداد پر کمر باندھ رکھی تھی۔ اور کمزور و ناتواں انسان ان کے ہاتھوں سخت نالاں تھے۔ یہاں ایک ہی لفظ میں بتا دیا کہ تباہی کس طرح سے آتی ہے۔ کہا کہ کتنی ہی قومیں ایسی گزری ہیں جنہیں تباہ کر دیا۔

قرآن کے نزدیک بستیوں سے مراد قومیں ہوتی ہیں

عزیزانِ من! عربی زبان میں بستیوں سے قومیں مراد ہو جاتی ہیں۔ ہم بھی یہ کہتے ہیں کہ کتنے ہی شہر اجڑ گئے' کتنی ہی بستیاں تباہ ہو گئیں۔ بستیوں سے مراد وہ مکانات نہیں ہوتے بلکہ اُن بستیوں سے مراد' ان کے رہنے والے ہوتے ہیں' قومیں ہوتی ہیں۔ یہاں کہا کہ کتنی ہی بستیاں تباہ ہو گئیں۔ سوال یہ ہے کہ وہ بستیاں کیوں تباہ ہو گئیں؟ یہاں قرآن بات تو تاریخ کی کر رہا ہے لیکن اس جرم کا جو اصل نتیجہ ہوتا ہے' وہ ہر وقت سامنے رکھتا ہے۔ وہ صاف صاف دو ہی لفظوں میں کہ کہا جاتا ہے۔ یہاں کہا کہ وہ اس لیے تباہ ہو گئیں

کیوں کہ **وَ هِیَ ظَالِمَةٌ** (22:45)۔ انہوں نے ظلم واستبداد پر کمر باندھ رکھی تھی' کمزور وناتواں انسان ان کے ہاتھوں سخت نالاں تھے۔ اسے یوں کہو کہ وہ ظالم تھے اور جہاں بھی ظلم ہوگا قرآن نے اس کے متعلق کہا ہے کہ **اِنَّهٗ لَا یُفْلِحُ الظّٰلِمُوْنَ** (28:37)۔ سمجھ رکھو کہ ظالم کی کھیتی کبھی پنپ نہیں سکتی۔ جیسا میں نے عرض کیا ہے کہ قرآن تو اپنی تفسیر آپ کرتا ہے۔ یہاں سوال یہ ہے کہ ظلم کیا ہے؟ ہمارے ذہنوں میں تو اس کا ایک ہی تصور ہوتا ہے لیکن قرآنِ کریم تصریفِ آیات کے ذریعے مختلف مقامات پر یہ بتاتا ہے کہ کس کس چیز کا نام ظلم ہے۔ ظلم کے عربی زبان کی رو سے بنیادی معنی ہوتے ہیں: ''کسی شے کا اس مقام پہ نہ ہونا جہاں اسے ہونا چاہیے۔'' بس بات ہی ختم ہوگئی صاحب! اس کی تفصیل کے لیے تو آپ بلاشبہ ضخیم کتابوں پہ کتابیں لکھتے چلے جائیں:

تفصیل معنیِ غمِ الفت طویل ہے
ویسے تو بس خفیف سا اک دل میں درد ہے

خفیف سی بات اتنی ہے کہ وہ معاشرہ کبھی نہیں پروان چڑھتا جس میں ''جس شے کو جہاں ہونا چاہیے وہ وہاں نہ ہو' جس میں جو اس کا اہل ہے' وہ اُسے نہ ملے' جس میں محنت کرنے والے کی کمائی اس کے ہاتھ میں نہ ہو' بلکہ دوسرے کے ہاتھ میں ہو۔'' میں نے عرض کیا ہے کہ اس کی تفصیل میں چلتے چلے جایئے ضخیم کتابیں تو بنتی چلی جائیں گی مگر اس کا مکمل احاطہ نہیں ہو سکے گا۔ اس کے برعکس جب آپ قرآن سے پوچھیں گے تو قرآن ان تمام معنی کو واضح کر دے گا' ان تمام معنی کو اپنے احاطہ میں لے لے گا' اور یہ کچھ تصریف آیات سے ہو گا۔ مثلاً تصریفِ آیات سے یہ پتہ چلے گا کہ قرآنِ کریم نے کہاں کہاں ظلم کے متعلق کیا کیا کچھ کہا ہے۔ ایسے تمام مقامات نکال کر دیکھ لینے سے قرآن سمجھ میں آیا کرتا ہے۔

قرآنی موضوعات کو تبویب [1] کی شکل میں پیش کرنے کی خوشخبری

آپ احباب کی اطلاع کے لیے میں یہ خوشخبری سنا دوں کہ تبویب القرآن جلد اول پریس میں جا چکی ہے۔ خدا کرے کہ طباعت کے مراحل طے ہو جائیں تو میں یہ کہہ سکوں کہ اس سے فہمِ قرآن کے لیے ایک اور آسانی پیدا ہو جائے گی۔ عزیزانِ من! یہاں یہ بتا دوں کہ قرآنِ کریم کا انداز عام انسانی تصانیف کا سا نہیں ہے۔ انسانی تصانیف میں کتاب کو مختلف موضوعات میں تقسیم کر دیا جاتا ہے اور جس موضوع سے متعلق جو کچھ کہنا ہو' اسے متعلقہ باب میں بیان کر دیا جاتا ہے لیکن قرآنِ کریم کا یہ اسلوب نہیں ہے۔ اس میں ایک حقیقت اگر ایک مقام پہ بیان کی گئی ہے تو اس کی مزید وضاحت یا تفصیل دوسرے مقام (یا مقامات) میں آئی ہے۔ ان میں اضافہ کہیں اور کیا گیا ہے'

---

[1] یہ ضخیم کتاب (Quran- Classified) تبویب القرآن کے نام سے ادارہ طلوعِ اسلام لاہور سے بار اول 1977 میں تین ضخیم جلدوں میں چھپ چکی ہے۔ اس کی جلد اول 616 صفحات' جلد دوم 462 صفحات اور جلد سوم 434 صفحات پر مشتمل ہے۔ اس طرح تبویب القرآن کی یہ ضخیم کتاب 1428 صفحات پر پھیلی ہوئی ہے جن میں 84 صفحات مراحلِ طلب وتجسس اور انڈکس تبویب القرآن پر مشتمل ہیں۔

استثناء کہیں اور۔ پھر مختلف اہم حقائق کو اچھی طرح ذہن نشین کرانے کے لیۓ انہیں سیاق وسباق کی روشنی میں مختلف مقامات پر دہرایا گیا ہے۔ یہ انداز بڑا بلیغ اور حقائق کی وضاحت کے لیے بڑا ہی مؤثر ہے۔

قرآنِ کریم کو صحیح طور پر سمجھنے کے لیے ضروری تھا کہ ایک موضوع کو لیا جاتا اور یہ دیکھا جاتا کہ اس کے متعلق قرآن مجید کے مختلف مقامات میں کیا آیا ہے۔ بعض آیات میں اس کے متعلق براہِ راست ذکر ہوگا اور بعض مقامات پر مختلف آیات اس موضوع کو مستنبط کیا جائے گا۔ اس مقصد کے لیے ضروری تھا کہ تبویب (Classification) کرنے والے کی سارے قرآن مجید پر اس طرح نگاہ ہو کہ اس کے سامنے بیک وقت وہ تمام مقامات آ جائیں جن میں موضوع زیرِ نظر سے متعلق براہِ راست کچھ کہا گیا ہے یا جن آیات سے وہ مفہوم مستنبط کیا جائے گا۔ یہ تھا تبویب کا وہ طریق جس سے قرآنی مضامین سمجھ میں آ سکتے تھے۔ میں نے ساری عمر قرآنِ کریم کو اسی طرح سے سمجھا اور جو کچھ سمجھا اُسے لکھتا چلا گیا۔ اس طرح قرآنِ کریم نے فلاں موضوع کے متعلق کہاں کہاں کیا کہا ہے (اسے تبویب کہتے ہیں' یعنی باب باب کلاسیفائی کرنا)۔ پورے قرآنِ کریم کی یہ تبویب میرے مطالعہ کے چالیس سال کے عرصے پر پھیلی ہوئی ہے۔ یہ جس مرحلے تک پہنچی تھی' احباب نے کہا کہ اسے شائع کر دینا چاہیے لیکن میں یہ سمجھتا تھا کہ یہ تو ابھی نامکمل ہی ہے۔ قرآن کی تبویب تو دنیا کا کوئی آخری آدمی کر سکے گا۔ قرآن تو قیامت تک کے لیے ہے۔ بہرحال اللہ کا شکر ہے کہ وہ جتنی بھی تکمیل تک پہنچی ہے اب وہ پریس میں ہے۔ اگر آپ کو (مثلاً) یہ معلوم کرنا ہے کہ قرآن کریم ظلم کسے کہتا ہے' ظالم کون ہوتے ہیں تو وہ آپ کو "ظلم" کے عنوان کے تابع مل جائے گا۔ اس میں یہ بھی ملے گا کہ یہ حرف قرآن میں کہاں کہاں اور کن کن معانی کے لیے آیا ہے۔ اس میں قرآنِ کریم کو موضوعات یا مضامین کے اعتبار سے (Subject- wise) باب' باب Classify (جماعت بندی) کیا گیا ہے۔ اسے ہی اصطلاح میں تبویب کہتے ہیں۔ اس سے آپ دیکھ لیں گے کہ قرآنِ کریم خود ہی کس طرح سے اپنے ایک ایک لفظ کی تشریح و تفصیل بیان کر جاتا ہے۔

عزیزانِ من! بات ہو رہی تھی کہ کتنی ہی بستیاں ایسی تھیں جو ہلاک ہو گئیں (22:45)۔ سوال یہ ہے کہ وہ کیوں ہلاک ہو گئیں؟ قرآنِ کریم نے جواب دیا کہ وَهِيَ ظَالِمَةٌ (22:45)۔ انہوں نے ظلم واستبداد پر کمر باندھ رکھی تھی۔ کمزور اور ناتواں انسان ان کے ہاتھوں سخت نالاں تھے۔ بس ایک ہی لفظ میں جواب دے دیا کہ وہ ظالم تھیں۔ اس کے بعد آپ قرآنِ کریم کا محاکاتی انداز دیکھیے کہ بات ایسے سمجھائی کہ وہ محسوس طور پر سامنے آ جائے۔ بہرحال آپ یہ سارے قرآنی مضامین یا موضوعات تبویب القرآن میں دیکھ سکیں گے۔ لیکن ایک بات ذہن میں رکھیے۔ عالمِ انفس و آفاق کے مستور حقائق تو حدود نا آشنا ہیں' علمِ انسانی جوں جوں وسیع' عمیق اور بلند ہوتا جائے گا' زمانے کی لہروں میں لپٹے ہوئے حقائق بے نقاب ہوتے اور اس طرح نت نئے عنوانات سامنے آتے جائیں گے اور حرفِ آخر اس دنیا کے آخری انسان تک چھوڑنا پڑے گا۔ قرآن تو تصریفِ آیات سے اپنا مفہوم واضح کر دیتا ہے۔

اقوامِ گزشتہ کی داستانیں باعثِ عبرت ہیں

عزیزانِ من! بستیوں کی بربادی کو محاکاتی انداز میں سمجھاتے ہوئے محسوس طور پر قرآنِ کریم نے کہا کہ **وَهِيَ خَاوِيَةٌ عَلَىٰ عُرُوشِهَا** (22:45)۔وہ ایسی اجڑیں کہ ان کی (سر بفلک) عمارتیں اوندھی ہو کر گر پڑیں۔محسوس طور پر کہا کہ دیکھتے نہیں ہو کہ کس طرح ان کی چھتیں اوندھی گری ہوئی ہیں۔ یہ نہیں کہا کہ انکے اندر کوئی رہا ہی نہیں۔ کہا یہ کہ ان کی چھتیں اوندھی ہو گئیں۔ محاکاتی انداز ملاحظہ کیجیے کہ پھر محسوس طور پر بات کو آگے بڑھاتے ہوئے کہا کہ **وَبِئْرٍ مُّعَطَّلَةٍ** (22:45)۔ان کے کنوئیں بیکار ہو گئے اور **وَّقَصْرٍ مَّشِيدٍ** (22:45)۔ان کے مستحکم قلعے کھنڈرات بن کر رہ گئے یعنی اسے محسوس علامات ونشانات سے واضح کر دیا کہ انہوں نے بڑے بڑے مضبوط قلعے بنائے ہوئے تھے' آپ دیکھتے نہیں کہ وہ تمام کھنڈرات میں تبدیل ہو گئے اور اگلی بات پھر وہی غور وفکر کی کر دی تا کہ انہیں محسوس طور پر معلوم ہو جائے کہ اقوامِ گزشتہ کی داستانیں باعثِ عبرت ہیں۔

آرکیالوجی کا علم اور حقائق

عزیزانِ من! اب یہاں دیکھیے کہ علوم کے کون کون سے گوشے اور ابواب ایسے ہیں جن کی طرف قرآن توجہ دلا رہا ہے۔ ہمارے دَور کی یہ خصوصیت بتائی جاتی ہے کہ انہوں نے آرکیالوجی (Archaeology) [1] کے علم کو سائنس بنایا۔ آرکیالوجی یہ ہے کہ یہ جو بستی ہوئی دنیا کے لوگ ہیں یہ اجڑے ہوئے کھنڈرات میں جائیں اور اقوامِ گزشتہ کی تاریخ ان کے وجود کے ابتدائی زمانے کی باقیات سے تلاش کریں۔ سو یہ لوگ ان میں جاتے ہیں اور وہاں جا کے ان کھنڈرات کی ٹھیکریوں پر اقوامِ گزشتہ کی جو داستانیں لکھی ہوئی ہوتی ہیں' وہ انہیں پڑھ کر اِن سے ان کی تاریخ مرتب کرتے ہیں۔ اسے آرکیالوجی کا علم کہتے ہیں۔ یہ جو کھدائیاں ہوتی رہتی ہیں' ہم تو یہ سمجھتے ہیں کہ یہ خوامخواہ بیکاروں کا ایک مشغلہ ہے۔ بیٹھے ہوئے ہیں اور وہاں کھدائی کر رہے ہیں۔ چھ مہینے کے بعد ایک ولولہ مچتا ہے کہ ہاں ہاں' وہاں سے ایک ٹھیکری نکلی ہے۔ ارے ٹھیکری نکلی ہے' تو تم نے کیا پا لیا؟ کہا کہ نہیں صاحب! وہ ٹھیکری تو ایک بہت بڑی داستان کا ٹکڑا ہوتی ہے۔ یہ ایک سائنس بن گئی ہے۔ ان ٹھیکریوں سے پہلے تو وہ اس قوم کا زمانہ متعین کرتے ہیں اور پھر انہی سے آہستہ آہستہ ان کے ٹکڑے جوڑ جوڑ کر ان کی تاریخ مرتب کرتے ہیں۔ جہاں بھی آرکیالوجی (علمِ آثارِ قدیمہ) نے تاریخ مرتب کی ہے وہ آخری باب تک یہ ہوتا ہے کہ یہ تباہ ہی کیوں ہوئے تھے۔ یہ آج کے دور کی بات ہے کہ آرکیالوجی (علمِ آثارِ قدیمہ) اس قسم کی سائنس بن گئی ہے اور اس سے یہ نتائج مرتب ہو رہے ہیں' آج تاریخ میں نئے باب کا اضافہ ہو رہا ہے مگر' عزیزانِ من! اسے بھی دیکھیے کہ چودہ سو سال پیشتر عرب کی تاریک ترین سرزمین میں ایک اَن پڑھ' امی' اٹھتا ہے۔ وہ خدا کی بات کہتا ہے: **اَفَلَمْ يَسِيرُوا فِي الْاَرْضِ** (22:46)۔کیا یہ

---

[1] علم آثارِقدیمہ۔آثارِقدیمہ (خصوصاً زمانہ قبل از مسیح کے آثار) کی سائنس جو اقوام کی تاریخ شناسی' ان کے وجود کے ابتدائی زمانے کی باقیات سے کرتی ہے۔

لوگ ان علاقوں میں چلے پھرے نہیں (کہ ان سابقہ اقوام کے عبرت انگیز کام کو دیکھتے)؟ قرآنِ کریم نے اسے واضح کیا کہ کیا یہ لوگ دنیا میں چلے پھرے نہیں ہیں' کیا ان کھنڈرات کو انہوں نے دیکھا نہیں ہے؟ ان کھنڈرات کے دیکھنے سے کیا ہوتا ہے؟ سنیے' عزیزانِ من! یہ آرکیالوجی والے (ماہرینِ آثارِقدیمہ) اتنی محنت وکاوش سے اس نتیجے پہ پہنچے ہیں کہ اس سے بہت کچھ معلوم ہوتا ہے اور بڑے بڑے حقائق سامنے آتے ہیں۔

چودہ سو سال پیشتر علم کے ایک عظیم شعبہ کی طرف توجہ

عزیزانِ من! میں آپ سے یہ عرض کروں کہ چودہ سو سال پیشتر کی جو اس دور کی History (تاریخ) ہے' اُسے لیجیے' اس دَور کی ہم عصر تاریخ لیجیے' بلکہ یہ کہنا زیادہ موزوں ہے کہ آپ جس ملک' جس قوم کی بھی چاہیں' تاریخ لیجیے اور انہیں دعوے سے کہیے اور خود بھی آپ دیکھ لیجیے۔ کیا کسی بھی جگہ آرکیالوجی (علمِ آثارِقدیمہ) کو بھی تاریخ کے حقائق معلوم کرنے کا ذریعہ بتایا گیا ہے؟ نہیں' یہ تو آج کے دور کی اختراع ہے جو اس قوم کی تاریخ مرتب کرنے میں بنیادی حقائق سامنے لا رہی ہے۔ آپ کو حیرت ہوگی کہ اس دَور کے اندر ایک وہ شخص یہ بات کہتا ہے جس نے عرب سے باہر کہیں قدم بھی نہیں رکھا تھا اور عرب کے اندر تو جوان کا سب سے بڑا کیپٹل سٹی مکہ تھا اس میں صرف سترہ آدمی نوشت وخواند جانتے تھے اور آپ ﷺ تو نبوت سے پہلے امی تھے۔ وہ شخص [1] یہ کہتا ہے کہ اگر انہوں نے معلوم کرنا ہے کہ یہ قومیں کیوں تباہ ہوئی تھیں تو یہ کہیں گے کہ صاحب! ہمارے پاس تو تاریخ نہیں ہے' ان کا تو کوئی آدمی بھی زندہ نہیں ہے۔ کیا کریں؟ وہ کہتا ہے کہ ان کے کھنڈرات میں جاؤ' اور ان کھنڈرات کی ٹھیکریوں سے ان کی داستانیں پڑھو۔ اس سے کیا ہوگا؟ قرآنِ کریم نے ایک لفظ میں بتا دیا کہ **فَتَكُوْنَ لَهُمْ قُلُوْبٌ يَّعْقِلُوْنَ بِهَآ اَوْ اٰذَانٌ يَّسْمَعُوْنَ بِهَا** (22:46)۔ وہاں جا کے' اُن کھنڈرات کا مطالعہ کرو تا کہ دلوں کے اندر سمجھنے سوچنے کی صلاحیت بیدار ہو جائے۔ آج بیسویں صدی کے اندر یہ چیز فخر سے کہی جاتی ہے کہ ہم نے آرکیالوجی (علمِ آثاریات) کو سمجھنے سوچنے کا ذریعہ بنا لیا ہے جبکہ وہ چودہ سو سال پہلے کہتا ہے کہ جاؤ' ان سے کہو کہ یہ جو بستیاں تباہ ہوئی تھیں' ان کے کھنڈرات میں جاؤ' چلو پھرو۔ کیوں چلو پھرو؟ کیا تماشا دیکھنے کے لیے یا سیر کرنے کے لیے؟ عزیزانِ من! ہمارے جیسے اگر ان کھنڈرات میں جاتے بھی ہیں تو وہ زیادہ سے زیادہ پکنک کے لیے جاتے ہیں۔ نویکلی تھاں ہوندی اے۔ ذرا عام لوکی نئیں گئے ہوئے ہوندے او تھے۔ اسی تے اوہدا وی ایناں ای فائدہ اٹھانے آں۔ [2] مگر قرآن کہتا ہے کہ یہ اس لیے ہے **فَتَكُوْنَ لَهُمْ قُلُوْبٌ يَّعْقِلُوْنَ بِهَآ** (22:46) تا کہ ان کے سینوں کے اندر جو دل ہوتے ہیں ان دلوں میں سمجھنے سوچنے کی صلاحیت بیدار ہو جائے۔ **اَوْ اٰذَانٌ**

---

[1] یہ اشارہ ہے حضرت محمد مصطفیٰ صلی اللہ علیہ وسلم کی ذاتِ گرامی کی طرف۔

[2] بالکل نئی جگہ ہوتی ہے۔ وہاں عام لوگ گئے نہیں ہوتے۔ ہم تو اُس سے بھی اتنا ہی فائدہ حاصل کرتے ہیں۔

يَّسۡمَعُوۡنَ بِهَا (22:46) ان کے کانوں میں سننے کی صلاحیت و استطاعت آ جائے۔ اس لیے کہا کہ وہاں جاؤ۔ اصل یہ ہے کہ جب کوئی شخص حقائق کی طرف سے آنکھیں بند کر لیتا ہے تو فَاِنَّهَا لَا تَعۡمَى الۡاَبۡصَارُ وَلٰـكِنۡ تَعۡمَى الۡقُلُوۡبُ الَّتِىۡ فِى الصُّدُوۡرِ (22:46) یہ نہیں ہوتا کہ اس کے ماتھے کی آنکھیں بند ہو جاتی ہیں۔ (وہ تو بدستور بینا ہوتی ہیں لیکن) ان کے دل اندھے ہو جاتے ہیں جو سینوں کے اندر ہیں (اور اس طرح ان میں سمجھنے سوچنے کی صلاحیت مفقود ہو جاتی ہے۔)

آخر آرکیالوجی کے علم سے ہوگا کیا؟

عزیزانِ من! قرآن کہتا ہے کہ جو ان حقائق سے آنکھیں بند کر لیتے ہیں، کہو کہ میرے بھائیو! یہ ماتھے کی آنکھیں اندھی نہیں ہوا کرتیں، وہ تو دل میں جو آنکھیں ہوتی ہیں، وہ اندھی ہوا کرتی ہیں۔ جاؤ وہاں جا کر دیکھنے سے تمہاری وہ آنکھیں کھلیں گی۔ تمہارا یہ کہنا کہ ''ہمارے کان سنتے ہیں، ہماری آنکھیں دیکھتی ہیں، دل بھی ہمارے ہاں کا موجود ہے، دھڑک رہا ہے'' کچھ بھی کارآمد نہیں ہے۔ ان سے کہو کہ ماتھے کی آنکھیں نہیں اندھی ہوا کرتیں، دل کی آنکھیں اندھی ہوا کرتی ہیں۔ ماتھے کی آنکھیں تو ہمارے ہاں کے تمام ڈاکوؤں اور چوروں کی بھی کھلی ہوئی ہوتی ہیں، ایک ایک کی دس دس آنکھیں ہوتی ہیں، اندھا پن کہاں ہوتا ہے! وہ جو دل میں آنکھیں ہوتی ہیں وہ اندھی ہوتی ہیں۔ اس لیے کہا کہ حقائق معلوم کرنے کا ایک ذریعہ یہ بھی ہے کہ ان کھنڈرات میں جاؤ، ان پر غور و فکر کرو، تمہارے دل کی آنکھوں میں بینائی پیدا ہو جائے گی۔ تم چیزوں کو ان کے صحیح پس منظر میں دیکھنے لگو گے۔

سِيۡرُوۡا فِى الۡاَرۡضِ کا مفہوم

عزیزانِ من! یہ يَسِيۡـرُوۡا فِـى الۡاَرۡضِ (55:11) قرآن کا حکم ہے۔ قرآن ماننے والوں کو، جنہیں مومنین کہا جاتا ہے یا جنہیں مسلمان کہو، جنہیں قرآن کے سامنے سرِتسلیم خم کر دینے والے کہو، یہ حکم دیا گیا ہے کہ سِيۡرُوۡا فِى الۡاَرۡضِ (55:11) زمین میں چلو پھرو۔ سابقہ اقوام کے عبرت انگیز انجام کو دیکھو۔ یہ حکم ہے کہ ان کھنڈرات میں جاؤ، جا کر ان کا مطالعہ کرو۔ چلو پھرو۔ یہ دیکھو یعنی سِيۡـرُوۡا فِى الۡاَرۡضِ دنیا میں چلو پھرو۔ شاید آپ کو پہلے بھی میں نے بتایا ہو کہ یہ جو قرآن شریف کے احکام ہیں، ان پہ آج بھی عمل ہوتا ہے۔ آپ کہیں گے کہ ہم نے تو کبھی کسی مسلمان قوم کے کسی مفکر کو نہیں دیکھا کہ وہ بھی آرکیالوجی میں یوں حصہ لے رہا ہو یا یہ کچھ کر رہا ہو۔ اس سلسلے میں ہماری تو عجیب صورتِ حال ہے۔

سِيۡرُوۡا کے سلسلہ میں اہلِ تصوف کا عمل

عزیزانِ من! آپ اس عجیب صورتِ حال پہ محوِ حیرت نہ ہوں سِيۡـرُوۡا فِى الۡاَرۡضِ پہ عمل ہو رہا ہوتا ہے مگر ہوتا عجیب انداز میں ہے۔ یہ جو روحانیت کے ارباب ہیں، ان کے ہاں یہ عمل ہوتا ہے۔ پھر میں بار بار دہرا دوں۔ یہ چیز محفوظ رہ جائے گی۔ میں یہ آپ

بیٹیاں سنا رہا ہوں' میری آدھی عمر یہیں گزری ہے' انہی حجروں اور خانقاہوں کے اندر **سِیۡـرُوۡا فِـی الۡاَرۡضِ** کرتے گزری ہے۔ بہرحال حضرت صاحب کو ملنے کے لیے آنے والے مریدوں نے بڑی دور سے کہا کہ جی! اطلاع دیدیجیے اور پوچھیے کہ کیا وہ باہر تشریف لے آئیں گے یا ہم انہیں اندر جا کر مل لیں۔ انہوں نے کہا کہ نہیں نہیں' آج کل تو وہ بالکل ہی نہیں مل سکتے جناب! انہوں نے کہا کہ جی! کبھی کسی وقت باہر آتے ہیں تو ہم دور سے ہی حضور کی زیارت کر لیں گے' اسی سے ہی ہمارے گناہوں کی بخشش ہو جائے گی۔ کہنے لگے: نہیں' وہ تو باہر بھی نہیں نکلتے۔ کہا کہ ہم دو چار دن کے بعد آ جائیں گے۔ کہنے لگے: نہیں' چالیس دن تک تو وہ اس کے باہر قدم نہیں رکھیں گے' اندر ہی ان کے کھانے یا پینے کے لیے یوں دیدیا جاتا ہے' دروازہ بھی نہیں کھل رہا۔ کہنے لگے کہ حضور! آج کل حضرت صاحب کیا کر رہے ہیں؟ کہنے لگے کہ **سِیۡرُوۡا فِی الۡاَرۡضِ** کے وظیفے میں لگے ہوئے ہیں۔ آپ بیٹیاں ہنس رہی ہیں۔ **سِیۡرُوۡا فِی الۡاَرۡضِ** تو خدا کا حکم تھا اب **سِیۡـرُوۡا فِی الۡاَرۡضِ** پہ عمل ہو رہا ہے' وظیفے میں لگے ہوئے ہیں۔ عزیزانِ من! یہ وظیفہ ہمیں بھی کرایا جاتا تھا۔ آپ کہیں گے کہ وہ **یسیـروا فـی الارض** ہوتا کیا تھا؟ بس اسے یوں سمجھو کہ بیٹھے بیٹھے ہی' عالمِ تخیل کے اندر ہی' ہم کبھی امریکہ پہنچے ہوئے ہیں' کبھی آسٹریلیا گئے ہوئے ہیں' کبھی انگلینڈ گئے ہوئے ہیں۔ یہ طبعی طور پہ دیکھا نہیں ہے' بس اپنے ہی ذہن میں آئے تو ہم افریقہ فرض کر لیں' زیادہ جی میں آئے تو یورپ فرض کر لیں۔ بس صاحب! بیٹھے ہوئے ہیں۔ یہ جو ہمارے ہاں کے دوسرے علم پڑھنے والے حضرات ہیں' ان کے ہاں کے جغرافیے میں تین [1] ہی برِاعظم ہوتے تھے کیونکہ اس زمانے میں جب وہ جغرافیہ پانچ سو سال پہلے لکھا گیا تھا اس وقت امریکہ اور آسٹریلیا ابھی دریافت نہیں ہوئے تھے۔ اے تینے ای برِاعظم سمجھ لیندے سن پئی دنیا دے علم تے حاوی ہو گئے۔ [2] علیگڑھ یونیورسٹی میں جب کہ یہ ابھی کالج ہی ہوتا تھا تو وہاں جغرافیے کے ایک مشہور پروفیسر سے ملنے کے لیے گئے۔ اُس وقت امریکہ اور جزیرہ آسٹریلیا دریافت ہو چکے تھے۔ تو ایک انگریز نے پروفیسر صاحب سے بھی پوچھا کہ پروفیسر صاحب! جب آسٹریلیا دریافت نہیں ہوا تھا تو دنیا کا سب سے بڑا جزیرہ [3] کونسا تھا؟ انہوں نے مثلاً نام لے لیا کہ جی فلاں تھا۔ تو اس پر اس انگریز نے پروفیسر صاحب سے کہا کہ نہیں جناب! دنیا کا سب سے بڑا جزیرہ اس وقت بھی آسٹریلیا [3] ہی تھا۔ البتہ دریافت نہیں ہوا تھا۔ یہ لوگ اس قسم کا لطیف مذاق

---

[1] آج سات براعظم دریافت ہو چکے ہیں: (۱) ایشیا' (۲) یورپ' (۳) افریقہ' (۴) جنوبی امریکا' (۵) شمالی امریکا' (۶) اوشینیا' (۷) انٹارکٹیکا۔ یاد رہے کہ اوشینیا میں آسٹریلیا سمیت تسمانیہ' نیوزی لینڈ' پاپوآ نیوگنی اور جزائر بحرالکاہل شامل ہیں۔

[2] یہ تین براعظموں کو سمجھ کر یوں ہوتا تھا کہ گویا یہ تمام دنیا کے علم پر حاوی ہو گئے۔

[3] ایشیا سب سے بڑا ہے۔ اس کی آبادی دنیا کی کل آبادی کا 60.68 فی صد ہے یہ 17,176,102 مربع میل پر محیط ہے جب کہ سب سے چھوٹا آسٹریلیا ہے۔ یہ 3,035,651 مربع میل پر پھیلا ہوا ہے۔ اس کی کل آبادی 17,800,000 نفوس پر مشتمل ہے جو کہ دنیا کی کل آبادی کا 0.50 فی صد ہے۔ یہ جنوبی بحرالکاہل میں واقع ہے۔ براعظم انٹارکٹیکا میں کوئی آبادی نہیں ہے۔ یہ 11,500,000 مربع میل پر محیط ہے اور جنوبی قطب پر واقع دنیا کا شدید ترین سرد خطہ ہے۔

کرتے تھے۔ ہاں تو میں یہ کہہ رہا تھا کہ **سِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ** کا وظیفہ ہو رہا ہے' جیسے عشاء کے بعد وہ ذکر کی ضربیں لگا کرتی ہیں۔ پہلے تو حجروں میں لگتی تھیں' اب یہ مسجدوں میں بھی شروع ہو گئیں ہیں۔ صاحب! اللہ کا ذکر جو ہے حالانکہ ذکر کے معنی یہ تھے کہ ''قانونِ خداوندی کو ہر وقت سامنے رکھو۔'' ذکر اللہ کے معنی یہ تھے کہ ''کوئی بھی معاملہ تمہارے سامنے آئے' فوراً قانونِ خداوندی تمہارے سامنے آ جانا چاہیے۔ اب اس کی جگہ ضربیں لگنی شروع ہو گئیں۔ یعنی یہ باقاعدہ احکام کی تعمیل ہو رہی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ تعمیل اس طرح سے ہو رہی ہے۔ بہرحال قرآن نے یہ کہا کہ ان سے کہو کہ جاؤ: **سِیْرُوْا فِی الْاَرْضِ** ۔ زمین میں چلو پھرو' ان کھنڈرات کو دیکھو' اس سے یہ ہو گا کہ تمہارے دل کی آنکھیں بیدار ہو جائیں گی۔

یہ وحی کا کرشمہ ہے

عزیزانِ من! چودہ سو سال پہلے آرکیالوجی (علمِ آثارِ قدیمہ) کے متعلق اس نتیجے پر پہنچنا وحی کے سوا کسی کے فکر کی بات نہیں تھی۔ انسانی فکر یہ کہہ ہی نہیں سکتی تھی۔ کہا کہ یہ ہے وہ بات کہ ہم درمیان میں مہلت (Respite) دیا کرتے ہیں۔ اس سے یہ لوگ غلط فہمی میں مبتلا ہو جاتے ہیں یہ لوگ' بجائے اس کے کہ عقل و بصیرت سے کام لیں' تقاضا پر تقاضا کر رہے ہیں کہ **وَیَسْتَعْجِلُوْنَکَ بِالْعَذَابِ** (22:47) جس تباہی کی انہیں دھمکی دی جا رہی ہے وہ جلدی کیوں نہیں آ جاتی۔ کہا کہ اس کے باوجود یہ تمہیں بار بار یہ کہتے ہیں کہ لاؤ وہ تباہی' کرو ہلاکت۔ ان سے کہا کہ وہ قانونِ مہلت (Law of Respite) ہے' یہ اِسے یوں نہیں سمجھتے کہ یہ ان کے فائدے کے لیے ہے۔ اگر سنکھیے کی ذرا سی پہلی Doze (خوراک) کھانے سے ہی مریض مر جائے تو روز موتیں ہوا کریں۔ یہ سنکھیا ہی نہیں' عزیزانِ من! ڈاکٹر یا ہیلتھ والے' ہمیں بتاتے ہیں کہ ایک ایک سانس کے اندر اتنے زہریلے جراثیم ہمارے اندر چلے جاتے ہیں کہ انسان کی موت کے لیے ایک سانس کافی ہو سکتا ہے وہ تو قدرت نے Catabolism[1] اور Metabolism[2] کا نظام ایسا رکھا ہوا ہے کہ اس سے مدافعت کی قوت پیدا ہوتی ہے' جس سے وہ تلف ہوتے جاتے ہیں' نئے بنتے چلے جاتے ہیں' لیکن اگر ہم بار بار اسی قسم کے کثیف زہر آلود سانس لیتے چلے جائیں تو پھر ایک دن تو اسکے بعد ہلاکت ہو گی۔ اب اگر کوئی یہ بات کہے کہ صاحب! آپ کہتے تھے کہ اس قسم کی گندی ہوا میں سانس نہ لیا کرو' مر جاؤ گے' میں تو سانس لیتا ہوں' مرتا تو ہوں نہیں۔ اور اگر آپ یہ کہتے ہیں تو پھر ذرا مجھے مار کے بتاؤ تو سہی۔ یہ لو' میں سانس لیتا ہوں' مرا تو نہیں ہوں۔ اس لیے کہا کہ یہ لوگ بجائے اس کے کہ عقل و فکر سے کام لیں' تقاضا پہ تقاضا کر رہے ہیں کہ **یَسْتَعْجِلُوْنَکَ بِالْعَذَابِ** (22:47) جس تباہی کی انہیں دھمکی دی جا رہی ہے' وہ جلدی کیوں نہیں آ جاتی۔ اب تم ان سے یہ کہتے ہو

---

[1] جاندار نامیاتی اجسام میں زیادہ پیچیدہ سالموں کا سادہ تر ذروں میں ٹوٹنا اور اس ٹوٹ پھوٹ سے توانائی کا اخراج ہونا۔

[2] زندہ عضویہ خلیوں میں وہ مجموعی کیمیائی تبدیلی' جس کے ذریعے خوراک زندہ مادۂ اولیٰ یا نخز مایہ میں تبدیل ہو جاتی ہے اور پھر جس کے ذریعے نخز مایہ استعمال ہوتا ہے اور ٹوٹ کر' توانائی مہیا کرتے ہوئے سادہ تر مرکبات اور فضلے کی صورت اختیار کرتا ہے۔

اور یہ کہتے ہیں کہ پھر وہ تباہی آتی کیوں نہیں ہے' ان سے کہو کہ دو باتیں یاد رکھو کہ **وَلَنْ یُّخْلِفَ اللّٰہُ وَعْدَہٗ** (22:47)۔ خدا کا قانون اٹل ہے۔ ایسا ہو نہیں سکتا کہ تمہارے اعمال کے نتائج تمہارے سامنے نہ آئیں۔ تم ایک بات تو یہ یاد رکھو۔

خدا کا قانون اٹل ہے

عزیزانِ من! پہلی بات تو یہ ہے کہ خدا کا قانون اٹل ہے۔ یہ ہو نہیں سکتا کہ جو اس نے کہا ہے وہ نہ ہو' یا وہ غلط ہو جائے۔ اب ان کا یہ اعتراض ہے کہ اگر یہی بات ہے تو وہ کچھ ہوتا کیوں نہیں ہے۔ آج بھی ہمارے ہاں لوگ یہ کہتے ہیں کہ اگر خدا موجود ہے تو جب ظالم اپنا خنجر مظلوم کے سینے میں گھونپنے کے لیے اٹھاتا ہے تو خدا اس کا ہاتھ پکڑ کا کیوں نہیں کر دیتا۔ یہ پنپتے چلے جاتے ہیں' Multi millionaire (کروڑ در کروڑ پتی) ہوتے چلے جاتے ہیں' انہیں وہ روکتا کیوں نہیں۔ تو بتاؤ کہ کس طرح خدا کا قانون اٹل ہے۔

قدرت کے دنوں کا حساب وشمار

عزیزانِ من! یہ کہتے ہیں کہ اگر خدا کے قانون کی یا اس کے نظام کی ایسی ہی چیز ہے تو یہ ظالم لٹ پٹ کیوں نہیں جاتے۔ یہ کہتے ہیں کہ وہ کچھ فوراً کیوں نہیں ہوتا۔ ان سے کہا کہ ایک تو یہ بات یاد رکھو کہ اگر یہ کچھ فوراً نہیں ہو رہا تو اس کے معنی یہ نہیں ہیں کہ وہ قانون جھوٹا ہے۔ اس سلسلے میں ان سے کہو کہ پہلی بات تو یہ یاد رکھو کہ وہ قانون بالکل برحق ہے' جو کچھ کہا گیا ہے وہ ہو کے رہے گا۔ اب رہی یہ بات کہ ظالم قوم فوراً اہلاک کیوں نہیں ہوتی۔ یہ فوراً کی تو اگلی بات ہے۔ عزیزانِ من! یہ اگلی بات مہلت (Respite) کی بتائی گئی ہے۔ لہٰذا سوچیے تو سہی کہ چودہ سو سال پیشتر کوئی یہ چیز کہہ سکتا تھا! کہا کہ ساری بات یہ ہے کہ جب یہ نتائج خدا کے کائناتی قانون [1] کے مطابق مرتب ہوں تو ان کے ظہور میں دیر لگتی ہے اس لیے کہ **وَاِنَّ یَوْمًا عِنْدَ رَبِّکَ کَاَلْفِ سَنَةٍ مِّمَّا تَعُدُّوْنَ** (22:47)۔ خدا کے کائناتی نظام (Cosmic System) میں ایک ایک دن کی مقدار ایسی ہے جیسے تم لوگوں کی گنتی شمار کے مطابق ایک ہزار سال ہو (70:4 (32:5)۔ کائناتی تبدیلیاں اور قوموں کے احوال وظروف میں تغیرات' بڑے بڑے لمبے عرصہ کے بعد رونما ہوتے ہیں۔ جو کچھ کہا جاتا ہے وہ واقع ہو کر رہتا ہے۔ اصل بات یہ ہے کہ تمہارا ایک دن تو چوبیس گھنٹے کا ہوتا ہے اور خدا کا ایک ایک دن ہزار ہزار سال کا ہوتا ہے۔ اگر اس کے قانون کے مطابق ظلم کی ابتدا اور انتہا میں اس کی تباہی کے لیے پانچ سو سال کا عرصہ بھی کسی قوم کو لگے' تو خدا کے ہاں آدھا دن ہوا۔ تو فرق صرف اس حساب وشمار کا ہے۔ تم اس نتیجے کو اپنے حساب کے مطابق برآمد کرانا چاہتے ہو جبکہ وہ ہمارے حساب کے مطابق برآمد ہوتا ہے۔

---

[1] Cosmic Law

قوموں کی تاریخ صدیوں میں مرتب ہوتی ہے

عزیزانِ من! آج یہ بات تو ساری دنیا مانتی ہے کہ قوموں کی تاریخ صدیوں میں مرتب ہوتی ہے۔ سوشیالوجی والے Sociologists (ماہرین علم سماجیات) بھی مان رہے ہیں کہ قوموں کی تاریخیں صدیوں میں جا کے بدلتی ہیں۔ اس کائناتی نظام کا ایک دودن ہمارے حساب شمار سے ایک دوسال کا عرصہ ہوتا ہے مگر قرآن کہتا ہے کہ یہ آنکھ جھپکنے کا عرصہ ہوتا ہے۔ قوموں کے تغیر اور احوال صدیوں میں ظہور پذیر ہوتے ہیں۔ اس لیے آپ دیکھتے ہیں کہ ایک ایک Dynasty 'ایک ایک خاندان' کو اقتدار سے الگ کرنے میں تین تین سو چار چار سو سال نہیں، ہزاروں سال تک کا عرصہ لگ جاتا ہے۔ آپ ایران اور روما کی سلطنتوں کی باطل تہذیب کو دیکھیے ہزار ہزار سال یہ ملک کا یہ وقفہ بھی چلا ہے۔ وہ یہ چیز تھی کہ خدا کا حساب اس تاریخ کا حساب ہے۔ قوموں کی تاریخیں صدیوں سے مرتب ہوتی ہیں اور صدیوں سے ناپی جاتی ہیں ہمارے حساب وشمار کے دنوں سے نہیں اور خدا کا تو ایک ایک دن ہزار ہزار سال کا ہے۔ عزیزانِ من! کونسا انسان اپنی فکر سے یہ باتیں کہے گا کہ قوموں کی تقدیریں ہزاروں سال کے بعد صدیوں کے ساتھ جا کے بدلی جاتی ہیں۔ اس لیے کہا کہ اس کی وجہ ان سے پوچھو **وَ كَاَيِّنْ مِّنْ قَرْيَةٍ اَمْلَيْتُ لَهَا وَهِيَ ظَالِمَةٌ ثُمَّ اَخَذْتُهَا** (22:48)۔ کتنی ہی قومیں ایسی تھیں جو ظلم واستبداد کرتی تھیں۔ پہلے انہیں مہلت دی گئی (اور جب وہ اپنی اس روش سے باز نہ آئے تو) انہیں پکڑ لیا گیا۔

قوموں کی موت وحیات کے متعلق ایک اہم سوال

عزیزانِ من! اب یہاں یہ کہا گیا ہے کہ ان سے کہو کہ ان اقوام کی تاریخ پہلے دن سے پڑھو۔ یہ چھوڑ دو کہ کسی قوم کو کتنا وقت لگا۔ ان سے یہ پوچھو کہ تاریخ میں کتنی ہی قومیں تمہارے سامنے آئیں گی جنہوں نے ظلم پر مبنی نظام قائم کیا۔ ہم نے انہیں مہلت دی۔ مہلت کا وقفہ پورا ہونے کے بعد پھر ان کی گرفت ہوئی۔ کہا کہ تمہیں تاریخ میں کوئی قوم بھی ایسی ملتی ہے کہ ان کا نظام ظلم پر مبنی ہوا اور وہ تباہ نہ ہوئی ہو؟ ہمارا اصول یہ ہے کہ **ثُمَّ اَخَذْتُهَا** (22:48) ہم نے انہیں پکڑا اور اگلا قدم یہ ہے کہ انہیں سمجھ لینا چاہیے کہ ان کا انجام بھی ہمارے اسی قانون کے مطابق ہو کر رہنا ہے۔ یہ اس سے بھاگ کر نہیں جاسکتے۔ اس لیے کہا کہ **وَاِلَيَّ الْمَصِيْرُ** (22:48) انہیں آخر الامر ہمارے ہی قانون کی طرف آنا ہے۔ اب یہاں آ کے ہمارے ہاں تراجم اور تفسیر نے پھر غلطی کی اور دہائی مچا دی کہ جی' ظالم پکڑا کیوں نہیں جاتا۔ یہ ظالم قوم کیوں نہیں پکڑی جاتی۔ عزیزانِ من! یہ نہیں پکڑی جائے گی۔ لیکن ہمارے ہاں کے ان تراجم اور تفاسیر کے مطابق خدا نے کہا ہے کہ **وَاِلَيَّ الْمَصِيْرُ** (22:48) انہوں نے ہمارے ہاں آنا ہے۔ بس اوتھے پھڑاں گے۔ ساڈے محلے آئیں گا نا' ایتھے کر لین جو کرنا ئیں۔ [1]

---

[1] وہاں (آخرت میں) ہم پکڑیں گے۔ تم ہمارے محلے میں آ ؤ گے۔ یہاں (اس دنیا میں) جو کچھ کرنا ہے کرلو۔

عزیزانِ من! خدا کا قانون تو قانونِ مہلت ہے مگر انہوں نے خدا کی عملداری بھی مرنے کے بعد کی زندگی کے لیے محدود کر رکھی ہے۔ یہ جو سارا دائرۂ کائنات ہے اس میں نہ خدا ہے نہ خدا کا قانون کارفرما ہے' وہ یہاں کچھ نہیں کر رہا۔ وہ مرنے کے بعد وہاں اگلی دنیا میں کرے گا۔ یہ یوں کہتے ہیں کہ اچھا کوئی بات نہیں' اک دن آئے گا ناساڈا وی۔ ❶ جب کہ خدا کہتا ہے کہ **وَاِلَيَّ الْمَصِيْرُ** (22:48) انہیں آخرالامر اس کی طرف آنا ہے۔ اور یہ کہتے ہیں کہ نہیں' خدا تو مرنے کے بعد ہی ان کی گرفت کرے گا۔ یہ کہنے کے بعد اب مطمئن ہو کے بیٹھ گئے ہیں۔

ہمارے کیے گئے شرعی فیصلوں کے تحت جنت میں موتیوں کے گھر کا حصول

عزیزانِ من! آخرت یعنی حیات بعدالممات کے متعلق قرآنِ کریم میں یہ ہے کہ جب ان سے کہا جاتا ہے کہ وہاں پکڑے جاؤ گے تو وہ کہتے ہیں کہ وہاں کا بھی ہم نے انتظام کر رکھا ہے۔ اللہ نے جو ہمیں دولت دے رکھی ہے' ہم نے اس سے ایسا انتظام کر رکھا ہے کہ...... اوتھے وی اسیں عیش ہی کرنے ہیگے نیں ❷ یہ کہتے ہیں کہ سیدھی سی بات ہے' ایک مسجد بنا دیجیے' ان کے شرعی فیصلے کے مطابق' موتیوں کا گھر جنت میں مل جاتا ہے۔ تو جو شخص اس طرح سے کروڑوں روپے غصب کرتا ہے' اس کے لیے لاکھ روپے کی ایک مسجد بنوا دینا کیا مشکل ہے۔ خیرات میں دیگیں پکوائے تو بقول ان کے جنت میں گھر تیار۔ یہ جتنی بڑی بڑی خانقاہوں کے اندر دیگیں جاتی ہیں' پوچھ لیجیے' یہ وہی بڑے بڑے اسمگلر ہیں' یہی لٹیرے ہیں' انہی کے ہاں سے جاتی ہیں۔ کہا یہ جاتا ہے کہ اللہ کے ہاں انکا ثواب ملتا ہے۔ تو یہ ثواب وہ وہاں جا کے لیں گے۔ قرآن میں ہے کہ انہیں اس فریب میں مبتلا رکھا جاتا ہے اسی لیے ان سے کہا گیا کہ انہیں سمجھ لینا چاہیے کہ ان کا انجام بھی اسی قانونِ مکافات کے مطابق ہو کر رہنا ہے۔ یہ اس سے بھاگ کر کہیں نہیں جاسکتے۔ کیوں کہ **وَاِلَيَّ الْمَصِيْرُ** (22:48) انہیں آخر الامر اس کی طرف آنا ہے۔ ہاں تو' عزیزانِ من! بات چلی آ رہی ہے کہ ان سے پوچھو' تاریخ کے اوراق سے پوچھو' ان کھنڈرات سے پوچھو کہ کتنی بستیاں تھیں' جو ظالم تھیں' وہ تباہ ہوئیں۔ قرآن اسی دنیا کی بات کر رہا ہے' کہہ یہ رہا ہے کہ صرف درمیان میں مہلت کا وقفہ ہوتا ہے۔ پھر اگلی بات کی اور واضح طور پر کہہ دیا کہ **وَاِلَيَّ الْمَصِيْرُ** (22:48) آخرالامر انہیں آنا تو اسی کی طرف ہے' فیصلہ تو اسی کے قانونِ مکافات کے مطابق ہوگا۔

اشتہاری مجرم کی اندرونی مجبوری و مقہوری

عزیزانِ من! یہ جو بھاگے ہوئے مجرم ہوتے ہیں پھر وہ اشتہاری ہو جاتے ہیں۔ آپ نے کبھی یہ سنا ہوگا کہ صاحب! پانچ سال کے بعد وہ خود ہی عدالت میں آ گیا اور اس نے کہا کہ صاحب! یہ جو عذاب کی زندگی تھی' یہ جو میں بھاگا بھاگا پھر رہا تھا' ایک دن بھی چین

---

❶ ایک دن ہمارا بھی آئے گا۔

❷ وہاں بھی ہم عیش ہی کریں گے۔

سے نہیں سویا اور بالآخر میں نے کہا کہ بھئی! جو سزا اس کیسے پہ ملے گی' وہ آسان ہے' وہ میں بھگت لونگا۔ اس لیے میں آپ کی طرف آ گیا ہوں۔ یہاں کی یہ صورت تو یوں ہے۔ اس میں خدا یہ کہتا ہے کہ یہ جو اس وقت بھاگے بھاگے پھر رہے ہیں اور کہتے ہیں کہ خدا کی گرفت ہی نہیں ہوسکتی' اس کی ہم تک پہنچ ہی نہیں ہوسکتی جبکہ انہوں نے ہیر پھیر کر بھی اسی عدالت میں آنا ہے' یہ کہیں اور جا ہی نہیں سکتے۔ اس لیے کہ ہماری کائنات تو لامحدود ہے' اس کی حدود سے کہیں باہر نہیں نکل سکیں گے؟ یہاں تو تم یہ کچھ کرلو گے۔ یہاں جرم کیا' سرحد پار چلے گئے' ٹھیک ہے' کسی دوسرے کی مملکت شروع ہوگئی تو تم بچ گئے مگر وہ کہتا ہے کہ یہاں تو کسی دوسرے کی مملکت ہی نہیں ہے' صرف ہماری ہی مملکت ہے' اس میں صرف ہمارا ہی اقتدار چلتا ہے اور تمہیں **وَاِلَـيَّ الْمَصِيْرُ** (22:48) آخرالامر اسی کی طرف آنا ہے۔ جتنا جہاں جی چاہے بھاگتے پھریں' جتنی دیر جی چاہے مفرور رہیں' اشتہاری رہیں' آخرالامر انہوں نے ہماری اس عدالت میں ہی حاضر ہونا ہے۔ کیا بات ہے! اور یہ سارا کچھ کہنے کے بعد وہ بات آ گئی جہاں سے میں نے آج بات شروع کی تھی کہ انبیاء کرام علیہم السلام کا مشن تو اتنا ہوتا ہے کہ وہ Warn (آگاہ' تنبیہ) کر دیتے ہیں کہ تمہارے اس نظام کا نتیجہ تباہی ہوگا۔ قرآنِ کریم کا انداز دیکھیے کہ یہاں انہیں واضح طور پہ کہا' اعلانیہ کہا کہ اس روش کا نتیجہ تباہی ہوگا۔ قرآن اس انداز کے لیے ہمیشہ ''قل'' کا لفظ استعمال کرتا ہے۔

پوری نوعِ انسانی کے لیے ایک تاکید لازم

عزیزانِ من! قرآنِ کریم پوری نوعِ انسان کے لیے ایک لازمی تاکید کرتا ہے۔ کہتا ہے کہ **قل** (22:49) اے رسول! یہ سارا خدا کا اٹل قانون یعنی قانونِ مکافاتِ عمل واضح کردینے کے بعد ان کو ایک بات بتادو کہ **يٰۤاَيُّهَا النَّاسُ** (22:49) اے لوگو! ...... یہاں یہ بات ذہن میں رکھیے کہ وہ صرف اپنی امت سے' مسلمانوں سے ہی نہیں کہہ رہے' الناس سے کہہ رہے ہیں۔ انہیں کہا بھی یہی جا رہا ہے کہ یہ بات پوری نوعِ انسانی پہ واضح کردو کہ **اِنَّمَاۤ اَنَا لَكُمْ نَذِيْرٌ مُّبِيْنٌ** (22:49)۔ میرا منصب' میری حیثیت' اس باب میں صرف اتنی ہے کہ میں تم سب کو خدا کے قانونِ مکافات سے کھلے الفاظ میں Warn (آگاہ) کردوں کہ تمہارے غلط نظام کا نتیجہ یہ ہوگا اور بس میں تو یہ کہنے کے لیے آیا ہوں' یہ بتانے کے لیے آیا ہوں' نہ مجھے اپنی حکومت قائم کرنی ہے' نہ طاقت قائم کرنی ہے' نہ تم سے کچھ لینا ہے۔ **لَاۤ اَسْـَٔـلُكُمْ عَلَيْهِ مِنْ اَجْرٍ** (6:91; 11:51)۔ میں تو اس کے صلے میں تم سے کچھ نہیں مانگتا۔ میں تو تمہیں ایک ناصحانہ مشورہ دیتا ہوں' قبل از وقت وارننگ دے رہا ہوں' آگاہ کر رہا ہوں' آنے والی تباہی کا قبل از وقت تمہیں بتا رہا ہوں۔ اس کے بدلے میں بھی میں تم سے کچھ نہیں مانگ رہا۔ عزیزانِ من! یہ بھی بڑی چیز ہے کہ معاوضے میں کچھ نہ مانگا جائے۔

دین اور مذہب میں فرق اور مذہبی پیشوائیت کی حالتِ زار

دین اور مذہب میں یہ بھی فرق ہوتا ہے کہ مذہب پروفیشن ہوتا ہے۔ مذہبی پیشوائیت انہیں کوئی ہنر نہیں سکھاتی کہ وہ اپنی روٹی آپ

کما سکیں۔ انہیں تو اس کے معاوضے میں کچھ مانگنا ہوتا ہے۔ کبھی آپ نے پوچھا کہ وہ کرتا کیا ہے؟ جیسا میں نے کئی دفعہ کہا ہے کہ جسے آپ امام کہتے ہیں اس نے بھی وہی نماز پڑھنی ہوتی ہے جو آپ نے پڑھنی ہے۔ ہم تو صرف اس کے پیچھے فرض پڑھ لیتے ہیں بقیہ نماز تو اس نے بھی پڑھنی ہوتی ہے۔ اسے یہ فائدہ ہوتا ہے کہ اگر پیچھے جگہ نہیں بھی ہوتی تو بھی اس کے لیے تو جگہ Reserve (مخصوص) کی ہوئی ہوتی ہے۔ کیا بات ہے اس نظم وضبط کی بھی!

اس امام کے لیے یہ Advantage ہوتا ہے اُس کی ایک پوزیشن ہوتی ہے کہ نمازی باہر دھوپ کے اندر تپتے ہوئے بھی کیوں نہ کھڑے ہوں اس امام کے لیے جگہ Reserve (مخصوص) ہوتی ہے۔ اگر آخر میں بھی آئے تو بھی سب سے آگے کھڑا ہوتا ہے۔ کرتا کیا ہے؟ جو نماز آپ نے پڑھنی ہوتی ہے وہ بھی وہی پڑھتا ہے۔ تین نمازیں ایسی ہوتی ہیں جن میں اُسے ذرا اونچی آواز سے پڑھنا ہوتا ہے اور یہ پڑھنے کے بعد وہ وعظ بھی کہتا ہے۔ اُس وعظ میں علمی سطح کچھ یونہی سی ہوتی ہے۔

بغیر کسی معاوضہ کے راہنمائی کرنا نبیوں کی سنت ہے

عزیزانِ من! قرآنِ کریم نے نبی کو **نَذِیْرٌ مُّبِیْنٌ** (22:49) کہا ہے یعنی خدا کے قانونِ مکافات سے کھلے کھلے الفاظ میں آگاہ کرنے والا جس کی فقط اتنی ہی حیثیت ہے کہ وہ آگے یہ کہتا ہے کہ میں وارننگ (آگاہی) دیتا ہوں لیکن **لَآ اَسْئَلُکُمْ عَلَیْهِ مِنْ اَجْرٍ** (6:90)۔ میں تم سے اس کا کوئی معاوضہ نہیں مانگتا۔ یہ حکیم، یہ طبیب، یہ ڈاکٹر، کتنا مخلص اور ناصح ہے! تمہاری پوری چیکنگ کرتا ہے، تمہاری پوری تشخیص کر دیتا ہے، علاج بتا دیتا ہے اور اس کے بعد جب آپ کہتے ہیں کہ بل پیش کیجیے تو وہ کہتا ہے کہ نہیں **اِنْ اَجْرِیَ اِلَّا عَلَی اللّٰهِ** (10:72)۔ میں تو یہ خدا کے لیے کرتا ہوں۔ میرا معاوضہ میرا خدا مجھے عطا کر دے۔ **اِنَّمَآ اَنَا لَکُمْ نَذِیْرٌ مُّبِیْنٌ** (22:49)۔ میری حیثیت اس باب میں فقط اتنی ہے کہ میں تمہیں خدا کے قانونِ مکافات سے کھلے کھلے الفاظ میں آگاہ کرتا ہوں میں تو صرف واضح طور پہ تمہیں بتاتا ہوں کہ آگے کنواں ہے اندھے ہوئے چلے جا رہے ہو اس کنویں میں گر پڑو گے۔ بس میرا منصب اتنا ہی ہے۔ یہ نذیر ہو گیا اور اس کا اگلا حصہ بشیر ہے یعنی صحیح روشِ زندگی کے نتائج کی خوش خبری دینے والا۔ غلط نظامِ زندگی کا نتیجہ تباہی ہوتا ہے۔ یہ بتانے کے لیے اسے نذیر کہتے ہیں۔ صحیح نظامِ زندگی کے نتیجہ کے لیے قرآن کہتا ہے کہ **فَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ وَّ رِزْقٌ کَرِیْمٌ** (22:50)۔ سو جو لوگ اس قانون کی صداقت پر یقین رکھ کر صلاحیت بخش کام کریں وہ تباہی اور بربادی سے بھی محفوظ رہیں گے اور انہیں باعزت روٹی بھی ملے گی۔ یعنی لوگ اسے مان لیں کہ یہ واقعی غلط نظام ہے اور پھر صحیح نظام پر آ جائیں۔ پہلی چیز مان لینے کی ہے۔ اسے مان لینے کے بعد کہا کہ **وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ** (22:50)۔ اور صلاحیت بخش پروگرام Adopt (اختیار) کر لیں اختیار کر لیں۔

یہاں اس نظام کے معنی ہی وہ نظامِ خداوندی ہے جسے آپ عملِ صالح کہتے ہیں۔ اسے قائم اور اختیار کرلیں تو اس کے لیے سنیئے' یہ بات کہی تھی کہ میں تم سے اس کے لیے کوئی اجر نہیں مانگتا۔ لیکن یہ ضرور کہا کہ وہ یہ سارا کچھ کرلیں تو پھر **لَهُمْ** (22:50)۔ ان کے لیے دو چیزیں ہیں' میرے لیے نہیں بھئی! اس نے آگے ان کے لیے دو چیزیں کہی ہیں' عزیزانِ من! اور میں سمجھتا ہوں کہ ان دو چیزوں میں ایک قوس کے دونوں سرے ان کے اندر آجاتے ہیں۔ کیا چیز نہیں ملے گی؟ کہا کہ **لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ** (22:50)۔ وہ تباہی اور بربادی سے محفوظ رہیں گے۔ اب ہمارے ہاں تو مغفرت کا ترجمہ ہو گیا کہ ان کی بخشش ہو جائے گی۔

قرآن انسان کو اس دنیا میں رہنا سکھاتا ہے

عزیزانِ من! قرآنِ کریم میں ساری بات اس دنیا کی چلی آرہی ہے۔ قرآن یا خدا کا دین انسان کو اس دنیا میں رہنا سکھاتا ہے اور جب وہ اس کے مطابق رہتا ہے اس کی یہ دنیا بھی خوشگوار ہوتی ہے اور چونکہ زندگی یہاں ختم نہیں ہو جاتی' آگے چلتی ہے' یہی خوشگواریاں اس کے ساتھ آگے چلی جاتی ہیں۔ یہ آخرت ہے۔ پہلی چیز یہ ہے کہ قرآن اس دنیا میں رہنا سکھاتا ہے۔ پیچھے سے بات یہ چلی آرہی تھی کہ قومیں تباہ ہو جاتی ہیں۔ تباہی اور بربادی تو بہت بُری چیز ہے۔ اس کے لیے کہا کہ **لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ** (22:50)۔ اس تباہی سے ان کی حفاظت ہو جاتی ہے۔

مغفرت کے معنی حفاظت کے ہوتے ہیں بخشش کے نہیں

عزیزانِ من! مغفرت کے معنی حفاظت ہیں' بخشش نہیں ہیں۔ ہماری قوم تو محنت سے جی چرانے والی ہے۔ ہر چیز بخشش کے طور پر گداگروں کی طرح مانگنے والی ہے۔ یہ کہتے ہیں کہ جنت بھی بخشش میں ملے۔ اس لیے مغفرت کا ترجمہ ہی بخشش ہو گیا۔ انہیں کیا چیزیں ملیں گی؟ اس کے جواب میں قرآنِ کریم نے کہا کہ **مَغْفِرَةٌ** ہر خطرے سے' ہر تباہی سے' حفاظت مل جائے گی' اس خطرے اور تباہی سے جس کا ذکر پیچھے سے چلا آرہا ہے وہ قوم اس سے محفوظ ہو جائے گی۔ یہ کتنی بڑی ضمانت ہے! تو کیا خطرے سے محفوظ ہو جانا ہی منتہائے زندگی ہے؟ اس سے حاصل تو کچھ نہیں ہوتا' آپ صرف محفوظ ہی ہوتے ہیں۔ آپ نے رات کو نہایت عمدگی سے کمرے بند کیے' مقفل کیے' زنجیریں لگائیں' باہر چوکیدار بھی بٹھا دیا' رات کو سو بھی لیا' آپ ساری رات حفاظت سے رہے۔ ملا ملایا تو آپ کو کچھ نہیں' بس محفوظ ہی ہوئے۔ یہ حصہ لَا ہے۔ یہ حفاظت بھی نہایت ضروری ہے کیونکہ اللہ تعالیٰ نے کہا ہے کہ جس قوم پہ عذاب آیا کرتا ہے **لِبَاسَ الْجُوْعِ وَالْخَوْفِ** (16:112)۔ وہ عذاب بھوک اور خوف کا ہوتا ہے۔ یہاں دو عذاب گنائے ہیں۔ ایک خوف کا عذاب ہے جس میں ہر وقت دھڑکا لگا رہے کہ کہیں وہ نہ آجائے' کہیں وہ نہ حملہ کردے' کہیں وہ نہ مار دے' کہیں وہ نہ خنجر گھونپ دے یعنی ہر وقت ایک خوف ہے جو

مسلط ہے۔ یہ خدا کا عذاب ہے اور دوسرا عذاب بھوک کا عذاب ہے۔ جو قوم عذاب میں گرفتار ہوتی ہے' اس کی دو باتیں سمجھ لیجیے۔ ایک تو یہ کہ اسے ہر وقت دھڑ کا لگا رہتا ہے کہ کہیں یہ نہ ہو جائے' کہیں وہ نہ ہو جائے اور دوسری یہ کہ اس پر بھوک کا عذاب طاری ہو جاتا ہے اس لیے یہاں کہا کہ لَهُمْ مَّغْفِرَةٌ (22:50)۔ پہلی چیز تو یہ کہ ان کو حفاظت کی ضمانت مل جاتی ہے کہ خوف دُور ہو جاتا ہے اور دوسری بات رزق کی ہے' وہ بھی مل جاتا ہے۔

رزق کا قرآنی مفہوم

عزیزانِ من! رزق صرف روٹی ہی کو نہیں کہتے۔ ''ہر وہ شے جس پہ انسانی زیست کا دارومدار ہے' عربی زبان میں' اسے رزق کہہ کے پکارا جاتا ہے۔'' عام طور پر انگریزی زبان میں انہوں نے اس کا ترجمہ Sustenance (برداشت' سہارا) کیا ہے لیکن اس کا یہ ترجمہ Sustenance (برداشت' سہارا) بھی غلط ہے۔ یہ جو کسی چیز کو صرف Sustain (برداشت کرنا) ہے' وہ تو اس چیز کو ویسے کا ویسا ہی رکھنا ہے۔ عربی کے اس لفظ (رزق) میں تو Development یعنی نشوونما بھی آتی ہے۔ رزق کے اندر زندگی کو برقرار رکھ کر' اس کی نشوونما کرتے چلے جانے والے تمام اسباب و ذرائع آ جاتے ہیں۔ ان سب کو قرآنِ کریم رزق سے تعبیر کرتا ہے۔ جیسے ہمارے ہاں اس کے لیے ایک لفظ روٹی ہے۔ اس کا مل جانا بڑی چیز تھی۔ اگر اس کی ضمانت مل جاتی ہے تو زندگی اپنے نصب العین کی طرف رواں ہونے کے لیے راستے ہموار پاتی ہے۔

اسلامی مملکت کے محسوس نشانات

عزیزانِ من! قرآنِ کریم نے رزق کے ساتھ ایک اور لفظ کا بھی اضافہ کیا ہے اور اس اضافے نے زمین و آسمان کا فرق پیدا کر دیا ہے۔ کہا ہے کہ رِزْقٌ كَرِيمٌ (22:50) ملے گا۔ یعنی لفظ کریم کا اضافہ کیا ہے۔ اس سے اس کے معنی ہوئے کہ عزت کی روٹی ملے گی۔ اب بات یہ بنی کہ عزت کی روٹی ملے گی' حفاظت کی ضمانت ملے گی' ہر قسم کے خطرات سے حفاظت ملے گی' سامانِ زیست ملے گا یعنی پرورش اور نشوونما ملے گا' یہ سب کچھ ملے گا۔ لیکن اس کے ملنے کا انداز ہو گا: كَرِيمٌ یعنی عزت کے ساتھ ملے گا۔ اس نے کہا ہے کہ یہ نتیجہ ہو گا ہمارے ان قوانین کی صداقت پر یقین رکھ کر ان کے مطابق نظام قائم کرنے کا۔ اس قوم کو اس سے یہ چیز ملے گی۔ یہ ہے دین۔

عزیزانِ من! اس کے لیے انبیاء کرام علیہم السلام آیا کرتے تھے۔ وہ یہ کر کے دکھاتے تھے اور جب بھی آپ یہ سمجھنا چاہیں کہ اسلامی زندگی ہے یا نہیں' اسلامی مملکت ہے یا نہیں' تو کم از کم یہ دو چیزیں جو قرآن نے کہی ہیں' پہلے تو ان کو دیکھ لیجیے یہاں کہا تھا کہ وَهِيَ ظَالِمَةٌ (22:48) وہ ظلم و استبداد کرتی تھیں۔ وہ چیزوں کو وہاں نہیں رہنے دیتی تھیں جہاں انہیں ہونا چاہیے' جس انسان کو جہاں ہونا چاہیے وہ اسے

وہاں نہیں رہنے دیتی تھیں۔ یہ لفظ ظلم (ظ ل م) کے معنی ہیں۔ اس طرح یہاں یہ بتایا کہ اس نظام میں' جو صلاحیت بخش پروگرام اختیار کر کے قائم ہوتا ہے' چیزیں وہاں ہوں جہاں انہیں ہونا چاہیے' انسان ان مناصب پر ہوں جہاں انہیں ہونا چاہیے پھر اس میں انہیں کسی قسم کا کوئی خوف نہ ہو اور اس میں ہر فرد کو رزقِ کریم مل رہا ہو۔ عزیزانِ من! رزق مل رہا ہو' سامانِ نشوونما ہو' اور عزت کے ساتھ مل رہا ہو' وہ اسلامی مملکت ہوتی ہے۔ آج بحثیں ہوتی ہیں' مناظرے ہوتے ہیں' مقالے لکھے جاتے ہیں' چلایا جاتا ہے کہ اسلامی نظام کسے کہتے ہیں' پھر بھی مدّ عا عنقا ہی رہتا ہے کہ جی! اسلامی مملکت کسے کہتے ہیں؟ جی! ایک کہتا ہے کہ یہ اسلامی ہے' دوسرا کہتا ہے کہ نہیں' یہ اسلامی نہیں ہے اور طرفہ تماشا یہ کہ یہ اسلامی چلائے چلے جا رہے ہیں۔ اس ❶ نے کیا ہی خوب کہا تھا:

قلندر جز دو حرفِ لا الہ کچھ بھی نہیں رکھتا

فقیہ شہر قاروں ہے لغت ہائے حجازی کا

وہ لغت ہائے حجازی کے قارون جاتے ہیں۔

اسلامی نظام کی کسوٹی نتائج ہوتے ہیں

عزیزانِ من! آج یہاں سے وہاں تک بحثیں کرتے ہیں کہ اسلامی جمہوریہ کسے کہتے ہیں' اسلامی نظام کسے کہتے ہیں؟ سوال یہ ہے کہ جسے وہ اسلامی نظام کہتے ہیں وہ کیا ہے؟ قرآن کہتا ہے کہ اس کے نتائج سے پرکھ کے دیکھو کہ کیا یہ اس کسوٹی پہ پورا اترتا ہے۔ اگر قرآنِ کریم کی کسوٹی پر پورا اترتا ہے تو اسلامی ہے اور یہ پورا نہیں اترتا تو اسلامی نہیں ہے اور وہ کسوٹی یہ ہے کہ ہر طرح کی حفاظت کا سامان فرد کو بھی' قوم کو بھی' جماعت کو بھی' ملک کو بھی' مملکت کو بھی مل رہا ہے۔ وہاں کامل حفاظت ہے اور ہر فرد کو زندگی کا سامانِ نشوونما عزت کے ساتھ مل رہا ہے' تو اسے اسلامی نظام اور اسلامی مملکت کہا جائے گا۔ اسی لیے کہا تھا کہ **فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ** (22:50) اور صلاحیت بخش کام کرتے ہیں تو وہ لوگ جو خدا کے اٹل قانون کی صداقت پر یقین رکھتے ہیں تو اس کا یہ نتیجہ ہوگا۔ اس کے بعد اگلی بات یہ کہی کہ **وَالَّذِيْنَ سَعَوْا فِيْٓ اٰيٰتِنَا مُعٰجِزِيْنَ** (22:51) اور جو لوگ اس کی کوشش کریں گے کہ قوانینِ خداوندی کی مخالفت کر کے کامیاب زندگی بسر کریں اور اس طرح انہیں (ان قوانین کو) عاجز اور ناکارہ کر کے رکھ دیں تو وہ یہ یاد رکھ لیں کہ وہ خود فریبی میں مبتلا ہیں' وہ کبھی ایسا نہیں کر سکیں گے۔ اسے نہایت واضح کر کے بتا دیا کہ یاد رکھو! جو لوگ بھی یہ کوشش کریں گے کہ ہمارے ان قوانین کو' اس نظام کو' ناکام بنا کے رکھ دیں' ثابت کریں کہ نہیں صاحب! یہ قانون بالکل غلط ہے جو قرآن دیتا ہے تو ان کے لیے وہ کہتا ہے کہ یہ یاد رکھو **اُولٰٓئِكَ اَصْحٰبُ الْجَحِيْمِ** (22:51) ان پر سعادتوں اور کامرانیوں کے دروازے بند ہو جائیں

---

❶ یہ اشارہ مفکرِ قرآن جناب ڈاکٹر علامہ محمد اقبال (1938-1877) علیہ رحمۃ کی طرف ہے۔

گے' اور وہ ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھ سکیں گے۔ وہ اس طرح تباہ و برباد ہو جائیں گے اور یہ وہ لوگ ہیں جن کی ترقیاں رک جائیں گی' جامد ہو جائیں گے' ساکن اور ساکت ہو جائیں گے' آگے نہیں بڑھ سکیں گے۔ جحیم کے یہ معنی ہوتے ہیں۔ ❶ ''ہم'' کہتے ہیں کہ وہاں جہنم میں ہونگے یعنی اتھے تے عیش کردے رہن گے۔ ❷ مگر قرآن یہاں کہتا ہے کہ قومیں تباہ ہونگی اور قرآن یہ بھی کہتا ہے کہ جو یہاں تباہ ہوگا وہ آگے بھی پنپ نہیں سکتا کیونکہ **مَنۡ کَانَ فِیۡ ہٰذِہٖۤ اَعۡمٰی فَہُوَ فِی الۡاٰخِرَۃِ اَعۡمٰی** (16:72) جو کوئی اس دنیا میں اندھا ہے وہ آخرت میں بھی اندھا ہی ہوگا۔

عزت کی روٹی اور ذلت کی روٹی میں فرق

عزیزانِ من! یہ اصول یاد رکھو کہ جو یہاں تباہی میں ہے' جو یہاں ہر وقت خوف سے لرزتا ہے' جسے یہاں عزت کی روٹی نہیں ملتی' قرآن کہتا ہے کہ اس کے لیے وہاں بھی **شَجَرَتَ الزَّقُّوۡمِ** ❸ (44:43) ہوگا' جو ملے گا یعنی وہاں کا رزق حلق سے نیچے نہیں اترے گا۔ **اُولٰٓئِکَ اَصۡحٰبُ الۡجَحِیۡمِ** (22:51)۔ یہ لوگ اصحاب الجحیم ہیں۔ اب یہ بتایا کہ جو لوگ کوشش کرتے ہیں کہ یہ نظام باقی نہ رہے' یہ پیغام باقی نہ رہے' یہ قانون باقی نہ رہے' یہ وحی اس شکل میں نہ رہے' تو اس کے لیے وہ کرتے کیا ہیں؟ یہ بڑی ہی اہم بات ہے۔ یہ آگے آیا ہے جس میں یہ بتایا گیا ہے کہ وہ کیا کرتے ہیں۔ میں نے عرض کیا ہے کہ قرآن کا تو ہر حرف عظیم ہے لیکن بعض آیات' مطالب و مفاہیم کے اعتبار سے' بڑی ہی اساسی اور بنیادی ہوتی ہیں۔ یہ اگلی آیت ہے۔ یہ انہی میں سے ایک بنیادی آیت ہے۔ یہ جو کچھ کرتے ہیں اس کی تشریح

---

❶ اگر زندگی اور اس کے مقاصد کے متعلق قرآنی نقطۂ نگاہ سے غور کیا جائے تو یہ حقیقت واضح ہو جاتی ہے کہ انسان کی موجودہ زندگی اس کے سلسلۂ ارتقاء کی ایک کڑی ہے جسے ابھی بہت آگے چلنا ہے۔ قوانینِ خداوندی کے مطابق عمل کرنے سے انسانی صلاحیتوں میں ایسی نشو و نما آجاتی ہے جس سے وہ (مرنے کے بعد) زندگی کی اگلی ارتقائی منزل تک پہنچنے کے قابل ہو جاتا ہے۔ لیکن اگر اس کی صلاحیتوں کی اس طرح نشو و نما نہ ہو تو وہ آگے بڑھنے کے قابل نہیں رہتا' وہیں رک جاتا ہے۔ یہ قانون ارتقاء (Law of Evolution) کا بنیادی اصول ہے۔ اِس رک جانے کو قرآن نے اَلۡجَحِیۡم کی اصطلاح سے تعبیر کیا ہے جس کے بنیادی معنی رک جانے کے ہیں۔ لہٰذا جحیم انسانی زندگی کی وہ منزل ہے جس میں وہ آگے بڑھنے سے رک جائے۔ قرآنِ کریم کی رو سے فرد یا قوم' جس مقام پہ رک جائے' وہ جحیم ہے۔ زندگی تو ایک جوئے رواں ہے جسے رواں دواں آگے بڑھتے چلے جانا ہے جونہی اس کی روانی بند ہوئی وہ جوئے رواں نہ رہی جوہڑ بن گئی۔ اور اس میں سڑاہند پیدا ہونی شروع ہوگئی۔

❷ یہاں وہ عیش و نشاط سے زندگی گزاریں گے۔

❸ اَلزَّقُّوۡم کا مادہ ''ز ق م'' ہے۔ عربی کے مشہور لغت تاج العروس میں ثعلب کے حوالے سے لکھا ہے کہ اَلزَّقُّوۡم ہر اس کھانے کو کہتے ہیں جو زہریلا اور قاتل ہو اور محیط المحیط کے مؤلف پطرس بستانی نے اپنی اس تالیف میں لکھا ہے کہ عوام میں اسے بطور ضرب المثل بولا جاتا ہے: جب کوئی شخص ایسی چیز کھا لے یا کوئی ایسا کام کرلے جو اس کے لیے وبال جان بن جائے۔ یہ ہے وہ رزق جو حلق سے نیچے نہیں اترتا۔

میں نے کافی حد تک اپنے ہاں ''شاہکارِ رسالت''❶ کے آخری باب میں لکھی ہے جس میں کہا ہے کہ حضرتِ عمر رضی اللہ عنہ کے بعد تو گویا ''شعلہ عشق سیاہ پوش ہوا تیرے بعد''۔❷ قرآن کہتا ہے کہ اس کے بعد یہ لوگ کیا کرتے ہیں' جس سے یہ شعلہ عشق سیاہ پوش ہوجاتا ہے' جس سے دین مذہب میں تبدیل ہوجاتا ہے۔ یہ لوگ کیا کرتے ہیں یہ بڑی ہی اہم چیز ہے۔ آپ سوچتے ہیں کہ یہ کتنی بنیادی چیز ہے۔ اسے ہم آئندہ درس میں لیں گے کیونکہ آج وقت ہوگیا۔

عزیزانِ من! آج ہم سورۃ الحج کی آیت 51 تک آ گئے' 52 آیت سے آئندہ درس میں لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّآ ط اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ط

❀❀ ...... ❀❀❀ ...... ❀❀

---

❶ پرویز: شاہکار رسالت......عمر فاروق رضی اللہ عنہ......ادارہ طلوع اسلام' لاہور' 1987ء۔

❷ یہ مصرعہ غالب کے اس شعر سے' تھوڑے سے لفظی تصرف کے ساتھ لیا گیا ہے:

شمع بجھتی ہے تو اس میں سے دھواں اٹھتا ہے — شعلۂ عشق سیہ پوش ہوا میرے بعد

(غالب' مرزا اسداللہ خاں: دیوانِ غالب' جہانگیر بک ڈپو' لاہور' 2002ء' ص۔65)

ساتواں باب: **سورۃ الحج** (آیت 52: اختلافِ قرأت)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اِذۡ دَخَلُوۡا عَلَیۡہِ فَقَالُوۡا سَلٰمًا ؕ قَالَ اِنَّا مِنۡکُمۡ وَجِلُوۡنَ ﴿۵۲﴾

عزیزانِ من! آج جنوری 1977ء کی 30 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ الحج کی آیت 52 سے ہو رہا ہے: (22:52)۔

زیرِ درس آیہ کریمہ کی اہمیت

آپ کو یاد ہوگا کہ میں نے پچھلے درس میں کچھ تھوڑا سا عرض کیا تھا کہ اب ہمارے سامنے ایک ایسی آیہ کریمہ آ رہی ہے جو اپنے موضوع کے اعتبار سے بڑی اہم ہے اور اس کا صحیح مفہوم سامنے نہ آنے کی وجہ سے بڑی غلط فہمیاں پیدا ہوتی چلی آ رہی ہیں۔ میں نے کہا تھا کہ میں اسے ضمناً نہیں چھیڑ سکتا۔ اس پہ پورا درس یا شاید ایک درس سے بھی زیادہ وقت درکار ہوگا۔ سابقہ اتوار موسم کی خرابی کی وجہ سے کم احباب آ سکے تو میں نے مناسب نہ سمجھا کہ وہ احباب جو اس مجبوری کی وجہ سے آنے سے معذور رہے ہیں، وہ اس سے محروم رہ جائیں تو پچھلے اتوار درس نہیں شروع کیا تھا۔ ہم نے کچھ سوال و جواب کے سلسلے میں ہی وہ وقت بسر کیا۔ آج میں اسی ایک آیت کو لیتا ہوں۔ اگر قرآنِ کریم کے نسخے آپ کے پاس ہیں تو انہیں سامنے رکھ لیجیے۔ بات بڑی اہم آئے گی۔ آیت نمبر 51، جو اس آیت سے پہلے کی ایک آیت ہے، اس میں کہا یہ گیا تھا کہ **وَالَّذِیۡنَ سَعَوۡا فِیۡۤ اٰیٰتِنَا مُعٰجِزِیۡنَ اُولٰٓئِکَ اَصۡحٰبُ الۡجَحِیۡمِ** (22:51)۔ اور جو لوگ اس کی کوشش کریں گے کہ قوانینِ خداوندی کی مخالفت کر کے کامیاب زندگی بسر کریں اور اس طرح انہیں عاجز اور ناکارہ کر کے رکھ دیں (تو وہ ایسا کبھی نہیں کر سکیں گے۔) ان پر سعادتوں اور کامرانیوں کے دروازے بند ہو جائیں گے اور وہ ایک قدم بھی آگے نہیں بڑھ سکیں گے (اور اس طرح تباہ و برباد ہو جائیں گے۔)

پیاس کو ختم کرنے کے لیے پانی کا حصول ضروری ہے

عزیزانِ من! نہایت ہی بلیغ انداز میں یہ واضح کر دیا گیا ہے کہ جو لوگ یہ کوشش کرتے ہیں کہ ہمارے قوانین کا مقابلہ کر کے، ان کی

یہ ہے کہ آیاتِ خداوندی کی مخالفت میں اس قسم کی سازش کرنے والے یہ کون لوگ تھے اور وہ کرتے کیا تھے؟ یہ بات نبی اکرم ﷺ سے ہی مخصوص نہیں بلکہ جب سے وحی کا سلسلہ شروع ہوا' تمام انبیاء کرام کے ساتھ یہ ہوتا رہا' یہ کشمکش بھی یونہی جاری رہی اور مخالفین یہ کچھ کرتے بھی چلے آ رہے تھے۔ چنانچہ اس کا ذکر ہے اور اس سلسلے میں حضور ﷺ سے کہا کہ اِنہیں کہہ دو کہ وَمَآ اَرْسَلْنَا مِنْ قَبْلِكَ مِنْ رَّسُوْلٍ وَّلَا نَبِيٍّ اِلَّآ اِذَا تَمَنّٰٓى اَلْقَى الشَّيْطٰنُ فِيْٓ اُمْنِيَّتِهٖ فَيَنْسَخُ اللّٰهُ مَا يُلْقِي الشَّيْطٰنُ ثُمَّ يُحْكِمُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ (22:52)۔ ہمارا فرستادہ نبی آتا۔ لوگوں تک ہمارا پیغام پہنچاتا۔ اس کے چلے جانے کے بعد' اپنی مفاد پرستیوں کے پیچھے چلنے والے لوگ' اس کی وحی میں' اپنی طرف سے آمیزش کر کے' اُسے کچھ سے کچھ بنا دیتے۔ (اس کے بعد خدا ایک اور رسول بھیج دیتا اور سابقہ وحی کو) اس آمیزش سے پاک اور صاف کر کے' اپنے قوانین کو پھر محکم کر دیتا۔ اس لیے کہ خدا کو ہر بات کا علم ہوتا ہے اور اس کے سب کام حکمت پر مبنی ہوتے ہیں۔

اس آیت کا مروجہ مفہوم اور اس کا ماحصل

عزیزانِ من! میں پہلے یہ عرض کرونگا کہ اس آیت کا عام ترجمہ کیا کیا جاتا ہے' مفہوم کیا لیا جاتا ہے اور پھر اس کی بنیادوں پر کس قدر ایسی عمارت اٹھائی جاتی ہے جو دین کو اس کے اصل و بنیاد سے اکھیڑ کے رکھ دیتی ہے اور رسول اللہ ﷺ کے متعلق تو ایک ایسا تصور سامنے آتا ہے کہ جس سے روح کانپ اٹھتی ہے۔ یہ سلسلہ بدستور چلا آ رہا ہے' ہمارے ہاں تفسیروں میں موجود ہے' روایات میں موجود ہے۔ گو کہ اس کے ساتھ ہی یہ بحث بھی چلی آ رہی ہے کہ بعض اِن روایات کو ضعیف ❶ قرار دیتے ہیں اور بعض صحیح ❷ قرار دیتے ہیں لیکن وہ واقعہ کے طور پر اور مروجہ ترجمے کی بنا پر آپ کے ہاں تاریخ میں چلی آ رہی ہے۔ بہر حال عام تراجم کی بنا پر کہا یہ جاتا ہے کہ اے

---

❶ ضعیف روایات: فنِ حدیث کی اصطلاح میں ضعیف تیسرے اور ادنیٰ درجہ کی حدیث ہے۔ اس زمرہ میں وہ احادیث شمار ہوتی ہیں جن کے راویوں میں ایک یا ایک سے زیادہ راوی کمزور اور ضعیف الحافظہ ہوں۔ (ازھر ازھری' ڈاکٹر حافظ شاہد اقبال: قرآن اور حدیث' مرکز تحقیقاتِ اسلامی' کراچی' 2004' ص۔ 27)

❷ صحیح روایات: فنِ حدیث کی اصطلاح میں' یہ ''صحیح'' کا لفظ وہ نہیں جو ''غلط'' کا متضاد ہے۔ عام گفتگو میں جب ہم کسی بات یا کام کے حوالہ سے صحیح کا لفظ استعمال کرتے ہیں تو اس کا مطلب یہ ہوتا ہے کہ جس بات یا کام کے لیے ہم صحیح کا لفظ بول رہے ہیں وہ صحیح ہے اور باقی غلط ہیں۔ لیکن حدیث کی نسبت سے معاملہ یہ نہیں ہے۔ فنِ حدیث کی اصطلاح میں صحیح پہلے درجہ کی حدیث کو کہتے ہیں۔ یہ وہ حدیث ہوتی ہے جس کی سند متصل ہو یعنی روایت کرنے والوں میں درمیان سے کوئی راوی چھوٹا نہ ہو۔ یادداشت اور حافظہ کے لحاظ سے کوئی راوی کمزور نہ ہو یعنی عادل اور قوی الحافظہ ہو لیکن فنی لحاظ سے ان تمام خوبیوں کے باوجود اگر حدیث کا متن یا مفہوم قرآن مجید کی کسی آیت سے متعارض ہو تو ''صحیح'' ہونے کے باوجود حدیث کی یہ روایت بطور حجت قابل قبول نہیں ہوسکتی۔ اسے رد کر دیا جائے گا۔ (ازھر ازھری' ڈاکٹر حافظ شاہد اقبال: قرآن اور حدیث' مرکز تحقیقات اسلامی' کراچی' 2004' ص۔ 27)۔

رسول ﷺ! تیرے ہی ساتھ یہ واقعہ کچھ خاص طور پر مخصوص نہیں' تجھ سے پہلے بھی کوئی رسول اور نبی ہم نے ایسا نہیں بھیجا کہ جس کے ساتھ یہ واقعہ نہ گزرا ہو۔ اب اس کا یہ ترجمہ کیا جاتا ہے کہ اس رسول کے دل کی خواہشات' آرزوؤں' تمناؤں میں شیاطین نے کچھ اپنی تمنا اور آرزو نہ ملا دی ہو تو پھر خدا کرتا یہ تھا کہ جو شیطان اس قسم کی آرزو ملا دیتا تھا' وہ اس کو منسوخ کر دیتا تھا۔ اپنی آیات کو محکم کر دیتا تھا۔ اللہ علیم اور حکیم ہے۔

کوئی رسول یا کوئی نبی بغیر شریعت کے نہیں آتا تھا

عزیزانِ من! ان کے بقول تو گویا یہ چیز ایک مسلمہ کے طور پہ نبی اکرم ﷺ ہی میں نہیں' بلکہ تمام انبیائے کرام علیہم السلام میں آئی ہے۔ یہاں میں یہ عرض کر دوں کہ قرآنِ کریم میں رسول کا لفظ آئے یا نبی کا لفظ آئے' یہ مرادف المعنی ہیں' وہ ایک ہی ہوتا ہے۔ یہ جو تخصیص ہمارے ہاں ہوئی ہے کہ رسول صاحبِ شریعت ہوتا تھا اور نبی بغیر شریعت کے آتا تھا' یہ بالکل وضعی ہے اور خالص قرآن کے خلاف ہے۔ یہ اپنی نبوتِ باطلہ کی تائید کے لیے ایجاد کی گئی ہے' قرآن میں یہ قطعاً تخصیص نہیں ہے۔ نبوت خدا کی طرف سے وحی کا ملنا ہے اور رسالت وہ فریضہ ہے جو اس وحی کو آگے پہنچانے کے سلسلے میں وہ نبی سرانجام دیتا ہے تو کبھی اسی کو رسول کہا جاتا ہے' کبھی اسی کو خدا نبی کہہ کر پکارتا ہے' بات ایک ہی ہے۔ بلاشریعت کے کسی نبی کا آنا بے معنی چیز ہے' نبی خدا کی طرف سے جو بھی وحی لائے گا وہ اس کی شریعت ہوگی' وہ اس کو خدا کا حکم ہی ہوگا جو وہ لائے گا اور وہ کچھ قصے سنانے کے لیے نہیں آئے گا۔ لہٰذا یہ تخصیص بالکل غلط ہے' خلافِ قانون اور خلافِ قرآن ہے کہ کچھ نبی تو آتے تھے جو شریعت لاتے تھے اور کچھ تو بغیر شریعت کے ہی آتے تھے' وعظ کرنے کے لیے آتے تھے...... معاذ اللہ' معاذ اللہ...... یہ چیز ان لوگوں کی وضع کردہ ہے' جو نبوتوں کے دعوے کرتے ہیں اور اعتراض پڑتا تھا کہ پھر اس طرح سے تو قرآن بھی نامکمل مانو۔

یہاں میں ضمناً عرض کر دوں کہ اس باب میں بہائیوں میں یا وہ جو بہاء اللہ تھا ان لوگوں نے باطل کو ہی سہی لیکن بہرحال انہوں نے کچھ خلوص سے کام لیا اور کہہ دیا کہ ٹھیک ہے قرآن ایک دور کے لیے تھا' وہ دَور ختم ہو گیا' اب نئے قرآن کی یا نئی وحی کی خدا کی طرف سے ضرورت ہے اور ہم وہ لے کے آئے ہیں' نئی شریعت لے کے آئے ہیں۔ باطل ہی سہی' انہوں نے بات تو صاف کی۔ یہاں والوں میں یہ کہنے کی جرأت بھی نہ ہوئی مگر نبوت کا دعویٰ ضرور کیا۔ جب یہ اعتراض پڑا کہ نبوت کے دعوے کے معنی یہ ہیں کہ قرآن ناقص تھا یا قرآن ساقط العمل ہو گیا ہے یا اس کا دور منسوخ ہو گیا ہے جو اب نئے قرآن' نئے احکام کی ضرورت ہے۔ انہوں نے کہا کہ نہیں' نہیں' نہیں' میں [1] ''تو نبی ہوں' من نیستم رسول نیاوردہ ام کتاب۔'' [2] میں کتابی رسول نہیں ہوں' نبی ہوں اس لیے بلا کتاب آیا ہوں' نبی وہ ہوتا

---

[1] یہ اشارہ مرزا غلام احمد قادیانی (1908 -1835) کی طرف ہے۔ [2] میں رسول نہیں ہوں اور نہ ہی میں کتاب لایا ہوں۔

ہے جو شریعت نہیں لاتا' رسول وہ ہوتا ہے جو شریعت لاتا ہے۔ قرآنِ کریم کی رو سے یہ بنیاد ہی باطل ہے کہ ایک شخص خدا کا نبی یا رسول ہو اور وہ کتاب نہ لائے۔ قرآن کے مطابق کوئی نبی بغیر کتاب کے آ ہی نہیں سکتا۔ (1) بہر حال یہ تو ضمناً بات سامنے آ گئی کیونکہ اس میں رسول اور نبی کے لفظ آئے ہیں۔

اپنے بندوں کے متعلق خدا کا ابلیس کو چیلنج اور پھر خود شیطان کا اعتراف

بات یہ تھی کہ یہ جو مفہوم لیا جاتا ہے کہ کوئی رسول ایسا نہیں آیا' یا کوئی نبی ایسا نہیں آیا جس کے ساتھ یہ ماجرا نہ گزرا ہو کہ اس کی تمناؤں میں شیطان نے اپنی ایک آرزو داخل نہ کر دی ہو لہٰذا پہلے تو ایک آرزو داخل کرنے کی اسی بات کو لیجیے کہ یہ کتنی بڑی سازش کی گئی۔

عزیزانِ من! ابلیس یا شیطان کے متعلق قرآنِ کریم نے بالتخصیص کہا ہے اور جہاں ابلیس اور خدا کا ایک مکالمہ سا دیا ہے وہاں ابلیس خود اس کا معترف ہے کہ میرا قابو' میرا غلبہ' میرا تسلط' تیرے مخلص بندوں پر نہیں ہو سکے گا اور خود دوسرے مقام پہ خدا کا چیلنج ہے کہ جب ابلیس/ شیطان نے کہا کہ تُو دیکھنا کہ میں بنی آدم کے ساتھ کیا کرتا ہوں' جس کی وجہ سے تُو نے مجھے اس طرح سے ذلیل قرار دیا ہے' دیکھ کہ میں اس کی اولاد کو کیسے ناکوں چنے چبواتا ہوں۔ خدا کی طرف سے کہا گیا کہ ہاں تُو یہ سب کچھ کر دیکھ' لیکن جو میرے مخلص بندے ہونگے ان پہ تیرا کوئی قابو نہیں چل سکے گا' تیرا سلطان وغلبہ نہیں ہو سکے گا' تُو ان پر قابو نہیں پا سکے گا' ان پر تیرا کوئی اثر نہیں ہو سکے گا۔

کوئی نبی شیطان سے مغلوب نہیں ہوسکتا

عزیزانِ من! قرآن کی یہ شہادت موجود ہے کہ خدا کے مخلص بندوں پر شیطان کا کوئی قابو' کوئی غلبہ' کوئی تسلط' نہیں ہوسکتا۔ یہ تو خدا کے عام مخلص بندوں کا ذکر ہے' چہ جائیکہ خدا کے رسول' جن سے زیادہ مخلص اس آسمان کے نیچے کوئی انسان ہو نہیں سکتا' ان کے متعلق یہ چیز آجائے کہ ان کی آرزوؤں میں شیطان' اپنی آرزو ملا دیتا تھا اور وہ اس کے زیرِ تسلط آجاتے تھے۔ یہ کہتے ہیں کہ شیطان یہ کچھ کر دیتا تھا

---

(1) خود قرآن کریم نے واضح الفاظ میں اس کی صراحت فرما دی کہ كَانَ النَّاسُ اُمَّةً وَّاحِدَةً فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ وَاَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ ......(2:213) چونکہ نوع انسانی کو ایک امت بن کر رہنا ہے اس لیے اللہ نے نبیوں کو بھیجا۔ خوشخبری دینے والے اور ڈرانے والے۔ اور ان سب کے ساتھ کتاب بالحق نازل کی! یہاں النبیین (انبیاء) فرمایا۔ دوسری جگہ رسول کہا: لَقَدْ اَرْسَلْنَا رُسُلَنَا بِالْبَيِّنٰتِ وَاَنْزَلْنَا مَعَهُمُ الْكِتٰبَ ......(57:25) ہم نے اپنے رسولوں کو دلائل کے ساتھ بھیجا اور اُن کے ساتھ کتاب نازل کی...... مَعَهُمْ (سب کے ساتھ) میں کسی نبی یا رسول کی استثنا نہیں ہے۔ قرآن کا ارشاد ہے کہ تورات (فرقان) حضرت موسیٰ اور حضرت ہارون دونوں کو دی گئی تھی (21:48)۔ یہ حقیقت ہے کہ نبی اور رسول ایک ہی منصب کے دو نام ہیں۔ تشریعی اور غیر تشریعی کی تفریق یکسر غیر قرآنی ہے۔ ہر نبی یا رسول خدا کا پیغام لاتا ہے جو اس کی شریعت ہوتی تھی۔ (پرویزؒ: معراجِ انسانیت' ادارہ طلوع اسلام' کراچی' 1949' ص ص۔ 808 -807)۔

اس لیے وہ خود اس سے نہیں بچ سکتے تھے۔ پھر انہوں نے اگلی بات یہ کہی ہے کہ جو کچھ وہ ان کی آرزوؤں میں ملاتا تھا خدا اسے الگ کر دیتا تھا اور اس طرح اپنی آیات کو محکم کر دیتا تھا یعنی شیطان غلبہ پالیتا تھا اور یہ اس سے مغلوب ہو جاتے تھے اور پھر خدا اسکو درمیان سے نکال دیتا تھا۔ میں نے عرض کیا ہے کہ اس سے پہلا تصور جو رسول یا نبی کے متعلق ذہن میں قائم ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ شیطان ان پر غلبہ وتسلط پالیتا ہے۔ آپ اس کا اندازہ لگائیے کہ قرآن کی یہ محکم آیات ہیں کہ خدا کے مخلص بندوں پر شیطان کا کوئی اثر ہی نہیں ہوسکتا۔ اس کے علی الرغم یہ مفہوم لیا جاتا ہے کہ وہ یہ کچھ کرتا تھا۔ اب اس مفہوم کے بعد اس پہ جو عمارت اٹھی ہے وہ کس قدر گھناؤنی سازش ہے اور کس طرح وحی کے تصور پر کاری ضرب لگاتی ہے جس سے نبی یا رسول کا قرآنی تصور تک ہل جاتا ہے۔ وہ ملاحظہ فرمائیے۔ اب اگلی بات لیجیے کہ کہا یہ جاتا ہے کہ مخالفینِ قریش بڑی کوشش کرتے تھے کہ رسول اللہ ﷺ سے کچھ مفاہمت کرلیں، کوئی اپنے معاملے میں Compromise (مفاہمت) کریں اور انہیں سب سے بڑا اعتراض اس پہ تھا کہ یہ ہمارے معبودوں کو، ہمارے بتوں کو بُرا کہتے ہیں، ان کو باطل تصور کرتے ہیں، وہ یہ کہنا چھوڑ دیں بلکہ ہماری طرح ان کی تعظیم کریں۔ اتنا سا یہ کرلیں تو باقی معاملات میں ہم ان کے ساتھ مفاہمت کرلیں گے۔

حق کا باطل کے ساتھ مفاہمت چہ معنی دارد؟

عزیزانِ من! قبل اس کے کہ میں آگے بڑھوں میں یہ عرض کردوں کہ اس کا ذکر خود قرآنِ کریم نے کیا ہے۔ (8:11) غور سے دیکھ لیجیے۔ اس میں کہا گیا ہے یہ تکذیب کرنے والے کبھی بھی تمہاری اطاعت نہیں کریں گے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ **وَدُّوْا لَوْ تُدْهِنُ فَيُدْهِنُوْنَ** (68:9)۔ یہ چاہتے یہ ہیں کہ تُو ان کے ساتھ کچھ مفاہمت کرلے تو یہ بھی تمہارے ساتھ مفاہمت کرلیں۔ کچھ تھوڑی سی مداہنت تم برتو، کچھ تھوڑے سے تم جھک جاؤ، کچھ یہ جھک جائیں۔ یہاں **وَدُّوْا** آیا ہے۔ **وَدُّوْا** (68:9) یہ دل سے چاہتے ہیں کہ تم ایسا کرلو، تم ان کے ساتھ تھوڑی سی مفاہمت کرلو۔ اور قرآن نے یہیں کہہ دیا کہ **وَلَا تُطِعْ كُلَّ حَلَّافٍ مَّهِيْنٍ o هَمَّازٍ مَّشَّآءٍ م بِنَمِيْمٍ** (68:10-11)۔ (اے رسول ﷺ!) جماعت مخالفین کے اس نمائندہ کی (جو مفاہمت کی پیش کش لے کر آیا ہے) یہ حالت ہے کہ یہ بڑا دنی [1] الطبع، پست ذہنیت، اور سخت جھوٹا ہے۔ اسی لیے اپنی بات کو سچا ثابت کرنے کے لیے قسموں پر قسمیں کھائے چلا جاتا ہے۔ یہ چاہتا ہے کہ اپنی دسیسہ کاریوں اور وسوسہ انگیزیوں سے تمہاری جماعت میں تفرقہ پیدا کردے۔ اس کی نگاہ کا زاویہ اس قدر بگڑ چکا ہے کہ اسے کہیں بھی حسن اور خیر نظر نہیں آتا۔ ہر جگہ شر، نقص، اور خرابی دکھائی دیتی ہے۔ ہر وقت لگائی بجھائی میں مصروف رہتا ہے۔ اِدھر کی بات اُدھر اور اُدھر کی بات اِدھر کرتا پھرتا ہے، اور اپنی باتوں میں جھوٹ ملا کر ہر جگہ فساد پیدا کرنے کی کوشش کرتا ہے۔ اس لیے رسول ﷺ سے کہا گیا کہ ان

---

[1] دنی: کمینہ، رذیل، سفلہ

سے قطعاً مفاہمت نہیں ہوسکتی۔ اس کا سوال ہی نہیں کہ یہ کچھ ہو سکے تو گویا خود قرآنِ کریم نے آپ ﷺ کو صورتِ حال سے آگاہ کر دیا۔ یہ اللہ تعالیٰ کی حکمت ہے، وہ علیم و خبیر ہے اور اس قسم کی باریک بینیوں کا ادراک اس کی حکمت سے پیدا ہوتا ہے۔

میں ابھی عرض کرونگا کہ اس سلسلہ میں انہوں نے قرآن کے خلاف، رسالت کے خلاف، جو سازشیں کی ہیں، اور پھر ان سے جو چیز پیدا ہوتی ہے قرآن نے خود ان کے اعتراضات کے جوابات پہلے سے دیدیئے ہوئے ہیں۔ کہا کہ یہ نہیں ہوسکتا کہ آپ کسی بھی قسم کی مداہنت ❶ کریں۔ دوسرے مقام پہ ہے کہ جب وہ اپنی مخالفت میں، اس کشمکش میں، تھک جاتے تھے تو وہ ان حربوں پہ آجاتے تھے جسے مفاہمت یا Compromise کہتے ہیں۔ کہا کہ **وَاِذَا تُتۡلٰی عَلَیۡہِمۡ اٰیَاتُنَا بَیِّنٰتٍ قَالَ الَّذِیۡنَ لَا یَرۡجُوۡنَ لِقَآءَنَا ائۡتِ بِقُرۡاٰنٍ غَیۡرِ ہٰذَاۤ اَوۡ بَدِّلۡہُ** (10:15)۔ جب ان لوگوں کے سامنے ہمارے واضح قوانین پیش کیے جاتے ہیں تو جو لوگ ہمارے قانونِ مکافات کا سامنا نہیں کرنا چاہتے، وہ کہتے ہیں کہ یا تو تم اس قرآن کی جگہ کوئی دوسرا قرآن لاؤ اور یا پھر اس (کے مطالب) میں ہی کچھ ردو بدل کر دو۔ یعنی وہ خدا کے اٹل اور غیر متبدل قوانین کو اپنی منشاء اور مفاد کے مطابق تبدیل کرانا چاہتے ہیں۔ اسے یوں کہو کہ یہ لوگ، جو ہمارے قانونِ مکافات کی زندگی پہ ایمان نہیں رکھتے ہیں، تم سے یہ کہتے ہیں کہ تمہارا ہمارا کوئی جھگڑا نہیں ہے، یہ جھگڑا تو سارا اس پیغام کا ہے، جو تم سناتے رہتے ہو۔ تم اس کی جگہ ہم سے کوئی دوسری بات کہہ دو، اس کی جگہ نہ کہو تو اس کے اندر کچھ تبدیلی ہی کر دو۔ بس اتنا کر دو، تو پھر معاملہ صاف ہے، پھر ہم کوئی جھگڑا باقی نہیں رکھیں گے۔

یہ تعلیم میری تعلیم نہیں یہ تصنیف میری تصنیف نہیں: خدا کی ہے

عزیزانِ من! مخالفین سے حق و باطل میں مفاہمت کرنے کا کہنے پر قرآن کریم نے وہیں اس کے جواب میں کہلوا دیا کہ **قُلۡ مَا یَکُوۡنُ لِیۡۤ اَنۡ اُبَدِّلَہٗ مِنۡ تِلۡقَآیِٔ نَفۡسِیۡ** (10:15)۔ کہو کہ اگر یہ میری تعلیم، میری تصنیف، میری ہی کچھ ایجاد ہوتی تو اس میں تو گنجائش تھی کہ اچھا صاحب! ہم یہ مصرع یوں نہیں، یوں کر دیتے ہیں، یہ مضمون میں نے ایسے لکھا ہے، تم چاہتے تو تمہاری خاطر میں اس میں تبدیلی کر دیتا ہوں۔ یہ میری کتاب ہی نہیں، میری فکر ہی نہیں، میری آیات ہی نہیں ہیں۔ یہ تو خدا کی طرف سے آتی ہیں۔ میں تمہارے پاس پہنچا دیتا ہوں۔ میں اس میں اپنی طرف سے کوئی تبدیلی کر ہی نہیں سکتا۔ تبدیلی کرنا تو ایک طرف، میری اپنی کیفیت یہ ہے

---

❶ اس لفظ کا مادہ (Root) ''دھن'' ہے۔ اَلدُّھۡنَۃُ۔ چکناہٹ۔ اَلۡمُدَاھَنَۃُ۔ فریب، بغاوت، تصنع، نمائش (چکنی چپڑی باتوں کے اعتبار سے)۔ مذہبی پیشوائیت کرتی ہی یہ ہے کہ قرآن کریم کی تعلیم میں کمی بیشی کرتی ہے اور اس طرح لوگوں کو حق کے مقام سے ہٹا دیتی ہے اور یہ سب اس لیے کہ اس سے ان کی روٹی کا سامان بہم پہنچتا رہے۔ وَتَجۡعَلُوۡنَ رِزۡقَکُمۡ اَنَّکُمۡ تُکَذِّبُوۡنَ (56:82)۔ اس تکذیب کو تم اپنے لیے ذریعہ معاش بناتے ہو۔ (پرویز: لغات القرآن جلد دوم، ادارہ طلوع اسلام لاہور، 1960، ص۔ 676)۔

کہ **اِنۡ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا یُوۡحٰۤی اِلَیَّ** (10:15)۔ میں تو خود اس کا اتباع کرتا ہوں' اپنے لیے میں اس میں کوئی تبدیلی نہیں کرتا۔ وحی میں یہ بات ذرا بڑی سخت سی آ گئی ہے کہ چلو تھوڑی سی تبدیلی کرلو' اپنے لیے ہی سہی۔ میں تو اپنے لیے بھی نہیں کرسکتا' تمہاری خاطر میں اس میں کیسے تبدیلی کردوں۔ **اِنِّیۡۤ اَخَافُ اِنۡ عَصَیۡتُ رَبِّیۡ عَذَابَ یَوۡمٍ عَظِیۡمٍ** (10:15)۔ تمہارے ذہن میں یہ ہوگا کہ میں بہت بڑی پوزیشن کا مالک ہوں' جو جی میں آئے' میں کردوں' خدا کیا کہے گا۔ یہ بات سن رکھو کہ اگر میں بھی خدا کے کسی حکم کی نافرمانی کروں تو میں بھی اس کے عذابِ عظیم سے ڈرتا ہوں' تو میں یہ کرکیسے سکتا ہوں۔ عزیزانِ من! میں دو ایک مقامات ہی آپ کے سامنے لایا ہوں قرآنِ کریم میں متعدد مقامات میں یہ چیزیں ہیں کہ ایسا کچھ کرنے کا اس میں کچھ تبدیلی کرنے کا' اس میں معمولی سا بھی ردو بدل کرنے کا' سوال ہی پیدا نہیں ہوتا۔

سیرت کی بلندی اصول پرستی پر مبنی ہوتی ہے

عزیزانِ من! ایک عام اصول پرست آدمی اپنے اصولوں میں کبھی بھی کسی کی خاطر تبدیلی نہیں کرتا' اصولوں پر مفاہمت نہیں کرتا۔ اس کے تو کیریکٹر کی پہچان ہی یہ ہوتی ہے کہ وہ اصول پرست ہے اور دنیا اس کی سیرت کی اس لیے معترف ہوتی ہے کہ نہیں' صاحب! وہ اپنے اصولوں کا بڑا پکا ہے اور یہ وہ اصول ہیں جو رسول کے اپنے پیدا کردہ نہیں ہیں۔ یہ تو خدا کی طرف سے دیئے ہوئے ہیں۔ ان میں تبدیلی پیدا کرنے کا کوئی سوال ہی نہیں ہے۔ عزیزانِ من! یہ ہوئی تمہید لیکن جب اس آیت کا یہ مفہوم یا ترجمہ لیا جائے کہ رسول کی آرزو میں شیطان اپنی آرزو ملا دیتا تھا' تو بات کہیں سے کہیں جا پڑی۔ کہا یہ گیا ہے کہ رسول اللہ کی بھی یہ آرزو تھی کہ ان لوگوں کے ساتھ کہیں کچھ مفاہمت ہو ہی جائے تو اچھا ہے۔ یعنی قرآن کے منع کرنے کے باوجود کچھ مفاہمت ہو ہی جائے؟ جبکہ قرآن کی رو سے یہ ناممکن تھا کہ شیطان نے ان پر غلبہ پا لیا ہو اور اپنی آرزو ملا دی ہو۔ قرآن کی رو سے اس قسم کی مفاہمت کر لینے کی رسول اللہ ﷺ کبھی بھی آرزو نہیں کر سکتے تھے' انہوں نے تو یہ آرزو کرنی ہی نہیں تھی۔ جبکہ ترجمے کی رو سے شیطان نے یہ آرزو ان کے دل میں ڈال دی کہ مفاہمت کرلیں۔ **یا للعجب !**

افسانوں کی عمارت اور ہمارے ہاں کی تفاسیر

عزیزانِ من! آپ دیکھیے کہ شیطان کے آپ کے دل میں آرزو داخل کرنے کی بات پہ کتنے بڑے افسانے کی عمارت وضع کی گئی۔ سورۃ النجم کی آیت نمبر 19 ہے۔ اس میں کہا یہ گیا ہے کہ حضور ﷺ نماز پڑھا رہے تھے۔ یہ چیزیں آپ کو ان تفاسیر میں ملیں گی۔ یہ کچھ سب افسانے ہیں جنہیں روایات کہا جاتا ہے۔ کہا یہ گیا ہے کہ آپ ﷺ نماز پڑھا رہے تھے جب آپ ان آیات پہ پہنچے کہ

اَفَرَءَیۡتُمُ اللّٰتَ وَالۡعُزّٰی o وَمَنٰوۃَ الثَّالِثَۃَ الۡاُخۡرٰی (53:19-20)۔(ان سے کہو کہ ایک طرف یہ دین ہے جو اس خدا کی طرف سے عطا ہوا ہے جس کا علم لامحدود ہے اور اسے اس کا وہ رسول پیش کر رہا ہے جو شرفِ انسانیت کے بلند ترین مقام پہ فائز ہے اور دوسری طرف تمہارا مسلک ہے جس کی رو سے تم اپنے ہاتھوں کے تراشیدہ پتھر کے بتوں کے سامنے جھکتے ہو۔) کیا تم نے کبھی اس پر بھی غور کیا ہے کہ......لات ❶ اور عزّیٰ ❷ اور ان کا تیسرا ساتھی منات ❸ ......ان کی حقیقت کیا ہے؟ عزیزانِ من! یہ لات ومنات اور عزّیٰ بت تھے یا دیویاں تھیں۔قریش ان کی پرستش کرتے تھے۔انہی کے متعلق بقول ان مفسرین کے وہ آپ ﷺ سے کہتے تھے کہ ان کی شان میں گستاخی نہ کرو' انہیں تسلیم کرلو کہ ان کے بڑے بلند مراتب تھے۔لیکن یہ بات یہیں تک ہی نہیں جاتی۔

روایات کی بناء پر نبی اکرم ﷺ کی طرف سے دیوی دیوتاؤں سے شفاعت کی خواہش

روایات میں یہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ جماعتِ مومنین کے ساتھ امام کی حیثیت سے نماز میں کھڑے ہوئے قرآنِ کریم کی اس سورۃ کی تلاوت فرما رہے تھے اور یہ مخالفین یا قریش پیچھے کھڑے دیکھ رہے تھے کہ یہ کیا کر رہے ہیں۔جب آپ ﷺ ان آیات پہ پہنچے جن میں لات' عزیٰ اور منات آیا ہے تو اس کے بعد آپ ﷺ نے نماز میں کھڑے ہوئے اس آیت کے بعد' ان الفاظ کی تلاوت فرمائی کہ **تِلۡکَ الۡغَرَانِیۡقُ الۡعُلٰی وانَّ شَفَاعَتَھُنَّ لَتُرۡتَجٰی** یہ بہت بڑی بلند مرتبہ دیویاں ہیں اور ان کی شفاعت کی واقعی انسان کو امید کرنی چاہیے۔آپ اندازہ لگائیے کہ جماعت کا امام اور وہ بھی اللہ کا رسول قرآنِ کریم کی آیات کے بعد یہ تلاوت فرما رہا ہے جب کہ اس سے اگلی آیت ہے کہ **اَلَکُمُ الذَّکَرُ وَلَہُ الۡاُنۡثٰی o تِلۡکَ اِذًا قِسۡمَۃٌ ضِیۡزٰی** (53:21-22)۔پھر کیا تم نے اپنے اس عقیدے پر کبھی غور کیا کہ یہ دیویاں خدا کی بیٹیاں ہیں۔ذرا سوچو کہ اول تو خدا کی اولاد کا عقیدہ ہی کس قدر باطل ہے' اس پر طرہ یہ کہ خدا کے ہاں اولاد بھی بیٹیاں ہیں اور تمہارے ہاں بیٹے! غور کرو کہ یہ تقسیم بجائے خویش کس قدر بھونڈی اور جہالت پر مبنی ہے۔

مخالفین کی طرف سے جشنِ مسرت

عزیزانِ من! سورۃ النجم کی ساری آیات ابھی آگے آ رہی ہیں۔کہا کہ جب آپ اس آیت پہ پہنچے جس میں لات وعزّیٰ اور منات کا ذکر ہے تو اس کے بعد آپ ﷺ نے یہ پڑھ دیا' جس کا مطلب ہے کہ یہ بہت بلند مرتبہ دیویاں ہیں' ان کی شفاعت کی امید رکھنی

---

❶ اللّٰت۔عہد جاہلیت میں طائف میں قبیلۂ ثقیف کا بت تھا۔یہ مونث ہے' اس لیے اسے دیوی کہنا چاہیے۔

❷ العزّیٰ۔عرب کے زمانۂ جاہلیت میں قبیلۂ عطفان کا ایک بت تھا جس کی یہ قبیلہ پرستش کرتا تھا۔یہ لفظ الاعز کا مونث بھی ہے۔

❸ مَنوٰۃُ۔جاہلیت عرب میں قبیلۂ ہذیل وخزاعہ کا بت تھا۔تاج العروس اور محیط المحیط میں یہی لکھا گیا ہے۔قبیلۂ ہذیل وخزاعہ اس بت کی پرستش کرتے تھے۔

چاہیے۔ کہا کہ جب آپ ﷺ نے یہ پڑھا تو سارے قریش اور مخالفین سجدے میں گر گئے اور انہوں نے جشنِ مسرت کے نعرے بلند کیے۔ انہوں نے کہا کہ کام بن گیا' بالکل ٹھیک ہے' صاحب! تمہاری اور ہماری مفاہمت ہوگئی' تمہارے اور ہمارے درمیان مصالحت ہو گئی' اب کوئی مخالفت کی بات باقی نہیں رہی اور یہ ایسے ہی نہیں ہوا کہ وہیں کی وہیں یہ بات ہوئی اور وہیں ختم ہوگئی۔ حقیقت حال دیکھیے کہ یہ واقعہ مکے کی زندگی کا بتایا جارہا ہے اور یہ وہ زمانہ تھا جب رسول اللہ ﷺ کے کچھ صحابہ رضی اللہ عنہم مکے والوں کی ان صعوبات سے تنگ آ کے حضور ﷺ کی تجویز کے مطابق ہجرت کر کے حبشہ تشریف لے گئے ہوئے تھے۔ کہا یہ جارہا ہے کہ یہ بات ان تک بھی پہنچ گئی یعنی مکے سے حبشہ تک بات پہنچ گئی کہ صلح ہوگئی ہے اور ان میں سے کچھ اصحاب رضی اللہ عنہم اس بناء پہ کہ اب تو مخالفت' مخاصمت کی بات نہیں رہی' واپس بھی آ گئے۔ گویا اس کا اتنا چرچا ہوا اور اس دوران یہ بھی نہیں ہوا کہ کوئی تردید ہوئی ہو بلکہ وہاں تک یہ بات پہنچ گئی کہ حضور ﷺ نے ان کی دیویوں کو تسلیم کر لیا ہے اور اس بنا پر آپس میں مصالحت ہوگئی ہے اور وہ وہاں سے واپس بھی آ گئے۔ اب بعد میں یہ بات ہوئی کہ حضور ﷺ کو بھی معاذ اللہ یہ محسوس ہوا کہ یہ الفاظ تو شیطان نے کہلوا دیئے ہیں اس لیے یہ چیز کہی گئی اور اس کی تردید کی گئی کہ نہیں' ہم ان دیویوں کو نہیں مانتے' یہ بات غلط ہے' تو پھر وہ مفاہمت یا مصالحت ٹوٹ گئی۔ یہ قصہ آپ کو تفاسیر میں ملے گا۔ وہ روایات کی بنیادوں پہ ملے گا۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے کہ روایات کے قصے میں تو یہ شروع سے چلا آ رہا ہے کہ یہ غلط ہے' یہ صحیح ہے' یہ ضعیف ہے' یہ یوں ہے۔ یہ سارا قصہ روایات کی بنیادوں پر ان کے ہاں موجود ہے کہ **اِذَا تَمَنّٰی** رسول کی جو آرزو ہوتی تھی اس میں شیطان اپنی آرزو ملا دیتا تھا۔ یہ کتنی عجیب بات کہی ہے۔ میں نے ابھی ابھی کہا تھا کہ مخالفین کہتے تھے کہ اس قرآن کے بدلے میں کوئی دوسرا قرآن لے آؤ۔ کچھ اس میں ملا دو' کچھ اس میں تغیر و تبدل کر دو۔ تو آپ فرماتے تھے کہ میں اپنی طرف سے اس میں کچھ نہیں کر سکتا۔ تو وہ کہتے ہیں کہ آپ نے یہ اپنی طرف سے نہیں کیا تھا۔ وہی تمنائے شیطان تھی جو اس کی طرف سے ہوگئی۔ یا اللہ! یا للعجب!

ان چیزوں کو بیان کرنے کا میرا مقصد

عزیزانِ من! میں کیا کیا عرض کروں! میں کہتا ہوں کہ قرآنِ کریم کی رو سے تو شاید اس کا ذکر بھی نہیں کرنا چاہیے تھا لیکن مجھے تو درس میں اس لیے ذکر کرنا ہوتا ہے کہ یہ چیزیں بھی آپ لوگ قرآنِ کریم کی انہی تفاسیر کی رو سے پڑھتے ہیں۔ آپ کو یہ چیزیں بھی ان تفاسیر میں مذکور ملیں گی۔ یہ واقعات تاریخ کی کتابوں میں بھی آئے ہوئے آپ کو ملیں گے کہ کچھ اس طرح ان کے ساتھ مصالحت ہوئی تھی' مفاہمت ہوئی اور پھر اس طرح سے یہ ٹوٹ گئی اور یہ قصہ بھی ہوا کہ حبشہ میں ہجرت کر کے جانے والے واپس آئے۔ یہ سارے قصے ان کے اندر موجود ہیں۔ اس لیے ان کی وضاحت قرآن فہمی کے لیے ضروری ہو جاتی ہے۔

اس آیت کا اصل مفہوم

عزیزانِ من! اب سنیے کہ اس آیت کے معنی کیا ہیں اور بات کیا ہے جسے یہاں تُمَنّٰی کہا گیا ہے، جس کے معنی صرف آرزو یا خواہش کے کیے گئے ہیں۔ تمنی کے معنی تلاوت ❶ کے ہوتے ہیں۔ جو کچھ رسول پیش کرتا ہے یعنی خود وحی خداوندی۔ اس وحی کی تلاوت ہوتی ہے۔ قرآنِ کریم نے بتایا یہ ہے کہ دین تو شروع سے ایک ہی چلا آ رہا تھا' دین کے ایک ہی اصول چلے آ رہے تھے۔ ہر قریہ میں نبی آیا' ہر زمانے میں نبی آیا اور دین کے وہی اصول تھے جو وہ پیش کرتا چلا آیا۔ اب اس کے بعد یہ ہوا کہ ہر نبی کی امت میں جو کچھ دین رائج تھا' دوسرا رسول آیا اور اس نے آکر ان میں سے بہت سی ان چیزوں کو غلط قرار دیدیا جو انہوں نے اپنی ذہنی اختراع سے اس میں ملا دیا ہوتا تھا۔ پھر اللہ تعالیٰ کی وحی کی رو سے ان غلط باتوں کی تردید کی' انہوں نے ان غلط باتوں کو منسوخ کیا اور پھر خدا کے دین کی صحیح باتیں اس نبی نے دیں' وہ چلا گیا۔ اس کے بعد پھر یہ قصہ ہوا۔ قرآن نے کہا ہے کہ ہر نبی کے ساتھ یہ ہوتا رہا کہ جو دین وہ پیش کرکے جاتا تھا اس کے بعد اس دین کے مخالف' سرغنے' سرکش' شیاطین جنہیں کہا جاتا ہے' یہ لوگ اسکی تلاوت کردہ وحی کے اندر خود کچھ ملا دیتے تھے' اس کی آمیزش کر دیتے تھے۔ وہ دین اپنی غیر آمیزش شکل' پاکیزہ منزہ شکل کے اندر باقی نہیں رہتا تھا' تو خدا کا پروگرام یہ تھا کہ فَيَنْسَخُ اللّٰهُ مَا يُلْقِي الشَّيْطٰنُ ثُمَّ يُحْكِمُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ (22:52)۔ خدا ایک دوسرا رسول بھیج دیتا تھا' اس کے بعد جو کچھ انہوں نے اس میں ملایا ہوتا تھا وہ اسے منسوخ کر دیتا تھا اور اپنی آیات کو جو پہلے رسول کی وساطت سے بھیجی ہوئی تھیں انہیں محکم کر دیتا تھا۔ وحی کا یہ طریقِ کار چلا آتا تھا۔ یہی ہے وہ جو آیہ تنسیخ ہمارے ہاں منسوخ کی ہے' وہ مشہور آیت ہے کہ مَا نَنْسَخْ مِنْ اٰيَةٍ اَوْ نُنْسِهَا نَاْتِ بِخَيْرٍ مِّنْهَآ اَوْ مِثْلِهَا (2:106)۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ یہ سلسلہ چلا آ رہا تھا کہ سابقہ نبی کے دیئے ہوئے دین میں سے جو آیات ایسی تھیں جو بھلا دی جاتی تھیں یا اس طرح سے ان میں آمیزش کر دی جاتی تھی تو ان کی مثل دوسرے رسول کی وساطت سے خدا کی وحی کی آیات دے دی جاتی تھیں اور جو احکام وقتی طور پہ دیئے گئے تھے' جن کو باقی رکھنا مقصود نہیں تھا' ان سے بہتر احکام بِخَيْرٍ اس نئے نبی کی وساطت سے دیدیئے جاتے تھے۔ یہ تو تھی صاف اور واضح بات جو ان آیات میں کی گئی ہے۔

---

❶ امام ابن قتیبہ الدینوری (المتوفی 277ھ) نے کتاب القرطین' جو کہ ان کی مشہور کتابوں' مشکل القرآن وغریبہ پر مشتمل ہے' کی جلد دوم صفحہ 31 پر اور ابن فارس (المتوفی 395ھ) نے اپنی تالیف مقاییس اللغۃ میں لکھا ہے کہ ''تَمَنَّى الْكِتَابَ۔ کتاب کو پڑھا۔ اُمْنِيَّةٌ۔ کتاب کی تلاوت کی۔ جو کچھ پڑھا جائے۔'' تَمَنّٰی کے اس معنی کے لیے تاج العروس میں اس کے مؤلف محبّ الدین ابن الفیض (المتوفی 1205ھ مطابق 1791ء) سے خاص طور پر اشعار بطور سند نقل کیے ہیں۔ اور ابن فارس نے کہا ہے کہ ''پڑھنے'' سے کتاب کے مفہوم کا اندازہ کیا جاتا ہے۔ مَنَاهُ يَمْنِيهِ مَنْيًا۔ اس کا اندازہ کیا۔ اَلْمَانِيْ اندازہ کرنے والا۔ اَلْمَنٰى (واحد مُنْيَةٌ) مقاصد' خواہشات' آرزوئیں یعنی وہ کام جن کا پہلے سے اندازہ کر لیا جائے۔

آیات کی منسوخی کے متعلق ہمارا عقیدہ

عزیزانِ من! پھر بات دوسری طرف نکل جائے گی لیکن اس کی وضاحت ضروری ہے۔ وہ بات یہ ہے کہ ہمارے ہاں عقیدہ یہ ہو گیا کہ خود قرآنِ کریم کے اندر بھی کئی آیات منسوخ ہیں۔ اس کی سند یہ آیت ہے۔ کہتے ہیں کہ دیکھیے قرآن نے کہا ہے۔ **مَا نَنۡسَخۡ مِنۡ اٰیَةٍ** (2:106)۔ اچھا جی! قرآنِ کریم میں بہت سی آیات منسوخ ہیں۔ ابتدا میں کہا گیا کہ قریباً پانچ سو آیات منسوخ ہیں۔ جو کوئی بھی اپنے احکام صادر کرتا ہے، جو حکومت اپنے احکام صادر کرتی ہے، جو مصنف اپنی تصنیف پہ نظرِ ثانی کرتا ہے، وہ خود یہ بتاتا ہے کہ یہ فلاں چیز جو ایسے میں نے پہلے کہی تھی، وہ منسوخ کی جاتی ہے اور اس کی جگہ یہ چیز رکھی جاتی ہے۔ روز ہمارے ہاں جتنے بھی حکومت کے یہ احکام ہوتے ہیں ان میں Abrogation (تنسیخ) ہوتی رہتی ہے، وہ اس تنسیخ کا Announce (اعلان) کرتے ہیں وہ Correction (تصحیح) سلپیں Issue (جاری) ہوتی ہیں، وہ اعلان کرتے ہیں کہ فلاں پہلا Order حکم، قانون منسوخ ہوا، اس کی جگہ یہ حکم دیا جاتا ہے۔ تو پھر یہ نیا حکم نافذ العمل ہوتا ہے۔ عدالت میں بھی وہ نیا حکم پھر ہی نافذ العمل ہوتا ہے۔ آپ کو اس چیز کو ثابت کرنا ہوتا ہے کہ صاحب! یہ آرڈر منسوخ ہو چکا ہوا ہے اور وہ فلاں قانون کی رو سے منسوخ ہوا ہے۔ اگر آپ وہ قانون نہ پیش کر سکیں تو وہ پہلا قانون اسی طرح سے رہتا ہے۔ اس کے بعد آپ کو کوئی نہیں مانتا ہے، آپ کو وہ منسوخ کرنے والا قانون پیش کرنا ہوتا ہے۔ یہ سیدھی بات ہے کہ جو پہلا قانون دیگا، وہی اس قانون کو منسوخ کر کے اس کی جگہ دوسرا قانون دے گا اور قرآن نے تو **مَا نَنۡسَخۡ مِنۡ اٰیَةٍ** خود لکھا ہوا ہے کہ ہم جن آیات کو منسوخ کرتے ہیں تو قرآنِ کریم میں اگر کچھ آیات منسوخ تھیں تو خدا کے لیے ضروری تھا کہ وہ یہ بتاتا کہ ہماری یہ آیت منسوخ ہو گئی، اس کی جگہ یہ آیت ہونی چاہیے یا کم از کم یہی طریق کار رہتا کہ نبی اکرم ﷺ کے آخری زمانہ حیات میں جو آیات منسوخ تھیں، آپ سے کہا جاتا کہ ان کو قرآن سے نکال دو اور ان کی جگہ ہم نے جو آیات دی ہیں وہ قرآن میں رکھ دو اور رسول اللہ ﷺ یہ کہتے کہ دیکھو بھئی! اب یہ جو قرآن ہم دے رہے ہیں یہ ہے خدا کی طرف سے آخری صحیفہ۔ اس سے پہلے کوئی چیزیں آئی بھی تھیں جو ہم سے تم لوگوں سے کہی بھی تھیں، قرآن میں بھی دی تھیں اب انہیں منسوخ سمجھو لو مگر قرآن میں تو خدا نے کہیں یہ نہیں کہا کہ فلاں آیت منسوخ ہے۔

پانچ سو آیات منسوخ کرنے کا فیصلہ علمائے کرام نے کیا

عزیزانِ من! ہمیں کہا جاتا ہے کہ علمائے کرام نے یہ فیصلہ کیا کہ پانچ سو آیات منسوخ ہیں یعنی خدا نے وہ نازل کی تھیں، علمائے کرام نے فیصلہ دیدیا کہ یہ منسوخ ہیں۔ اِس کا بھی قصہ دلچسپ رہا۔ پانچ سو سے بات شروع ہوئی کہ یہ منسوخ ہیں۔ شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ [1]

---

[1] آپ کا اصل نام شاہ قطب الدین احمد ہے۔ آپ شاہ ولی اللہ کے نام سے معروف ہیں۔ آپ قصبہ پھلت ضلع مظفر نگر یو پی میں 1702ء مطابق 1114ھ میں پیدا ہوئے اور 29 محرم 1176ھ کو بعمر 61 سال راہیٔ ملکِ بقا ہوئے۔ آپ کے والد بزرگوار شاہ عبدالرحیم عہد اورنگ زیب (1658-1707) کے مشہور علما میں مانے جاتے تھے۔ (شبیر احمد: تعلیم کی کہانی، کفایت اکیڈمی، کراچی، 1974، ص ص۔ 281-277)

(1114-1176AH) تک پہنچتے پہنچتے وہ پانچ آیتیں رہ گئیں کہ نہیں، صرف پانچ آیات منسوخ ہیں اور ان کے شاگرد رشید مولانا [2] سندھیؒ نے جو سب سے بڑے شارح امام ولی اللہؒ مانے جاتے ہیں؛ انہوں نے کہا کہ شاہ ولی اللہؒ نے بھی اپنے زمانے کے ان مذہبی پیشواؤں کے Pressure (دباؤ) کی رو سے ایسا کہہ دیا تھا؛ ورنہ یہ جو انہوں نے پانچ آیتیں کہی ہیں ان کے منسوخ ہونے کی بھی کوئی وجہ ہی نہیں تو قصہ ہی ختم ہو گیا۔ پانچ سو سے شروع ہوا اور یوں چلتا گیا اور صفر تک پہنچا۔ لیکن عقیدہ اب بھی باقی ہے۔ جہاں کہیں کسی حکم سے اِدھر اُدھر سرتابی کرنے کا، بچ نکلنے کا، ان کا جی چاہتا ہے تو کہتے ہیں کہ یہ آیت منسوخ ہے۔ اب بھی یہ چیز ہے کہ یہ منسوخ ہے اور منسوخ کے تو قصے ہی عجیب ہو گئے۔ کہتے ہیں کہ وہ آیتیں ہیں جو قرآن میں موجود ہیں لیکن ان کی تلاوت ثواب کی خاطر کی جائے گی ان کے حکم منسوخ ہو گئے اور اِس چیز کے بارے میں کہیں قرآن میں نہیں کہا۔ تو ایک بات ہو گئی منسوخ۔ دوسری بات یہ ہے کہ کئی آیتیں ایسی ہیں کہ ان کا حکم تو جاری ہے لیکن وہ قرآن میں درج نہیں ...... یا اللہ ...... یہ کہتے ہیں کہ وہ آیات منسوخ التلاوت ہیں۔ وہ قرآن کی آیات کے مطابق پڑھی نہیں جاتیں لیکن ان کا حکم موجود ہے۔ قرآن میں یہ بھی موجود ہیں انہیں تو انہوں نے اپنی منشا کے مطابق منسوخ کرنا تھا تو اگلا عقیدہ یہ ہوا کہ رسول اللہ ﷺ کی حدیث قرآن کی آیت کو منسوخ کر سکتی ہے اور آیات ایسی ہیں جنہیں کہا گیا ہے کہ حضور ﷺ کی حدیث نے انہیں منسوخ کیا ہے جب کہ قرآنِ کریم میں رسول یہ کہتے تھے کہ میں تو ان آیات میں کوئی تبدیلی نہیں کر سکتا۔ میں تو ان کا امین ہوں؛ بعینہٖ انہیں لوگوں تک پہنچاتا ہوں۔

قرآنِ حکیم کے متعلق مختلف تصورات

عزیزانِ من! آپ ان چیزوں کو کہیں نوٹ کرتے چلے جایئے یا اپنے قرآن کے نسخوں میں لکھتے چلے جایئے؛ پتہ نہیں کہ ان باتوں کے دہرانے کا پھر یہ موقعہ آئے یا نہ آئے۔ میں آپ پہ کوئی جبر نہیں کیا کرتا۔ میں تو اپنی قرآنی بصیرت کو پیش کیا کرتا ہوں کہ آپ خود اس پہ غور و فکر کیجیے گا۔ یہ بھی عقیدہ ہے کہ یہ آیات قرآن میں موجود ہیں؛ پڑھی جاتی ہیں مگر ان کا حکم منسوخ ہے۔ یہ بھی عقیدہ ہے کہ آیات قرآن میں موجود نہیں ہیں؛ لیکن ان کا حکم چلتا ہے؛ جیسے وہ زانی کو سنگسار کرنے کی آیت کے متعلق کہا گیا ہے کہ وہ قرآن کی آیت ہے؛ قرآن میں موجود نہیں ہے؛ حکم اس کا چلتا ہے۔ یہ بھی عقیدہ ہے کہ رسول اللہ ﷺ کی حدیث قرآن کی آیت کو منسوخ کر سکتی ہے جیسا کہ آیہ وصیت میں کہا گیا ہے۔

---

[2] عبیداللہ سندھی رحمۃ اللہ علیہ

وصیت کے متعلق روایات نے قرآنی آیات کو منسوخ کر دیا ہوا ہے

عزیزانِ من! وصیت کا بلا مشروط حکم قرآن میں موجود ہے اور بڑی تاکید کے ساتھ آیا ہے۔ پہلے کہا ہے کہ **كُتِبَ عَلَيْكُمْ** (2:180)۔ تم پر یہ چیز واجب' فرض' قرار دی گئی ہے کہ **اِذَا حَضَرَ اَحَدَكُمُ الْمَوْتُ** (2:180)۔ جب تم یہ دیکھو کہ تمہاری موت قریب ہے اور **اِنْ تَرَكَ خَيْرًا** (2:180)۔ تم اپنے پیچھے کچھ مال و دولت چھوڑ رہے ہو' تو **الْوَصِيَّةُ لِلْوَالِدَيْنِ وَالْاَقْرَبِيْنَ بِالْمَعْرُوْفِ** (2:180)۔ تم اپنے والدین اور اقربین کے لیے قاعدے کے مطابق وصیت کر جاؤ۔ تم اپنے ورثاء کے لیے' اپنے والدین کے لیے' اپنے دین کے لیے' جس کے لیے' تم چاہو وصیت کر جاؤ اور آخر میں کہا ہے کہ **حَقًّا عَلَى الْمُتَّقِيْنَ** (2:180)۔ ایسا کرنا تمام متقین (مسلمانوں) پر فریضۂ خداوندی ہے' متقین پر ایسا کرنا حق ہے۔ یہ ایسی محکم آیت ہے اس پر کہا گیا ہے کہ نہیں' حضور ﷺ کی ایک حدیث ہے' جس میں آپ ﷺ نے فرمایا ہے کہ وصیت صرف (1/3) ایک تہائی میں ہو سکتی ہے اور وہ وصیت بھی وارثوں کے متعلق نہیں ہو سکتی۔ حضور ﷺ کی اس حدیث نے قرآن کی اس آیت کو منسوخ کر دیا ہوا ہے۔ اس پر اعتراض ہوا کہ خدا نے حضور ﷺ کی زبانِ مبارک سے یہ فرمایا تھا کہ میں تو قرآن میں کوئی تبدیلی نہیں کر سکتا' یہ تو قرآن میں بہت بڑی تبدیلیاں ہوئیں پھر ان چیزوں کی کیا بات ہے' جواب دیا گیا کہ اس میں کہا گیا تھا کہ **مِنْ تِلْقَآئِ نَفْسِيْ** (10:15)۔ یہ چیز میرے حیطۂ اختیار سے باہر ہے کہ میں اپنی طرف سے کسی قسم کا ردوبدل کر سکوں۔ نہیں' میں اپنی طرف سے نہیں کر سکتا۔ یہ جو حدیثِ رسول اللہ ﷺ کی طرف سے ہوا' اس کے لیے کہا گیا کہ یہ تو حضور ﷺ کی حدیث ہے جس کی رو سے ہوا ہے۔ یہ تو حضور ﷺ کی ہے۔ یہ اگر اپنی طرف سے نہیں کیا گیا تو اور کس کی طرف سے کیا گیا ہے۔ عقیدہ یہ وضع کیا گیا کہ وحی کی دو قسمیں ہوتی ہیں: ایک وحی وہ تھی کہ جو قرآن میں آ جاتی تھی اور اسکی تلاوت ہوتی تھی' اور دوسری وحی وہ تھی جو قرآن میں نہیں آتی تھی' اس کی تلاوت بھی نہیں ہوتی تھی اور وہ وحی حضور ﷺ کی حدیث تھی تو یہ حضور ﷺ نے اپنی طرف سے منسوخ نہیں کی تھی' یہ تو ایک وحی نے دوسری وحی کو منسوخ کر دیا۔ اب کر لو کیا کرتے ہو۔

وحی کی دو قسموں کا عقیدہ یہودیوں کا عقیدہ تھا

عزیزانِ من! گو کہ بات دوسری طرف چلی جائے گی مگر اس کی وضاحت ضروری ہے یہ لوگ کہتے ہیں کہ وحی کی دو قسمیں ہیں۔ یہ یہودیوں کا عقیدہ تھا۔ ان کے ہاں ایک وحی' کتبِ وحی تھی یعنی ایک وہ وحی جو تلاوت [1] کی جاتی تھی' وہ کتاب کہلاتی تھی۔ ایک وحی وہ تھی جس کی تلاوت [2] نہیں ہوتی تھی۔ وہ روایات کہلاتی تھی۔ ان کے ہاں یہ دونوں چیزیں چلی آ رہی تھیں۔ قرآنِ کریم میں دوسری وحی کا

---

1. وحی جلی یا وحی متلو۔ اسے یہودیوں میں شبکتب کہتے تھے۔ ہمارے ہاں یہ عقیدہ یہودیوں سے آیا ہے۔
2. وحی خفی یا وحی غیر متلو۔ اسے یہودیوں میں شبعلفہ کہتے تھے۔ یہ عقیدہ بھی ہمارے ہاں یہودیوں سے آیا ہے۔

کہیں کوئی ذکر نہیں ہے۔ایک ہی وحی ہے لیکن اس دوسری وحی کی صورت یہ ہوئی کہ ایک وحی تو قرآنِ کریم کے اندر محفوظ ہے' خدا نے خود اس کی حفاظت کا ذمہ لیا ہے۔ بقول ان کے جو دوسری اسی قسم کی وحی تھی' جو قرآن کی ناسخ ہو سکتی تھی' وہ آپ کی احادیث تھیں' انہیں نہ رسول اللہ ﷺ نے مرتب کرا کے دیا' نہ صحابہ کرام رضی اللہ عنہم نے ان کو مرتب کیا' نہ صدرِ اول میں وہ کہیں جمع ہوئیں۔

عزیزانِ من! جسے آج پہلا صحیح ترین مجموعہ کہا جاتا ہے' وہ امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ (194-260 ہجری) کا ہے۔ وہ احادیث رسول ﷺ کی زندگی کے دو اڑھائی سو سال بعد کہیں جا کے جمع ہوئیں اور اس وقت تک وضعی حدیثوں کے پھیلنے کی' اور ان کی اشاعت کی کیفیت کا اندازہ خود امام بخاریؒ ❸ کے اس قول سے لگائیے کہ انہوں نے فرمایا کہ مجھے چھ لاکھ کے قریب روایات ملیں۔ میں نے اپنی بصیرت کے مطابق اپنے مجموعے میں کوئی دو ہزار سات سو کے قریب رکھیں۔ آپ کوئی تین ہزار سمجھ لیجیے۔ اس سے پہلے ان کا کوئی تحریری ریکارڈ نہیں تھا' جہاں سے یہ لی گئی ہوں۔ اُن کا روایات جمع کرنے کا طریقہ یہ تھا کہ وہ لوگوں سے آ کے ملتے تھے' پوچھتے تھے کہ بھئی! رسول اللہ ﷺ کی جو بات تم تک پہنچی ہو۔ وہ کہتا تھا کہ ہاں پہنچی ہے۔ رسول اللہ تو ڈھائی سو یا دو سو سال پہلے ہو چکے تھے۔ اب یہ جو سامنے راوی ہے' یہ حدیث اس تک کیسے پہنچی تھی۔ وہ کہتا تھا کہ مجھے میرے والد صاحب نے یہ بتایا تھا۔ تو جی! تمہارے والد صاحب کا انتقال تو کوئی پچاس برس یا تیس برس یا چالیس برس پہلے ہو گیا۔ وہ تو رسول اللہ ﷺ کے زمانے کے نہیں تھے۔ وہ کہتے تھے کہ جی! نہیں' وہ کہتے تھے کہ میں نے اپنے استاد سے سنا تھا۔ بھئی! ان کا یہ سنِ وفات بھی اسی مدت کے قریب ہوگا۔ وہ کہتا تھا کہ میں نے اپنے باپ سے سنا تھا اور اس طرح سے رسول اللہ ﷺ تک پہنچنے کے لیے کم از کم پانچ' چھ' سات' آٹھ راوی درمیان میں آ جائیں گے اور اس کا بھی احتمال ہے کہ بات کیا سے کیا بن جائے گی۔

چھ لاکھ حدیثوں میں سے 3 ہزار باقی رکھیں: کیوں؟

عزیزانِ من! خود امام بخاریؒ نے یہ کہا ہے کہ مجھے اس طرح سے چھ لاکھ کے قریب روایات ملی تھیں۔ میں نے اپنی بصیرت کے مطابق چھان پھٹک کی تو اس میں سے میں نے کچھ مکررات کو نکال کے کوئی دو ہزار سات سو کے قریب اپنے مجموعے میں رکھیں' آپ انہیں کوئی تین ہزار سمجھ لیجیے۔ چھ لاکھ میں سے اتنی روایات امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ (194-260 ہجری) نے اپنی بصیرت کے مطابق صحیح سمجھیں' پانچ لاکھ ستانوے ہزار کے قریب تو ایک امام بخاریؒ نے کہہ دیا کہ یہ سب وضع ہوئیں یا ضعیف قرار پائیں۔ عزیزانِ من! امام بخاری کہتے ہیں کہ میں نے اپنی بصیرت کے مطابق اتنی ہی روایات کو صحیح قرار دیا۔ امام بخاریؒ خدا کے رسول نہیں تھے کہ وحی خداوندی کی رو سے ان روایات کی چھان پھٹک کرتے۔ انہوں نے تو صرف اپنی ہی بصیرت کے مطابق ان روایات کی چھان پھٹک کی تو پانچ لاکھ ستانوے ہزار

---

❸ امام محمد اسمٰعیل بخاری (260ھ-194ھ)

کے قریب روایات کو یا تو وضعی پایا یا انہیں ضعیف قرار پایا۔ اور اس قسم کے کتنے ہی جامعینِ حدیث تھے؛ چھ تو ہمارے ہاں صحاح ستہ کی کتابیں کہلاتی ہیں اور عجیب چیز ہے کہ یہ چھ جو صحاح ستہ ❶ ہیں، جنہیں حدیث کی چھ صحیح ترین کتابیں کہا جاتا ہے؛ ان کے تمام جامعین میں سے کوئی ایک بھی عربی نہیں ہے۔ بہرحال اگر یہاں کے عرب ہوتے تو ایک دوسرے سے ملتے۔ یہ ان میں سے کوئی بھی نہیں ہے۔ یہ تو سارے ایران سے آئے تھے۔ ہاں تو، عزیزانِ من! میں کہہ یہ رہا تھا کہ جب یہ احادیث جمع ہوئی ہیں تو اس وقت خود امام بخاری رحمۃ اللہ علیہ کے قول کے مطابق پانچ لاکھ ستانوے ہزار تو انہوں نے مسترد کر دی تھیں تو آپ اندازہ لگائیے کہ اس وقت یہ روایات کس کثرت سے پھیلی ہوئی ہونگی۔ مروجہ عقیدے کے مطابق وحی جلی (یا متلو) قرآن مجید کے اندر درج ہے اور وحی خفی (یا وحی غیر متلو) احادیث کے اندر۔ وحی غیر متلو (وحی خفی) کے متعلق یہ عقیدہ وضع کیا گیا کہ یہ بھی ''مثلہ ❷ معہ'' یعنی قرآن کے ساتھ اس کی ''مثل'' ہے۔ یعنی قرآن کی مثل قرآن کے ساتھ۔ اس طرح روایات یا احادیث کی یہ کیفیت ہوگئی۔

---

❶ اہل السنّت والجماعت ان مجموعوں میں سے چھ کو صحیح تسلیم کرتے ہیں۔ آپ یہ دیکھ کر حیران ہوں گے کہ (شیعہ جامعین روایات کی طرح) یہ سنی جامعین روایات بھی سب کے سب ایرانی تھے۔ درج ذیل جدول ملاحظہ فرمائیے۔

نمبر شمار	نام جامع حدیث	مجموعہ	ولادت و وفات	وطن	کتنی احادیث جمع کیں	کتنی اپنے مجموعے میں درج کیں
۱	امام محمد اسمٰعیل بخاریؒ	صحیح بخاری	ولادت:194ھ وفات:260ھ	بخارا	چھ لاکھ	2762 (مکررات حذف کرنے کے بعد)
۲	امام مسلم بن حجاجؒ	صحیح مسلم	ولادت:204ھ وفات:261ھ	نیشاپور	تین لاکھ	4348
۳	امام ابوعیسیٰ محمد ترمذیؒ	جامع ترمذی	ولادت: 209ھ وفات:279ھ	ترمذ	تین لاکھ	3115
۴	امام ابوداؤدؒ	سنن ابی داؤد	ولادت:203ھ وفات:275ھ	سیستان	پانچ لاکھ	4800
۵	ابوعبداللہ ابن ماجہؒ	سنن ابن ماجہ	ولادت:209ھ وفات 273ھ	قزوین	چار لاکھ	4000
۶	امام عبدالرحمٰن نسائیؒ	سنن نسائی	وفات 303ھ	صوبہ خراسان کا گاؤں	دو لاکھ	4321

(ماخذ: پرویز: شاہکارِ رسالت۔ عمر فاروقؓ، ادارہ طلوع اسلام، لاہور، 1987۔ ص، 502)

اہل السنّت والجماعت کے احادیث کے متعدد مجموعے ہیں۔ ان میں سے متذکرہ بالا چھ کتابوں کو، جنہیں صحاح ستہ کہا جاتا ہے، مستند مانا جاتا ہے۔ پھر صحاح ستہ میں سے دو کتابوں، صحیح بخاری اور صحیح مسلم، کو صحیحین، اور صحیح بخاری کو اصح الکتب بعد کتاب اللہ قرار دیا جاتا ہے۔

❷ کہا جاتا ہے کہ وحی متلو اور وحی غیر متلو، (مثلہ معہ)'' قرآن کے ساتھ اس کی مثل کا عقیدہ امام شافعیؒ نے وضع کیا تھا۔ یہ عسقلان کے صوبہ میں 150ھ میں پیدا ہوئے اور ہارون الرشید کے زمانہ میں یمن میں مقیم تھے جو شیعوں کا مرکز تھا۔ ان پر تشیع کا الزام ہے اور اسی بنا پر ہارون الرشید کے ہاں ان کی طلبی بھی ہوئی تھی۔ آخرالامر انہوں نے مصر میں 204ھ میں انتقال کیا۔ اس عقیدے کی رو سے، قرآن سے باہر ایک مجموعہ وحی اور وجود میں آ گیا جنہیں احادیث کہا جاتا ہے۔ جن لوگوں کے دلوں میں دین کا صحیح تصور اور دل میں قرآن مجید کے ''لاشریک لہ'' ہونے کی عظمت تھی، انہوں نے اس نئے عقیدے کی مخالفت کی ...... اُن لوگوں پر معتزلہ کا لیبل لگا دیا۔ ''معتزلہ'' اور شوافع کی کشمکش اور آویزش کی داستان بڑی طویل اور خونچکاں ہے۔ (پرویز: شاہکار رسالت۔ عمر فاروق۔ ادارہ طلوع اسلام، لاہور، 1987، ص ص 500 -499۔)

احادیث قرآن کو منسوخ کر سکتی ہیں

عزیزانِ من! یہ ہیں وہ امور جن کے متعلق اب یہ عقیدہ ہے کہ احادیث قرآن کی آیت کو منسوخ کر سکتی ہیں۔ اس پہ اعتراض ہوا کہ یہ اس قسم کی جمع کی ہوئی رسول اللہ ﷺ کی حدیثیں اول تو وہ قابلِ اعتماد ہی کیسے ہو سکتی ہیں اور پھر ان کا ایسا درجہ کہ وہ قرآن کو منسوخ کر سکتی ہیں کیونکر ممکن ہے۔ کوئی جواب نہیں۔ کہنے لگے کہ ان پہ اعتراض یہی ہے کہ یہ رسول اللہ ﷺ نے مرتب کر کے نہیں دیں' محفوظ کر کے نہیں دیں' مگر رسول اللہ ﷺ نے تو قرآن بھی مرتب کر کے نہیں دیا۔ چل بھئی! کرلو اعتراض' کیا کرتے ہو! حضور نے قرآن کریم بھی مرتب شدہ شکل میں دیا ہی نہیں تھا۔ حضور ﷺ نے قرآن ایسی شکل میں پھیلا ہوا دیا کہ کچھ کسی کے پاس' کچھ کسی کے پاس' کسی نے پتے پہ لکھا ہوا' کسی نے ہڈی پہ لکھا ہوا ہے' کسی نے کسی پہ لکھا ہوا ہے' کسی نے کسی پارچے پہ چار آیتیں لکھی ہوئی ہیں' کسی کے پاس دو آیتیں' کسی کے پاس دس آیتیں۔ یہ قرآن تو بعد میں مرتب و مدون ہوا۔ اب قرآن کے جمع و مرتب کرنے کی وہ تاریخ مرتب ہوئی تو وہ شروع ہو گئے۔ کسی نے کہا کہ حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ (573-634AD) نے کیا تھا۔ کسی نے کہا کہ حضرتِ عمر رضی اللہ عنہ (581-644AD) نے کیا تھا تو آخر میں آ کر حضرتِ عثمان رضی اللہ عنہ (573-656AD) تک بات پہنچی اور اب اس کے لیے خطبے میں صحابہ کبار کے نام لیے جاتے ہیں۔ ان خلفائے راشدین کے نام ذرا خطابت کے لیے یا ذرا شاعری کے لیے ان کے نام کے ساتھ ہی ہم قافیہ لفظ جوڑے جاتے ہیں جیسے حضرتِ عثمانؓ جامع القرآن میں عثمان اور قرآن ہم قافیہ ہیں۔ ان کے ساتھ ایسا جامع القرآن کا لفظ آیا تو اب معلوم ہی یہ ہوا کہ حضرت عثمانؓ ہی جامع القرآن تھے۔ ان سے پہلے دور میں' یعنی رسول اللہ ﷺ کی پوری زندگی میں صحابہ کرام رضی اللہ عنہم میں پہلے دونوں خلفائے راشدین کے زمانے میں قرآن جمع ہی نہیں ہوا تھا۔ اس طرح وہ چیزیں ثابت کرنے کے لیے کہ صاحب! احادیث اس طرح سے کیوں ہوئیں' ان کا کیا اعتبار ہے' اس کا جواب دینے کے لیے انہوں نے کہا کہ طریقہ یہ ہے کہ قرآن کے متعلق ثابت کر دو کہ یہ بھی اسی طریقے سے جمع ہوا ہے۔

یہ اگر قرآن جمع نہیں ہوا تھا تو پھر کونسا قرآن حفظ کیا گیا

اب کہانیاں وضع ہوئیں کہ قرآن کیسے جمع کیا۔ ایک کمیٹی بٹھائی۔ اس میں ان خلفائے راشدین وغیرہ میں سے کوئی شامل نہیں ہے۔ حضرتِ زید ہیں' وہ اپنے ساتھ کچھ لوگ بٹھا لیتے ہیں اور یہ لوگوں سے کہتے ہیں کہ کسی کے پاس کچھ بھی لکھا ہوا ہو تو اسے لے آؤ۔ سوال یہ ہے کہ اس کی ضرورت کیوں پیش آئی۔ ذرا غور فرمائیے جو میں نے کہا ہے کہ یہ لوگ آپس میں دو ٹکڑے بھی نہیں ملاتے۔ کہتے ہیں کہ جنگِ یمامہ میں' جو حضرتِ صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ کے زمانے (632-634AD) میں ہوئی تھی' اس ایک جنگ کے اندر قریباً بعض روایات میں تو بہت زیادہ تعداد ہے لیکن کم از کم یہ کہا گیا ہے کہ ستر قرآن کے حافظ شہید ہو گئے' تو اس پہ حضرتِ عمر رضی اللہ عنہ

(581-644AD) نے یہ تجویز دی تھی کہ اگر حفاظ اس طرح سے ہی شہید ہوتے گئے' یا دنیا سے گزرتے گئے تو قرآن تو کہیں رہے گا نہیں' اِسے کہیں جمع کر لینا چاہیے تو گویا یہ تو ان لوگوں نے لکھ دیا۔لیکن یہ سمجھ میں نہ آیا کہ یہ جو ستر قرآن کے حافظ تھے یہ کیسے بن گئے تھے کیونکہ حافظ تو وہ ہوتا ہے جسے الحمد سے والناس تک پورا قرآن حفظ ہو۔اب ان کی تعداد اتنی تھی کہ ستر تو ایک جنگ میں شہید ہو گئے' جو زندہ بچے ان کی تعداد ہزاروں کی ہوگی' تو کتنے حفاظ تو موجود تھے۔اگر رسول اللہ ﷺ نے قرآن کی کوئی ترتیب ہی نہیں دی تھی تو سوال یہ ہے کہ یہ سارے قرآن کے حفاظ کیسے بن گئے۔پھر یہ بھی روایت میں ہے کہ نبی اکرم ﷺ ہر سال قرآن کو دہرایا کرتے تھے۔اپنے ہاں اور اپنی عمرِ شریف کے آخری سال دو مرتبہ حضور ﷺ نے دہرایا' پھر حجۃ الوداع کے خطبہ کے اندر حضورؐ کا یہ اعلان چلا آرہا ہے کہ میں تم میں' آپ یہاں وہ روایت چھوڑ دیجیے کہ جس میں اختلاف ہے' دو چیزیں چھوڑ چلا ہوں۔بعض دو کہتے ہیں اور بعض کہتے ہیں کہ ایک چھوڑ چلا ہوں۔ایک تو ہر ایک مانتا ہے کہ میں تم میں کتاب اللہ چھوڑ چلا ہوں اور دوسری چیز کچھ بھی ہو۔لیکن یہ تو ہر ایک مانتا ہے کہ ''میں تم میں کتاب اللہ چھوڑ چلا ہوں۔'' حجۃ الوداع میں لاکھوں کے مجمع میں آخری الفاظ دیکھیے : میں تم میں کتاب اللہ چھوڑ چلا ہوں تو کیا کوئی شے کہ کہیں یوں پڑی ہوئی ہو' کہیں دو آیتیں کسی جگہ' چار آیتیں کسی اور جگہ پڑی ہوئی ہوں' اس کو کتاب اللہ کہا جائے گا؟ جب کہ اسی کے متعلق خدا نے کہا ہے۔**ذٰلِکَ الْکِتٰبُ لَا رَیْبَ فِیْهِ** (2:2)۔یہ کتاب وہ ہے جس میں نہ بے یقینی اور تذبذب ہے اور نہ کوئی نفسیاتی الجھن۔آپ سوچیے کہ کیا اس خدا نے بھی ان ہڈیوں اور کھجور کے پتوں کو ہی کتاب کہا ہے۔بہرحال اب قرآن' جو خدا کی کتاب ہے' کے متعلق تو قرآن میں موجود ہے کہ ہم نے اس کو نازل کیا ہے۔**وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ** (15:9)۔ہم اس کے محافظ ہیں' لیکن یہاں وہ کمیٹی جمع ہوتی ہے' بیٹھتی ہے' کمیٹی لوگوں کو بلاتی ہے کوئی ہڈی کا ٹکڑا' کوئی کھجور کا پتہ' کوئی کھال کا ٹکڑا' لا رہے ہیں۔کوئی ایک آیت' کوئی دو آیتیں' پیش کر رہا ہے اور یہ بیٹھے ہوئے' اس طرح سے قرآن کو مرتب کر رہے ہیں کہ جی! وہ دو آیتیں کسی نے دیں' چار آیتیں کسی اور سے ملیں۔بس قرآن جمع ہو گیا۔ **یا للعجب !**

قرآن کی ترتیب میں خدا کے ہاتھ کا سوال

عزیزانِ من! اگلا سوال یہ تھا کہ قرآنِ کریم کی الحمد سے والناس تک ترتیب کہ اس طرح آیات آئیں' اس طرح اس میں سورتیں آئیں' یہ کس نے دی؟ کہا کہ جی! یہ حضرتِ عثمان رضی اللہ عنہ نے کر دیا۔کسی کتاب کی ترتیب کو الٹ دیجیے' آپ دیکھیں گے کہ وہ کتاب' کتاب ہی نہیں رہتی۔میں کسی فرقے کے بارے میں کبھی بھی گفتگو نہیں کیا کرتا لیکن یہ بھی تو آپ میں مشہور ہے کہ قرآنِ کریم جس طرح سے نازل ہوا تھا' رسول اللہ ﷺ نے تو اس طرح سے مرتب کیا تھا۔اس ترتیب کو پھر الٹ دیا گیا۔حضرتِ علی رضی اللہ عنہ (600-661AD) نے تو اس ترتیب کے مطابق قرآن کو جمع و مرتب کیا اور یہ جو مصحفِ عثمانی ہے اس میں یہ ساری ترتیب ہی الٹ دی گئی۔شیعہ حضرات کی صحیح کتاب

الکافی [1] ہے۔اس میں یہ لکھا ہے کہ حضرتِ علی رضی اللہ عنہ (600-661AD) نے اپنا جو مصحف پیش کیا کہ قرآن یہ ہے اور اس شکل میں نازل ہوا تھا تو کسی نے نہیں مانا۔انہوں نے اسی قرآن کو مانا جو حضرتِ عثمان نے دیا تھا تو آپ نے کہا کہ بہت اچھا' تم نہ مانو' میں اس کو محفوظ کیے دیتا ہوں' آخرالامر قیامت کے قریب تو یہ قرآن نکلے گا۔جب قیامت آجائے گی تو......اس قرآن دی لوڑ [2] کی رہ گئی......پھر کیسے ہوا؟ ائمہ کرام [3]

---

[1] اثناعشری جامعین احادیث میں' ثقتہ الاسلام کلینی کو سب سے زیادہ مستند اور معتمد علیہ سمجھا جاتا ہے' ان کی پیدائش مقام رے (موجودہ طہران) میں 250ھ میں ہوئی اور وفات 329ھ میں۔امامیہ شیعہ حضرات کے گیارھویں امام حسن عسکری رضی اللہ عنہ نے 260ھ میں وفات پائی اور ان کے بعد بارھویں امام محمد المنتظر' چار یا پانچ سال کی عمر میں (بغداد کے قریب) سامرا کے غار میں مستور ہو گئے۔ان حقائق کی روشنی میں یہ حقیقت سامنے آجاتی ہے کہ کلینی نے اپنی جمع کردہ روایات' کسی امام سے براہ راست نہیں لیں۔دوسرے راویوں سے حاصل کی ہیں۔شیعہ حضرات کی حدیث کی باقی تین کتابیں' اس سے بعد مدون ہوئی تھیں یعنی من لایحضرہ الفقیہ (شیخ محمد ابن علی۔متوفی 381ھ) اور استبصار (ابوجعفر محمد بن حسن۔متوفی 460ھ)۔الکافی کے متعلق کتاب الشافی (جلد اول) کے مقدمہ میں کہا گیا ہے کہ'' کافی کی سولہ ہزار ایک سو ننانوے احادیث میں صرف پانچ ہزار بہتر صحیح ہیں۔باقی ایک سو چوالیس حسن' ایک ہزار ایک سو سولہ موثق' تین سو دو قوی اور نو ہزار چار سو ضعیف ہیں۔'' اور راقم الحروف کے نزدیک '' معیار حدیث یہ ہے کہ کوئی حدیث جو قرآنِ کریم کے خلاف جاتی ہو' صحیح نہیں ہو سکتی۔[پرویز رحمہ اللہ: شاہکار رسالت......عمر فاروق رضی اللہ عنہ......ادارہ طلوع اسلام' لاہور' 1987' ص ص۔495 -494)۔

[2] اس قرآن کی بھی پھر کیا ضرورت رہی!

[3] ضروری ہے کہ ان حضرات کا شجرہ نسب سامنے آجائے۔جنہیں ائمہ (حاملِ امامت) تسلیم کیا جاتا ہے وہ حسب ذیل ہے:

(۱) حضرت علیؓ (م۔40ھ)

(۲) (امام) حسنؓ (م۔49ھ)

(۳) (امام) حسینؓ (م۔61ھ)

محمد بن حنفیہ

ابو ہاشم

(۴) (امام) زین العابدین (م۔95ھ)

(۵) (امام) باقر (م۔117ھ)

زید

(۶) (امام) جعفر صادق (م۔148ھ)

اسماعیل

(باطنی فدائی' آغا خانی اور بوہرے وغیرہ انہی کی نسبت سے اسماعیلہ کہلاتے ہیں۔ یہ امامت کو اِن کی اولاد میں موروثی تسلیم کرتے ہیں۔)

(۷) (امام) موسیٰ کاظم۔ (م۔182ھ)

(۸) (امام) علی رضا۔ (م۔208ھ)

(۹) (امام) محمد جواد (تقی) (م۔220ھ)

(۱۰) (امام) علی ہادی (نقی) (م۔254ھ)

(۱۱) (امام) حسن عسکری (م۔260ھ)

(۱۲) (امام) محمد (امام غائب)

کے پاس ہی رہا اور آخر میں امام مہدی [1] جو غار میں تشریف رکھتے ہیں وہ ان کے پاس ہے۔ وہ قرآن کو ساتھ لے کر قیامت کے قریب برآمد ہونگے۔ وہ قرآن ہے جو صحیح ترتیب کے ساتھ ہے۔ میں نے گزارش کیا ہے کہ میں آپ کے سامنے اس کا دعویٰ نہیں کر رہا' میں تو واقعات پیش کر رہا ہوں کہ آپ کے ساتھ ہوا کیا ہے۔ چلیے' جنہیں اہلِ سنت والجماعت کہتے ہیں' انہوں نے اس پہ تو اتفاق کرلیا کہ حضرتِ عثمان نے ہی صحیح قرآنِ کریم مرتب کر کے دیدیا' اس قرآن کے متعلق بھی سنیوں کی روایتیں میں پیش کر رہا ہوں' وہ بھی سنیے اور سوچیے کہ معاملہ کیا ہے اور ہمارے ساتھ ہوا کیا ہے؟

سنیوں کی روایات کے مطابق صحائف میں تضاد تھا

سنیوں کے ہاں یہ روایتیں ہیں کہ حضرتِ عثمان رضی اللہ عنہ (573-656AD) نے جو قرآن جمع کیا تھا' وہ خود مدینے کے بہت سے صحائف (یا نسخوں) سے مختلف [2] تھا۔ باہر کے نسخے تو ایک طرف رہے' جو نسخے مدینے میں موجود تھے اس میں بھی غلطیاں رہ گئی تھیں' بعد میں بنی امیہ کے زمانے (661-750AD) میں حجاج بن یوسف [3] نے مصحف عثمان رضی اللہ عنہ میں بہت سی غلطیوں کو درست کیا تھا۔ مروجہ قرآن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یہ حجاج بن یوسف کا تصحیح کردہ ہے۔ علاوہ ازیں خود حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانے (645-656AD) میں مختلف صحابہ کے پاس جو قرآن کے نسخے تھے' ان میں اور مصحف عثمان رضی اللہ عنہ میں متعدد اختلاف تھے۔ آپ سوچیے کہ جس قرآن کی جمع وتدوین کے متعلق اس قسم کے خیالات عام کردیئے جائیں اسلامی محکمیت کہاں باقی رہ سکتی ہے؟ اور اسے بھی نہ بھولیے کہ یہ وہ قرآنِ کریم ہے جس کے متعلق آپ کا یہ ایمان ہے کہ اس کی حفاظت کا ذمہ خود خدا نے لیا تھا۔ ادھر یہ ہے کہ جی' یہ جو آپ نے فرمادیا کہ ان صحابہ رضی اللہ عنہم کے پاس جو نسخے

---

[1] شیعوں کا پہلا فرقہ کیسانیہ ہے جو حضرت علی رضی اللہ عنہ کے بعد ان کے اس بیٹے (محمد بن حنفیہ) کو (جو حضرت فاطمہ رضی اللہ عنہا کے بطن سے نہیں تھے بلکہ ان کی ایک اور بیوی' حنفیہ کے بطن سے تھے) امام مانتا ہے۔ بالفاظ دیگر' اس فرقہ نے فاطمیین کے مقابلہ میں علویین کو ترجیح دی۔ جب ان کے امام (محمد بن حنفیہ) کی وفات ہوگئی تو ان میں سے ایک گروہ نے یہ عقیدہ وضع کیا کہ امام محمد بن حنفیہ مہدی موعود تھے' وہ دراصل مرے نہیں بلکہ لوگوں کی نگاہوں سے غائب ہوگئے عنقریب دنیا میں واپس آئیں گے اور اپنی حکومت روئے زمین پر قائم کریں گے۔ (پرویز رحمہ اللہ: شاہکار رسالت......عمر فاروق رضی اللہ عنہ......ادارہ طلوع اسلام لاہور' 1987' ص ص۔ 475 -474)

[2] جو نسخہ قرآن حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے مرتب فرمایا تھا اس کے متعلق امام ابن ابی داؤد' اپنی تصنیف' کتاب المصاحف میں لکھتے ہیں کہ ''جب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ مصحف سے فارغ ہوگئے اور انہوں نے اُسے دیکھا تو فرمایا کہ تم لوگوں نے بہت اچھا کیا اور خوب کیا۔ مگر مجھے اس میں کچھ غلطیاں نظر آتی ہیں۔ (لیکن کوئی بات نہیں) عرب انہیں اپنی زبانوں سے ٹھیک کرلیں گے۔

[3] حجاج بن یوسف خلیفہ عبدالملک بن مروان کے دورِ خلافت (705ء - 684ء) میں' خلیفہ کا بڑا ہی قابلِ اعتماد جرنیل تھا۔ اس دور کا مورخ اس خلیفہ کی کامیابی کا راز انہی کے ثقہ مشوروں کو قرار دیتا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ خلیفہ عبدالملک بن مروان' جن کا 86 ہجری بمطابق 705ء انتقال ہوا' نے اپنی وفات سے قبل اپنے بیٹے ولید' جو 705ء تا 715ء خلیفہ رہے' کو ان کی عزت وآبرو قائم ودائم رکھنے کے لیے کہا تھا۔

تھے وہ مختلف تھے تو انہوں نے خود اس کے اندر کچھ کر رکھا تھا۔ یہ چیزیں قائم ہیں۔ محض باتیں ہی نہیں ہیں۔

قرآن کا ایک ایک حرف اپنی جگہ پہاڑ کیطرح محکم ہے

عزیزانِ من! میں نے عرض کیا تھا کہ یہ آیت جو میرے پیشِ نظر ہے بڑی ہی اہم ہے۔ کہا کہ **اَلْقَى الشَّيْطٰنُ فِيْٓ اُمْنِيَّتِهٖ** (22:52)۔ اس رسول کی تلاوت میں شیاطین یہ کچھ کر دیا کرتے تھے' اس میں کچھ ڈال دیا کرتے تھے۔ یہاں کہا یہ گیا ہے کہ ہر رسول کے ساتھ یہ ماجرا ہوتا تھا۔ میں آپ کو قرآنِ کریم کے متعلق یہ بتا رہا ہوں کہ روایات کی رو سے اس کے ساتھ کیا گزری' خود قرآن کی رو سے نہیں۔ قرآن کی رو سے تو اس کا ایک ایک حرف پہاڑ کی طرح محکم ہے۔ عزیزانِ من! جس طرح خدا نے یہ نازل کیا' جس ترتیب سے خدا نے رسول اللہ کو اور رسول اللہ ﷺ نے امت کو دیا' وہ حرفاً حرفاً' لفظاً لفظاً' بغیر کسی قسم کی تحریف و اختلاف کے امت کے لیے کتابی صورت میں موجود ہے۔ قیامت تک یہ اسی طرح موجود رہے گا۔ یہ ہے قرآنِ کریم گو کہ اس کے خلاف بے شمار سازشیں ہوتی رہی ہیں۔

خدا تعالیٰ کا فرمان ایک طرف لیکن قرآت کا اختلاف دوسری طرف

یہ جو چیز تھی کہ شیاطین رسول اللہ کی تلاوت میں کچھ ملا دیا کرتے تھے۔ عزیزانِ من! میں آپ کو اس کی روئیداد سنا رہا ہوں۔ میں یہ بات کہہ رہا تھا کہ کیا ان صحابہ کبار رضی اللہ عنہم نے اس میں خود کچھ ملا دیا تھا؟ کہنے لگے معاذ اللہ خود کیسے ملا دیتے؟ پوچھا کہ بھئی! پھر اختلاف کیسے ہے؟ کہنے لگے کہ خدا نے جو قرآن نازل کیا تھا' خود اس میں اختلاف ہے۔ جبکہ خدا نے خود یہ کہا ہے کہ قرآن کے منجانب اللہ ہونے کی ایک دلیل یہ بھی ہے کہ اگر یہ خدا کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا تو اس میں تم کئی اختلاف دیکھتے۔ خود خدا قرآن کے منجانب اللہ ہونے کی یہ دلیل دیتا ہے کہ اس میں کوئی اختلافی بات نہیں۔ مگر انہوں نے کہا کہ خدا ہی نے جو نازل کیا تھا اس میں اختلاف ہے۔

عزیزانِ من! آپ نے ایک لفظ سنا ہوگا۔ وہ ہمارے ہاں مروج ہے کہ اس آیت کی آیت ہوتی ہے۔ اس کو نیچے لکھا جاتا ہے کہ اس آیت کا ترجمہ تو یہ ہے' اس کی تفسیر بھی یہ ہے لیکن حضرتِ ابنِ عباس رضی اللہ عنہ کی قرأت میں یہ یوں آیا ہے۔ آج کل ہمارے ہاں عام طور پہ قاری آتے ہیں' ان کی قرأت ہوتی ہے۔ جب ہم لفظ قرأت سنتے ہیں تو ہمارے ذہنوں میں یہ ہے کہ قرآنِ کریم کے پڑھنے کا جو انداز ہے اُسے قرأت کہتے ہیں اور یہ قرأتیں مختلف ہوتی ہیں۔ ایک حجازی قرأت ہوتی ہے جو بھیروں [1] راگ میں ہوتی ہے۔ ایک مصری قرأت ہوتی ہے جو بھیروی [2] میں ہوتی ہے۔ قرأت میں قرآنِ کریم کو اس طرح سے گا کر پڑھا جاتا ہے۔ جب کوئی اس طرح سے گا کر پڑھتا ہے تو اس کو قرأت کہتے ہیں اور اس طرح پڑھنے والے کو آپ قاری کہتے ہیں مگر جب یہ کہا جاتا ہے کہ (مثلاً) حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ

---

[1] بھیروں۔ چھ راگوں میں سے ایک راگ۔ راگ اصطلاحی طور پر لے یا سُر کو کہتے ہیں۔

[2] بھیروی۔ یا بھرویں۔ ایک راگنی جو صبح کے وقت گائی جاتی ہے۔

کی قرأت میں یوں ہے تو وہ یہ بات نہیں ہوتی۔ عزیزانِ من! اسے پھر سن لیجیے کہ جب یہ آتا ہے کہ حضرتِ ابنِ عباس رضی اللہ عنہ کی قرأت میں یوں آیا ہے تو یہ وہ بات نہیں ہے کہ حضرتِ عمر رضی اللہ عنہ تو اس کو ذرا آآ کر کے پڑھتے تھے اور وہ آآ لمبی آواز سے پڑھتے تھے۔ جی! نہیں۔ ایسا نہیں۔ اس قرأت میں، اس پڑھی جانے والی آیت میں، اور قرآنِ کریم میں، جو ہمارے پاس ہے، الفاظ اور ہوتے ہیں، وہ آیت اور ہوتی ہے۔ جسے ہم مصحفِ عثمانی کہتے ہیں، اس قرآن میں اور وہ جو قرأت کی آیت کہتے ہیں، اس آیت میں فرق ہوتا ہے، آیت کے الفاظ میں فرق ہوتا ہے۔

عربی جاننے والے جانتے ہیں کہ عربی زبان میں جسے ہم اعراب کہتے ہیں، اس کی کتنی بنیادی اہمیت ہوتی ہے۔ وہ اعراب زیر زبر پیش مد شد ہوتے ہیں۔ ہمارے ہاں تو ذرا وہ زیر زبر کے اختلاف سے کوئی لفظ بول دیا جائے تو یہی کہتے ہیں کہ اس کا تلفظ صحیح نہیں ہے، بس اتنی ہی بات ہے، مگر عربی زبان میں تو زمین آسمان کا فرق پڑ جاتا ہے۔ معنی کے اعتبار سے ایک زیر کو زبر سے، یا زبر کو زیر سے، پیش کو زبر سے، بدلتے ہیں تو زمین آسمان کا فرق پڑ جاتا ہے۔ یہ جو اختلافِ قرأت والی آیتیں ہیں، ان میں زیروں اور زبروں کا فرق ہے اور ان زیروں اور زبروں کے فرق سے فرمایا جاتا ہے کہ اس اعتبار سے اس کے معنی یہ ہیں۔ پہلے دوسرے معنی مختلف تھے یعنی اس قرآن کا جو لفظ ہے، وہ جو اس میں اعراب ہیں، ان سے مختلف اعراب والے میں کہا جاتا ہے کہ اس کے معنی اور ہیں۔ یہ آیتیں ایسی ہیں جن کے اندر الفاظ میں فرق ہے۔ شیعہ حضرات نے تو اپنے ہاں بات کو صاف کر لیا۔ الکافی میں تو انہوں نے یہ بات کہہ دی کہ کلینی کی کتاب الکافی کی ہر حدیث کسی نہ کسی امام سے مروی ہے۔ ان کے ائمہ کرام علیہم السلام ہر حدیث کسی نہ کسی امام کی طرف منسوب کرتے ہیں اور اس طرح وہ حدیث ہی وہی مانتے ہیں جو ان کے ائمہ کی طرف سے مروی ہے۔

الکافی کا بیان: آیات میں اختلاف

عزیزانِ من! جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے الکافی وہ مشہور کتاب [1] ہے جو میرے پاس بھی موجود ہے۔ اب تو یہ کتاب چھپی ہوئی بھی مل جاتی ہے۔ اس سے پہلے نہیں ملا کرتی تھی۔ اب اس کا ترجمہ بھی [2] ملتا ہے۔ اس کتاب میں تو بیشمار آیات ہیں جن کے متعلق یہ لکھا ہے کہ حضرتِ امامِ جعفر رحمۃ اللہ علیہ (م۔ 148ھ) نے فرمایا کہ یہ آیت دراصل یوں نازل ہوئی ہے، یہ آیت دراصل یوں نازل [3] ہوئی ہے۔

---

[1] اس کتاب کا پورا نام 'الاصولِ الکافی' اور تالیف ہے ثقۃ الاسلام محمد بن یعقوب بن اسحٰق الکلینی الرازی (متوفی 329ھ) کی۔ اس کتاب کے دو حصے ہیں۔ ایک ہے ''اصولِ کافی'' اور دوسرا ہے ''فروعِ کافی''

[2] اس کا اردو ترجمہ ''حضرت ادیب اعظم' مولانا سید ظفر حسن صاحب امروہوی'' کا ہے جسے شمیم بک ڈپو ناظم آباد کراچی نے کتاب الشافی کے نام سے (1966ء میں) شائع کیا ہے۔ اس میں امامت کو بھی وحی میں شریک کر لیا گیا ہے۔

[3] اس کی تفصیل کے لیے دیکھیے: پرویزؒ: شاہکارِ رسالت......عمر فاروق......ادارہ طلوع اسلام' لاہور' 1989' ص ص۔ 488 - 471۔

ان کے ساتھ تو یہ ہمارے سنی حضرات لٹھم لٹھا ہوتے چلے آ رہے ہیں کہ تم قرآن میں تحریف کے قائل ہو اور خود اپنے ہاں عقیدہ یہ ہے کہ قرأتِ حضرتِ عباس رضی اللہ عنہ میں یوں آیا ہے' مصحفِ عثمانی میں یوں آیا ہے۔ مگر قرأتِ حضرتِ عباس رضی اللہ عنہ کے متعلق یہ نہیں کہتے کہ حضرتِ عباس نے اپنی طرف سے یہ یوں کرلیا۔ عقیدہ یہ ہے کہ یوں بھی نازل ہوا تھا' یوں بھی نازل ہوا تھا۔ ہمارے ہاں ایک کتاب المصاحف ❶ ہے۔ یہ صحاح ستہ میں ابوداؤد رحمۃ اللہ علیہ کی طرف سے ہے۔ وہ چھ جامع احادیث میں سے ایک ہیں۔ انہوں نے کتاب المصاحف بھی مرتب کی ہے' جس میں مختلف قرأتیں گنی گئیں ہیں' جس میں یہ بھی کہا گیا ہے کہ آیات میں بھی اختلاف ہے۔ انہوں نے روایات کے ساتھ وہ آیات بھی جمع کرلیں۔ مستشرقین یورپ کو تو اس قسم کی چیز خدا دے۔ اِن مستشرقین یورپ میں ایک جیفری (Arther Jefery) ہے۔ اس نے اس کتاب ❷ کو Edit (مرتب و مدون کرنا) کیا' انگریزی میں ترجمہ کیا' اور پھر شائع کیا ہے اور اس میں یہ بتایا ہے کہ امام ابوداؤدؒ نے کتاب المصاحف میں صرف اتنے ہی مختلف مصاحف گنائے ہیں جبکہ عزیزانِ من! آپ سمجھتے ہیں کہ قرآن ہی ایک کتابِ مصحف ہے۔ اس کتاب مصحف کے مقابلے میں وہ کتاب المصاحف کو بھی لے آئے۔ اِس کتاب المصاحف میں تو اختصار سے

---

❶ یہ کتاب حافظ ابوبکر عبداللہ ابن ابی داؤد سلیمان بن اشعث سجستانی کی تصنیف ہے۔ اس میں قرآنِ کریم سے متعلق ان تمام روایات کو یکجا جمع کر دیا جس سے ثابت ہو کہ (معاذ اللہ' معاذ اللہ) قرآن کریم میں بھی صحابہ اور تابعین کے زمانے میں کافی اختلافات موجود تھے۔ یہ روایتیں اکثر صحاح ستہ اور دوسری مستند کتب روایات میں منتشر طور پر موجود ہیں جنہیں ابوبکر عبداللہ ابن ابی داؤد نے یکجا جمع کر دیا ہے۔ ان کا سن پیدائش 230ھ اور سن وفات 316ھ ہے۔ آپ حدیث کے مشہور امام ابوداؤد سلیمان ابن اشعث سجستانی (جن کی کتاب سنن داؤد صحاح ستہ میں شمار کی جاتی ہے) کے صاحب زادے ہیں۔ آپ کی کتاب المصاحف علمائے حدیث کے ہاں مستند کتابوں میں شمار کی جاتی ہے چنانچہ اکثر متقدمین کی کتابوں میں اس کتاب کے حوالے ملتے ہیں۔ امام ابن الجزریؒ نے ان کو ثقۃٌ کبیرۃٌ مامونٌ کے الفاظ سے یاد کیا ہے۔ اس کتاب المصاحف سے چند ایک درج ذیل نکات نکلتے ہیں: (۱) قرآن کو حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے جمع نہیں کیا بلکہ حضرت صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے جمع کرا دیا۔ (۲) قرآن صدیق اکبر نے خود جمع کیا اور حضرت زید رضی اللہ عنہ نے نظر ثانی فرمائی۔ (۳) جمع قرآن کا کام صدیق اکبر رضی اللہ عنہ نے نہیں بلکہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ نے شروع کیا اور عثمان رضی اللہ عنہ نے تکمیل کی۔ (۴) قرآن کی کچھ آیات بکری کھا گئی۔ (۵) مروان نے حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا کے صحیفے جلا دیئے۔ (۶) قرآن کی ترتیب حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے قائم کی تھی۔ (۷) قرآن میں غلطیاں رہ گئیں۔ (۸) حضرت عثمان نے جو مصاحف لکھوائے ان میں سے مدینہ منورہ کے تمام مصاحف خود امام یعنی ان کے اپنے مصحف سے مختلف تھے۔ (۹) مختلف شہروں کے لیے جو مصحف لکھے گئے' ان میں باہمی اختلاف تھا۔ (۱۰) حجاج بن یوسف نے مصحف عثمانی میں گیارہ موقعوں پر تبدیلی کی۔ (۱۱) قرآن کے اختلاف' قرأت اور لب و لہجہ کے اختلاف نہیں تھے۔ (۱۲) قرآن بھی روایت بالمعنی ہے۔ وغیرہ...... اس سے صرف یہ بتانا مقصود ہے کہ ہماری کتب احادیث میں خود قرآن کریم کے متعلق کس کس قسم کی روایات موجود ہیں۔ مکمل تفصیل کے لیے دیکھیے طلوع اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ) لاہور کی کتاب مقام حدیث۔

❷ اس کی اس کتاب کا نام ہے: Material for the History of the Text of Quran

کام لیا گیا ہے لیکن جیفری نے جو تفصیل درج کی ہے'اس کی رو سے ان نسخوں میں مختلف فیہ آیات کی تعداد صحابہ کبارؓ [1] کے نام سے دے دی گئی ہے۔جن سے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ یہ وہ آیات ہیں جن میں صحابہ کبار رضی اللہ عنہم میں بھی اختلاف ہے۔

قرأتوں کی کتاب

عزیزانِ من! کتاب المصاحف میں روایات کی سند کے ساتھ یہ بھی کہا گیا ہے کہ جب حضرت عثمانؓ (656-573ء) نے قرآن مجید کا نسخہ مرتب کیا تو مختلف اکابر صحابہ رضی اللہ عنہم کے پاس اپنے اپنے نسخے تھے جن میں بے شمار آیات' ان آیات سے مختلف تھیں جو صحف عثمانیؓ میں درج تھیں۔جب آرتھر جیفری نے اس کتاب المصاحف کو Edit (مرتب و مدون کرنا) کر کے بڑے اہتمام کے ساتھ شائع کیا تو اس کے ساتھ اپنی طرف سے اضافہ کردہ حصہ میں وہ تمام آیات درج کر دیں جو مختلف صحابہ رضی اللہ عنہم کے نسخوں میں تھیں اور جو مصحف عثمانی رضی اللہ عنہ میں درج شدہ آیات سے مختلف تھیں۔اور اس نے اپنے ہاں ان کی تفصیل بھی ساتھ ہی دے دی ہے۔آپ کو یاد ہوگا کہ میری ایک کتاب ہے' جس کا نام ''مقامِ حدیث'' ہے۔اس کے پہلے ایڈیشن میں جنہیں اختلافی قرأتیں کہتے ہیں' ان کو بھی نقل کر دیا تھا لیکن چونکہ بڑی تفصیل تھی' اس لیے اس میں وہ ساری آیات تو نہیں دی گئیں لیکن کتاب المصاحف کا پورا ذکر موجود ہے۔اب آپ آرتھر جیفری کی جمع کردہ روایات کی رو سے جو اختلافات ہیں' ان میں سے ذرا چند ایک سن لیجیے کہ وہ کتنے اختلاف ہیں۔سب سے زیادہ اختلافات حضرتِ ابنِ مسعود رضی اللہ عنہ کے مصحف میں ہیں۔یہ صحابہ کبار رضی اللہ عنہم سے ایک جلیل القدر صحابی رضی اللہ عنہ ہیں مگر صحابہ رضی اللہ عنہم شیعہ حضرات کے نہیں ہیں۔یہ سنی ہیں۔سنیوں کے اس دور میں' تو خیر' یہ کہا ہی نہیں جاتا تھا کہ یہ شیعہ کے صحابی رضی اللہ عنہ ہیں یا سنی کے ہیں لیکن بہرحال یہ بٹوارہ بعد میں ہوا ہے۔تو یہ سنیوں کے صحابہ رضی اللہ عنہم حضرتِ ابن مسعود رضی اللہ عنہما کے مصحف میں مصحفِ عثمانی سے تیرہ سو بائیس جگہ قرأت کا اختلاف آ گیا ہے۔اسے ذہن میں رکھیے گا کہ حضرتِ ابن مسعود رضی اللہ عنہما نے یہ اختلافِ قرأت خود وضع کر کے اس میں نہیں رکھے۔یہ نہیں ہے کہ جن سنگھ' یشونت سنگھ سے اختلافاتِ قرأت رکھے ہیں۔آپ کو یاد ہوگا کہ وہ لاہور میں ہوا کرتے تھے۔یہ سب سے زیادہ قرآن چھاپنے والے تھے۔اس زمانے میں یہی چھاپا کرتے تھے۔تو وہ ٹھیک ہے کہ ان کے چھاپنے کے اندر قرآن میں کچھ غلطیاں بھی ہو جاتی تھیں' یہ بات نہیں ہے کہ اس مصحف میں یہ کتابت کی غلطیاں ہیں۔ان کے مصحف میں یہ لکھا ہے کہ یہ آیتیں نازل ہی اس طرح سے ہوئی تھیں۔تو جب کہا گیا کہ

---

[1] ان صحابہ کبار رضی اللہ عنہم کے نام بمعہ تعداد آیات حسب ذیل ہیں: (۱) حضرت ابن مسعود رضی اللہ عنہ (1322 آیات)' (۲) حضرت ابی بن کعب رضی اللہ عنہ (952 آیات)' (۳) حضرت علی رضی اللہ عنہ (89 آیات)' (۴) حضرت ابن عباس (186 آیات)' (۵) حضرت ابوموسیٰ رضی اللہ عنہ (4 آیات)' (۶) حضرت حفصہ رضی اللہ عنہا (10 آیات)' (۷) حضرت انس بن مالک رضی اللہ عنہ (24 آیات)' (۸) حضرت عمر رضی اللہ عنہ (28 آیات)' (۹) حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہ (10 آیات)' (۱۰) حضرت ابن زبیر رضی اللہ عنہ (34 آیات)' (۱۱) حضرت عمرو بن العاص رضی اللہ عنہ (تعداد معلوم نہیں)' (۱۲) حضرت عائشہ رضی اللہ عنہا (13 آیات)' (۱۳) حضرت سالم رضی اللہ عنہ (2 آیات)' (۱۴) حضرت ام سلمہ رضی اللہ عنہا (14 آیات) اور (۱۵) حضرت عبید ابن عمیر رضی اللہ عنہ (18 آیات)

پھر حضرتِ عثمان رضی اللہ عنہ کے مصحف میں یہ غلطیاں کیوں ہیں، تو کہا کہ جی یہ آیات ویسے بھی نازل ہوئی تھیں۔ اس کے لیے ایک حدیث، ایک روایت یہ مل گئی کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا تھا کہ قرآن سبع الاحرف (سات حرفوں پر) نازل ہوا ہے۔ چل بھئی، سات حرفوں پر نازل ہوا تھا۔ اب سات حرفوں کے معنی یہ ہوگئے کہ اس میں الفاظ مختلف ہیں، اعراب مختلف ہیں، آیتیں مختلف ہیں، تو اب یہ عقیدہ ہو گیا کہ حضرتِ ابنِ مسعود رضی اللہ عنہ نے جو یہ فرمایا کہ ان کے مصحف میں تیرہ سو بائیس جگہ مصحفِ عثمانی رضی اللہ عنہ سے اختلاف ہے تو گویا یہ کہ خدا نے یوں بھی نازل کیا تھا، یوں بھی نازل کیا تھا۔ **یا للعجب** !

ان اختلافات کی نوعیت

عزیزانِ من! میں ابھی عرض کرونگا کہ یوں اور ووں نازل کرنے کے اندر، یونہی نہیں کہ چلو صاحب! یوں نہ سہی یوں سہی۔ یہ تو قرآن کے خلاف گہری سازش ہے۔ کسی شاعر کے شعر کو پڑھتے ہیں۔ بعض وزن ٹھیک رکھتے ہیں، اس میں مطلب بھی ٹھیک رہتا ہے۔ لفظ کا اختلاف ہوتا ہے تو ہو جاتا ہے کہ صاحب ٹھیک ہے اس طرح نہ سہی اس طرح سے سہی۔ مگر قرأتِ قرآن کے معاملہ میں یہ اختلاف اس طرح سے نہیں ہے۔ اس میں احکام کا بھی فرق ہے۔ ابھی میں عرض کرونگا حضرتِ ابی بن کعب رضی اللہ عنہما کے مصحف میں نوسو باون جگہ اختلاف ہے۔ حضرتِ علی رضی اللہ عنہ کے مصحف میں 89 جگہ اختلاف ہے۔ یہ شیعہ حضرات کے ہاں الکافی وغیرہ میں محفوظ ہے، اور شائع کیا ہوا ہے۔ یہ اختلاف 89 جگہ موجود ہے جسے میں اناسی یا نواسی کہا کرتا ہوں۔ کہتے ہیں کہ حضرتِ ابنِ عباس رضی اللہ عنہما کے مصحف میں ایک سو چھیاسی جگہ یہ اختلاف ہے۔ خود حضرتِ حفصہ رضی اللہ عنہا رسول صلی اللہ علیہ وسلم کی ازواجِ مطہرہ نے اور امہات المؤمنین نے یہ اختلاف دس جگہ بتایا ہے۔ حضرتِ انس بن مالک رضی اللہ عنہ کے مصحف میں چوبیس جگہ اختلاف ہے۔ حضرتِ عمر رضی اللہ عنہ کے پاس جو قرآن تھا اس میں اٹھائیس جگہ اختلاف تھا۔ حضرتِ ابنِ زبیرؓ کے مصحف میں چونتیس جگہ اختلاف تھا۔ میں کس کس کا اختلاف گنا تا چلا جاؤں۔

عزیزانِ من! اب یہ سنیے کہ اختلافات کی نوعیت کیا تھی، یہ اختلافات کس قسم کے تھے؟ جب انہیں کہا جاتا ہے تو یہ کہتے ہیں کہ صاحب! نہیں بات یہ نہیں تھی۔ یہ اس قسم کا اختلاف تھا، جیسے لاہوری سے بات کریں تو وہ چڑیا کو چریا ہی کہتا ہے۔ تو یہ اصل میں ایسا اختلاف ہی تھا۔ یہ حضرتِ عثمان رضی اللہ عنہ کے مصحف میں چڑیا لکھی گئی تھی اور حضرتِ ابنِ عباس رضی اللہ عنہما کے مصحف میں چریا لکھی گئی تھی تو کچھ فرق نہیں ہوا۔ اور عربوں کے مختلف قبائل تھے چونکہ ان قبائل کے اس قسم میں فرق ہوتا تھا تو اللہ تعالیٰ نے ان مختلف قبائل کی زبان میں بیک وقت اتنے قرآن نازل کر دیئے۔ اولاہوریو! اے تہاڈے لئی اے۔ اے ملتان والیو! تم سبحان اللہ۔ اسی جالندھر والے ہیں، جی اچھا جی ایناں نو دیدیو۔ (1) عزیزانِ من! ہنسیے نہیں۔ آپ کو معلوم نہیں کہ میرا کلیجہ کس طرح سے خون روتا ہے۔ جب میں یہ چیزیں بیان کرتا

---

(1) اے اہلِ لاہور! یہ تمہارے لیے ہے۔ اے ساکنانِ ملتان! یہ تم لو سبحان اللہ۔ اسی طرح جالندھر والے ہیں کہ جی! انہیں بھی یہ دے دو۔

ہوں تو کلیجہ شق ہوجاتا ہے۔ بہت اچھا جی' ان کے مختلف قبائل تھے۔ میں یہ عرض کردوں کہ قرآن **بِلِسَانٍ عربی مبین** نازل کیا ہے۔ قرآن کے متعلق یہاں لسان ہی کہا ہے' السنہ نہیں کہا۔ عربی مبین کی زبان میں قرآن نازل ہوا اور یہ خود مانتے ہیں کہ عربی مبین قریش کی زبان تھی۔ میں جو روایت پیش کررہا ہوں جس میں یہ دونوں صحابی رضی اللہ عنہما مکے کے ہیں' قریشی ہیں' عربی مبین جاننے والے ہیں۔ یہ نہیں کہ ان میں سے ایک مکے والا قریشی لاہوری تھا اور دوسرا ان میں سے ملتانی تھا اور ان میں یہ جھگڑا ہوگیا۔ کہ توں کس طرح پڑھنا اے تے توں کس طرح پڑھنا اے۔ ❶

متضاد شکل میں آیات کا نزول بخاری کی روایات کے تحت رسولِ خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی گواہی

ذرا اختلاف کی ایک روایت سن لیجیے۔ مکے کے رہنے والے دو قریشی صحابہ رضی اللہ عنہم تھے۔ تو ان کی تو زبان ایک ہی تھی۔ یہ روایت کتاب المصاحف میں بھی ہے اور صحیح بخاری میں بھی یہ روایت ہے۔ کہتے ہیں کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ فرماتے ہیں کہ میں نے ہشام بن حکیم ابن حزام کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں سورۃ فرقان پڑھتے ہوئے سنا۔ میں نے ان کا پڑھنا سنا تو وہ بہت سارے ایسے الفاظ پڑھ رہے تھے' جو مجھے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے نہیں پڑھائے تھے' وہ ایسے الفاظ پڑھ رہے تھے۔ قریب تھا کہ میں نماز ہی میں ان پر حملہ کر بیٹھوں مگر میں نے بمشکل صبر کیا حتیٰ کہ انہوں نے سلام پھیرا تو میں نے انہیں انہی کی چادر میں کس لیا۔ اور میں نے ان سے پوچھا کہ یہ سورۃ جو میں نے تمہیں پڑھتے ہوئے سنا ہے' تمہیں کس نے پڑھائی ہے؟ انہوں نے کہا کہ مجھے تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے پڑھائی۔ میں نے کہا تو جھوٹ بولتا ہے کیونکہ رسول اللہؐ نے خود مجھے اس کے خلاف پڑھائی ہے جو تُو پڑھ رہا تھا۔ میں اسے کھینچتا ہوا رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے پاس لے گیا اور میں نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے کہا کہ میں نے اس کو سورۃ فرقان کو ایسے الفاظ میں پڑھتے ہوئے سنا ہے جو آپ صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے نہیں پڑھائے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ انہیں چھوڑ دو اور ہشام سے کہا کہ پھر پڑھو چنانچہ اس نے اسی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے سامنے پڑھ دیا جیسا کہ میں نے پڑھتے ہوئے سنا تھا۔ عزیزانِ من! حضرت عمر رضی اللہ عنہ یہ فرما رہے ہیں۔ اس پر رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یہ سورۃ یونہی تو نازل ہوئی ہے۔ پھر فرمایا کہ عمر رضی اللہ عنہ! اب تم پڑھو۔ چنانچہ جس طرح حضور صلی اللہ علیہ وسلم نے مجھے پڑھائی تھی' میں نے پڑھ کر سنائی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا کہ یوں بھی نازل ہوئی ہے۔ یہ بخاری شریف کی حدیث ہے جو اصح الکتب بعد کتاب اللہ ہے۔

بخاری شریف کے مطابق قرآن سات زبانوں میں نازل ہوا تھا

عزیزانِ من! متذکرہ بالا حدیث بخاری شریف کی دوسری جلد کی ہے۔ اس میں یہ حدیث موجود ہے۔ یہ مشہور ہے کہ اس میں یوں

---

❷ کہ تم کس طرح پڑھتے ہو اور تم اسے کس طرح پڑھتے ہو۔

بھی نازل ہوئی ہے اور اسکے بعد آپ ﷺ نے فرمایا کہ تم دونوں آپس میں جھگڑ رہے ہو مگر قرآن سات حرفوں پر نازل ہوا ہے۔ لہٰذا جس طرح آسان ہو پڑھ لیا کرو۔ قرآن سات حرفوں پر نازل ہوا ہے۔ کیا اتنی بات ہی ختم کر دوں؟ نہیں بات آگے چلے گی۔ میں اس اختلافِ قرأت کی صرف دو مثالیں پیش کرنا چاہتا ہوں۔ میں یہ عرض کروں کہ انہیں آج بھی مانا جاتا ہے۔ یہ مختلف قرأتیں قرآن کی آیتوں کے اختلافات ہیں۔ ایک طرف موجودہ قرآن کی آیت نقل کی جاتی ہے، معنی بتائے جاتے ہیں، مفہوم، تفسیر بتائی جاتی ہے، اس کے ساتھ کہا جاتا ہے کہ مثلاً حضرتِ ابن عباس رضی اللہ عنہما یا فلاں صحابہ رضی اللہ عنہم کی قرأت میں یوں بھی آیا ہے اس لیے اس کے یہی معنی ہو سکتے ہیں۔ یعنی وہ بات ابھی تک ان کے ہاں مسلمہ ہے کہ یہ قرآن سات قرأتوں کے، سات مختلف طریقوں سے، سات اختلافات کے ساتھ نازل ہوا ہے۔ **یا للعجب!**

شیعہ اور سنی حضرات کے مابین متعہ کا مسئلہ

عزیزانِ من! آج بھی شیعہ اور سنی حضرات میں بنیادی مسئلہ متعہ کا ہے۔ سنی حضرات نکاح کو دائمی عقد یا معاہدہ مانتے ہیں جو موت یا طلاق کے ذریعے ہی ختم ہوتا ہے ورنہ اس میں مدت کا تعین نہیں ہے۔ فریقین اپنی پوری زندگی بسر کرنے کے لیے ایک معاہدہ کرتے ہیں، وہ معاہدہ وقتی نہیں ہوتا جب کہ شیعہ حضرات یہ مانتے ہیں کہ نہیں، یہ معاہدہ وقتی طور پہ بھی ہو سکتا ہے، یہ صرف ایک وقت کے لیے ہی ہوا کرتا ہے۔ میری بیٹیاں معاف رکھیں، اسے متعہ کہا جاتا ہے۔ یہ ایک مدتِ متعین کے لیے ہے۔ سنی حضرات اس متعہ کو ناجائز بلکہ اسے حرام تک کہتے ہیں۔ وہ اسے زنا شمار کرتے ہیں۔ ان دونوں فرقوں میں یہ چیز وجہ نزاع چلی آ رہی ہے۔ میں سنیوں کی بات عرض کرتا ہوں، شیعوں کی نہیں۔ سورۃ نسآء کی یہ آیت ہے۔ **وَاُحِلَّ لَكُمْ مَّا وَرَآءَ ذٰلِكُمْ اَنْ تَبْتَغُوْا بِاَمْوَالِكُمْ مُّحْصِنِيْنَ غَيْرَ مُسٰفِحِيْنَ** (4:24)۔ اور جو اس کے سوا ہیں وہ تمہارے لیے حلال ہیں، اس طرح کہ تم ان کو اپنے مالوں کے ساتھ چاہو نکاح میں لا کر، نہ کہ شہوت رانی کرتے ہوئے۔ سو تم ان میں سے جس کے ساتھ نفع اٹھانا چاہو تو انہیں ان کے مقرر کردہ مہر دے دو۔ عزیزانِ من! جن جن سے نکاح حرام ہے انکی فہرست دینے کے بعد قرآن نے یہ کہا ہے کہ ان کے علاوہ باقی عورتوں کے ساتھ تمہارا نکاح حلال ہے بشرطیکہ تم ان کا مہر ادا کر دو اور اپنی شہوت رانی تمہارا مقصد نہ ہو۔ میں تفصیل میں نہیں جانا چاہتا۔ یہاں یہ کہا ہے کہ ان سے محض اپنی شہوت رانی تمہارا مقصد نہ ہو بلکہ ازدواجی زندگی، Home Life، بسر کرنا ہونا چاہیے۔ تو پھر تم ان سے تمتع یعنی فائدہ اٹھا سکتے ہو اور یہ کچھ کرنے کے لیے اس طریق سے عہد ہو، معاہدہ ہو، Marriage (شادی) ہو، یہ سب کچھ ازدواجی زندگی بسر کرنے کے لیے ہو، محض شہوت رانی کی تسکین کے لیے نہیں۔

ازدواجی زندگی عمر بھر کا معاہدہ ہے۔ یہ ایک ایسا معاہدہ ہے جو موت یا طلاق سے ٹوٹے گا۔ یہ تو ہوئی قرآن کی آیت۔ سنیوں کے ہاں اس معاہدہ کا نام نکاح ہے جو مہر ادا کر کے، دائمی طور پر کیا جاتا ہے اور جو موت یا طلاق سے فسخ ہو سکتا ہے۔ اس کے برعکس شیعہ حضرات

متعہ کے قائل ہیں جس میں ایک مرد اور ایک عورت ایک مدت معینہ کے لیے مباشرت کا معاملہ طے کر لیتے ہیں اور اس کے لیے اس عورت کا جنسی تعلق کا معاوضہ دے دیا جاتا ہے۔ سنیوں کے ہاں متعہ حرام ہے۔ اب یہ آیت لکھنے کے بعد کہا جاتا ہے کہ حضرت عبداللہ ابنِ عباس رضی اللہ عنہ' جو سنیوں کے جلیل القدر صحابی ہیں' ان کی قرأت میں یا ان کے مصحف میں یہ آیت یوں آئی ہے: **فَاسْتَمْتَعْتُمْ بِهٖ مِنْهُنَّ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى** تم عورتوں سے متعہ کرو ایک معیاد مقرر کے لیے' ان سے ایک مدت معینہ کے لیے فائدہ اٹھاؤ۔ عزیزانِ من! یہ ان کی قرأت میں یوں آیا ہے کہ تم ان سے ایک معینہ مدت کے لیے یہ کچھ کام کر لیا کرو یعنی اس قرأت کی رو سے قرآنی آیت میں **اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى** کا اضافہ کیا گیا ہے اسی سے تو متعہ کی سند مل جاتی ہے۔ اب سنی حضرات کے حضرتِ ابنِ عباس رضی اللہ عنہ[1] صحابی ہیں۔ ان کا مصحف یا قرأت ہے۔ اس میں اس کو تسلیم کیا جاتا ہے کہ خدا نے یہ آیت اس طرح سے بھی نازل کی تھی۔ ان سے پوچھیے کہ پھر آپ کی شیعہ حضرات سے بحث کس قسم کی ہے۔ کوئی یہ جرأت نہیں کرے گا کہ یہ کیا فرق ہوا یا اس کی ابنِ عباسؓ کی یہ روایت جھوٹی ہے' وضعی ہے' غلط ہے' ہم اسے تسلیم نہیں کرتے مگر اس کے باوجود اسے Quote (حوالہ دینا) کیا جاتا ہے کہ قرأتِ حضرت ابن عباسؓ میں یہ یوں بھی آیا ہے۔

قرأت سے مراد قرآن کا لہجہ نہیں بلکہ عبارت کا اختلاف ہے

عزیزانِ من! آپ نے غور فرمایا کہ اس اختلافِ قرأت کے معنی کیا ہیں' مفہوم کیا ہے۔ اس کے معنی و مفہوم قرآن کا لہجہ نہیں ہے' عبارت کا اختلاف ہے اور اختلاف بھی اس قسم کا ہے کہ اس قرآن میں یہ اضافہ ہے۔ ایک دوسرا مسئلہ' شیعوں اور سنیوں کے درمیان' وضو

---

[1] آپ دیکھیے کہ اس اضافے کے متعلق حضرت عبداللہ ابن عباس رضی اللہ عنہما کیا فرماتے ہیں۔ سنیوں کی سب سے زیادہ قابل اعتماد تفسیر' تفسیر طبری ہے۔ وہ اس میں آیت کی تفسیر میں یوں لکھتے ہیں۔ ''ابونضرہ کی روایت ہے کہ میں نے ابن عباسؓ سے متعہ کے متعلق دریافت کیا۔ انہوں نے کہا کہ کیا تم سورۂ نساء کی تلاوت نہیں کرتے۔ میں نے کہا: کیوں نہیں۔ کہا: پھر اس میں یہ آیت نہیں پڑھا کرتے کہ ''فَاسْتَمْتَعْتُمْ بِهٖ مِنْهُنَّ اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى۔'' میں نے کہا: نہیں' میں اگر اس طرح پڑھتا ہوتا تو آپ سے دریافت کیوں کرتا۔ انہوں نے کہا: اچھا' تمہیں معلوم ہونا چاہیے کہ اصلی آیت یونہی ہے۔ عبدالعلی کی روایت میں بھی ابونضرہ سے اس طرح کا واقعہ منقول ہے۔ تیسری روایت میں بھی ابونضرہ سے نقل ہے کہ میں نے ابن عباس رضی اللہ عنہ کے سامنے یہ آیت پڑھی: فَاسْتَمْتَعْتُمْ بِهٖ مِنْهُنَّ ابن عباس رضی اللہ عنہ نے کہا: اِلٰٓى اَجَلٍ مُّسَمًّى۔ میں نے کہا کہ میں اس طرح نہیں پڑھتا۔ انہوں نے تین مرتبہ کہا: ''خدا کی قسم! خدا نے اسی طرح نازل کیا ہے۔'' اسے کہتے ہیں اختلافِ قرأت۔ یعنی روایات کی رو سے حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ (اور دیگر صحابہ رضی اللہ عنہم) کا دعویٰ تھا کہ وہ آیات اسی طرح نازل ہوئی تھیں جس طرح ان کے صحیفوں میں درج ہیں' نہ اس طرح جس طرح وہ مصحف عثمانی میں مذکور ہیں۔ کہا جائے گا کہ اس ساری ''سازش'' کا مدار ''کتاب المصاحف'' ہے' اسے کس طرح مستند تسلیم کیا جاتا ہے؟ لیکن صاحب کتاب المصاحف نے اپنی کتاب میں اپنی طرف سے کچھ نہیں لکھا۔ انہوں نے اختلاف قرأت سے متعلقہ روایات کو کتب احادیث سے اکٹھا کر کے یک جا مرتب کر دیا ہے۔ اور یہ کتب احادیث وہ ہیں جنہیں ہمارے ہاں صحیح تسلیم کیا جاتا ہے اور سب سے بڑی سند یہ ہے کہ یہ ہمارے علماء کرام اس ''اختلاف قرأت'' کے قائل ہیں۔ ان نکات کی مزید تفاصیل کے لیے دیکھیے: مقام حدیث' طلوع اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ)' لاہور' 2001' ص ص۔ 190 -167۔

میں پاؤں دھونے یا مسح کرنے کا ہے۔شیعہ حضرات پاؤں پہ مسح کرتے ہیں اور سنی حضرات پاؤں دھوتے ہیں اور ہزار برس سے یہ سنی ان شیعہ حضرات کے ساتھ مناظرے کرتے چلے آ رہے ہیں۔قرآنِ کریم میں جہاں وضو کے احکام آئے ہیں' وہاں ہے کہ **یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اِذَا قُمْتُمْ اِلَى الصَّلٰوةِ فَاغْسِلُوْا وُجُوْهَكُمْ وَاَیْدِیَكُمْ اِلَى الْمَرَافِقِ وَامْسَحُوْا بِرُءُوْسِكُمْ وَاَرْجُلَكُمْ اِلَى الْكَعْبَیْنِ** (5:6)۔اے ایمان والو! جب تم صلوٰۃ کے لیے کھڑے ہو(یعنی عزم صلوٰۃ کرو) تو تم اپنا منہ اور اپنے ہاتھ کہنیوں تک دھو لیا کرو اور اپنا سر پونچھ لیا کرو اور پاؤں کو ٹخنوں تک دھو لیا کرو۔اب یہ بات تھوڑی سی عربی جاننے والے بھی جانتے ہیں زبر اور زیر کے فرق سے معنی بدل جاتے ہیں۔یہ کہتے ہیں کہ اس آیت کے لفظ **وَاَرْجُلَكُمْ** کی دو قرأتیں متواتر ہیں: نافع' ابن عامر' حفص' کسائی اور یعقوب کی قرأت **وَاَرْجُلَكُمْ** (بفتح لام) ہے اور ابن کثیر' حمزہ' ابوعمرو اور عاصم کی قرأت **وَاَرْجُلِكُمْ** (بکسر لام) ہے۔یہ اعراب کا فرق ہے۔میں نے کہا تھا کہ وہاں **وَاَرْجُلِكُمْ** میں لام پر زیر ہے' اور **وَاَرْجُلَكُمْ** میں لام پر زبر ہے' یہ لام زبر کے ساتھ ہے۔موجودہ قرآنِ کریم میں اسی طرح سے زبر کے ساتھ ہے۔اس کے معنی پاؤں دھونے کے ہو جاتے ہیں۔اگر یہ لام زیر کے ساتھ ہو جائے تو اس کے معنی مسح کرنے کے ہو جائیں گے تو سنیوں کے ہاں جو قرآن موجود ہے اس میں **وَاَرْجُلَكُمْ** ہے۔یعنی لام پر زبر ہے۔اس میں تو یہی کچھ ہے۔

قرأت کے متعلق مودودی رحمہ اللہ کا فرمان

عزیزانِ من! مودودی [1] صاحب فرماتے ہیں اور ان کے لیے تو یہ بڑا ضروری بھی ہے' بڑا ہی ضروری ہے کہ دونوں (شیعہ اور سنی حضرات) سے ناراضگی نہ مول لی جائے۔ان سے Concensus (اتفاقِ رائے) حاصل کیا جائے۔وہ یہ ساری بات کہا کرتے ہیں کہ یہ پاؤں دھونا ہے۔ان کا یہ جواب سب کو معلوم ہے کہ سنی حضرات وضو میں پاؤں دھوتے ہیں اور شیعہ حضرات پاؤں پر مسح کرتے ہیں۔ ایک صاحب نے سید ابوالاعلیٰ مودودی صاحب (1978 -1903) سے دریافت کیا کہ ان میں سے کون سا طریقہ قرآن کے مطابق ہے۔ ان کا جواب ترجمان القرآن بابت فروری 1959 میں شائع ہوا۔اس میں وہ لکھتے ہیں پہلے تو یہ سمجھیے کہ وارجلکم کی دو قرأتیں متواتر منقول ہوئی ہیں اور اس کے بعد لکھتے ہیں کہ اس لفظ **اَرْجُلَكُمْ** میں **اَرْجُلَكُمْ** (بفتح لام) بھی ہے اور **اَرْجُلِكُمْ** بکسر لام بھی ہے۔یوں بفتح لام بھی قرآن میں نازل ہوا یوں بکسر لام بھی قرآن میں نازل ہوا۔لہٰذا پاؤں دھونا بھی ہو گیا اور قرآن کی رو سے پاؤں پہ مسح کرنا بھی ہو گیا۔وقت نہیں' عزیزانِ من! کہ میں آپ کو اور مثالیں بھی دوں۔میں نے عرض کیا ہے کہ وہ تو تیرہ سو بائیس (1322) مختلف فیہ

---

[1] سید ابوالاعلیٰ مودودی رحمہ اللہ (1978 -1903)

آیات ہیں جو صرف ایک حضرتِ ابن مسعودؓ کے مصحف میں ہیں۔ میں آپ کو کتنی مثالیں اور دوں لیکن مودودی صاحب نے بھی یہ نہیں بتایا کہ اس کے بعد لام (ل) کے زیر والی قرأت کا کیا بنے گا جو اسی طرح متواتر اور مستند ہے جس طرح لام (ل) کے زبر والی قرأت۔ بات یہیں ختم نہیں ہو جاتی۔ قرآن کریم کے خلاف عجم کی یہ سازش دور تک جاتی ہے۔ اب آپ ہی بتائیے کہ آیات الٰہی کا نگہبان کدھر جائے؟

حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے چھ زبانوں والے قرآن جلوا دیئے: کیوں؟

عزیزانِ من! وہ جو کہتے ہیں کہ یہاں سرہی غائب ہے گریباں سے' مودودی صاحب نے پھر قصہ ہی ختم کر دیا۔ آپ کو معلوم ہے کہ انہوں نے یہ بیان دیا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے قرآن کو سات قرأتوں میں نازل کیا' سات زبانوں میں نازل کیا۔ یہ ان کے الفاظ ہیں کہ قرآن سات زبانوں میں نازل کیا' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اسے سات زبانوں میں صحابہ رضی اللہ عنہم کو دیا' حضرتِ عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانے تک جو قرآن تھے وہ انہی سات زبانوں میں محفوظ رہے۔ سنیئے' حضرتِ عثمان رضی اللہ عنہ نے اپنی مرضی کے مطابق ان میں سے چھ زبانوں والے قرآن جلوا دیئے اور صرف ایک زبان والا باقی رکھا جو ہمارے پاس ہے۔ چل بھئی! دیجیے جواب مستشرقین کو' اور اس کے بعد کرتے رہیے بحث قرآن پر۔ عزیزانِ من! مجھے ان مستشرقین سے کوئی عداوت نہیں۔ میں تو اپنے ہاں کے ان علمائے کرام سے پوچھتا ہوں کہ مسئلے پر تو یہ کچھ کرتے ہیں اور اِدھر یہ ایک شخص ہے کہ سات زبانوں میں قرآن نازل ہوا' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے اس کو صحابہ رضی اللہ عنہم میں دیا' یہ موجود رہا۔ حضرت عثمان رضی اللہ عنہ نے اپنی مرضی سے چھ کو جلا دیا' ایک باقی رکھا' حالانکہ اس کے لیے نہ خدا نے کوئی حکم دیا تھا' نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے کہا۔ یہ حضرات ان سب باتوں کو سن رہے ہیں مگر ایک لفظ بھی اس بات کے خلاف نہیں ہے۔ صرف یہی ایک بدبخت ہے [1] کہ جس نے اس بات کے خلاف یہ کچھ کہنے کی جرأت کی ہے۔ اِس پر ان علماء حضرات نے کفر کے فتوے لگا دیئے کیونکہ میں نے کہا یہ تھا کہ یہ قرآن خدا نے دیا ہے۔ اس کے متعلق ہمارا ایمان ہے کہ یہ لفظاً لفظاً' حرفاً حرفاً ''الحمد'' سے ''والناس'' تک بعینہ وہی ہے جسے اللہ تعالیٰ نے رسول اللہ علیہ وسلم پر وحی کیا اور جسے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے امت کو دیا۔ لیکن ان کے ہاتھ قرآن تک بھی جا پہنچے۔ اس چیز کا کیا ثبوت ہے کہ یہ جو چھ جلوا دیئے تھے ان میں کیا کچھ تھا۔ کیا حق تھا حضرتِ عثمان رضی اللہ عنہ کو کہ وہ یہ کچھ کرتے؟ معاذ اللہ' معاذ اللہ امت مسلمہ کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم یہ کہہ رہے ہیں کہ میں اس قرآن کو نہیں بدل سکتا' میں اس قرآن کی جگہ کوئی دوسرا قرآن نہیں لا سکتا۔ نہ خدا نے اس کے منسوخ کرنے کا حکم دیا تھا' نہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ایسا کہا تھا۔ مگر یہ ہیں کہ کہہ رہے ہیں کہ اس قرآنِ کریم کو جلوا دیا تھا۔ آج باقی عالمِ اسلام کو یہ کچھ کہا جا رہا ہے۔ یہ کچھ میں نہیں کہہ رہا۔ یہ ملتان کے اندر' آپ کے پاکستان کے اندر' یہ علمائے کرام یہ کچھ کہہ رہے ہیں۔ اس کی تردید اسی بدبخت کے حصے میں آئی ہے لیکن اس کے جواب میں تو انہوں نے کہا ہے کہ یہ شخص منکرِ حدیث ہے۔ ہر منبر و محراب سے پرویز منکرِ حدیث ہے کی

---

[1] یہ اشارہ پرویزؒ مرحوم کا اپنی ہی طرف ہے۔

آواز آ رہی ہے اور یہ کہ پرویز یہ کہتا ہے۔

نبوتِ باطلہ کا دعویٰ اور مطالبہ

عزیزانِ من! خدا کے لیے اپنی جرأتیں اتنی بیباک نہ کریں۔ میں تو آگے جا کے بتاؤنگا کہ رسول اللہ ﷺ کے سامنے یہ شخص [1] کیا کہتا ہے۔قرآن کے متعلق یہ لکھا ہے۔ میں صرف اس کی ایک مثال دوں گا اور یہ جو آپ کے اس دور میں نبوتِ باطلہ قادیان [2] کی اٹھی' اسے اختلاف قرأت سے سہارا ملا۔ حضرت ابن عباسؓ کی قرأت میں یہ آیا ہے کہ یہ جو آیت ہے۔ **وَمَآ اَرۡسَلۡنَا مِنۡ قَبۡلِکَ مِنۡ رَّسُوۡلٍ وَّلَا نَبِیٍّ اِلَّاۤ اِذَا تَمَنّٰۤی** (22:52)۔خدا نے سارے قرآن میں رسول اور نبی کا لفظ استعمال کیا ہے انبیائے کرام' جو خدا کی طرف سے وحی لاتے تھے' ان کے لیے قرآنِ کریم میں رسول یا نبی کے لفظ استعمال ہوئے۔ان الفاظ کے علاوہ کوئی اور لفظ نہیں آئے مگر حضرتِ ابنِ عباسؓ کی قرأت میں یہ آیا ہے کہ اصل میں یہ آیت یوں تھی: **وَمَآ اَرۡسَلۡنَا مِنۡ قَبۡلِکَ مِنۡ رَّسُوۡلٍ وَّلَا نَبِیٍّ وَلَا مُحَدَثٍ** اس میں محدث کا لفظ ہے اور دال کی زبر کے ساتھ ہے۔مُحدِّث زیر کے ساتھ حدیث بیان کرنے والے کو کہتے ہیں۔ اس قرأت کے مطابق محدَّث خدا کے طرف سے ہے کہ جس طرح رسول اور نبی ہے اسی طرح اس کے بعد محدَّث کا لفظ لیا ہے۔ یہ خدا کی طرف سے آیا کرتے تھے۔ یہ قرأت حضرتِ ابنِ عباس میں ہے۔اور اس قرأت میں یہ کہا گیا ہے۔اس نبوت باطلہ قادیان [2] نے اپنے دعوے کی تائید میں یہ قرأت پیش کردی اور کہا کہ اس کی رو سے مجھے تم رسول اور نبی نہ بھی مانو تو بھی خدا کی طرف سے بھیجا ہوا محدَّث تو مان لو گے۔ بات تو مامور من اللہ ہونے کی ہے' بات خدا کی طرف سے بھیجا ہوا' ہونے کی ہے۔ چلیے' خود قرآن ہی کے متعلق یہ اعلان ہوا کہ وہ بھی محفوظ شکل میں امت کو نہیں ملا تھا۔ جب حالت یہاں تک پہنچ جائے تو عزیزانِ من! آپ ہی بتائیے کہ آیات الٰہی کا نگہبان کدھر جائے؟

حضرت ابنِ عباس رضی اللہ عنہ کی قرأت کی بنیاد پر مرزا صاحب کا پہلا دعویٰ

عزیزانِ من! حضرت ابن عباس رضی اللہ عنہ کی قرأت کی بنیاد پر مرزا غلام احمد قادیانی (1835-1908) نے جو پہلا دعویٰ کیا تھا وہ محدَّث ہونے کا کیا تھا اور اس دعوے کی دلیل یہ دی تھی کہ اس آیت میں رسول اور نبی یہی دو لفظ نہیں ہیں' حضرتِ ابنِ عباس رضی اللہ عنہ کی قرأت کی رو سے اس میں محدث کا لفظ بھی ہے۔ آیت یوں ہے اور یہ جو چیز ہے کہ یہ آیت یوں ہے یہ شیعہ حضرات کی کتاب الکافی میں بھی ہے لیکن اگر آپ ان کا ریفرنس [3] یا حوالہ دیں گے تو سنی حضرات تو اسے قبول نہیں کریں گے۔ سنیوں کے ہاں حضرتِ ابنِ عباس رضی اللہ عنہ کی قرأت

---

[1] سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ (1978 -1903)

[2] مرزا غلام احمد قادیانی (1908 -1835)

[3] دیکھیے' مولانا سید ظفر حسن امروہوی: کتاب الشافی جلد اول' شمیم بک ڈپو' ناظم آباد' کراچی' 1966' ص ص۔ 281 -204 -203 '176۔

میں بھی یہی ہے تو کیا جواب دیں گے؟ کہا کہ یہ تو مانو گے۔ جب یہ مان لیا تو مَا اَرۡسَلۡنَا جو ہے یعنی ہم نے بھیجے۔ کون کون بھیجے؟ رسول بھیجے' نبی بھیجے' محدث بھیجے۔ تو میرے منجانب اللہ آنے کے اختلافات پہ کیا اعتراض ہے۔ میں تو صرف محدث کا دعویٰ کرتا ہوں اور رسول اللہ ﷺ تو خاتم النبین ﷺ تھے۔ صرف خاتم المحد ثین تو کہیں نہیں لکھا ہوا۔

ختم نبوت کے سلسلہ میں مقدمہ بہاولپور کا فیصلہ

عزیزانِ من! ختم النبوت کے مسئلہ پر مقدمہٗ بہاولپور (35-1926ء) کے فاضل مجسٹریٹ [1] (محمد اکبر ڈسٹرکٹ جج بہاول نگر) نے 7 فروری 1935ء کو اس فیصلے میں لکھا تھا کہ مسئلہ ختم نبوت پر نو برس (35-1926ء) تک بحث ہوتی رہی اور میں کسی نتیجے پہ نہ پہنچ سکا۔ اس کے بعد اس نے لکھا کہ نتیجے پہ پہنچا تو وہ ایک شخص کا ایک مضمون بعنوان میکانکی اسلام از جناب چودھری غلام احمد صاحب پرویز تھا۔ اس کا نام لکھتے ہوئے وہ مجسٹریٹ لکھتا ہے کہ وہ غلام احمد پرویز کا ایک مضمون تھا جس سے یہ بات مجھ پہ منکشف ہوگئی کہ نبی کسے کہتے ہیں اور اس کی رو سے مجھ پہ یہ حقیقت منکشف ہوئی کہ حضور ﷺ کے بعد اس قسم کا کوئی دعویٰ کرنے والا جو بھی ہے' وہ اسلام کے دائرے سے خارج ہے' اور جو ایسے شخص کو مسلمان مانتا ہے' وہ خود اسلام کے دائرے سے خارج ہے۔ اس نے یہ فیصلہ 7 فروری 1935ء کو دیا تھا۔ سوال یہ ہے کہ وہاں نو برس (35-1926ء) تک یہ بات کیوں صاف نہ ہوئی؟ وہ کیا چیز تھی جس کی بنا پہ وہ بات میرے ایک مضمون سے ثابت ہوئی؟ یہ وہی چیز تھی' عزیزانِ من! جس بنا پہ مجھے کافر کہا جا رہا ہے۔ میں نے کہا یہ تھا کہ قرآنِ کریم نے صرف رسول اور نبی کہا ہے۔ خدا نے کہا ہے کہ ہم صرف رسول اور نبی بھیجا کرتے ہیں۔ اس میں کہیں محدث نہیں کہا۔ محدث کا تو لفظ بھی قرآنِ کریم میں نہیں آیا۔ یہ روایت وضعی ہے اور غلط ہے' قرآن میں اضافہ ہے۔ قرآن پہ ایمان رکھنے والا اس کو نہیں مان سکتا۔ لہٰذا اگر یہ اپنے آپ کو کہتا ہے کہ خدا نے اسے بھیجا ہے تو اسے ماننا پڑے گا کہ یا یہ رسول ہے یا نبی ہے۔ اور رسول اور نبی کے لیے میں نے ثابت کیا ہے کہ یہ ایک ہی ہوتا ہے۔ اس بات پہ اس کا دعویٰ نبوت غلط ہے۔ اس فاضل مجسٹریٹ نے اس بنا پہ اُسے کافر قرار دیدیا تھا کہ وہ شخص' جو مرزا کا متبع ہوجاتا ہے' وہ

---

[1] 1926ء کا ذکر ہے' ریاست بہاولپور کی ایک عدالت میں ایک مقدمہ دائر ہوا جس میں ایک مسلمان خاتون نے یہ دعویٰ کیا کہ اس کے خاوند نے قادیانی مسلک اختیار کرلیا ہے جس کی وجہ سے وہ مرتد ہوگیا ہے اس لیے اس شخص سے مدعیہ کا نکاح فسخ قرار دیا جائے۔ یہ "مقدمہ مرزائیہ بہاولپور" کے نام سے مشہور ہے۔ اس مقدمہ نے ملک گیر شہرت حاصل کرلی اور مسلمانوں میں ایک ہیجان پیدا ہوگیا اس لیے نہیں کہ اس میں فریقین کی حیثیت بڑی ممتاز تھی۔ وہ تو بالکل غیر معروف سے تھے۔ یہ اس لیے کہ ہندوستان میں (غالباً) یہ اپنی نوعیت کا پہلا مقدمہ تھا جس میں فیصلہ طلب سوال یہ تھا کہ ایک شخص قادیانی مسلک اختیار کرنے کے بعد مسلمان رہتا ہے یا نہیں۔ اس اعتبار سے یہ مقدمہ متعلقہ فریقین کا مابہ النزاع معاملہ نہ رہا بلکہ قادیانیوں اور غیر قادیانیوں کے مابین ایک دینی سوال بن گیا۔ اس مقدمہ کی مکمل تفصیل کے لیے دیکھیے پرویزؒ: ختم نبوت اور تحریک احمدیت بشمول مقدمہ مرزائیہ بہاولپور 1935ء کا عدالتی فیصلہ (ایڈیشن ششم) طلوع اسلام ٹرسٹ' لاہور' 1998۔ نیز پمفلٹ مرزائیت (قادیانیت) اور طلوع اسلام' شائع کردہ ادارہ طلوعِ اسلام' 25بی۔ گلبرگ 2' لاہور۔

دائرہ اسلام سے خارج ہو جاتا ہے۔ یہ پہلا فتویٰ تھا جو ہندوستان میں 1935ء میں میرے اس مضمون[1] کی بنیاد پر دیا گیا۔ اور کچھ نہیں تھا تو کم از کم اتنا ہی مان لیتے کہ میرے اس مضمون کی بنا پہ اس فاضل جج نے یہ پہلا فتویٰ دیدیا۔ یہ فیصلہ 1935ء میں دیا تھا۔[2] ان لوگوں نے اس چیز کو چھپایا کہ اس میں میرا نام آ رہا ہے اور آج تک چھپا رہے ہیں۔ جہاں بھی بہاولپور کے اس مقدمے کا ذکر آتا ہے یہ لوگ میرا نام چھپا دیتے ہیں۔ یہ معاملہ ختمِ نبوت کے Agitation (اشتعال) کے زمانے میں یہاں سینکڑوں مرتبہ آیا ہے، وہ آپ نے بھی دیکھا ہوگا کہ اس میں سے وہ حصہ غائب کر دیتے ہیں جس میں نام ہوتا ہے۔ میرا جرم یہ ہے، عزیزانِ من! کہ میں خدا کی اس کتاب قرآنِ کریم کے متعلق یہ ایمان رکھتا ہوں کہ اس میں ایک حرف کا نہ رد و بدل ہوا ہے، نہ اضافہ ہوا ہے، نہ کوئی کمی ہوئی ہے۔ حضورؐ نے اسی طرح سے یہ کچھ دیا اور ہم تک یہ پہنچا ہے اور حضور ﷺ کے بعد کوئی شخص، کسی معنی میں بھی، اگر کہتا ہے کہ خدا نے اُسے بھیجا ہے تو وہ ختمِ نبوت کی مہر کو توڑتا ہے، وہ امتِ محمدیہ ﷺ کے دائرے سے خارج ہو جاتا ہے۔ اللہ اللہ خیر سلا۔ اگر یہ کہنا ان کے نزدیک کفر ہے جو یہ دعویٰ کرتے ہیں عزیزانِ من! تو مجھے اس کفر کا بھی مان ہے، میں اللہ کے ہاں جا کے جواب دونگا۔ شکریہ

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّآ ؕ اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ؕ

❀❀ ...... ❀❀❀ ...... ❀❀

---

[1] میکانکی اسلام

[2] یہ فیصلہ صادر کیا تھا کہ ''مدعیہ کی طرف سے یہ ثابت کیا گیا ہے کہ مرزا صاحب کاذب مدعی نبوت ہیں۔ اس لیے مدعا علیہ بھی مرزا صاحب کو نبی تسلیم کرنے سے مرتد قرار دیا جائے گا۔ لہٰذا ابتدائی تنقیحات جو 4 نومبر 1926ء کو عدالتی منصفی احمد پور شرقیہ سے وضع کی گئی تھیں۔ بحق مدعیہ ثابت قرار دے جا کر یہ قرار دیا جاتا ہے کہ مدعا علیہ قادیانی عقائد اختیار کرنے کی وجہ سے مرتد ہو چکا ہے لہٰذا اس کے ساتھ مدعیہ کا نکاح تاریخ ارتداد مدعا علیہ سے فسخ ہو چکا ہے اور اگر مدعا علیہ کے عقائد کو بحث مذکورہ بالا کی روشنی میں دیکھا جائے تو بھی مدعا علیہ کے ادعا کے مطابق مدعیہ یہ ثابت کرنے میں کامیاب رہی ہے کہ رسول اللہ کے بعد کوئی امتی نبی نہیں ہو سکتا اور یہ کہ اس کے علاوہ جو دیگر عقائد مدعا علیہ نے اپنی طرف سے منسوب کیے ہیں وہ گو عام اسلامی عقائد کے مطابق ہیں لیکن ان عقائد پر وہ انہی معنوں میں عمل پیرا سمجھا جاوے گا جو معنی مرزا صاحب نے بیان کیے ہیں اور یہ معنی چونکہ ان معنوں کے مغائر ہیں، جو جمہور امت آج تک لیتی آئی، اس لیے بھی وہ مسلمان نہیں سمجھا جا سکتا اور ہر دو صورتوں میں وہ مرتد ہی ہے اور مرتد کا نکاح چونکہ ارتداد سے فسخ ہو جاتا ہے، لہٰذا ڈگری بدیں مضمون بحق مدعیہ صادر کی جاتی ہے کہ وہ تاریخ ارتداد مدعا علیہ سے اس کی زوجیت میں نہیں رہی۔ مدعیہ خرچہ بھی ازاں مدعا علیہ لینے کی حق دار ہوگی۔ (حوالہ اسلامک فاؤنڈیشن: مقدمہ مرزائیہ بہاولپور (تین جلدیں)، 1۔ ڈیوس روڈ، لاہور، ص ص۔ 102-101)۔

آٹھواں باب: **سورة الحج** (آیات 52 تا 53)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

إِذْ دَخَلُوا عَلَيْهِ فَقَالُوا سَلَامًا ط قَالَ إِنَّا مِنكُمْ وَجِلُونَ ﴿٥٢﴾
قَالُوا لَا تَوْجَلْ إِنَّا نُبَشِّرُكَ بِغُلَامٍ عَلِيمٍ ﴿٥٣﴾

عزیزانِ من! آج فروری 1977ء کی 6 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم میں جو آیہ جلیلہ سابقہ درس میں پیشِ نظر تھی اسی کے تسلسل میں بلکہ اسی آیت سے ہی آج پھر درس شروع ہوتا ہے: (22:52)۔

خدا کے دین کا دارومدار قرآنی آیات کے صحیح مفہوم پر موقوف ہے

جیسا کہ میں نے سابقہ درس میں عرض کیا تھا کہ یہ وہ آیت ہے جس کا غلط مفہوم ایک طرف وہ سب کچھ کرنے کا ذمہ دار ہے جس کی بنا پہ خدا کا بھیجا ہوا یہ دین آج مذہب میں تبدیل ہو گیا ہے اور دوسری طرف یہ کہ اگر یہ امت چاہتی ہے کہ دوبارہ اسی دین پہ آجائے تو اس کا مدار اس آیت یا اس ضمن کی دیگر آیات کے صحیح مفہوم پر موقوف ہے۔ جیسا کہ میں نے پچھلی دفعہ بھی عرض کیا تھا اس اعتبار سے آپ دیکھیے کہ یہ آیت بڑی اہم ہو جاتی ہے۔ اس لیے میں نے پچھلی دفعہ پورا درس اس پہ صرف کیا اور وہ بات ختم نہیں ہوئی۔ آج بھی اسی کے تسلسل میں مجھے کچھ عرض کرنا ہے۔ وہ آیت میں پھر دہرا دوں۔ بات یہ ہو رہی تھی کہ قوانینِ خداوندی' جن کی رو سے قوموں کی سعادتوں اور ناکامیوں کے فیصلے ہوتے ہیں' کوئی پہلی مرتبہ سامنے نہیں لائے گئے۔ انہیں ہم شروع ہی سے' مختلف انبیاء کی معرفت دیتے چلے آرہے ہیں لیکن ہوتا یہ رہا ہے کہ **وَمَآ أَرْسَلْنَا مِن قَبْلِكَ مِن رَّسُولٍ وَلَا نَبِيٍّ إِلَّآ إِذَا تَمَنَّىٰٓ أَلْقَى الشَّيْطَانُ فِيٓ أُمْنِيَّتِهِ فَيَنسَخُ اللَّهُ مَا يُلْقِي الشَّيْطَانُ ثُمَّ يُحْكِمُ اللَّهُ آيَاتِهِ وَاللَّهُ عَلِيمٌ حَكِيمٌ** (22:52)۔ ہمارا فرستادہ نبی آتا۔ لوگوں تک ہمارا پیغام پہنچاتا۔ اس کے چلے جانے کے بعد' اپنی مفاد پرستیوں کے پیچھے چلنے والے لوگ اس کی وحی میں اپنی طرف سے آمیزش کر کے اسے کچھ سے کچھ بنا دیتے۔ (اس کے بعد خدا ایک اور رسول بھیج دیتا اور سابقہ وحی کو) اُس آمیزش سے پاک اور صاف کر کے اپنے قوانین کو پھر محکم کر دیتا۔ اس لیے کہ خدا کو ہر بات کا علم ہوتا ہے اور اس کے سب کام حکمت پر مبنی ہوتے ہیں۔ عزیزانِ من! اس آیت میں واضح کر دیا گیا ہے کہ

آیت میں واضح کر دیا گیا ہے کہ اے رسول ﷺ! تم سے پہلے ہم نے جتنے بھی رسول یا نبی بھیجے' ان کے ساتھ یہ ماجرا گزرا۔

میں نے پچھلی دفعہ عرض کیا تھا کہ اس کے ترجمہ یا مفہوم کے لیے جب انہوں نے **اِذَا تَمَنّٰی** کا مفہوم آرزو اور خواہش لیا کہ کوئی رسول اور نبی ایسا نہیں گزرا جسکے ساتھ یہ ماجرا نہ گزرا ہو کہ اس کی آرزوؤں میں شیطان نے اپنی آرزوئیں ملا دیں' کوئی نبی اور کوئی رسول ایسا نہیں گزرا بلا استثنا ہر ایک کے ساتھ یہ کچھ ہوتا رہا...... معاذ اللہ...... تو خدا کا عطا فرمودہ دین مذہب میں تبدیل ہو گیا اور لاتعداد مابہ النزاع مسائل نے سر اٹھا لیا۔

ابلیس ہو یا شیطان' وہ خدا کے مخلص بندوں پر اثر انداز ہو ہی نہیں سکتا

عزیزانِ من! جیسا کہ میں نے عرض کیا تھا کہ جہاں بھی ابلیس یا شیطان کے چیلنج کا ذکر ہے' اُس میں یہی نہیں کہ اللہ تعالیٰ نے یہ اس سے کہا ہے کہ جا' جو تیرا جی چاہے بنی آدم کے ساتھ کر دیکھ' میرے مخلص بندوں پر تیرا کسی قسم کا کوئی غلبہ' داؤ' قابو نہیں چل سکے گا۔ خود ابلیس نے یہ چیز کہی کہ اس آدم کی بنا پہ مجھے تو ذلیل و خوار کیا گیا ہے' اب تم دیکھو' میں بنی آدم کے ساتھ بجز تیرے مخلص بندوں کے کیا کرتا ہوں۔ اسے خود اس کا اعتراف تھا کہ خدا کے مخلص بندوں پہ اس کا کسی قسم کا تسلط یا غلبہ نہیں ہو سکتا چہ جائیکہ انبیاء اور رُسل پر اس کا اتنا اثر ہو کہ انکی خواہشات و آرزوؤں میں شیطان بھی اپنی آرزوئیں ملا دے۔ اور پھر یہ کہ کوئی نبی اور کوئی رسول ایسا نہیں گزرا کہ جس کے ساتھ یہ نہ بیتی ہو۔ اب سوائے اس کے کہ آدمی سر پیٹ کے بیٹھ جائے اور کیا کرے! عزیزانِ من! دینِ خداوندی مذہب میں تبدیل ہو کر یہ کچھ کر دیتا تھا اور پھر اس نبی اور رسول میں معاذ اللہ خود یہ صلاحیت نہیں ہوتی تھی کہ وہ یہ پہچان لے کہ یہ بات ہو گئی ہے کہ او ہو' خدا کی طرف سے نہیں یا میری اپنی بھی نہیں' بلکہ یہ کچھ تو شیطان نے ملا دیا ہے اور پھر خدا کو وہ منسوخ کرنا پڑتا تھا جو شیطان ملا دیتا تھا۔ تو آپ پہلی چیز تو یہ دیکھیے۔ بہر حال اب سابقہ درس کی روشنی میں اس پہ تو زیادہ وقت صرف کرنے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ سابقہ درس سے یہ تصورات آپ کے ذہن و فکر میں اپنی جگہ پا چکے ہوں گے۔

ملاوٹ کرنے والے یہ شیاطین کون تھے؟

عزیزانِ من! اب دوسری طرف آئیے۔ صحیح چیز یہ ہے کہ اللہ تعالیٰ کے ہاں سے' جیسا میں نے عرض کیا تھا' اسے پھر دہرا دوں' انبیائے کرام علیہم السلام کی وساطت سے اصولی اعتبار سے دین ایک ہی تھا جو شروع سے آخر تک آتا رہا لیکن اس نے کہا یہ ہے کہ پھر ہوتا یہ تھا کہ ایک نبی کے چلے جانے کے بعد' اس کی وحی میں' شیاطین تحریف کر دیتے تھے' اپنی طرف سے اس میں کچھ ملا دیتے تھے۔ اب یہاں قرآنِ کریم نے لفظ شیاطین استعمال کیا ہے کہ وہ ایسا کچھ کرنے والے ہیں۔ قرآن نے ان لوگوں کو شیاطین کہا ہے جو اس کے اپنے ہی نام لیوا ہیں اور کہا یہ ہے کہ وہ وحی میں تحریف کر دیتے تھے۔ اگر کوئی دوسرا یہ کچھ کرتا تو فوراً پکڑا جاتا۔ اس کے بعد پھر خدا کا ایک دوسرا نبی

آ جاتا تھا' وہ جو کچھ اس طرح سے خدا کی اس وحی میں آمیزش کی ہوئی ہوتی تھی' وہ خدا کی وحی کی بنا پہ' اس آمیزش کو الگ کر دیتا تھا اور دین کو پھر اپنی اصلی حالت' حقیقی شکل' میں پیش کر دیتا تھا۔ **فَيَنسَخُ اللّٰهُ مَا يُلْقِي الشَّيْطٰنُ ثُمَّ يُحْكِمُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ** (22:52)۔اس طرح سے خدا مفاد پرستیوں کے پیچھے چلنے والے لوگوں کی آمیزش کو منسوخ کر دیتا تھا اور اپنی آیات کو محکم کر دیتا تھا۔ یہ ہوتا چلا آ رہا تھا کہ سب انبیاء کرام کے آخر میں نبی اکرم ﷺ تشریف لے آئے۔ پھر سن لیجیے کہ ہوتا کیا تھا؟ ایک نبی کی وحی میں یہ کچھ ملایا جاتا تھا' اس کے بعد خدا کی طرف سے پھر دوسرا رسول آتا تھا۔ وہ اس میں جو کچھ بھی آمیزش ہوئی ہوتی تھی' اس کو صاف کر کے' دین کو اپنی منزہ شکل میں پھر دنیا کو دیدیتا تھا۔ ایک رسول آیا کرتا تھا' ایک نبی آیا کرتا تھا اور حضور ﷺ تو خاتم النبین ہیں۔ آپ ﷺ کے بعد تو کسی کو آنا ہی نہیں تھا تو اس سلسلے میں خدا نے کہا یہ ہے کہ ہر نبی اور ہر رسول کے ساتھ یہ ہوتا رہا۔ اگر بعد میں اس نبی کے ساتھ بھی یہ ہوا تو پھر کیا ہوگا۔ اس سدِ باب کے لیے خدا نے یہ کہہ دیا کہ ہم نے اس قرآن کو نازل کیا ہے' ہم اس کی حفاظت کا ذمہ لیتے ہیں۔ اس سے پہلے کی کتب آسمانی میں' کتبِ سابقہ میں' کسی کتاب میں بھی یہ بات نہیں ہے جو قرآن میں ہے کہ ''ہم اس کی حفاظت کا ذمہ لیتے ہیں۔'' یہ تو بڑی بات ہوگئی کہ اب اس کتاب (قرآنِ کریم) میں وہ شیاطین' وہ مفاد پرستیوں کے پیچھے چلنے والے لوگ' جو اپنی طرف سے خدا کی وحی میں کچھ ملا دیا کرتے تھے تو اس کے اندر تو ملانے کی گنجائش ہی نہیں' امکان ہی نہیں رہا۔ جب خدا حفاظت کا ذمہ لے لے تو پھر کس کی مجال ہے کہ اس کے اندر کچھ ملا دے یا تحریف کر دے۔ اگر یہ کچھ ہو جائے تو اس آمیزش کو الگ کرنے کا تو کوئی ذریعہ ہی باقی نہ رہا کیونکہ اب کسی اور رسول نے آنا ہی نہیں۔ اس لیے اس کے تو امکان ہی سے انکار ہوگیا۔ اب یہ جو ملانے والے تھے' وہ تو باز نہیں آ سکتے تھے۔ اب انہوں نے قرآنِ کریم میں آمیزش کرنے کے لیے نئی نئی تدابیر سوچیں۔ جیسا کہ میں نے گزارش کی ہے اب اس قرآنِ کریم میں یہ کوئی چیز نہیں ملا سکتے تھے۔ اور یہی وہ چیز ہے جس کے متعلق میں نے پچھلی دفعہ تفصیل سے عرض کیا تھا۔ اسے پھر دہرا دوں کہ اس کے بعد سازش یہ ہوگی کہ اس کے اندر تو کچھ نہیں ملایا جائے گا لیکن کیا وہی کچھ جائے گا جو پہلے کیا کرتے تھے۔ اب یہ کتاب تو محفوظ رہے گی اس کے لیے جو سازشیں کی جائیں گی میں ان میں سے پانچ سات چیزیں عرض کروں گا جو میں نے سابقہ درس میں بھی عرض کی تھیں۔

ملت اسلامیہ کے ساتھ پہلی سازش: قرآن تو محفوظ رہا لیکن پانچ سو قرآنی آیات کو منسوخ کر دیا گیا

عزیزانِ من! اس سازش کے لیے پہلا عقیدہ یہ وضع کیا گیا کہ اس قرآن سے پانچ سو آیات منسوخ ہیں۔ اس قرآنِ کریم میں ملایا تو کچھ نہیں لیکن اتنی آیتوں کو اس میں سے نکال دیا یعنی قرآن کے اندر کچھ کرنے کی تو جرأت ہو نہیں سکتی تھی کہ اس کی حفاظت کا ذمہ خدا نے لیا تھا' ان آیتوں کو قرآن میں سے نکالا نہیں' وہ آیات منسوخ التلاوت نہیں ہیں' جسے یہ اپنی اصطلاح میں کہتے ہیں۔ وہ پڑھی جاتی ہیں لیکن ان کے احکام منسوخ ہوگئے۔ تو اتنا حصہ قرآن کا یعنی چھ ساڑھے چھ سو آیات' ساری احکام کی' قرآن میں ہیں۔ تو یہ جو ناسخ منسوخ کی آیات وہ بتا رہے تھے وہ ساری کی ساری قرآن کے احکام وحقائق کے متعلق تھیں۔ مابعد الطبیعات کے متعلق تو منسوخ کرنے کی کوئی بات

ہی نہیں تھی۔ بات تو ساری احکام میں ہی ہوتی ہے کہ یہ حکم منسوخ ہے‘اس میں سے اتنے احکام منسوخ کر دیئے۔ یہ تھی ایک سازش

دوسری سازش: کچھ آیات قرآن میں شامل تو نہ ہوئیں لیکن حکم انہی کا چلتا رہا

عزیزانِ من! اس کے ساتھ ایک اور سازش کا اضافہ ہوا کہ کچھ آیتیں ایسی ہیں کہ جو قرآن کے اندر داخل نہیں ہیں لیکن وہ وحی ہیں وہ قرآن کا حصہ ہیں‘ وہ اس کے اندر شامل نہیں ہوئیں‘ وہ پڑھی نہیں جاتیں مگر حکم انہی کا چلتا ہے۔ اب قرآن کے اندر وہ آیات داخل نہیں ہوئیں۔ آپ غور کیجیے گا کہ وہ جو بات تھی کہ قرآن میں‘ رسول کی وحی میں وہ کچھ شامل کر دیتے تھے‘ تو یہاں قرآنِ کریم میں وہ آیات شامل نہیں ہوئیں‘ لیکن فرق کیا پڑا‘ باہر رکھی گئیں‘ حکم ان کا چلتا ہے۔ عزیزانِ من! بڑے غور سے سنیے گا جو کچھ میں عرض کر رہا ہوں۔ آج سینے میں میرے درد سوا ہوتا ہے۔ آج ہی نہیں ہوتا‘ میرے سینے کو تو عمر بھر اسی درد نے چھلنی چھلنی کر دیا کہ اس امت کے ساتھ کیا ہوا۔ قرآن کی حفاظت کے دعوے کے باوجود کہ ’’خدا نے اس کی حفاظت کا ذمہ لیا ہے‘‘ اس امت کے ساتھ ہوا کیا؟ یہ جو کسی نبی اور رسول کی چیز کہی گئی ہے کہ جو نبی اور رسول آیا‘ اس کے ساتھ یہ بیتی۔ یہ چیز تھی جس کے متعلق کبھی ذہن میں نہیں آتا تھا کہ ایک خاتم النبیین ﷺ کے ساتھ بھی یہی کچھ بیتے گا۔ اب یہ حکم قرآن سے باہر ہے لیکن کہا یہ گیا ہے کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ (644-501ء) نے ان سے کہا: اوئے بابا! یہ آیتیں ہم رسول اللہ ﷺ کے زمانے میں پڑھتے تھے۔ اب یہ اس قرآن میں نہیں ہیں۔ وہ تو خلیفہ وقت بھی تھے۔ لوگوں نے یہ کہا کہ صاحب! یہ آیات نہیں ہیں تو آپ رضی اللہ عنہ اس میں شامل کر دیجیے۔ انہوں نے کہا: نہیں‘ بھائی! مجھے تو اب ڈر لگتا ہے کیونکہ لوگ کہیں گے کہ عمرؓ نے قرآن میں اضافہ کر دیا۔ تو انہوں نے کہا: پھر کیا کیا جائے‘ وحی ہے یہ تم داخل کرتے نہیں ہو۔ کہنے لگے: ٹھیک ہے‘ ہم اس قرآن میں ان آیات کو داخل نہیں کرتے مگر حکم انہی کا چلے گا۔ عزیزانِ من! یہ ہے آپ کی تاریخ‘ اور حکم ان آیات کا چلتا ہے‘ چلا جا رہا ہے۔ یہ تھی ایک دوسری سازش

تیسری سازش: قرآن کریم کی مختلف قرأتوں کا عقیدہ وضع ہوا

عزیزانِ من! ان آیات کا حکم ہے‘ یہ بات آج تک قرآن کے ساتھ قصہ پارینہ نہیں ہے۔ پھر یہ عقیدہ وضع ہوا کہ جسے قرآن کہتے ہیں اس کی مختلف قرأتیں ہیں۔ میں نے پچھلی دفعہ (سابقہ درس میں) بتایا تھا کہ قرأتوں کے معنی یہ نہیں ہیں کہ پڑھنے کا لہجہ مختلف ہے۔ کہا یہ گیا ہے کہ یہ آیت یوں بھی نازل ہوئی تھی اور یوں بھی نازل ہوئی تھی۔ وہ ایک تو اس قرآن کے اندر آ گئی اور جو یوں بھی نازل ہوئی تھی وہ اس کے اندر نہیں آئی‘ وہ باہر رہی۔ آپ دیکھیے پھر بھی یہ کہتے ہیں کہ قرآن میں کچھ داخل نہیں کیا گیا۔ بات تو اتنی ہی کہنی ہے کہ پھر وہ آیات باہر ہی رہیں۔ اگر آپ کوئی تفسیر یا کوئی تفسیری ترجمہ‘ جس میں نوٹس وغیرہ ہوں‘ دیکھیں تو اس میں آپ یہ لکھا ہوا دیکھیں گے کہ قرأتِ حضرت عباس رضی اللہ عنہ میں یوں بھی آیا ہے‘ حضرتِ ابن عباس رضی اللہ عنہ میں یوں بھی آیا ہے‘ فلاں صحابہ کی قرأت میں یوں بھی آیا ہے۔

اور وہ جو یوں بھی آیا ہے وہ قرآنی بن جاتا ہے۔ آپ کو کوئی تفسیری ترجمہ یا تشریحی نوٹس یا کوئی تفسیر ایسی نہیں ملے گی جس میں یہ لکھا نہیں ملے گا کہ یہ تو قرآن کا حکم یوں ہے لیکن فلاں صحابی رضی اللہ عنہ کی قرأت میں یوں بھی آیا ہے۔ اس لیے یہ بھی ٹھیک ہے۔ پچھلی دفعہ (سابقہ درس میں) میں نے آپ کو مثالیں بھی دی تھیں کہ یہ جو قرآن کے اندر قرأت ہے' مصحفِ عثمانی کی رو سے متعہ حرام ہے' جیسے حنفی کہتے ہیں۔ دوسرا طبقہ کہتا ہے کہ یہ جو قرأت آئی ہے اس کی رو سے متعہ عین مطابق شریعت ہے۔ مطابقِ شریعت کہنے والے کہتے ہیں کہ صاحب! یہی قرأت صحیح ہے۔ یہ قرأتیں جو قرآن کے باہر ہیں انہیں بھی صحیح کہنے والے کہیں گے قرآن میں تو یہ نہیں ہے مگر وہاں یہ قرأت ہوئی قرآن تو حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے زمانے (656-645ء) میں مرتب ہوا تھا یہ جتنی قرأتیں ہیں جنہیں وہ اپنے ہاں صحیح کہہ رہے ہیں اُن کا کہنا ہے کہ یہ قرأتیں قرآن میں اس طرح سے داخل نہیں ہوئیں۔ یہ تھی ایک تیسری سازش۔

چوتھی سازش: ہماری فقہ کا سارا مدار ان قرأتوں پر ہے

عزیزانِ من! میں نے عرض کیا تھا کہ آپ کتاب الکافی [1] اٹھا کر دیکھیے۔ آپ کو شروع سے آخر تک یہ لکھا ہوا ملے گا کہ قرآن کی اس آیت کے بارے میں اصل میں' فلاں امام نے یہ فرمایا کہ یہ آیت دراصل یوں نازل ہوئی۔ اور ان کی فقہ کا' ان کے احکام کا' مدار ان آیات پہ ہے جن کے متعلق کہا جاتا ہے کہ یوں بھی نازل ہوئی تھیں۔ اِس یوں بھی نازل ہوئی اور یوں بھی نازل ہوئی کی بات پر ہزار برس سے آپس میں لٹھم لٹھا ہوتے چلے آ رہے ہیں۔ ان سے کہیے تو یہ کہتے ہیں کہ قرأتِ فلاں میں یوں آیا ہے۔ وہ سیدھی سی بات کر دیتے ہیں کہ یوں یہ نازل ہوا تھا۔ درحقیقت یہ دونوں کو مانتے ہیں کہ عثمانی مصحف میں' جو مروجہ قرآن ہے' اس میں یوں آیا ہے لیکن فلاں کی قرأت میں یوں آیا ہے۔ اور وہ بات تو وہیں چلی گئی۔ وہ کہتے ہیں کہ صاحب! قرآن نازل ہی یوں ہوا تھا۔ ویسے اس سلسلہ میں سابقہ درس میں بڑی اہم مثال پیش کی تھی جس بنا پر مرزا غلام احمد قادیانی (1908 - 1835) نے نبوت کا دعویٰ کیا تھا۔ اسی آیت کے متعلق یہ کہا گیا ہے کہ **وَمَآ اَرۡسَلۡنَا مِنۡ قَبۡلِکَ مِنۡ رَّسُوۡلٍ وَّلَا نَبِیٍّ اِلَّآ اِذَا** ...... (22:52)۔ تم سے پہلے کوئی رسول یا نبی ایسا نہیں بھیجا جس کے ساتھ یہ کچھ نہ ہوا ہو۔ تو انہوں نے کہا کہ قرأتِ حضرتِ ابنِ عباس رضی اللہ عنہ میں یہ **مِنۡ رَّسُوۡلٍ وَّلَا نَبِیٍّ وَلَا مُحَدَّثٍ** آیا ہے یعنی خدا کی طرف سے رسول بھی آتے تھے' نبی بھی آتے تھے' محدث بھی آیا کرتے تھے۔ آپ کے ہاں یہ عقیدہ چلا آ رہا ہے۔

عزیزانِ من! اس درس میں اس کی تفصیل کی ضرورت نہیں وہ سابقہ درس میں آ چکی۔ میں یہ عرض کروں کہ یہ محدث والی جو بات

---

[1] اس کتاب کا پورا نام ہے ''الاصول الکافی'' اور تالیف ہے ''ثقۃ الاسلام محمد بن یعقوب بن اسحٰق الکلینی الرازی (متوفی 329ھ)۔ یہ کتاب امامیہ یا اثنا عشری حضرات کے نزدیک حدیث کی سب سے زیادہ معتبر اور مستند کتاب ہے اور اس کی ہر حدیث کسی نہ کسی امام سے مروی ہے۔ اسی کتاب کا اردو ترجمہ دو حصوں میں چھپا ہے۔ ایک کا نام ''کتاب الشافی'' اور دوسرے حصے کا نام ''فروعِ کافی'' ہے۔ یہ ترجمہ ''حضرت ادیب اعظم' مولانا سید ظفر حسن صاحب امروہوی'' کا ہے جسے شمیم بک ڈپو' ناظم آباد' کراچی نے 1966ء میں شائع کیا ہے۔

ہے یہ چیز تو شیعہ حضرات کی کتاب ''الاصول الکافی'' کے شروع میں ہی ہے' اور سنی حضرات تو شروع سے ہی مانتے چلے آ رہے ہیں کہ خدا کی طرف سے محدث بھی آتے ہیں۔ ہمارے پنجابی نبی [1] نے تو ابتدا بھی یہیں سے کی تھی کہ ''یہ محدث ہیں'' اور جب اس سے کہا کہ مامور من اللہ تو رسول ہوتا ہے' نبی ہوتا ہے' یہ کہاں سے آئے تو اس نے کہا کہ تمہارے ہاں قرأتِ ابنِ عباس کے اندر ایک تیسرا لفظ محدث بھی لکھا ہوا ہے یعنی اس کے اندر تیسرا [2] لفظ محدَّ ث ہے' یہ محدِ ث نہیں ہے۔ محدث حدیثیں بیان کرنے والا ہوتا ہے۔ محدِ ث تو عام ہوتے ہیں۔ یہ محدَّ ث ہے یعنی خدا کی طرف سے خبریں پانے والا۔ وہ تو نبی ہوتا ہے۔ کہا کہ قرآن میں یہ لفظ ''محدَّ ث'' بھی تھا۔ وہ تو یہ کہتے ہیں کہ یہ آیت نازل ہی یوں ہوئی تھی اور یہ بگاڑ کے اس طرح کر دی گئی۔ یہ کہتے ہیں کہ نہیں' یہ تو مصحفِ عثمانی میں یوں آیا ہے۔ اس پہ مستزاد یہ کہ ایک قرأت حضرتِ ابنِ عباس رضی اللہ عنہ کی یوں بھی آئی ہے۔ صاحب! سنتے جا رہے ہیں آپ! یہ ہے ایک چوتھی سازش

پانچویں سازش: سات زبانوں میں قرآن نازل کیا

عزیزانِ من! اور آج مودودی صاحب [3] کی طرف سے مختلف قرأت کے بارے میں یہ فتویٰ نازل ہو گیا کہ قرآن درحقیقت سات زبانوں میں نازل ہوا تھا' خدا نے بھی سات زبانوں میں نازل کیا' رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے سات زبانوں میں لیا' پہلے دو خلفا کے زمانے میں وہ سات زبانوں میں رہا' حضرتِ عثمان رضی اللہ عنہ (656-573ء) نے ان میں سے چھ زبانوں والے قرآن کو اپنی مرضی سے جلا دیا' صرف ایک زبان والا باقی رکھا جو آپ کے پاس ہے۔ اور معلوم ہی نہیں کہ وہ جو چھ زبانوں والا تھا' اس میں کیا کیا تھا۔ چل' بھئی! سن رہے ہیں' عزیزانِ من! کہ ہم پہ بیتی کیا ہے۔ آج یہ چیز کہی جا رہی ہے۔ تعجب خیز یہ چیز ہے کہ اس قسم کے باطل عقائد' جو ہم تاریخ میں پڑھ رہے ہیں' اس قسم کے لوگوں کو جرأت کیسے ہو گئی کہ وہ انہیں پھیلائیں اور پھر اس کا یہ دعویٰ بھی کریں۔ آپ حیران ہونگے کہ آج یہ شخص یہاں بیٹھا ہوا' یہ کچھ کر رہا ہے۔ پورے پاکستان میں ہی نہیں' پورے عالمِ اسلام میں سے بھی کسی ایک شخص نے بھی اس کے خلاف آواز نہیں اٹھائی کہ کیا کہہ رہے ہو۔ کل کو یہ سند ہو جائے گی۔ ان کے ہاں کے جو سطوت علما ہیں' ان کے ہاں سے بھی اس کی تائید ہوتی ہے کہ ایک مفسر نے یہ اعلیٰ بات کہی ہے۔ وہ تو ان کا مقام امام احمد بن حنبل (855-780ء) اور ابن تیمیہ (1328-1263ء) جیسا بتایا جا رہا ہے کہ اس نے یہ چیز کہی ہے۔ سطوت علما میں سے کسی ایک شخص نے بھی اس کے خلاف کچھ نہیں کہا۔ جو کہنے والا تھا' وہ پرویز تھا۔ اسے علما نے کافر قرار دیدیا تھا' زبانی نہیں کہا' لکھ کے دیدیا' یہ موجود ہے۔ چلیے صاحب! ہزار ہزار معاذ اللہ کے ساتھ' اللہ میاں سے کہتا ہوں کہ کرتے رہیے اس کے الفاظ کی حفاظت۔ یہ بھی قرآنِ کریم کے خلاف اپنی نوعیت کی ایک نہایت ہی گھناؤنی سازش ہے۔ یہ ہے پانچویں سازش

---

[1] یہ اشارہ مرزا غلام احمد قادیانی کی نبوتِ باطلہ کی طرف ہے۔

[2] یعنی پہلا لفظ رَسُوۡلٍ دوسرا لفظ نَبِیٍّ اور یہ تیسرا لفظ مُحَدَّثٍ ہے۔

[3] سید ابوالاعلیٰ مودودی رحمہ اللہ (1978 - 1903)

تمام کے تمام محدِّثین ایرانی تھے: آخر کیوں؟

عزیزانِ من! قرآنِ کریم کے خلاف سازشوں میں اور آگے بڑھیے' اتنے سے تو بات ختم نہیں ہو جاتی پھر کیا کیا؟ حضور نبی اکرم ﷺ کی وفات کے دو اڑھائی سو سال بعد احادیث جمع کرنے والے حضرات ایران سے آئے۔ جسے آپ پوری صحاح ❶ ستہ کہتے ہیں' سنیوں کے ہاں' حدیث کی صحیح ترین چھ کتابیں ہیں۔ ان کا تذکرہ سابقہ درس میں تفصیل سے کیا جا چکا ہے۔ شیعوں کے جامعین حدیث ❷ میں سے بھی کوئی عرب نہیں ہے۔ یہ بنو امیہ ❸ کا عربوں کی سلطنت کا زمانہ تھا۔ یہاں سے کوئی ایک بھی جامع حدیث نہیں ہے

---

❶ صحاح ستہ یہ ہیں: (۱) صحیح بخاری' (خود حضرت امام بخاری رحمہ اللہ نے اپنی اس کتاب کا نام ''الجامع الصحیح المسند المختصر من امور رسول اللہ وسنۃ وایامہ'' رکھا ہے۔ گیلانی' مولانا مناظر احسن: تدوین حدیث' نفیس اکیڈمی' کراچی) (۲) صحیح مسلم' (۳) جامع ترمذی' (۴) سنن ابوداؤد' (۵) سنن ابن ماجہ' (۶) سنن نسائی۔

❷ شیعہ حضرات کے احادیث کے مجموعے حسب ذیل ہیں: (۱) الکافی: جامع ابوجعفر محمد جو کلینی کے نام سے مشہور ہیں۔ ان کی وفات 239ھ میں ہوئی۔ (۲) من لا یستحضرہ الفقیہ: یہ شیخ محمد ابن علی (متوفی 381ھ) کی تالیف ہے' (۳) تہذیب: مؤلفہ شیخ ابوجعفر محمد بن حسن۔ متوفی 460ھ اور (۴) استبصار: یہ بھی انہی کی تالیف ہے (شیخ ابوجعفر محمد بن حسن)۔ ان میں سے کوئی بھی عرب نہیں ہے۔

❸ بنی عباس اور بنی امیہ ایک ہی شجر کی دو شاخیں تھیں۔ قریش میں عبد مناف ایک ممتاز شخصیت گزری تھی۔ وہ ان دونوں خاندانوں کا مورث تھا۔ اس سے سلسلہ شجرۂ نسب یوں آگے چلا:

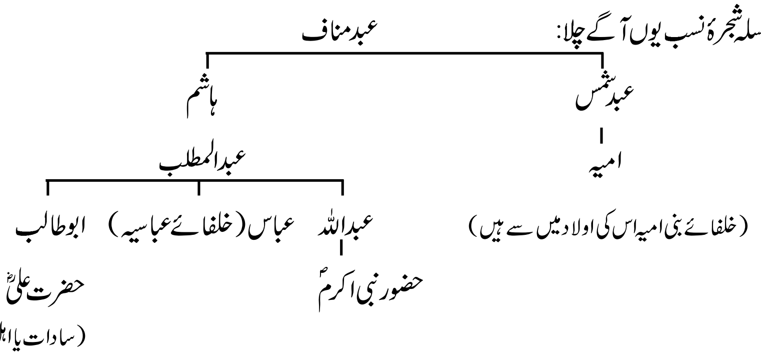

''اہل بیت'' کی اصطلاح کو سمجھنے کے لیے حسب ذیل شجرۂ نسب دیکھیے:

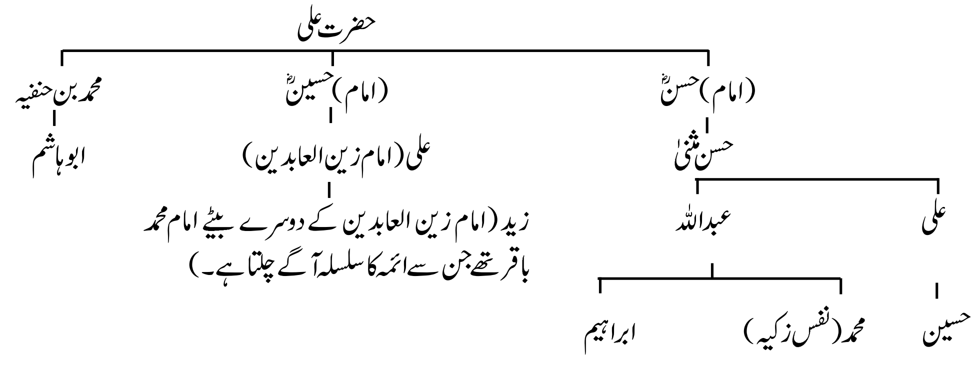

جس نے یہ کیا ہو۔ مجھے کسی کی نیت پہ شبہ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔ ان جامعین حدیث کا معاملہ ان کے خدا کے ساتھ ہے' مجھے اس سے کیا واسطہ !

الموٴطا کو صحاح ستہ میں شامل ہی نہیں کیا گیا: کیوں؟

عزیزانِ من! تاریخ کا ایک واقعہ عرض کرتا ہوں۔ اس سے ذرا پہلے امام مالک [1] (95-179ھ) کا ایک الموٴطا ہے۔ یہ انہوں نے جمع کیا تھا۔ ایک تو اس میں حدیثیں ہی بہت کم ہیں اور دوسرا یہ کہ وہ بھی اس میں سے ہر سال کم کرتے جاتے تھے۔ دس ہزار سے چھ سو اور پھر چھ سو سے قریباً قریباً تین سو رہ گئی تھیں اور انہوں نے اس میں صرف یہ لکھا ہے کہ مدینے میں جو صحابہ ہیں ان کا عمل یوں ہے۔ اس تالیف میں اتنا ہی ہے لکھا ہوا لیکن بہرحال وہ ان میں سے پہلے عرب تھے حالانکہ وہ بھی یمنی تھے۔ لیکن بہرحال عرب تھے۔ ان کی اس تالیف الموٴطا کو صحاح ستہ میں شامل ہی نہیں کیا گیا۔ بہرحال' یہ آئے انہوں نے اپنے طور پر اس ایک کام کو اہم سمجھا۔ اس زمانے میں لوگ جتنی باتیں رسول اللہ ﷺ کی طرف منسوب کرتے تھے' انہوں نے ان کو چنا۔ اور اکٹھا کیا جیسا کہ میں نے عرض کیا تھا کہ اِسی دور میں کس قدر وضعی' بناوٹی' حدیثیں عام ہوتی تھیں' اس کا اندازہ اس ایک واقعہ سے لگائیے کہ امام بخاریؒ نے لکھا ہے کہ مجھے چھ لاکھ حدیثیں ملیں' جن میں سے انہوں نے کوئی تین ہزار کے قریب یعنی 2762 اپنی کتاب میں درج کی ہیں' باقی کے لیے انہوں نے کہہ دیا کہ یہ سب ضعیف ہیں' وضعی ہیں اور مسترد ہیں۔ آپ ذرا نسبت کا اندازہ لگائیے کہ چھ لاکھ میں سے تین ہزار کے قریب (یعنی 2762) اور وہ بھی مکررات کو چھوڑ کر اپنی کتاب میں درج کیں اور باقی چھوڑ دیں اور یہی کچھ باقی جامعینِ حدیث نے کیا۔

چھٹی سازش: حدیثوں کے مجموعوں کو قرآن کے مثل قرار دیا گیا

عزیزانِ من! آپ دیکھ لیجیے کہ ان جامعینِ حدیث میں سے ہر ایک نے کہا کہ مجھے اتنے لاکھ ملیں' مجھے اتنے لاکھ ملیں اور میں نے اتنی اتنی مسترد کرنے کے بعد اتنی اتنی اپنی کتب میں باقی رکھیں۔ یہ ان افراد کی اپنی ذاتی تصانیف تھیں جن کی بنا پہ انہوں نے اتنی احادیث کو اچھا سمجھ کے' چن کے' رکھ لیا۔ انہیں اس کے لیے خدا کی طرف سے یا اس کے رسول ﷺ کی طرف سے تو کوئی سند نہیں ملی تھی۔ چلیے صاحب! اچھا ہے کہ کچھ چیزیں جمع ہو گئیں خواہ صحیح بھی ہوں یا غلط بھی ہوں۔ ان کا مقام یہی ہے کہ حضور ﷺ کی وفات کے دو اڑھائی

---

[1] امام مالک بن انس الحمیری المدنی رسول اللہ کی وفات ۱۱ھ کے چوراسی سال بعد 95ھ میں پیدا ہوئے اور چوراسی سال کی عمر پا کر 179ھ میں وفات پائی۔ الموٴطا انہی کی تالیف ہے۔ اس کتاب ''الموٴطا'' کی تالیف کا زمانہ دوسری صدی ہجری ہے یعنی رسول اللہؐ کی وفات کے تقریباً سو سال بعد۔ روایات حدیث کی یہ پہلی کتاب ہے جس کی تالیف عہدِ رسالت اور دورِ خلافت سے قریب ترین زمانہ میں ہوئی۔ علامہ شبلی نعمانی کے قول کے مطابق: ''محدثین نے لکھا ہے کہ امام مالک نے اول جب موٴطا لکھی تو اس میں دس ہزار حدیثیں تھیں۔ پھر امام مالک زیادہ تحقیق کرتے گئے تو یہ تعداد کم ہوتی گئی۔ یہاں تک کہ چھ سات سو رہ گئی۔ سیرۃ النعمان' ص۔ 182۔ (از ھرازھری' ڈاکٹر حافظ شاہد اقبال: قرآن اور حدیث' مرکز تحقیقاتِ اسلامی' کراچی' 2004' ص۔ 67)

سو سال بعد کسی شخص نے انفرادی طور پر ان باتوں کو، جو اس زمانے میں لوگوں کی زبان زد تھیں، اکٹھا کیا۔ یہی کہا جاتا تھا کہ حضور ﷺ نے ایسا کیا، حضور ﷺ نے ایسا فرمایا، یہ کچھ ایسا کرنا کسی نے جمع کر لیا۔ آپ ان کو یہی مقام دے سکتے ہیں مگر ہوا اس کے برعکس کہ نہیں صاحب! یہ مثلہ معہ قرآن ہیں، یہ قرآن کی مثل قرآن کے ساتھ ہے، قرآن کی مثل ہیں۔ جس قرآن نے یہ تحدی کی ہوئی ہے، یہ چیلنج کیا ہوا ہے، ایک مقام پہ ہی نہیں بلکہ پانچ چھ مقامات میں کہ ان سے کہو کہ دنیا بھر کے جتنے بھی تمہارے ہاں کے بڑے بڑے دانشور ہو سکتے ہیں، وہ اکٹھے ہو جائیں، اور اس قرآن کی ایک سورۃ کے برابر، دس آیتوں کے برابر، ایک آیت کی مثل، دوسری اس کی مثل بنا کے بتا دیں۔ کہا کہ صاحب! قرآن نے تو یہ تحدی کی ہوئی ہے۔ انہوں نے کہا کہ ٹھیک ہے، وہ تو یہ کہا تھا کہ انسان ایسا بنا کر دکھائے۔ یہ روایات ساری تو وحی ہے۔ کہا کہ صاحب! وحی تو قرآن میں ہے، تو کہنے لگے کہ وحی کی دو قسمیں ہیں: ایک قرآن کے اندر وحی ہے جو پڑھی جاتی ہے اور دوسری قرآن کے باہر وحی ہے جس کی تلاوت نہیں ہوتی۔ وہ وحی جو قرآن کے اندر ہے وہ تو قرآن کے احکام ہو گئے۔ پھر تم یہ کہتے ہو جو وحی قرآن کے باہر ہے، وہ قرآن کے مثل ہے۔ کچھ اس وحی کے احکام ہو گئے۔ چلیے، ان کو الگ الگ رکھیے۔ کہنے لگے کہ اتنی سی بات ہی نہیں ہے۔ قرآن کی تو پانچ سو آیتیں منسوخ کی گئیں ہیں۔ پہلا جو عقیدہ منسوخ تھا اس میں تو یہ تھا کہ قرآن کی کوئی آیت دوسری آیت کو منسوخ کر رہی ہے اگرچہ وہ بھی خدا نے نہیں کہا تھا کہ میری یہ فلاں آیت میری فلاں آیت کو منسوخ کرتی ہے، ان کا یہ اپنا فیصلہ تھا۔ اُس وقت تو بہر حال اتنا ہی تھا۔ اب یہ ہوا کہ یہ جو، ان مجموعوں کے اندر احادیث ہیں، وہ قرآن کی آیات کو منسوخ کر دیتی ہیں۔ کہا کہ دیکھیے ہم نے قرآن میں تو کچھ بھی نہیں ملایا۔ عزیزانِ من! یہاں (22:52) میں جو قرآن نے کہا ہے کہ رسول کی وحی کے اندر، اس کی تلاوت کردہ وحی کے اندر، شیاطین کچھ ملا دیا کرتے تھے۔ دوسرے مقام پہ قرآن کریم نے یہ بتایا ہے کہ یہ کون لوگ تھے اور کس قسم کی باتیں ملا دیا کرتے تھے (سورۃ الانعام 6:113 میں بھی ہے کہ کوئی رسول یا نبی نہیں بھیجا جس کے ساتھ یہ ماجرا نہ گزرا ہو) کہا کہ **وَ كَذٰلِكَ جَعَلْنَا لِكُلِّ نَبِيٍّ عَدُوًّا شَيٰطِيْنَ الْاِنْسِ وَالْجِنِّ يُوْحِيْ بَعْضُهُمْ اِلٰى بَعْضٍ زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُوْرًا** (6:112)۔ اور یہ بات کچھ نئی نہیں۔ جو نبی بھی آیا، اس کی قوم کے بڑے بڑے سرغنے، خواہ وہ شہروں میں بسنے والے متمدن افراد تھے (انس ❶) یا باہر بدوّیت کی زندگی بسر کرنے والے غیر مہذب (جن ❶) اس کی مخالفت کے لیے اٹھ کھڑے ہوئے۔ (اس لیے کہ اس دعوتِ انقلاب کی،

---

❶ انس۔ مانوس ہونا۔ چنانچہ تاج العروس، لین کے انگریزی زبان میں عربی کے مشہور لغت (Lane`s Lexicon) اور سعید الخوری الشرتونی اللبنانی کے مشہور لغت ''اقرب الموارد'' میں استانس الوحشی کے معنی لکھے ہیں ''جانور مانوس ہو گیا۔'' انہی نے لکھا ہے کہ الانس وہ قبیلہ جو کسی جگہ مقیم ہو۔ انس کے برعکس وہ خانہ بدوش قبائل جو جگہ جگہ پھرتے تھے اور اس طرح عام نگاہوں سے اوجھل رہے تھے، جن کہلاتے تھے۔ اس لیے انس شہروں میں بسنے والے متمدن افراد ہیں اور جن بدوّیت کی زندگی بسر کرنے والے، غیر مہذب افراد ہیں۔ پرویزؒ نے اپنی لغات القرآن جلد اول ص 446 پہ لکھا ہے کہ ''قرآنِ کریم میں جن اور انس کے الفاظ متعدد مقامات پر اکٹھے آئے ہیں۔ عربوں میں الانس ان قبیلوں کو کہتے تھے جو ایک مقام پہ مستقل طور پر سکونت پذیر ہو جائیں لیکن جن وہ قبائل تھے جو جنگلوں اور صحراؤں میں جگہ جگہ پھرتے رہتے تھے اور اس طرح شہر والوں کی نگاہوں سے اوجھل رہتے تھے۔ انہیں خانہ بدوش قبائل (Nomadic Tribes) کہا جاتا ہے۔'' قرآن میں جن و انس سے مراد وحشی اور متمدن انسان ہیں۔

ان کی مفاد پرستیوں پر زد پڑتی تھی۔) اس کے لیے وہ خفیہ سازشیں کرتے تھے اور عوام کو اپنے ساتھ رکھنے کے لیے ان سے طرح طرح کی ملمع سازی کی باتیں کرتے۔

عزیزانِ من! ہر نبی کے دشمن ہوا کرتے تھے۔ یہ شیاطین شہری اور صحرائی دونوں ہی ہوتے تھے۔ وہ ایک دوسرے سے چپکے ہی چپکے **زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُوْرًا** (6:113) تھے یعنی چپکے چپکے عوام سے طرح طرح کی ملمع سازی کی باتیں کرتے تھے۔ یہ ان کی ملمع ساز باتیں تھیں، ان کی وضع کردہ باتیں تھیں، دھوکہ دیدینے والی باتیں تھیں جو وہ دعوتِ اولیٰ میں ملایا کرتے تھے۔ ہر وعظ میں آپ دیکھیے گا کہ کس قدر داستانیں، کس قدر دلکش ہوتی ہیں، کس قدر رنگا رنگ فریب ہوتی ہیں، ان میں کس قدر چاشنی ہوتی ہے۔ علامہ اقبالؒ نے کہا تھا کہ

ذرا سی بات تھی اندیشۂ عجم نے اسے

بڑھا دیا ہے فقط زیبِ داستاں کے لیے ❶

''بڑھا دیا ہے فقط زیبِ داستاں کے لیے'' قرآن کی آیت **زُخْرُفَ الْقَوْلِ غُرُوْرًا** (6:113) کا مفہوم ہے۔ اسے اقبالؒ نے جھوٹے نگوں کی مینا کاری کہا ہے۔ زخرف کے معنی یہی ہوتے ہیں: جھوٹی چمک، جھوٹی چمک کی باتیں۔ فریب دینے کے لیے غرور کا لفظ ہے۔ یہ کیا کرتے تھے؟ یہ یہی کرتے تھے کہ ملمع سازی کو ملایا، جھوٹی چمک کی باتوں کو ملایا اور انہیں یہ مقام دیا کہ یہ روایات ہیں جو قرآن کی آیات کو منسوخ کر سکتی ہیں۔ ان کا مقام یہ ہے کہ یہ وحی ہیں جن کی تلاوت نہیں ہوتی اور یہ قرآن کی مثل ہیں۔ یہ ہے قرآنِ کریم کے خلاف ایک اور سازش۔

کراچی سے علامہ عبدالوہاب کے فتوے کی وجہ: روایات بھی وحی ہیں

عزیزانِ من! ایک اور قصہ سنیے۔ یہ بھی قصہ ماضی نہیں ❷ ہے۔ آج جسے آپ شریعت کا قانون کہہ رہے ہیں اور جو آج آپ کے ہاں رائج ہے، اس میں قرآنِ کریم کے ایسے احکام ہیں جنہیں ان روایات نے منسوخ کیا ہوا ہے۔ وہ احکامِ شریعت وہ ہیں جو ان روایات کے ہیں اور قرآن کی آیات کے خلاف جاتے ہیں۔ میرے خلاف غالباً عبدالوہاب صاحب کراچی کے ہی تھے جنہوں نے فتنہ انکارِ حدیث میں میرے خلاف بڑے فخر سے یہ بات لکھی ہوئی ہے کہ یہ کہتے ہیں کہ حدیث قرآن کو منسوخ نہیں کر سکتی ہے۔ اس نے کہا کہ یہ شخص حدیث کے متعلق سمجھا ہی نہیں ہے۔ یہ جو کہا جاتا ہے، کہ وہ قولِ رسول ہوتا ہے، یہ بات نہیں ہے۔ قولِ رسول کہنے کے اعتبار سے قرآن بھی تو ہم نے رسول اللہ ﷺ کی زبان سے ہی سنا تھا۔ اس اعتبار سے ہم احادیث کو اقوالِ رسول کہتے ہیں، ورنہ وہ وحی تھی اور ایک وحی نے دوسری وحی کو منسوخ کیا ہوا ہے۔ اس کے بعد کہنے لگے کہ اس کی سند یہ دیکھ لیجیے کہ ہمارے ہاں حکم جو...... وصیت کے سلسلے میں ...... چل رہا ہے، وہ قرآن کی آیت کا نہیں چل رہا، حدیث کا چل رہا ہے۔ اس ضمن میں انہوں نے قرآن کا وصیت کا حکم Quote (حوالہ)

---

❶ بالِ جبریل، کلیاتِ اقبال، اقبال اکاڈمی پاکستان، لاہور، 2000ء، ص۔ 380

❷ یاد رہے یہ 6 فروری 1977ء کی بات ہے۔

کیا تھا کہ چل رہا ہے۔ تو بتائیے کہ اب آپ کس طرح سے انکار کر سکتے ہیں۔ ٹھیک ہے جی! پہلے آپ یہ تسلیم کر لیجیے گا کہ دو وحیاں تھیں: ایک قرآن کے اندر اور دوسری قرآن کے باہر۔ ایک وحی نے دوسری وحی کو منسوخ کر دیا اور حکم اس وحی کا چل رہا ہے۔ یہ بات چلی آ رہی ہے یعنی پہلے یہ چیز تھی کہ کچھ آیتیں باہر رہ گئی ہیں مگر ان کا حکم چل رہا ہے۔ اب بات آگے چلی کہ وحی آیتیں ہی نہیں ہیں یہ جو روایات ہیں یہ بھی وحی ہیں مگر قرآن سے باہر ہیں' یہ قرآن کے احکام کو منسوخ کر دیتی ہیں۔ حکم ان کا چل رہا ہے۔

گوجرانوالا سے مولانا اسماعیل مرحوم کا فتویٰ: حدیث کا انکار وحی قرآن کا انکار ہے۔

عزیزانِ من! اسی بنیاد پر گوجرانوالا سے مولانا اسماعیل رحمۃ اللہ علیہ نے مودودی رحمۃ اللہ علیہ صاحب [1] کے خلاف لکھا تھا کہ صحیح مسلم اور صحیح بخاری کی تمام احادیث' جو ان دونوں کتابوں میں ہیں' کی ہر حدیث کے متعلق قطعی فیصلہ یہ ہے کہ وہ بالکل صحیح ہیں' وہ رسول اللہ کی ہیں اور اس کے بعد انہوں نے لکھا تھا کہ ان میں سے کسی ایک حدیث کا انکار انسان کو دائرۂ اسلام سے خارج کر دیتا ہے کیونکہ وہ انکار وحی کا انکار ہے۔ آج آپ جہاں کھڑے ہیں یہ ہماری ہزار سال کی تاریخ ہے۔ اب تک تو معاملہ یہ تھا کہ قرآن کی مختلف قرأتیں ہیں۔ چلیے اور اب یہ ہوا کہ روایات بھی خدا کی طرف سے رسول اللہ کی وحی تھی۔ وہ قرآن کے اندر نہیں آئی' وہ باہر رہ گئی اور یہ بھی ہے کہ قرآن کی آیتیں بھی قرآن میں داخل نہیں ہوئیں وہ بھی باہر رہ گئیں اور اس پر مستزاد یہ کہ حضرت عمر رضی اللہ عنہ (581-644ء) کا قول ہے کہ احادیثِ رسول اللہ کو قرآن سے باہر رہنے دیں وہ بھی قرآن کی مثل کی دوسری وحی ہے۔ چلیے وہ بھی خدا کی طرف سے وحی ہیں۔ اب خدا کی طرف سے جو متفقہ عقیدے کے مطابق وحی تھی وہ تو یونہی ان کے کہنے کی رو سے ہی سہی وہ تو قرآن میں آ گئی ہے۔ اس طرح ایک حصہ مکمل ہوا۔ اب دوسرا حصہ ان احادیث کے مجموعوں میں آ گیا۔ وہ مجموعے بھی مکمل ہو گئے۔ قرآن بھی مکمل ہو گیا اور احادیثِ رسول کے مجموعے بھی مکمل ہو گئے۔ اب اس کے بعد یہ کہ ختمِ نبوت نے مہر لگا دی۔ نبی اور رسول آ نہیں سکتا۔ تو اب کیا ہو؟

نبی اور رسول کسے کہتے ہیں؟ یہ ہوتا کیا ہے؟

عزیزانِ من! پہلے آپ سوچ لیجیے کہ جسے آپ نبی یا رسول کہتے ہیں' وہ ہوتا کیا تھا۔ قرآنِ کریم نے خود انسان کے متعلق کہا ہے کہ ہم نے اسے علم حاصل کرنے کی صلاحیت عطا کی ہے۔ انسانوں کے علم حاصل کرنے کے ذرائع ہمارے سامنے ہیں۔ یہ ذرائع مطالعہ ہے' مشاہدہ ہے' تجربہ ہے' کسی استاد سے تعلیم حاصل کرنا ہے۔ یہ علم کے ذرائع ہیں۔ اس میں انسان اپنی محنت کرتا ہے' غور و فکر کرتا ہے' تجربے مشاہدے سے نتائج تک پہنچتا ہے' انہیں آگے منتقل کرتا ہے۔ یہ وہی ہے جسے ہم کہتے ہیں کہ تاریخ کی رو سے علم آگے چلتا ہے۔ انسان کے پاس یہی ذرائع ہیں۔ جیسا میں نے عرض کیا تھا کہ اس میں ایک استثنیٰ ہوئی تھی اور وہ ایک عظیم انقلاب تھا۔ وہ استثنیٰ یہ ہوئی تھی کہ خدا کی طرف سے کسی ایک برگزیدہ فرد کو براہِ راست کچھ علم ملتا تھا' جس میں اس کے مطالعہ' مشاہدہ' تجربہ' غور و فکر' اپنی محنت اور اپنے کسب و

---

[1] سید ابوالاعلیٰ مودودی مرحوم (1903 - 1978)

ہنر کا کوئی دخل نہیں ہوتا تھا۔ یہ وہی ہے جسے Objective Reality کہا جاتا ہے۔ یہ خارج سے ایک حقیقت تھی جو قلبِ نبوی میں اتاری جاتی تھی۔ یہ بالکل ایک Exceptional (استثنائی) چیز ہے۔ یہ وحی کا Exceptional ذریعہ تھا۔ جسے یہ چیز عطا ہوتی تھی اسے نبی یا رسول کہتے تھے۔ یہ خدا کی طرف سے براہِ راست کچھ علم ملتا تھا۔ ختمِ نبوت کے معنی یہ ہوئے کہ یہ ذریعہ علم ختم ہوگیا۔ اس میں زبر یا زیر کا سوال نہیں۔ عزیزانِ من! اسے اچھی طرح سمجھ رکھیے کہ یہ جو Exceptional یعنی استثنائی ذریعہ علم تھا' جو انبیاء کے لیے مخصوص تھا یا جسے وحی خداوندی کہا جاتا ہے' وہ ختم ہوگیا۔ ختمِ نبوت کے معنی یہ تھے کہ یہ ذریعہ علم ختم ہوگیا۔ اب حضور ﷺ کے بعد اگر کوئی یہ دعویٰ کرتا ہے کہ اُسے خدا کی طرف سے' اس طرح بغیر اپنے کسب و ہنر' محنت' مشقت' مطالعہ' مشاہدہ' تجربے کے براہِ راست علم ملتا ہے تو وہ ختمِ نبوت کی مہر کو توڑتا ہے۔ اس طرح حضور کے بعد براہِ راست علم ملنے کا ذریعہ ختم ہوگیا۔ وہی چیز ہے جسے آپ نبوت کہتے ہیں۔ وہ جو خدا کی طرف سے وحی ملتی تھی وہ ختم ہوگئی تھی۔ جو یہ کہتا ہے کہ یہ اب بھی ملتا ہے' وہ کہتا ہے کہ وحی اور علم کا اس طرح ملنا ختم نہیں ہوا۔ یہی تو ختمِ نبوت کا انکار ہے۔ تاریخ ہمیں بتا رہی ہے کہ اس عقیدے کی ابتدا شروع سے ہی ہوگئی تھی یہ بعد کی بات نہیں ہے۔

شیعہ حضرات کی چار کتابیں

عزیزانِ من! آپ کو معلوم ہے کہ میرا کسی مذہبی فرقے سے تعلق نہیں ہے۔ مجھے تو تاریخ بیان کرنی ہوتی ہے۔ شیعہ حضرات کا جو عقیدۂ امامت [1] ہے' وحی یعنی براہِ راست علم ملنے سے اس کا آغاز ہوتا ہے۔ ان کے ہاں امام ہی وہی ہے جسے خدا کی طرف سے براہِ راست علم ملتا تھا۔ ٹھیک ہے' ان کے ہاں کا یہ عقیدہ ہے' وہ اسے مانتے ہیں۔ میں تو اس تناظر میں یہ عرض کر رہا ہوں کہ وحی یا نبوت کا تصور' اس کی Definition (تعریف) یہ ہے کہ اس میں نبی/ رسول کو خدا کی طرف سے براہِ راست علم ملتا تھا۔ یہ سلسلہ حضور نبی اکرم ﷺ پر ختم ہوگیا۔ یہ جو میں نے ابھی عرض کیا ہے اِس کے انحراف کرنے سے شیعہ حضرات کا عقیدۂ امامت آیا۔ آپ حضرات اگر اس کی تفصیل معلوم کرنا چاہیں تو کلینی کی کتاب الکافی موجود ہے۔ ان کے ہاں احادیث کی چار کتابیں ہیں۔ جیسے ہمارے ہاں احادیث کی چھ کتابیں گنی جاتی ہیں' ان کے ہاں چار ہیں۔ یہ چاروں کتابیں اس لیے معتبر ترین ہیں کیونکہ یہ اپنے ائمہ کرام کے سوا کسی اور کی روایت قبول نہیں کرتے اس لیے ان کے ہاں یہ چاروں کتابیں بڑی معتبر ہیں۔

---

[1] شیعہ حضرات کے ہاں امام کا ایک خاص مفہوم ہے۔ ختمِ نبوت کے معنی یہ ہیں کہ دین میں سند اور حجت قرآن مجید ہے اور کسی شخص کو اس کا حق حاصل نہیں کہ وہ کسی سے کوئی بات (جو قرآن سے باہر ہے) یہ کہہ کر منوائے کہ وہ خدا کا حکم ہے۔ خدا سے براہِ راست علم حاصل ہونا خاصۂ نبوت تھا۔ لیکن ہم اصول الکافی میں دیکھتے ہیں کہ اس میں امامت کو بھی شریک کر لیا گیا ہے اگرچہ اس کے لیے اصطلاح نبی کی نہیں اختیار کی گئی' ایک اور اختیار کی گئی ہے۔ وہ اصطلاح ہے محدث کی (د کے زبر کے ساتھ)۔ اس کے برعکس سنی حضرات علوم دین کے ماہرین کو امام کہہ کر پکارتے ہیں۔ مثلاً امام بخاری' امام طبری' امام ابوحنیفہ رحمہم اللہ۔ (پرویزؒ: شاہکارِ رسالت......عمر فاروقؓ......ادارہ طلوع اسلام لاہور' 1987' ص ص۔ 481' 504)۔

الکافی میں امام کی Definition (تعریف) اور اس کے مضمرات

عزیزانِ من! سنیوں میں سے سب سے زیادہ معتبر امام بخاری کی صحیح بخاری سمجھی جاتی ہے۔ اسی طرح شیعہ حضرات کے نزدیک الکافی ہے۔ آپ اس میں امام کی Definition (تعریف) دیکھ لیجیے اس میں امامت کے معنی یہ ہیں کہ جہاں سے محمد ﷺ کو یہ علم وحی ملتا تھا وہیں سے امام کو علم ملتا ہے مگر اس کے لیے اصطلاح مختلف ہے۔ وہ اصطلاح قرأت میں مُحَدَّثٌ آئی ہے۔ اس کی سند بھی وہی اختلافِ قرأت دی جاتی ہے۔ یہیں سے وہ شیعہ ہو گئے اور آپ کو معلوم ہے کہ سنی حضرات ان کے خلاف ہزار برس سے اٹھے ہوئے ہیں اور حیرت کی بات یہ ہے کہ بعینہٖ یہی عقیدہ اپنے ہاں لیے ہوئے ہیں کہ مُحَدَّثُ بھی پیدا ہوتے ہیں' یہ خدا کی طرف سے ہیں' مامور من اللہ ہیں۔ انہیں یہ حضرات اولیائے کرام کہتے ہیں۔ یہ صرف اور صرف الفاظ بدلے ہوئے ہیں: وہاں امام ہے' یہاں ولی ہے۔ شیعہ حضرات نے امامت وہاں یعنی ایک خاص مقام تک رکھی اور آپ یہ سن کر حیران ہونگے کہ ہزار برس سے یہ جھگڑا چلا آ رہا ہے کہ سنی یہ کہتے ہیں کہ نہیں' امامت کا عقیدہ دین نہیں ہے۔ اسی پہ تو ہم جھگڑتے ہیں اور وہ کہتے ہیں کہ اس عقیدہ امامت سے انکار دین کا انکار ہے۔ امامت پر تو یہ سارا کچھ ہو رہا ہے۔ سُنّیوں کے ہاں بھی مامور من اللہ چلے آ رہے ہیں' وہی خدا کے ہاں سے براہِ راست علم پانے والے محدَّث ہیں۔ میں نے ابھی عرض کیا ہے کہ یہ شیعوں کے ہاں بھی ہیں۔ وہ محدَّث ہیں۔ سنیوں کے ہاں تو یہ روایت حضرتِ ابنِ عباس کی ہے۔ یہ سنیوں کے ہاں پہلے صحابہ کرام میں سے سب سے بڑے مفسر ہیں۔ جو قرأتِ حضرتِ عباسؓ میں آیا ہے' وہ اسے تسلیم کرتے ہیں۔ اس طرح یہ تسلیم کرتے ہیں کہ یہاں نبی اور رسول کے ساتھ محدَّث بھی خدا کی طرف سے آتے تھے۔ اب نبی اکرم ﷺ کی ذاتِ اقدس پہ جو سلسلہ ختم ہوا ہے وہ نبوت کا ختم ہوا ہے' محدثیت کا ختم نہیں ہوا۔ نام بدل لیا تو پھر امامت' نبوت نہیں' امامت ہے۔ ان کے ہاں نبوت نہیں' محدَّثیت ہے۔ اس تصور نے ایک اور گھناؤنی سازش کو جنم دیا۔

ساتویں سازش: سو سال کے بعد مجدد کا عقیدہ' امام مہدی کا عقیدہ

عزیزانِ من! ایک اور سازش [1] پروان چڑھائی گئی کہ ہر سو سال کے بعد ان کے ہاں ایک مجدد پیدا ہوتا ہے۔ یہ مامور من اللہ ہوتا

---

[1] ابو مسلم خراسانی' جس کا نام ابراہیم بن عثمان بن بشار تھا' نے ''اہل بیت'' کے نام سے پراپیگنڈہ شروع کیا۔ یہ ایرانی الاصل تھا' بزرجمہر کی اولاد سے تھا' اصفہان میں پیدا ہوا اور کوفہ میں ابتدائی پرورش پائی۔ یہ بلا کا ذہین اور اعلیٰ تنظیمی صلاحیتوں کا مالک تھا۔ پراپیگنڈہ کے فن میں اس کا کوئی حریف نہیں تھا۔ محمد (عباسی) کے بیٹے ابراہیم نے اس کی صلاحیتوں کو بھانپا اور پراپیگنڈہ کا شعبہ اس کے سپرد کر دیا۔ اس نے ''اہل بیت'' کے نام سے اس قدر شد و مد سے پراپیگنڈہ کیا کہ سلطنت بنی امیہ (750-661ء) کی بنیادوں میں تزلزل واقع ہو گیا۔ 122ھ میں امام زین العابدین کے فرزند زید نے کوفہ میں بغاوت کر دی۔ ابو مسلم خراسانی کا پروپیگنڈہ کامیاب ہو گیا۔ اُس زمانے میں ایک ''آنے والے'' (مہدی) کا عقیدہ بھی عام ہو رہا تھا۔ اس کے ساتھ ہی اس قسم کی روایات بھی پھیلائی جا رہی تھیں کہ آنے والا خراسان سے آئے گا۔ ابو مسلم نے اس آنے والے کا پراپیگنڈہ بڑی شد و مد سے کیا۔ جب فضا سازگار ہوئی تو اس نے 128ھ میں خراسان فتح کر لیا۔ اور 132ھ میں ایک فیصلہ کن جنگ کے بعد بنی امیہ کا خاتمہ ہو گیا اور سلطنت بنو عباس کی طرف منتقل ہو گئی۔ ان کا پہلا خلیفہ عبداللہ تھا جو سفاح کے لقب سے مشہور ہے۔

ہے۔ مامور من اللہ کے معنی ہیں اللہ کیطرف سے بھیجا ہوا۔ اس مامور من اللہ کے بارے میں یہ عقیدہ پیدا کیا گیا کہ اسے خدا سے وحی کا علم ملتا ہے اور آخرالامر مہدی آخرالزمان آئے گا' اس کے بعد قیامت آجائے گی۔ ان کا یہ عقیدہ شیعہ حضرات کے ہاں امام کی صورت میں کارفرما ہے وہ اپنے آخری امام کے متعلق یہی عقیدہ رکھتے ہیں۔ سنیوں کے ہاں بھی یہ عقیدہ موجود ہے۔ مجھے ان الفاظ سے بحث نہیں۔ یاد رکھیے کہ بات پھر وہی ہے کہ وہ ذریعہ علم جو استشنائی تھا' جو صرف انبیا تک مخصوص تھا' وہ ذریعہ علم چلا آرہا ہے اور حضور اکرم ﷺ پر آکر ختم ہو گیا مگر شیعہ حضرات نے اپنے ہاں اس استثنائی ذریعہ علم کو جاری وساری رکھا۔ وہ اپنے ہاں اسے گیارہ امام تک لے گئے جو ظاہر تھے اور پھر بارھویں امام' جو غائب ہیں' اس استثنائی ذریعہ علم کو وہیں تک رکھا۔ یہ سلسلہ شیعہ حضرات کے ہاں 12 اماموں کے بعد آگے نہیں چلا مگر یہ جو اسماعیلی جن کو آپ خوجے یا بوہرے [1] وغیرہ کہتے ہیں' ان میں یہ سلسلہ ابھی تک ختم نہیں ہو رہا۔ ان کے ہاں کے ظاہر امام چلے آرہے ہیں اور ان کے ہر امام کے متعلق ان کا یہی عقیدہ ہے۔ آغا خان [2] ان کے امام تھے اور اب ان کے پوتے (پرنس) کریم آغا خان (پیدائش 1936ء) ان کے امام ہیں۔

آٹھویں سازش: سنیوں کے تصورِ حیات میں وحی کی جگہ کشف اور الہام کا عقیدہ

عزیزانِ من! اس قبیل کے عقیدے کے سلسلے میں سنی حضرات بھی پیچھے نہیں رہے۔ انہوں نے کہا کہ صاحب! ہم تو اکثریت میں ہیں۔

---

[1] شیعوں کے جس گروہ نے امام باقرؒ (م۔117ھ) کو امام برحق تسلیم کیا' وہ ان کے بعد' ان کے بیٹے امام جعفر صادقؒ (م۔148ھ) کی امامت کے بھی قائل رہے۔ لیکن ان کے بعد یہ پھر دو گروہوں میں بٹ گئے۔ انہی دو گروہوں نے تاریخ میں شہرت حاصل کی۔ ان میں سے ایک گروہ نے کہا کہ امام جعفر صادقؒ کے بعد' ان کے فرزند اکبر اسماعیلؒ امام منصوص ہیں اور دوسرے گروہ نے ان کے بجائے' ان کے دوسرے بیٹے امام موسیٰؒ کاظم (م۔182ھ) کو امام تسلیم کر لیا۔ اول الذکر' کو شش امامیہ' [کیونکہ وہ پہلے چھ اماموں [(۱) حضرت علی رضی اللہ عنہ (م۔40ھ)' (۲) امام حسن رضی اللہ عنہ (م۔49ھ)' (۳) امام حسین رضی اللہ عنہ (م۔61ھ)' (۴) امام زین العابدین (م۔95ھ)' (۵) امام باقر (م۔117ھ) اور (۶) امام جعفر صادق (م۔148ھ) کو ائمہ برحق تسلیم کرتے ہیں] یا اسماعیلیہ کہا جاتا ہے۔ باطنی فدائی اور اس قسم کے دوسرے غالی شیعہ فرقے' عام طور پر انہی سے متعلق ہیں۔ آج کل' آغا خانی اور بوہرے' اس فرقہ کی دو مشہور شاخیں ہیں۔ ہندوستان میں اسماعیلی' خوجوں (آغا خانیوں) اور بوہروں پر مشتمل ہیں۔ اسماعیلیوں کا سب سے مشہور فرقہ نزاری ہے جس کا ایک امام حسن بن صباح تھا۔ باطنی فدائی اس کے معتقدین کہلاتے تھے۔ آغا خانیوں اور بوہروں کا تعلق اس فرقہ سے ہے۔ دوسرا فرقہ' جس نے امام جعفر صادق (م۔117ھ) کے دوسرے بیٹے امام موسیٰ کاظم کو اپنا امام تسلیم کیا تھا' اثنا عشری یا امامیہ کہلاتا ہے اور جمہور شیعہ اسی سے متعلق ہیں۔ یہ بارہ اماموں کے قائل ہیں اور اسی سلسلہ کے آخری امام (محمد) کے متعلق ان کا عقیدہ ہے وہ زندہ ہیں اور عراق کے ایک غار میں مستور۔ قیامت کے قریب' ان کا ظہور ہوگا اور وہ ساری دنیا پر اپنی حکومت قائم کریں گے۔ انہی کو امام مہدی کہا جاتا ہے۔ شیعوں کا کوئی فرقہ بھی ہو' امام کے منصوص ہونے اور مہدویّت (یعنی ایک آنے والے امام) کا عقیدہ ان سب کے ہاں پایا جاتا ہے۔ ان تمام کی مکمل تفصیل کے لیے دیکھیے: پرویزؒ: شاہکار رسالت...... عمر فاروق رضی اللہ عنہ ...... ادارہ طلوع اسلام' لاہور' 1987ء' ص ص۔474,475,480۔

[2] حسن علی شاہ آغا خان اول (81-1804ء)

ہمارے ہاں جو صوفیائے کرام یا اولیاء اللہ ہیں' انہیں اسی طرح سے براہِ راست' خدا کی طرف سے' یہ علم حاصل ہوتا ہے۔ مگر انہوں نے اسے وحی نہیں کہا۔ اس کو الہام کہا یا کشف کہا۔ آپ کی ساری تاریخ اس سے بھری پڑی ہے۔ تاریخ کیا بھری پڑی ہے...... اُتھے تے اِٹ چکّو تے پتہ نہیں کتنے نکل اون ❶ ...... ہر وہ مزار جسے اس کا مجاور ذرا سا بھی اونچا کر دے اور ایک جھنڈی لہرا دے یا وہاں اوقاف والے ڈگڈگی بجا کے ایک عرس کر دیں' تو اس کا شمار اولیاء اللہ میں ہو جاتا ہے آپ ہزار کہتے رہیے یا جو دوسرے ہیں' رقابت بھی تو پروفیشنل ہوتی ہے' وہ کہتے رہیں کہ صاحب! یہ تو بھنگی تھا' چرسی تھا' مگر کوئی نہیں مانے گا۔ ہمارے سامنے یہ سب کچھ ہوتا تھا۔ انہوں نے کہا کہ یہ ملامتیے ❷ ہوتے ہیں' یہ حضرات جان بوجھ کے یہ کچھ کرتے ہیں تاکہ دنیا ان سے نفرت کرے' ورنہ یہ ہر دور میں ہوتا ہے۔ یہ جو کرہ ارض کی سطح پہ چلتا ہے کہ کوئی گورنر جنرل یا کوئی پریذیڈنٹ ہے یا وزیرِ اعظم ہے اور پھر ان کے نیچے کوئی کمشنر' کوئی ڈپٹی اور کوئی مجسٹریٹ ہے۔ یہ سارے اسٹیج کے ایکٹرز (اداکار) ہیں۔ اصل میں اسٹیج کے پیچھے جو کچھ ہو رہا ہے' وہ سطح ارض کے نیچے ہے۔ یہ جتنے بھی قبروں میں لیٹے ہوئے ہیں' بقول ان کے' یہی سب کچھ ہیں اور یہ جو کچھ سطحِ ارض کے اوپر ہے' وہ تو محض اس کرہ ارض کی اسٹیج کے ایکٹرز (اداکار) ہیں اصل تو وہ ہیں جو قبروں میں محوِ استراحت ہیں۔ بہر حال ان سب کے متعلق یہ عقیدہ ہے کہ انہیں خدا کی طرف سے الہام ہوتا تھا۔ یہاں یہ حضرات وحی کا لفظ استعمال نہیں کرتے۔ انہوں نے ان کے لیے نبی کا لفظ بھی استعمال نہیں کیا۔ ان میں سے کچھ تھے' جنہوں نے یہ بات بھی کہدی تھی' مگر اس کو دبا دیا گیا اور انہی کی وجہ سے یہ جو قادیانی نبی ❸ تھا غلطی کھا گیا اور اس نے یہ سمجھا کہ اگر ان لوگوں نے انہیں کچھ نہیں کہا تو مجھے بھی کچھ نہیں کہیں گے۔

شیخ اکبر محی الدین ابن عربی کا دعویٰ: ہمارا اور رسول اللہ کا مقامِ علم ایک ہی ہے

عزیزانِ من! صوفیائے عظام میں محی الدین ❹ ابن عربی جنہیں شیخ اکبر کہا جاتا ہے' کا نام تو آپ جانتے ہیں کہ وہ کس مقام پہ

---

❶ یہاں تو ہر اینٹ کے نیچے معلوم نہیں کتنے ہی ایسے حضراتِ کرام دفن ہوں گے!

❷ فقیروں (درویشوں) کا ایک ٹولہ

❸ یہاں اشارہ مرزا غلام احمد قادیانی (1908 - 1835) کی نبوتِ باطلہ کی طرف ہے۔

❹ محی الدین ابن عربی سرخیل صوفیا ہیں۔ ''فصوص الحکم'' ان کی مشہور کتاب ہے۔ اس میں یہ لکھتے ہیں کہ ''جس مقام سے نبی لیتے تھے اُسی مقام سے انسانِ کامل صاحب الزماں' غوث' قطب لیتے ہیں۔'' محققین کا خیال ہے کہ ابن عربی' اخوان الصفا کے نظریات و معتقدات سے متاثر تھے۔ اخوان الصفا' باطنی مسلک اسماعیلیہ کے پیرو' مصنفین کا ایک گروہ تھا جس نے (اپنے ناموں کا انکشاف کیے بغیر) کچھ رسائل تصنیف کیے تھے۔ ان کی تعلیمات' محمد ابوالقاسم الاندلسی (متوفی 395ھ) کی تصانیف کے توسط سے افریقہ اور اندلس (ہسپانیہ) تک رائج ہو گئیں تھیں اس لیے ان محققین کا قوی گمان ہے کہ ابن عربی انہی کے فلسفہ سے متاثر تھے۔ تصوف کی جو تصویر ان کے ہاں نظر آتی ہے وہ ایک حد تک اخوان الصفا کی تعلیمات کا عکس ہے۔ (حوالہ: مرزا محمد سعید مرحوم کی کتاب مذہب اور باطنی علوم)

آ تا ہے۔ وہ صریحاً کہتے ہیں کہ ہم لوگ اسی مقام سے علم حاصل کرتے ہیں جس مقام سے رسول اللہ ﷺ علم حاصل کیا کرتے تھے۔ یہ کچھ اسلاف کے اقوال میں بھی آیا ہے اور ان لوگوں کے بھی اقوال میں آیا ہے۔ یہ کہتے ہیں کہ یہ ٹھیک ہے کہ رسول نہیں آ سکتا' مگر نبی آ سکتا ہے۔ ان کے ہاں یہ چیزیں جو انہوں نے کہی ہیں نئی بات نہیں تھی ❶ اگر وہی بات رہتی جو انہوں نے پہلے مجدد' مجتہد' محدث ❷ کے سلسلے میں کی تھی یعنی اس میں لفظ نبی نہ آتا' تو مسلمان کچھ بھی نہ کہتے۔ وہ انہیں تو ہزار برس سے Tolerate (برداشت) کرتے ہوئے چلے آ رہے تھے۔ صرف Tolerate (برداشت) کرتے ہوئے ہی نہیں یعنی انہیں برداشت کرتے ہوئے ہی نہیں چلے آ رہے تھے بلکہ ان لوگوں کو سر آنکھوں پہ بٹھاتے چلے آ رہے تھے۔ ان لوگوں کو اگر وہ بھی ولی اللہ یا مامور من اللہ یا محدَّث والی بات تک ہی

---

❶ ہم دیکھ چکے ہیں کہ ختم نبوت کی مہر کو توڑنے اور وحی کے مقابلے میں اُس کا ہم پایہ ایک نیا دروازہ کھولنے کے لیے محدثیت کا نظریہ وجود میں لایا گیا لیکن یہ خصوصیت اہل تشیع کے ائمہ کرامؒ تک محدود رہی۔ اس لیے اس کا اثر و نفوذ بھی انہی کے دائرے میں مقید۔ سنیوں کے ہاں اس کے مقابل' دو قسم کی وحی کا نظریہ اختراع کیا گیا اور قرآن سے خارج عقاید و احکام کو قرآن کا ہم پایہ قرار دے دیا گیا لیکن یہ چیز نبی اکرمؐ کی ذات اقدس تک محدود رہی اور اس کا ماحصل احادیث کے سرمایہ میں مقید۔ ضرورت اس امر کی محسوس کی گئی کہ خدا کے ہاں سے ''براہِ راست علم پا لینے'' کے اس امکان کو قیامت تک دراز کر دیا جائے۔ اِس ضرورت کو تصوف نے آ کر پورا کر دیا۔ وہ تصوف جس کے متعلق علامہ اقبال (1938 - 1877) نے سید سلیمان ندوی مرحوم (1884- 1935) کے نام اپنے ایک مکتوب میں لکھا تھا کہ: ''اس میں ذرا بھی شک نہیں کہ تصوف کا وجود ہی سرزمین اسلام میں ایک اجنبی پودا ہے جس نے عجمیوں کی دماغی آب و ہوا میں پرورش پائی ہے (اقبال نامہ۔ جلد اول' ص۔ 78)۔'' کہا جاتا ہے کہ اسلام میں پہلا شخص جو صوفی کے لقب سے مشہور ہوا کوفے کا رہنے والا ابو ہاشم عثمان بن شریک تھا جس کی وفات 160ھ کے قریب رملہ کی خانقاہ میں ہوئی۔ تصوف کی بنیاد اس عقیدے پر ہے کہ انسان' خاص قسم کے مجاہدات' ریاضیات' مراقبات اور چلہ کشیوں کے ذریعے اس مقام پر پہنچ سکتا ہے جہاں وہ خدا سے براہِ راست مکالمہ اور مخاطبہ کر سکے۔ ظاہر ہے کہ شیعہ حضرات' اس عقیدے کے حامی نہیں ہو سکتے تھے کیونکہ وہ اس قسم کے مخاطبہ اور مکالمہ کو اپنے ائمہ منصوصؒ میں محدود سمجھتے ہیں اور وہی خیال کرتے تھے۔ اس لیے انہوں نے صوفیہ کی مخالفت کی لیکن یہ عجیب بات ہے کہ صوفیہ کے تمام خانوادے (نقشبندیہ کے سوا) اپنے ائمہ کی وساطت سے حضرت علیؓ تک پہنچے ہیں' جنہیں متفقہ طور پر شاہ ولایت تسلیم کیا جاتا ہے۔ ان کے نزدیک ولایت کا درجہ خلافت سے بہت بلند ہے۔ اتنا ہی نہیں' صوفیہ کے نزدیک' تصوف کے بلند ترین مقام پر صرف اہل بیت پہنچ سکتے تھے۔ چنانچہ ابن عربی ''فتوحاتِ مکہ'' میں لکھتے ہیں کہ قطب الاولیا ہمیشہ اہل بیت میں سے ہوتا ہے۔ دیگر صوفیا' جو ان سے متفق نہیں' ان کا عقیدہ ہے کہ قطب الاقطاب' بہرحال اہل بیت میں سے ہوتا ہے۔ مزید تفصیل کے لیے دیکھیے: پرویزؒ: شاہکارِ رسالت...... عمر فاروق رضی اللہ عنہ...... ادارہ طلوع اسلام' لاہور 1987' ص ص۔ 519 - 518۔

❷ اہل تشیع کے ہاں محدثیت کا عقیدہ یہ تھا کہ جس سرچشمۂ علم خداوندی سے رسول کو وحی ملتی تھی' اسی سے ائمہ کرام رحمۃ اللہ علیہم کو علم حاصل ہوتا تھا۔ بعینہٖ یہی عقیدہ اہل تصوف کا ہے۔ اس کے سرخیل صوفیا میں سے محی الدین ابن عربی ہیں جنہیں شیخ اکبر کہا جاتا ہے۔ صوفیا اپنے اس علم کا نام کشف اور الہام رکھتے ہیں۔ لفظ مذہب کی طرف یہ الفاظ بھی ان معنوں میں قرآنِ کریم میں کہیں نہیں آئے' نہ ہی اس میں تصوف یا صوفی کا لفظ کہیں آیا ہے۔ وحی اور کشف و الہام میں صرف لفظی فرق ہے' مفہوم و معانی کے اعتبار سے دونوں ایک ہی ہیں یعنی خدا سے براہِ راست علم حاصل ہونا۔ ان الفاظ کی مزید تفصیل و مضمرات کے لیے دیکھیے: پرویزؒ: شاہکار رسالت...... عمر فاروقؓ...... ادارہ طلوع اسلام' لاہور' 1987' ص ص۔ 520 - 519۔

رکھتے تو مسلمان کچھ نہ کہتے۔ اب بھی لاہوری اور قادیانی کے دونوں فرقوں میں' آپس میں' جو سر پھٹول چلی آ رہی ہے وہ اسی لیے چلی آ رہی ہے کہ انہوں نے یہ محسوس کرلیا کہ یہاں وہ ❶ غلطی کر گیا' اسے نبی کا یہ لفظ استعمال نہیں کرنا چاہیے تھا...... فیر سنّے خیراں سن' گل کیہڑی نویں کہی سی جی ❷ ...... آپ کی تو پوری تاریخ اس سے بھری پڑی ہے۔ اس نے تو یہی کہا تھا کہ مجھے خدا کی طرف سے براہِ راست ملتا ہے مگر آپ کی تو ساری تاریخ اسی سے بھری پڑی ہے۔

عزیزانِ من! درس کا وقت پھر تھوڑا رہ گیا۔ اب مجھے اس آیت پہ آنا ہے جہاں یہ کہا گیا تھا کہ کوئی رسول/ نبی ایسا نہیں گزرا جس کے ساتھ یہ ماجرا نہ ہوا ہو' یہ نہ بیتی ہو کہ شیاطین نے اس کی وحی میں کچھ نہ کچھ ملا دیا ہو اور ہمارا یعنی خدا کا طریق پھر یہ رہا کہ **فَيَنسَخُ اللّٰهُ مَا يُلْقِى الشَّيْطٰنُ ثُمَّ يُحْكِمُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ وَاللّٰهُ عَلِيْمٌ حَكِيْمٌ** (22:52)۔ خدا ان کی ملاوٹ کو' ان کی آمیزش کو' دوسرے نبی کے ذریعے سے منسوخ کر دیتا تھا' اپنی آیات کو محکم کر دیتا تھا' اللہ علیم اور حکیم ہے۔ اب ہم یہاں آ کر کھڑے ہو گئے کہ وہ جو دین میں اسے منسوخ کرنے کا پہلا سسٹم تھا وہ تو ختم ہو گیا۔ نسخ کے معنی مٹا دینے کے ہوتے ہیں: ان کو مٹا دینا' انہیں الگ کر دینا۔ یہ وہی کچھ تھا جس میں مفاد پرست اپنے مفادات کے لیے دین میں آمیزش کر دیتے تھے۔ جو لوگ بھی نئے رسول کی رسالت پر ایمان لاتے تھے ان کا یہ ایمان ہوتا تھا کہ اب وہ جسے دین کہے گا' وہی دینِ خداوندی ہوگا۔ وہ جو پہلے سے چلا آ رہا تھا' انہیں معلوم تھا' کہ اس میں آمیزشیں ہو گئی تھیں' وہ اب مٹ گیا ہے اور یہ رسول جو دین لایا ہے وہی دینِ خداوندی ہے۔ ان کا یہ ایمان ہوتا تھا۔ یہ تھا وہ طریقہ جس سے خدا شیاطین کی آمیزش کو مٹایا کرتا تھا۔

جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے کہ ختم نبوت سے وہ طریقہ تو اب ختم ہو گیا' رسول تو اب آنا نہیں ہے۔ اور وہ جو صحیح معنی میں' قرآن کی رو سے' ختمِ نبوت کے ماننے والے ہیں' ان کو یہ بھی ماننا پڑے گا کہ یہ طریقہ' جو خدا کی طرف سے' وحی دے کر بھیجنے کا تھا یا براہِ راست علم دینے کا تھا وہ ختمِ نبوت کے ساتھ ختم ہو چکا ہے۔ اب ان کے لیے لمحہ فکریہ یہ ہے کہ یہ جو آپ کے ہاں پھر دین کے اندر آمیزشیں ہو گئی ہیں انہیں کس طرح سے منسوخ کیا جائے۔ وہ پہلے والا طریقہ تو اب رہا نہیں ہے۔ جنہوں نے بھی دعاوی کیے تھے کہ ہم دین سے' یہ جتنی بھی آمیزشیں ہوئی ہیں' ان کو نکالنے کے لیے آئے ہیں' دینِ غالب دینے کیلیے آئے ہیں' وہ یہی محدّث' مجتہد' مجدد' صوفیا' ائمہ تھے۔ باطل نبی' مجدد کا یہ تصور ہی اس لیے آیا تھا کہ لوگ دین میں سو سال تک جو کچھ ملانا ہوتا ہے ملاتے ہیں۔ اللہ میاں بیٹھے تکدے رہن' کوئی گل نئیں' ملائی جاؤ' ملائی جاؤ۔ سونیار دی' اک لوہار دی۔ ❸

---

❶ یہاں اشارہ مرزا غلام احمد قادیانی (1908-1835ء) کی نبوتِ باطلہ کی طرف ہے۔

❷ پھر تو سب کچھ ٹھیک ٹھاک تھا۔ اس نے کون سی نئی بات کہی تھی۔

❸ اللہ میاں بیٹھے تکتے رہیں کہ کوئی بات نہیں جو کچھ بھی ملانا ہے' جس چیز کی بھی آمیزش کرنی ہے' کرتے چلے جاؤ اور پھر دیکھو کہ سونار کی ایک لوہار کی۔

دین کے معاملے میں مختلف مجددوں کا کردار کیا رہا؟ ایک لمحۂ فکریہ

عزیزانِ من! دین میں تصور یہی چلا آیا ہے کہ اللہ میاں نے سو سال کے بعد ایک مجدد بھیج دیا۔ وہ مجدد خالص دین کی تجدید کیلیے آتا تھا۔ اول تو ان سے پوچھیے آپ سو سال کے بعد ذرا گنائیں تو سہی کہ کون سی ملاوٹ انہوں نے الگ کی۔ میں بارِ دگر کہتا ہوں کہ آپ ان سے پوچھیے کہ دین میں جو ملاوٹ ہوئی تھی اس میں سے وہ کون سی باتیں تھیں جو انہوں نے اس کے اندر سے الگ کیں اور دینِ خالص کو پیش کیا۔ ہر مجدد کے آنے کے بعد' ایک اور نیا عقیدہ وضع ہو گیا' ایک اور نیا فرقہ وجود میں آ گیا۔ پھر یہ مامور من اللہ آتے تھے' کشف اور الہام والے جتنے بھی ہیں' آتے تھے۔ اِن کشف والہام والوں میں سے وہ کون تھے جنہوں نے دین کے اندر جو انحراف وتحریف ہو چکی تھی' جو ملاوٹیں ہو چکی تھیں' انہوں نے انہیں الگ کیا؟ Snow Ball کی طرح جوں جوں یہ سلسلہ آگے بڑھتا چلا گیا' برف کا یہ گولا زیادہ سے زیادہ موٹا ہوتا چلا گیا یعنی اگر کسی کو چھٹی صدی میں اپنے سے پانچ سو صدیوں پہلے گزرے ہوئے ان حضرات کے خلاف کہنا پڑتا ہے تو آج ہمیں اپنے سے تیرہ' چودہ صدیوں پہلے گزرے ہوؤں کے خلاف کہنا پڑتا ہے۔ برف کا یہ گولہ پہلے سے کہیں زیادہ موٹا ہوتا چلا جا رہا ہے اور پھر وہ ان کے خلاف کچھ کہنے کو برداشت بھی نہیں کر سکتے تھے چہ جائیکہ یہ تیرہ سو سال میں پیدا ہونے والوں کے خلاف وہ برداشت کریں......سائیں گھوڑے شاہ دے خلاف نئیں کچھ کہہ سکدے تسی [1] ......

عزیزانِ من! سوچنے کا مقام آ گیا کہ جنہوں نے انہی طریقوں کے تسلسل کو جاری رکھنا ہے وہ تو سمجھ لیتے ہیں کہ وہ آ کر یہ کچھ کر دے گا ٹھیک ہے جی! مجدد سہی' محدَّث سہی' اولیاء اللہ سہی' مامورین من اللہ سہی' بہرحال بقول ان کے اگر انہوں نے آنا ہے تو وہ اسی پر مطمئن رہیں گے کہ وہی ہیں جو آ کے پھر یہ کچھ کر دیتے ہیں۔ جس عقیدے کا' جس فرقے کا' کوئی وہ آتا ہے' اس فرقے والے اس کے متعلق سمجھ لیتے ہیں کہ وہ یہ کچھ کر دے گا' پھر اس کی تقلید شروع کر دیتے ہیں مگر یہ جو خدا نے کہا تھا کہ خدا پھر یہ کرتا ہے کہ جو کچھ بھی انہوں نے دین میں ملایا ہوا ہوتا ہے' اس کو مٹا دیتا ہے اور اپنی آیات کو محکم کرتا ہے۔ خدا کے یہ بڑے اہم لفظ ہیں کہ **ثُمَّ يُحۡكِمُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ** (22:53)۔ خدا اُس آمیزش سے پاک اور صاف کر کے' اپنے قوانین کو پھر محکم کر دیتا۔ یہ جو آیات اللہ ہیں' یہاں انہی کی تحکیم' انہی کو محکم کرنے کی بات ہے۔

عزیزانِ من! اب یہیں سے تو سارا مسئلہ حل ہو جاتا ہے۔ ابھی تک یہ غنیمت ہے کہ انہوں نے جو مختلف دعاوی کیے ہیں' ان کے نام الگ الگ رکھے ہیں۔ کسی نے بھی اپنے دعاوی میں آیات اللہ نام نہیں رکھا' اپنی ایک وحی کا' یا الہام کا' یا کشف کا' نام آیات نہیں رکھا۔ وہ ویسی ہی آیاتِ خداوندی ہیں۔ آیت اللہ کو یہ لوگ خدا کی مجسم نشانیاں کہتے ہیں۔ یہ جو اپنے ہاں ان کا الہام' کشف' یا ماموریت تھی' وہ قرآن کی آیات کی طرح آیات اللہ نام کی کوئی چیز نہیں تھی۔ آیات اللہ تو وہی ہیں جو تھیں۔ انہوں نے اپنے کسی دعاوی کا نام آیات اللہ نہیں رکھا۔

---

[1] آپ تو سائیں گھوڑے شاہ کے خلاف بھی کچھ نہیں کہہ سکتے۔

عزیزانِ من! اب ان دعاوی کی تنسیخ کا طریقہ یہ ہوگا کہ اب نبی نہیں آئے گا' مامور من اللہ نہیں آئے گا' آسمان سے کوئی نہیں آئے گا' اس کو خدا سے علم پانے کی ضرورت ہی نہیں رہے گی۔ اب قرآن کی آیات کو محکم کرنا ہے۔ قرآن کی آیات کو کسی نبی نے آ کر محکم نہیں کرنا' کسی رسول نے نہیں کرنا' خدا کی طرف سے براہِ راست علم پا کر نہیں کرنا۔ اب اس کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ جو آیاتِ خداوندی قرآن میں ہیں یہ محفوظ ہیں۔ ایسا کہنے والے کی پہلی بات تو یہ ہوگی کہ یہ کتاب اللہ حرفاً حرفاً لفظاً لفظاً وہی ہے' جو خدا نے نازل کی' جو رسول اللہ ﷺ نے امت کو دی' اور جس کی حفاظت کا ذمہ خدا نے لیا۔ پہلا ایمان یہ ہے۔ وحی یہی تھی' وحی کی کوئی اور قسمیں نہیں ہیں۔ خدا کی وحی اس قرآن کے اندر ہے' اس کی حفاظت کا ذمہ خدا نے لیا ہوا ہے۔ جسے قرآن نے اٰیٰتِہٖ کہا ہے' وہ اس قرآن کے اندر کی آیات ہیں۔ انہیں ضعیف کر دیا گیا ہے' اب انہیں محکم کرنا ہے۔ یہاں محکم لفظ آ گیا ہے' انہیں کمزور کر دیا ہے' انہیں مشکوک کر دیا گیا ہے' انہیں اپنی جگہ سے ہلا دیا گیا ہے۔ کرنے کی بات تو اتنی سی رہ گئی ہے کہ آیات اللہ کو ان کے مقام پہ محکم کر دیا جائے۔ اس کے لیے خدا سے علم پانے کی ضرورت ہی نہیں ہے' کسی مامور من اللہ کی حاجت ہی نہیں ہے' کسی آنے والے کی ضرورت ہی نہیں ہے۔ وہ آیات قرآنِ کریم میں موجود ہیں۔ بات صرف اتنی ہی ہے کہ یہ جو اس قرآن کے ساتھ اور عقائد آ گئے جو اس کے باہر بھی ہیں' روایات ہیں جو مثلہ معہ بھی ہیں' وہ بقول ان کے قرآن کی آیات کو منسوخ بھی کر سکتی ہیں' اس میں سے کچھ آیات مسنوخ بھی ہو گئی ہوئی ہیں' یہ سب کچھ خلافِ قرآن ہے۔

عزیزانِ من! دوسری بات یہ ہے کہ یہ جو کہتے ہیں کہ خدا کی طرف سے "آنے والے" آتے ہیں' وہ خدا کی طرف سے کچھ الہام پاتے ہیں' کچھ کشف ہوتا ہے۔ یہ اس قبیل کے جتنے بھی عقائد ہیں' یہ جتنے بھی امامت کے عقائد ہیں' محدّثین کے تصورات ہیں' یہ سارے خلافِ قرآن ہیں' ختمِ نبوت کے تصور کے خلاف ہیں' ان سے انکار کرنا ہوگا۔ جی! ان سے انکار کرنا ہوگا۔ اور وہ جس نے ختمِ نبوت کی لم کو اس وقت پا لیا تھا جب نبی اکرم ﷺ کی دنیاوی حیاتِ طیبہ کے آخری لمحات میں' نظر آتا تھا کہ اب نبی اکرم دنیا سے تشریف لے جا رہے ہیں' نبوت ختم ہو گئی ہے' اس کے ساتھ ہی حضور ﷺ کی وفات کے معنی یہ تھے کہ وہ ختمِ نبوت ہے جس نے اس لم کو پا لیا تھا' اس نے اعلان کر دیا تھا کہ حَسْبُنَا كِتٰبُ اللّٰهِ ہمارے لیے خدا کی کتاب کافی ہے۔ ❶ یہ اقبالؒ (1938 - 1877) نے بڑا صحیح کہا ہے کہ یہ ہے آیات اللہ کی تحکیم۔ جو حَسْبُنَا كِتٰبُ اللّٰهِ کہے گا وہ دین کو اپنی اصل شکل میں پیش کر سکے گا۔ سوال یہ ہے کہ کیا عجمی تصورات وعقائد کی سی سازشوں کا توڑ ممکن ہے اور کیا اسلام کو اس ملبے کے ڈھیر سے نکالا جا سکتا ہے؟ علامہ اقبال رحمہ اللہ (1938-1877) کا جواب یہ ہے کہ ایسا ممکن ہے اور یقیناً ممکن: بشرطیکہ اسلامی دنیا اس کی طرف عمر رضی اللہ عنہ کی روح لے کر آگے بڑھے۔ وہ عمر رضی اللہ عنہ جو اسلام کا سب سے پہلا تنقیدی اور حریت پسند قلب تھا۔ وہ جسے رسول اللہ کی حیاتِ طیبہ کے آخری لمحات میں یہ کہنے کی جرأت ہوئی کہ حسبنا کتٰب اللہ۔ ہمارے لیے خدا کی کتاب کافی ہے۔ ❶ آج اس کی ضرورت ہے جو یہ کہے کہ خدا کی کتاب قرآنِ کریم محفوظ ہے اور یہ دین کے

---

❶ خطباتِ اقبالؒ۔

لیے کافی ہے۔سوال یہ ہے کہ یہ ملاوٹیں جو کرتے تھے وہ کا ہے کیلیے تھیں؟ ابھی میں دو باتیں آگے عرض کردوں۔اگلی آیت ساتھ ہی شامل ہوگئی ہے جو اس سوال کا جواب ہے کہ وہ کیوں ایسا کرتے تھے؟ کہا کہ **لِيَجْعَلَ مَا يُلْقِي الشَّيْطٰنُ فِتْنَةً لِّلَّذِيْنَ فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ وَّالْقَاسِيَةِ قُلُوْبُهُمْ وَاِنَّ الظّٰلِمِيْنَ لَفِيْ شِقَاقٍۭ بَعِيْدٍ** (22:53)۔وحی خداوندی میں انسانی آمیزشوں سے ہوتا یہ کہ جن لوگوں کے دل میں (انفرادی مفاد پرستیوں کا) مرض ہوتا' یا جن کے دل حقائق قبول کرنے کی طرف سے سخت ہوجاتے' وہ خود بھی اس فتنہ میں مبتلا رہتے۔(اور دوسروں کو بھی اس میں مبتلا رکھتے)۔غور کرو کہ جو لوگ قوانینِ خداوندی سے سرکشی برتتے ہیں وہ اس باب میں کہاں تک چلے جاتے ہیں؟ یعنی وہ اس کی جرأت بھی کرلیتے ہیں کہ اپنی طرف سے شریعت وضع کرکے اسے خدا کی طرف منسوب کر دیں۔یہ کتنا بڑا ظلم ہے۔اس طرح' عزیزانِ من! اس سوال کا جواب یہ دیا کہ یہ ظالم تھے' دین سے بہت دُور نکل گئے ہوئے تھے دین کی انتہا درجے کی مخالفت کرنے والے تھے۔خدا اپنی ان آیات کو اس لیے محکم کرتا تھا تاکہ وہ ان لوگوں کے لیے فتنے کا باعث نہ بنیں۔

دین کو پروفیشن بنانے والے ظالم ہیں

عزیزانِ من! یہاں قرآن نے دو گروہ گنائے ہیں اور بڑی عجیب چیز کہی ہے۔یہ بتایا ہے کہ یہ جتنے انبیائے کرام کی مخالفت کرنے والے تھے' یہ مذہبی پیشوا ہوتے تھے جو دین کو پروفیشن بناتے تھے کیونکہ **يَكْتُبُوْنَ الْكِتٰبَ بِاَيْدِيْهِمْ ثُمَّ يَقُوْلُوْنَ هٰذَا مِنْ عِنْدِ اللّٰهِ لِيَشْتَرُوْا بِهٖ ثَمَنًا قَلِيْلًا** (2:79)۔یہ مذہبی پیشوا خود لکھتے تھے اور کہتے تھے کہ یہ شریعتِ خداوندی ہے تاکہ اس کے عوض ان کو چار پیسے مل جائیں۔قرآن نے انہیں دو گروہوں میں تقسیم کیا ہے اور عجیب چیز کہی ہے۔کہا کہ ایک تو ان میں وہ ہے جو جانتے بوجھتے یہ سب کچھ کرتے ہیں۔انہیں قرآن نے منافقین کہہ کے پکارا ہے اور کہا ہے کہ **فِيْ قُلُوْبِهِمْ مَّرَضٌ** (22:53) ان لوگوں کے دلوں میں انفرادی مفاد پرستیوں کا مرض ہوتا ہے' وہ منافقت کے مرض میں مبتلا ہوتے ہیں۔وہ جانتے ہوئے کہ یہ چیز قرآن کے خلاف ہے اپنی مفاد پرستی کے پیشِ نظر یہ کچھ جان بوجھ کر کرتے ہیں۔پیشوائیت کی لیڈرشپ کی مفاد پرستیاں ہوں یا ان کی اپنی انانیت ہو' کچھ بھی ہو' بہرحال ایک گروہ وہ ہے کہ جس کے متعلق کہا ہے کہ وہ جانتے بوجھتے ایسا کرتے تھے۔

صرف نیک نیتی حق وصداقت کا ثبوت نہیں ہوتی

عزیزانِ من! دوسرا گروہ خدا نے اُن کا کہا ہے جن میں صدیوں سے اندھی تقلید چلی آرہی ہے' جس نے ان کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں ہی مفقود کردی ہیں' ان کے دل ہی پتھر کے ہوگئے ہیں۔آپ کو یہ دونوں گروہ ملیں گے۔جنہیں عام طور پہ کہا جاتا ہے کہ صاحب! اِن کے سامنے تو کوئی کسی قسم کا بھی مفاد نہیں ہے' اللہ والا آدمی ہے' درویش سا ہے' بڑی سادہ سی زندگی بسر کرتا ہے۔اُس نے ساری عمر خدا واسطے دین کی تبلیغ کے لیے وقف کردی ہوئی ہے' وہ تو یہ کچھ نہیں کرتے' اس قسم کے گروہ کے لیے کہا کہ **اَلْقَاسِيَةِ قُلُوْبُهُمْ**

(22:53) ان کے دلوں میں سمجھنے سوچنے کی صلاحیت ہی نہیں رہی' ان کے دل حقائق قبول کرنے کی طرف سے سخت ہو چکے ہیں۔ان کے لیے کہا جاتا ہے کہ وہ نیک نیتی سے کرتے ہیں۔عزیزانِ من! نیک نیتی حق اور صداقت کا ثبوت یا اس کی سند نہیں ہو سکتی۔حق اور صداقت تو ایک طرف رہی وہ تو انگریزی کا محاورہ ہے کہ

Sincerity is not always a guarantee for sanity

نیک نیتی یا خلوص حق وصداقت کا کبھی ثبوت نہیں بنتے

جسے آپ نیک نیتی کہتے ہیں یہ بھی ضروری نہیں ہے کہ ہر دفعہ آپ نیک نیتی سے کہیں کہ وہ شخص عقلمند بھی تھا اور وہ واقعی عقلمند بن جائے۔سچ پوچھوتے ساڈے زمانے میں نیک نیت ہوندا ای او ہیگا جیہڑا بیوقوف ہووے۔[1] یہاں میں عام طور پہ کہہ رہا ہوں۔احباب مجھے معاف رکھیں یعنی یہ دور ہی ایسا آ جاتا ہے **اَلْقَاسِيَةِ قُلُوْبُهُمْ** (22:53)۔وہ لوگ ہیں جو اندھی تقلید کی بنا پہ چلے آتے ہیں۔ان میں سے کوئی دانستہ وہ کچھ کرتا ہے یا جس میں سمجھنے سوچنے کی صلاحیت ہی نہیں ہے' وہ کچھ مذہبی پیشوا بنا بیٹھا ہے۔دونوں ہی نے اس کے اندر جو کچھ ملا رکھا' وہ اسے محکم سے محکم تر کرتے چلے جاتے ہیں اور اگر کوئی آواز آیاتِ خداوندی کی تحکیم کیلیے اٹھتی ہے تو یہ دونوں گروہ اس کے پیچھے پڑ جاتے ہیں۔اور کہتے ہیں کہ یہ **عدو** ہے۔

عدو کا قرآنی مفہوم

عزیزانِ من! آیاتِ خداوندی کی تحکیم کرنے والے کی مخالفت میں یہ روش چلی آ رہی ہے کہ یہ دونوں ہی گروہ اس کے پیچھے پنجے جھاڑ کر پڑ جاتے ہیں لیکن اس میں تو کوئی شک ہی نہیں ہے کہ آیات اللہ اپنے مقام پر ایک کوہِ گراں ہیں۔آخر کار انسان کے تمام تصورات' نظریات' عقائد' مسالک اور مشارب انہی کے گرد گھومیں گے۔جیسے اقبالؒ (1877-1938) نے کہا ہے کہ کائنات زندگی را محور یعنی خارجی کائنات کی زندگی کا ایک ایک لمحہ قدرت کے مقرر کردہ قانون کے گرد ہی گھوم رہا ہے۔یہ ہے **يُحْكِمُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ** (22:52)۔ختمِ نبوت سے پہلے تو یہ ہوتا تھا کہ جب مفاد پرستیوں کے پیچھے چلنے والے لوگ خدا کی وحی کو اپنی طرف سے کچھ سے کچھ بنا دیتے' اس کے بعد خدا کا رسول آتا اور سابقہ وحی کو اُس آمیزش سے پاک اور صاف کر کے قوانینِ خداوندی کو پھر محکم کر دیتا۔اب خدا براہِ راست یہ کچھ نہیں کرے گا' اس نے اس سلسلے کو بند کر دیا ہے۔اب یہ کچھ انسانوں کے ہاتھوں سے ہی ہوگا۔عدو یہ ہونگے جو اس لکڑی کی طرح ہوں جو دو لکڑیوں کے درمیان دے دی جاتی ہے تاکہ وہ دونوں لکڑیاں ایک دوسرے سے دُور رہیں اور یہی قرآن کریم میں قصہ آدم میں ہے کہ جب انسانوں نے ''امت واحدۃ'' کے بجائے باہمی تشت وافتراق (مشاجرت) کی زندگی شروع کر دی تو ان کی انفرادی مفاد پرستیاں

---

[1] اگر سچ پوچھو تو ہمارے زمانے میں نیک نیت ہی وہ ہوتا ہے جو بیوقوف ہوتا ہے۔

ایک دوسرے کے درمیان حائل ہوگئیں اوران میں دُوری اور بُعد پیدا ہوگیا۔ یہ ہے عدو کا قرآنی مفہوم۔ میں نے ابھی عرض کیا ہے کہ قرآن کی اس آواز کے خلاف اٹھنے والے عدو ہیں۔ عزیزانِ من! جیسا کہ میں کہا کرتا ہوں اللہ تعالیٰ توفیق دیئے جائے' عمر ملے گی تو قرآن پیش کیے چلا جاؤنگا' زندگی کا کیا بھروسہ ہوتا ہے۔

قرآن کی ایک ایک آیت اپنی اپنی جگہ کوہِ گراں ہے

عزیزانِ من! میں یہ عرض کردوں کہ زندگی کے اندر' یہاں کا مسلمان ہو' کسی اور جگہ کے مسلمان ہوں' یا کوئی غیر مسلم ہو' کوئی انسان ہو' خدا کا یہ قرآن تو کسی امت کے لیئے' یا کسی خاص قوم کیلیے' مخصوص نہیں تھا۔ کوئی بھی ہو' جو بھی یہ ارادہ کرے کہ دینِ خداوندی کے مطابق زندگی کا نظام قائم ہوجائے اُسے یہ جرأت کر کے اٹھنا ہوگا کہ دینِ خداوندی صرف اور صرف اس قرآن کے اندر ہے۔ لہٰذا جو اس کے مطابق ہے وہ کہیں سے بھی اس کو ملے اور اس کی نسبت کسی کی طرف سے بھی کی جائے کیونکہ وہ اس کے مطابق ہے اس کو وہ قبول کرلے گا' جو اس کے خلاف ہے اس کی نسبت آپ کسی کی طرف کیوں نہ کر لیجیے وہ اس کو مسترد کر دے گا کیونکہ محکم یہ ہے' پیمانہ یہ ہے' معیار یہ ہے' کسوٹی یہ ہے' پرکھنے کا کوہِ گراں' جیسے میں نے کہا ہے' وہ یہ ہے۔ یہ اپنے مقام سے نہیں ہلے گا۔ **يُحْكِمُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ** (22:52) یہ عجیب الفاظ ہیں۔ وہ آیاتِ خداوندی ہی ہیں جو قرآن کے اندر ہیں' یہ محکم ہیں باقی سب اسی ہی کی تصدیق کی محتاج ہیں۔ جسے یہ صحیح کہے گا وہ صحیح ہوگی جسے یہ غلط کہے گا وہ غلط ہوگی۔

ختمِ نبوت شخصیت پرستی کا خاتمہ کردیتی ہے

عزیزانِ من! ختمِ نبوت کے معنی تھے شخصیت پرستی کا خاتمہ۔ اور یہ چیز تھی جو اللہ کے دین نے سکھائی' حضور ﷺ کی تربیت نے بھی سکھائی۔ اس سلسلے میں قرآن نے کہا کہ **وَمَا مُحَمَّدٌ اِلَّا رَسُوْلٌ قَدْ خَلَتْ مِنْ قَبْلِهِ الرُّسُلُ اَفَائِنْ مَّاتَ اَوْ قُتِلَ انْقَلَبْتُمْ عَلٰى اَعْقَابِكُمْ وَمَنْ يَّنْقَلِبْ عَلٰى عَقِبَيْهِ فَلَنْ يَّضُرَّ اللّٰهَ شَيْئًا ط وَسَيَجْزِى اللّٰهُ الشّٰكِرِيْنَ** (3:143) محمد ﷺ جیسی بلند شخصیت کا بھی یہ عالم ہے کہ وہ خدا کا ایک رسول ہے' اس سے پہلے بھی رسول آتے رہے' اپنے وقت میں چلے جاتے رہے' کل کو اگر یہ قتل ہوجائے' یا مار دیا جائے' تو کیا تم سمجھو گے کہ دینِ خداوندی کا خاتمہ ہوگیا؟ تو کیا تم سمجھو گے کہ اس محمد ﷺ کی موت سے یہ سارا نظام ختم ہوگیا؟ اور اُس کے بعد تم اپنی قدیم روش کی طرف پلٹ جاؤ گے اور یوں سمجھو کہ اب ہمیں پھر سابقہ ادیان کی طرف چلے جانا چاہیے جو مذہب بن چکے تھے۔ قرآن نے آگے کہا کہ جو ایسا کرے گا' کرلے' وہ خدا کا کچھ نہیں بگاڑ سکے گا' اپنا ہی نقصان کرے گا۔ خدا کا دین تو محکم ہو چکا ہے۔ یہ تھی وہ آیت جو حضرتِ صدیقِ اکبر رضی اللہ عنہ (634-573ء) نے وفاتِ رسول اللہ ﷺ کے وقت (634ء) منبر پہ کھڑے ہو کے پڑھی تھی اور اس کا اعلان کیا تھا کہ کیوں گھبرا رہے ہو' کیوں پریشان ہو رہے ہو' تم لوگوں نے یہ کیا واویلا مچا

دیا ہے' کیا بگڑا ہے' جو یہ وفات پا گئے ہیں! کہنے والا' عزیزانِ من! معاذ اللہ معاذ اللہ یہ نہیں تھا کہ مرنے والے کا دشمن تھا' معاذ اللہ یا یہ کہ کوئی اجنبی تھا کہ جس کو اس کے ساتھ کوئی تعلق نہیں تھا' یہ تو وہ تھا جسے قرآن نے یارِ غار کہا تھا۔ اتنا بڑا یارِ غار' تو اس دن سے ہمارے ہاں محاورہ ہو گیا۔ یہ یارِ غار اٹھ کے کہہ رہا ہے کہ اس سے کچھ نہیں بگڑا۔ یہ تھے قرآن کے سمجھنے والے اور یہ تھی اس رسول اللہ ﷺ کی دی ہوئی تربیت کہ ختمِ نبوت شخصیت پرستی کا خاتمہ کر دیتی ہے۔ خاتمہ اس طرح کر دیتی ہے کہ وہ کہہ یہ رہا ہے کہ اس کے بعد اب کسی شخص کو یہ حق حاصل نہیں ہوگا کہ دوسرے انسانوں سے آ کر یہ کہے کہ یہ جو کچھ میں کہہ رہا ہوں' میں نہیں کہہ رہا' یہ خدا کہہ رہا ہے۔ اس لیے میری بات مانو گے۔ وہ کہے گا کہ وہ خدا کی بات ہے جو تمہیں ماننی پڑے گی۔ ختمِ نبوت کا ماننے والا اس شخص کو یہ کہے گا کہ بس کرو' تم سے خدا نے جو کہنا تھا وہ قرآن کے اندر کہہ دیا۔ اب تم اپنی بات کہہ کے پیش کرو۔ ہم دیکھیں گے' ماننے کے قابل ہوگی تو مانیں گے' اگر یہ ماننے کے قابل نہیں ہوگی تو دھتکار دیں گے۔ اس لیے اقبال رحمہ اللہ (1877-1938) نے کہا تھا کہ ختمِ نبوت کے ماننے والی قوم کو تو دنیا میں سب سے بڑی آزاد قوم ہونا چاہیے تھا جو آج سب سے زیادہ غلام قوم ہو گئی ہے۔

عزیزانِ من! رسول اللہ ﷺ نے آ کر اغلال و سلاسل کو توڑ دیا تھا۔ قرآن کہتا ہے کہ انہوں نے ان اغلال و سلاسل' زنجیروں' طوق اور بیڑیوں کے جو ٹوٹے ہوئے ٹکڑے تھے اپنی عقیدت سے چنے اور پہلے سے کہیں زیادہ شدت سے ان کو ویلڈ (Weld) کر کے' محکم کر کے' اپنے بدن کا ایک ایک بال ان میں جکڑ لیا۔ ختمِ نبوت اور قرآن کی آیات کی تحکیم' دنیا میں سب سے بڑی آزاد قوم بنا دیتا ہے۔ وہ قوم' جیسا کہا گیا ہے' کسی بادشاہ یا کسی ڈکٹیٹر یا کسی شہنشاہ کا حکم چلانا تو ایک طرف رہا' دنیا کی جمہوریت کا اکاون فیصدی بھی ایک طرف ہو' تو بھی مغرب کے جمہوریت نظام کی سو فیصد انسانوں کی آراء بھی آ کے اس قوم کے کسی شخص کو اپنے فیصلے کا محکوم نہیں بنا سکتیں۔ جو ختمِ نبوت کا ماننے والا ہے کہہ دے گا کہ یہ تمہاری آراء ہیں ہمارے پاس خدا کی طرف سے عطا کردہ محکم آیات اللہ ہیں' ان کی سند لاؤ۔ جو اس کے مطابق ہیں' میں مانتا ہوں' تمہاری رائے سمجھ کر نہیں مانتا۔ اس لیے مانتا ہوں کہ قرآن نے اس کی صداقت کی شہادت دی ہے۔ اگر تمہیں یہ شہادت نہیں مل سکتی تو جو کچھ تم کہو' وہ دیوار کے ساتھ مار دینے والی چیز ہے۔ یہ ہے ختمِ نبوت اور یہ ہے عزیزانِ من! **يُحْكِمُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ** (22:52) کا طریقہ۔

عزیزانِ من! میں پھر عرض کر دوں کہ دنیا کی کوئی قوم ہو' ہم مسلمان کہلانے والوں کی قوم ہو' ختمِ نبوت کے بعد کوئی دوسری قوم ہو' جو بھی یہ چاہے گا کہ یہاں آیات اللہ کے مطابق دینِ خداوندی کا نظام قائم ہو' اسے آیات اللہ کو محکم کرنا ہوگا اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ جو بھی دین کے اندر آمیزشیں [1] ہوئی ہیں' وہ ان سب کو منسوخ کر کے اٹھے گا' پھر یہ دین قائم ہوگا۔ اور اسی لیے کہا کہ وہ جو آمیزشیں ہوتی تھیں'

---

[1] ایرانی سازش کا ملخص علامہ اقبالؒ (1877 - 1938) نے ایک فقرہ میں سمٹا دیا ہے جس میں کہا ہے کہ تسخیرِ ایران کا نتیجہ یہ نہ نکلا کہ ایران اسلام کا حلقہ بگوش بن گیا بلکہ یہ نکلا کہ اسلام' ایرانیت کے رنگ میں رنگا گیا۔ (Islam and Mysticism in New Era, Dated July28, 1917)

وہ تو اس لیے ہوتی تھیں کہ یہ جو منافقین، یہ جو قاسین قلوب ہیں، جو کچھ یہ دین کے نام پہ دین فروشیاں کرتے ہیں، ان کو خدا مٹائے **قَاسِيَةِ** (22:53) **وَ لِيَعْلَمَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَيُؤْمِنُوْا بِهٖ فَتُخْبِتَ لَهٗ قُلُوْبُهُمْ ط وَاِنَّ اللّٰهَ لَهَادِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ** (22:54)۔ یہی سلسلۂ وحی اب قرآن تک آ پہنچا ہے۔ اس میں وہ سب کچھ جو انبیاء سابقہ کی طرف بھیجا گیا تھا اصلی شکل میں جمع کر دیا گیا ہے۔ اس وحی میں انسانی آمیزش کا شائبہ تک نہیں، نہ ہی اس میں کوئی آمیزش ہو سکے گی۔ اس لیے کہ اس کی حفاظت کا ذمہ خود خدا نے لیا ہے (15:9)۔ جو لوگ علم و بصیرت سے کام لیں گے ان پر یہ بات واضح ہو جائے گی کہ جو کچھ قرآن میں دیا جا رہا ہے وہ تیرے نشو و نما دینے والے کی طرف سے حقیقت ثابتہ ہے۔ سو ان لوگوں کو چاہیے کہ (علم و بصیرت سے کام لے کر) قرآن کی صداقتوں پر ایمان لے آئیں اور اس طرح ان کے دل اس کے سامنے جھک جائیں۔ وہ اس کی اطاعت اختیار کر لیں۔ (ہمارا قانون یہ ہے کہ) جو لوگ وحی کی صداقت پر ایمان لے آئے ہیں، ہم ان کی رہنمائی زندگی کی متوازن اور سیدھی راہ کی طرف کر دیتے ہیں۔ اس طرح اس طریقے سے وہ لوگ جو صحیح ایمان رکھتے ہیں وہ علی وجہ البصیرت پکار اٹھتے ہیں کہ واقعی قرآن اور صرف قرآن خدا کی طرف سے واحد کتاب ہے۔ عزیزانِ من! یہ اگلی آیت (54) ہے، اسے ہم آئندہ درس میں لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّآ ط اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ط

❀❀ ...... ❀❀❀ ...... ❀❀

نواں باب: **سورۃ الحج** (آیات 54 تا 56)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قَالَ اَبَشَّرۡتُمُوۡنِیۡ عَلٰۤی اَنۡ مَّسَّنِیَ الۡکِبَرُ فَبِمَ تُبَشِّرُوۡنَ ﴿۵۴﴾
قَالُوۡا بَشَّرۡنٰکَ بِالۡحَقِّ فَلَا تَکُنۡ مِّنَ الۡقٰنِطِیۡنَ ﴿۵۵﴾
قَالَ وَمَنۡ یَّقۡنَطُ مِنۡ رَّحۡمَۃِ رَبِّہٖۤ اِلَّا الضَّآلُّوۡنَ ﴿۵۶﴾

عزیزانِ من! آج فروری 1977ء کی 13 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ الحج کی آیت 54 سے ہو رہا ہے: (22:54)۔

دین کی بنیادی اساس

بات تسلسل سے چلی آ رہی ہے اور جیسا کہ آپ کو معلوم ہے گزشتہ دو دروس اسی نکتے کی وضاحت میں صرف کیے گئے۔ بات بڑی اہم ہے کیونکہ یہ دین کے بنیادی اساسات میں سے ہے۔ اگر اسے اچھی طرح سے سمجھ لیا جائے تو پھر دین اپنی اصلی شکل میں قائم کیا جا سکتا ہے ورنہ دین مذہب کی شکل پر آ جاتا ہے اور پھر مذہب کو دین میں بدلنا بڑا مشکل ہوتا ہے۔ آیت 52، جس کی طرف میرا اشارہ ہے، میں جو کہا گیا ہے اگر میں اسے ملخصاً دو لفظوں میں عرض کر دوں تو وہ یہ ہے کہ نبی اکرم ﷺ سے یہ کہا گیا ہے کہ آپؐ سے پہلے بھی، ہر نبی اور رسول کے ساتھ، یہ ہوتا رہا کہ وہ خدا کا صحیح پیغام، منزہ شکل میں، لوگوں کو دے کر چلا جاتا رہا اور اس کے بعد شیاطین اس وحی میں آمیزشیں کر لیتے تھے۔ اس کے بعد شکل یہ پیدا ہوتی تھی کہ پھر ایک اور نبی بھیج دیا جاتا۔ وہ ان آمیزشوں کو الگ کر دیتا اور وحی خداوندی کو پھر محکم بنا کے لوگوں کو دوبارہ دے دیتا اور یہ سلسلہ اسی طرح سے چلا آیا۔

پہلی ہی کتاب کو کیوں نہ محفوظ رکھا گیا؟

عزیزانِ من! سابقہ دو دروس میں جب ناسخ و منسوخ کا قصہ آیا تھا تو میں نے یہ بیان کیا تھا کہ اس قسم کے پروسیس (عمل) کے لیے یہ طریقہ کار کیوں اختیار کیا گیا؟ پہلی ہی وحی، پہلی ہی کتاب کو کیوں نہ محفوظ رکھا گیا تاکہ یہ ضرورت ہی نہ پڑتی۔ میں نے یہ بات کہی

تھی تو دوسرا نبی آیا کرتا جس کی وساطت سے وہ منزہ شکل کی وحی خدا کیطرف سے دوبارہ آ جایا کرتی تھی' وہ ختم ہو گیا۔ ختمِ نبوت کے بعد یہ صورت تو باقی نہ رہی' باقی جہاں تک وحی کا تعلق تھا خدا نے اسے اپنے ذمے لے لیا کہ ہم نے اسے نازل کیا ہے اور ہم اس کی حفاظت کے ذمہ دار ہیں۔ یہ بات اچھی طرح سمجھ میں آ جانے والی ہے کہ ختمِ نبوت کے ساتھ یہی ہونا چاہیے تھا۔ یہ دونوں چیزیں لازم وملزوم ہیں۔ اگر ختمِ نبوت کی آیت قرآن میں نہ بھی ہوتی تو بھی یہی چیز کافی تھی کہ قرآن کے متعلق کہا گیا کہ **تَمَّتْ كَلِمَتُ رَبِّكَ صِدْقًا وَّعَدْلًا** (6:115)۔ اس قرآن میں' خدا کا ضابطۂ قوانین' تمام صداقتوں کو اپنے اندر لیے ہوئے' اور عدل وتوازن کے تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے' مکمل ہو چکا ہے اور پھر اس کے فوراً بعد کہا کہ **لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ** (6:115) اب ان قوانینِ خداوندی میں کوئی تغیر وتبدل کرنے والا نہیں۔ یعنی یہ مکمل ایسا ہے کہ اس میں اضافے کی گنجائش نہیں اور محکم ایسا ہے کہ اس میں کسی تغیر وتبدل کی ضرورت نہیں۔ پھر اس کے بعد یہ کہ اسے ہم نے نازل کیا اور **وَاِنَّا لَهٗ لَحٰفِظُوْنَ** (15:9) اور ہم خود اس کی حفاظت کریں گے۔ اسے دنیا کی کوئی طاقت مٹا نہیں سکے گی۔ یعنی یہ مکمل' غیر متبدل' محفوظ' خدا کی وحی ہے اور پھر یہ جو کہا گیا ہے کہ ہم نے اِسے تمام نوعِ انسانی کیلئے' ہمیشہ کیلئے' دیا ہے تو انہی آیات سے ختمِ نبوت کا تصور قائم ہو جاتا ہے۔ اس کے بعد کسی اور نبی کے آنے کی ضرورت باقی نہیں رہتی۔ تو قرآن کو محفوظ کر دیا گیا' نبوت ختم ہو گئی لیکن وہ جو وحی میں آمیزش کا پروسیس (عمل) چلا آ رہا تھا' وہ وحی کے ان مخالفین کی طرف سے جاری رہا۔ میں نے گزشتہ دو درسوں میں یہ عرض کیا تھا کہ کس کس شکل میں یہ ہوتا رہا' قرآن کے الفاظ کے اندر تو یہ آمیزش یوں نہیں کی گئی اگرچہ اس کی بھی ایک شکل پیدا کر دی گئی کہ یہ آیت یوں نہیں' یوں نازل ہوئی تھی' یا یہ آیت مصحفِ عثمانی میں یوں ہے' اور قرأتِ حضرتِ عباس میں یوں آیا ہے۔ وہ اس میں بھی یہاں تک تو بڑھ گئے' اس میں بھی ایک اس قسم کی آمیزش کی Attempt (کوشش) کی گئی لیکن آج اتنا ضرور ہے کہ یہ جو بھی قرآن آج ہمارے سامنے ہے' خدا کا دیا ہوا ہے۔ اس کے اندر یہ الفاظ نہیں داخل کیے گئے۔ اس حد تک تو یہ واقعی حفاظتِ خداوندی کی رو سے محفوظ رہا لیکن اس کی مثل' اس کے ساتھ' ایک اور وحی بنا دی گئی' قرأتیں مختلف کر دی گئیں۔ وہ جو اس کے ساتھ اس کی مثل کہا گیا ہے وہ روایات یا احادیث ہیں' جنہیں یہ درجہ دیا گیا اور روایات یا احادیث کا وہ ذخیرہ قرآن کے الفاظ میں تو شامل نہیں کیا گیا لیکن انہیں درجہ قرآنِ کریم سے بھی زیادہ دے دیا گیا۔

قرآن روایات کے تابع آ گیا

عزیزانِ من! آپ کو معلوم ہے کہ قرآن تو احادیث اور روایات کے اس ذخیرے کا محافظ بھی نہیں ہے۔ وہ تمام چیزیں گویا قرآن کے الفاظ میں تو شامل نہیں کی گئیں لیکن ان کو درجہ وہی دیا گیا بلکہ اس سے بھی زیادہ درجہ دیا گیا۔ یہ عقیدہ کہ حدیث قرآن کی آیت کو منسوخ کر سکتی ہے اُسے اس سے بھی اونچا درجہ دے گیا۔ اس طرح یہ سارا پروسیس (عمل) آپ کے ہاں جاری رہا ہے۔ آج ہی نہیں بلکہ صدیوں سے ہے۔ اس کا نتیجہ یہ ہے قرآنِ کریم تو محض تلاوت کیلیے باقی رہ گیا۔ جسے آپ اسلام کہتے ہیں' جسے اب مذہب کہا جاتا ہے' وہ

سارا ہی اب خارج از قرآن ہے۔ قرآن ان کے تابع آ گیا ہے۔ ان روایات یا احادیث کی تائید میں اگر قرآن کی کوئی ایسی آیت آتی ہے تو اسے تو پیش کر دیا جاتا ہے۔ یہ نہیں ہوتا کہ قرآن کو سرِ فہرست رکھ کر' بطور معیار رکھ کر' مدار رکھ کر' ماپنے کا پیمانہ قرار دے کر' دوسری چیزوں کو اس کے تابع لایا جائے کہ جو اس کے مطابق ہے انہیں صحیح مانا جائے اور جو اس کے خلاف ہے انہیں مسترد کر دیا جائے۔ اب پروسیس (عمل) اس کے الٹ ہو گیا ہے۔ اب قرآن کی حیثیت تو صرف ثانوی رہی ہے۔ اس کے بعد وہ جو اللہ تعالیٰ نے کہا تھا کہ ہم یہ کرتے تھے کہ دوسرا نبی بھیج دیتے تھے ختمِ نبوت کے بعد تو یہ سارا سلسلہ ختم ہو گیا۔

عزیزانِ من! اب وہی سورۃ حج کی آیت 52 ہے جہاں سے بات شروع ہوئی تھی کہ **فَيَنۡسَخُ اللّٰهُ مَا يُلۡقِى الشَّيۡطٰنُ ثُمَّ يُحۡكِمُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ** (22:52)۔ اس ذریعہ (یعنی دوسرا نبی بھیجنے) سے' مفاد پرستیوں کے پیچھے چلنے والے لوگوں کی وحی میں اپنی طرف کی گئی جو آمیزشیں ہوتی تھیں خدائی وحی کے ذریعے ان کی گئی آمیزشوں کو منسوخ کر دیتا تھا اور اس طرح سے سابقہ وحی کو ان آمیزشوں سے پاک اور صاف کر کے اپنی آیات کو محکم کر دیتا تھا۔ ختمِ نبوت کے بعد اب اس کے لیے کیا شکل ہو گی؟ نبی آئے گا نہیں۔ اور یہ ساری چیزیں یعنی روایات اور احادیث...... جتنی بھی ہیں...... یہ قرآن سے خارج ہیں۔ جیسا میں نے عرض کیا ہے کہ یہ روایات یا احادیث قرآن سے بھی بالا درجہ حاصل کر چکی ہیں جسے آج آپ اسلام' اسلامی شریعت' نظام کہتے ہیں یہ سارے انہی روایات یا احادیث پر مبنی ہیں جو خارج از قرآن ہیں۔ قرآن کے متعلق یہ کہنا کہ حسبنا کتاب اللہ' ہمارے لیے اللہ کی کتاب کافی ہے' انکارِ حدیث پر منتج کیا جاتا ہے۔ پہلے بھی اس کے متعلق یہ کہا جاتا تھا۔ اور آج تو برملا کہا جاتا ہے کہ یہ چیز انکارِ حدیث ہے۔ اب اس کا نام انکارِ حدیث قرار دیدیا گیا ہے۔ قرآن کو کافی قرار دینا تو اب دائرہ اسلام سے خارج ہونا ہے۔ ایسا کہنے والے کے بارے میں کہتے ہیں کہ یہ ملحد ہے' بے دین ہے۔ اب تو یہاں تک نوبت پہنچ چکی ہے۔ تو اب ان حالات میں یہ جو کچھ خارج از قرآن ہے اسے کیسے منسوخ قرار دیا جائے' اُسے کیسے قرآن کے تابع رکھا جائے؟

آج آیات اللہ کو محکم کرنے کا فریضہ امت کے سپرد ہے

عزیزانِ من! آج آیات اللہ کو محکم کرنے کا طریقِ کار کیا ہو گا؟ یہ بڑا ہی اہم اور بنیادی سوال ہے۔ پہلی چیز تو یہ ہے کہ آیات اللہ کو محکم کرنے کے معنی کیا ہیں؟ قرآن میں تو وہ آیات موجود ہیں' وہ اپنی جگہ سے ہلی نہیں ہیں۔ اس میں تو اگر ذرا سا زیر زبر کا بھی فرق پڑ جاتا ہے تو ایک دہائی مچتی ہے اور مچنی بھی چاہیے۔ اس کے لیے بڑا اہتمام کیا جاتا ہے۔ قرآن بالکل صحیح طریق سے محفوظ ہے۔ تو یوں کہا جائے گا کہ صاحب! یہ محکم تو ہے لیکن یہ محکم تو صرف طباعت کے اعتبار سے ہے۔ پڑھنے کے اعتبار سے' لکھنے کے اعتبار سے' الفاظ کے اعتبار سے بھی یہ محکم ہے۔ اس سے آگے تو اس کی کوئی حیثیت ہی نہیں رہی...... معاذ اللہ...... اب بات آگے یوں چلے گی کہ یہ کیسے محکم ہو گا؟

اس کے لیے ایک اور بنیادی حقیقت بھی سمجھ لیجیے۔ ختمِ نبوت کے معنی یہ ہیں کہ خدا کی طرف سے وحی پانے کا یہ سلسلہ اب ختم ہو گیا۔ خدا کی طرف سے اب براہِ راست علم حاصل کرنے کا جو طریق اختیار کیا گیا تھا اسے خدا نے ختم کر دیا ہے۔ ختمِ نبوت کے ساتھ آپ

اس کا کچھ بھی نام رکھیے اب براہ راست خدا سے علم حاصل کرنے کا امکان ہی نہیں ہے۔ اب کشف والہام وغیرہ کی سب چیزیں غلط ہیں۔ خدا سے وحی پانے کا یہ سلسلہ اب ختم ہوگیا۔ دین کو' قرآن کو' دوسروں تک پہنچانا' قرآن کے مطابق احکام نافذ کرنا' قرآن کے مطابق نظام قائم کرنا' حضور ﷺ کے بعد امت کا فریضہ تھا۔ سمجھنے کیلیے آپ اسے فریضہ رسالت کہہ لیجیے۔ عزیزانِ من! رسالت کے معنی پیغامبری ہوتا ہے' دوسروں تک پہنچانے کا عمل ہوتا ہے۔ قرآنِ کریم میں حضور ﷺ سے کہا تھا کہ **بَلِّغْ مَآ اُنْزِلَ اِلَیْکَ مِنْ رَّبِّکَ** (5:67) تم اس ضابطۂ حیات کو جو تمہارے رب کی طرف سے تم پر نازل کیا گیا ہے' تمام انسانوں تک یکساں طور پر پہنچاتے رہو۔ اب قرآن کو اس شکل کے اندر دنیا میں نافذ العمل رکھنا امت کا فریضہ ہوگیا۔ یہ فریضہ اب حضور ﷺ کے بعد امت کا قرار پا گیا۔ نبی نہیں آئے گا' اسے اب امت کرے گی اسی لیے اسے اس امت کو وارثینِ کتاب کہا گیا ہے۔ کتاب کی وراثت ان کے حصے میں آئی ہے۔ اس امت کا فریضہ ہے کہ وہ آیات اللہ کو محکم کرے۔ اب اگلی ہی آیت میں جو ایک آیت کے بعد آتی ہے' یہ بات واضح ہوجاتی ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ آج کے درس میں یہ چیز پوری ہوجائے گی یا شاید اس سے بھی زیادہ وقت لے گی۔

آیات کو محکم کردینے کی عملی شکل کیا ہوگی؟

عزیزانِ من! ''خدا اپنی آیات کو محکم کردیتا تھا'' کے عملی معنی کیا ہیں؟ اور آج اس کی کیا شکل ہوگی؟ نبی آکے یہ نہیں کرے گا' یہ امت کرے گی۔ آیت 54' جہاں سے یہ درس شروع ہوتا ہے' سے پہلے یہ کہا تھا کہ اس میں آمیزش والحاق ہوتا تھا۔ جو آمیزش اس میں ہوتی تھی' وہ ان لوگوں کیلیے ایک فتنہ بن جاتی تھی۔ یہاں' قرآن میں' دو گروہوں کے نام لیے گئے ہیں۔ ایک تو وہ گروہ ہے جو منافقین کا ہے' جن کے دلوں کے اندر' کہا ہے کہ' مرض تھا' وہ دانستہ یہ کچھ کرتے تھے اور دوسرا وہ ہے: **قَاسِيَةِ قُلُوْبُهُمْ** (22:53) جن کی پیہم' مسلسل' تقلید سے سمجھنے سوچنے کی صلاحیت ہی سلب ہوچکی ہوتی ہے' وہ اس پہ غور وفکر ہی نہیں کرسکتے۔ یہ دوسرا گروہ وہ ہوتا ہے جو پہلے گروہ کے فریب میں آجاتا ہے۔ وہ دانستہ آتا ہے کیونکہ وہ جان بوجھ کر یہ سب آمیزش وغیرہ کرتا ہے اور یہ دوسرا گروہ نادانستہ آتا ہے کیونکہ تقلیدِ پیہم سے ان کی سوچنے سمجھنے کی صلاحیتیں سلب ہوچکی ہوتی ہیں۔ نتیجہ دونوں کا ایک ہی ہوتا ہے کہ خارج از قرآن یا قرآن سے بالا چیزیں دین کی بنیادیں بن جاتی ہیں۔ اسے مذہب کہتے ہیں۔ آج بھی آپ دیکھیں گے کہ مذہبی پیشوائیت میں آپ کو دونوں قسم کے یہ گروہ ملیں گے۔ کچھ تو وہ ہیں جو جانتے بوجھتے یہ سب کچھ کرتے ہیں' وہ بڑے ہوشیار لوگ ہیں۔ علاوہ ازیں کثیر طبقہ ان کا ہے جو سمجھ سوچ سے کام ہی نہیں لیتے۔ وہ جو کچھ اسلاف سے ہوتا چلا آرہا ہے آنکھیں بند کرکے اسی پر چلے جاتے ہیں' آہستہ آہستہ ان کی سمجھنے سوچنے کی صلاحیتیں ہی مفلوج ہوجاتی ہیں لیکن ان دونوں کی وجہ سے یہ جو اس میں آمیزش ہے' یہ جو اس میں الحاق ہے' یہ امت کیلیے اور دین کیلیے فتنے کا باعث ہوجاتی ہے۔ دوسری طرف وہ لوگ ہیں جو **وَلِيَعْلَمَ الَّذِيْنَ اُوْتُوا الْعِلْمَ اَنَّهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ فَيُؤْمِنُوْا بِهٖ** (22:54) جو علم سے کام لیتے ہیں' بصیرت سے کام لیتے ہیں' عقل وفکر سے کام لیتے ہیں' غور وتدبر سے کام لیتے ہیں' وہ یہ سمجھتے ہیں کہ **اَنَّهٗ**

الْحَقُّ (22:54) یہی قرآن ہے، جو الحق ہے۔ وہ اس نتیجے پہ پہنچ جاتے ہیں، وہ اسے سمجھ لیتے ہیں کہ **اَنَّـهُ الْحَقُّ** (22:54) الحق یہی ہے جسے آپ The Truth (صداقت وسچائی) کہتے ہیں۔ The Truth (صداقت وسچائی) کے معنی یہ ہوگا کہ جو باقی ساری چیزیں ہیں انہیں جب اس کے سامنے لایا جائے گا، اس کے مقابل لایا جائے گا تو جس کی تائید یہ کرے گا اسے ہم سچائی مان لیں گے، جس کی یہ تائید نہیں کرے گا وہ سچائی نہیں ہوگی۔ یہ اپنے مقام پہ حق ہوگا۔

عزیزانِ من! حق اسے کہتے ہیں جو اپنے مقام پہ اٹل ہوتا ہے۔ یہاں کہا ہے کہ **اَنَّـهُ الْحَقُّ مِنْ رَّبِّكَ** (22:54) جو العلم والے ہیں یہ تیرے نشوونما دینے والے کی طرف ان کے لیے الحق، The Truth (صداقت وسچائی) ہے۔ اب یہاں یہ نظر آ گیا کہ اس کیلیے شرط علم وبصیرت کی ہوئی، وہ اس پہ ایمان لائیں گے، الحق تو یہی ہے اور جب وہ جاننے کے بعد، عقل وبصیرت کی رو سے، غور وتدبر کی رو سے، علم کی رو سے، اس پہ ایمان لائیں گے تو وہ جان لیں گے کہ الحق یہی ہے۔ وہ اس کی صداقت پر ایمان لائیں گے، ان کے دل اس صداقت کے سامنے جھکیں گے۔ یہاں پھر اس میں ایک بڑا بنیادی نکتہ آیا ہوا ہے۔ علم کی رو سے تو اس کی صداقت سمجھ میں آتی ہے۔ یہ ایک فطری چیز ہے۔ اس کی اطاعت تو قلب کا اس کے سامنے جھکنا ہے۔ محض فکری طور پر قرآن کو سمجھ لینا کافی نہیں ہے۔

صرف فکری طور پر قرآن کو سمجھ لینا کافی نہیں

عزیزانِ من! اصل چیز تو یہ ہے کہ فکری طور پر قرآنِ کریم کو سمجھ کر اس کے سامنے جھکا جائے، اس کے احکام کے سامنے سرِ تسلیم خم کیا جائے۔ پہلی چیز العلم کی رو سے اس پہ ایمان لانا ہے۔ یہ تو ایمان کیلیے ایک ناگزیر شرط ہے لیکن یہ ایک مقصد کے حصول کا مقدمہ ❶ ہے تمہید ہے۔ ❷ اور وہ مقصد یہ ہے کہ **فَتُخْبِتَ لَهٗ قُلُوْبُهُمْ** (22:54) اُس کے سامنے ان کے دل جھک ❸ جائیں یا نرم ہو جائیں، اس کے سامنے سرِ تسلیم خم کیا جائے۔ **وَاِنَّ اللّٰهَ لَهَادِ الَّذِيْنَ اٰمَنُوْٓا اِلٰى صِرَاطٍ مُّسْتَقِيْمٍ** (22:54)۔ جو اس طرح سے ایمان لے آتے ہیں، اس کا نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ یہ قرآن ان کی صراطِ مستقیم کی طرف راہنمائی کر دیتا ہے، زندگی کی جو متوازن سیدھی راہیں ہیں، یہ ان راہوں کی طرف اُن کی راہنمائی کر دیتا ہے۔

خدا انسان کو راہنمائی تو دیتا ہے، راستے پر نہیں چلاتا

عزیزانِ من! یہ ہدایت اور یہ راہنمائی عجیب چیزیں ہیں۔ قرآن کے ایک ایک لفظ پر کھڑے ہو جانے کو جی چاہتا ہے۔ یہ قرآن یا

---

❶ Reface

❷ Opening

❸ تاج العروس میں کہا گیا اَلْـخَبْـتُ (مادہ خ ب ت ہے) کا معنی ہے نشیبی زمین جو وسیع بھی ہو۔ اَخْبَـتَ وہ نشیبی زمین میں پہنچا۔ اس کے بعد یہ لفظ نرمی، خشوع، تواضع اور جھک جانے، اطاعت کرنے نیز مطمئن ہونے کے معنوں میں استعمال ہونے لگا۔ (پرویزؒ: لغات القرآن جلد دوم، ص۔ 573)

خدا کسی انسان کو کسی راستے پر نہیں چلاتا بلکہ انسان نے خود اس راستے پر چلنا ہوتا ہے البتہ یہ اس کی راہنمائی کر دیتا ہے' اس دوراہے پہ یہ بتا دیتا ہے کہ یہ راستہ سیدھا منزلِ مقصود کی طرف جاتا ہے اور تمہارا یہ راستہ غلط سمت کی طرف جاتا ہے۔ خدا یہ نہیں کرتا کہ انسان کو متوازن سیدھے راستے پر چلا دے۔ خدا نے تو رسول اللہ ﷺ سے بھی یہ کہہ دیا تھا کہ تُو جس سے بہت زیادہ محبت کرتا ہے تو اسے بھی سیدھے راستے پر نہیں چلا سکتا' صرف یہ بتا سکتا ہے کہ کونسا راستہ صحیح ہے۔ یہ بڑی چیز ہے۔ انسان کا صاحبِ اختیار وارادہ ہونے کے تو معنی ہی یہ ہیں کہ انسان اُس رہنما کیے ہوئے متوازن، سیدھے راستے پر اپنے اختیار وارادہ سے چلے۔ اگر وہی چلاتا چلا جائے تو اس کے بعد انسان کا اس میں کریڈٹ کیا ہوا۔ وہ چلا رہا ہے اور جو نہیں چل رہا' اس کا کیا قصور ہوا۔ عزیزانِ من! بات دُور نکل جائے گی ورنہ تفصیل سے بتاتا کہ ہمارے ہاں تو الھادی ❶ چلانے والے کو کہتے ہی نہیں بلکہ لوگ تو خدا کو اَلْمُذِلُّ ❷ کہتے ہیں یعنی گمراہ کرنے والا...... معاذ اللہ...... تو میں کہہ یہ رہا تھا کہ یہ چیز ہدایت ہے' صرف راہنمائی ہے' صرف صحیح راستہ بتا دینا ہے' صرف راستے پر چلا دینا نہیں ہے۔ وہ بتا دیتا ہے کہ یہ راستہ جاتا ہے' اس میں تمہاری منزلِ مقصود کی طرف جانے والا یہ سیدھا متوازن راستہ ہے' اب تمہارا جی چاہے تو اس پہ چلو' تمہارا جی چاہے تو نہ چلو' کھڑے رہو یا دوسرے راستے پہ چلے جاؤ۔ ہم نے بتا دیا اور یہی اس کا کام تھا۔ اب جو لوگ علم وبصیرت اور غور وتدبر سے کام نہیں لیں گے' ان کے لیے کہا کہ **وَلَا يَزَالُ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا فِيْ مِرْيَةٍ مِّنْهُ حَتّٰى تَاْتِيَهُمُ السَّاعَةُ بَغْتَةً اَوْ يَاْتِيَهُمْ عَذَابُ يَوْمٍ عَقِيْمٍ** (22:55)۔ وہ اس کی طرف سے برابر شک میں رہیں گے' تا آنکہ موعودہ گھڑی اچانک ان کے سر پر آ جائے' یا ان پر وہ عذاب آ جائے جو ان کے شجرِ امید کو یکسر خشک کر کے رکھ دے' اور اِس کے بعد وہ کبھی بار آور نہ ہو سکے۔ اس طرح قرآن کریم نے واضح کر دیا کہ جو لوگ اس کی صداقت سے انکار کرتے ہیں' خواہ وہ دانستہ کرتے ہیں' دل کے مرض سے کرتے ہیں جسے منافقت کہا جاتا ہے یا اس لیے کرتے ہیں کہ ان میں سمجھنے سوچنے کی صلاحیت ہی نہیں رہی' نتیجہ دونوں کا ایک ہی ہوتا ہے یعنی جو بھی اس کے الحق ہونے کے معاملے میں کسی شک میں رہتے ہیں' ان کا انجام' جیسا کہ قرآن نے متعدد مقامات پہ بتایا ہے' بہر کیف' بہر حال' تباہی ہی ہوتا ہے۔

تباہی ہمیشہ مختلف طریق سے بتدریج آتی ہے

عزیزانِ من! تباہی کی شکلیں مختلف ہوتی ہیں یا تو وہ آہستہ آہستہ بتدریج آتی ہیں جیسا کہ قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ **سَنَسْتَدْرِجُهُمْ مِّنْ حَيْثُ لَا يَعْلَمُوْنَ** (7:182)۔ ہم انہیں آہستہ آہستہ' بتدریج' تباہی وبربادی کے اُس مقام تک لے آتے ہیں

---

❶ راہ نما۔ عربی زبان کے مشہور لغت تاج العروس کے مولف محبّ الدین ابن الفیض (متوفی 1205ھ مطابق 1791ء) نے یہی معنی لکھے ہیں۔

❷ محیط المحیط کے بیروت میں 1870ء میں چھپنے والے نسخے میں پطرس بستانی نے لکھا ہے کہ "عَيْرُوا الْمَذَلَّةِ اس گدھے کو کہتے ہیں جس کے اوپر بوجھ لدا ہو اور پیچھے سے لاٹھی سے ہانکا جا رہا ہو" اس سے ذلت کا صحیح نقشہ سامنے آ جاتا ہے۔ ویسے "ہادی" کے مقابل "مضل" اور "معز" کے مقابل "مذل" آتا ہے۔

جواُن کے وہم وگمان میں بھی نہیں ہوتا اور یا **اَتٰهُمُ الْعَذَابُ مِنْ حَيْثُ لَا يَشْعُرُوْنَ** (16:26)۔انہوں نے اپنی طرف سے ہر ممکن تدبیر کررکھی ہوتی ہے کہ ان کا نظام تباہ نہ ہو لیکن ان پر تباہی اور بربادی کا عذاب ان راستوں سے آ پہنچتا ہے جو ان کی عقل وشعور میں بھی نہیں ہوتے۔اس طرح قرآن نے بتایا ہے کہ غیر شعوری طور پر' درجہ بدرجہ' بتدریج' وہ تباہی کی طرف پہنچتے ہیں اور اس کے بعد ایسا وقت آ جاتا ہے' یعنی جسے Accumulative Effect (مجموعی اثر) کہتے ہیں یعنی مرض اتنی شدت اختیار کر جاتا ہے' کہ پھر فوری Death (موت) ہو جاتی ہے۔ یہ جو Heart Failure (دل کے فیل ہو جانے) سے بھی مرتے ہیں' جن کے متعلق یہ کہا جاتا ہے کہ صاحب! ابھی اچھا بھلا تھا' وہ ایک جھٹکا لگا' اور فوراً ہی اس کی Death (موت) ہو گئی Heart Specialist (ماہر امراض قلب) سے پوچھیے' وہ بتائے گا کہ نہیں صاحب! موت فوری نہیں ہوتی' یہ بات تو بڑے عرصے سے' بڑی مدت سے' شروع ہوئی ہوتی ہے۔ یہ اس کی طرف دھیان نہیں دیتے اور آخر الامر یہ اس درجے پر پہنچ جاتی ہے کہ پھر فوری اس کی Death (موت) واقع ہو جاتی ہے۔ یہ جو **السَّـــاعَةُ بَغْتَةً** (22:55) ہے [1] یعنی اچانک' فوری ایک عذاب [2] کا آجانا' یہ Accumulative Effect (مجموعی اثر) اس کا آخری نتیجہ ہوتا

---

[1] قرآنِ کریم میں اَلسَّــاعَةُ کا لفظ کثرت سے آیا ہے۔قرآنِ کریم غلط روش پر چلنے والوں کو بار بار متنبہ کرتا ہے کہ اس روش کا نتیجہ ہلاکت و بربادی کے سوا کچھ نہیں۔تم نے اس روش کو نہ چھوڑا تو تم پر تباہی آ جائے گی۔تمہارے سعی وعمل ضائع ہو جائیں گے۔تم ہلاک اور برباد ہو جاؤ گے (اسی کو اِنــــذَارٌ کہتے ہیں) وہ اس انذار پر کان نہیں دھرتے اور اپنی روش پر جمے رہتے ہیں۔ان کے غلط اعمال اپنے تباہ کن اثرات مرتب کرتے چلے جاتے ہیں حتیٰ کہ وہ وقت آ جاتا ہے جب یہ اندر ہی اندر مرتب ہونے والے اثرات ابھر کر سامنے آ جاتے ہیں اور وہ لوگ تباہ اور برباد ہو جاتے ہیں۔اسے اَلسَّــاعَةُ یا انقلاب کی گھڑی کہا جاتا ہے۔ یہ ظاہر ہے کہ یہ انقلاب دفعۃً واقع نہیں ہو جاتا بلکہ آہستہ آہستہ ترتیب پا رہا ہوتا ہے۔البتہ اس کا ظہور اس طرح ہوتا ہے کہ جنہیں حقیقت کا علم نہ ہو وہ یہ سمجھتے ہیں کہ یہ دفعۃً نمودار ہو گیا ہے۔چونکہ اکثر اوقات یہ انقلاب اُس جماعت کے ہاتھوں نمودار ہوتا ہے جو حق کی حمایت کے لیے اٹھتی ہے اس لیے الساعۃ سے مراد حق اور باطل کی وہ آخری جنگ ہوتی ہے جس میں باطل کی قوتیں شکست کھا کر برباد ہو جاتی ہیں۔مختصراً یہ کہ الساعۃ ظہورِ نتائج کا نام ہے جسے ہلاکت انگیز انقلاب کی گھڑی کہا جاتا ہے یا حق وباطل کا فیصلہ کن تصادم۔(پرویزؒ: لغات القرآن (جلد دوم)' ادارہ طلوع اسلام' لاہور' 1960ء' ص ص۔919 -918۔)

[2] عذاب کا مادہ ''ع ذ ب'' ہے۔تاج العروس اور محیط المحیط کے مطابق اس مادہ (Root) کے بنیادی معنوں میں تین باتیں شامل ہیں: (۱) پانی کی خوشگواری اور شیرینی جو پیاس کو روک دیتی ہے' (۲) اذیت اور تکلیف جو زندگی کے آرام میں حائل ہوتی ہے' اور (۳) بندش' منع کرنا' اور رکاوٹ۔عَذَبٌ ان تنکوں یا کوڑے کرکٹ کو کہتے ہیں جو پانی کے اوپر پڑ جائیں اور اس طرح اسے مکدر کر دیں۔ان کپڑے کی چندیوں کو بھی کہتے ہیں جسے نوحہ کرنے والی عورتیں اپنے ساتھ رکھتی ہیں۔عَذَبَةٌ ایک درخت ہے جسے کھا کر اونٹ مر جاتے ہیں۔عذب سزا نیز بھوک' پیاس اور تکلیف کو بھی کہتے ہیں۔عَذُوبٌ اور عَاذِبٌ کے لیے تاج العروس اور انگریزی زبان میں عربی کے مشہور لغت Lane`s Lexicon میں لکھا ہے کہ ''اُس آدمی یا اونٹ یا گھوڑے کو کہتے ہیں جو پیاس کی شدت کی وجہ سے کھانا پینا چھوڑ دے۔جو بغیر کچھ کھائے رات گزار دے اسے بھی عَـاذِبٌ کہتے ہیں۔Lane (لین) تو اِسے بھی کہتا جسے حفاظت اور سایہ کے لیے چھت نصیب نہ ہو۔لہٰذا بھوک' پیاس' تکلیف' خانماں خرابی' سب کے لیے عَـذَابٌ کا لفظ آتا ہے۔یہی معانی پرویزؒ نے اپنی لغات القرآن جلد سوم کے صفحات 1143 تا 1144 میں درج کیے ہیں۔

ہے اور یہ جسے عام طور پر عذاب کہا جاتا ہے وہ تدریجی مراحل ہوتے ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ ان تدریجی مراحل میں کیا ہوتا ہے؟

قوم آہستہ آہستہ حالتِ عقیم میں پہنچ جاتی ہے

عزیزانِ من! سوال یہ تھا کہ عذاب کے تدریجی مراحل میں بھی کیا ہوتا ہے؟ یہاں قرآنِ کریم نے **یَوۡمٍ عَقِیۡمٍ** (22:55) کہا ہے۔ قرآنِ کریم کے عجیب لفظ ہیں۔ خزاں کے موسم میں پت جھڑ ہو جاتی ہے' کہیں کوئی روئیدگی' سبزی یا درخت میں پتے تک نظر نہیں آتے۔ درخت بالکل مردہ نظر آ رہا ہوتا ہے۔ اس کے ساتھ صرف شاخیں لگی رہتی ہیں۔ پھر بہار کا موسم آتا ہے تو ان میں حیاتِ تازہ کی نمود ہو جاتی ہے۔ پتیاں' کونپلیں' شگوفے سارے اس میں ابھر آتے ہیں۔ اب جو اس میں سے خشک ٹہنی ٹوٹ کے گر جائے' اس میں تو پھر دوبارہ بہار نہیں آتی۔ خواہ بہار کتنی ہی جوبن میں کیوں نہ آئے' اس خشک ٹوٹی ہوئی ٹہنی میں زندگی دوبارہ نہیں آتی۔ یہ جو کسی چیز کا ایسا ہو جانا ہے کہ اس میں بار آوری کی صلاحیت ہی باقی نہ رہے' اسے عقیم کہتے ہیں۔ بانجھ عورت کے لیے بھی یہ لفظ آتا ہے۔ جس میں بار آوری (Fertilization) کی صلاحیت نہ رہے۔ قوم تو وہ زندہ رہتی ہے' سانس لیتی ہے' بس وہ چلتی پھرتی لاشیں ہوتے ہیں۔ حالات کے تغیر سے پھر ان میں حیاتِ تازہ کی نمود نہیں ہوتی۔ حیاتِ تازہ کی نمود صرف اس میں ہوتی ہے' جس میں ہنوز اس کی صلاحیت باقی ہوگی۔ بہرحال' اس قسم کا عذاب' اس قسم کی تباہی' اس قوم پر آ جاتی ہے جس نے قرآنِ کریم کی صداقتوں سے انکار کیا۔ اس قوم کے بالمقابل وہ دَور آتا ہے جس میں یہ کہا ہے کہ اللہ اپنی آیات کو محکم کر دیتا ہے۔

سابقہ دو' تین دروس کا نقطہ ماسکہ

عزیزانِ من! اللہ اپنی آیات کو کس دور میں محکم کرتا ہے یہ ہے وہ مقام جو ہمارے آج کے درس کا موضوع ہے' یہ ہے وہ نقطہ ماسکہ جو ان تمام درسوں کے بعد سامنے آئے گا کہ یہ آیات اللہ محکم کیسے ہوتی ہیں؟ اِسے پھر سن لیجیے کہ لفظی اعتبار سے قرآنِ کریم کی حفاظت کا ذمہ خود خدا نے لیا ہے' یہ آیات اللہ محکم ہیں یعنی قرآنِ کریم میں موجود ہیں۔ اگر آج بھی ایک اِعراب کا' زیر زبر کا' کسی بھی جگہ فرق پڑتا ہے' کوئی قاری ذرا سا ایک حرف میں بھی فرق کرتا ہے تو پیچھے سے سامع کی دس آوازیں آ جاتی ہیں کہ اس نے غلط پڑھا ہے۔ آیات اس طرح سے محکم نہیں ہیں' اس طرح سے الفاظ محفوظ ہو جاتے ہیں۔ اب سوال یہ ہے کہ آیات کس طرح سے محکم ہوتی ہیں؟ اُس کے لیے کہا کہ اس کے مقابلے میں وہ لوگ ہیں جو اس پہ ایمان لے آئے اور اِن کے سامنے انہوں نے سرِ تسلیم خم کر دیا۔ وہ ایک ایسا نظام قائم کرتے ہیں جس میں آیات اللہ محکم ہو جاتی ہیں۔ اب آئی اصل بات۔

آیات اللہ کیسے محکم ہوتی ہیں؟

عزیزانِ من! بڑے غور سے سنیے۔ میں پھر عرض کرتا ہوں' جو ہمیشہ کہا کرتا ہوں کہ قرآنِ کریم کے نسخے اپنے

سامنے رکھا کریں۔ ان الفاظ کے سامنے آنے سے بات سمجھ میں صحیح آ جاتی ہے۔ صرف سننے سے بات سمجھ میں نہیں آتی۔ یہاں کہا کہ یہ وہ دَور ہوگا' غور فرمائیے کہ آیات اللہ محکم کیسے ہوتی ہیں' جس میں **اَلْمُلْکُ یَوْمَئِذٍ لِّلّٰہِ** (22:56)۔قوت واقتدار' سب کا سب' قانونِ خداوندی کو حاصل ہوگا۔ اس دُور میں پورا اقتدار صرف اللہ کے لیے ہوجائے گا۔

عزیزانِ من! آپ کو یاد ہوگا کہ پاکستان کی قراردادِ مقاصد پاس ہوئی تھی تو کہا گیا تھا کہ پوری کائنات کا حاکمِ مطلق اللہ تعالیٰ ہے اور پھر اسی سے سمجھ لیا گیا کہ یہ پوری کائنات پر اللہ کا حاکمِ مطلق ہونا اسلامی بات ہوگئی۔ اب پھر یہی دہرایا جارہا ہے کہ ساری کائنات کا حاکمِ مطلق خدا ہی ہے۔ ٹھیک ہے' ہوا کرے' وہ اس کی کائنات ہے۔ اس کے لیے تو اس نے ابنِ آدم سے کہہ دیا کہ **سَخَّرَ لَکُمْ** (45:13) ہم نے یہ کائنات تمہارے تابعِ تسخیر کی ہوئی ہے تو بہرحال اگر یہ پوری کائنات پہ اقتدارِ مطلق ہی ہے تو یہ ہم بھی تسلیم کرتے ہیں کہ وہاں اسی کے قوانین جاری وساری ہیں مگر سوال تو انسانوں کی دنیا کا ہے۔ یہ قرآن پتھروں' دریاؤں' درختوں کے لیے نہیں آیا کہ وہاں اقتدارِ خداوندی ثابت کردیا جائے کہ یہ ہوگیا صاحب! یہ دیکھ لیجیے۔ **اَلْمُلْکُ یَوْمَئِذٍ لِّلّٰہِ** (22:56)۔ والی بات ہوگئی۔ لیکن دیکھنا تو یہ ہے کہ جب ابھی انسان کی اس کرہ ارض پر نمود بھی نہیں ہوئی تھی' تو خدا کا اقتدار تو اس زمانے میں بھی تھا' کائنات تھی' کائنات میں اس وقت بھی **اَلْمُلْکُ یَوْمَئِذٍ لِّلّٰہِ** (22:56) تھا۔

میں نے گزارش کیا ہے کہ قرآن کسی بات کو مبہم نہیں چھوڑتا' وہ اسی سانس میں بات واضح کردیتا ہے۔ یہ **اَلْمُلْکُ** (22:56) کا لفظ ہے یہ اقتدار صرف اللہ کیلیے ہوگا۔ اس کی تفسیر اگلے ہی حرف میں بیان کردی اور اس بیان میں وہی لفظ استعمال کیا ہے جو وہاں کیا جب کہا تھا کہ **یُحْکِمُ اللّٰہُ اٰیٰتِہٖ** (22:52)۔ اور اب اس آیت میں کہا کہ **یَحْکُمُ بَیْنَھُمْ** (22:56) تمام امور کے فیصلے اس (ضابطہ یعنی قرآن) کے مطابق ہوں گے۔ آپ دیکھیے گا کہ وہی مادہ ''ح ک م'' کا ہے وہی جسے آپ نے استحکام کہا' جسے محکم کرنا کہا ہے۔ کس طرح سے؟ کہا کہ **اَلْمُلْکُ یَوْمَئِذٍ لِّلّٰہِ** (22:56)۔ اس دور میں اقتدارِ مطلق' پوری پوری حاکمیت' خدا کیلیے ہوگی' لوگوں کے درمیان وہی آخری فیصلے کرے گا۔ یہ ہے آیاتِ خداوندی کا استحکام یعنی ہر خارج یا غیر از قرآن یا خلافِ قرآن جتنی بھی چیزیں آچکی ہیں' ان کو منسوخ کرکے' فیصلے قرآن کے مطابق کرنا۔ یہ ہے آیات اللہ کا استحکام۔ جب یہ کچھ ہوجائے گا تو پھر ہوگا **اَلْمُلْکُ یَوْمَئِذٍ لِّلّٰہِ** (22:56) کہ نظام صرف خدا کیلیے ہے' اقتدار صرف خدا کیلیے ہے۔ اور جب یہ کہا جائے گا کہ اقتدار صرف خدا کیلیے ہے تو اس کے معنی یہ ہیں **یَحْکُمُ بَیْنَھُمْ** (22:56) لوگوں کے اختلافی معاملات میں فیصلہ کرنے والا خدا ہوگا۔ وہی حق وباطل کا فیصلہ کرے گا' لیکن خدا تو فیصلے کرنے کیلیے خود سامنے نہیں آتا ہے۔ اس نے کہا تھا کہ وہ اپنی آیات کو محکم کرتا ہے۔ یہاں اس نے یہ کہا ہے کہ اقتدارِ مطلق خدا کا ہے۔ اس کے معنی یہ ہیں کہ لوگوں کے معاملات کا فیصلہ وہ کرتا ہے اور یہی بات سمجھنے کی ہے یہ کچھ کہ خدا کیسے کرتا ہے' اس کے متعلق اس نے کہا ہے کہ **اَلْمُلْکُ یَوْمَئِذٍ لِّلّٰہِ** (22:56)۔ اس دور میں سب کا سب قوت واقتدار قانونِ خداوندی کو حاصل ہوگا اور **یَحْکُمُ بَیْنَھُمْ**

(22:56) تمام امور کے فیصلے اس (ضابطہ یعنی قرآن) کے مطابق ہوں گے۔

یوم الدین کا مفہوم

عزیزانِ من! دوسری جگہ بڑے حسین انداز میں قرآن نے ایک بات یہ بھی کہدی کہ **مَآ اَدْرٰکَ مَا یَوْمُ الدِّیْنِ** (82:17) تجھے خدا کے سوا کون بتا سکتا ہے کہ یوم الدین (ظہورِ نتائج کا دَور) کیسا ہوگا؟ **وَمَآ اَدْرٰکَ مَا یَوْمُ الدِّیْنِ** (82:18) یقیناً خدا کے سوا کوئی نہیں بتا سکتا کہ اس دَور کی کیفیت کیا ہوگی؟ یہ بڑی عجیب چیز ہے کہ ہر روز' ہر نماز کی ہر رکعت میں' سورۃ فاتحہ پڑھی جاتی ہے اور سورۃ فاتحہ کے یہ الفاظ **اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعٰلَمِیْنَ o الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ o مٰلِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ** (1:1-3) یہ کتنی ہی بار دہرائے جاتے ہیں۔ آپ سوچ لیجیے کہ اگر چہ اب نمازیوں کی تعداد کم ہی سہی لیکن بہرحال ساری دنیا کے اندر یہ سورۃ فاتحہ پڑھی جاتی ہے۔ ساری دنیا کے مسلمان' جو نماز پڑھتے ہیں' ہر نماز کی ہر رکعت میں' یہ الفاظ دہراتے ہیں۔ یہ الفاظ دہرانے کے معنی یہ ہیں کہ اس کا اعتراف واقرار کرتے ہیں' اس کا اعلان کرتے ہیں کہ خدا **مٰلِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ** (1:3) ہے۔ اب ہوا یہ ہے کہ یہاں اس کا مفہوم ذرا سا تبدیل کیا اور ترجمہ کر دیا: مالک ہے' دن جزا کا۔ اور جزا کا دن ہوا قیامت۔ اب یہاں کا یعنی اس دنیا کا معاملہ تو نپٹ ہو گیا۔ فریب دینے والوں نے آسانی سے فریب دیدیا کہ یاں تو آرام سے گزرتی ہے عاقبت کی خبر خدا جانے۔ دیکھ لاں گے اوتھے جا کے جو کچھ ہووے گا۔ [1] معاملہ یونہی چلا گیا۔

عزیزانِ من! قرآن نے کہا کہ **مَآ اَدْرٰکَ مَا یَوْمُ الدِّیْنِ** (82:17)۔ **مٰلک یوم الدین** کہنے والو! کچھ پتہ بھی ہے کہ یہ یوم الدین کونسا دَور ہے؟ یہ کہنے والو! کیا تم کچھ سمجھے بھی ہو؟ تم کیا سمجھو گے! **ثُمَّ مَآ اَدْرٰکَ مَا یَوْمُ الدِّیْنِ** (82:18)۔ خدا کے سوا کون تمہیں سمجھا سکے گا کہ یوم الدین کیا ہے؟ اتنی بار **مٰلِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ** دہرانے والو! کیا تم سمجھتے ہو کہ یوم الدین کیا ہے؟ یہاں پھر اسے دہرایا ہے۔ کیا عجیب بات ہے! او کچھ سمجھے بھی ہو! یہ کہتے چلے جا رہے ہو: **مٰلِکِ یَوْمِ الدِّیْنِ** !! کچھ سمجھے بھی ہو کہ یہ دَور کونسا ہوگا؟ اس کی کیا خصوصیت ہوگی؟ اس میں کیا ہوگا؟ کہا کہ بات تو بڑی آسان ہے: **یَوْمَ لَا تَمْلِکُ نَفْسٌ لِّنَفْسٍ شَیْئًا** (82:19)۔ یہ وہ دَور ہوگا جس میں ہر انسان اپنے اپنے اعمال کو اپنے سامنے دیکھے گا۔ کوئی کسی دوسرے کے لیے کچھ نہیں کر سکے گا۔ نہ ہی کسی انسان کو کسی دوسرے انسان پر کسی قسم کا اختیار واقتدار ہوگا یعنی اسے یوں سمجھو کہ یہ وہ دَور ہوگا جس دور میں کسی انسان کا دوسرے انسان پہ کوئی اقتدار اور کوئی اختیار نہیں ہوگا' کوئی کسی کیلیے کچھ نہیں کر سکے گا۔ **وَالْاَمْرُ یَوْمَئِذٍ لِّلّٰہِ** (82:19)۔ تمام معاملات کے فیصلے خدا کے قانون کے مطابق ہونگے۔ یہ یوم الدین ہوگا۔ لہٰذا بات تو یہاں اس دنیا کی ہے۔ یوم الدین یہاں کا یوم الدین ہے۔ یہ ہے اس

---

[1] جو کچھ بھی ہوگا وہاں جا کر دیکھ لیں گے۔

یوم کی خصوصیت کہ **یَوْمَ لَا تَمْلِکُ نَفْسٌ لِّنَفْسٍ شَیْئًا** (82:19)۔ ''کوئی کسی کے کوئی کام نہ آئے'' کسی کا کسی کے اوپر کوئی اقتدار نہ ہو' کوئی کسی کا محکوم نہ ہو...... اللہ اکبر...... اور یہ اسی صورت میں ہو سکتا ہے کہ **وَالْاَمْرُ یَوْمَئِذٍ لِّلّٰہِ** (82:19)۔ اس دور کے تمام حکم' اس دور کے تمام فیصلے' صرف اللہ کیلیے ہونگے۔ سمجھ لیا یہاں جو کہا تھا **اَلْمُلْکُ یَوْمَئِذٍ لِّلّٰہِ** (22:56)۔ اُس وقت قوت واقتدار' سب کا سب' قانونِ خداوندی کو حاصل ہوگا' وہاں یہ کہا کہ **وَالْاَمْرُ یَوْمَئِذٍ لِّلّٰہِ** (82:19)۔ اختیارات تمام کے تمام قوانین خداوندی کے لیے مختص ہوں گے' حکومت صرف ان قوانین کی ہوگی' کسی اور کی نہیں ہوگی۔

عزیزانِ من! اب بات سمجھ میں آ گئی کہ **اَلْمُلْکُ** اور **اَلْاَمْرُ** ایک ہی بات ہے۔ یہ اللہ کیلیے ہوگا۔ تو ٹھیک ہے جی! ہم نے بھی اپنے ہاں دستور میں' اپنے منشور میں یہ سارا کچھ رکھ لیا ہے کہ صاحب! قادرِ مطلق خدا ہے اور ہم تسلیم کر رہے ہیں کہ وہی ہے۔ یہ تو اوپر تبرکاً لکھ دیا۔ ہم **بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ** تبرکاً لکھتے ہیں' یا کارڈ کے اوپر سات سوچھیاسی لکھتے ہیں' تے تھلے پاویں شراب دے ٹھیکے دیاں شرطاں لکھیاں ہون۔ [1] یہ ہے ہمارے ہاں کیفیت **اَلْمُلْکُ یَوْمَئِذٍ لِّلّٰہِ** اور **اَلْاَمْرُ یَوْمَئِذٍ لِّلّٰہِ** کی۔

دینِ خداوندی انسان کو فریبِ نفس میں مبتلا نہیں کرتا

عزیزانِ من! قرآن اس فریبِ نفس میں مبتلا نہیں رہنے دیتا۔ قرآن کی خصوصیت ہی یہ ہے کہ وہ ہر تصورِ دین کو واضح کرتا چلا جاتا ہے۔ یہ مذہب ہے جو فریبِ نفس میں مبتلا رکھتا ہے۔ دین کسی کو فریبِ نفس میں نہیں رکھتا' کسی کو اس فریبِ نفس میں رکھنے کی اجازت بھی نہیں دیتا' اس کی گنجائش ہی نہیں چھوڑتا کہ جس کا جی چاہے من مانی سے اس کے معنی کر لے' یا اپنا مفہوم لے آئے۔ سنیے! بات پھر وہیں سے شروع ہوئی ہے کہ شروع سے یہ طریق کار ہوتا چلا آیا کہ نبی نے وہ وحی اپنی خالص شکل میں دی' وہ چلا گیا' بعد میں اس وحی میں تحریف ہوئی' اللہ تعالیٰ کی طرف سے پھر نبی آ گیا' اس نے پھر وحی کو محکم کیا' پھر اس وحی کے مطابق انتظام بتایا۔ ساری بات ہی یہ ہے کہ سارے کا سارا حکم یا امر خدا کے لیے ہوگا۔

اب اگلی بات یہ ہوئی کہ خدا خود تو یہاں آتا نہیں ہے' نہ ہم نے کبھی اُسے دیکھا کہ کوئی عدالت ایسی ہے جس میں معاذ اللہ خدا خود کرسی پہ بیٹھا ہوا ہے' مقدمات پیش ہو رہے ہیں' وہ فیصلے کر رہا ہے۔ پھر فیصلے کیسے ہونگے؟ عزیزانِ من! یہی تو بات ہے جو اس نے سمجھائی ہے کہ یہ فیصلے کیسے ہونگے؟ قرآن کریم نے بتایا تھا کہ **کَانَ النَّاسُ اُمَّۃً وَّاحِدَۃً** (2:213)۔ سب ایک برادری میں رہتے تھے۔ آپ اس بات کو تو چھوڑ دیجیے کہ نوعِ انسان ایک امت' ایک عالمگیر برادری ہے۔ اس کے بعد انہوں نے تمدنی زندگی شروع کی تو باہمی مفاد میں ٹکراؤ ہوا اور اس طرح ان میں اختلاف پیدا ہونے شروع ہو گئے۔ ان اختلافات کو مٹانا تنہا عقلِ انسانی کی بات نہیں تھی

---

[1] اس کے نیچے چاہے شراب کے ٹھیکے کی شرائط ہی لکھی ہوئی ہوں۔

کیونکہ ہر فرد اور ہر گروہ کی عقل اُس کے ذاتی مفاد کا تحفظ چاہتی ہے۔ دوسروں کا مفاد اس کے سامنے نہیں ہوتا۔ اس مقصد کے لیے **فَبَعَثَ اللّٰهُ النَّبِيّٖنَ مُبَشِّرِيْنَ وَمُنْذِرِيْنَ** (2:213) اللہ نے انبیاء کو وحی دے کر بھیجا۔ وہ انہیں اختلافی زندگی کے نتائج و عواقب سے آگاہ کرتے اور ایک برادری بن کر رہنے کی زندگی کے خوشگوار ثمرات کی خوشخبری سناتے۔ یوں خدا نے انبیاء کو مبشر اور منذر بنا کے بھیجا یعنی صحیح راستے پہ چلنے کی خوشگواریوں کی بشارتیں دینے والے (مبشر) اور غلط راستوں پہ چلنے والوں کو وارننگ دینے والے (منذر) کہ تباہ ہو جاؤ گے **وَاَنْزَلَ مَعَهُمُ الْكِتٰبَ بِالْحَقِّ** (2:213) اور ان سب کے ساتھ اس نے الکتاب بھیجی' یعنی ان کے ساتھ ایک ضابطہ قوانین نازل کیا' حق کے ساتھ نازل کیا۔ سوال یہ ہے کہ وہ الکتاب یا ضابطۂ قوانین کا ہے کیلیے دیا؟ اسے سن لیجیے کہ آگے وہی ''ح ک م'' کا مادہ جو چلا آ رہا ہے اسے استعمال کرتے ہوئے کہا کہ **لِيَحْكُمَ** (2:213) تا کہ وہ لوگوں کے اختلافی امور کا فیصلہ کرے۔

خدا کے فیصلے سے مراد خدا کی کتاب کا فیصلہ ہے

عزیزانِ من! یہاں جو یہ چیز کہی گئی ہے وہ **لِيَحْكُمَ** (2:213) کی ہے۔ سوال یہ ہے کہ وہ حکم کرتا کیسے ہے؟ وہ ان کے معاملات کا فیصلہ کرتا ہے۔ اِس کام کے لیے کہتا ہے کہ ان میں سے ہر نبی کے ساتھ ہم نے کتاب بھیجی: **لِيَحْكُمَ بَيْنَ النَّاسِ فِيْمَا اخْتَلَفُوْا فِيْهِ** (2:213) تا کہ جن معاملات میں یہ اختلاف کریں اس میں وہ انبیاء اس کتاب کی رو سے فیصلے کریں۔ یہ ہوئے خدا کے فیصلے۔ آج بھی' عزیزانِ من! جب ہم کہتے ہیں کہ حکومتِ پاکستان کا فیصلہ یہ ہے تو وہ حکومتِ پاکستان وہاں اسلام آباد میں کسی کمرے کے اندر کرسی پہ تو بیٹھی ہوئی نہیں ہے۔ آپ کسے حکومتِ پاکستان کا فیصلہ کہتے ہیں؟ حکومتِ پاکستان کا جو فیصلہ اس حکومت کے بنائے ہوئے قانون کے مطابق ہوگا' اسے اس کا فیصلہ کہیں گے' جو اس کے قانون کے خلاف ہوگا' آپ کہیں گے کہ یہ حکومتِ پاکستان کے فیصلے کے خلاف ہے۔ فیصلہ ہی اس کے قانون کے مطابق ہوگا۔ یہاں بتایا یہ ہے کہ اللہ کی کتاب کے مطابق فیصلہ کرنا آیات اللہ کا محکم کرنا ہے۔ خدا نے یہاں جو کہا ہے کہ **يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ** (22:56) خدا ان کے مابین فیصلے کرتا ہے۔ اب یہ فیصلے خدا کس طرح سے کرتا ہے؟ خدا جو کتابیں انبیاء کی طرف بھیجتا تھا' جب وہ ان کتابوں کے مطابق فیصلہ کرتے تھے تو وہ فیصلہ خدا کا فیصلہ ہوتا تھا۔ اب یہاں بات یہ ہوئی ہے کہ خلافِ قرآن یا خارج از قرآن کو منسوخ کرنے کے بعد' خدا کی کتاب (قرآن) کے مطابق فیصلے کیے جائیں۔ یہ ہوگا آیات اللہ کا محکم کرنا اور پھر یہ حکم تو تمام انبیائے کرام علیہم السلام کے متعلق تھا کہ ہر نبی کو کتاب دی جاتی تھی تو اس سے مقصد ہی یہ تھا کہ اس کتاب کے مطابق لوگوں کے مابین فیصلے کرو۔ ان سے کہا ہی یہ جاتا تھا۔

ہر نبی آیاتِ خداوندی کو محکم کرتا تھا

عزیزانِ من! وہ مادہ ''ح ک م'' کا ذہن میں رکھیے۔ یہ لفظ ہے: **يَحْكُمُ** اسی کا مادہ ''ح ک م'' ہے۔ اسی سے فیصلہ کرنے

کی بات چلتی ہے۔ آپ دیکھیے کہ قرآن کس طرح سے اپنے ایک ایک نکتے کی تشریح دیگر مقامات میں کرتا چلا جاتا ہے۔ وہاں (22:52) میں کہا تھا کہ اللہ اپنی آیات کو محکم کرتا ہے۔ اس کے دو ہی آیتوں کے بعد (22:56) میں اس نے کہا ہے کہ وہ الحق کے ذریعے سے **یَحۡکُمُ بَیۡنَہُمۡ** (22:56) کرتا ہے' یعنی وہ الحق کے ذریعے سے لوگوں کے مابین فیصلے کرتا ہے۔ یہ ہے آیات کا محکم کرنا۔ ہر نبی یہی کرتا تھا۔ کتاب کے مطابق فیصلے کرنے کے معنی ہی اس کتاب کی آیات کو محکم کرنا تھا۔ نبی اکرم ﷺ کو ارشاد ہوتا ہے کہ **وَ اَنۡزَلۡنَاۤ اِلَیۡکَ الۡکِتٰبَ بِالۡحَقِّ مُصَدِّقًا لِّمَا بَیۡنَ یَدَیۡہِ مِنَ الۡکِتٰبِ وَ مُہَیۡمِنًا عَلَیۡہِ** (5:48)۔ اب تمام سابقہ کتب کے بعد (جب وہ اپنی اصلی حالت پر نہ رہیں اور مشیت کے پروگرام کے مطابق وہ وقت آ گیا کہ تمام نوعِ انسان کے لیے واحد اور مکمل ضابطۂ حیات دے دیا جائے جو ہمیشہ تک ان کی راہنمائی کرے) ہم نے تیری طرف یہ کتاب نازل کی جو تمام ٹھوس حقیقتوں کو اپنے آغوش میں رکھتی ہے۔ اُن تمام وعدوں اور دعوؤں کو سچ کر کے دکھانے والی ہے جو کتب سابقہ میں کیے گئے تھے۔ اور اس اصولی تعلیم کی جامع اور نگران و نگہبان ہے جو اس سے پہلے وقتاً فوقتاً دی جاتی رہی اور جس کا ہمیشہ کے لیے غیر متبدل رکھنا مقصود ہے۔ یہ کچھ کہنے کے بعد حکم دیا کہ **فَاحۡکُمۡ بَیۡنَہُمۡ بِمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰہُ** (5:48) یہ جو خدا نے کتاب نازل کی ہے اس کے مطابق لوگوں کے درمیان فیصلے کر۔ یہ رسول اللہ ﷺ کو حکم ہے۔ یہ امر ہے کہ **فَاحۡکُمۡ بَیۡنَہُمۡ** (5:48) آیات اللہ محکم ہوتی چلی جارہی ہیں۔

نبی اکرم ﷺ نے خود یہ ارشاد فرمایا۔ یوں کہیے کہ وحی میں حضور ﷺ کی لسانِ مبارک سے یہ کہلوایا کہ **اَفَغَیۡرَ اللّٰہِ اَبۡتَغِیۡ حَکَمًا** (6:114)۔ کیا میں اب خدا کے سوا کسی اور کو حاکم تسلیم کرلوں؟ یہاں وہی حکماً آیا ہے' جس کا مادہ ''ح ک م'' ہے' یعنی فیصلہ کرنے والا۔ کہا: کیا میں کسی غیر اللہ کو حاکم مان لوں؟ یہاں یہ بھی دیکھ لیجیے کہ جب بھی اللہ آیا' ہم نے دیکھا ہے کہ یہ الکتاب کیلیے ہے' القرآن کیلیے ہے۔ یہاں کہا ہے کہ کیا میں غیر اللہ کو فیصلے کرنے والا تسلیم کرلوں حالانکہ **وَ ہُوَ الَّذِیۡۤ اَنۡزَلَ اِلَیۡکُمُ الۡکِتٰبَ مُفَصَّلًا** (6:114)۔ اس نے تمہاری طرف یہ ایک کتاب نازل کر دی ہے جو اپنے مطالب کو بڑی نکھار نکھار کر بیان کرنے والی ہے۔ تو گویا جسے غیر اللہ کہا گیا ہے' جسے یہاں خدا کے سوا کسی اور کو حاکم تسلیم نہیں کرنا رسول اللہ ﷺ سے کہلوایا گیا' اس کے معنی کیے گئے کہ **ہُوَ الَّذِیۡۤ اَنۡزَلَ اِلَیۡکُمُ الۡکِتٰبَ مُفَصَّلًا** (6:114) اُس نے تمہاری طرف ایک واضح اور نکھرا ہوا ضابطۂ قوانین بھیج دیا ہے۔ یہاں وہی الکتٰب آیا ہے۔ پھر الکتاب کی خصوصیات بتاتے ہوئے کہا کہ **وَ الَّذِیۡنَ اٰتَیۡنٰہُمُ الۡکِتٰبَ یَعۡلَمُوۡنَ اَنَّہٗ مُنَزَّلٌ مِّنۡ رَّبِّکَ بِالۡحَقِّ فَلَا تَکُوۡنَنَّ مِنَ الۡمُمۡتَرِیۡنَ** (6:114)۔ جن لوگوں کو یہ کتاب دی گئی ہے (یعنی جماعتِ مومنین کے اربابِ علم وبصیرت) وہ اس حقیقت کو پا گئے ہیں کہ یہ فی الواقعہ بڑے نشوونما دینے والے کی طرف سے' حق کے ساتھ نازل ہوئی ہے اس لیے ان مخالفین کے ساتھ جھگڑا کرنے کی ضرورت نہیں۔ ان معنی کو میں یہیں چھوڑتا ہوں۔ کتاب کی خصوصیت بتائی' کہا کہ **تَمَّتۡ کَلِمَتُ رَبِّکَ صِدۡقًا وَّ عَدۡلًا** (6:115)۔ اس قرآن میں خدا کا ضابطۂ قوانین' تمام صداقتوں کو اپنے اندر لیے اور عدل وتوازن کے تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے مکمل ہو

چکا ہے۔اس طرح اب وہ کتاب مکمل ہوگئی۔ **لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِهٖ** (6:115)۔اب ان قوانینِ خداوندی میں کوئی تغیر وتبدل کرنے والا نہیں‘ان میں کوئی تبدیلی نہیں کرسکتا۔الکتاب کے مطابق فیصلے کرنے گویا خدا کے فیصلے ہیں۔غیر اللہ کی طرف رجوع کرنے سے منع کیا۔ حضور ﷺ نے خود فرمایا کہ کیا تم چاہتے ہو کہ میں غیر اللہ کو حاکم مان لوں حالانکہ اس نے یہ کتاب اتار دی۔کتاب بھی کیسی؟ تمت مکمل کتاب‘ غیر متبدل کتاب‘ محفوظ کتاب۔ یہاں حضور ﷺ نے فرمایا کہ کیا میں کسی غیر اللہ کو تسلیم کرلوں؟ اب ایک تو شکل یہ ہوسکتی ہے کہ جس کیلیے اردو میں ہمارے ہاں ایک لفظ استعمال ہوتا ہے جبکہ عربی کے اندر اس لفظ کے استعمال میں بڑی غلطی ہوجایا کرتی ہے۔مثلاً ایک یہ کہ کیا میں خدا کے علاوہ اوروں کو بھی حاکم مان لوں‘ اس کے معنی ہوتا ہے کہ خدا کو بھی حاکم مانوں اور اس کے ساتھ اوروں کو بھی۔اب یہاں یہ کہا گیا ہے کہ کیا میں خدا کے سوا کسی اور کو حاکم مان لوں؟ غیر اللہ کو حاکم مان لوں دوسرا یہ ہوسکتا ہے کہ خدا کو بھی مان لوں‘ اس کے ساتھ کسی اور کو بھی مان لوں‘ یہ ہو جائیں گے معنی خدا کے علاوہ۔یعنی وہ بھی اور اس کے علاوہ یہ بھی۔کیا ایسی شکل کا نام بھی خدا کی آیت کو محکم کرنا اور خدا کے فیصلے کرنا ہوگا کہ اسے بھی اور اس کے ساتھ اور بھی۔کہا کہ بالکل نہیں۔

قرآن کے نزدیک شرک کا مفہوم

یاد رکھو! **وَلَا يُشْرِكُ فِىْ حُكْمِهٖٓ اَحَدًا** (18:26)۔خدا اپنے حکم‘ اپنے فیصلوں میں‘ کسی اور کو شریک نہیں کرتا۔اس کے ساتھ غیر اللہ کو ملایا ہی نہیں جاسکتا۔ ہمارے ہاں شرک اور مشرک کے الفاظ پامال ہو کے‘ سمٹ سمٹا کے‘ صرف بُت پرستوں تک رہ گئے یا وہ آگے چلے جہاں فرقہ بندی آئی۔ ہمارے ہاں ایک گروہ نے قبروں پر جانے والوں کے متعلق کہہ دیا کہ یہ مشرکین ہیں۔گویا شرک یا مشرک کی بات یہاں تک ہی رہی۔ یہاں تک کوئی نہ پہنچا کہ اس نے شرک کسے قرار دیا ہے؟ وہ کہتا ہے کہ **وَلَا يُشْرِكُ فِىْ حُكْمِهٖٓ اَحَدًا** (18:26)۔خدا کے نظام میں یہ بات نہیں چل سکتی کہ تم اس کے قانون کے ساتھ‘ کسی اور کے قانون کو بھی شامل کرلو۔اُس کے قانون کے ساتھ کسی اور کے قانون کو شریک نہیں کیا جاسکتا۔عزیزانِ من! آپ غور کرتے چلے آرہے ہیں کہ کڑی سے کڑی کیسے ملتی آرہی ہے۔الکتاب‘ جو منزل من اللہ ہے‘ الکتٰب جو القرآن ہے‘ اس کے مطابق‘ صرف اس کے مطابق جو فیصلے ہیں‘ وہ خدا کے فیصلے ہیں۔ یہی نہیں کہ اس کو قطعاً چھوڑ دیا جائے اور کسی اور کے فیصلوں کو لے لیا جائے بلکہ اس کے ساتھ کسی اور کا ملانا جو ہے اسے شرک قرار دیا گیا ہے۔سب سے پہلے حضورِ نبی اکرم ﷺ ہمارے سامنے آتے ہیں۔وہ اعلان فرماتے ہیں۔رسول اللہ ﷺ کا اہم اعلان ہے‘ اسی کو سنتِ رسول اللہ ﷺ کہیں گے۔یہ جو عمل رسول اللہ ﷺ کا تھا جو وہ قرآن کے مطابق کرتے تھے‘ وہی سنتِ رسول اللہ ہے۔

قرآن کے سلسلہ میں حضور ﷺ کا اعلان

عزیزانِ من! قرآنِ کریم کے سلسلہ میں حضور ﷺ کا اعلان ہے یہ کہ **اِنْ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا يُوْحٰٓى اِلَىَّ** (6:50)۔میں خود بھی

صرف اس کا اتباع کرتا ہوں جو میری طرف وحی کیا جاتا ہے اور تمہارے جتنے بھی معاملات سامنے آتے ہیں' ان کا فیصلہ بھی اسی کتاب کے مطابق کرتا ہوں۔ اس کتاب کی یعنی خدا کے کسی حکم کی خلاف ورزی پر جو گرفت ہوگی' اس سے بہت ڈرتا ہوں' اس کی سزا بڑی سخت ہوا کرتی ہے۔ عزیزانِ من! خدا کی کتاب کی یعنی خدا کے کسی حکم کی خلاف ورزی کو معصیّت کہا جاتا ہے۔ **اِنۡ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا یُوۡحٰۤی اِلَیَّ اِنِّیۡۤ اَخَافُ اِنۡ عَصَیۡتُ رَبِّیۡ عَذَابَ یَوۡمٍ عَظِیۡمٍ** (10:15)۔ میں صرف اس وحی کی پیروی کرتا ہوں جو میری طرف نازل ہوتی ہے۔ اگر میں اپنے نشو ونما دینے والے کے احکام سے سرتابی کروں تو اس کا قانونِ مکافات مجھے بھی نہیں چھوڑے گا اس لیے میں اس کی گرفت سے بہت ڈرتا ہوں۔ اس کی سزا بڑی سخت ہوا کرتی ہے۔ عزیزانِ من! اس آیت کے پہلے حصے میں یہ کہا گیا ہے کہ یہ لوگ مطالبہ کرتے ہیں کہ اس قرآن کے بدلے میں کوئی دوسرا قرآن لے آؤ یا اس میں ہماری خاطر کچھ تبدیلی کردو۔ حضور ﷺ نے فرمایا کہ میں تو اس میں تبدیلی کر ہی نہیں سکتا' یہ میرے بس کی بات نہیں' یہ میری کتاب ہی نہیں۔ میرا تو کام ہی صرف اس وحی کی پیروی کرنا ہے۔ **اِنۡ اَتَّبِعُ اِلَّا مَا یُوۡحٰۤی اِلَیَّ** (10:15) میں تو اتباع ہی اسی کا کرتا ہوں جو میری طرف وحی کی جاتی ہے اور آگے ہے کہ **اِنِّیۡۤ اَخَافُ اِنۡ عَصَیۡتُ رَبِّیۡ عَذَابَ یَوۡمٍ عَظِیۡمٍ** (10:15) اگر میں بھی اس کی خلاف ورزی کروں تو خدا کے عذاب سے میں بھی ڈرتا ہوں۔ ان آیات میں **مَا یُوۡحٰۤی** (6:50;10:15) آیا ہے یعنی جو کچھ میری طرف وحی کیا جاتا ہے۔

عزیزانِ من! میں نے کہا تھا کہ بعد میں ایک عقیدہ یہ شامل کیا گیا کہ یہ جو **ما یوحیٰ** ہے یہ وحی تو صرف قرآن ہی نہیں ہے بلکہ وحی کی دوسری قسم بھی ہے۔ جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے کہ دوسری قسم کی کسی بھی وحی کا قرآن میں کوئی ذکر ہی نہیں ہے۔ لہٰذا اسے چھوڑیئے' اس اعلان کو دیکھیے **وَ اُوۡحِیَ اِلَیَّ ہٰذَا الۡقُرۡاٰنُ** (6:19) میری طرف یہ قرآن وحی کیا گیا ہے۔ پھر سن لیجیے کہ ان آیات میں یہی آیا ہے: **مَا یُوۡحٰی** جو میری طرف وحی کیا جاتا ہے' میں اسی کا اتباع کرتا ہوں' اس کی خلاف ورزی نہیں کرتا اور اسی کے مطابق تمہارے فیصلے کرتا ہوں۔ جو میری طرف آتا ہے وہ **مَا یُوۡحٰی** ہے' وہ قرآن ہے۔ (6:115) میں الکتاب آ چکا ہے: **ہُوَ الَّذِیۡۤ اَنۡزَلَ اِلَیۡکُمُ الۡکِتٰبَ مُفَصَّلًا** (6:114) خدا نے الکتاب نازل کی ہے جو ایک واضح اور نکھرا ہوا ضابطۂ قوانین ہے۔ یہی ہے جو میری طرف وحی کی گئی ہے۔ **وَ اُوۡحِیَ اِلَیَّ ہٰذَا الۡقُرۡاٰنُ** (6:19) میری طرف یہ قرآن وحی کیا گیا ہے۔ تو جہاں بھی الکتاب کی اطاعت کا' وحی کی اطاعت کا' خدا کی اطاعت کا' یہ ذکر آئے گا وہ القرآن ہوگا کیونکہ کہا ہی یہ گیا ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا ہے کہ میری طرف القرآن وحی کیا گیا۔

وحدت کے بغیر امت نہیں رہتی اور دین مذہب میں بدل جاتا ہے

عزیزانِ من! یہ جسے ہم حکومت کہتے ہیں' جسے ہم معاملات کہتے ہیں' اس کے لیے بنیادی مقصد یہی ہوتا ہے کہ لوگوں میں جن معاملات کے اندر کچھ اختلاف ہو جائے' کوئی تنازعہ ہو جائے' تو اس اختلاف کو مٹایا جائے' فیصلہ دیا جائے۔ اگر امت کے اندر اختلاف

پیدا ہو جائے تو پھر وہ امت امتِ واحدہ نہیں رہتی اور جب امت امتِ واحدہ نہ رہے تو اس امت کے اندر دین رہتا ہی نہیں ہے۔ دین کی بنیادی شرط امت کا امتِ واحدہ ہونا ہے۔ قرآن نے اسی لیے تفرقے کو شرک کہا ہے۔ اختلاف و تفرقے کے متعلق دوسرے مقام پہ یہی آیا ہے۔ یہاں تو کہا ہے کہ وہ شرک ہوتا ہے: **وَلَا تَكُونُوا مِنَ الْمُشْرِكِينَ o مِنَ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ** (30:31-32) مشرکین میں سے نہ ہو جانا' یعنی ان لوگوں میں سے نہ ہو جانا جنہوں نے اپنے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ دوسرے مقام پہ نبی اکرم ﷺ سے کہا گیا ہے کہ **اِنَّ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَ كَانُوا شِيَعًا لَّسْتَ مِنْهُمْ فِي شَيْءٍ** (6:159)۔ دین ایک راستے پر چلنے کا نام ہے' مختلف راستوں پر چلنے کا نہیں۔ جو لوگ اپنے دین میں تفرقہ پیدا کرتے ہیں اور الگ الگ گروہ بن جاتے ہیں۔ اے رسول! تیرا اُن سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ اس طرح رسولِ اکرم ﷺ نے واضح کر کے بتا دیا کہ جو لوگ اختلاف کرتے ہیں اور فرقہ بنا لیتے ہیں' اے رسول ﷺ! تیرا ان سے کوئی واسطہ نہیں ہے۔ بات بڑی صاف ہے۔

قرآن کے فیصلوں کا ایک ہی رنگ ہوتا ہے

عزیزانِ من! آئین پاکستان یا قانون حکومتِ پاکستان میں اگر کوئی ایک' کسی ایک آئین کو' قانون کو' اطاعت کا موجب مانتا ہے اور کوئی دوسرا دوسرے کی اطاعت کرتا ہے' تو دو الگ اطاعتیں ہو جاتی ہیں۔ اس سے بڑا شرک تو کوئی اور ہو ہی نہیں سکتا۔ اور یہ جو ان کے ہاں کہا جاتا ہے کہ صاحب! یہ تفرقے اور فرقے بندی ٹھیک ہیں' ان میں سے ہر ایک یہ کہتا ہے کہ ہم قرآن ہی کے مطابق فیصلہ کرتے ہیں تو معاذ اللہ یہ ماننا پڑا کہ قرآن اپنے ایسے احکام دیتا ہے کہ اس کے اندر سے بہتّر بہتّر مختلف فیصلے دیئے جا سکتے ہیں...... یا اللہ...... قرآن نے تو اپنے منجانب اللہ ہونے کی ایک دلیل یہ دی ہے کہ اگر یہ خدا کے سوا کسی اور کی طرف سے ہوتا تو **لَوَجَدُوا فِيهِ اخْتِلَافًا كَثِيرًا** (4:82)۔ اس میں تو کتنے ہی اختلاف پاتے۔ عزیزانِ من! اگر اتنے فرقے یہ دعویٰ کریں یعنی اتنے فرقوں میں سے ہر فرقہ یہ دعویٰ کرے کہ ہمارا مسلک قرآن کے مطابق ہے اور ان فرقوں میں یہ باہمی اختلافات ہوں تو سوچیے بات کہاں جاتی ہے۔ اگر قرآن خود ہی اس قسم کے احکام' اس قسم کے اختلافی فیصلے دیتا ہے' تو منجانب اللہ ہونے کا دعویٰ ہی ختم ہو جاتا ہے۔ عزیزان من! پھر دوسری بات ہی رہ جاتی ہے کہ جس کی اطاعت کیجاتی ہے وہ القرآن یا خدا نہیں رہا' وہ قرآن کے باہر سے چیزیں آ گئیں' اس میں غیر اللہ آ گیا۔

مولانا کوثر نیازی کا مفتی محمود' مولانا شاہ احمد نورانی اور مودودی صاحب کو چیلنج

عزیزانِ من! آپ ذرا ان کے اختلافات کی نوعیت دیکھیے۔ نماز کے متعلق با جماعت حکم ہے۔ جماعت کے متعلق تو آپ کو معلوم ہے کہ یہ امت کا ہی نام ہے۔ یہ نماز با جماعت پڑھتے ہیں۔ [1] اس الیکشن کے دوران کوثر نیازی صاحب نے یہ چیلنج کیا ہے کہ اگر مفتی محمود'

---

[1] یاد رہے کہ یہ بات 13 فروری 1977ء کو کہی جا رہی ہے۔

مولانا نورانی اور مودودی صاحب (1978-1903) کراچی کی جامع مسجد میں' اکٹھے ایک امام کے پیچھے' نماز پڑھ لیں تو وہاں کا جو ہمارا Candidate (امیدوار) ہے' ہم اس سے کہیں گے کہ وہ الیکشن سے دستبردار ہو جائے اور اس طرح انہیں ایک Uncontested (بلا مقابلہ) سیٹ مل سکتی ہے۔ تو الیکشن میں ایک سیٹ کا Uncontested (بلا مقابلہ) ملنا کوئی چھوٹی بات نہیں ہوتی اور وہ بھی صرف اتنی سی بات پہ کہ یہ تینوں مل کے ایک امام کے پیچھے نماز پڑھ لیں' لیکن کسی نے بھی یہ چیلنج قبول نہ کیا۔ اور ان تینوں کا دعویٰ یہ ہے کہ ہم جو نماز پڑھتے ہیں' یہ خدا کے احکام کے مطابق ہے' قرآن کے مطابق ہے' رسول اللہ ﷺ کے مطابق ہے۔ اور کیفیت یہ ہے کہ ''با جماعت پڑھتے ہیں۔''

علما حضرات کے نزدیک ''باجماعت'' کے معنی اپنی اپنی علیحدہ علیحدہ نماز ہوتی ہے

عزیزانِ من! باجماعت کے معنی ہو گئے اپنی اپنی جماعت۔ تو جب یہ جماعت اپنی اپنی ہو گئی تو وہ امت کہاں گئی' وہ تو قصہ ختم ہوا۔ ہزار برس سے ان اختلافات کو مٹانے کے لیے لگے ہوئے ہیں۔ یہ مٹ ہی نہیں سکتے' مٹتے بھی نہیں ہیں۔ تو اس کے بعد پھر فریبِ نفس یہ ہے کہ وہ ایک حدیث وضع کر لی کہ میری امت کا اختلاف رحمت ہے۔ باقی امتوں کا اختلاف تو عذاب ہے۔ قرآن نے کہا ہے کہ اختلاف عذاب ہوتا ہے لیکن معاذ اللہ' معاذ اللہ نبی اکرم ﷺ کی طرف اس حدیث کو منسوب کر دیا کہ آپؐ نے فرمایا ہے کہ میری امت کا اختلاف رحمت ہے۔ یہاں جس طرح سے وہ رحمت برستی ہے' آپ سب اس سے خوب واقف ہیں۔ اسے ذہن میں رکھیے کہ میں نے خاص طور پہ کہا ہے ''برستی ہے۔'' وہ رحمت پولیس کے ڈنڈے کی شکل میں برستی ہے۔ پولیس کو تو چھوڑ دیجیے' اب آپ غیر ممالک میں دیکھیے کہ وہاں کیا ہو رہا ہے۔

انگلستان میں مسجد کے ٹکڑے کے حصول پر قتل و غارت گری

عزیزانِ من! اب ان لوگوں نے باہر' ولایت تک' جانا شروع کر دیا ہے۔ پہلے یہ افریقہ' برما' انڈونیشیا' وغیرہ میں جایا کرتے تھے۔ اور اب وہاں سے بہت سے مسلمان یورپ کے ممالک میں بھی چلے گئے ہیں اور ظاہر ہے کہ جب آدمی باہر چلا جاتا ہے تو ایک تو وہاں ان لوگوں کی مالی حالت زیادہ اچھی ہوتی ہے اور دوسرا انہیں اپنے وطن کے ساتھ' اپنے وطن والوں کے ساتھ کچھ تعلق بھی زیادہ ہو جاتا ہے۔ تو یہ سارے وہاں ''بھیڑیں مونڈنے'' کیلیے جاتے ہیں۔ ابھی پچھلے ہی ہفتے کے المنبر میں یہ چیز آئی ہوئی ہے کہ انگلستان میں' جہاں سب سے زیادہ مسلمان بستے ہیں' تبلیغ الاسلام کی جماعت ہے' شاید تبلیغی جماعت ہو۔ اس میں اور حنفیوں کے درمیان سر پھٹول ہوئی ہے۔ وہاں سے خبر آئی ہے کہ وہاں اس بات پر چاقو چل گئے' ایک مر گیا ہے کہ وہاں ایک جگہ پر مسجد بنانے کیلیے ایک طرف یہ جماعت تبلیغی ہے جو قبضہ کرنا چاہتی ہے اور دوسری طرف یہ حنفی قبضہ کرنا چاہتے ہیں۔ اور جہاں میٹنگ ہو رہی تھی وہ غالباً اسکول ہے' جو ان کا نہیں ہے۔ خبر میں لکھا

ہوا ہے کہ اس اسکول پر قصے کے لیے میٹنگ ہو رہی تھی۔ چنانچہ وہاں کرسیاں اٹھیں' چاقو چلے۔ انگلستان میں چاقو چلنے پر غالباً گرفتاریاں ہو رہی ہیں اور وہاں کے اخبار نے تبصرہ کیا ہے کہ اس سے پہلے اسکول کی یہ عمارت یا ہال وہاں مسلمانوں کو اپنے جلسے کرنے کیلیے مل جایا کرتا تھا۔ اب غالباً حکومت اس سے بھی روک دے گی۔ تو یہ کچھ انگلستان میں مساجد کی تقسیم پر ہونا شروع ہو چکا ہے۔

فرقوں کے لفظ کی بجائے مکتبِ فکر کے لفظ کا استعمال

عزیزانِ من! مسجد کی تقسیم پہ انگلستان میں دو جماعتوں کے درمیان چاقو چل رہے ہیں' تین مولانا (مولانا مفتی محمود' مولانا شاہ احمد نورانی اور مولانا ابوالاعلیٰ مودودی صاحبان) ایک امام کے پیچھے نماز نہیں پڑھ سکتے اور اس کے باوجود مذہب کا فریبِ نفس یہ ہے کہ کہا جاتا ہے کہ یہ فرقے نہیں ہیں صاحب! کیونکہ فرقوں کو خدا نے مشرکین میں سے کہا ہے' توبہ توبہ صاحب! یہ تو فرقہ کہنے سے مشرک ہو جاتے ہیں۔ اس کو رام داس نہ کہیے' نہ نہ نہ! عبدالرحمٰن کہیے۔ بھائی یہ فرقے نہیں ہیں۔ جی! یہ کیا ہے؟ کہا کہ یہ مکاتبِ فکر ہیں' جی! مکاتبِ فکر ہیں مگر آپس میں چاقو چل رہے ہیں' نماز اکٹھی نہیں پڑھ سکتے' ان کی مسجدیں الگ الگ ہیں۔ کہا کہ صاحب! یہ اختلاف دُور ہی نہیں ہو سکتے۔ اور جیسا میں نے ابھی عرض کیا ہے کہ پھر فریبِ نفس کرنے کی ضرورت نہیں تھی' یہ اختلافات تو رحمت ہیں۔

عزیزانِ من! یہ اختلافات دور ہو سکتے ہیں۔ **وَمَا اخۡتَلَفۡتُمۡ فِيۡهِ مِنۡ شَىۡءٍ فَحُكۡمُهٗۤ اِلَى اللّٰهِ** (42:10)۔ یہ ٹھیک ہے کہ طباع کے اختلاف' اور مختلف رجحانات و میلانات کی وجہ سے تم میں مختلف امور میں باہمی اختلاف ہوگا۔ ان اختلافات کے مٹانے کا طریقہ یہ ہے کہ ہر معاملہ کا فیصلہ خدا کے قانون کی رو سے کیا جائے (جو سب کے لیے حکم اور آخری سند 4:59 ہے)۔ اب جس بات میں بھی تمہیں اختلاف پیدا ہو جائے **فَحُكۡمُهٗۤ اِلَى اللّٰهِ** (42:10)۔ اس کا فیصلہ خدا کی کتاب سے کرو' اور خدا کی کتاب کبھی دو متضاد فیصلے نہیں دیتی کیونکہ اس نے اپنے منجانب اللہ ہونے کی ایک دلیل یہ دی ہے کہ اس میں اختلاف نہیں ہے۔ ایک فیصلہ ہوگا جس معاملے میں بھی تم میں اختلاف پیدا ہو جائے۔ اس لیے **فَحُكۡمُهٗۤ اِلَى اللّٰهِ** (42:10)۔ اس کا فیصلہ خدا کی کتاب کی رو سے کرو۔ عزیزانِ من! اور اگلے الفاظ بڑے قابلِ غور ہیں۔ کہا کہ ہر وقت اللہ اللہ اللہ کرنے والو! سنو! **ذٰلِكُمُ اللّٰهُ** (42:10)۔ جسے تم اللہ پہ ایمان کہتے ہو' وہ یہ ہے تمہارا اللہ: جس معاملے میں اختلاف پیدا ہو جائے اس کی کتاب سے فیصلہ لے لو۔ یہ ہے اللہ۔ کیا بات ہے اس لفظ کی! کہ یہ ہے اللہ اور اگر وہاں سے فیصلہ نہیں لیتے تو پھر وہ اللہ نہیں ہے: **ذٰلِكُمُ** ۔ اور پھر آخر میں تو قرآن نے' عزیزانِ من! یہ کہہ کر بات ہی صاف کر دی کہ **وَمَنۡ لَّمۡ يَحۡكُمۡ بِمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓـئِكَ هُمُ الۡكٰفِرُوۡنَ** (5:44)۔ یاد رکھو! جو شخص اُس قانون کے مطابق فیصلے نہیں کرتا جسے خدا نے نازل کیا ہے' وہ کافر ہے' خواہ وہ زبان سے اس قانون پر ایمان رکھنے کا مدعی بھی کیوں نہ ہو۔ کافر و مومن کی تمیز ہی اس سے ہوتی ہے۔ عزیزانِ من! یہ وہ آیت ہے جو میں ہمیشہ دہرایا کرتا ہوں۔ پھر یاد رکھیے بات **يَحۡكُمُ بَيۡنَهُمۡ** (22:56) کی ہو رہی

ہے کہ تمام امور کے فیصلے اس (ضابطہ یعنی قرآن) کے مطابق کرو۔ یہ وہی ہے جو قرآن نے کہا ہے کہ **ثُمَّ يُحْكِمُ اللّٰهُ اٰيٰتِهٖ** (22:52)۔ استحکامِ آیات اللہ کہا ہے۔ اللہ کی آیتیں محکم کر کے دیکھو۔ فیصلہ یہ کر دیا۔

ختمِ نبوت پر 1953ء میں منیر کمیٹی کی رپورٹ

عزیزانِ من! بحثیں چلی آ رہی ہیں مسلمان کسے کہتے ہیں؟ آپ کو معلوم ہے کہ منیر کمیٹی ختمِ نبوت کے سلسلے میں 1953ء میں یہاں قائم ہوئی تھی۔ ❶ اس کمیٹی کے ممبران ❷ نے ہمارے علمائے کرام ❸ سے یہ کہا تھا کہ مسلمان کی Definition (تعریف) دے دیجیے یعنی یہ بتا دیجیے کہ مسلمان کسے کہتے ہیں؟ آپ اس رپورٹ کی تفصیل پڑھ کے دیکھیے۔ جن سے یہ سوال پوچھا گیا تھا۔ ان میں بیشتر تو وہ تھے جنہوں نے یہ کہا تھا کہ صاحب! آپ نے یہ سوال ہم سے یونہی پوچھ لیا۔ اس سوال کا جواب ایسے ہی نہیں دیا جا سکتا ہے۔ اس کیلیے بڑے لمبے نوٹس کی ضرورت ہے اور حالت یہ ہے کہ صبح سے شام تک مسلمان کے لفظ سے زیادہ کوئی دوسرا لفظ دہرایا ہی نہیں جاتا۔ روز اپنے ہاں یہ ایک دوسرے کو مسلمان کہتے ہیں۔ ہاں تو پوچھا گیا کہ صاحب! مسلمان کسے کہتے ہیں؟ کہنے لگے: It requires notice جی، کوئی وقت تو دیجیے۔ اور جو حضرات ایسے تھے جنہوں نے بہرحال جواب دیدیا تو ایک کا جواب دوسرے سے نہیں ملتا تھا کہ

---

❶ اس رپورٹ کا نام ہے: ”رپورٹ تحقیقاتی عدالت بابت فسادات پنجاب 1953ء۔“ اس رپورٹ پر جناب جسٹس محمد منیر نے بحیثیت پریذیڈنٹ اور جناب جسٹس ایم آر کیانی نے بحیثیت ممبر کام کیا۔ یہ رپورٹ بڑی تقطیع کے 425 صفحات پر مشتمل ہے۔ ”مارچ 1953ء کے آغاز میں پنجاب کی سرزمین پر وسیع فسادات پھوٹ پڑے جو بعض مقامات پر اپریل 1953ء کے وسط تک جاری رہے۔ ان فسادات نے ایسا ہولناک رنگ اختیار کیا اور پُرخطر شکل پکڑ لی کہ متعدد مقامات پر ملٹری کو طلب کرنا پڑا اور لاہور میں تو مارشل لا کا اعلان کیے بغیر چارہ نظر نہ آیا جو مئی 1953ء کے وسط تک رہا (ص۔۱)۔“ عدالت تحقیقات نے ”تحقیقات کے اس حصے (تحقیقات کی عقائدی حیثیت اور دوسرے متعلقہ مذہبی موضوعات کے متعلق) میں علم انسانی کی تقریباً ہر شاخ اور ہر شعبے پر نظر ڈالی: مذہب، فلسفہ، سائنس، اخلاقیات، صفاتِ الٰہی، تشبیہ و حلول، عقل، الہام، تفسیر، علم کائنات، تخلیق، زمان و مکان، انسان کی ابتدا اور اس کی منزل مقصود، زندگی کے مقاصد، مملکت اور دینی اداروں کے وظائف، حاکمیت، جمہوریت، دینی حکومت۔ یہ تمام مضامین ......کسی اعتبار سے بھی تحقیقات سے بے تعلق نہ رہے۔ (ص ص۔7-6) اس عدالتِ تحقیقات نے یہ بھی لکھا کہ ”تدوین حدیث کا کام تیسری صدی ہجری سے شروع ہوا اور صحاحِ ستہ اُسی صدی میں مرتب کی گئیں...... (یہاں تک کہ شیعہ حضرات کی) پانچ کتب احادیث بھی۔ (ص 222)۔“

❷ یہ دو رکنی عدالتِ تحقیقات تھی: جناب جسٹس محمد منیر صدر اور جناب جسٹس ایم آر کیانی رکن۔

❸ مذہبی پیشوائیت کے بارے میں عدالت تحقیقات فسادات پنجاب 1953ء نے لکھا کہ ”اس میں شک نہیں کہ ملا زیادہ تر ایسے طبقے سے پیدا ہوتے ہیں جن کو تعلیم سے کوئی واسطہ نہیں ہوتا اور جن کا دائرۂ نظر انتہائی طور پر تنگ ہوتا ہے۔ ملاؤں کو دراصل اربابِ سیاست ہی نے بنایا ہے لیکن اب وہ اس کی حمایت کرنے کے بجائے ان قوتوں پر حملہ آور ہو رہے ہیں جنہوں نے ان کو پیدا کیا تھا۔ وہ اب خود اقتدارِ حکومت پر قابض ہونے کے درپے ہیں اور ترقی کے دشمن ہیں۔ (ص ص۔119-118)

مسلمان کسے کہتے ہیں [1] یعنی کفر اور ایمان کے درمیان حدِ امتیاز کیا ہے؟ کسے ایمان کہیں گے؟ کفر کسے کہیں گے؟ ساری بات تو یہی ہے کہ مومن کسے کہیں گے؟ غیر مومن کسے کہیں گے؟ کافر کسے کہیں [2] گے؟ انہوں نے کہا کہ نہیں صاحب! یہ بات بڑی لمبی ہے۔

عزیزانِ من! آپکو پتہ ہے کہ یہ نوٹس کا ہے کیلیے مانگا جارہا ہے؟ وہ ایک ایسی Definition (تعریف) مرتب کرنا چاہتے تھے کہ جس میں ان کا اپنا فرقہ تو مسلمان ثابت ہو جائے اور ان کے علاوہ جو باقی ہیں وہ نہ کہیں مسلمان ثابت ہو جائیں۔ تے مصیبت اے پے گئی او تھے۔ او منجی اک پاسیوں ٹھیک کردے سن، دوہا پاوا ایوں نکل جانداسی۔ اوہدروں ٹھوک کے ایہوں کردے سن، تے آپاوا ایویں نکل جانداسی۔ او فیر وی نئیں سی ٹھک ہندی۔ [3] اس کی اصل وجہ یہ تھی کہ ہر فرقے کے خلاف تو کفر کا فتویٰ عائد کیا ہوا ہے۔ اگر یہ Definition (تعریف) دیدیں کہ وہ فرقہ بھی مسلمان ہونے کے اعتبار سے اس کے اندر آ جائے تو پھر یہ ہوگا کہ ان کے بھی خلاف آپ نے کفر کا فتویٰ دیا ہوا ہے تو پھر یہ کیسے مسلمان ہو گئے۔ دیکھا، انسان کتاب اللہ سے باہر جانے کے بعد کن کن مشکلات میں الجھتا ہے، کتنی خاردار جھاڑیاں راستے میں آتی ہیں جو قدم قدم پر دامن کو الجھا لیتی ہیں۔ اگر دیکھا جائے تو بات تو بڑی مختصر سی تھی جسے افسانہ بنا دیا۔ مشکل یہ ہے کہ یہ لوگ قرآن سے تو پوچھتے نہیں۔ اسی سے تو انہیں چڑ ہے کہ فیصلہ کتاب اللہ سے نہیں لینا چاہتے۔ اگر کتاب اللہ سے فیصلہ لیتے، عزیزانِ من! تو سارے چار لفظ ہیں جن میں معاملہ صاف ہو جاتا ہے۔ سورۃ المائدہ کی 44ویں آیت دیکھیے یعنی (5:44) دیکھیے، فیصلہ ہے،

---

[1] اس نکتے پر عدالت تحقیقات فسادات پنجاب 1953ء نے لکھا کہ ''ان متعدد تعریفوں کو جو علما نے پیش کی ہیں، پیش نظر رکھ کر کیا ہماری طرف سے کسی تبصرے کی ضرورت ہے؟ بجز اس کے کہ دین کے کوئی دو عالم بھی اس بنیادی امر پر متفق نہیں ہیں۔ اگر ہم اپنی طرف سے ''مسلم'' کی کوئی تعریف کر دیں جیسے ہر عالم نے کی ہے اور وہ تعریف اُن تعریفوں سے مختلف ہو جو دوسروں کی پیش کی ہیں تو ہم کو متفقہ طور پر دائرہ اسلام سے خارج کر دیا جائے گا اور اگر ہم علما میں سے کسی ایک کی تعریف کو اختیار کر لیں تو ہم اس عالم کے نزدیک تو مسلمان رہیں گے لیکن دوسرے تمام علما کی تعریف کی رو سے کافر ہو جائیں گے۔'' (ص ص۔ 236-235)۔

[2] اِس مسئلہ پر عدالت تحقیقات فسادات پنجاب 1953ء نے لکھا کہ ''مملکت کو لازماً کوئی ایسا انتظام کرنا ہوگا کہ مسلم اور غیر مسلم کے درمیان فرق معین ہو سکے اور اس کے نتائج پر عمل درآمد کیا جا سکے لہٰذا یہ مسئلہ بنیادی طور پر اہم ہے کہ فلاں شخص مسلم ہے یا غیر مسلم اور یہی وجہ ہے کہ ہم نے اکثر ممتاز علما سے یہ سوال کیا کہ وہ ''مسلم'' کی تعریف کریں۔ اس میں نکتہ یہ ہے کہ اگر مختلف فرقوں کے علما......کو کافر سمجھتے ہیں تو ان کے ذہن میں نہ صرف اس فیصلے کی وجوہ بالکل روشن ہوں گی بلکہ وہ ''مسلم'' کی تعریف بھی قطعی طور کر سکیں گے کیونکہ اگر کوئی شخص یہ دعویٰ کرتا ہے کہ فلاں شخص یا جماعت دائرہ اسلام سے خارج ہے تو اس سے لازم آتا ہے کہ دعویٰ کرنے والے کے ذہن میں اس امر کا واضح تصور موجود ہے کہ ''مسلم'' کس کو کہتے ہیں۔ تحقیقات کے اس حصے کا نتیجہ بالکل اطمینان بخش نہیں۔ اور اگر ایسے سادے معاملے کے متعلق بھی ہمارے علما کے دماغوں میں اس قدر ژولیدگی موجود ہے تو آسانی سے تصور کیا جا سکتا ہے کہ زیادہ پیچیدہ معاملات کے متعلق ان کے اختلافات کا کیا حال ہوگا۔'' (ص ص۔ 232-231)۔

[3] پتا پڑی تھی کہ اگر وہ ایک طرف سے چارپائی درست کرتے تھے تو دوسری طرف سے اس کا پایہ نکل جاتا تھا اور اگر وہ اس دوسری طرف سے پائے کو ٹھوک بجا کر درست کرتے تھے تو پہلے والا پایہ جا نکلتا تھا۔ وہ چارپائی پھر بھی صحیح و درست نہیں ہو پاتی تھی۔

سیدھی بات ہے۔ کہا کہ **وَمَنۡ لَّمۡ يَحۡكُمۡ بِمَآ اَنۡزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الۡكٰفِرُوۡنَ** (5:44) جو **مَآ اَنۡزَلَ اللّٰهُ** یعنی کتابِ خداوندی (قرآن) کے مطابق حکومت قائم نہیں کرتے، فیصلے نہیں کرتے، انہیں کافر کہا جاتا ہے اور جو اس کے مطابق فیصلے کرتے ہیں انہیں مومن کہا جاتا ہے۔ بس مسئلہ حل ہو گیا۔ اللہ اللہ خیر سلا۔

خطرہ دراصل اپنے اپنے اسلام کا ہے

عزیزانِ من! کتاب اللہ یعنی قرآنِ کریم کے مطابق حکومت قائم کرنے یا فیصلہ کرنے سے ہر کہنے والے کا اپنا اسلام بھی خطرے میں پڑ جاتا تھا۔ ان میں بھی کتنے ایسے اعتقادات و مسالک و مشارب تھے جو کتاب اللہ کے خلاف جاتے تھے اور پائے جاتے ہیں، اسے کیا کریں؟ یہ اس کتاب کو کبھی سامنے نہیں لائیں گے۔ جس طرح میں نے عرض کیا تھا کہ وہ ان آیات کو کبھی بھی زیرِ غور نہیں لائیں گے جن میں کہا گیا ہے کہ **وَلَا تَكُوۡنُوۡا مِنَ الۡمُشۡرِكِيۡنَ ۝ مِنَ الَّذِيۡنَ فَرَّقُوۡا دِيۡنَهُمۡ وَكَانُوۡا شِيَعًا كُلُّ حِزۡبٍ بِمَا لَدَيۡهِمۡ فَرِحُوۡنَ** (30:31-32) یاد رکھو مومنو! ایمان لانے کے بعد مشرک نہ ہو جانا یعنی فرقوں میں نہ بٹ جانا، بڑی احتیاط برتنا کہ توحید کے پیرو بن کر پھر سے مشرک نہ بن جانا یعنی ان لوگوں میں سے نہ ہو جانا جنہوں نے اپنے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا اور اس طرح امت واحدہ رہنے کے بجائے مختلف فرقوں میں بٹ گئے۔ فرقوں میں بٹ جانے کے بعد حالت یہ ہو جاتی ہے کہ ہر فرقہ سمجھتا ہے کہ جس طریقے پر ہم چل رہے ہیں، وہ حق و صداقت کی راہ ہے۔ اس لیے وہ اپنے آپ میں مگن ہو کر بیٹھ جاتا ہے۔ یاد رکھو! فرقہ پرستی اور گروہ بندی شرک ہے، تم اس شرک کے مرتکب نہ ہو جانا۔ اگر یہ کیفیت ہو گئی کہ ہر گروہ یہ کہے کہ میں تو حق پر ہوں، باقی سارے جہنمی ہیں، دیکھنا کہیں ایسا نہ ہو جانا۔ آپ نے کتنے وعظ سنے ہیں، کبھی اس آیت پر بھی آپ نے وعظ سنا ہے؟ کبھی اس آیت پر بھی، جہاں حضور ﷺ کا فرمان جو خدا نے حضور ﷺ کی زبان سے کہا کہ ان سے کہہ دو کہ اگر تم نے **فَرَّقُوۡا دِيۡنَهُمۡ** (30:32) دین میں تفرقے یا تفریق پیدا کر لی، فرقے پیدا کر لیے تو اے رسول! **لَسۡتَ مِنۡهُمۡ فِىۡ شَىۡءٍ** (6:160) تیرا ان سے کوئی واسطہ نہیں۔ عزیزانِ من! کیا کبھی کوئی وعظ آپ نے ان عنوانات پہ بھی سنا ہے؟ آج فرقہ بندی کو کفر یا شرک کہنے والا کافر ہے اور باقی سارے، ان فرقہ بندیوں پر اختلافات پر جم کر کھڑے ہونے والے مشارب ہیں۔

عزیزانِ من! مومن اور کافر کے درمیان خطِ امتیاز کی Definition (تعریف) یہ ہے کہ **وَمَنۡ لَّمۡ يَحۡكُمۡ بِمَآ اَنۡزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الۡكٰفِرُوۡنَ** (5:44) یاد رکھو! جو شخص اس قانون کے مطابق فیصلے نہیں کرتا جسے خدا نے نازل کیا ہے، وہ کافر ہے خواہ وہ زبان سے اس قانون پر ایمان رکھنے کا مدعی کیوں نہ ہو۔ کافر اور مومن کی تمیز ہی اس سے ہوتی ہے۔ یہاں تین آیتیں ہیں جہاں انہی الفاظ کے بعد **هُمُ الظّٰلِمُوۡنَ** (5:45) کہا ہے، **هُمُ الۡفٰسِقُوۡنَ** (5:47) کہا ہے اور اس آیت (5:44) میں تو **هُمُ الۡكٰفِرُوۡنَ** کہا ہے۔ یعنی ظالم بھی وہی ہیں، فاسق بھی وہی ہیں، کافر بھی وہی ہیں جو قرآن کے مطابق فیصلے نہیں کرتے۔ قرآن نے کہا تھا کہ **تَمَّتۡ كَلِمَتُ**

رَبِّکَ صِدۡقًا وَّعَدۡلًا (6:116)۔اس قرآن میں' خدا کا ضابطہ قوانین' تمام صداقتوں کو اپنے اندر لیے اور عدل وتوازن کے تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے مکمل ہو چکا۔اب اعتراض کیا جاتا ہے کہ صاحب! قرآن کے مطابق تو آپ یہ کچھ کہتے ہیں' جبکہ قرآن میں تو تفاصیل ہی نہیں دی ہوئیں مثلاً نماز کا جو فریضہ ہے' اس کے متعلق کیا کیا جائے اور پھر قرآن میں زکوٰۃ کی شرح دی ہوئی نہیں ہے' فلاں معاملے کے فیصلے نہیں دیئے ہوئے۔گویا قرآن کا یہ نقص تھا' جو بعد میں آ کے ان لوگوں نے یہ کہا۔وہ تو اپنے ہاں کہہ رہا ہے کہ **تَمَّتۡ كَلِمَتُ رَبِّكَ** (6:116)۔اِس قرآن میں' خدا کا ضابطۂ قوانین' مکمل ہو چکا۔اب اس الکتاب کو قیامت تک کیلیے' ضابطہ ہدایت بننا ہے' راہنمائی بننی ہے اور آئین بننا ہے۔

آئین اور قانون میں فرق: تغیر وتبدل کا حسین امتزاج

عزیزانِ من! کیا آپ کو پتہ ہے کہ آئین اور قوانین میں کیا فرق ہوتا ہے؟ اسے سن رکھیے کہ آئین مملکت کے اصولی خط وخال متعین کرتا ہے' اصولی حدود متعین کرتا ہے' اور پھر ان حدود کے اندر رہتے ہوئے ہر حکومت' اپنے اپنے حالات کے مطابق' قوم کے حالات کے مطابق' ملک کے حالات کے مطابق' بین الاقوامی حالات کے مطابق' خود اپنے قوانین متعین و وضع کرتی ہے۔آئین کی وہ حدود اپنے مقام پر محکم رہتی ہیں مگر ان وضع شدہ قوانین کے اندر تبدیلیاں بھی ہوتی رہتی ہیں۔یہ الگ بات ہے کہ مغربی جمہوریت کے تابع آئین میں بھی وہ شرائط کے ماتحت تبدیلی کر دیتے ہیں لیکن آئین کے متعلق یہ ہوتا ہے کہ اس کے حدود کے اندر کوئی تبدیلی نہ کی جائے۔تو یاد رکھیے! کوئی قانون بھی' جو پارلیمنٹ پاس کر دے' ہر قاعدے قانون کے اعتبار سے صحیح ہو' اگر وہ آئین کی کسی حد سے' کسی اصول سے' ٹکرا گیا ہے' اس کے خلاف جاتا ہے! اسٹیٹ اس قانون کو کہتی ہے کہ یہ غیر از قانون ہے کیونکہ آئین کے خلاف ہے۔آئین وہ مدار اور حدود مقرر کرتا ہے جس کے خلاف پارلیمنٹ کوئی قانون پاس نہیں کر سکتی اور جتنے قوانین ان حدود کے اندر رہتے ہوئے پاس کیے جاتے ہیں' آئین کی رو سے وہ قوانین جائز اور صحیح قرار پاتے ہیں۔

قرآن میں حدود اللہ دیئے ہوئے ہیں۔قرآن میں دین کے ابدی اصول دیئے ہوئے ہیں' اس نے ہمیں آئین دیا ہے۔آج کی اصطلاح میں یوں کہیے کہ اس نے ہمیں ملتِ اسلامیہ کا Constitution (آئین) دیا ہے۔یہ غیر متبدل ہے' اس آئین میں تبدیلی نہیں ہو سکتی۔اس آئین کی حدود کے اندر رہتے ہوئے جتنے معاملات آپ کے سامنے آئیں' ان کے لیے قوانین وضع کرنا ہوں گے۔آج کی اصطلاح میں آپ یوں کہیے کہ ان کیلیے آپ قوانین یا By - laws[1] بنائیں گے' ان کی تفاصیل متعین کریں گے' ان پر عمل پیرا ہونے کے طریقے تجویز کریں گے' ان کے مطابق پروگرام بنائیں گے۔یہ جو آپ اس کیلیے طریقے تجویز کریں گے' قوانین' جزئیات' By - laws[1]

---

[1] یا Bye - Laws

بنائیں گے' یہ تو زمانے کے تقاضوں کے مطابق بدلتے جائیں گے۔ از خود نہیں بدلتے جائیں گے' امت کا یہ نظام جو قرآن کو اپنا غیر متبدل آئین تسلیم کیے ہوئے ہے' صرف وہ نظام اس کے اندر تبدیلی پیدا کرے گا' کوئی فرد تبدیلی نہیں پیدا کر سکتا' کوئی فرقہ تبدیلی نہیں پیدا کر سکتا' کوئی گروہ تبدیلی نہیں پیدا کر سکتا' امت میں فرد' گروہ اور فرقے کی تو حیثیت ہی کچھ نہیں ہوتی' صرف امت کی حیثیت ہوتی ہے۔ قرآنِ کریم نے امت' کو صرف اصولی حکم دیا ہے' اس کی جزئیات یا طریقِ کار کو خود متعین نہیں کیا۔

قرآن نے جزئیات خود متعین نہیں کیں

عزیزانِ من! جس آئین کو' جس ضابطے کو' قیامت تک کیلیے غیر متبدل رہنا تھا اس کی یہی حیثیت ہونی چاہیے تھی۔ قرآنِ کریم غیر متبدل اصول دیتا ہے' جزئیات غیر متبدل نہیں دیتا۔ اگر جزئیات غیر متبدل ہوتیں تو حالات کے بدلنے کے ساتھ ان پر عمل پیرا ہونا ناممکن ہو جاتا ہے۔ قرآن نے کہا ہے کہ **وَاَمۡرُهُمۡ شُوۡرٰى بَيۡنَهُمۡ** (42:38)۔ ان کے معاملات باہمی مشاورت سے طے ہونگے۔ اس نے کہیں اس مشاورت کی جزئیات کو خود متعین نہیں کیا' اس کا طریقِ عمل خود طے نہیں کیا۔ یہ نہیں بتا دیا کہ مشاورت کی یہ مشینری کیا ہوگی؟ کیسے مشاورت کی جائے گی؟ کیا طریقِ کار ہوگا؟ یہ اس نے امت کی صوابدید پر' حالات کی مطابقت پر' چھوڑ دیا۔ کونسی امت پر چھوڑا؟ اس امت پر جو امتِ واحدہ ہوگی۔

ملتِ اسلامیہ وہ ہوگی جو قرآن کو اپنا آئین تسلیم کرے گی

عزیزانِ من! قرآن نے مشاورت کی مشینری اور اس کے طریق کار کو اس امت پر چھوڑ دیا جو اس قرآن کو اپنا آئین تسلیم کرے گی۔ یہ اس امت پر چھوڑ دیا جو یہ تسلیم کرے گی کہ **مَنۡ لَّمۡ يَحۡكُمۡ بِمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الۡكٰفِرُوۡنَ** (5:44) جو اس کے قانون کے مطابق فیصلہ نہیں کرتا جسے خدا نے نازل کیا ہے' وہ کافر ہے۔ یہ وہ امت ہوگی جس میں اور غیر مسلم میں وجہ تفریق **مَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ** ہوگی۔ ایک امت امتِ واحدہ ہے' وہ امت فیصلہ کرے گی کہ قرآن کے اس آئینی اصول پر عمل پیرا ہونے کا آج کونسا طریقہ ہے۔ یہی امت اس طریق کو کل بدل دے گی بشرطیکہ قرآن کے کسی اصول سے نہ ٹکرائے۔ قرآن نے اصول یہ دیا تھا کہ **اِنَّ اَكۡرَمَكُمۡ عِنۡدَ اللّٰهِ اَتۡقٰٮكُمۡ** (49:13)۔ تم میں سے سب سے زیادہ واجب التکریم وہ ہے جو سب سے زیادہ قوانینِ خداوندی کا اتباع کرنے والا ہے۔ اب اگر آپ کے شوریٰ کے اندر یہ چیز ہے تو وہ قرآن کے اصولوں کے اندر رہتے ہوئے جزئیات خود متعین کرے گی یا آپ نے اس کی تشکیل کرنی ہے۔ آپ آج کی اصطلاح میں اِسے حکومت کہہ لیجیے۔ اس میں معیارِ عزت تقویٰ ہوگا۔ قرآن نے یہ معیار قرار دیا ہے' برادری نہیں' دولت نہیں' حسب و نسب نہیں' پروپیگنڈہ نہیں' ڈنڈا نہیں' استبداد نہیں' فرعونیت نہیں' قارونیت نہیں' ہامانیت نہیں' صرف تقویٰ معیار ہے۔ یہ قرآن کا اصول ہے۔ یہ ہیں وہ حدود اور اصول جو غیر متبدل ہیں' جو مکمل ہیں۔

میں یہ عرض کر رہا تھا کہ یہ جو فی الفور اعتراض ہے کہ صاحب! اگر یہ کیا جائے تو قرآن میں تو یہ تفاصیل نہیں ہیں' تو پھر ہم یہ تفاصیل کہاں سے لائیں۔ چلیے' صاحب! پھر آپ وہ سب خارج از قرآن تفاصیل لے آئے۔ معاف رکھیے گا بات بڑی اہم ہے' اس کے لیے میں پانچ سات منٹ اور لیتا ہوں۔ جب تک تو وہ نظام قائم تھا جس میں قرآن اور صرف قرآن کے اصولوں کو' اقدار کو' حدود کو' غیر متبدل تسلیم کر کے' ان کے اندر رہتے ہوئے معاملات طے کرنے تھے' امت میں کوئی تفرقہ نہیں پیدا ہوا تھا۔ خلافتِ راشدہ (11-40AH بمطابق 632-661AD) میں کوئی فرقہ نہیں تھا' ہو ہی نہیں سکتا تھا۔ قرآن کا دعویٰ ہے کہ مجھ میں کوئی اختلافی بات نہیں ہے۔ جب اس کا یہ دعویٰ ہے تو اس کے حدود کے اندر' اس نظام کے مرکز سے جو طریقِ کار بنایا جاتا تھا' وہ ساری امت کا ایک ہوتا تھا۔ ساری امت پہ وہ نافذ ہوتا تھا۔ میں مرکز کا لفظ Central Authority کے معنی میں استعمال کیا کرتا ہوں' آج یہ جو چیزیں ہیں' ان کا کیا کہنا!! ان کے پروپیگنڈے کے مطابق تو آپ یہ دیکھ لیجیے کہ آج یحییٰ خان [1] (1917-1980) کو بھی' اور فلاں کو بھی' مرکز قرار دیدیتے ہیں اور پھر کہا کہ ان کے فیصلے خدا اور رسول کے فیصلے ہو گئے۔ نہیں قطعاً نہیں۔ لیکن جہاں میں نے مرکز لکھا ہے' وہاں میں نے خلافت علیٰ منہاج رسالت کہا ہے۔ آج کی اصطلاح میں بات یوں سمجھ میں آتی ہے کہ ہر حکومت کی ایک سنٹرل اتھارٹی ہوتی ہے۔ اسے میں نے مرکزِ ملت کہا ہے۔ جب خلافت تھی تو مرکزِ ملت خلافت کے اندر امیر المومنین تھا' خلیفۃ المسلمین تھا یا اس کا جو بھی نظام ہو' ایک فرد ہو' پوری کیبنٹ ہو' وہ پوری حکومت ہو' اس کی کوئی بھی شکل ہو' اب اتھارٹی وہ ہے۔ عزیزانِ من! وہ اتھارٹی یہ فیصلہ کرتی تھی کہ قرآن کے خلاف حکم یا اصول کی تفصیل کیا ہو گی' اور وہ ساری امت پر یکساں نافذ العمل ہوتی تھی۔ حکومت کے قوانین کی طرح' یہ سارا کچھ' جو جھگڑے پیدا ہوئے' اور اختلافات پیدا ہو رہے ہیں' اس نظام کے نہ رہنے کی وجہ سے ہیں۔ کسی وجہ سے یہ نظام نہ رہا۔ اس کے بعد سب سے پہلے یہ بات دماغوں میں ڈالی گئی کہ صرف قرآن ہی آخری سند نہیں ہے' قرآن کی مثل قرآن کے ساتھ' اور بھی ہے۔ جونہی یہ چیز آپ کے ذہن میں آئی اور پھر چل سو چل ہر قسم کے عقائد اور مسالک آپ کے ہاں آتے چلے گئے۔ ان کے صحیح ہونے کا مدار یہ نہیں تھا کہ قرآن کی مثل قرآن کے ساتھ اور بھی ہے۔ سند صرف قرآنِ کریم تھا اور ہے۔

---

[1] جنرل آغا محمد یحییٰ خان (1917-1980) نے 25 مارچ 1969ء کو ملک میں دوسرا مارشل لا لگایا اور پھر 25 مارچ 1969ء سے 20 دسمبر 1971ء تک صدرِ پاکستان کے عہدے پر فائز رہے۔ ان کے بعد 20 دسمبر 1971ء سے 13 اگست 1973ء تک مسٹر ذوالفقار علی بھٹو (1928-1979) غیر عسکری کی حیثیت سے ملک کا چیف مارشل لا ایڈمنسٹریٹر رہے۔ ان کے بعد چودھری فضل الٰہی 14 اگست 1973ء سے 16 ستمبر 1978ء تک صدر پاکستان کے عہدے پر فائز رہے۔

شخصیتوں کو مدار بنانے کا نتیجہ اللہ کی حاکمیت کا اُٹھ جانا ہے

عزیزانِ من! ہوا یہ کہ قرآن کی حدود کے مطابق فیصلے کرنے کے بجائے شخصیتیں ان کا مدار بن گئیں۔ اور شخصیتوں کو مدار بنانے کا تو آسان طریقہ یہ ہے اُن کے دور میں، تو ہمیں پتہ نہیں کہ ان کی حیثیت کیا ہوگی، آج آپ کسی شخصیت کے متعلق اتنا پروپیگنڈہ کر دیجئے اس کے مقام کو بلند کر دیجئے، پھر جو چیز جی چاہے ان کی طرف منسوب کر دیجئے تو کسی میں اس کے خلاف لب کشائی کرنے کی جرأت نہیں ہوتی۔ عزیزانِ من! رسول اللہ ﷺ کو حکم دیا گیا ہے کہ تُو بھی قرآن کے مطابق فیصلے کیا کر۔ حضور ﷺ فرماتے ہیں کہ میں بھی اس کے خلاف کوئی فیصلہ دوں تو میں خدا کے عذاب سے ڈرتا ہوں۔ جہاں شخصیت درمیان میں آئی، اللہ کی حاکمیت اٹھ گئی، توحید باقی نہیں رہی، درمیان میں خدا نہیں رہا۔ اسلام کے اندر شخصیتوں کا سوال ہی نہیں ہے۔ خدا کی کتاب ہے، اس کو عملاً نافذ کرنے کیلیے ایک نظام ہے جو اس کتاب کے اصول واقدار واحکام وقوانین کو غیر متبدل، مکمل، محفوظ، تسلیم کرے، وہ اس کے اندر رہتا ہوا اپنے سارے اختلافی معاملات کے تصفیے کراتا چلا جائے، امت واحدہ رہے اور اس کے ساتھ یہ جو نظام ہے، قیامت تک کیلیے چلتا رہے گا۔

امتِ واحدہ کا وہ نظام کیوں باقی نہ رہا؟

عزیزانِ من! یہ نظام کچھ وقت کیلیے قائم ہوا، پھر ٹوٹ گیا؟ یہ کیوں ٹوٹا؟ وقت نہیں، نہ ہی درس میں اس کیلیے میں تفصیل بیان کر سکتا ہوں۔ میری ''کتاب شاہکارِ رسالت'' کا آخری باب دیکھیے جس کا عنوان ہے: ''شعلۂ عشق سیاہ پوش ہوا ترے بعد۔'' وہاں میں نے بتایا ہے کہ پھر یہ نظام کیوں نہ رہا؟ بہرحال 'کیوں نہ رہا' کی بات تو چھوڑ دیجیے۔ کسی کے دل میں بھی اگر یہ جذبہ ہے کہ پھر سے یہ دین کا وہی نظام قائم ہو جائے تو کوئی شکل اس کے سوا نہیں بجز یہ کہ آیات اللہ کو محکم کیا جائے۔ اس کے محکم کرنے کی میں نے صرف چند آیات آپ کے سامنے پیش کی ہیں۔ اس قسم کی بیسیوں اور آیات ہیں جن میں یہ ہے کہ کتاب اللہ کے مطابق فیصلہ کرنے کے لیے اس کو حکم، اس کو معیار، اس کو پیمانہ، اس کو بنیاد قرار دیدیا جائے تو پھر تو یہ صورت پیدا ہو جائے گی۔ اگر مسلمان نام رکھانے والی قوم اپنے ہاں یہ کچھ کر لے تو اس کے ہاں یہ نظام پیدا ہو جائے گا، ورنہ یہ شخصیت پرستی کے اندر الجھی ہوئی رہے گی، پھر دین نہیں آ سکتا، لیکن اس نے تو انسانیت کا دین بننا ہے اگر یہ قوم نہیں رہے گی تو کوئی دوسری قوم آ رہے گی۔ قرآن نے تو کہا ہے کہ اگر تم اس نظامِ دین سے گریز کرو گے، منہ موڑ لو گے، تو کوئی بات نہیں۔ **يَسْتَبْدِلْ قَوْمًا غَيْرَكُمْ** (47:38) تمہاری جگہ کوئی دوسری قوم لے لے گی **ثُمَّ لَا يَكُونُوٓا أَمْثَالَكُمْ** (47:38) پھر وہ قوم تمہاری مثل نہیں ہوگی۔ وہ خدا کی کتاب کو، غیر قرآنی تصورات، عقائد، نظریات، مسالک سے پاک اور صاف کرتے ہوئے اس نظام کی رو سے، ان کی تفاصیل طے کر کے، پوری امت کیلیے نافذ العمل قرار دیگی، تو پھر دینِ خداوندی متشکل ہو جائے گا اور معاشرے میں قرآن کی آیات اللہ محکم ہو جائیں گی۔

عزیزانِ من! ہم بات کر رہے تھے کہ **اَلْمُلْکُ یَوْمَئِذٍ لِّلّٰہِ** (22:56) جب وہ دَور آئے گا تو اس وقت قوت واقتدار' سب کا سب' قانونِ خداوندی کو حاصل ہوگا۔ **یَحْکُمُ بَیْنَھُمْ** (22:56) تمام امور کے فیصلے اس (ضابطہ یعنی قرآن) کے مطابق ہوں گے۔ اُسی قانون کے مطابق یہ ہوگا کہ **فَالَّذِیْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ فِیْ جَنّٰتِ النَّعِیْمِ** (22:56) جو لوگ اس ضابطہ کی صداقت پر یقین رکھتے ہیں اور اس کے متعین کردہ صلاحیت بخش پروگرام پر عمل پیرا ہو رہے ہیں' انہیں زندگی کی خوش حالیاں اور شادابیاں نصیب ہوں گی۔ عزیزانِ من! ختمِ نبوت کے بعد آیات اللہ کے پھر سے محکم کرنے کی بات ہوگی۔ مگر اب وقت ہوگیا اور میں اب تھک بھی جاتا ہوں۔ اسے ہم اگلے درس میں لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّآ ط اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ط

❀❀ ...... ❀❀❀ ...... ❀❀

دسواں باب: **سورۃ الحج** (آیات 56 تا 66)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قَالَ وَمَنْ يَّقْنَطُ مِنْ رَّحْمَةِ رَبِّهٖۤ اِلَّا الضَّآلُّوْنَ ﴿٥٦﴾ قَالَ فَمَا خَطْبُكُمْ اَيُّهَا
الْمُرْسَلُوْنَ ﴿٥٧﴾ قَالُوْۤا اِنَّاۤ اُرْسِلْنَاۤ اِلٰى قَوْمٍ مُّجْرِمِيْنَ ﴿٥٨﴾ اِلَّاۤ اٰلَ لُوْطٍ ؕ اِنَّا
لَمُنَجُّوْهُمْ اَجْمَعِيْنَ ﴿٥٩﴾ اِلَّا امْرَاَتَهٗ قَدَّرْنَاۤ ۙ اِنَّهَا لَمِنَ الْغٰبِرِيْنَ ﴿٦٠﴾ فَلَمَّا
جَآءَ اٰلَ لُوْطِ ِۨالْمُرْسَلُوْنَ ﴿٦١﴾ قَالَ اِنَّكُمْ قَوْمٌ مُّنْكَرُوْنَ ﴿٦٢﴾ قَالُوْا بَلْ
جِئْنٰكَ بِمَا كَانُوْا فِيْهِ يَمْتَرُوْنَ ﴿٦٣﴾ وَاَتَيْنٰكَ بِالْحَقِّ وَاِنَّا لَصٰدِقُوْنَ ﴿٦٤﴾ فَاَسْرِ
بِاَهْلِكَ بِقِطْعٍ مِّنَ الَّيْلِ وَاتَّبِعْ اَدْبَارَهُمْ وَلَا يَلْتَفِتْ مِنْكُمْ اَحَدٌ
وَّامْضُوْا حَيْثُ تُؤْمَرُوْنَ ﴿٦٥﴾ وَقَضَيْنَاۤ اِلَيْهِ ذٰلِكَ الْاَمْرَ اَنَّ دَابِرَ هٰۤؤُلَآءِ
مَقْطُوْعٌ مُّصْبِحِيْنَ ﴿٦٦﴾

عزیزانِ من! آج فروری 1977ء کی 20 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ الحج کی آیت 56 سے ہو رہا ہے:
(22:56)

سابقہ درس کا تسلسل

یہی آیت پچھلے درس میں بھی زیرِ نظر تھی۔ اب اسی تسلسل سے بات آگے چلتی ہے۔ آپ کو یاد ہوگا کہ گزشتہ چار پانچ دروس میں ایک ہی موضوع ہمارے پیشِ نظر رہا اور وہ تھا کہ ''ختمِ نبوت کے بعد' اب یہ امت جو وارثِ کتاب اللہ قرار دی گئی ہے' اس کا کام یہ ہے کہ

خداوندی کے دشمن، جنہیں شیاطین کہا گیا ہے، خدا کی وحی میں اپنی طرف سے کچھ آمیزشیں کر دیتے تھے اور خدا کا طریق یہ تھا کہ پھر دوسرا نبی آتا، وہ ان آمیزشوں کو الگ کر کے وحی کو پھر اس کی اصلی، منزہ، شکل میں پیش کر دیتا تھا۔ اسے خدا کی آیات کو محکم کرنے سے تعبیر کیا جاتا تھا۔ رسول اللہ ﷺ کی بعثت کے بعد کہا کہ دین کی تکمیل ہوگئی، یہ قرآنِ کریم میں آ کے مکمل ہوگیا، یہ غیر متبدل ہے اور اسکی حفاظت کا ذمہ خود خدا نے لے لیا۔ اب قرآن کے اندر تو کسی قسم کے اضافے یا آمیزش کی گنجائش یا امکان نہ رہا لیکن حضورؐ کے بعد وحی کا نام رکھ کر اس کی کچھ اور بھی شکلیں اختیار کی گئیں۔ اب یہ تو نہیں کہا جائے گا کہ انہیں قرآن کے اندر ملا دیا البتہ ہوا یہ کہ انہیں قرآن کے ساتھ رکھ دیا اور اس کی کیفیت کو یہاں تک بڑھا کر یہ بھی کہا گیا کہ وہ قرآن کی آیات کو منسوخ بھی کر سکتی ہیں۔ تو اس کے بعد آپ دیکھیں گے کہ جتنا مروجہ اسلام آپ کے ہاں چلا آ رہا ہے، یہ جتنی چیزیں خارج از قرآن بنائی گئی تھیں، یہ سارا مذہب اس پر مدوّن ہے۔ قرآن کا مقصد صرف اس کی تلاوت سے ثواب حاصل کرنا رہ گیا ہے، عملاً آپ کے ہاں جو مذہب ہے وہ جتنی بھی خارج از قرآن چیزیں ہیں ان کا مدار اسی پر ہے۔ آپ کسی سے کسی مسئلے پہ پوچھ لیجیے، شریعت کے متعلق، اس دین کے متعلق، کوئی سوال کیجیے، آپ کو جتنی سندیں، جتنی اتھارٹیز کوٹ (Quote) کی جائیں گی، وہ آپ دیکھیں گے کہ قرآن کے باہر کی کتابوں سے متعلق ہونگی۔ اب جبکہ امت کا کام یہ تھا کہ قرآن کی آیات کو، وحی کی آیات کو، محکم کرے اس کے لیے میں نے پچھلے درس میں عرض کیا تھا کہ قرآن ہی کی مختلف آیات سے آیات اللہ کو محکم کرنے کے معنی یہ ہیں کہ آپ قرآنِ کریم کے مطابق حکومت قائم کریں، اسی کے مطابق فیصلے کریں کیونکہ قرآن کا فرمان ہے کہ **وَمَنْ لَّمْ يَحْكُمْ بِمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْكٰفِرُوْنَ** (5:44) جو ما انزل اللہ (قرآنِ کریم) کے مطابق حکومت قائم نہیں کرتے، فیصلے نہیں کرتے، وہ کافر ہیں۔

کفر اور ایمان میں فرق

عزیزانِ من! کفر اور ایمان میں حدِ امتیاز (Line of Demarcation) یہ ہے کہ جو بھی قرآن کے مطابق فیصلے کریں، اس کے مطابق حکومت قائم کریں، انہیں تو مومن کہا جائے گا اور جو ایسا نہ کریں، انہیں کافر کہا جائے گا۔ تو یہ ہے اصل آیات اللہ کے محکم کرنے کا طریق، کہ اس کے مطابق جملہ امور کے فیصلے کیے جائیں۔ اور حضور ﷺ کے یہ فیصلے انفرادی چیز تو ہوتی نہیں تھی اور یہی وہ چیز ہے جس کیلیے یہ ضروری ہے کہ اسلام کی یا قرآن کی آیات کو محکم کرنے کے لیے اپنی آزاد مملکت ہو، اس کے لیے اپنی آزاد مملکت کا ہونا لاینفک ہے۔ جسے آپ فیصلے کرنا کہتے ہیں، یہ حکومت کا کام ہوتا ہے۔ اسی کے نظام کے تابع معاملات کے یہ فیصلے ہوتے ہیں۔ یہ فیصلے، صرف وضو اور طہارت کے ہی مسائل نہیں ہیں۔ یہ تو زندگی سے متعلق جملہ امور، جتنے بھی مسائل ہیں، انفرادی ہوں، اجتماعی ہوں، بین الاقوامی ہوں، اُن تمام امور کے فیصلے ہیں۔ اگر یہ فیصلے آیاتِ خداوندی کے مطابق کیے جائیں گے تو یہ دین ہوگا اور اگر اس کے مطابق نہیں ہونگے، اس سے

الگ ہٹ کے کیے جائیں گے تو یہ اسلام نہیں ہے۔ قرآن نے خود بتا دیا کہ اب ختمِ نبوت کے بعد کسی نبی کی تو ضرورت نہیں کیونکہ قرآن کے اندر کوئی آمیزش نہیں ہوئی کہ جس کو الگ کرنے کیلیے خدا کیطرف سے کسی نئی تازہ وحی کی ضرورت ہو۔ وہ تو آپ کے ہاں محفوظ شکل میں موجود ہے۔ اب امت کا فریضہ یا منصب یہ ہے کہ اس محفوظ کلام اللہ (قرآنِ کریم) کو اس کی آیات کو محکم کرے۔ اس کام کے لیے ایسا نظام قائم کرے جس میں اس امت کے جتنے فیصلے ہیں وہ قرآن کے مطابق ہوں۔ عزیزانِ من! گزشتہ تین چار درسوں میں ان آیات کی مسلسل تشریح کے بعد ہم یہاں تک پہنچے تھے۔ اب آخر میں یہ تھا کہ جب یہ ہوگا تو **اَلْمُلْكُ يَوْمَئِذٍ لِّلّٰهِ يَحْكُمُ بَيْنَهُمْ** (22:56)۔ اُس وقت قوت و اقتدار سب کا سب قانونِ خداوندی کو حاصل ہوگا اور تمام امور کے فیصلے اِس (ضابطہ یعنی قرآن) کے مطابق ہوں گے۔ اسے کہیں گے حکومتِ خداوندی اسے کہیں گے حکومتِ الٰہیہ کہ جس میں جو فیصلے ہیں وہ خدا کے قانون کے مطابق کیے جائیں۔

آیاتِ خداوندی کو محکم کرنے کا نتیجہ: زندگی کی آسائشیں اور شادابیاں

عزیزانِ من! اب آگے یہ بات چلی کہ **فَالَّذِيْنَ اٰمَنُوْا وَعَمِلُوا الصّٰلِحٰتِ** (22:56)۔ اسی قانونِ خداوندی کے مطابق یہ ہوگا کہ وہ لوگ جو اس حقیقت پر ایمان رکھتے ہوئے کہ وحیِ خداوندی اس قرآن کے اندر محفوظ ہے غیر متبدل شکل میں ہے عملِ صالح کریں گے یعنی ان آیات پر عمل کر کے انہیں محکم کریں گے وہ عملِ صالح یہی ایمان و یقین ہوگا۔ کہ وحی اس قرآن کے اندر ہے محفوظ ہے غیر متبدل شکل میں ہے۔ اور عملِ صالح یہ ہے کہ اس قرآن کی آیات کو محکم کیا جائے یعنی جملہ امور کے فیصلے اس قرآن کے مطابق کیے جائیں۔ یہ عملِ صالح ہوا۔ اب اسی آیت میں آگے کہا کہ جو یہ کریں گے۔ **فِيْ جَنّٰتِ النَّعِيْمِ** (22:56) انہیں زندگی کی خوش حالیاں اور شادابیاں نصیب ہوں گی وہ آسائشوں کی زندگی بسر کریں گے۔ اب یہ زندگی مرنے کے بعد ہی کی زندگی نہیں ہے بلکہ وہ زندگی یہیں سے شروع ہو جاتی ہے۔ قرآنِ کریم میں بے شمار آیات ہیں جن میں یہاں کی زندگی کے متعلق کہا گیا ہے کہ جو قوم بھی اس قرآن کے مطابق اپنا نظام قائم کرے گی ہم انہیں اسی دنیا کے اندر سرفرازیاں اور خوشگواریاں جملہ نعمائے خداوندی عطا کر دیں گے یہ بات یہیں سے شروع ہو جائے گی اور اس کے برعکس **وَالَّذِيْنَ كَفَرُوْا وَكَذَّبُوْا بِاٰيٰتِنَا فَاُولٰٓئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّهِيْنٌ** (22:57) اور جو لوگ ان قوانین سے انکار کریں گے اور انہیں جھٹلائیں گے انہیں ذلت[1] آمیز سزا ملے گی۔ عزیزانِ من! اسے دوسرے الفاظ میں یوں

---

[1] مُهِيْنٌ۔ مادہ "ھ و ن" ہے۔ صاحبِ تاج العروس لکھا ہے کہ هَانَ۔ يَهُوْنُ۔ هُوْنًا ذلیل ہونا اور هَوَّنَ الشَّيْءَ وَاَهَانَهٗ کسی چیز کو حقیر سمجھنا۔ اس کی اہانت کرنا۔ اس کی مزید تفصیل کے لیے دیکھیے: پرویزؒ: لغات القرآن جلد چہارم ادارہ طلوعِ اسلام لاہور 1961 ص ص۔ 1774 - 1772
عَذَابٌ۔ سزا نیز بھوک پیاس اور تکلیف کو بھی کہتے ہیں (تاج العروس اور محیط المحیط)۔ اس لیے عَذَابٌ مُّهِيْنٌ کا مطلب ہے۔ ذلت آمیز سزا (جس سے آدمی بے وقعت اور حقیر ہو جائے۔)

کہیے کہ جو اس صداقت سے انکار کریں گے' کہ وحی خداوندی قرآن کے اندر محفوظ شکل میں' غیر متبدل اور مکمل ہے' اور پھر ہمارے قانون کو عملاً جھٹلائیں گے تو انہیں ذلت آمیز سزا ملے گی۔ پہلا (22:56) عملِ صالح تھا کہ جس کے مطابق فیصلے کریں گے اور یہاں (22:57) یہ کہا گیا ہے کہ جو ہماری آیات کی تکذیب کریں گے تو انہیں ذلت آمیز سزا ملے گی۔ میں نے یہ واضح کیا تھا کہ تکذیبِ آیات کے معنی یہ ہوتا ہے کہ ''زبان سے مانتے رہیں لیکن عملاً یہ بات ہو کہ نہیں' صاحب! جیسا یہ کہا گیا ہے' ویسا نہیں ہوگا۔'' اب یہ جو کہا گیا ہے کہ جو تکذیبِ آیات کریں گے' جو اس کے خلاف نظام قائم کریں گے **فَأُولَٰئِكَ لَهُمْ عَذَابٌ مُّهِينٌ** ان لوگوں کیلیے عذاب ایک تباہی ہے' ذلت آمیز تباہی۔ عزیزانِ من! تکذیب کے معنی یہ ہیں کہ ''یہ کہا جائے کہ نہیں' یہ بات نہیں ہے' ایسا نہیں ہوسکتا' یعنی کسی کی بات اگر چہ خارجی واقعہ کے عین مطابق ہو لیکن اگر اس میں اس کے دل اور زبان کی ہم آہنگی نہیں تو وہ کِـــــــذْبٌ ہے اور اگر کسی معاملہ میں دل اور زبان ہم آہنگ ہیں لیکن وہ بات واقعہ کے خلاف ہے تو اسے کِذْبٌ نہیں کہیں گے۔ وہ بات اُس کے عدمِ علم پر محمول کی جائے گی۔''

جغرافیائی استقامت کے باوجود ہماری ہزار سالہ تاریخی زبوں حالی

عزیزانِ من! ہماری ہزار سالہ تاریخ اس پر شاہد ہے کہ جب سے ہم نے قرآن چھوڑا ہے' ہم اسی عذاب مھین' ذلت آمیز عذاب میں مبتلا ہیں۔ گزشتہ تاریخ کو چھوڑ دیجیے' اپنے ہی زمانے کو لیجیے۔ آبادی کے لحاظ سے مسلمانوں کی تعداد کم از کم اسی کروڑ ہے۔ اب تو اس سے بھی بڑھ گئی ہے' شاید تقریباً نوے کروڑ آبادی ہوگئی ہے۔ ان کی Geographical position (جغرافیائی حیثیت) یہ ہے کہ مراکش سے لے کر انڈونیشیا تک ایک مسلسل بحرِ متلاطم ہے۔ یہ کوئی چھوٹی چیز نہیں ہے اور یہ علاقہ جہاں اکثریت مسلمانوں کی ہے' وہ تو زمین کے ناف میں واقع ہوا ہے۔ اس تسلسل میں' اتنی بڑی تعداد میں' اتنے لمبے خطہ زمین کے اندر' جغرافیائی اعتبار سے اگر یورپ قوم بس رہی ہوتو پھر انکی قوت کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔ دراصل کسی قوم کی یہ جغرافیائی پوزیشن بڑی محکم ہوتی ہے اور پھر اس خطہ زمین کے مختلف حصوں میں سب کچھ موجود ہے' انہیں کسی دوسرے کی احتیاج ہی نہیں ہے اگر دوسروں کو ان کی احتیاج ہوتو پھر یہ تو Big Three Powers (تین بڑی قوتیں) کہلاتے۔ میں کہتا ہوں کہ یہ قوم تو دنیا میں Biggest Power (سب سے بڑی قوت) ہونی چاہیے تھی لیکن آپ غور کیجیے کہ وہاں مراکش سے یہاں انڈونیشیا تک وہ ساری قوم ذلت آمیز زندگی بسر کر رہی ہے۔ ان پر Big powers (بڑی قوتوں) کا خوف طاری ہے' ان کی احتیاج ان کو ہر وقت گھیرے رکھتی ہے۔ یہ اپنے فیصلے آپ نہیں کر سکتے' دوسروں کے سہارے زندگی بسر کررہے ہیں۔ [1] اس سے بڑا بھی آج کوئی اور عذاب ہوگا!!

---

[1] اِسی لیے علامہ اقبالؒ (1938 - 1877) نے کہا تھا کہ

خرد نے کہہ بھی دیا لاالہ تو کیا حاصل دل ونگاہ مسلماں نہیں تو کچھ بھی نہیں (اقبال: ضربِ کلیم' نیشنل بک فاؤنڈیشن' اسلام آباد' 1996' ص۔57)

خدا کے کہے ہوئے پر اعتبار نہ کرنا تکذیبِ دین ہے

عزیزانِ من! یہ ہے وہ جسے تکذیب دین کہتے ہیں۔ یہ مسلمان قوم آیاتِ قرآن کا زبان سے انکار نہیں کرتی' بلکہ ان پہ اِسے اعتبار ہی نہیں ہے کہ ان آیات اللہ میں واقعی یہ بات ٹھیک کہی ہے کہ اس قرآنِ کریم کے مطابق زندگی بسر کرو گے' تو تمہیں ہر قسم کی خوشگواریاں میسر ہونگی' اس کے خلاف جاؤ گے تو ذلت آمیز عذاب ہوگا۔ اب اگلی آیت میں یہ بات واضح کی کہ یہ جو اس کے مطابق فیصلے کرنا ہے یہ آیات اللہ کو محکم کرنا ہے۔ جیسے میں نے کہا ہے کہ قرآن کریم کہتا ہے کہ یہ چیز مسجدوں اور مکتبوں میں بیٹھے ہوئے نہیں ہو سکے گی۔ جب قرآن کے مطابق فیصلے کرنے کیلیے اٹھو گے تو دنیا کی جتنی مفاد پرست قومیں ہیں' وہ تمہاری مخالفت کیلیے اٹھ کھڑی ہونگی۔ لیکن آخر الامر تمہی کامیاب وکامران رہو گے۔

مفاد پرستی کی بنا پر قرآنی نظام کو کوئی قوم برداشت نہیں کرتی

عزیزانِ من! قرآنی نظام تو ہر نوعِ غلامی کیلیے' موت کا پیغام ہے اور دنیا کی کوئی قوم یہ برداشت نہیں کر سکتی کہ کسی خطہ زمین میں بھی قرآن کے مطابق نظام قائم ہو جائے۔ اگر کہیں بھی یہ قائم ہو گیا تو دنیا کے باقی نظام نہیں رہ سکتے۔ یہ ایک ایسا مثالی نظام قائم ہوتا ہے جس کے متعلق قرآن نے کہا ہے کہ تم اسے قائم کر کے دیکھو **یَدۡخُلُوۡنَ فِیۡ دِیۡنِ اللّٰہِ اَفۡوَاجًا** (110:2) باقی دنیا کے انسان فوج در فوج اس نظام کیطرف لپک کر اور اُمڈ کر آ جائیں گے' اس لیے دنیا کی وہ قومیں' جو اس کے خلاف نظام قائم کیے ہوئے چلی آ رہی ہیں' وہ کبھی برداشت نہیں کر سکتیں کہ اس کے مطابق نظام قائم ہو جائے۔ لہٰذا جو یہ نظام قائم کرنا چاہتے ہیں' اب انہیں پھر مخالفتوں کا مقابلہ کرنا ہوگا۔ اسی لیے قرآن نے متعدد مقامات پہ یہ کہہ رکھا ہے کہ کیا تم سمجھتے ہو کہ یونہی بیٹھے ہوئے جنت میں چلے جاؤ گے اور تم پر وہ کچھ نہیں بیتے گی جو اس سے پیشتر ان قوموں پہ بیتی ہے جنہوں نے وحی خداوندی کے مطابق نظام قائم کرنے کی کوشش کی۔ قرآن نے کہا کہ تمہیں ان تمام مصائب ومشکلات اور نامساعد حالات سے نہ صرف گزرنا پڑے گا بلکہ انہیں برداشت بھی کرنا ہوگا' اور ان مخالفتوں کا مقابلہ بھی کرنا ہوگا۔

نظامِ خداوندی کی پہلی منزل: ہجرت

عزیزانِ من! اس نظام کے قیام کے لیے پہلی منزل ہجرت ہے۔ اس لیے قرآنِ کریم نے کہا کہ **وَالَّذِیۡنَ ھَاجَرُوۡا فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ** (22:58) وہ لوگ' اس نظام کے قیام کی خاطر' اپنا گھر بار (اور سب کچھ) چھوڑ کر نکل کھڑے ہوتے ہیں۔ اب اس نظام کے قیام کیلیے پہلی منزل ہجرت کی آ گئی۔ قرآنِ کریم میں آپ دیکھیے گا کہ ہر رسول کی زندگی میں یہ مقام آتا ہے۔ اس میں آپ دیکھیں گے کہ جس مقام پہ وہ اپنی دعوت کا آغاز کرتا ہے' کچھ عرصے تک تو وہ وہاں اس دعوت کی تبلیغ کرتا ہے' اِسے پھیلاتا ہے اور اسکے بعد وہ وہاں سے اپنے ان چند متبعین کو' جو اس کے ساتھ' لمبے عرصے میں' بڑی تھوڑی سی تعداد میں ملتے ہیں' لے کر کسی ایسے خطہ زمین کیطرف چلا جاتا

ہے' جہاں اس نظام کے قیام کیلیے فضا زیادہ سازگار ہوتی ہے۔ اسے ہجرت کہا جاتا ہے۔ ویسے تو ہجرت کو عمومی معنی کے اعتبار سے لیجیے تو اس کے معنی ہوتے ہیں کہ ''اس مقصد کے حصول کیلیے' جو کچھ چھوڑنا پڑے' اسے چھوڑ دیا جائے۔'' اور اس چھوڑنے میں آخری مرحلہ وہ آتا ہے' جہاں گھر بار چھوڑنا پڑے' وطن چھوڑنا پڑے' بیوی بچوں کو چھوڑنا پڑے' مال و سامان و اسباب کو اور جائیدادوں کو چھوڑنا پڑے۔ اس آخری مرحلے میں انسان وہ سب کچھ چھوڑ کر' پلو جھاڑ کر' اٹھ کر چل پڑے۔ اسے ہجرت کہتے ہیں کیونکہ اس کا آخری مرحلہ وہ ہوتا ہے جہاں انسان ایک وطن سے دوسرے وطن کی طرف منتقل ہوتا ہے۔ ہمارے ذہن میں ہجرت کا یہی تصور ہے۔ قرآن یہ بتاتا ہے کہ اس میں تو پہلے ہی دن سے مخالفت کی وجہ سے مقابلہ کرنے کے لیے اور اپنی مدافعت کے لیے ہجرت شروع ہو جاتی ہے۔ ہر چیز چھوڑنی پڑتی ہے اور رفتہ رفتہ یہاں تک آ جاتے ہیں کہ گھر بار چھوڑنا پڑتا ہے' وطن چھوڑنا پڑتا ہے۔ یہ چھوڑنا Escapism نہیں ہے' یہ بھاگنا نہیں ہے' بلکہ یہ کسی ایسی فضا کیطرف منتقل ہونا ہے جہاں اس نظام کے قیام کے لیے حالات زیادہ سازگار ہوں۔ یہ ہے وہ انتقالِ مکانی کا مرحلہ جسے ہم عام طور پہ ہجرت کہتے ہیں۔ اب بظاہر جو نظر آتا ہے وہ یہ ہے کہ ٹھیک ہے' ایک جگہ' ایک قوم نے' اس کی تصدیق کی' چاہا کہ وہاں ایسا نظام قائم ہو' مگر وہاں کے لوگوں نے اس کی مخالفت کی۔ اِس نظام کے قیام کے چاہنے والوں نے اس مخالفت کا مقابلہ نہیں کیا۔ یہ اس قابل نہیں تھے کہ اسکی مدافعت کر سکتے۔ انہوں نے کہا کہ اچھا' ٹھیک ہے' ہم اس مقام کو چھوڑ کے کسی دوسری جگہ چلے جاتے ہیں تو بظاہر ایسا ہونا چاہیے تھا کہ انہیں اس پہ اعتراض نہ ہو' بلکہ اِن مخالفین کو تو خوش ہونا چاہیے تھا کہ اچھا ہوا کہ وہ بلا' جس قدر گلے پڑی ہوئی تھی' اس سے ہم چھوٹ گئے' اب آرام سے زندگی بسر کریں گے' کیونکہ ان کی مخالفت میں اور اپنی مدافعت میں' ہمیں کچھ نہ کچھ تو کرنا ہی پڑتا تھا تو اچھا ہوا کہ یہ گئے' تو چلے جانے دیجیے' خس کم جہاں پاک۔ مگر ایسا نہیں ہوا۔

ہجرت کے باوجود مخالفت کی اصل وجہ قرآن یا وحی کے مطابق نظام کا قیام ہے

عزیزانِ من! ہجرت کرنے کے بعد بھی مخالفت میں کمی نہیں آئی۔ کہیں بھی ایسا نہیں ہوا کہ ان نظام قائم کرنے والوں نے وطن چھوڑ کے دوسری جگہ جانے کا ارادہ کیا ہو اور اس کی بھی مخالفت نہ ہوئی ہو۔ یہ مخالفت کیا ہے؟ مخالفت' درحقیقت' قرآن یا وحی کے مطابق نظام قائم کرنے کی مخالفت ہے۔ اس کا تو سوال ہی نہیں کہ کس مقام پہ یہ نظام قائم ہوتا ہے۔ انہوں نے اپنے ہاں مخالفت کی کہ ہم یہاں یہ نظام قائم ہی نہیں ہونے دینگے۔ اب یہ لوگ یہاں سے اٹھ کے دوسری طرف جا رہے ہیں کہ وہاں جا کے ہی ہم اس کو قائم کریں تو چونکہ ان کے سامنے مقصد یہ تھا' کہ اس نظام کو قائم نہیں ہونے دینا' اس لیے انہیں یہ کبھی بھی پسند نہیں تھا' گوارا نہیں تھا کہ یہ کسی دوسری جگہ جا کے اس نظام کو قائم کر دیں۔ وہ اس مخالفت میں سچے تھے۔

عزیزانِ من! ہمیں اب اس چیز کا معلوم ہی نہیں' احساس ہی نہیں کہ قرآن کے مطابق نظام قائم کرنے سے دنیا میں کتنا بڑا انقلاب

آ تا ہے' دنیا کس طرح اس کی طرف کھنچی ہوئی چلی آتی ہے۔ وہ جو مخالفت کرنے والے تھے وہ اس حقیقت سے بخوبی آگاہ تھے۔ اگر ہم قرآنِ کریم کی تاریخ ہی لیں' رسول اللہ ﷺ کی تاریخ ہی لیں تو معلوم ہوتا ہے کہ مخالفت کرنے والے یہ جو قریش تھے' وہ ہم سے زیادہ قرآن کو سمجھتے تھے' ہم سے بہتر طور پر جانتے تھے کہ اس کے نظام کے قیام کے اندر ان کیلیے کتنی قیامتیں موجود ہیں۔ وہ اس نظام کے متعلق سمجھتے تھے کہ اگر کہیں بھی یہ قائم ہوگیا' تو ہماری مفاد پرستی باقی نہیں رہ سکتی۔ اور آپ نے دیکھا کہ تاریخ نے کس طرح ان حقائق کو ثابت کیا ہے کہ اس زمانے میں مکے سے کوئی تین سو میل دور مدینہ' کوئی چھوٹی منزل نہیں ہوتی۔ وہ آج کی دنیا نہیں تھی کہ تین سو میل کا فاصلہ آدھے گھنٹے میں ہوائی جہاز میں طے ہوجاتا ہے۔ اتنی دُور جا کر صاحب! قریش کا ان سے کوئی تعلق' کوئی واسطہ ہی نہیں تھا۔ یہ بھی نہیں تھا کہ قریش کی ایک مملکت تھی اور اس مملکت کا ایک حصہ مدینہ تھا اور یہ چاہتے تھے کہ ہماری مملکت کے کسی گوشے میں بھی یہ ایسا نظام قائم نہ کرسکیں۔ قریش کی مملکت تو تھی ہی نہیں تو انہیں اس پر کیا اعتراض ہوسکتا تھا لیکن اعتراض یہی تھا' وہ جانتے تھے کہ اگر کہیں بھی یہ نظام قائم ہوگیا تو ہم باقی نہیں رہ سکتے۔ اس لیے ہجرت کے مقام سے ہی ان کی مخالفت شروع ہوجاتی ہے۔ ان قریش کا سوچ کا دائرہ ہی یہ تھا کہ ہم انہیں مدینہ جانے ہی نہیں دینگے اور یہاں بھی کام نہیں کرنے دینگے۔

فرعون کا بھی یہی کردار تھا

عزیزانِ من! قرآن کہتا ہے کہ فرعون نے بھی یہی کہا تھا۔ حضرتِ موسیٰ علیہ السلام نے فرعون کو کہا تھا کہ میں تمہارے ساتھ جنگ کرنے کیلیے نہیں آیا' میں تو صرف یہ کرنے کیلیے آیا ہوں کہ اس بنی اسرائیل کی قوم کو میرے ساتھ جانے کی اجازت دیدو' ہم تمہاری مملکت سے نکل جائیں گے۔ تمہیں یہ اچھے نہیں لگتے' ان پر اتنے ظلم وستم کرتے ہو۔ انہیں چھوڑ دو......جینوں کیندے نیں پچھا چھڑانا[1]......انہیں میرے ساتھ جانے دو لیکن موسیٰ علیہ السلام کو فرعون کا کہنا تھا کہ ہم جانتے ہیں کہ ''اس جانے کے معنی کیا ہونگے''، نہیں جانے دینگے۔ قریش کی بھی یہی چیز تھی کہ ''نہیں جانے دینگے۔'' اسی لیے کہا کہ آیات اللہ کے محکم کرنے کا یہ مرحلہ آسانی سے طے نہیں ہوسکتا۔ یاد رکھو! اس کیلیے تو بڑی قربانیاں دینی پڑیں گی اور پہلی قربانی وہی ہے جسے آپ ہجرت کہتے ہیں: چھوڑ کے دوسری جگہ چلے جانا اس لیے قرآنِ کریم نے کہا کہ وَالَّذِينَ هَاجَرُوا فِي سَبِيلِ اللَّهِ ثُمَّ قُتِلُوا أَوْ مَاتُوا (22:58)۔ (لیکن اس دوران میں) جو لوگ' اس نظام کے قیام کی خاطر' اپنا گھر بار (اور سب کچھ) چھوڑ کر نکل کھڑے ہوتے ہیں' وہ اگر اس جدوجہد میں اپنی طبعی موت مرجائیں' یا قتل کردیئے جائیں تو انہیں اس احساس سے افسردہ خاطر نہیں ہونا چاہیے کہ اس نظام کی تشکیل ان کے ہاتھوں سے تکمیل تک نہیں پہنچ سکی۔ انہوں نے اس جدوجہد میں پورا پورا حصہ لیا اور اس طرح اپنے لیے حیاتِ جاوید کا سامان مہیا کرلیا۔

---

[1] یہ وہی ہے جسے کہتے ہیں کہ ان کا پیچھا چھوڑ دو۔

خدا کے ہاں مجاہدین کے مدارج

عزیزانِ من! قرآن کے الفاظ **ثُمَّ قُتِلُوْا** (22:58) سے نظر آ گیا کہ یہ جوان مخالفین کی طرف سے قتال تھا' یہ بدر کے میدان میں جا کر نہیں ہوا تھا' یہ تو یہیں سے انہوں نے ان کے خلاف اس قسم کی سازش کر دی تھی اور اسی لیے ان کو یہاں سے وہاں جانے کیلیے لمبا عرصہ لگ گیا تھا۔ لوگ چوری چھپے جاتے تھے کیونکہ میدان میں آ کے ان کے خلاف جنگ کرنے کی تو ابھی قوت نہیں تھی۔ تو یہ جو چیز ہے **ثُمَّ قُتِلُوْا** اس میں یہ نظر آتا ہے کہ نوبت یہاں تک پہنچی ہوئی تھی کہ یہ انہیں یہاں سے آسانی سے نکل کر بھی جانے کیلیے رضامند نہیں تھے۔ تو کہا کہ کوئی بات نہیں ہے' ہجرت کرنے والا جو بھی یہاں سے نکل کر جا رہا ہے' اگر راستے میں قتل کر دیا جائے یا طبعی موت مر جائے تو بھی اس کے مدارج و مناصب میں' اللہ کے ہاں' کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ اب آپ دیکھیے کہ میدانِ جنگ میں' جہاں جہاد کا ذکر ہے' جسے قتال یا جنگ کہا جائے گا(3:156) جو مجاہد جنگ کے لیے جاتے تھے' ان کے متعلق قرآنِ کریم نے کہا کہ **وَلَئِنْ قُتِلْتُمْ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ اَوْ مُتُّمْ لَمَغْفِرَةٌ مِّنَ اللّٰهِ وَرَحْمَةٌ خَيْرٌ مِّمَّا يَجْمَعُوْنَ** (3:157)۔ اس راستے میں اگر تم قتل کر دیئے جاؤ یا طبعی موت مر جاؤ تو بھی تمہارے مدارج اور مناصب میں اللہ کے ہاں کوئی فرق نہیں پڑے گا۔ ضروری نہیں ہے کہ دشمن کی تلوار سے ہی تمہاری گردن کٹے۔ جب تم اس راستے میں جنگ کرنے کیلیے' جان دینے کیلیے' نکلے ہو تو یہ بھی تو ہو سکتا ہے کہ اس راستے میں کوئی طبعی موت سے ہی مر جائے۔ تو اب یہ جو ہمارے ہاں جسے عام طور پہ شہید کہا جاتا ہے' جس کا گلا میدانِ جنگ میں دشمن کی تلوار سے کٹے اس طرح سے جو قتل ہونے والا ہے اُسے مقتول فی سبیل اللہ کہا جاتا ہے' قرآنِ کریم اس میں اضافہ کرتا ہے کہ اس راستے میں جاتے ہوئے' اگر کوئی طبعی موت سے بھی مرتا ہے' تو وہ بھی اسی کے برابر ہے جس کا گلا میدانِ جنگ میں جا کے دشمن کی تلوار سے کٹ جاتا ہے۔ اس طرح قرآنِ کریم نے کہا ہے کہ اگر کوئی اس راستے میں قتل ہو جائے یا انہیں طبعی موت آ جائے' اللہ کے ہاں ان کے مناصب ایک ہی ہیں۔ اس لیے کہ یہ اس مقصد کیلیے نکلے ہوئے ہیں۔ اصل شے تو وہ مقصد ہے جس کیلیے یہ اٹھ کر جان دینے کیلیے چلے ہیں۔ تو اسی طرح یہاں بھی یہ چیز کہی گئی ہے کہ اگر ہجرت فی سبیل اللہ میں بھی یہ کیفیت ہو کہ **ثُمَّ قُتِلُوْٓا اَوْ مَاتُوْا** (22:58) قتل کر دیئے جائیں یا ان کو موت آئے۔ اس کے آگے جو یہ لفظ ہیں اس سے یہ نظر آتا ہے کہ طبعی موت سے مر جائیں یا قتل ہو جائیں' ہمارے نقطہ نگاہ سے' عام نقطہ نگاہ سے' تو ان پہ موت وارد ہو گئی' عام نقطہ نگاہ سے یہ ختم ہو گئے' لیکن قرآن جو زندگی کا تصور دیتا ہے اس میں تو یہ موت جسم پر وارد ہوتی ہے۔ انسان کا جو نفس ہے' انسان کی جسے ہم انسانیت کہتے ہیں' اس کا کچھ بھی نام رکھ دیجیے' وہ جو اس کی ''میں'' یعنی ذات ہے وہ اس موت سے نہیں مرتی' وہ تو آگے بھی چلتی ہے۔ اسے حیاتِ آخرت کہتے ہیں۔

جنت بھی شہداء کے لیے آخری مقام نہیں ہے

عزیزانِ من! ہمارے ہاں آخرت کی زندگی کا تصور یہ ہے کہ یہاں سے مرنے کے بعد آگے جنت میں گئے بس یہ وہ جنت آخری مقام ہوگیا۔اب وہاں ابدی طور پہ کھانا پینا عیش کرنا بس یہی کچھ ہوگا۔اس کے بعد آگے کوئی تصور ہی نہیں دیا جاتا۔بات یہ نہیں ہے۔جیسا کہ میں نے متعدد بار کہا ہے کہ قرآنِ کریم کی رو سے زندگی ارتقائی منازل طے کرتی ہوئی چلی جارہی ہے۔وہ جو آپ کے ہاں کا ایک پہلا لائف سیل تھا' وہاں سے زندگی نے' لائف نے' ارتقائی منازل طے کرنے شروع کیے۔وہ درجہ بدرجہ یہ طبعی منازل طے کرتی ہوئی حیوانی درجے تک پہنچی' وہاں سے ایک منزل آگے بڑھی' انسانیت کے درجے میں آئی۔یہاں آ کر یہ حیوانیت سے مختلف ہوگئی۔یہاں اس میں ایک ایسی شے آ گئی جو اب طبعی موت سے نہیں مرسکتی۔یہ آگے جاتی ہے اور اتنا ہی نہیں ہے کہ وہ اس موت کے بعد آگے گئی تو اس کے بعد پھر آگے سلسلہ ختم ہوگیا۔اس نے مزید ارتقائی منازل طے کرنے ہیں۔جنت اس کا آخری مقام' آخری منزل نہیں ہے۔وہ تو راستے میں سستا کر آگے چلنے کا مقام ہے۔دیکھیے! قرآن ایک لفظ میں کیسے یہ بات صاف کرتا ہے۔وہ کہتا ہے کہ یہ لوگ جو اس راستے میں قتل کردیئے جائیں یا طبعی موت مرجائیں تو انہیں اس احساس سے افسردہ خاطر نہیں ہونا چاہیے کہ اس نظام کی تشکیل ان کے ہاتھوں سے تکمیل تک نہیں پہنچ سکی۔انہوں نے اس جدوجہد میں پورا پورا حصہ لیا اور اس طرح اپنے لیے حیاتِ جاوید کا سامان مہیا کرلیا۔لہٰذا **لَيَرْزُقَنَّهُمُ اللّٰهُ رِزْقًا حَسَنًا** (22:58) اس کے بعد اللہ ان کو نہایت خوشگوار اور حسین سامانِ نشوونما دیگا۔نشوونما کا سامان تو اس چیز کیلیے ضروری ہے کہ جس نے آگے بڑھنا ہے۔

شہید کا لفظ ہماری اصطلاح ہے' قرآن کی نہیں

عزیزانِ من! شہید کا لفظ تو ہماری اپنی اصطلاح ہے قرآن میں یہ لفظ استعمال نہیں ہوا بلکہ قرآن نے ان کیلیے **مقتولین فی سبیل اللہ** ❶ ہی کہا ہے یعنی اللہ کی راہ میں قتل ہوجانے والے۔ان آیات کی رو سے' ویسے ہی خدا کی راہ میں مرجانے والے' جنہیں حیاتِ جاوید کے حامل افراد کہتے ہیں' انہیں وہاں رزق ملے گا' اور رزق سامانِ نشوونما کو کہا جاتا ہے۔یہ صرف روٹی کپڑے کی بات نہیں ہے۔یہ تو جو آپ کا طبعی جسم ہے' اس کی نشوونما کا سامان ہے۔

انسانیت کی نشوونما کے لیے ضروریات کی کیفیت اور انداز

عزیزانِ من! یہاں بھی جو انسانیت کی نشوونما ہے' وہ صرف روٹی کپڑے پہ نہیں ہوسکتی۔روٹی کپڑے اور مکان تک کی ضرورت تو

---

❶ مثلاً جیسے وَالَّذِيْنَ قُتِلُوْا فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ (47:4) تم میں سے وہ جو اللہ کی راہ میں مارے جائیں۔

حیوانی سطح پہ بھی ہوتی ہے۔ ہر حیوان کو ضرورت ہوتی ہے۔ انسان کی بھی طبعی زندگی کیلیے اس کی ضرورت ہے۔ زندگی کے اس درجے میں بھی انسانیت کی نشوونما کیلیے کسی اور چیز کی ضرورت ہوتی ہے۔ وہ جو سامانِ رزق ہے وہ انسانیت کی تربیت کے لیے ہوتا ہے' اس کی صحیح تعلیم کے لیے ہوتا ہے۔ اس کو Values کہتے ہیں جنہیں آپ اقدار کہتے ہیں۔ وہ رزق ان اقدار سے روشناس کرانے کیلیے ہوتا ہے' ان کے مطابق زندگی بسر کرانے کیلیے ہوتا ہے۔ یہ جو سامان ہے اس کو بھی قرآن نے رزق کہا ہے اور اسی لیے رزقاً حسناً کہہ کے تو بات صاف کردی۔

بات یہ آ رہی تھی کہ یہ آیات اللہ کو محکم کرنے کا جو سوال ہے یہ یونہی مسجدوں مجلسوں کے اندر بیٹھ کر نہیں کیا جا سکتا۔ اس کیلیے تو آپ اٹھیں گے تو دنیا بھر کی مخالفت مول لینی پڑے گی اور اس میں پہلی منزلِ ہجرت' جسے انتقالِ مقامی کہتے ہیں' آئے گی۔ اس میں بھی آخری چیز یہ کیفیت ہوگی کہ قتل کیے جائیں گے یا طبعی موت آئے گی لیکن خدا کے ہاں ان کے مدارج وہی ہیں جیسے مدارج میدانِ جنگ میں جا کر جان دینے والوں کے ہیں یا طبعی طور پر مرجانے والوں کے ہیں۔ ان دونوں میں قرآن کوئی فرق نہیں کرتا۔ کہتا ہے کہ **وَاِنَّ اللّٰـهَ لَهُوَ خَيۡـرُ الرّٰزِقِيۡنَ** (22:58)۔ اللہ انہیں' ان کی موت کے بعد' بہترین سامانِ نشوونما عطا کرے گا جس سے وہ زندگی کی مزید ارتقائی منازل طے کرنے کے قابل ہوجائیں گے اور حقیقت یہ ہے کہ اللہ بہترین سامانِ نشوونما عطا کرنے والا ہے۔ اس طرح سے' عزیزانِ من! کہہ دیا وہاں سامانِ نشوونما دیا جائے گا اور کہا کہ یاد رکھو! اس قسم کا بہترین سامانِ نشوونما خدا ہی کے ہاں سے مل سکتا ہے۔ طبعی طور پہ تو ہر جگہ سے مل سکتا ہے لیکن انسانیت کی نشوونما کا سامان یہاں اس دنیا میں بھی خدا کی مقرر کردہ اقدار (Values) کے ذریعے مل سکتا ہے اور اگلی زندگی میں تو' بہرحال' اس کا انداز ہی کچھ اور ہوگا۔ اب یہ جو اس راستے میں قتل ہوگئے یا جنہیں موت آگئی ان کے لیے کہا کہ **لَيُدۡخِلَنَّهُمۡ مُّدۡخَلًا يَّرۡضَوۡنَهٗ** (22:59) وہ انہیں زندگی کی اس منزل میں داخل کرے گا جسے وہ بہت پسند کریں گے۔ یہ زندگی ان کی مرضی کے مطابق ہوگی۔ وہ جو ہم رضی اللہ عنہم ورضوا عنہ کہتے ہیں' ہم صحابہ رضی اللہ عنہم کے ساتھ ہمیشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہم لکھتے ہیں وہ یہی چیزیں ہیں کہ اللہ تعالیٰ انہیں ایسے مقامات' ایسی زندگی عطا کرے گا جنہیں وہ بہت پسند کریں گے اور حقیقت یہ ہے کہ **وَاِنَّ اللّٰـهَ لَعَلِيۡمٌ حَـلِيۡمٌ** (22:59)۔ اللہ سب کچھ جاننے والا ہے' اور نہایت تحمل سے' ہر بات کو اس کے انجام تک پہنچاتا ہے' اسے معلوم ہے کہ اس راستے میں کیا کیا دشواریاں اور مشکلات پیش آئیں گی لیکن یہ حقیقت ہے کہ وہ ہر بات کو' نہایت تحمل سے' اس کے انجام تک پہنچاتا ہے۔

بڑے بڑے مقاصد میں کامیابی کا حصول حلیمی کے بغیر ممکن نہیں

عزیزانِ من! یہاں ایک اہم بات آئی ہے جس کی وضاحت نہایت ضروری ہے اور وہ یہ ہے کہ یہاں حلیم کا لفظ بھی عجیب آیا ہے۔ میں نے آپ کو بتایا تھا کہ حلیم اسے کہتے ہیں ''جو چھوٹی چھوٹی سی باتوں پر بھڑک نہ اٹھے' جس میں سہار' برداشت اور تحمل بہت زیادہ ہو۔''

یہاں لفظ حلیم تو خدا کی صفت کیلیے کہا ہے لیکن درحقیقت کہا یہ گیا ہے کہ یہی مومن کی صفت ہے۔ اس کیلیے حلیم ہونا بڑا ضروری ہے۔ چھوٹی چھوٹی سی باتوں پر بھڑک اٹھنے والے بڑے مقاصد میں کامیاب نہیں ہوتے اور جب قوموں کو جذباتی بنا دیا جاتا ہے تو وہ تو کوئی بھی بڑا مقصد حاصل نہیں کر سکتیں۔ وہ تو جھکڑ کی طرح اٹھتی ہیں' آنسوؤں کی طرح بیٹھ جاتی ہیں۔ ان کی ساری تاریخ کا ماحصل تباہیاں اور نقصانات ہوتا ہے' Achievement (فوز) نہیں ہوتا۔ Achievement (فوز) کیلیے قوم کی صورت یہ ہوتی ہے کہ وہ قوم حلیم ہو' تحمل مزاج ہو' چھوٹی چھوٹی باتوں پر بھڑک نہ اٹھے' ہر معاملے کا فیصلہ ٹھنڈے دل و دماغ سے' غور اور تدبر سے کرے۔

قائداعظمؒ کے تحمل اور برداشت کا گاندھی کو ایک تاریخی جواب

عزیزانِ من! ہمارے ہاں ہندوستان میں مسلمانوں کی تاریخ میں سرسید رحمہ اللہ (1898 -1817) اور اقبالؒ (1938 -1877) تو نظری طور پہ مفکر تھے۔ عملی زندگی میں ہماری خوش بختی تھی کہ ہمیں قائداعظمؒ (1948 -1876) جیسا شخص مل گیا۔ آپ قائداعظم رحمہ اللہ کی زندگی میں دیکھیں گے کہ وہ کبھی بھی چھوٹی چھوٹی سی باتوں پر بھڑک نہیں اٹھتے تھے' بڑے ہی متحمل مزاج تھے۔ انہوں نے ساری جنگ لڑی ہے اور جیسا کہ وہ کہتے تھے کہ آزادی کی اس جنگ میں ایک جان دینا تو ایک طرف رہا' ایک قطرۂ خون بہائے بغیر ہم نے ایک مملکت حاصل کی ہے۔ وہ تو جب اپنے ہاں گاندھی[1] نے 1942ء میں Civil Disobedience[2] (سول نافرمانی) قانون شکنی' کی مہم شروع کی تھی تو اس نے قائداعظم کو دعوت دی تھی کہ آپ کا اور ہمارا یہ مقصد تو مشترک ہے[3] کہ یہاں سے انگریز کو نکال دیا جائے تو اس سلسلہ میں Quit India Movement[4] جو میں چلا رہا ہوں' اس میں آپ بھی شریک ہو جایئے اور اس کا طریق کار ہے: Civil

---

[1] موہن داس گاندھی (1948 -1869)

[2] سول نافرمانی کی تحریک کی منظوری تو 1920ء میں ہوئی جس پر 7 اگست 1942ء کے بعد عمل شروع کیا۔ کانگریس ورکنگ کمیٹی نے بمبئی میں گاندھی جی کی اس تجویز کو بالاتفاق رائے پاس کر دیا۔ اس تجویز کے مطابق کانگریس اور کانگریسوں کا پروگرام یہ تھا کہ سول نافرمانی کی جائے اور قانون توڑا جائے۔ اس کا خلاصہ مسٹر ایمری کی زبان سے سنیئے: ''ان تیاریوں میں تجارتی اور صنعتی کارخانوں میں ہڑتالیں' عدالتوں' اسکولوں اور کالجوں کا بائیکاٹ' ٹریفک میں رکاوٹ' پبلک خدمات میں گڑبڑ' تاروں اور ٹیلیفون کی لائنوں کا کاٹنا' فوجوں اور بھرتی کے دفتروں پر دھرنا مارنا شامل تھا اور لطف یہ کہ عدم تشدد کی آڑ لے کر۔'' (حوالہ: عبدالقدیر' کرنل (ر): دل دل پاکستان' میسرز اکمل قدیر اینڈ کمپنی' لاہور' 1998' ص۔49۔)

[3] مقصد کے لیے قائداعظم رحمہ اللہ کی نگاہِ بصیرت دیکھیے کہ کہاں تک جاتی تھی۔ جناب شریف الدین پیرزادہ سابق اٹارنی جنرل وزیر قانون پاکستان نے درج ذیل واقعہ قلمبند کیا: ''غالباً کانپور میں' کسی احراری نے قائداعظم سے سوال کیا: ''آپ شیعہ ہیں یا سنی؟'' قائداعظم نے کہا: ''تم بتا سکتے ہو پیغمبر اسلام کیا تھے؟'' احراری کہنے لگا: ''وہ مسلمان تھے۔'' قائداعظم نے کہا: ''پھر میں بھی مسلمان ہوں۔'' (حوالہ: عبدالقدیر' کرنل (ر): دل دل پاکستان' میسرز اکمل قدیر اینڈ کمپنی' لاہور' 1998' ص۔188۔)

[4] ''ہندوستان چھوڑ دو'' تحریک کی قرارداد کانگریس کی ورکنگ کمیٹی کے منعقدہ اجلاس ممبئی میں 8/اگست 1942 کو پاس ہوئی۔ (حوالہ: پاکستان: کامیاب منتہا۔ ص۔232۔)

Disobedience (سول نافرمانی) یعنی قانون شکنی کو اپنایا جائے۔ قائداعظمؒ نے اسے یہ کہا تھا کہ مجھے افسوس ہے کہ قوموں کے فلسفہ اجتماعیت پہ تمہاری نگاہ نہیں ہے۔ جب قوم کو قانون شکنی کی عادت ڈال دی جائے تو آج جو قانون شکنی آپ دشمن کے خلاف کرا رہے ہیں' کل ہی وہ تمہارے خلاف قانون شکنی شروع کر دیں گے۔ قوموں کو کبھی قانون شکنی کی عادت نہ ڈالیے۔ قوموں کو قانون کی پابندی کی عادت ڈالیے۔ یہ ٹھیک ہے کہ آج قانون غلط ہے' ہم قانون کو بدلیں گے۔ اگر قوم میں قانون شکنی کی عادت راسخ ہوگئی تو آپ جو بھی قانون بنائیں گے' وہ کتنا ہی اچھا کیوں نہ ہو' وہ قوم اسے توڑے گی کیونکہ تم نے اُسے سکھایا ہی یہ ہے۔ میں اپنی قوم کو اس کی عادت نہیں ڈالنا چاہتا۔ میں اس قانون کو بدلوں گا' لیکن قوم کو قانون شکن نہیں بناؤں گا۔

قائداعظم رحمہ اللہ کے لیے ایک بہت بڑا کریڈٹ

عزیزانِ من! یہ کہا جاتا ہے کہ دیکھیے صاحب! قائداعظمؒ تو ایک دن کیلیے بھی جیل نہیں گئے اور یہ نہیں کیا اور وہ نہیں کیا۔ یہ بہت بڑا اعتراض ہے جو ان کے خلاف کیا جاتا ہے لیکن میں تو کہتا ہوں کہ یہی تو اس کا کریڈٹ ہے' میرٹ ہے کہ انہوں نے اتنی عظیم تحریک کو چلایا' اتنی عظیم مملکت کو حاصل کیا' ایک بندے کو' ایک انسان کو' ایک دن کیلیے' کہیں جیل میں نہیں جانا پڑا۔ پنجاب میں ممدوٹ [1] اور خضر حیات [2] کا جو قصہ ہوا تھا' وہ تو انگریز کے خلاف یا ہندو کے خلاف ایک باہمی چپقلش تھی۔ یہ چیز تو انہوں نے ایک دن کیلیے بھی نہیں ہونے دی۔ میں کہتا ہوں کہ اس تحمل مزاجی' برداشت اور سہار کی بڑی قوت ہوتی ہے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ دیکھنا' کہیں آپ بھڑک نہ اٹھیں۔

---

[1] سر شاہنواز خان ممدوٹ (متوفی 1942ء) جو (کہ) پنجاب مسلم لیگ کے صدر تھے اور آل انڈیا مسلم لیگ کے ممبر تھے۔ وہ پنجاب کی ہر سیاسی تحریک کی مدد کرتے رہتے تھے۔ 1937ء سے مسلم لیگ کے دل و جان سے حامی تھے۔ مسلم لیگ کا پنجاب کا 1940ء کا اجلاس انہی کی جانفشانیوں اور مالی امداد کا شاہکار تھا۔ خود اپنی ذاتی نگرانی میں مسلم لیگ کے پنڈال بنوائے اور اس کے لیے تمام انتظامات میں ہمہ تن مصروف رہے۔ (ص ص۔ 884 -883)' پاکستان کی آزادی کے بعد پنجاب کا پہلا چیف منسٹر خان افتخار حسین ممدوٹ تھا جو 15 اگست 1947ء تا 14 نومبر 1948ء تک چیف منسٹر رہے۔

[2] لیفٹیننٹ کرنل ملک سر خضر حیات خان ٹوانہ (مسلم یونینسٹ) مارچ 1944ء کو حکومتِ پنجاب میں وزیراعظم تھے۔ اس نے حکومتِ پنجاب کے وزیراعظم کی حیثیت سے حکومت ہند کو لکھا تھا کہ پنجاب اسمبلی میں مسلم لیگ کا صرف ایک نمائندہ سردار شوکت حیات ہے۔ اس طرح پنجاب اسمبلی میں مسلم لیگ کا کوئی وجود نہیں رہا (ص ۱۱۹)...... لیکن مسلمانوں کو غلط فہمی میں مبتلا رکھنے کے لیے مسلم لیگ سے وابستگی کا اعلان کرتے رہے۔ (ص۔ 121)۔ 46-1945ء کے انتخابات میں گورنر پنجاب گلنسی اور کانگریس کے صدر ابوالکلام آزاد کی ملی بھگت سے خضر حیات کو وزارت بنانے کی دعوت دی...... چنانچہ خضر حیات یونینسٹ پارٹی کے دس ساتھیوں کے ساتھ ہندوؤں اور سکھوں کے زیرِ سایہ پنجاب کے ڈمی وزیراعظم بن گئے۔ (ص۔ 142)۔ حوالہ: عبدالقدیرؒ کرنل (ر): دل دل پاکستان' میسرز اکمل قدیر اینڈ کمپنی' لاہور' 1998ء۔

حلیم اور علیم دونوں صفات ضروری ہیں

عزیزانِ من! قائداعظم نے کہا تھا کہ یاد رکھو‘ زندگی کے راستے میں حلیم ہونا بھی ضروری ہوگا‘ علیم ہونا بھی بڑا ضروری ہوگا۔ ضروری ہے کہ انسان باخبر بھی رہے‘ چوکنا رہے‘ چاروں طرف اس کی نگاہیں ہوں‘ اور پھر بردباری اور سہارا اتنی ہو کہ چھوٹی چھوٹی سی باتوں پر بھڑک نہ اٹھیں۔ بڑا مقصد سامنے آئے تو جان بھی دیدیں۔ یہ ہے میر کارواں کی خصوصیات۔ یہ ٹھیک ہے کہ وہاں تحریکِ پاکستان میں ان خصوصیات کو عمل میں لانا ہوگا۔ تو اس کے لیے کرنا یہ ہوگا کہ انسان یونہی ذرا ذرا سی باتوں پر بھڑک نہ اٹھے۔ اب یہ سوال پیدا ہوگا کہ اگر ایسی ہی بات تھی تو ابھی اسی سورۃ میں‘ جہاں سے بات شروع ہوئی ہے یعنی 39 ویں آیت کے اندر‘ یہ کہا گیا تھا کہ **اُذِنَ لِلَّذِيْنَ يُقٰتَلُوْنَ بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا** (22:39)۔ یہی وجہ ہے کہ ان لوگوں کو (یعنی جماعتِ مومنین) کو‘ جن پر مخالفین کی طرف سے‘ اس قدر مظالم توڑے گئے ہیں‘ اور جن کے خلاف اب وہ مخالفین میدانِ جنگ تک میں اتر آئے ہیں‘ دشمن کا مقابلہ کرنے کے لیے جنگ کی اجازت دی جاتی ہے۔ اب یہاں ان لوگوں کو‘ جن پہ اس قدر مظالم ہوئے ہیں‘ میدانِ جنگ میں نکلنے کی اجازت دی جاتی ہے۔ لیکن قرآن نے تو وہاں بھی اجازت اس کے ساتھ مشروط کردی ہے کہ **بِاَنَّهُمْ ظُلِمُوْا** (22:39) ان پر بڑے ہی مظالم ہوئے ہیں‘ اب تو اس ظلم کی انتہا ہوگئی۔ تو اس ظلم کی مدافعت کیلیے انہیں اجازت دی جاتی ہے کہ یہ میدانِ جنگ میں آجائیں۔ آپ کو یاد ہے کہ قرآن نے وہیں یہ بات کہہ دی تھی کہ انہیں یہ اجازت اس لیے نہیں دی جاتی کہ ان پہ مظالم ہوئے ہیں‘ ان پہ زیادتی ہوئی ہے‘ بلکہ یاد رکھیے کہ **لَوْلَا دَفْعُ اللّٰهِ النَّاسَ بَعْضَهُمْ بِبَعْضٍ لَّهُدِّمَتْ صَوَامِعُ وَبِيَعٌ وَّصَلَوٰتٌ وَّمَسٰجِدُ يُذْكَرُ فِيْهَا اسْمُ اللّٰهِ كَثِيْرًا** (22:40)۔ اگر اللہ اس کا انتظام نہ کرتا کہ ایک گروہ کی روک تھام دوسرے گروہ کے ذریعے ہوسکے (اگر وہ سرکش قوتوں کو بدلگام چھوڑ دیتا کہ وہ جو جی میں آئے کرتے چلے جائیں‘ تو اور چیزیں تو ایک طرف) کسی قوم کی عبادت گاہ تک بھی دنیا میں محفوظ نہ رہتی......خانقاہیں‘ گرجے‘ یہودیوں کے معبد‘ مساجد جن میں خدا کا نام کثرت سے لیا جاتا ہے......سب‘ کبھی کے ڈھائے جاچکے ہوتے۔

ظلم اور استبداد کے خلاف سینہ سپر ہونا فرض ہے

عزیزانِ من! ظلم اور استبداد کسی بھی قوم کے خلاف کیوں نہ ہو‘ اس امت کا یہ فریضہ ہوگا کہ وہ مظلوم کی حمایت کرے‘ ظالم کے خلاف سینہ سپر ہوکر کھڑی ہوجائے۔ اس سلسلے میں کہا کہ اگر ہم یہ انتظام نہ کرتے رہیں تو دنیا میں کوئی بھی ایسی قوم موجود نہ رہے‘ جو مظلوم کی مدافعت کیلیے‘ سینہ سپر ہوجائے۔ اگر ایسا نہ ہو تو تم دنیا میں دیکھوگے کہ کوئی گرجا‘ یہودیوں کا کوئی معبد‘ کوئی مندر‘ کوئی کلیسا‘ کوئی مسجد باقی ہی نہ رہے۔ وہ تو ان گرجاؤں اور مندروں کی حفاظت کیلیے بھی اس امت کو کھڑا کرتا ہے خواہ ظالم کوئی بھی ہو اور مظلوم کوئی بھی ہو۔ اس مقام پہ اس قوم کو ان کی مدافعت کیلیے اٹھ کھڑے ہونے کی اجازت دی جاتی ہے اب یہاں پوچھا جائے گا کہ اگلی آیت (22:60) کے

شروع میں ہی یہ **ذٰلک** کس مقصد کے لیے آیا ہے؟ اسے یاد رکھیے کہ یہ قرآن کا وہی لفظ ہے جس میں جنگ کی اجازت (22:39) دی گئی ہے۔ یہ اس کی طرف اشارہ ہے۔ اب یہ کہا جائے گا کہ صاحب! ہجرت ہوئی' اس کے بعد یہ جنگیں ہوئیں' اس میں یہ قتال بھی ہوا۔ سوال یہ ہے کہ یہ کیوں ہوا؟ یہاں **ذٰلِكَ** اس سوال کا جواب ہے کہ یہ اس لیے ہے کہ **وَمَنْ عَاقَبَ بِمِثْلِ مَا عُوْقِبَ بِهٖ** (22:60) جس پہ ظلم وستم کیا جائے اور اس ظلم کی انتہا ہو جائے تو اس کو اجازت دی جاتی ہے کہ وہ اس ظالم کے بڑھتے ہوئے ہاتھ کی کلائی کو مروڑ دے اور اگر ایسا کرنے میں **ثُمَّ بُغِيَ عَلَيْهِ** (22:60) وہ ظالم اور شدت سے ان پر چڑھ دوڑیں تو **لَيَنْصُرَنَّهُ اللّٰهُ** (22:60) ہم آ کے تمہاری ایسی قوم کی مدد کریں گے۔ یہ مدد ہمارے قوانین کی رو سے ہوگی۔ اب وہی جو یہاں اجازت دی کیونکہ ان پہ اتنے ظلم ہوئے ہیں۔ اس لیے اس ظلم کی مدافعت کیلیے انہیں میدانِ جنگ میں نکلنے کی اجازت دی جاتی ہے۔ عزیزانِ من! یہاں بھی وہی بات کہی کہ **مَنْ عَاقَبَ بِمِثْلِ مَا عُوْقِبَ** (22:60) بمثل زیادتیوں اور ظلم کے جوان پر ہوئی ہیں' انہیں روکنے کیلیے' اس ظلم وزیادتی کی مثل انہیں اجازت دی ہے۔ ایک یہی چیز ہے کہ وہ یہ ظلم اور زیادتی نہیں کر سکتے بلکہ **ثُمَّ بُغِيَ عَلَيْهِ** (22:60) وہ ان پر زیادتی کرتے ہوں اس کے بعد بھی' جب وہ مدافعت کیلیے اٹھتے ہیں تو وہ اور بھی زیادتی کرتے ہیں تو کہا کہ پھر **لَيَنْصُرَنَّهُ اللّٰهُ** (22:60) ان لوگوں کی ہم مدد کریں گے کیونکہ **اِنَّ اللّٰهَ لَعَفُوٌّ غَفُوْرٌ** (22:60) اس کا قانون' یقیناً ظلم وتشدد کو مٹا کر' مظلوموں کے لیے سامانِ حفاظت بہم پہنچانے والا ہے۔

آیات اللہ کو محکم کرنے والی قوم کا فریضہ: اپنے اندر قوت پیدا کرنا

عزیزانِ من! خدا کے قوانین میں یہ قوت موجود ہے کہ وہ ظلم وزیادتی کو مٹا بھی دے۔ اسے عفو [1] کہتے ہیں اور دوسری بات یہ کہ وہ پھر غفور بھی ہے یعنی وہ ان کو سامانِ حفاظت بھی عطا کر دے کہ پھر کسی کو اس کی جرأت نہ ہو کہ ان کے خلاف بُری آنکھ اٹھا کر بھی دیکھے۔ یہ قوم' یہ امت' آیات اللہ کو محکم کرنے والی ہے۔ اس امت کیلیے یہ بھی ضروری ہے کہ وہ اپنے اندر اتنی قوت پیدا کر رکھے کہ مخالفین اس کی طرف نگاہ اٹھا کر بھی نہ دیکھ سکیں۔ جیسا کہ قرآن نے کہا ہے کہ یاد رکھو! جس مملکت میں تم آیات اللہ کو محکم کرنا چاہتے ہو اس کی سرحدوں کو اتنا مضبوط ہونا چاہیے کہ مخالف ان کی طرف نگاہ اٹھا کے بھی نہ دیکھ سکیں۔ اب اس کے بعد' قرآن جو اپنے انداز میں' ایک نظریہ' ایک

---

[1] عَفُوٌّ کے اصلی معنی ''ترک'' کے ہیں۔ صاحب تاج العروس نے اپنی لغت میں لکھا ہے کہ عَفَا عَنْهُ اسے سزا دیئے بغیر چھوڑ دیا اور جانے دیا۔ معاف کر دیا۔ صاحب محیط المحیط کے نزدیک عَفُوٌّ اور مَغْفِرَةٌ میں فرق یہ ہے کہ غُفْرَانٌ میں سزا قطعاً نہیں ہوتی اور عَفُوٌّ سزا سے پہلے بھی ہو سکتا ہے اور سزا کے بعد بھی۔ سزا کے بعد عَفُوٌّ سے مراد ہو گا سزا کے اثرات کو مٹا دینا کیونکہ عَفُوٌّ کے معنی مٹا دینا بھی ہوتے ہیں اور مَغْفِرَةٌ کے معنی ہوں گے ''ان اثرات سے شروع سے ہی بچائے رکھنا'' احمد بن مصطفیٰ اللبابیدی (دمشقی) نے اپنی کتاب لطائف اللغۃ میں الفاظ کی لغوی باریکیوں سے بحث کرتے ہوئے لکھا ہے کہ یہ لفظ اضداد میں سے ہے یعنی اس کے معنی ''مٹا دینے'' کے بھی ہیں اور ''زیادہ کرنے'' کے بھی جیسے قُلِ الْعَفْوَ (2:219) ان سے کہہ دو کہ جس قدر تمہاری ضروریات سے زائد ہے سب کا سب۔

کلیہ' ایک اصول' ایک قانون' بیان کرتا ہے' اس کیلیے عام مشاہدات کی مثالیں دیتا ہے جن سے ہر ایک کی سمجھ میں بات آ جائے۔ کہا کہ اگر یہ صورت ہو کہ ظالم ظلم میں بڑھتا ہی چلا جائے' اور کوئی اس کو روکنے والا ہی نہ ہو اور یہ مستقل طور پر اس کی ڈگر چلتی جائے' تو تم سوچو کہ ان کا کیا حشر ہو۔ کہا کہ یہ بات نہیں ہے۔ یہ تو شرارِ بولہبی ہے۔ یہ نہیں ہو سکتا کہ مستقل طور پہ' ہمیشہ ہمیشہ کیلیے' ایک ہی قسم کا یہ ظلم کا نظام قائم ہو' اس میں تبدیلی نہ آ سکے۔ کہا کہ دیکھتے نہیں ہو کہ خود کائنات میں خدا کا یہ قانون جاری وساری ہے کہ صورت حال بدلتی رہتی ہے (3:139)۔ اور یہاں کہا کہ یہ اس لیے ہے تاکہ **ذٰلِکَ بِاَنَّ اللّٰہَ یُوْلِجُ الَّیْلَ فِی النَّھَارِ وَیُوْلِجُ النَّھَارَ فِی الَّیْلِ وَاَنَّ اللّٰہَ سَمِیْعٌ بَصِیْرٌ** (22:61)۔ (یہ نہ ہو کہ مظلوم ہمیشہ ظلم وستم سہتا رہے اور ظالم جور وتعدّی کرتا رہے۔ کیا تم خارجی کائنات میں نہیں دیکھتے کہ) خدا کا قانون کس طرح رات کو دن کی مملکت میں داخل کر دیتا ہے اور دن کو رات کی مملکت میں۔ وہ سب کچھ سننے والا' دیکھنے والا ہے۔

رات کی تاریکی کبھی مستقل طور پر نہیں رہ سکتی

عزیزانِ من! اگر یہ ہو کہ تاریک رات مستقل تاریک' ہمیشہ کیلیے تاریک رات ہی رہے' کبھی دن ہی نہ چڑھے تو سوچو کہ انسانیت کا کیا حشر ہو۔ ہمارا نظام تم دیکھتے ہو کہ ہر شب کے بعد سحر ہوتی ہے۔ یہ اس لیے ہے کہ یہ جو ظلم کی تاریکیاں ہیں' یہ مستقل طور پہ' ابدی طور پہ' نہیں رہ سکتیں۔ یہ تاریکیاں چھٹتی ہیں۔ کیا مثال ہے! ہر شخص اس کو سمجھ سکتا ہے کہ دیکھتے نہیں' ہر رات کے بعد دن ہوتا ہے' ہر دن کے بعد رات ہوتی ہے۔ یہ چیز ابدی طور پر قائم نہیں رہ سکتی کہ دن ہمیشہ دن اور رات ابدی طور پر رات ہی رہے۔ اسی طرح آج جن کے ہاتھوں میں قوت ہے وہ یہ نہ سمجھ لیں کہ یہ قوت ہمیشہ ہمیشہ کیلیے ہمارے ہی ہاتھوں میں رہے گی اور ہم یہی کچھ کرتے رہیں گے' کرتے چلے جائیں گے' کوئی ہمیں روکنے والا ہی نہیں ہوگا۔ نظامِ کائنات کا یہ گردشِ لیل ونہار تو ہمارے ہاں کا محاورہ ہو گیا ہے۔ یہ محاورے کی زبان میں گفتگو کی ہے۔ قرآن نے یہاں کہا ہے کہ اس میں تبدیلی تو فطرت کا قانون ہے۔ اس کے قانون کے مطابق یہ سب کچھ ہوتا ہے اور یہاں کوئی اندھی بہری گونگی قوت کارفرما نہیں ہے۔ جس نظام کے پیچھے وہ خدا ہے وہ **اَنَّ اللّٰہَ سَمِیْعٌ بَصِیْرٌ** (22:61) سننے والا' دیکھنے والا ہے' کسی اندھی قوت والا نہیں ہے' بلکہ اس کے پیچھے قوانینِ فطرت ہیں۔ قانون فطرت تک ماننے والے یہ جو ہمارے ہاں یورپ کے سائنٹسٹ ہیں وہ اتنا تو مانتے ہیں کہ یہ قوانین تو ہیں' جن کی رو سے یہ فطرت کا نظام چلتا ہے لیکن وہ ان قوانین کے پیچھے کارفرما فطرت کو اندھی' بہری قوت ہی کہتے ہیں۔ یہاں کہا ہے کہ کیا ان قوانینِ فطرت کے پیچھے کوئی فطرت کی اندھی بہری قوت ہے جس کا اس کارگہہ کائنات میں کوئی دخل نہیں ہے؟ قرآن پر ایمان رکھنے والوں میں اور ان لوگوں میں یہ فرق ہے کہ قرآن پہ ایمان رکھنے والا یہ مانتا ہے کہ اس کے پیچھے ایک قوت ہے جو علیم بھی ہے' سمیع بھی ہے' بصیر بھی ہے۔ یعنی وہ قوت دیکھنے والی' علم رکھنے والی' سننے والی' خبر رکھنے والی

ہے۔ اُسے ہم خدا کہتے ہیں اور یہاں یہ کہا کہ یہ نظام تو اس خدا کا قائم کردہ ہے جو سننے والا ہے' دیکھنے والا ہے' اندھی اور بہری قوتوں کا مالک نہیں ہے۔ یہاں پھر وہی لفظ **ذٰلک** (22:62) آیا ہے۔ آپ دیکھیے گا کہ یہ ذٰلک کیسے آ رہا ہے۔ یہ اس لیے ہے کہ اس کے معنی یہ ہیں کہ جنگ میں جانے کی اجازت (22:39) دی ہے' ہم نے ان لوگوں کو کہا ہے کہ اس مقام کو چھوڑ کے ہجرت کر جاؤ' کسی دوسرے مقام کی طرف چلے جاؤ۔ یہ ہے وہ چیز جو کہی ہے اور یہ اس لیے ہے کہ جن پہ ظلم و تعدی ہوتی ہے' ان کی بھی مدافعت ہو۔ یہ اسلیے ہے کہ تم گردشِ لیل و نہار کو دیکھتے ہو کہ رات کی تاریکی ہمیشہ کیلیے نہیں رہتی۔ یہ اس لیے ہے کہ **بِاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ وَاَنَّ مَا يُدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ هُوَ الْبَاطِلُ وَاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْعَلِيُّ الْكَبِيْرُ** (22:62) حق' اللہ ہی کی ذات ہے۔ اس کے سوا جنہیں لوگ پکارتے ہیں وہ سب باطل ہیں۔ ٹھوس تعمیری نتائج صرف اس کے قانون کی رو سے مرتب ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ باقی سب تخریبی نتائج پیدا کرتے ہیں۔ اور خدا کا قانون تمام غیر خدائی قوانین پر غالب ہے اور سب سے بلند و برتر۔

الحق صرف خدا کے قوانین ہیں جو قرآن کریم میں ہیں

عزیزانِ من! یہ اس لیے ہے کہ جسے الحق کہا جائے گا' جو The truth (حق و صداقت) کہا جائے گا' وہ تو صرف خدا کے قوانین ہیں' خدا کی آیات ہیں۔ یہاں تو یہ اللہ ہی الحق ہے اور اللہ تو ہمارے سامنے' اس کلام اللہ (قرآنِ کریم) کی شکل میں ہے۔ یہ قرآنِ کریم الحق ہے' اس لیے اُس نے قرآن کو الحق کہا ہے۔ یہ اس لیے ہے کہ جو الحق ہے' The truth (حق و صداقت) ہے وہ ایک ہی ہے' یہ مختلف نظام نہیں ہو سکتے۔ وہ ایک ہی نظام ہے جسے آپ حق پر مبنی نظام کہہ سکتے ہیں۔ اور وہ نظام وہی ہوگا جو آیات اللہ کو محکم کرنے کی رو سے قائم ہوگا۔ وہ الحق ہوگا اور اس کے سوا وہ ہے جسے **مَا يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ** (22:62)۔ کہا ہے یعنی جسے وہ اس کے سوا پکارتے ہیں۔ اب یہ عجیب بات کہی ہے کہ وہ جو خدا کی کتاب ہے اس کے علاوہ اگر تم کسی اور کو بھی دعوت دو گے' پکارو گے' بلاؤ گے' اس کے مطابق نظام قائم کرو گے' تو **هُوَ الْبَاطِلُ** (22:62) وہ باطل ہوگا۔ اب آپ دیکھیے کہ قرآن کس طرح اسے توحید کہتا ہے۔ یہ الحق قرآن ہے۔

مروجہ نظامِ شریعت ہو یا نظامِ اسلام ہو' اسے الحق کی کسوٹی پر پورا اترنا ہوگا

عزیزانِ من! یہی بات شروع سے چلی آ رہی ہے کہ تم جس نظام کی بھی دعوت دو گے' جن قوانین کے مطابق بھی اپنا نظام متشکل کرو گے' اگر وہ وحی خداوندی کے مطابق نہیں ہے تو وہ باطل ہوگا' آپ اپنے آپ کو دھوکا دینے کیلیے بہتیرا کہتے رہیے کہ یہ اسلامی نظام ہے' یہ ہماری شریعت ہے' اس کے مطابق ہم یہ کچھ کرتے ہیں۔ یہ سب دھوکا ہی دھوکا ہوگا۔ اصل بات یہ ہے کہ اس کے کھوٹے یا کھرے ہونے کی کسوٹی ایک ہی ہے: اگر وہ الحق کے مطابق ہے' قرآن کی آیات کے مطابق ہے' تو صرف اسی کو آپ نظامِ شریعت اور نظامِ اسلام کہہ سکتے ہیں باقی سب **مَا يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ** (22:62) کے زمرے میں آتا ہے۔ اگر اس کے سوا تم کسی اور کے مطابق نظام

قائم کرتے ہو' تو وہ باطل ہے۔ کسوٹی یہ ہے۔ اور یہیں سے یہ ساری بات واضح ہوتی ہے' عزیزانِ من! کہ ہمارے ہاں اسلام اسلام تو پکارا جاتا ہے لیکن اس اسلام میں بھی آپ دیکھیے' ان پکارنے والوں کے اندر بھی' اپنے ہاں بھی' وحدت نہیں ہے۔ وہ جو اسلام پکار رہے ہیں' ان کا وہ اسلام مختلف گروہوں میں بٹا ہوا ہے' ہر پکارنے والے کا اسلام مختلف ہے۔ یہ کیا ہے؟ یہ **مَا يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ** (22:62) ہے۔ الحق تو ہوتا ہی ایک ہے جبکہ خدا نے تو یہ کہا ہے کہ قرآن کے منجانب اللہ ہونے کی دلیل یہ ہے کہ اس میں کوئی اختلافی بات نہیں ہے۔ تو جہاں اسلام اتنا مختلف ہوگا' ہر ایک کا الگ الگ ہوگا وہ کیسے الحق پر مبنی ہو سکتا ہے؟

عزیزانِ من! اگر یہ سارے مختلف اسلام' الحق پہ مبنی ہیں' قرآن پہ مبنی ہیں' تو معاذ اللہ قرآن کا وہ دعویٰ باطل ہو گیا کہ اس میں اختلافی بات نہیں ہے۔ کچھ تازہ تازہ شہادت' زیادہ مؤثر ہوتی ہے' میں اسے پھر پیش کرتا ہوں۔ یہ اسلام کا نام لے کر کھڑے ہوئے' اسے چھوڑ دیجئے' مجھے اس سے مقصد نہیں' اس سے کچھ واسطہ نہیں ہے کہ مقابلے کی کوئی پارٹی ہے۔ یہ جو ایک دوسرے کے مقابل میں اسلامی خدمات گنا رہے ہیں اور اسلام کا نام لے کر کھڑے ہو رہے ہیں' انہیں چھوڑ دیجیے۔ صرف ایک مثال لے لیجیے۔ ایک پارٹی کو لے لیجیے۔ ان کے اسلام کے متعلق تو آپ کو معلوم ہی ہے کہ انہیں یہ چیلنج کیا گیا تھا کہ جو اس اسلام کے تین بڑے بڑے دعویدار مودودی صاحب' نورانی صاحب' مفتی محمود صاحب ہیں' ایک امام کے پیچھے' ایک نماز پڑھ کے بتا دیں۔ انہوں نے اس چیلنج کو آج تک قبول نہیں کیا۔ عزیزانِ من! سوچیے کہ یہ کیا چیز ہے؟ کیا یہ الحق ہوگا جن کی کیفیت یہ ہے کہ نماز جیسا فریضہ بھی وہ اکٹھے مل کے ادا نہیں کر سکتے؟ کیا ان کے ہاں کی شریعت' ان کا نظام شریعت' ان کا نظامِ اسلام' ایک ہو سکتا ہے مگر دعویٰ ان میں سے ہر ایک کا یہ ہے کہ حق پر مبنی ہے۔ عزیزانِ من! سچ کہا تھا قرآنِ کریم نے کہ **ذٰلِكَ بِاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ** (22:62) یہ سب اس لیے ہے کہ الحق' اللہ ہی کی ذات ہے' الحق تو صرف یہی ہے۔ **وَاَنَّ مَا يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ هُوَ الْبَاطِلُ** (22:62) اور اس کے علاوہ جسکو بھی آپ پکارو گے' تو وہ سب باطل ہیں۔ کہا تو یہ جائے گا کہ بہر حال' ہم اسلام ہی کا نام لے رہے ہیں' اسی مذہب کے پیرو ہیں۔

عزیزانِ من! اس کو ذرا آگے بڑھائیے۔ قرآن نے کہا ہے کہ ہم نے ہر قوم میں رسول بھیجے ہیں' ہر ملک میں رسول بھیجا ہے' ہر زمانے میں رسول آئے ہیں۔ یہ جو باقی دنیا میں اہلِ مذاہب ہیں' ان میں سے بھی تو ہر ایک کا دعویٰ یہ ہے کہ خدا کا بھیجا ہوا جو دین تھا' جو نظام تھا' ہم اس کے پیرو ہیں۔ ان کی اس بات کو تو آپ کبھی نہیں مانتے۔ کہتے ہیں کہ باطل ہے۔ سوال یہ ہے کہ یہ کیوں باطل ہے؟ کیونکہ ہم سے مختلف ہے' اس لیے یہ باطل ہے اور اپنے اندر اگر ان میں سے ہر ایک کے اسلام کا یہ دعویٰ ایک دوسرے سے مختلف ہے' تو کیا ان میں سے ہر ایک حق پر ہے؟ اگر دیکھا جائے تو قرآن چھوڑنے کے بعد ہم بھی اسی سطح پہ آ گئے ہیں جس سطح پر باقی اہلِ مذاہب ہیں۔ یہی **مَا يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ** (22:62) ہے۔ سوچیے' عزیزانِ من! کہ یہ قیامت ہے کہ ایک اتنا بڑا فریضہ صلوٰۃ ہے جسے یہ کہتے ہیں کہ یہ مومن اور کافر میں حدِ امتیاز ہے۔ یہ خدا کا مقرر کردہ ہے' رسول اللہ ﷺ کا' ایک رسول کا' متشکل کردہ ہے اور اس کے بعد ان کے نام

لینے والوں کی کیفیت یہ ہے کہ یہ جو اس وقت تین بڑے بڑے اسلام کے مدعی ہیں' یہ ایک نماز' ایک جگہ' اکٹھے ہو کے نہیں پڑھ سکتے تو یہ کیسے الحق کے دعویدار ہو سکتے ہیں؟

جس امت یا قوم میں فرقے ہونگے وہاں دین کا نشان تک نہیں ہوگا

عزیزانِ من! اسے سن رکھیے! یہ قرآن کا فیصلہ ہے کہ جس امت یا جس قوم میں فرقے ہونگے وہاں دین نہیں ہوگا۔ دین ایک ضابطہ قوانین کے تابع رہنے کا نام ہے۔ اس کی اطاعت کرنے والی امت' اس ایک ضابطہ قوانین کے تابع رہنے والی ایک قوم ہے تو اس ایک ضابطہ قوانین کے تابع رہنے میں تو اختلاف اور فرقہ بن ہی نہیں سکتا۔ یہاں آپ کے ہاں ایک Constitution (آئین) ہے۔ آج جو اتنی زیادہ پارٹیاں بنی ہوئی ہیں' ان میں سے ذرا کوئی ایک پارٹی یہ دعویٰ کر دے کہ ہمارا Constitution (آئین) الگ ہے' کسی دن' بغاوت کی سزا میں پھانسی پہ چڑھا دیا جاتا ہے۔ امت میں اگر یہ فرقے باقی رہیں تو دین نہیں آ سکتا۔ دین الحق ہے' اس میں کوئی اختلاف نہیں ہے۔ اس کا تو فطری نتیجہ امتِ واحدہ ہے۔ یہ ایک امت ہے۔ ایک نظام کے تابع ہے' ایک ضابطہ قوانین کی اطاعت کرنے والے' ایک مرکز کے تابع ہیں۔ اس کا نام ہے اسلامی نظام یا الحق کے مطابق نظام۔ اسی کے لیے اس نے آیات اللہ کو محکم کرنا کہا ہے۔ اس کے لیے وہ ان کے خلاف جنگ کی اجازت دے رہا ہے اور اس لیے اجازت دے رہا ہے کہ **بِاَنَّ اللّٰهَ هُوَ الْحَقُّ وَاَنَّ مَا يَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ هُوَ الْبَاطِلُ** (22:62) حق اللہ ہی کی ذات ہے۔ اس کے سوا جنہیں لوگ پکارتے ہیں وہ سب باطل ہیں۔ اور الحق کے لیے اس حقیقت کو یاد رکھیے **هُوَ الْعَلِيُّ الْكَبِيْرُ** (22:62) خدا کا قانون' تمام غیر خدائی قوانین پر غالب ہے اور سب سے بلند و برتر اقتدارِ اعلیٰ خدا کے قانون کیلیے ہوگا' کبریائی بھی اس کیلیے ہوگی' عدوات و نفرت اس کیلیے ہوگی۔ اور سن رکھیے! جہاں بھی قرآن نے یہ چیزیں اپنے لیے کہی ہیں' جہاں تک ہمارا تعلق ہے' اس سے مراد اس کی کتاب قرآنِ کریم ہے۔

طبعی زندگی کے لیے بارش کی طرح انسانیت کی زندگی کے لیے تعلیمِ وحی لازم ہے

عزیزانِ من! قرآن پھر دوسری مثال کی طرف آ گیا۔ پہلی مثال گردشِ لیل ونہار کی تھی کہ تم دیکھتے ہو' فطرت میں بھی کس طرح یہ تبدیلیاں ہوتی رہتی ہیں۔ اگلی چیز ان کی طرف سے یہ اعتراض آیا کہ یہ مسلمانوں کی اتنی سی' کمزور سی' نہتی قوم ہے' جب انہوں نے مدینے میں جا کر' پہلی جنگ کے زمانے میں مملکت کی تشکیل بھی کی ہے تو تاریخ کہہ رہی ہے کہ بدر کے میدان میں تین سو کے قریب تو یہ سارے مسلمان تھے۔ تیرہ سال مکے کی زندگی کے' قریباً دو سال یہاں مدینے میں بھی گزرے۔ تو حضور ﷺ کی رسالت کی اتنی مدت میں یہ ساری اتنی سی تعداد تھی اور وہ بھی دوسری جگہ آ کے پناہ لینے والے تھے۔ اسی لیے وہاں یہ مہاجرین اور انصار دو نام گنائے گئے ہیں۔ وہ لوگ جنہوں نے ان کو وہاں رہنے کی' بسنے کی' اس حالت میں مدد کی تھی' یہ قریش کہتے تھے کہ ان کے پروگرام ملاحظہ فرمایئے: کہتے ہیں کہ

قیصر وکسریٰ تک کی سلطنتیں الٹ کے رکھ دیں گے۔ اس پر یہ کہا کہ ٹھیک ہے' انہوں نے دیکھا نہیں ہے کہ یہ زمینِ مردہ' جس میں کوئی ترو تازگی کا نشان تک نہیں ہوتا' بارش برسنے پر اس کی کیا کیفیت ہو جاتی ہے۔ یہ تعمیری نتائج پیدا کرنے والا قانون' کائنات میں کس طرح کارفرما ہے' اس کے لیے **اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَتُصْبِحُ الْاَرْضُ مُخْضَرَّةً** (22:63) کیا تُو نے اس پر غور نہیں کیا کہ اللہ بادلوں سے بارش برساتا ہے تو اس سے زمین سرسبز وشاداب ہو جاتی ہے۔ عزیزانِ من! اس پر زور دے کر کہا کہ کیا انہوں نے دیکھا نہیں ہے کہ بنجر بے برگ وگیاہ زمین جہاں زندگی کا کوئی نام ونشان نہیں' ایک چھینٹا آسمان سے آکے پڑتا ہے تو کس طرح سے پھر حیاتِ تازہ ابھر کر اوپر آجاتی ہے۔ صرف آسمانی چھینٹے کی ضرورت ہوتی ہے۔ طبعی زندگی میں تو وہ بارش کی شکل میں آتا ہے ''انسانوں کی زندگی میں وہ وحی کی شکل میں آتا ہے۔'' تو وحی کی بارش جس قوم کی زمین پر آکے یوں برسے گی' ان سے پوچھو کہ کیا اس سے زندگی لہلہاتی ہوئی ابھر کر سامنے نہیں آجائے گی۔ **اِنَّ اللّٰهَ لَطِيْفٌ خَبِيْرٌ** (22:63) یقیناً خدا بڑا ہی باریک بین' اور ہر شے کے حالات اور اس کی صلاحیتوں سے واقف ہے۔ عزیزانِ من! یہاں لطیف کی کیا بات ہے! بارش برستی ہے تو اس کے بعد پتہ نہیں چلتا کہ یہ لہلہاتی زندگی پھر اٹھتی کیسے ہے۔ کھیتی بڑھتی کیسے ہے؟ یہ کھیتی بڑی غیر محسوس شے ہوتی ہے۔ آپ سارا دن کسی ذرا سی کونپل کے پاس بیٹھے رہیں تاکہ آپ اسے سمجھ لیں کہ یہ کس وقت ذرا بڑھی ہے۔ آپ شام تک بیٹھے رہیے معلوم ہی نہیں ہوتا کہ کس وقت بڑھی ہے اور وہ بڑھ رہی ہوتی ہے' وہ اپنی منزل کی طرف پہنچنے کیلیے اس میں نمود اور بالیدگی پیدا ہوگئی ہوتی ہے۔ اس میں تو ایک دن' پھل بھی آنا ہوتا ہے۔ اور وہ پھل آتا ہے۔

جنگِ بدر میں جوہرِ انسانیت کے پیکروں کا کردار

عزیزانِ من! سوال یہ ہے کہ یہ کچھ کیسے ہوتا ہے؟ خدا بڑے ہی غیر محسوس طریقے سے لطیف بھی ہے اور خبیر بھی۔ وہ جانتا ہے کہ یہ کیسے ہونا چاہیے لیکن جو اس کا انداز ہے وہ بڑا ہی لطیف انداز ہے۔ یہ چیز غیر محسوس طور پہ ہوگی۔ ٹھیک ہے کہ جنگ بدر[1] میں یہ تین سو

---

[1] یہ اُس رمضان کی سترہ تاریخ (2۔ھ) تھی جس میں پہلے پہل روزے فرض ہوئے تھے یعنی سترہ رمضان 2۔ھ مطابق 13 مارچ 624ء کی صبح بدر کے میدان میں دو صفیں (ایک آپؐ کی معیت میں جماعت مومنین اور مدِ مقابل قریشِ مکہ) ایک دوسرے کے سامنے نبرد آزما تھیں۔ اس وقت خدا کی اس وسیع وعریض زمین میں خدا کا نام لینے والوں کی کل کائنات یہی 313 نفوس پر مشتمل تھی۔ شوقِ شہادت کے وفور کا یہ عالم تھا کہ جب ایک کم سن بچے (عمیر بن ابی وقاص) سے کہا تھا کہ وہ واپس چلا جائے تو وہ رو پڑا اور حضورؐ کو مجبوراً اجازت دینی پڑی کہ وہ ساتھ ہو لے۔ اس جوشِ مسرت میں اس کا بڑا بھائی (سعد بن ابی وقاص) اٹھا اور چھوٹے بھائی کے گلے میں خود تلوار حمائل کر دی۔ بے سروسامانی کا یہ عالم تھا کہ ان کے کل دو گھوڑے تھے۔ مدِ مقابل قریش بڑے کروفر اور شان وشوکت سے نکلے تھے۔ ہزاروں سپاہیوں کی جمیعت' سوسواروں کا رسالہ' تمام رؤسائے قریش (باستثنائے ابولہب) شریک فوج' رسد کا یہ انتظام کہ دس دس اونٹ روزانہ ذبح ہوتے تھے۔ یہ دو صفیں ایک دوسرے کے مقابل شمشیر بکف کھڑی تھیں۔ کن افراد پر مشتمل تھیں؟ ایک طرف حضرت ابوبکرؓ تھے تو دوسری طرف مقابلہ میں ان کا بیٹا' ادھر حضرت حذیفہؓ تھے' تو صف غنیم میں ان کا باپ عتبہ' اِدھر حضرت عمرؓ تھے تو ادھر آپ کا ماموں جس کے خون سے آپ کی تلوار رنگین تھی' اِدھر حضرت علیؓ تھے تو مخالف صف میں ان کے بھائی عقیل' ادھر خود محمدؐ تھے تو سامنے کی صف میں آپ کے [باقی اگلے صفحے پر]

کے قریب تھے جو ایک ایک دو دو کر کے جمع ہوئے تھے لیکن تمہیں معلوم نہیں ہے کہ ان کے اندر جوہرِ انسانیت کی بالیدگی کس لطیف طریقے سے نمود تک پہنچی ہے۔ قرآنِ کریم نے کہا کہ **لَهٗ مَا فِی السَّمٰوٰتِ وَمَا فِی الْاَرْضِ وَاِنَّ اللّٰهَ لَهُوَ الْغَنِیُّ الْحَمِیْدُ** (22:64) کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے سب اس کے متعین کردہ پروگرام کی تکمیل کے لیے سرگرمِ عمل ہے۔ اسے اپنے قانون کو نتیجہ خیز بنانے کے لیے کسی سہارے کی ضرورت نہیں۔ (وہ قانون اپنے زورِ دروں سے از خود نتیجہ خیز ہوتا ہے) اور اس کے نتائج خود اس کی حمد وستائش کی زندہ شہادت دیتے ہیں۔ خدا نے کہا ہے کہ یہ دو تین مثالیں تو ہم نے یوں ہی دی ہیں ورنہ یہ سلسلہ کائنات اس کے پروگرام کے مطابق چل رہا ہے۔ باقی رہا یہ کہ صاحب! ان کے پاس ساز وسامان کہاں ہے؟ مجھے معلوم نہیں ہے۔ یہ جو اس کائنات کا پورا چلانے والا خدا ہے وہ تمہارے ساز وسامان سے بے نیاز ہے؛ تم سے کچھ مانگے اور لیے بغیر وہ حسن وخوبی سے تمام کاروبار چلا رہا ہے۔ اس کے قانون کی متبع قوم بھی اسی طرح سے اٹھے گی اور یوں کرے گی۔ آپ دیکھنا چاہتے ہیں کہ ہمارا قانون کیا کرتا ہے؟ تو سنو! **اَلَمْ تَرَ اَنَّ اللّٰهَ سَخَّرَ لَكُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ وَالْفُلْكَ تَجْرِیْ فِی الْبَحْرِ بِاَمْرِهٖ** (22:65)۔ کیا تم نے اس پر غور نہیں کیا کہ جو کچھ زمین میں ہے، اللہ نے اُسے، کس طرح تمہارے فائدے کے لیے قانون کی زنجیروں میں جکڑ رکھا ہے۔ کشتی کو دیکھو کہ وہ کس طرح، اُس کے قانون کے مطابق، سینۂ بحر کو چیرتی ہوئی چلی جاتی ہے۔ اس طرح کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے، اسے ہم نے انسان کے فائدے کے لیے قانون کی زنجیروں میں جکڑ رکھا ہے۔ بات تو ساری یہ ہے کہ اس کے قانون کا علم حاصل کرلیا

[گزشتہ سے پیوستہ] --

حقیقی چچا (حضرت) عباس اور آپؐ کے داماد ابوالعاص، اِدھر ام المومنین حضرت سودہؓ تھیں تو سامنے ان کے عزیز سہیل بن عمر۔ حبش کا رہنے والا بلالؓ اپنوں میں سے تھا، لیکن حقیقی چچا عباس غیروں میں سے، روم کا صہیب یگانہ لیکن حقیقی بیٹا بے گانہ۔ دونوں جماعتیں آمنے سامنے ہیں۔ آج کا معرکہ انسانیت کی تاریخ میں ایک عظیم انقلاب پیدا کرنے والا ہے۔ معاملہ کی نزاکت اور واقعہ عظیمیہ کی اہمیت کے احساس سے نبی اکرمؐ کا یہ عالم تھا کہ فوجیں میدان جنگ میں ہیں اور حضور اُس خدائے ناصر ومعین کی بارگاہِ عالیہ میں جھولی پھیلائے کھڑے ہیں کہ جس کی نصرت وتائید کے بغیر زندگی کے کسی گوشہ میں کامیابی وکامرانی نصیب نہیں ہوسکتی۔ آپؐ نے جھولی پھیلائی ہوئی ہے اور محویت کا یہ عالم ہے کہ ردائے مبارک کندھوں سے گر گر پڑتی ہے اور آپ کو خبر تک نہیں ہوتی۔ اسی خشوع وخضوع اور والہانہ جذب وانہماک سے بحضور رب العزت عرض کرتے ہیں کہ

بارِالٰہا! اگر مٹھی بھر یہ جماعت مٹ گئی تو پھر قیامت تک تیری عبودیت اختیار کرنے والا کوئی نہیں رہے گا۔

اب فوجیں باہم گتھم گتھا ہوگئیں۔ تھوڑے ہی عرصہ میں سردارِ لشکر عتبہ بن ربیعہ، اس کے بیٹے ولید اور بھائی شیبہ کی لاشیں میدان میں تھیں۔ ابوجہل کہ جس کی عداوت وسرکشی کی داستانیں ضرب المثل بن چکی تھیں، انصار کے دو نوجوان بھائیوں (معوذ اور معاذ) کی تلوار سے پیوست زمین ہوگیا۔ سردارانِ لشکر کے قتل سے قریش کے حوصلے پست ہوگئے اور انہوں نے ہتھیار ڈال دیئے۔ مسلمانوں میں سے چودہ (14) مجاہدین نے شہادت پائی۔ کفار کے قریب 70 آدمی اور اسی قدر گرفتار ہوئے۔ اسیرانِ جنگ میں حضرت عباس، عقیل اور حضورؐ کے داماد ابوالعاص بھی تھے۔ حق وباطل کے اس پہلے معرکہ میں یوں حق غالب آیا اور باطل پسپا ہوا۔ (پرویزؒ: معراج انسانیت، ادارہ طلوع اسلام، کراچی، 1949، ص ص۔ 524-516)

جائے تو وہ ساری کی ساری قوت تمہارے ہاتھ میں آ جائے۔ قانون کا علم حاصل کرنے کی ساری بات ہے۔ جب طبعی قوانین کا علم حاصل ہو جائے تو ''وہ قوت کیسے حاصل ہو جاتی ہے'' وہ تو آج ہم دیکھ رہے ہیں۔ وہ ایک قانون تھا جس کے متعلق کچھ علم حاصل کیا ہے۔ اب اس کی توانائیوں کو دیکھیے کہ یہ بے حد و شمار ہیں۔ اس نے کہا ہے کہ اسی طرح انسانی دنیا میں بھی ہوتا ہے' وہاں بھی خدا کے قوانین کارفرما ہیں۔

طبعی قوانین کی طرح انسانی زندگی کی قدر و منزلت کیلیے وحی کی اقدار سے آگاہی حاصل کرنا ہوگی

عزیزانِ من! طبعی قوانین کی طرح یہی قوانین انسانی زندگی کے اندر بھی ہیں جو ہمیں وحی کی رو سے دیئے گئے ہیں۔ راز سارا یہ ہے کہ ان قوانین کے متعلق علم حاصل کیجیے اور اسکے بعد دیکھیے کہ کس طرح قوتیں آ جاتی ہیں۔ صدرِ اول [1] کی تاریخ کے متعلق ساری دنیا حیران ہے کہ انہوں نے یہ کیسے کر لیا تھا۔ واقعی اگر ظاہری اسباب کی رو سے دیکھا جائے تو ناممکنات میں سے نظر آتا ہے۔ وہ بات اتنی ہی تھی کہ یہ جو انسانیت کی زندگی کے متعلق قوانین ہیں جو وحی کی رو سے ملے تھے' انہوں نے اس کا علم حاصل کر لیا تھا اور علم حاصل کرنے کے بعد پھر ان کو عملاً نافذ کرنے لگ گئے تو خدا کے قانون میں تو بڑی قوت ہوتی ہے۔ اور قوت کے متعلق تو اس نے یہ کہا ہے کہ **اَنَّ الْقُوَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا** (2:165) فی الواقعہ کائنات میں اقتدار و اختیار صرف خدا کو حاصل ہے۔ اس کے سوا کسی اور کو نہیں۔

قوت کا سرچشمہ قوانینِ خداوندی میں مضمر ہے

عزیزانِ من! یاد رکھو' یہ چیزیں اپنے ذہن میں نہ لاؤ کہ اُن کے ہاں قوت ہے اور اس کے ہاں قوت ہے اور وہاں قوت ہے۔ قوت کا سرچشمہ کوئی اور نہیں ہے' قوت تو قوانینِ خداوندی کے اندر ہے۔ یاد رکھیے جسے جمیعاً کہتے ہیں کہ ساری قوت خدا کے ہاتھ میں ہے' قوت تو الحق کے اندر ہے۔ یہاں کہا ہے کہ ہم نے انسانوں کے فائدے کیلیے قوت کو' کائنات کی ہر شے کو' قانون کی زنجیروں میں' جکڑ لیا ہے اس کے ثبوت کے لیے کیسی عمدگی سے مثال دیتے ہوئے کہا کہ ذرا دیکھیے تو سہی کہ **وَالْفُلْكَ تَجْرِیْ فِی الْبَحْرِ بِاَمْرِهٖ** (22:65)۔ کشتی کس طرح اُس کے قانون کے مطابق' سینۂ بحر کو چیرتی ہوئی' چلی جاتی ہے۔ یہ خدا کا ایک قانون ہے جس کے مطابق کشتی سمندر میں تیرتی ہے۔ اگر اس قانون کا علم نہ ہو تو ایک سوئی پانی میں ڈال دیجیے' وہ سمندر کی تہ تک پہنچ جاتی ہے' اوپر رہتی ہی نہیں۔ اس کے برعکس لوہے کا اتنا بڑا پہاڑ جیسا جہاز ہے وہ پانی پر تیرتا چلا جاتا ہے۔ یہ کیسے ہوتا ہے؟ یہ فطرت کا ایک قانون ہے کہ ''پانی کے حجم کے برابر

---

[1] 610ء تا 632ء حضور پاک کا دورِ ہمایوں اور 632ء تا 661ء دورِ خلفائے راشدین اس طرح صدرِ اوّل کی تاریخ کا یہ دور 610ء تا 661ء پر محیط ہے۔

اگر باہر خلا پیدا کرلیا جائے تو وہ شے پانی کے اندر ڈوب نہیں سکتی۔ [1] یہ ایک قانون ہے۔ سارے جہاز اس قانون کے تابع بنے ہوئے ہیں۔ اِس آیت میں قرآن کہتا ہے کہ تمہیں اس مثال سے ہی یہ سمجھ لینا چاہیے کہ قانون میں یہ قوت کتنی ہوتی ہے۔ دیکھو تو سہی' یہ کشتیاں سینۂ بحر کو بطخ کی طرح چیرتی ہوئی کیسے چلی جاتی ہیں۔ یہ **بِاَمْرِہٖ** ہے۔ اس میں خدا کا ایک قانون (امر) کارفرما ہے۔ یہ اس کے قانون کے مطابق سینۂ بحر پہ چلتی ہے۔

وحی کے قانون کی افادیت کو سمجھانے کا طریق

عزیزانِ من! قرآن کا یہی انداز ہے۔ یہ جتنی مشاہدے میں آ جانے والی محسوس چیزیں ہیں' وہ ان کی مثال دیتا ہے اور اس سے وہ اپنے ان قوانین کی طرف پہنچاتا ہے جن کا تعلق انسانیت کی اجتماعی زندگی سے ہے۔ یہ غیر محسوس ہوتی ہیں' اس لیے وہ انہیں محسوس مشاہدے میں آنے والی چیزوں کی رو سے سمجھاتا ہے۔ چنانچہ یہاں کہا کہ دیکھا! ہمارے قانون کی کس قدر قوت ہے! اور آگے بڑھیے' اس بارش کو دیکھیے۔ یہ بادل جو تمہارے سر پہ چلے جا رہے ہوتے ہیں' یہ سب پانی ہوتا ہے' اسی کا نام بارش ہے۔ وہاں ایک قانون کارفرما ہے۔ اس قانون سے **وَيُمْسِكُ السَّمَآءَ اَنْ تَقَعَ عَلَى الْاَرْضِ اِلَّا بِاِذْنِهٖ** (22:65) اس نے بارش کو روک رکھا ہوتا ہے تاکہ وہ زمین پر صرف اُس قانون کے مطابق گرے۔ ایسا کبھی نہیں ہوتا کہ سمندر سے وہ بھاپ بن کے اٹھے اور اٹھنے کے بعد فوراً پانی بن کے نیچے گر جائے۔ ایک قانون ہے جو انہیں بھاپ کی شکل میں رکھے ہوئے ہوتا ہے یعنی ایسی شکل میں کہ ہوائیں انہیں اِدھر سے اُدھر لیے لیے پھرتی ہیں اور جب اسی قانون کے مطابق' وہ بخارات یا بادل' پانی میں تبدیل ہوتا ہے' تو کوئی ہوا بھی اس کو اوپر نہیں روک سکتی۔ وہ پانی زمین پر آ کر رہتا ہے۔ کہتا ہے کہ ہمارا قانون دیکھتے ہو کہ کس طرح کارفرما ہے اور یہ سارا نظام کاہے کیلیے ہے؟ اس لیے کہ انسان اس کرہ ارض پر زندہ رہے' بڑھے پھولے' اسے زندگی کے سامانِ زیست میسر آتے رہیں۔ یہ سب اس لیے ہے کہ **اِنَّ اللّٰهَ بِالنَّاسِ لَرَءُوْفٌ رَّحِيْمٌ** (22:65)۔ یہ سارا نظامِ کائنات' قاعدے اور ضابطے کے مطابق اس لیے چلتا رہتا ہے کہ ان موانعات (Barriers) کی مدافعت ہو سکے جو انسانوں کی نشوونما میں حائل ہیں' اور انہیں سامانِ نشوونما نہایت عمدگی سے ملتا رہے۔ قرآن کریم نے راف اور رحمت دونوں چیزیں یہاں کہہ دیں۔

---

[1] اِسے اصول آرشمیدس یا Principle of Buoyancy کہتے ہیں: کسی مائع میں ڈوبے ہوئے جسم کے وزن یا حجم میں کمی اس کے ہٹائے گئے مائع کے وزن یا حجم کے برابر ہوتی ہے۔

The apparent loss in the weight or value of a body immersed in a fluid is equal to the weight or volume of the fluid displaced. Archimedes: c. 287 B.C 212 B.C.

رحمت اور راف کا مفہوم

عزیزانِ من! میں نے عرض کیا تھا کہ رحمت کے معنی ہوتا ہے: سامانِ نشوونما بہم پہنچانا اور راف میں نرمی کا پہلو ہوتا ہے۔ اگرچہ رحمت میں بھی نرمی کا پہلو ہوتا ہے، مگر راف میں لوچ اور لچک ہوتی ہے۔ اصل میں رحمت ہوتی ہے کہ جس قسم کی مناسبت سے کوئی چیز پیدا کرنی ہو، اسے وہ سامانِ نشوونما بتدریج دیا جائے جیسے بچے کی نشوونما رحمِ مادر کے اندر ہوتی ہے۔ اس کا مادہ ہی ''ر ح م'' ہے اور راف کے اندر یہ چیز ہے کہ یہ اسے ملے تو ضرور، لیکن جیل خانوں میں قیدی کی طرح روٹی نہ ملے۔ اس ملنے میں راف اور محبت کا پہلو ہو۔ یہ چیز اس انداز سے ہو جیسا کہ وہ بغیر احسان کے دیتا ہے اور اس کا رزق، جو بکھرا ہوا ہے، وہ تو مزدومعاوضہ کے بغیر پھیلا ہوا ہوتا ہے، جو وہ کسی تشدد کے بغیر دیتا ہے، بشرطیکہ اس کے قوانین کا علم حاصل کر لیا جائے۔ اور کہا کہ روزمرہ کی یہ چیز ہمارے سامنے ہے۔ یہ کہتے ہو کہ یہ ذرۂ ناچیز ہے اور ایک نئے جہاں کی تعمیر کرنا چاہتا ہے اور اس کے ساتھی، ایک مردہ سی قوم اس نظام کو قائم کرنے کے لیے اٹھ کھڑی ہوئی ہے۔ قرآن نے کہا ہے کہ **وَهُوَ الَّذِیْٓ اَحْيَاكُمْ ثُمَّ يُمِيْتُكُمْ ثُمَّ يُحْيِيْكُمْ** (22:66)۔ یہی وہ قانون ہے جس کے مطابق اس نے تمہیں زندگی عطا کی۔ پھر اسی کے مطابق تمہارے طبعی جسم پر موت وارد ہو جاتی ہے اور اسی کے مطابق وہ تمہیں پھر زندگی عطا کر دے گا۔ حیات اور موت تو تمہارے اختیار میں ہی نہیں۔ تم زندہ ہوئے ہو تو اپنی کاریگری سے نہیں ہو گئے۔ کوئی انسان یہ دعویٰ نہیں کر سکتا ہے کہ میں پہلے مردہ تھا اور میں نے پھر یہ کیا اور میں نے یہ کیا اور اِدھر یہ ہوا اور اس کے بعد میں زندہ ہوا۔ جناب! یہ ہے ہی نہیں۔ قرآن کہتا ہے کہ تمہاری سمجھ میں یہ بات آئی کہ زندگی کون عطا کرتا ہے۔ اور اس کے بعد آگے چل کے تم نے یہ بھی دیکھ لیا کہ ٹھیک ہے اس کے قاعدے قانون کے مطابق زندگی بسر کرو تو کچھ عمر بڑھ جاتی ہے لیکن وہ بھی لاانتہا نہیں بڑھتی۔ اس کے بعد (جسمانی) زندگی کا خاتمہ ہو جاتا ہے۔ اسے بھی تم روک نہیں سکے۔ اسی طرح قوموں کی زندگی، قوموں کی موت وحیات، کا فیصلہ بھی خدا ہی کے قانون کے مطابق ہوتا ہے۔

قوموں کی حیات کا راز اقدارِ سماوی سے وابستہ ہے

عزیزانِ من! زندگی خدا کے قانون کی رو سے ملتی ہے۔ جو ان قوانین کو چھوڑ دیتا ہے تو اس کی موت بھی ہوتی ہے۔ اور ایک ایسی قوت بھی ہوتی ہے کہ زمینِ مردہ کی طرح اگر وہ قوم پھر سے اپنا تعلق، وہی سماوی بارش کے ساتھ یعنی اقدارِ سماوی کے ساتھ جوڑ لے، تو اسے حیاتِ تازہ بھی مل سکتی ہے۔ اور تمہاری زندگی میں بھی اسی طرح سے ہوگا۔ اس لیے یاد رکھو کہ مرنے کے بعد بھی پھر وہ یہ ساری چیزیں زندہ کرے گا کہ زندگی اس نے تمہیں دی۔ جب تک تم زندہ ہو، وہ اس طرح سے تمہیں رزق کا سامان دے رہا ہے۔ یوں حیات تمہارے حصے میں آ رہی ہے۔ کم از کم اگر تم اتنے پہ ہی غور کرو تو اس میں تمہاری کاریگری کا کوئی دخل نہیں۔ لہٰذا تمہیں کچھ تو سپاس گزار ہونا چاہیے کیونکہ یہ سب کچھ انسان ہی کے لیے ہو رہا ہے، اور انسان کی حالت یہ ہے کہ اپنی زندگی غیر خداوندی قوانین کے تابع گزارنا چاہتا ہے۔

اس کی کیفیت یہ ہے کہ **اِنَّ الْاِنْسَانَ لَكَفُوْرٌ** (22:66)۔ یہ کس قدر ناسپاس گزار واقع ہوا ہے' یہ ان سب چیزوں کو بھول جاتا ہے' بڑا ہی ناسپاس گزار ہو جاتا ہے' ہماری ان نعمتوں کا انکار کرتا ہے اور ہمارے علی الرغم [1] ایک نظام قائم کرتا ہے اور پھر دعویٰ یہ کرتا ہے کہ نصرت و کامیابی اور خوشگواری و سرفرازی انسانوں کے قائم کردہ نظام کے تحت ہوگی۔ ہم دیکھ لیں گے کہ وہ خدا کے ہاں کیا کرے گا؟ عزیزانِ من! آگے ایک بڑی اہم بات آ رہی ہے کہ خدا کا جو بنیادی قانون' انسان کی رہنمائی کے لیے شروع سے چلا آ رہا ہے' اس کے عملی نفاذ کی صورتیں اور طور طریقے کیا ہیں؟

عزیزانِ من! آج ہم سورۃ الحج کی آیت 66 تک آ گئے' ان طور طریقوں کو ہم اگلی آیت 67 سے لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّآ ط اِنَّكَ اَنْتَ السَّمِيْعُ الْعَلِيْمُ ط

❀❀ ...... ❀❀❀ ...... ❀❀

---

[1] خلاف

گیارھواں باب: سورۃ الحج (آیات 67 تا 71)

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

وَجَآءَ اَهۡلُ الۡمَدِيۡنَةِ يَسۡتَبۡشِرُوۡنَ ﴿۶۷﴾
قَالَ اِنَّ هٰٓؤُلَآءِ ضَيۡفِىۡ فَلَا تَفۡضَحُوۡنِۙ ﴿۶۸﴾ وَاتَّقُوا اللّٰهَ وَلَا تُخۡزُوۡنِ ﴿۶۹﴾
قَالُوۡۤا اَوَلَمۡ نَنۡهَكَ عَنِ الۡعٰلَمِيۡنَ ﴿۷۰﴾
قَالَ هٰٓؤُلَآءِ بَنٰتِىۡۤ اِنۡ كُنۡتُمۡ فٰعِلِيۡنَؕ ﴿۷۱﴾

عزیزانِ من! آج مارچ 1977ء کی 6 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ الحج کی آیت 67 سے ہو رہا ہے: (22:67)۔ سابقہ آیات میں اس کشمکش کا ذکر ہو رہا تھا جو بالخصوص نبی اکرم ﷺ کے زمانے میں حق اور باطل میں ہو رہی تھی۔ حضور ﷺ کے زمانے میں، ایک تو مخالفین میں سب سے بڑی جماعت خود قریش کی تھی، ان کا شمار اہلِ مذاہب میں نہیں تھا، عام بت پرست سی قوم تھی اور اس کے علاوہ دوسری جماعت یہودیوں اور عیسائیوں کی تھی۔ یہ لوگ اہلِ مذاہب تھے۔ ان کے علاوہ تیسرا گروہ ایران کے مجوسیوں [1] کا تھا۔ لیکن وہ عربوں کے ہاں بہت کم تعداد میں کہیں کہیں خال خال ہی تھے۔ یہود [2] اور نصاریٰ زیادہ اہلِ کتاب تھے۔ ٹکراؤ کی جتنی زیادہ

---

[1] المجوسیۃ۔ ایک قدیم مذہب جس کی تجدید جناب زرتشت (628 ق م تا 551 ق م) نے کی تھی۔ اس مذہب کے ماننے والوں کو مَجُوسٌ کہتے ہیں۔ زرتشت کے بعد، جب اس مذہب کی شکل بگڑی تو اس میں خیر و شر کے لیے اہرمن و یزداں کی دو مستقل قوتوں کو تسلیم کر لیا تھا۔ قرآن کریم میں المجوس (22:17) کا ذکر یہودیوں، نصرانیوں اور صابیوں کے ساتھ آیا ہے۔ قرآنِ کریم نے ان کا تفصیلی تعارف نہیں کرایا۔ اس لیے کہ اس زمانے میں اس مذہب کے پیرو موجود تھے جس سے عرب اچھی طرح واقف تھے۔ اب اس سے عام طور پر پارسی مراد لیے جاتے ہیں جو جناب زرتشت کے متبعین ہیں۔ ابن فارس (المتوفی 395ھ) نے مقاییس اللغۃ میں لکھا ہے کہ یہ لفظ فارسی زبان کا ہے۔ (حوالہ پرویزؒ: لغات القرآن (جلد چہارم) ادارہ طلوع اسلام، لاہور، 1961، ص۔ 1525۔)

[2] نصاریٰ حضرت عیسیٰؑ کے متبعین تھے۔ یہ یَھُوۡدِیٌّ کے بالمقابل تھے۔

شکلیں پیدا ہوئیں وہ ان قریش کے ساتھ ہوئیں' یعنی خود اہلِ عرب کے ساتھ ہوئیں اور یہ جنہیں مذہبی بحثیں کہا کرتے ہیں وہ یہود و نصاریٰ لے کے سامنے آتے تھے۔ آج کی اس زیرِ درس آیت میں ایک بڑی بنیادی حقیقت کو سامنے لایا گیا ہے اور ہمارے لیے خاص طور پہ بڑی اہم ہے' دلیل راہ ہے۔ اصل بات یوں ہے کہ انسان کی رہنمائی کے لیے خدا کا ایک بنیادی قانون شروع سے چلا آ رہا ہے۔ لیکن اس کے عملی نفاذ کی شکلیں' مختلف ادوار میں' زمانے کے تقاضوں کے ماتحت' مختلف قوموں میں مختلف ہوتی رہی ہیں۔ اسی بنا پر قرآنِ کریم نے کہا کہ **لِكُلِّ أُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنسَكًا هُمْ نَاسِكُوهُ فَلَا يُنَازِعُنَّكَ فِي الْأَمْرِ وَادْعُ إِلَىٰ رَبِّكَ إِنَّكَ لَعَلَىٰ هُدًى مُّسْتَقِيمٍ** (22:67)۔ مختلف قوموں کے رسوم و رواج اور طرزِ معاشرت الگ الگ ہیں۔ یہ کوئی ایسی بات نہیں جس پر جھگڑا کیا جائے (2:177)۔ اصل چیز وہ بنیادی تعلیم ہے (جواب اپنی حقیقی شکل میں قرآن میں محفوظ کر دی گئی ہے۔) اس کے متعلق کسی تنازع کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔ یعنی یہ نہیں ہو سکتا کہ مخالفین سے مفاہمت کی خاطر اس میں کچھ ردو بدل کر دیا جائے یا اس کی مخالف تعلیم کے متعلق کہہ دیا جائے کہ وہ بھی برحق ہے۔ اب برحق اور صداقت پر مبنی صرف وہ تعلیم ہے جو قرآن کے اندر محفوظ کر دی گئی ہے۔ لہٰذا تم (اے رسول!) اس تعلیمِ ربّانی کی طرف دعوت دیتے جاؤ اس لیے کہ تم بالکل سیدھے اور متوازن راستے پر چلے جا رہے ہو۔

دین کے معاملے میں دو بنیادی چیزوں کی وضاحت

عزیزانِ من! جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے اس آیت میں ایک بڑی بنیادی چیز کہی گئی ہے۔ ایک چیز دین کی اصل بنیاد ہے جو کہ اس کی روح یہ احسن ہے۔ دوسری چیز اس دین کے نظریات کو' یا اس دین کی روح کو' عمل میں لانے کے طور طریقے ہیں کہ کس کس انداز سے دین کے وہ اصول عملی طریق اختیار کریں گے اور انہیں کس طرح نافذ کیا جائے گا۔ مثلاً دین کی اصل عدل ہے۔ عدل کے معنی تو قرآن نے خود متعین کر دیئے کہ **يَهْدُونَ بِالْحَقِّ وَبِهِ يَعْدِلُونَ** (7:181) جو حق کے ساتھ دوسروں کی رہنمائی کرتے ہیں اور اس کے ذریعے اعتدال اور توازن ہمیشہ برقرار رکھتے ہیں۔ اسی کو حق و عدل کے ساتھ فیصلے کرنا کہتے ہیں۔ اس لیے یہ الحق یعنی قرآن کے مطابق فیصلہ دینا عدل ہو گیا۔ یہ ہوئی بنیادی چیز' اصل چیز' روح کی' اس نظام کی' اس دین کی۔ اب یہ ہے کہ اس عدل کے قیام کیلیے کیا طریقے اختیار کیے جائیں' کیا مشینری اختیار کی جائے؟ آپ اس چیز کو اس کی Forms (شکلیں) کہہ لیجیے۔ یعنی ایک تو Essence (روحِ اصل) یا Substance (نفسِ مضمون۔ مواد) ہوتی ہے اور اس کے بعد ایک اس کی فارم' اس کے طور طریقے ہوتے ہیں۔ دین میں بھی طور طریقے ہوتے ہیں اور انہیں بھی اہمیت حاصل ہوتی ہے۔ ان طریقوں کے بغیر تو دین کے نظام کو متشکل ہی نہیں کیا جا سکتا اس لیے اسکی بھی بڑی ضرورت ہوتی ہے۔ عبادت کی بھی بڑی اہمیت ہوتی ہے۔ کورٹ (عدالت) میں جانے اور آنے کے جو آداب مقرر

ہیں ان کی بھی بڑی اہمیت ہوتی ہے ان کی خلاف ورزی کو آپ Contempt of Court (توہینِ عدالت) کہتے ہیں۔ عدل کے اصل وروح سے تو اس توہینِ عدالت کا کچھ تعلق نہیں ہوتا لیکن وہ بھی جرم قرار پا جاتا ہے اہمیت اس کی ہوتی ہے۔ لیکن جب دین مذہب میں بدل جاتا ہے تو اصل و بنیاد وروح تو مفقود ہو جاتی ہے گم ہو جاتی ہے اور یہ طور طریقے ہی باقی رہ جاتے ہیں۔ یہ فرق ہوتا ہے دین میں اور مذہب میں۔ اب یہاں مذہب میں سارا زور انہی جزئیات وفروعات کے عملی نفاذ کے طور طریقوں پر ہوتا ہے اور جیسا کہ میں نے عرض کیا ہے یہ تو درحقیقت اِس نظامِ عدل کو متشکل کرنے کے طور طریقے فارمز شکلیں ہیں۔ مقصودِ بالذات نہیں مقصد کو حاصل کرنے کے ذرائع ہیں۔

باہمی مناظروں کے مابین ''اہم ترین مسائل'' کی حقیقت

عزیزانِ من! دین کی اصل تو مذہب میں آ کر گم ہو جاتی ہے اور یہ جو اس کے طور طریقے جزئیات وفروعات ہیں یہی اصل مذہب یا اصلِ دین قرار پا جاتے ہیں۔ اب ساری بحثیں انہی کے گرد گھومتی رہتی ہیں۔ اسی کا نام آج کی دنیا میں اسلام ہے۔ اب جب اسلام کہا جائے گا تو آپ دیکھیے گا کہ ہمارے ان مذہبی پیشوائیت کے باہمی مناظروں میں کن باتوں پہ مناظرہ ہوتا ہے۔ کیا آپ نے کبھی کسی مناظرے میں ان لوگوں سے کہیں سنا ہے کہ عدل کیسے کیا جائے گا؟ ان کے ہاں آپس میں کسی اختلاف یا جھگڑے کی کوئی اہمیت ہی نہیں ہوتی۔ اس کا تصور ہی ذہن میں نہیں کہ یہ دین تھا مذہب نہیں۔ سو برس تو رہے ایک طرف آپ پانچ سو برس کے مناظروں کی ہسٹری (تاریخ) لے لیجیے اور وہ احباب جو کچھ ہماری عمر کے ہیں انہوں نے تو اپنی پہلی زندگی میں مناظرے دیکھے بھی ہیں۔ کل تک ان کا بڑا زور تھا۔ اب یہ ہے کہ مناظرے کن چیزوں پہ ہوتے تھے؟ امام کے پیچھے سورۃ فاتحہ پڑھنی چاہیے یا نہیں؟ سورۃ فاتحہ کے بعد آمین اونچی آواز سے کہنی چاہیے یا خفی آواز سے کہنی چاہیے؟ یہ ان کے ہاں اہم ترین مسئلہ تھا۔ ان کے ہاں اتنی اتنی بڑی کتابیں لکھی ہوئی ہیں کہ آمین اونچی آواز سے کہنی چاہیے یا خفی آواز سے ہاتھ باندھنے چاہئیں یا چھوڑ دینے چاہئیں اگر باندھنے چاہئیں تو کہاں باندھنے چاہئیں: زیرِ ناف یا سینے کے اوپر تکبیر میں انگلیاں کہاں تک لاؤ: کانوں کی لو تک انگوٹھے جانے چاہئیں یا گردن تک رہنے چاہئیں۔ یہ دین کی جتنی بھی جزئیات تھیں جو دین کی اصل کے نفاذ کے لیے وضع کی گئی تھیں وہی اصل دین بنا لی گئیں۔ اس کے بعد آپ دیکھیے کہ مذہب میں ساری بحثیں انہی چیزوں پر آ کے رہ جاتی ہیں۔ جو اصلِ دین ہے وہ نگاہوں سے اوجھل ہو چکا ہوتا ہے۔

غیر مسلم حکومت کے تابع دین کے احکامات کو قانونی شکل نہیں دے سکتے

عزیزانِ من! اصل دین تو یہ تھا کہ کسی غیر مسلم حکومت کے تابع دین پہ عمل ہو ہی نہیں سکتا۔ غیر مسلم حکومت خواہ انگریز کی ہو یا جیسا

کہ بعد میں انہوں ❶ نے کوشش کی کہ متحدہ قومیت کے تابع' ہندو کی حکومت ہو۔ اس میں کس طرح دین کے مطابق فیصلے ہو سکتے ہیں! مگر یہ مذہبی پیشوا متحدہ قومیت کے تابع ہندو کی حکومت میں نہایت اطمینان سے یہ فتویٰ دیتے تھے کہ یہاں ہمیں نماز روزے حج زکوٰۃ کی اجازت ہے اور اس میں کوئی مداخلت بھی نہیں کر رہا۔ اسے ہمارے ہاں مداخلتِ دین کہتے ہیں' حالانکہ ان کے ہاں دین کا تصور ہی نہیں تھا۔ وہ الدین تو ختم ہو گیا' جب آپ کسی غیر مسلم کی حکومت کے تابع زندگی بسر کر رہے ہوں۔ مگر یہاں بڑے فخر سے اعلان ہوتا تھا کہ انہوں نے Freedom of Religion (مذہب کی آزادی) دے دی ہے۔ انہوں نے Religion (مذہب) ایک لفظ استعمال کیا۔ ان کے ہاں تو یہ لفظ ٹھیک تھا کیونکہ ان کے ہاں Religion (مذہب) تھا' الدین تو تھا ہی نہیں۔ ان کے ہاں مذہب ہی تھا جس کا انہوں نے انگریزی ترجمہ Religion (ریلیجن) کیا اور پھر Religion (ریلیجن) کے لفظ کے استعمال سے دین کا اور مذہب کا فرق ہی مٹ گیا۔ یہ نیشنلسٹ علما کہتے تھے کہ یہ مداخلت فی الدین نہیں کرتے۔ یعنی وہ کہتے ہیں کہ ٹھیک ہے آپ اذان دیدیا کیجئے' نماز پڑھ لیا کیجیے۔ انہوں نے اس کا نام مداخلت فی الدین رکھ دیا یعنی جو اصل نظام' جو اصل دین ہے' وہ ختم ہو گیا' اس کا تصور تک نہ رہا یہ جو الدین ہے' یہ جو وحی خداوندی ہے' یہ جو قرآنِ کریم کے احکام کو قانون کی حیثیت سے نافذ کرنا تھا' اس کا تصور مٹ گیا' حالانکہ یہی الدین تھا۔ اب ظاہر ہے کہ غیر مسلموں کی حکومت میں تو اس کا امکان ہی نہیں ہو سکتا۔ اب اس کے بعد انہوں نے اِسے Split (توڑا) کیا۔ اس کے دو ٹکڑے کیے: ایک طرف کچھ Personal Laws (شخصی قوانین) بنائے اور دوسری طرف کچھ Public Laws (حکومتی قوانین) بنائے۔ اندازہ لگائیے کہ دین کے حصے ہو رہے ہیں۔ ان علما کا سارا زور شخصی قوانین پر یعنی نکاح طلاق عدت مہر وغیرہ کے مسائل پر ہے۔ انہوں نے بھی کہا' حکومت کرنے والوں نے بھی کہا کہ جس طرح مرضی جا کے کرو تسی۔ تین طلاقاں دیو تسی' ست طلاقاں دیو سانوں کی دخل ہے۔ ❷ جس عمر میں چاہے کوئی نکاح کر لے' ہمیں اس سے کوئی غرض نہیں ہے۔ اس کا نام تھا عدم مداخلت فی الدین۔ مذہب کے اندر رہ کر آدمی کتنے بڑے فریب میں رہتا ہے۔ سچ کہا تھا قرآنِ کریم نے کہ **كُلُّ حِزْبٍ بِمَا لَدَيْهِمْ فَرِحُوْنَ** (30:32)۔

---

❶ مولانا حسین احمد مدنی مرحوم (1957 -1879) ارشاد فرماتے تھے کہ ''ایسی جمہوری حکومت' جس میں ہندو' مسلمان' سکھ' عیسائی سب شامل ہوں' حاصل کرنے کے لیے سب کو متفقہ کوشش کرنی چاہیے۔ ایسی مشترکہ آزادی اسلام کے اصولوں کے عین مطابق ہے اور اسلام اس آزادی کی اجازت دیتا ہے۔ (زمزم مورخہ 7 جولائی 1938)'' جب کہ قائداعظم نے جامعہ عثمانیہ حیدر آباد دکن میں 14 اگست 1941ء کو خطاب کرتے ہوئے کہا تھا کہ ''اسلامی حکومت کے تصور کا یہ امتیاز ہمیشہ پیش نظر رہنا چاہیے کہ اس میں اطاعت اور وفا کشی کا وجود خدا کی ذات ہے جس کی تعمیل کا عملی ذریعہ قرآن مجید کے احکام اور اصول ہیں۔ اسلام میں اصلاً نہ بادشاہ کی اطاعت ہے' نہ پارلیمان کی' نہ کسی اور شخص یا ادارہ کی۔ قرآن کے احکام ہی سیاست و معاشرت میں ہماری آزادی اور پابندی کے حدود متعین کرتے ہیں۔ اسلامی حکومت' دوسرے الفاظ میں' قرآنی اصول اور احکام کی حکمرانی کا نام ہے اور حکمرانی کے لیے آپ کو لامحالہ علاقہ اور مملکت کی ضرورت ہوتی ہے۔'' (عبدالقدیر' کرنل (ر): دل دل پاکستان' میسرز اکمل قدیر اینڈ کمپنی' لاہور' 1998' ص۔ 180۔)

❷ تم تین طلاق دو' سات طلاق دو' جس طرح تمہاری مرضی ہے کرو' ہمیں اس سے کیا؟

ہر فرقہ سمجھتا ہے کہ جس طریق پر ہم چل رہے ہیں' وہی حق وصداقت کی راہ ہے۔ اس لیے وہ اپنے آپ میں مگن ہو کر بیٹھ جاتا ہے۔ قرآن نے عجیب بات کہی ہے کہ پھر ان کے نزدیک یہی چیزیں دین بن جاتی ہیں اور ہر گروہ اس بات پر مگن رہتا ہے کہ ہم دین پر صحیح عمل کر رہے ہیں۔ بڑے خوش ہوتے ہیں کہ الحمدللہ نماز میں یہ سارے ارکان پورے ہو گئے۔ وہ ارکان ہیں کہ یہاں تک ہاتھ اٹھاؤ' یہاں باندھو' اتنے زاویے سے جھکو' سجدے میں جاؤ تو یہ آپ کے سات اعضاء زمین کے ساتھ ٹکنے چاہئیں' تین تین مرتبہ اس طرح سے یہ تسبیحیں کرنی چاہئیں۔ پھر اس کے بعد ایک اور جماعت اٹھی۔ اس نے کہا کہ نہیں' صاحب! یہ ذرا حلق سے عین نکالنی چاہیے' پھر وہ صحیح ہوتی ہے۔ یہ تبلیغی جماعت ہوگئی یعنی سارا زور ان چیزوں پر ہے اور جو دین ہے وہ یہ ہے ہی نہیں۔ وہ دین تو کفر اور اسلام کا فیصلہ تھا کہ **مَنۡ لَّمۡ یَحۡکُمۡ بِمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰہُ فَاُولٰٓئِکَ ھُمُ الۡکٰفِرُوۡنَ** (5:44)۔ جو **مَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰہُ** کے مطابق حکومت قائم نہیں کرتے' ان کو کافر کہا جاتا ہے۔ اب یہاں غیر مسلم کی حکومت تو **مَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰہُ** کے خلاف قائم ہو رہی ہے' یہ مسلمان کی بھی نہیں ہے اور اس کے اندر خوش ہو رہے ہیں کہ ہمیں آزادی مل گئی ہے۔ اور کہتے ہیں کہ یہ مداخلت فی الدین نہیں کرتے اور ان کے نزدیک دین نام ہی ان چند چیزوں کا ہے۔ مذہب اس خود فریبی میں مبتلا رکھتا ہے' مذہبی پیشوائیت اس کی علمبردار ہوتی ہے اور پھر یہی کچھ کرنا ان کا پیشہ بن جاتا ہے اور باقیوں کو بھی اپنی رسوم ومناسک کی پابندی پر مطمئن رکھتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ تمہاری نماز میں یہ کچھ ہو تو یہ نماز ٹھیک ہے' اگر یہ کچھ نہیں ہوا تو تمہاری نماز نہیں ہوئی۔ پوچھا کہ او بھئی کیا ہو گیا؟ تیری شلوار گٹیاں توں نیچے سی۔ اُتے ہو جائے تے ہوگئی نماز' تھلے ہو جائے تے نہیں ہوئی۔ نماز پھر پڑھ۔ ❶ یعنی آپ دیکھ رہے ہیں کہ یہ جو وہ کہتے ہیں کہ حج کے بعد عرفات کے میدان میں اگر انہوں نے خطبہ سن لیا تو پھر حاجیوں کے حج قبول ہو گئے۔ وہ حج قبول ہو گیا صاحب! خوش ہو گئے' مطمئن ہو گئے۔ صرف رسوم ومناسک اور جزئیات وفروعات پر زور رہے۔

مذہب کے تابع حج کا مقصد ومنتہا

عزیزانِ من! دین یہ تھا کہ **لِیَشۡھَدُوۡا مَنَافِعَ لَھُمۡ** (22:28)۔ وہ یہاں اس لیے آئیں کہ اپنی آنکھوں سے دیکھ لیں کہ یہ نظام ان (یعنی نوع انسان) کی منفعت کے لیے کیا کچھ کر رہا ہے' اس لیے یہاں کہا کہ اقوامِ عالم کو آواز دو کہ یہاں آ کے دیکھیں کہ یہ نظام ان کی منفعت کیلیے کیا کچھ کر رہا ہے۔ یہ الدین تھا۔ اب یہاں حج اس چیز کا نام رہ گیا ہے کہ عرفات کے میدان میں خطبہ سن کر مطمئن ہو گئے کہ جی! حج قبول ہو گیا۔ الحمدللہ' بڑے خوش خوش وہاں سے واپس آ گئے۔ یہ ہے' عزیزانِ من! دین۔ جب دین مذہب کی شکل اختیار

---

❶ تمہاری شلوار کے پائنچے تمہارے ٹخنوں کے نیچے جا رہے تھے اس لیے تمہاری نماز نہیں ہوئی۔ اگر یہ ٹخنوں کے اوپر ہوتے تو تمہاری نماز ہو جاتی۔ اس لیے اب نماز دوبارہ پڑھو۔

کر لیتا ہے تو زیادہ سے زیادہ اگر کوئی بہت بڑا متقی، پرہیز گار، دھرم پال [1] ہے تو وہ خیرات قسم کے کام، صدقے کے کام کر لیتا ہے یعنی کوئی چار پیسے کسی کو دیدیئے۔ اس کے برعکس اگر دین کا نظام قائم ہو تو کوئی محتاج ہی نہیں ہوتا وہاں خیرات لینے کا اور خیرات دینے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا، وہاں تو کوئی محتاج ہی نہیں ہوتا، بھوکا ہی کوئی نہیں ہوتا۔ یہاں دین کا نظام الٹ کے رکھ دیا۔ دین تو موجود نہیں ہے۔ اب اس کے بعد ایک پورے گروہ کو غریب اور محتاج رکھا جاتا ہے۔

مذہب کے سایہ میں معاشی نظام کا نتیجہ

عزیزانِ من! یہاں مذہب کے زیر سایہ ایک ایسا معاشی نظام قائم کیا جاتا ہے کہ اس میں پوری آبادی کا ایک حصہ بھوکا رہے محتاج رہے اور دوسروں کے پاس اتنی دولت ہو کہ پھر وہ اس میں سے کچھ ان کو خیرات کے طور پہ دیدیں۔ مذہب کے معیار کی رو سے اس نے بڑا ثواب کا کام کر دیا ہے۔ جی، اس میں یہ جتنی چیزیں ہیں، جنہیں میں نے دین کو متشکل کرنے کے طور طریق کہا ہے یہ سب کے سب بعد میں مذہب کی شکل ہی نہیں اختیار کرتے بلکہ اصل میں یہی چیزیں دین بن جاتی ہیں۔ یعنی اس طرح دین غالب ہی نہیں ہوتا بلکہ درمیان سے نکل ہی جاتا ہے۔ اور پھر مذہب کے زیر سایہ معاشی نظام کا نتیجہ یہی ڈھانچہ رہ جاتا ہے۔

فوج سے الگ ہونے والے سپاہی کا عمل

عزیزانِ من! مذہب کے سایہ میں معاشی نظام کے اس ڈھانچے کے بارے میں پھر میں کہا کرتا ہوں کہ اس کی مثال سپاہی کی سی ہوتی ہے کہ جب وہ فوج میں ہے تو اصل مقصد تو اس کا یہ ہے کہ اپنی سرحدوں کی حفاظت کرے، دشمن کی مدافعت کرے، لیکن اس کیلئے یہ بھی ضروری ہوتا ہے کہ صبح جا کے دو گھنٹے تک پریڈ کرے، پریڈ کیلئے سر سے پاؤں تک وردی پوری کی پوری اسی انداز کی ہونی چاہیئے، حتیٰ کہ بوٹ کے تسمے بھی اس انداز سے بند ہونے چاہئیں۔ یہ اس کے لیے طور طریقے مقرر کیے ہوئے ہوتے ہیں اور اب اگر وہ فوج بھی نہیں رہی، فوج سے ہٹا ہوا ایک سپاہی اسی طرح وردی اپنی ساتھ لے آیا ہے۔ اب گاؤں میں آتا تھا اور وہ صبح ٹھیک آٹھ بجے اٹھ کے اسی وقت پر وہ وردی جیسے پہنتا ہے اسی طرح سے بیلٹ باندھتا ہے، بوٹ کے تسمے باندھتا ہے، بندوق تو ہے نہیں، ہاتھ میں ڈنڈا ہی لیتا ہے اور دو گھنٹے لیفٹ رائٹ لیفٹ رائٹ کرتا چلا جاتا ہے، مطمئن ہو جاتا ہے کہ ملک کی سرحدیں محفوظ ہیں۔ جناب! میں نے عرض کیا ہے کہ دین میں یہ طور طریقے بھی اپنی اہمیت رکھتے ہیں، لیکن یہ دین کا جو اصل ہے، یہ اس اصل کو متشکل کرنے کے طور طریقے ہوتے ہیں، جبکہ مذہب میں جو اصل ہوتا ہے، وہ تو غائب ہو جاتا ہے اور یہ چیزیں جو ہیں وہ مقصود اور منتہیٰ بن جاتی ہیں۔ میں کہتا ہوں یہ وہ مقام ہے جہاں پہنچ کے سمجھ میں

---

[1] دھرم ماتما یعنی پابند مذہب، دیندار

آ تا ہے کہ واقعی یہ قرآن کسی اہلِ مذہب کی تصنیف کردہ کتاب نہیں ہے۔ یہ دین دینے والے کی کتاب ہے اور خدا کا یہ دین لامذہبیت کے مقابلے میں اسٹیج پہ کھڑا ہوکر مذہب کی ایک ایک چیز کی مخالفت کرتا چلا جارہا ہے۔

طورطریقوں میں فرق کو بنیاد بنا کر دین کی اصل کو نظرانداز نہ کرو

عزیزانِ من! اب آیئے اس آیت کی طرف جہاں سے ہمارے اس آج کے درس کا آغاز ہوتا ہے۔ اب یہ دیکھیے کہ یہاں کہا گیا ہے کہ **لِكُلِّ اُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنْسَكًا هُمْ نَاسِكُوْهُ** (22:67)۔ ہم نے ہر امت کے لیے ایک طریقہ [1] مقرر کر دیا تھا جس پر انہیں چلنا تھا۔ جسے مناسک کہتے ہیں وہ طورطریقے ہیں جن کی رو سے دین عملی شکل اختیار کرتا ہے۔ The Form (شکلوں) کے متعلق قرآن کہتا ہے کہ یہ ٹھیک ہے کہ مختلف اقوام میں، مختلف مذاہب میں، یہ طورطریقے ہیں، یہ اس میں ثابت بھی کرسکتے ہیں، دعویٰ بھی کرسکتے ہیں کہ ہاں یہ ٹھیک ہے کہ ان کے نبی کے زمانے میں بھی یہ ایسا ہی ہوتا تھا۔ ٹھیک ہے، یہ بھی ہوسکتا ہے۔ لیکن یہ بھول جاتے ہیں کہ یہ کسی مقصد کے حصول کے ذرائع تھے، مقصد نہیں تھے۔ اب ان کی کیفیت یہ ہے کہ وہ صبح سے شام تک ان معاملات پہ تمہارے ساتھ جھگڑتے رہتے ہیں کہ تمہاری نماز اس قسم کی کیوں ہے۔ اگر تم کہتے ہو کہ دین وہی ہے جو نوح علیہ السلام کو ملا، جو موسیٰ علیہ السلام کو ملا، جو عیسیٰ علیہ السلام کو ملا، جو قرآنِ کریم نے حضرتِ نوح علیہ السلام سے حضرت عیسیٰ علیہ السلام تک گنایا ہے اور جو قرآن کے مطابق تمام انبیاء علیہم السلام کو یہی ملا، تو پھر یہ آ کے جھگڑتے بھی ہیں کہ اگر یہ وہی دین ہے جو موسیٰ علیہ السلام کو ملا تھا، یا عیسائی کہتے ہیں کہ جو عیسیٰ علیہ السلام کو ملا تھا، تو یہ بتاؤ کہ تم پھر اپنا رخ اِدھر کیوں کرتے ہو اُدھر کیوں نہیں کرتے۔ قرآنِ کریم نے آپؐ سے فرمایا کہ ان سے کہو کہ یہ مناسک ہیں۔ میں تم سے اصلِ دین کی بات کرتا ہوں۔ یہ تمہارے پاس مناسک ہیں۔ یہ ٹھیک ہے کہ ہر مذہب والے، ہر قوم والوں کے ہاں، اپنے اپنے طورطریقے ہونگے۔ اصل شے جو ہے وہ ''الامر'' ہے۔ اس لیے قرآنِ کریم نے کہا کہ **فَلَا يُنَازِعُنَّكَ فِي الْاَمْرِ** (22:67)۔ یہ کوئی بات نہیں ہے جس پر جھگڑا کیا جائے۔ یہ جو الامر ہے، اس میں تنازع کی بات نہیں ہونی چاہیے۔ جسے الامر کہا جاتا ہے وہ الدین ہے۔ جو چیز وحی کی رو سے، خدا کی طرف سے ملتی ہے، اسے

---

[1] تاج العروس میں لکھا ہے کہ نَسَكَ اِلٰی طَرِيْقَةٍ جَمِيْلَةٍ ۔ اس نے اچھا طریقہ اختیار کرلیا اور پھر اس پر مداومت کی۔ راستہ اختیار کرلینے کی جہت سے کلام عرب میں مَــنْسَكٌ ہر اس مقام کو کہتے ہیں جس کی طرف جانے کے لوگ عادی ہوچکے ہوں خواہ یہ خیر میں ہو یا شر میں۔ ابن قتیبہ نے کہا ہے کہ اس (نَسَكَ) کے معنی ہر اس چیز کے ہیں جس کے ذریعے خدا کا تقرب حاصل کیا جائے۔ نَسَكٌ سے مراد زندگی کا ہر طورطریقہ ہے۔ شاہ عبدالقادر، شاہ رفیع الدین اور مولانا ابوالکلام آزاد نے اپنے تراجم میں مناسک کا ترجمہ عبادت کے طورطریقے یا ارکانِ حج کیا ہے۔ پرویزؒ نے اپنی لغات القرآن جلد چہارم (ص۔1616) میں لکھا ہے کہ ''اس حقیقت کو بھی نظرانداز نہیں کرنا چاہیے کہ جب مناسک مختلف اقوام میں بدلتے رہے ہیں تو امت کے مختلف ادوار میں بھی زمانے کے تقاضوں کے مطابق ان مناسک میں تبدیلی ہوسکتی ہے جنہیں قرآن کریم نے متعین نہ کیا ہو بلکہ وہ کسی زمانے میں باہمی مشاورت سے متعین کیے گئے ہوں۔ یہ تبدیلی قرآنی نظام کی طرف سے ہوگی۔ افراد کو اس کا حق نہیں ہوگا۔''

قرآن الامر بھی کہہ کے پکارتا ہے۔ ویسے تو قرآنِ کریم میں بیشمار آیات ہے جن سے ثابت ہوتا ہے کہ جو الامر ہے وہ وحی کی رو سے دین ہے مثلاً ایک ریفرنس کے طور پر آیت لے لیجیے جس میں کہا ہے کہ جو الامر ہے' وہ وحی کی رو سے وہی ہے جس سے دین ملتا ہے۔ وہ الامر کیا ہے؟ اس کے لیے قرآنِ کریم نے کہا کہ **وَمَآ اُمِرُوْٓا اِلَّا لِيَعْبُدُوا اللّٰهَ مُخْلِصِيْنَ لَهُ الدِّيْنَ** (98:5)۔ الامر یہ ہے جو خدا کی طرف سے ملا ہے کہ خدا کے علاوہ کسی کی محکومیت اختیار نہ کرو۔ یہ ہے جی' الامر! اب رہے یہ طور طریقے تو ان کے لیے میں نے عرض کیا ہے کہ ان کی اہمیت تو اتنی ہے کہ قرآنِ کریم' ہمارے نقطۂ نگاہ سے' اتنے اتنے اہم معاملات کی تفاصیل کہیں نہیں دیتا' یہ نہیں بتاتا کہ نماز کتنے وقت کی پڑھو' اور کتنی رکعتیں ہوں' زکوٰۃ کتنی دو' یہاں تک بھی نہیں ہے' لیکن اس کے ساتھ ہی ان کی اہمیت بھی اتنی ہے کہ وضو کے پورے طریقے بتا رہا ہے' وصیت لکھنے کی پوری شرح بتا رہا ہے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی وہ واضح کرتا ہے کہ کہیں اس فریب میں نہ آجانا کہ یہ طور طریقے اصلِ دین ہیں۔ یہ وہی بات ہے جو میں نے کہا تھا کہ وہ مذہب کی اسٹیج پہ کھڑے ہو کر یہ اعلان کرتا ہے' وہ مذہب کو چیلنج دیتا ہے دیکھیے (2:177) ❶ لیکن اپنے ہاں تو سارے ہی جھگڑے اسی قسم کے ہیں کہ منہ اِدھر کرو' اُدھر کرو' رخ اِدھر کرو' اُدھر کرو' نماز میں یوں کرو' بھگتی ❷ اس طرح سے کرو' پوجا ایسے ہو جائے گی' Worship (پرستش) ایسے ہو جائے گی' سروس ایسے ہو گی۔ یہی مذہب کے سارے اختلاف ہیں اور پھر انہی کو انہوں نے کشاد اور تقویٰ کی راہ سمجھ رکھا ہے۔

اصل نیکی تو دین کی نشو ونما ہے

عزیزانِ من! سنیے! قرآن مذہب کی اسٹیج پر سے یہ اعلان کرتا ہے کہ **لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ** (2:177)۔ اصل نیکی کا یہ کام نہیں ہے کہ تمہارا منہ مغرب کی طرف ہوتا ہے یا مشرق کی طرف ہوتا ہے۔ **لَيْسَ الْبِرَّ** ❸ (2:177) یہ نہیں ہے۔ اب اگر دین نہ رہے' اور یہی بات رہ جائے کہ مغرب کی طرف یا مشرق کی طرف منہ کرنا ہے تو وہ قرآن کریم نے مثال کے طور پہ ایک بات کی ہے کہ کہیں یہی فارم نہ رہ جائے: **لَيْسَ الْبِرَّ** وہ کہتا ہے کہ یہ نیکی ہے ہی نہیں' یعنی جسے ہم سمجھ رہے ہیں

---

❶ یہ لوگ دین کے مقصد سے بے گانہ ہو جاتے ہیں اور چند رسوم و مناسک کو اصل دین سمجھ کر' اُن کی پابندی کو' اُس کی غایت سمجھ لیتے ہیں۔ لیکن تم کہیں اس فریب میں نہ آجانا۔ تم اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لو کہ قانونِ خداوندی کی رو سے' وسعت و کشاد کی راہ (جس سے انسان معیارِ خداوندی پر پورا اترتا ہے) یہ نہیں کہ تم اپنا منہ مشرق کی طرف کرتے ہو یا مغرب کی طرف [اگرچہ امت میں وحدت اور یک جہتی پیدا کرنے کے لیے اس قسم کے محسوس شعائر کی پابندی بھی ضروری ہوتی ہے لیکن یہ مقصود بالذات نہیں ہوتے] مقصود اس نظام کا قیام ہے جس کے اصول اساسی ہیں: اللہ پر ایمان' قانونِ مکافات اور حیاتِ اخروی پر ایمان' اُن کائناتی قوتوں پر ایمان جو مشیت کے پروگرام کو بروئے کار لانے میں واسطہ بنتی ہیں' انبیائے کرام پر ایمان جن کی وساطت سے خدا کا پیغام انسان تک آتا ہے اور اُن کی وساطت سے ملی ہوئی کتابوں پر ایمان۔

❷ بھگتی یا بھکتی بمعنی عبادت

❸ قانونِ خداوندی کی رو سے یہ کشاد و وسعت کی راہ نہیں ہے۔

کہ اس سے اسلام کا' دین کا وہ مقصد پورا ہوگیا وہ مقصد تو بہت بڑی چیز ہے۔ وہ کہتا ہے کہ یہ نیکی ہے ہی نہیں: لَيْسَ الْبِرَّ تمام اہلِ مذاہب ان فروعات اور جزئیات کو سب سے بڑی نیکی کی بات کہتے ہیں۔ یعنی یہی جو میں نے عرض کیا ہے کہ تکبیر میں ذرا ہاتھ اونچا کیجیے صاحب! یہ دیکھیے پھر آپ کو کیا کہتے ہیں وہ کہتا ہے: لَيْسَ الْبِرَّ (2:177) یہ قانون خداوندی کی رو سے' وسعت وکشاد کی راہ نہیں ہے۔ کہیں اس فریب میں نہ رہنا کہ یہ جو فارم ہیں' ان کی ادائیگی سے کشاد کی راہ پیدا ہوتی ہے۔ اور یہاں نیکی کا لفظ بھی ''بِر'' آیا ہے۔ کیا بات ہے! کہا کہ زندگی میں کشاد کی راہیں ان چیزوں سے نہیں پیدا ہوتیں کہ تم اپنا منہ مغرب کیطرف کر لیتے ہو یا مشرق کیطرف۔ اس کیلیے تو اس نے کہا کہ فَاَيْنَمَا تُوَلُّوْا فَثَمَّ وَجْهُ اللّٰهِ (2:115)۔ تم جہاں بھی اس کی طرف متوجہ ہوگے' اس کی طرف لے جانے والا راستہ تمہارے سامنے ہوگا۔ عزیزانِ من! تم اصول دیکھنا چاہتے ہو تو جدھر بھی تم اپنا رخ کرو' خدا سامنے ہوتا ہے تو اسی کو یعنی مشرق کی طرف منہ کرنے یا مغرب کی طرف منہ کر لینے کو ہی کہیں نیکی نہ سمجھ لینا' اپنے آپ کو فریب میں مبتلا نہ کر لینا' یہ نیکی نہیں ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ (2:177)۔ تم اس حقیقت کو اچھی طرح سمجھ لو کہ قانونِ خداوندی کی رو سے' وسعت وکشاد کی راہ (جس سے انسان معیارِ خداوندی پر پورا اترتا ہے) یہ نہیں کہ تم اپنا منہ مشرق کی طرف کرتے ہو یا مغرب کی طرف۔ (اگرچہ امت میں وحدت اور یک جہتی پیدا کرنے کے لیے اس قسم کے محسوس شعائر کی پابندی بھی ضروری ہوتی ہے لیکن یہ مقصود بالذات نہیں ہوتے' مقصود اس نظام کا قیام ہے۔) آؤ تمہیں پہلی اور بنیادی چیز بتائیں کہ وہ کیا ہے؟ وہ چیز' اس نظام کا وہ نظریہ ہے جسے کلمہ کہتے ہیں۔ اس کے لیے کہا کہ وَلٰكِنَّ الْبِرَّ (2:177)۔ وہ وسعت وکشاد کی راہ اس نظام کا قیام ہے جس کے اصولِ اساسی یہ ہیں: مَنْ اٰمَنَ بِاللّٰهِ وَالْيَوْمِ الْاٰخِرِ وَالْمَلٰٓئِكَةِ وَالْكِتٰبِ وَالنَّبِيّٖنَ (2:177)۔ اللہ پر ایمان' قانونِ مکافات اور حیاتِ اخروی پر ایمان' اُن کائناتی قوتوں پر ایمان جو مشیت کے پروگرام کو بروئے کار لانے میں واسطہ بنتی ہیں' انبیائے کرام پر ایمان جن کی وساطت سے خدا کا پیغام انسانوں تک آتا رہا ہے' اور اُن کی وساطت سے ملی ہوئی کتابوں پر ایمان۔

دین میں بنیادی چیز کی وضاحت: اَلْبِرُّ کا قرآنی مفہوم

عزیزانِ من! پہلی چیز تو یہ ہے کہ دین کی صداقتوں پر ایمان لاؤ' اِن پر یقین رکھو۔ اس یقین رکھنے کے بعد اب قرآن آیا ہے کہ ''بِر'' کیا ہوتا ہے؟ کہا کہ یہ مشرق اور مغرب کیطرف منہ کر لینا نہیں ہے۔ اِس ایمان (آئیڈیالوجی) کے بعد عملی دنیا میں یہ روش رکھو کہ وَاٰتَى الْمَالَ عَلٰى حُبِّهٖ ذَوِى الْقُرْبٰى وَالْيَتٰمٰى وَالْمَسٰكِيْنَ وَابْنَ السَّبِيْلِ وَالسَّآئِلِيْنَ وَفِى الرِّقَابِ (2:177) مال کی محبت اور کشش کے باوجود' اپنی ضرورت سے زائد جو کچھ بھی ہے' اسے دوسرے حاجت مندوں ......یعنی (1) رشتہ دار' (2) ایسے لوگ جو معاشرے میں لاوارث اور تنہا رہ جائیں' (3) وہ لوگ جن کا چلتا ہوا کاروبار رک جائے یا ان میں کام کاج کی

استطاعت باقی نہ رہے' (4) ایسے مسافر جو کسی طرح زادِراہ سے محروم رہ جائیں' (5) وہ لوگ جن کی کمائی ان کی ضروریات کے لیے کافی نہ ہو...... کی ضروریات پوری کرنے کے لیے دے دینا' اَلْبِرَّ ہے۔ اور اس کے بعد وَاَقَامَ الصَّلٰوةَ وَاٰتَى الزَّكٰوةَ وَالْمُوْفُوْنَ بِعَهْدِهِمْ اِذَا عٰهَدُوْا (2:177) نظامِ صلٰوۃ کو قائم کرنا تاکہ تمام ضرورت مندوں کو سامانِ نشو ونما ملتا رہے' اپنے عہد و پیمان کا احترام کرنا اور قول و اقرار کا پکا ہونا لیکن اگر وَ الصّٰبِرِيْنَ فِي الْبَاْسَآءِ وَالضَّرَّآءِ وَحِيْنَ الْبَاْسِ (2:177) مخالفت قوتیں آمادۂ پیکار ہو جائیں تو پھر مصائب و مشکلات کا نہایت ثابت قدمی اور استقامت سے مقابلہ کرنا اور خوف و ہراس کو پاس نہ پھٹکنے دینا۔ اور اس کشمکش میں اگر میدانِ جنگ تک جانا پڑے تو وہاں قطعاً نہ گھبرانا' مصائب اور مشکلات کا سامنا کرنا' مردانہ وار ان کو جھیلنا اور جان تک دیدینا۔ اُولٰٓئِكَ الَّذِيْنَ صَدَقُوْا (2:177)۔ یہ لوگ ہیں کہ جو دین کی صداقت کا ثبوت بہم پہنچاتے ہیں۔ اُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُتَّقُوْنَ (2:177)۔ اور انہی کو یہ کہنے کا حق ہے کہ وہ قانونِ خداوندی کی نگہداشت کرتے ہوئے خطرات کی گھاٹیوں سے بچتے ہیں۔

عزیزانِ من! پوچھتے ہو کہ متقی کسے کہتے ہیں؟ متقی انہیں کہتے ہیں۔ لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ (2:177)۔ اس دھوکے میں نہ رہو کہ مغرب کیطرف منہ کر لیا' مشرق کیطرف منہ کر لیا۔ اس لیے کہا کہ فَلَا يُنَازِعُنَّكَ فِي الْاَمْرِ (22:67)۔ ان سے کہو کہ بحثیں اور مناظرے ان چیزوں پہ نہ کرو کہ ہاتھ کہاں باندھے جائیں گے' رکعتیں کتنی ہونگی۔ بات ''الامر'' کی ہے کہ وہ کیا ہے اور یہ جو ابھی میں نے عرض کیا ہے وہ ایک ہی مقام پہ مثال دی ہے' اس میں میں نے امر کا کہا ہے۔

سب سے پہلے طے کرنے والی بات

عزیزانِ من! بنیاد یہ ہے کہ خدا کے سوا کسی کی بھی محکومیت اختیار نہیں کی جائے گی۔ کہا کہ تم اس پہ آؤ' اس پہ بات کرو۔ باقی کی یہ باتیں باہمی مشورے سے طے کرلیں گے کہ اس کی فارم کیا ہونی چاہیے' اس کے طور طریقے کیا ہونے چاہئیں۔ رسول اللہ ﷺ کو بھی یہی کہا گیا تھا کہ شَاوِرْهُمْ فِي الْاَمْرِ (3:159)۔ ان صحابہ رضی اللہ عنہم سے فی الامر مشاورت کرو۔ یہی جو الدین ہے' اس کی فروعات وجزئیات اور طور طریقوں کے لیے مشاورت کرو۔ یہی کہا کہ بعد میں یہ باہمی مشاورت سے طے کرلیں گے۔ آؤ' تم بھی اسی کے اندر' اسی گروہ کے اندر آجاؤ' پہلے ان چیزوں پہ ایمان لے آؤ۔ آؤ پھر الامر کے اوپر بیٹھتے ہیں' پہلے متفق ہو جاؤ کہ خدا کے سوا کسی کی محکومیت نہیں ہو سکتی' پھر بیٹھ کے طے کرلیں گے صاحب! کہ اس کے مناسک کیا ہونگے۔ سوچیے' عزیزانِ من! مذہب کے کسی گوشے سے بھی یہ آواز آسکتی ہے کہ نیکی یہ نہیں ہے کہ تمہارا منہ مشرق کو ہے یا مغرب کو ہے' ہاتھ یہاں باندھتے ہو یا وہاں باندھتے ہو' پرستش یوں کرتے ہو یا اس طرح سے کرتے ہو' یہ نہیں ہے۔ بات ''الامر'' کی کرو۔ محکومیت خدا کے سوا کسی کی نہیں ہے۔ کہا کہ اصل چیز یہ ہے۔ انہیں کہو کہ یہ وہ دین تھا جو تمہارے ہاں کے انبیاء نے تمہیں دیا تھا۔ اس میں جھگڑے کی کوئی بات نہیں ہے۔ وہ جو کہا ہے اس پر آجاؤ۔

پرستش اور عبادت میں فرق

عزیزانِ من! قرآنِ کریم کا فرمان ہے کہ **قُلْ یٰٓاَهْلَ الْكِتٰبِ** (3:63)۔تم ان اہلِ کتاب (یہود ونصاریٰ دونوں) سے کہو کہ **تَعَالَوْا اِلٰى كَلِمَةٍ سَوَآءٍۢ بَیْنَنَا وَبَیْنَكُمْ** (3:63)۔اِن جزئی باتوں کو چھوڑ واور اصل الاصول کی طرف آ ؤ ٗجس کے ماننے کے تم بھی دعویدار رہواور جس کی طرف ہم بھی دعوت دیتے ہیں۔پکار کر یہ بات کہی کہ اس بات کی طرف کہ آ ؤ جسے تم بھی اپنے ہاں مانتے ہواور ہم بھی اسی کی دعوت دیتے ہیں۔فرق صرف یہ ہے کہ تم اس کو عبادت کہہ کر ''پرستش'' کہتے ہواور ہم دین کے نقطۂ نگاہ سے اس کو محکومیت خداوندی کہتے ہیں۔آ ؤ اس بات پہ متفق ہو جائیں کہ عبادتِ خداوندی کے معنی خدا کی محکومیت اختیار کرنا ہیں' باقی باتیں طے ہوتی رہیں گی۔کیا نظام دیا ہے! کیا بات ہے!! اب اس کے بعد رسول اللہ ﷺ نے کہا کہ ان سے'ان معاملوں میں' مت جھگڑو' مت مناظرے کرو۔آپ کے ہاں کے مذہبی فرقوں کا سارا وقت اسی میں ضائع ہو جاتا ہے اور پھر قوم کا سارا روپیہ اس میں تباہ کر کے یہ اپنے اپنے فرقے کو مطمئن رکھتے ہیں۔یہ کیسے کیا جاتا ہے' اس کی بھی ایک مثال سن لیجیے۔بقول اِن کے' یہ فاتحِ کلکتہ کی کہانی ہے۔

فاتحِ کلکتہ کی کہانی حقائق کی زبانی

عزیزانِ من! میں نے آپ کو پہلے بھی بتایا تھا کہ یہ میں نے خود دیکھا ہے۔دلی میں جلوس نکل رہا تھا۔بہت بڑے مولوی صاحب تھے۔''فاتحِ کلکتہ زندہ باد' پائندہ باد'' کے نعرے بلند ہو رہے تھے۔سوچا کہ یا اللہ! انگریزوں کا زمانہ ہے۔کلکتہ تو جاپانی بھی فتح نہیں کر سکے تھے یہ فاتحِ کلکتہ کون ہے؟ دیکھا تو معلوم ہوا کہ مولوی صاحب ایک ہار پہنے ہوئے ہیں۔وہ فاتحِ کلکتہ چلا آ رہا ہے۔پوچھا کہ جی کیا ہوا؟ کہنے لگے کہ یہ فلاں مولانا صاحب ہیں۔میں نام نہیں لینا چاہتا' وہ شخصیت پہ بات آ جائے گی۔میں نے کہا کہ میں انہیں جانتا ہوں' یہ بہت بڑے اہلحدیث تھے۔کلکتے میں حنفیوں کے ساتھ ان کا مناظرہ ہوا تھا۔اس مناظرے میں اُنہوں نے ایک دوسرے کو گالیاں دی تھیں۔امام ابوحنیفہ رحمۃ اللہ علیہ[1] (150-80ھ بمطابق 767-699ء) کی شان میں کچھ گستاخیاں کیں' گالیاں دیں تو اُنہوں نے مقدمہ

---

[1] ان کا شمار ائمہ فقہا میں سرفہرست ہے۔بات یہ ہے کہ ''چونکہ کوئی مرکزی اتھارٹی نہیں تھی اس لیے مختلف فقہا نے اپنے اپنے طور پر قوانین مرتب کر لیے اور ان کے معتقدین نے ان قوانین کا اتباع اپنے اوپر لازم قرار دے لیا۔اس طرح یہ امت فرقوں میں بٹ گئی۔ان ائمہ فقہا کی تعداد تو بہت زیادہ تھی لیکن ان میں سے چار نے بڑی شہرت حاصل کی یعنی:

ا۔ امام اعظمؒ (کوفی) پیدائش 80ھ۔ وفات 150ھ

۲۔ امام مالکؒ (یمنی' مدنی) پیدائش 93ھ۔ وفات 179ھ

۳۔ امام شافعیؒ (عسقلانی' مکی) پیدائش 150ھ۔ وفات 204ھ

۴۔ امام احمد بن حنبلؒ (بغدادی) پیدائش 164ھ۔ وفات 341ھ

اہلِ تشیع کی فقہ جعفری کے فقہا ان سے الگ ہیں۔(حوالہ: پمفلٹ۔فقہی قوانین کی دینی حیثیت' ادارہ طلوع اسلام' لاہور (سالِ اشاعت درج نہیں ہے)' ص۔۹)

کر دیا۔ حضرتِ صاحب کو سال بھر کی جیل ہوگئی۔ کہنے لگے کہ اب یہ وہاں جیل سے رہائی کے بعد آئے ہیں۔ ان کا جلوس نکل رہا ہے: فاتح کلکتہ زندہ باد۔ عزیزانِ من! اب تو دین اسی کا نام رہ گیا ہے۔ یہ تو خیر' جیل ہوئی تھی۔ اس سے پہلے آپ نے شاید طلوعِ اسلام میں اُس جھگڑے کے متعلق لکھا ہوا پڑھا ہوگا جوان کے ہاں چلا آتا ہے کہ اگر وہ امام اہلحدیث وہابی قسم کا ہو تو کیا اس کے پیچھے نماز ہو سکتی ہے یا نہیں ہو سکتی؟ اس میں لکھا ہے کہ یہ جھگڑا آج کی بات نہیں' یہ تو مدت ہوئی طے ہو گیا تھا۔

سنی اور وہابیوں کا عدالت میں مقدمہ' ہائی کورٹ میں اپیل' اور انگریزوں کی کونسل کا فیصلہ

عزیزانِ من! یہ اٹھارہ سو چون یا 1857ء یا سو سال پہلے کی بات ہے کہ یہ جھگڑا ہوا تھا اور عدالت میں پہنچا تھا۔ Lower Court (نچلے درجے کی عدالت) نے اہلحدیث کے خلاف فیصلہ دیا' پھر ہائی کورٹ میں گئے۔ پتہ نہیں کہ انہوں نے اس کے خلاف دیا۔ بڑھتے بڑھتے انگریزوں کی ایک کونسل میں یہ معاملہ پہنچا' تو انہوں نے اب اپنے اخبار میں فخر سے لکھا تھا کہ ان اہلِ احناف [1] کو بتا دو کہ ان کے خلاف تو کونسل نے فیصلہ دے رکھا ہے' اب یہ ہم سے کس بات پہ جھگڑتے ہیں۔ عزیزانِ من! ہماری کیا بات ہے یہ کونسل ان کے دین کا فیصلہ دے رہی ہے۔ قرآن نے بہ نصِ صریح یہ کہا کہ ان سے کہو کہ دعویٰ اپنے ایمان کا کرتے ہو اور اپنے فیصلے کرانے کیلیے غیر خدائی قوتوں کی طرف' ان کی عدالتوں میں' جاتے ہو' کیا اسے ایمان کہتے ہیں؟ مگر وہ ہیں کہ انگریزوں کی کونسل کا سو سال پہلے کا فیصلہ فخر سے بیان کر رہے ہیں کہ جی' فیصلہ ہو چکا ہے۔ اب تو یہاں کسی مناظرے کا' کسی مباحثے کا' سوال ہی نہیں ہے مگر یہ ہیں کہ کہتے ہیں کہ ہمارے حق میں ڈگری ہوئی ہے۔ ''ہمارے حق میں'' ان کو کیا حق پہنچتا ہے؟ اور یہ اہلِ حدیث ہیں کہ برملا کہتے ہیں کہ اب یہ بات کریں' یہ کونسل کا فیصلہ ہو گیا ہے۔ عزیزانِ من! یہ ہوتا ہے جب دین نگاہوں سے اوجھل ہو جائے۔ اور جب یہی جزئیات اور فروعات عینِ مذہب قرار پا جائیں تو پھر کونسل کا فیصلہ' جس کے متعلق میں نے کہا یَتَحَاكَمُوْٓا اِلَى الطَّاغُوْتِ (4:60)۔ یہ انسانوں کے خود ساختہ قوانین کی رو سے فیصلے کراتے ہیں۔ اسے قرآن نے کفرِ صریح قرار دیا ہے تو ملاحظہ فرمائیں کہ یہ طاغوت کی عدالت عالیہ سے سو سال کے بعد فیصلہ لا رہے ہیں' اور کہہ رہے ہیں کہ اس کا فیصلہ تو ہمارے حق میں ہو چکا ہے۔ اس لیے تم اب معاملے میں بحث ہی کیا کر سکتے ہو۔ اس وقت یہ کچھ ہوتا ہے جب جزئیات وفروعات اصل دین بن جائیں۔ یہی مقصود بالذات (End) ہو جاتی ہیں' ذریعہ (Mean) نہیں رہتیں۔

مذہب میں فروعات کو ہی دین سمجھا جاتا ہے

عزیزانِ من! اسے پھر دہرادوں کہ جب مناسک عینِ مقصود بن جائیں تو فروعات ہی کا نام دین قرار پائے گا۔ اصلِ نظام غائب

---

[1] احناف' حنفی حضرات' سنی مسلمانوں کی وہ جماعت جو امام ابوحنیفہؒ کی پیرو ہے۔

ہو جاتا ہے۔ پھر تو یوں ہوتا ہے جیسے ''کہ دھڑ کا ذکر کیا' یہاں سر ہی غائب ہے گریباں سے۔'' اصلِ دین' جو الدین کا نظام ہے' وہی اوجھل ہو جاتا ہے' اور اس کے بعد تو بس بقول علامہ اقبالؒ (1938 -1877)

رہ گئی رسمِ اذاں' روحِ بلالی نہ رہی ❶

روح کیا' وہ تو نظام ہی ختم ہو جاتا ہے۔ تو قرآن یہ کیسی عجیب چیز کہہ گیا ہے کہ **لِكُلِّ اُمَّةٍ جَعَلْنَا مَنْسَكًا هُمْ نَاسِكُوْهُ** (22:67)۔ مختلف قوموں کے رسوم و رواج اور طرزِ معاشرت الگ الگ ہیں۔ یہ کوئی ایسی بات نہیں جس پر جھگڑا جائے (2:177)۔ اس طرح تم بھی ہر ایک کے ہاں سے الگ الگ طور طریقے دیکھو گے مگر نظام پر عمل کرنے کی انہیں اہمیت نہیں ہے کیونکہ **لَيْسَ الْبِرَّ اَنْ تُوَلُّوْا وُجُوْهَكُمْ قِبَلَ الْمَشْرِقِ وَالْمَغْرِبِ** (2:177) یہ باتیں ''اَلْبِرّ'' کی اور ''تقوے'' کی اور نیکی کی نہیں ہیں۔ اس لیے ان سے کہو کہ ان معاملوں میں آ کے خواہ مخواہ کے لیے وقت نہ ضائع کیا کرو۔ **فَلَا يُنَازِعُنَّكَ فِي الْاَمْرِ** (22:67) اصل چیز وہ بنیادی تعلیم ہے (جواب اپنی حقیقی شکل میں قرآن میں محفوظ کر دی گئی ہے۔) اس کے متعلق کسی تنازع کی اجازت نہیں دی جا سکتی۔ اس طرح بات ''الامر'' کی ہے اور اس میں تو جھگڑے کا کچھ سوال نہیں ہے۔ ہر نبی آ کے یہی کہا کرتا تھا۔ فرق تو یہ ہے کہ تم اب اس عبودیتِ خداوندی کو پرستش اور بھگتی اور عبادت کہتے ہو لیکن جو الدین ہے وہ اس کو محکومیتِ خداوندی کہتا ہے اور تم خدا کو 'معبود' کہتے ہو جبکہ ہمارے ہاں قرآن کی روسے' دین کی روسے' جو معبود ہے وہ اقتدار اعلیٰ رکھنے والے کو کہتے ہیں بس اتنی سی بات ہے۔ آؤ' باقی تفصیلات طے کر لیں گے۔

آپ دیکھتے ہیں کہ کس طرح اس دین کی دعوت دی گئی تھی۔ کہا کہ یہ سارا کچھ جو' ان مناسک میں ہے' اس قسم کی بحثوں اور مناظروں میں ہے' ان میں اپنا وقت نہ ضائع کرو **وَادْعُ اِلٰى رَبِّكَ** (22:67) لہٰذا تم (اے رسول!) اس تعلیم ربانی کی طرف دعوت دیتے جاؤ۔ تم اپنے رب کی طرف دعوت دیئے جاؤ' محکومیت اسی کی ہے۔ **اِنَّكَ لَعَلٰى هُدًى مُّسْتَقِيْمٍ** (22:67) تفصیلات میں مت الجھو' دین کی طرف دعوت دو اور یہی صراطِ مستقیم ہے اور یقیناً تو اے رسول ﷺ! اس صراطِ مستقیم پر ہے۔ **وَاِنْ جٰدَلُوْكَ فَقُلِ اللّٰهُ اَعْلَمُ بِمَا تَعْمَلُوْنَ** (22:68) اور اگر یہ لوگ اس بات میں تم سے جھگڑے پیدا کریں' تو ان سے کہہ دو کہ (مجھے تم سے جھگڑنے کی ضرورت نہیں) خدا کا قانونِ مکافات خوب جانتا ہے کہ تم کیا کرتے ہو۔ وہ اس کے مطابق نتائج مرتب کر دے گا۔ عزیزانِ من! آپ کو معلوم ہے کہ پہلے (22:67) میں تنازع (**يُنَازِعُنَّكَ**) کہا تھا اور اب اِس آیت میں **جٰدَلُوْكَ** کہا ہے۔ تنازع تو مناظروں تک کی

---

❶ رہ گئی رسمِ اذاں' روحِ بلالی نہ رہی — فلسفہ رہ گیا' تلقینِ غزالی نہ رہی
مسجدیں مرثیہ خواں ہیں کہ نمازی نہ رہے — یعنی وہ صاحبِ اوصافِ حجازی نہ رہے
(اقبال: جوابِ شکوہ در بانگِ درا' نیشنل بک فاؤنڈیشن' اسلام آباد' 1996' ص۔ 213)

بات تھی۔ اب جدال تک کی بات آ رہی ہے۔ وہ اگر کچھ یہاں تک بھی اتر آئیں تو پھر بھی اپنا وقت بحث میں ضائع نہ کرو۔ کہو کہ بھئی! میں تو تمہیں علیٰ وجہ البصیرت دعوت دیئے جاتا ہوں۔ میں تم سے جھگڑتا نہیں' میرے پاس وقت نہیں ہے۔ خدا بہتر جانتا ہے اور اگلی بات یہ ہے کہ **اَللّٰہُ یَحۡکُمُ بَیۡنَکُمۡ یَوۡمَ الۡقِیٰمَۃِ فِیۡمَا کُنۡتُمۡ فِیۡہِ تَخۡتَلِفُوۡنَ** (22:69)۔ جب ظہورِ نتائج کا وقت آئے گا تو خدا کا یہی قانونِ مکافات ان تمام امور میں فیصلہ کر دے گا جن میں تم اس وقت اختلاف کر رہے ہو۔ کہا کہ یہ جو تمہارے باہمی اختلافات ہیں' ان کا فیصلہ کس طرح سے ہو؟ آج تو ان اختلافات کا فیصلہ ہو ہی نہیں سکا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ جب تک مذہب ہے' یہ آپس میں ٹکراتے رہینگے' تو ان کا آج تک فیصلہ نہ کبھی ہوا ہے اور نہ ہو سکتا ہے۔ کہا کہ کیا آپ کے مناظروں نے کبھی یہ فیصلہ کیا ہے کہ حق کدھر ہے اور کیسے ہے۔ آپ مختلف مذاہب میں دیکھ لیجئے' بین المذاہب جو مناظرے ہوتے ہیں' انہیں دیکھ لیجئے' کبھی فیصلہ نہیں ہوا کہ حق کیا ہے۔

تمام اہلِ مذاہب کے اجتماع کا نتیجہ: وہی ڈھاک کے تین پات

عزیزانِ من! یہ بڑے فخر سے کہتے ہیں کہ صاحب! All World Riligion Conference (عالمی مذہبی کانفرنس) ہوئی تھی' تمام دنیا کے اہلِ مذاہب اکٹھے ہوئے اور انہوں نے آ کے اپنے اپنے مقالے پڑھے۔ اس کے بعد پھر کیا ہوا؟ یعنی کیا یہ فیصلہ ہو گیا کہ حق کس طرف ہے؟ اور کیا ہر ایک نے اپنا اپنا مذہب چھوڑ کر اسے قبول کر لیا؟ یہ سارا کچھ ہوا لیکن وہ سب اپنا اپنا مذہب لے کر واپس چلے گئے۔ اس کے علاوہ یہ کہ ایک ہی مذہب کے اندر جو آپ کے ہاں فرقے ہیں تو کیا روز آپس میں ان کے مناظرے اور مباحثے نہیں ہوتے اور کیا کبھی آپ نے دیکھا کہ اس کے بعد کوئی فرقہ مٹ گیا ہو کہ ہاں صاحب! ٹھیک بات ہے' ہم غلطی پر تھے' حق پر یہی لوگ ہیں اور انہوں نے کہہ دیا ہو کہ ہم آج سے اپنا فرقہ ختم کرتے ہیں اور یہ جو فرقہ کل کا ہے اسی کو اختیار کرتے ہیں۔ فرقے تو اسی طرح سے چلے آ رہے ہیں:

نہ دکھ جائے نہ درماں راس آئے
مگر خبطِ دعا ہے اور میں ہوں

فرقے بازی کا یہ سب کچھ چلا آ رہا ہے۔ اور آپ سوچیے کہ یہ جو آپس کے مناظرے اور مباحثے ہیں' یہ کیا ہے؟ یہی کہ یہ سب پیشہ ورانہ جنگ ہے جو ختم ہونے کو نہیں آتی۔ اور یہ جو اوپر کے بڑے ہوتے ہیں وہ اپنی اپنی چودھراٹ قائم کرنے کیلیے نیچے کے ان بیچارے عوام کو جہالت میں رکھتے ہیں' خود فریبی میں مبتلا رکھتے ہیں' ان چیزوں کا نام بتا دیتے ہیں کہ انہیں کرنے سے بڑا ثواب ملتا ہے۔ ان لوگوں کے ان غریبوں کے پلے سے ان مناظروں پر ہزاروں روپے خرچ ہوتے تھے۔ وہ مناظرہ ہوتا تھا۔ یہ تو طریق ہی بنیادی طور پر غلط ہے۔

فیصلہ قیامت پر اٹھا رکھنے کا فائدہ: کچھ بھی نہیں

عزیزانِ من! اب آگے ایک اور بات آتی ہے۔ وہ بڑی ہی اہم بات ہے۔ کہا کہ اگر یہ لوگ اس بات میں تم سے جھگڑا پیدا کریں تو ان سے کہہ دو کہ مجھے تم سے جھگڑنے کی ضرورت نہیں۔ **اَللّٰہُ یَحۡکُمُ بَیۡنَکُمۡ یَوۡمَ الۡقِیٰمَۃِ فِیۡمَا کُنۡتُمۡ فِیۡہِ تَخۡتَلِفُوۡنَ** (22:69) جب ظہورِ نتائج کا وقت آئے گا تو خدا کا قانونِ مکافات ان تمام امور کے فیصلے کر دے گا جن میں تم اس وقت اختلاف کر رہے ہو۔ عزیزانِ من! انہوں نے اس کا جو عام ترجمہ کیا ہے وہ یہ ہے کہ جن معاملات میں تم اختلاف کرتے ہو ان کا فیصلہ خدا قیامت کے دن کر دے گا۔ ان ترجمہ کرنے والوں سے یہ پوچھیے کہ اگر یہی بات ہے تو پھر تم آپس میں روز مناظرے کیوں کرتے ہو؟ سوچنے کی بات یہ ہے کہ اختلاف کے فیصلہ کرنے سے مقصد تو یہ ہے کہ بتایا جائے کہ تم غلطی پر ہو' یہ راستہ صحیح نہیں ہے اور یہ جو دوسرا راستہ ہے یہ صحیح ہے' اور علیٰ وجہ البصیرت دلائل و براہین کی رو سے اس اختلاف کو مٹا دیا جائے اور انہیں قائل کر دیا جائے کہ وہ بات غلط ہے' یہ بات صحیح ہے' تاکہ اس کے بعد آئندہ وہ اس صحیح راستے پہ چلیں۔ اختلافات مٹنے کا یہی فائدہ ہوگا۔ اور اگر یہ اختلاف اس دنیا کی پوری زندگی میں تو اسی طرح سے رہیں اور قیامت میں جا کے مٹ جائیں تو وہاں ان کے مٹنے کا فائدہ کیا ہوا یعنی وہاں تو یہاں کے اختلافات کی بنا پہ فیصلہ ہونا ہے کہ یہ حق پر تھا' جنت میں جائے اور یہ باطل پر تھا اس لیے جہنم میں جائے تو وہاں اختلافات کے مٹ جانے سے فائدہ کیا ہوا؟ یہ بڑی غور طلب چیز ہے۔

انبیاء کرام علیہم السلام کی بعثت اور سماوی راہنمائی کا منتہا

عزیزانِ من! قرآن کا اور دین کا تو منتہا یہ ہے کہ **کَانَ النَّاسُ اُمَّۃً وَّاحِدَۃً** (2:213)۔ پوری عالمگیر انسانیت کو ایک امتِ واحدہ بنا دینا۔ امتِ واحدہ تو اس صورت میں بنتی ہے کہ جب اس میں اختلافات نہ ہوں۔ اس کیلیے کہا کہ **فَبَعَثَ اللّٰہُ النَّبِیّٖنَ مُبَشِّرِیۡنَ وَمُنۡذِرِیۡنَ** (2:213)۔ مبشر اور منذر بنا کے انبیاء کو بھیجا گیا۔ انہی کی بات آگے ہے۔ فرمایا کہ **وَاَنۡزَلَ مَعَہُمُ الۡکِتٰبَ بِالۡحَقِّ** (2:213)۔ اور ان کے ساتھ' ہر نبی کے ساتھ' آسمانی کتاب بھیجی گئی۔ کاہے کیلیے بھیجی گئی؟ کہا کہ **لِیَحۡکُمَ بَیۡنَ النَّاسِ فِیۡمَا اخۡتَلَفُوۡا فِیۡہِ** (2:213)۔ تاکہ جن معاملات میں وہ باہمی اختلاف کرتے تھے' ان میں وہ اس کتاب کی رو سے فیصلہ کر لیں۔ تو یہ تو یہاں کرنے کی بات ہے' یہیں انبیاء آئے' یہیں کتابیں آئیں۔ ان کتابوں کا مقصد بتایا کہ وہ کتب ان اختلافی امور میں فیصلہ کریں گی۔ انبیاء کی بعثت کا مقصد بتایا کہ وہ ان کے مابین اختلافی امور کا فیصلہ کرتے ہیں تو یہاں ہی کرتے ہیں' یہاں کی بات ہے۔ اب یہاں یہ کہا گیا کہ صاحب! یوم القیٰمۃ کو فیصلہ ہوگا تو کیا یہ انبیاء کرام اپنی اپنی کتابیں لے کر وہاں قیامت کے دن لوگوں میں فیصلہ کرنے جا بیٹھیں گے۔ قرآن تو یہاں کی بات کر رہا ہے۔ قرآن کے یہ وہ مقامات ہیں جہاں کھڑے ہو کے سوچنا پڑتا ہے۔

قرآنِ حکیم کو خالی الذہن ہو کر سمجھنا ہوگا

عزیزانِ من! یہ الجھن اور دشواری اس لیے پیش آتی ہے کہ قرآنِ کریم کی جو اصطلاحات ہیں' ان کا ایک خاص مفہوم چلا آ رہا ہے' اور وہی ہمارے ذہنوں پر مسلط وحاوی ہوتا ہے۔ ہم اسی کے مطابق یہاں ترجمہ سے پڑھ لیتے ہیں پھر اسی کے مطابق سوچتے ہیں' اگر سوچنا بھی ہو۔ یعنی وہ مفہوم جو پہلے متعین ہوتا ہے اس کے آگے تو پھر ہم میں سوچ والی بات ہی نہیں ہے۔ جب یہ مفہوم پہلے سے ہی متعین ہو گیا ہو تو پھر سوچ کا ہے کی رہی۔

عزیزانِ من! قرآنِ کریم نے تو ہر ایک کو تدبر کا حکم دیا ہے' تعقل کا حکم دیا ہے' غور و فکر کا' سوچ بچار کا حکم دیا ہے' یہ حکم نہ کسی خاص زمانے تک محدود ہے اور نہ کسی خاص گروہ سے متعلق ہے۔ سوچنے کی بات قیامت کا تصور ہے۔ القیٰمۃ یا قیامت کے متعلق ہمارے ذہنوں میں پہلے سے یہ ہے کہ مرنے کے بعد کی زندگی میں جو کچھ ہونا ہے اسے قیامت کہا جائے گا۔ **لَا رَیْبَ بِالْحَقِّ** بالحق کہتا ہوں کہ اس میں کوئی شک نہیں' کوئی شبہ نہیں۔ مرنے کے بعد کی زندگی پر ہمارا ایمان ہے' حیاتِ آخرت پر ہمارا ایمان ہے۔ یہ ٹھیک ہے کہ یہاں اس کے لیے قیامت کا لفظ آیا ہے لیکن یہ لفظ صرف اسی کیلیے ہی نہیں آیا۔ اسی لیے تو قرآن ہر دَور کے افراد کو دعوتِ فکر دیتا ہے اور اس کے لیے یہ ضروری ہے کہ انسان اس کی طرف خالی الذہن آئے۔

لفظ قیامت کی قرآنی اصطلاح کا مفہوم

قرآنِ کریم میں جو اصطلاحات آئی ہیں وہ مختلف مقامات پر مختلف مفاہیم کیلیے آئی ہیں۔ اُن اصطلاحات میں ایک اصطلاح قیامت یا القیٰمۃ کی بھی ہے۔ قیامت کا یہ لفظ قیام' ہی سے ہے جس کے معنی ''کھڑے ہونا'' ہے۔ یہ عربی زبان بڑی ہی عجیب وغریب زبان ہے۔ یہ جو قیام کے آخر میں گول ۃ لگ گئی ہے اس سے اس کے معنی ہوتے ہیں: ''کسی چیز کا یکبارگی انقلابی طور پر پیدا ہو جانا۔'' یہاں وہ لمبی والی ت نہیں ہے۔ وہ لمبی ت ہوتی ہے' اس کے معنی اور ہوتے ہیں۔ ہم تو اس کو اردو میں لمبی ت سے لکھتے ہیں عربی زبان کی رو سے' یہ قیام کے بعد وہ یوں گول ۃ ہوتی ہے' یہ لفظ اس گول ۃ سے لکھا جاتا ہے۔ اسے یوں نہ کہیے کہ کوئی بات نہیں' عربوں نے اس کو یوں لکھ لیا' ہم نے اسکو یوں لکھ لیا۔ ہماری تو قیامت بھی وہ ہماری اردو والی قیامت ہے۔ ان کے ہاں کا یہ عجیب قاعدہ ہے کہ تین لفظوں کے آگے یہ جو اس قسم کی گول ۃ لگتی ہے اس کے معنی ہوتے ہیں ''کسی چیز کا یکبارگی انقلابی طور پر' پیدا ہو جانا۔'' وہ جو مرنے کے بعد کا قیام ٹھیک ہے' جسے مُردوں کا اٹھنا کہتے ہیں اس میں بھی یہ چیز ہے کہ وہ بتدریج نہیں ہوتا کہ آہستہ آہستہ تھوڑا تھوڑا آرام آیا تو پھر ایک دن سے تین چار چھ مہینے کے بعد مریض اٹھ بیٹھا' کھڑا ہو گیا۔ وہاں وہ بھی یکلخت کیلیے ہے۔ جب میں وہاں پر آؤنگا کہ وہ جو حیاتِ آخرت ہے اس میں یہ یکلخت اٹھنا کیا ہے۔ وہ عجیب بات ہے' جو قرآن کہتا ہے کہ جھٹ سے ان کی آنکھ کھلے گی اور وہ کہیں گے کہ ہمیں کس نے جگا دیا؟ یہ بہت

عجیب بات ہے۔ اس میں بھی یہی چیز یکلخت فوری طور پر ہے' Gradually (بتدریج' آہستہ آہستہ) نہیں ہے۔ اس دنیا میں بھی جو قوموں کی حیاتِ ثانیہ' اس طرح سے یکبارگی اٹھ کھڑے ہونے والی بات ہوگی' جسے ہم انقلاب کہتے ہیں' اس کے لیے بھی قرآنِ کریم میں یہ لفظ ''قیامۃ'' آتا ہے۔ ہمارے ہاں بھی سوچنے والوں نے اس میں ایک فرق کیا تھا اور وہ اچھا فرق تھا جسے قیامتِ صغریٰ اور قیامت کبریٰ کہا جاتا ہے۔ آپ سوچیے کہ اس زندگی کے اندر بھی یہ جو کسی اس قوم کا جسے بظاہر مردہ سمجھ لیا گیا ہو' اس طرح سے ایک ہی ثانیہ میں اسے حیاتِ نو مل جائے تو کہتے ہیں کہ وہ حیاتِ نو کا ملنا ایسا انقلابی طور پر اچانک ہوا کہ کسی کے وہم و گمان میں بھی نہ تھا کہ یہ یوں اٹھ کھڑی ہوگی۔ یہ ہے القیمۃ۔ ❶

رسولِ ﷺ خدا کے دور کی انقلابی جماعت کی کیفیت

عزیزانِ من! یہ جو حضرت محمد رسول اللہ ﷺ والذین معہ رضی اللہ عنہم کی اسلام لانے والی جماعت تھی ان کی حیاتِ ثانیہ خود ان قریش کے نزدیک القیٰمۃ ہے۔ ان کے تصور میں بھی نہیں آ سکتا تھا کہ یہ ذرۂ ناچیز و تعمیرے بیابانے نگر' اس طرح سے اٹھ کھڑے ہونگے' اٹھ ہی کھڑے نہیں ہوں گے بلکہ ایران اور روم جیسی سلطنتوں کی بساط لپیٹ کر رکھ دیں گے......اللہ اکبر......تاریخ کے اندر پانچ سات ہزار سال سے دو ہی تہذیبیں چلی آتی تھیں: ایک رومن ایمپائر کی جس میں شاہِ روم کا لقب قیصر ہوتا تھا اور دوسری Persian Empire (سلطنتِ فارس یعنی سلطنتِ ایران) کی جس میں شاہانِ عجم کے ہر بادشاہ کا لقب کسریٰ ہوتا تھا۔ اور ان کے مقابلے میں یہ عرب تھے' اونٹ چرانے والے' کھجور کی گٹھلیوں پر گزارہ کرنے والے' اِن کی نفرت میں یہ قیصر و کسریٰ والے کہتے تھے کہ یہ شیر شتر خوردن سوسمار ❷ قوم' اونٹنیوں کا

---

❶ قِیَامَۃٌ کا اصلی مفہوم ہے انسان کا یک بارگی اٹھ کھڑا ہونا۔ یہ لفظ قِیَامٌ کے آخر میں ''ۃ'' کے اضافہ سے بنا ہے جس سے مطلب ہے ''یکبارگی ہونا'' اَلْقِیَامَۃُ سے مراد ''اس خاص گھڑی کا واقع ہونا ہے جس میں انسان اس طرح یکبارگی کھڑا ہو جائے۔

قِیَامَۃٌ کا لفظ قرآنِ کریم کی ان بنیادی اصطلاحات میں سے ہے جن کا مفہوم بڑا جامع ہوتا ہے۔ امام راغب اصفہانی کے قول کے مطابق (المفردات فی غریب القرآن' مطبع میمنیہ' مصر۔1324ھ) اس کا مفہوم ہے ''ایسا قیام جو یکبارگی واقع ہو جائے۔'' اس دنیا میں قِیَامَۃٌ کسی قوم کی وہ نشاۃ ثانیہ (حیاتِ جدید) ہے جو انقلاب کی رو سے ظہور میں آئے۔ یعنی وہ قوم یکبارگی اٹھ کھڑی ہو۔ اور مرنے کے بعد دوسری زندگی تو ہے ہی ایک انقلابی ظہور۔ قیامت' آخرت' ساعت' بعث وغیرہ الفاظ کا مفہوم قرآنِ کریم کے مختلف مقامات میں سامنے آ جاتا ہے۔ ان مقامات میں یہ دیکھنا ضروری ہوگا کہ متن کے اعتبار سے متعلقہ لفظ کے معنی اِس دنیا میں انقلاب اور نشاۃ ثانیہ ہیں یا اخروی زندگی کا بعث و قیام۔ اسی طرح قیامت کا لفظ بھی اس دنیا میں قیام اور موت کے بعد کے قیام کے لیے بولا جائے گا۔ (اس لفظ اور اس کے مادہ ''ق و م'' سے بننے والے متعدد الفاظ کے معانی و مفہوم کے لیے دیکھیے: پرویزؒ: لغات القرآن (جلد سوم)' ادارہ طلوع اسلام' لاہور' 1961ء ص ص۔ 1405 -1399)۔

❷ سوسمار (سوس۔مار) (فارسی۔اسم۔مذکر) ایک جانور: گوہ

دودھ پینے والی' گوہ کا گوشت کھانے [1] والی قوم ہے اور ان کی کیفیت یہ ہے کہ ایران کے مقابلے میں اٹھ کر کھڑے ہونے کا دعویٰ کر رہی ہے لیکن یہ جو اٹھ کھڑی ہوئی ہے تو اس نے ان دونوں تہذیبوں کی بساط لپیٹ کر رکھ دی۔ یہ تھا انکی زبان میں لفظ القیٰمۃ کا مفہوم۔ یہ کسی کے وہم وگمان میں بھی نہیں تھا کہ یہ قوم یوں یکبارگی اٹھ کھڑی ہوگی۔ تو یہ قوم یوں اٹھ کھڑی ہوئی۔ یہ قوم اٹھ کھڑی ہوئی جس طرح ہلاکو اور چنگیز [2] کے ہاں کے وہ حملہ آور ہوتے تھے' دبڑ دبڑ کر کے آجاتے تھے۔ یہ قوم اس طرح نہیں اٹھ کھڑی ہوئی۔ یہ قوم خدا کے نظام کے قیام کیلیے' خدا کی کتاب کے مطابق نظامِ عدل قائم کرنے کیلیے' اٹھی یہ جو اس قوم کی حیاتِ ثانیہ ہے جس میں خدا کے احکام کے مطابق فیصلے ہوتے تھے۔ یہ ہے وہ دور جس میں اختلافات مٹ جاتے ہیں۔ قرآن کہتا ہے کہ یہ اختلافات یوں نہیں مٹ سکتے کہ یہ لوگ مذاہب کی حیثیت پہ قائم رہیں اور چاہیں کہ مناظروں سے اختلافات مٹ جائیں۔ یہ اس طرح نہیں مٹ سکتے۔ قرآن کہتا ہے کہ یہ نظام قائم ہو جانے دیجیے' یہاں خدا کے احکام کے مطابق فیصلے ہو جانے دیجیے' اس کے بعد دیکھیے کہ یہ اختلافات کس طرح سے مٹتے ہیں۔ ہم نے پہلے اسی سورۃ الحج کی 69 آیت میں یہ بتایا تھا کہ یہ یک بارگی خدا کے قوانین کے مطابق فیصلے کرنے کے لیے اٹھ کر نظام قائم کرنا نشاۃ ثانیہ (حیاتِ جدید) ہے۔ اس انقلاب کے لیے یکبارگی اٹھ کھڑے ہونے کے لیے میں نے القیٰمۃ کی بات کی ہے۔ یہاں ساعۃ ہے۔ **حَتّٰىٓ اِذَا جَآءَتْهُمُ السَّاعَةُ** (6:31)۔ جب وہ تباہ کن انقلاب' یک لخت اُن کے سامنے آئے گا۔ دیکھیے یہاں اس لفظ ساعۃ کے ساتھ بھی وہی گول ''ۃ'' ہے اور اس کے ساتھ ہی **بَغْتَةً** کہہ کے وضاحت کر دی کہ وہ گھڑی اچانک ان پر آئے گی۔ کہا کہ پھر کیا ہوگا؟

---

[1] ان کے ہاں جہالت کا تو یہ عالم تھا کہ تاریخ نے اس عہد کا نام ہی عہدِ جاہلیت رکھا ہے۔ اس لیے تمدن وتہذیب کی بلند سطح تو ایک طرف روزمرہ کے حوائج زندگی میں وحشت وبربریت چلتی پھرتی نظر آتی تھی۔ مثلاً کھانے پینے میں حلال وحرام تو ایک طرف نفیس وخبیث کی بھی تمیز نہ تھی۔ حشرات الارض ان کی عام غذا تھی۔ چھپکلیوں تک کو کھا جاتے تھے۔ خون کو جما لیتے اور مزہ لے لے کر کھاتے' مردہ جانوروں کو کھا جاتے حتیٰ کہ چمڑہ تک کو بھون کر کھا لیتے۔ درندگی کا یہ عالم کہ زندہ اونٹ کا کوہان اور دنبے کی چکی کاٹ کر کھا جاتے۔ ان کے دنیائے اخلاق اور خانہ جنگی کے کوائف کے لیے دیکھیے: پرویزؒ: معراج انسانیت ادارہ طلوع اسلام' کراچی' 1949' ص ص۔ 143-136۔

[2] ہلاکو خان' چنگیز خان کا پوتا تھا۔ ان کا قدیم وطن ترکستان کا شمالی وسیع وعریض صحرا تا تار (Tartar) تھا۔ اس علاقے میں وحشی قبائل آباد تھے۔ ان کا سب سے بڑا سردار تموجان 549ھ میں پیدا ہوا۔ اس نے شمالی چین کو فتح کیا۔ 616ھ میں اس نے ترکستان پر حملہ کیا اور ایک ہی سال کے اندر بخارا اور سمرقند کو فتح کر لیا۔ چنگیز خان کا انتقال 623ھ میں ہوا۔ اس کا بیٹا تو الی خان ایران کا بادشاہ بنا۔ وہ 654ھ میں فوت ہوا۔ اُس کے بعد اس کا بیٹا منجو خان بادشاہ بنا۔ اس نے اپنے بھائی ہلاکو خان کو مسلم ممالک کی سرکوبی کے لیے بھیجا۔ اس نے سلطنت بنو عباس کی اندرونی سازشوں کے ایما پر 656ھ بمطابق 1258ء بغداد کی اینٹ سے اینٹ بجادی اور خلیفہ معتصم باللہ کو قتل کر کے سلطنتِ عباسیہ کا خاتمہ کر دیا۔

جب تا تار اور مغل قبائل نے اسلام قبول کیا تو انہوں نے سرزمین ہندوستان کی طرف بڑھنا شروع کیا۔ ظہیر الدین بابر کا تعلق ددھیال کی طرف سے نسل تیمور سے اور ننھیال کی طرف سے نسل چنگیز خان سے تھا۔ جب ظہیر الدین بابر نے 1526ء میں دلی کو فتح کیا تو اس نے اس علاقے میں پھیلے ہوئے کرب واضطراب کی تمام سازشوں کو ختم کر کے رکھ دیا۔

اَلْـمُـلْـکُ یَوْمَئِذٍ لِّلّٰہِ (22:56)۔ جب اقتدار اس دنیا میں ایک اللہ کیلیے رہ جائے گا تو اقتدار تو اِس وقت بھی کائنات میں اسی کا ہے تو اس اقتدار میں اور اُس اقتدار میں فرق کیا ہوگا جو یوں آئے گا؟ کہا کہ فرق یہ ہوگا کہ **یَـحْـکُـمُ بَیْـنَـھُـمْ** (22:56)۔ پھر انکے اختلافی معاملات کے فیصلے خدا کے قوانین کی رو سے ہونگے۔ یہ ایک طریقہ ہے جس سے فرقے مٹ سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ فرقے مٹ ہی نہیں سکتے۔

مذہبی فرقوں کے سلسلہ میں مفتی محمود صاحب کا اعلان

عزیزانِ من! آج جو جی میں آئے' کر دیکھیے فرقے نہیں مٹیں گے۔ آج تو الزام ہے کہ یہاں نظامِ شریعت نافذ نہیں ہے۔ ٹھیک ہے کل [1] جو ان کی طرف سے دعویٰ کیا گیا ہے کہ نظامِ شریعت نافذ ہوگا تو مفتی محمود صاحب نے یہ اعلان کیا ہے کہ ہر ایک فرقے کو اپنے اپنے فقہ کے مطابق عمل کرنے کی پوری آزادی ہوگی' کسی قسم کی مداخلت نہ ہوگی تو اختلاف تو ختم نہ ہوا بلکہ اس سے یہ جڑیں اور مضبوط ہوگئیں۔ یہی تو وہ چیز تھی کہ جس میں یہ انگریز کے زمانے میں' ہندو کے دَور میں' لڑتے جھگڑتے چلے آرہے تھے۔ یہ یہی کچھ ہے جسے یہ کہتے ہیں کہ یہ لادینی دَور ہے۔ اس میں تو پھر بھی بہر حال مناظرے تو ہوتے تھے' ایک دوسرے کے خلاف چارہ جوئی تو کوئی ہوتی تھی مگر اس شریعت کے نافذ کرنے میں تو فرقوں کی جڑیں اور مضبوط ہوجائے گی۔

حکومتی سطح پر فرقہ بندی کی اجازت: خلافِ قرآن سوچ

عزیزانِ من! جس قسم کا یہ نظامِ شریعت نافذ کرنے کے درپے ہیں اور کہتے ہیں کہ اس کے متعلق جب حکومت کی طرف سے یہ ضمانت دیدی جائے گی کہ ہر ایک کو اپنے اپنے اختلافات کو قائم رکھنے کا تحفظ حاصل ہے تو کسی دوسرے کے عقیدے یا منصب یا فروعات یا جزئیات میں' دخل دینے کی کسی کو اجازت نہیں ہوگی۔ میں سمجھتا ہوں' پھر تو مناظرے کی بھی اجازت نہیں ہوسکتی' یہ کسی دوسرے کے عقیدے یا منصب یا فروعات و جزئیات میں مداخلت ہوجائے گی۔ حکومت ان کے ان عقائد کی Protection (تحفظ) دے گی۔ اس کے بعد پھر یہ آپ کے ہاں کے یہ فرقے بہت پختہ ہوجائیں گے' اسے نظامِ شریعت کہا جارہا ہے۔ جب یہ نظامِ شریعت نافذ ہوگا تو اس میں یہ فرقے اور زیادہ پختہ ہوجائیں گے۔ صاحب! جب آپ کسی فرقے کے عقیدے یا کسی منصب کے خلاف اس زمانے میں لب کشائی بھی نہ کرسکیں' تو کیا اس طرح سے یہ مٹیں گے؟

عزیزانِ من! یہ فرقے مٹے تھے لیکن یہ ہوا اُس وقت تھا جب نظامِ خداوندی قائم ہوا تھا اور کتاب اللہ کے مطابق فیصلے ہونے شروع ہوگئے تھے۔ پھر اِن فرقوں کے باقی رہنے کا سوال ہی پیدا نہیں ہوتا کیونکہ قرآن تو تفرقے کو شرک قرار دیتا ہے لیکن یہاں خود فریبیاں

---

[1] یہ 6 مارچ 1977ء کی بات ہے۔

بھی عجیب قسم کی ہیں۔ فرقہ بندی کو اگر قرآن نے شرک قرار دیا ہے تو یہاں دہائی مچ گئی کہ اگر فرقہ بندی شرک ہے تو یہ جو اس وقت ساری امت فرقوں میں بٹی ہوئی ہے وہ تو پھر یہ ساری امت مشرک ہوگئی، ہیں۔ یہ طلوعِ اسلام ہی تھا جو لکھ رہا تھا کہ قرآنِ کریم کی رو سے فرقہ بندی شرک ہے۔ لیکن اس کے خلاف دہائی مچادی گویا طلوعِ اسلام ساری امت کو مشرک قرار دے رہا ہے۔ او بابا! یہ خدا کی آیت ہے جو صرف طلوعِ اسلام لکھ رہا ہے۔

فرقے کے لفظ کی بجائے مکاتبِ فکر کے لفظ کا استعمال: ایک اور خود فریبی

عزیزانِ من! قرآن کہتا ہے کہ جب امت فرقوں میں بٹ جائے تو توحید نہیں رہتی، شرک ہو جاتا ہے۔ تو ہم نے تو انہیں مشرک نہیں قرار دیا۔ یہ تو خدا کی آیات ہیں جو یہ قرار دے رہی ہیں۔ کہا کہ نہیں، تمہارا جرم یہ ہے کہ تم ان کو فرقے کہتے ہو۔ دراصل یہ مکاتبِ فکر ہیں، فرقے نہیں ہیں۔ جی! مکاتبِ فکر!! بس انہوں نے اس کا یہ لفظ بدل لیا اور مطمئن ہو گئے۔ قرآن نے کہا تھا کہ یہ تو **اَسۡمَآءٍ سَمَّیۡتُمُوۡهَآ اَنۡتُمۡ وَ اٰبَآؤُكُمۡ** (7:71)۔ چند اصطلاحی نام ہیں جو تم نے اور تمہارے اسلاف نے وضع کر رکھے ہیں۔ تم کرتے یہ ہو کہ خود ہی کچھ نام رکھ لیتے ہو یا وہ نام تمہارے بڑے رکھ لیتے ہیں اور پھر مطمئن ہو جاتے ہو کہ نام بدلنے سے حقیقت بدل گئی، کیونکہ نام بدل دیا تھا اس لیے اب فرقہ نہیں بلکہ مکاتبِ فکر ہیں اور خوش ہو کے بیٹھ گئے کہ اب ہم مشرک نہیں رہے۔ یعنی وہ تو جو کچھ قرآن کریم نے کہا ہے فرقے والوں کے متعلق ہے۔ اب فرقہ تو ہے نہیں، ہمارے ہاں تو مکاتبِ فکر ہیں۔

مذہبی پیشواؤں کی اندرونی سوچ

عزیزانِ من! یہ بات نہیں ہے کہ یہ سارے مذہبی پیشوا جاہل ہی ہیں۔ یہ اتنے جاہل نہیں ہوتے۔ ان کے ہاں کا نچلی سطح والا طبقہ تو بیچارہ پکی روٹی والا ہوتا ہے۔ یہ اوپر والے بڑے گھاگ [1] ہوتے ہیں۔ آپ دیکھیے یہ اپنے اپنے پیشے کیلیے، اپنی اپنی معاش کیلیے، کیا کچھ طریقے سوچتے ہیں۔ انہیں یہ معلوم ہوتا ہے کہ ہم یہ کیا کر رہے ہیں۔ وہ جان بوجھ کر اپنے ہاں کے مقتدیوں کو اس فریبِ نفس میں مبتلا رکھتے ہیں کیونکہ انہوں نے پوچھنا شروع کر دیا تھا کہ صاحب! یہ تو قرآن کی آیت ہے۔ جس میں کہا ہے کہ تم بڑی احتیاط برتنا کہ توحید کے پیروکار بن کر **وَلَا تَكُوۡنُوۡا مِنَ الۡمُشۡرِكِيۡنَ مِنَ الَّذِيۡنَ فَرَّقُوۡا دِيۡنَهُمۡ** (30:31-32) مشرک نہ بن جانا یعنی ان لوگوں میں سے نہ ہو جانا جنہوں نے اپنے دین کو ٹکڑے ٹکڑے کر دیا۔ اس کے بعد قرآن یہ کہتا ہے کہ **وَ كَانُوۡا شِيَعًا كُلُّ حِزۡبٍ** م (30:31) اور اس طرح امتِ واحدہ رہنے کے بجائے مختلف فرقوں میں بٹ گئے۔ عزیزانِ من! یہاں اسی آیت میں قرآن انہیں ''حزب'' بھی

---

[1] پرانے تجربہ کار

کہتا ہے'' شیعہ'' بھی کہتا ہے'' فرقہ'' بھی کہتا ہے۔ یہ سارا کچھ ہے مگر وہ ہیں کہ کہتے ہیں کہ نہیں' نہیں' جی! یہ نہیں ہے' ہم مکاتبِ فکر ہیں' فرقہ ہے ہی کوئی نہیں۔ میں نے عرض کیا ہے کہ کبوتر کیطرح آنکھیں بند کر لینے سے تو آپ بلی سے نہیں بچ سکتے۔ خدا کے قانونِ مکافات سے تو آپ نہیں بچ سکتے آپ کچھ بھی نام رکھ لیجیے۔ قرآنِ حکیم کا فرمان یہ ہے کہ **اَللّٰہُ یَحۡکُمُ بَیۡنَکُمۡ یَوۡمَ الۡقِیٰمَۃِ فِیۡمَا کُنۡتُمۡ فِیۡہِ تَخۡتَلِفُوۡنَ** (22:69)۔ جب ظہورِ نتائج کا وقت آئے گا تو خدا کا یہی قانون (قانونِ مکافات) ان تمام امور میں فیصلہ کر دے گا جن میں تم اِس وقت اختلاف کر رہے ہو۔ تو اختلافات مٹنے کا طریقہ یہ ہوگا۔ ایک قوم اس طرح سے خدا کے قوانین کے مطابق نظام قائم کرنے کیلیے اٹھ کھڑی ہوگی۔ اس نظام کے اندر کسی فرقے کے پیدا ہونے کا سوال ہی نہیں ہوگا۔ عزیزانِ من! وہ جو میں متعدد بار دہرایا کرتا ہوں آج پھر میں علامہ اقبالؒ (38 - 1977) کا وہ شعر آہ وفغاں ❶ دہرا دوں۔ اسلام امتِ واحدہ کے اندر ہوتا ہے۔ **کَذٰلِکَ جَعَلۡنٰکُمۡ اُمَّۃً وَّسَطًا** (2:143)۔ ہم نے تمہیں ایک امت بنایا ہے' ایک ایسی قوم جسے تمام دنیا میں بین الاقوامی پوزیشن حاصل ہو' جس سے دنیا کی ہر قوم یکساں فاصلے پر ہو' نہ کسی طرف جھکی ہوئی ہو' نہ کسی سے کھنچی ہوئی۔

فرقوں کو مٹانے کا طریق

عزیزانِ من! علامہ ڈاکٹر اقبالؒ (1938-1877) روتا ہی یہ ہے کہ خدا نے تو تمہیں ایک امت بنایا تھا اور تم تو کتنی امتیں بن گئے ہو۔ وہ امتِ واحدہ بنتی ہے ایک خدا کے ضابطہ قوانین کے تابع زندگی بسر کرنے سے۔ اس کتاب (قرآنِ کریم) کی خصوصیت یہ بتائی ہے کہ اس میں کوئی اختلافی بات نہیں ہے' تو جس کتاب میں اختلافی بات نہ ہو اور وہ ایک امت پر نافذ العمل ہو تو امت میں اختلاف پیدا ہی نہیں ہو سکتا' پھر اس کی ایک مرکزی اتھارٹی ہو جو اسے نافذ کرے' وہی مرکزی اتھارٹی باہمی مشاورت سے اس کے طور طریقے متعین کرے۔ وہ جو طور طریقے اپنے نظامِ مملکت میں متعین کرے گی تو انہیں بھی تو قانون کی حیثیت سے نافذ کرے گی۔ نظامِ مملکت میں تو اتنی سی چیز' جو Keep to the Right یا Keep to the Left ❷ ہے' بڑی اہم ہے۔ نظر بظاہر آپ دیکھیے تو نظامِ عدل میں اس کا کوئی دخل نہیں ہے' کوئی رائٹ (دائیں) کو چل دے کوئی لیفٹ (بائیں) کو چل دے لیکن چونکہ ایک متمکن نظام کیطرف سے' قانون کی حیثیت سے' یہ بات نافذ ہوئی ہے کہ Keep to the Left ❸ کے بجائے اگر آپ رائٹ (دائیں) کیطرف چلتے ہیں تو قانون شکنی

---

❶ مجھے آہ وفغانِ نیم شب کا پھر پیام آیا | تھم اے رہرو کہ شاید پھر کوئی مشکل مقام آیا
(بالِ جبریل' نیشنل بک فاؤنڈیشن' کراچی' 1996' ص۔ 72)

❷ دائیں چلو یا بائیں چلو

❸ بائیں چلو

ہوتی ہے، سزا ملتی ہے۔ آپ اس سے ذرا اختلاف کیجئے، دیکھیے پھر کیا ہوتا ہے۔ اختلافات یوں مٹتے ہیں۔ ایک عملی نظام ہو جس میں قرآن کے احکام وقوانین مملکت کے قوانین کی حیثیت سے ایک اتھارٹی کی طرف سے نافذ ہوں۔ **جَعَلْنٰكُمْ اُمَّةً وَّسَطًا لِّتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا** (2:143)۔ اس پروگرام سے ہمارا مقصد یہ ہے کہ تمہیں ایک ایسی قوم بنا دیا جائے، جسے تمام دنیا میں بین الاقوامی پوزیشن حاصل ہو، جس سے دنیا کی ہر قوم یکساں فاصلے پر ہو۔ وہ نہ کسی کی طرف جھکی ہو، نہ کسی سے کھنچی ہوئی۔ اور اس کا فریضۂ زندگی یہ ہو کہ وہ تمام اقوامِ عالم کے اعمال کی محاسب ونگران ہو۔ (وہ دیکھے کہ کوئی قوم ظلم اور زیادتی پر تو نہیں اتر آئی) اور اُن کے اپنے اعمال کا محاسب ونگران، ان کا رسول ہو، جسے اس نظامِ خداوندی کی مرکزی حیثیت حاصل ہے۔ اس طرح تم تمام نوعِ انسانی کے معاملات کی نگرانی کرو گے۔ **وَيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ عَلَيْكُمْ شَهِيْدًا** (2:143)۔ اور تمہارے معاملات کے اوپر تمہارا یہ سربراہ تمہاری نگرانی کرے گا۔ اس کیلیے نگران کا ہونا ضروری ہے۔ اسی کو میں وہ مرکزِ ملت کہا کرتا ہوں، اسی کو خلافت علیٰ منہاج رسالت کہا جاتا ہے۔ اگر وہ اسی طرح سے باقی چلی آتی جیسے کہ وہ شروع ہوئی تھی تو عزیزانِ من! کوئی فرقہ وجود میں نہ آتا، اسلام کبھی دین سے مذہب نہیں بن سکتا تھا۔ ایک امت، ایک نظام، ایک ضابطہ قوانین، اس کی اطاعت ہر ایک پر لازم ہے۔ وہ اس مرکز کے نہ رہنے کی وجہ سے مذہب بن گیا۔ جب نظام یا مرکز یا خدا کے قوانین کی وہ حکومت نہیں رہتی تو پھر مذہب بن جاتا ہے۔ اب اس میں پھر ہر ایک کو اپنے اپنے طریقے سے اجازت دی جاتی ہے کہ یہ کچھ کرے۔ حکومت بادشاہت ہوتی ہے، وہ ان معاملوں میں دخل ہی نہیں دیتی۔ وہ کہتی ہے کہ پھر اس سر دردی کی ہمیں کیا ضرورت ہے۔ ٹھیک ہے صاحب! نکاح، طلاق، عدت، نماز، روزہ حج زکوٰۃ کرتے رہو جیسے تم نے کرنا ہے بلکہ وہ تو اور زیادہ Create Differences (اختلافات پیدا کرنا) کرتے رہتے ہیں کہ آپس میں لڑتے جھگڑتے رہو۔ کہا کہ یہ فرقے اس دور میں مٹ سکیں گے جب خدا کے دیئے ہوئے قوانین کے تابع نظام قائم ہوگا۔ اب قرآنِ کریم نے آگے کہا کہ **اَلَمْ تَعْلَمْ اَنَّ اللّٰهَ يَعْلَمُ مَا فِى السَّمَآءِ وَ الْاَرْضِ** (22:70)۔ کیا تو نہیں جانتا کہ کائنات کی پستیوں اور بلندیوں میں جو کچھ ہے، سب خدا کے علم میں ہے۔ کوئی شے اُس کے قانونِ مکافات کی نگاہوں سے چھپی ہوئی نہیں ہے۔ عزیزانِ من! کیا بات ہے اس خدا کی کہ جسے کائنات کی ارض وسما کی ہر شے کا علم ہے۔ **مَا فِى السَّمَآءِ وَ الْاَرْضِ** ارض وسما میں تو انسان بھی آجاتے ہیں، اُسے ان کے متعلق بھی علم ہے۔ اس علم کی بنا پہ جو کچھ کائناتِ ارض وسما میں ہوتا ہے، سب **اِنَّ ذٰلِكَ فِىْ كِتٰبٍ** (22:70) اس کے قانون کی کتاب میں ضبط ہوتا جاتا ہے۔

صحیفہ کائنات میں کوئی اختلاف نہیں

عزیزانِ من! اب یہاں، اس آیت (22:70) میں کتب آیا ہے اور کہا ہے کہ یہ سب کچھ اس کے قانون کی کتاب میں ضبط ہوتا جاتا

ہے۔ یہاں اس سے مراد کتابِ فطرت ہے۔ یہ وہی ہے جسے ہم قوانینِ [1] فطرت کہتے ہیں۔ یہ صحیفہ کائنات کے اندر کتابِ قوانین مرقوم ہے۔ اِنَّ ذٰلِکَ فِـیۡ کِتٰبٍ [2] (22:70)۔ اور وہ جو انسانی دنیا کیلیے وحی کے ذریعے سے آئے ہیں، وہ آ کے قرآن کے اندر مرقوم ہیں۔ وہاں یعنی قوانین فطرت میں، صحیفہ کائنات میں، مذہبی پیشوائیت کا کوئی دخل نہیں ہے، اس لیے قوانینِ فطرت میں، وہاں کوئی اختلاف پیدا نہیں ہوتا۔ وہاں کبھی یہ نہیں ہوتا کہ وہ جو اہلحدیث کے ہاں پانی ہے، وہ تو سو ڈگری پر کھولے گا اور حنفی کے ہاں وہی پانی ایک سو دس ڈگری سینٹی گریڈ پہ جا کے کھولے گا کیونکہ امام ابو حنیفہؒ نے یہ فرمایا ہے کہ وہ ایک سو دس ڈگری پہ کھولے گا۔ پانی آپ کے ہاں کھولے، اہلحدیث کے ہاں کھولے، بت پرست ہندو کے ہاں کھولے، پانی کے نقطہ کھولاؤ (Boiling Point) میں اختلاف ہی نہیں ہے، اس لیے کہ اس میں مذہبی پیشوائیت کا دخل نہیں ہوتا۔ اسے مذاہب کی پیشوائیت کے حوالے کر دیجیے، تو تہاڈی چاء ای نہ پکن دین۔ اے تے او آکھن اگ ساڈے حنفیاں دی چھیدی اے سانوں۔ [3] یہ تو ہم بچ گئے۔ یہ اس لیے کہ وہاں ان کا دخل نہیں ہے۔ وہاں کہا ہے کہ اِنَّ

---

[1] وائٹ ہیڈ (Whitehead) کے نزدیک قوانین فطرت کے متعلق چار نظریات متداول ہیں:

۱۔ Law of Immanence۔ (قانونِ نفاذِ کلی) اس نظریہ سے مفہوم یہ ہے کہ کائنات میں کوئی شے اپنی ذاتی خصوصیت کی بنا پر قائم نہیں بلکہ ہر شے اپنی ہستی کے لیے دوسری اشیاء کی محتاج ہے لہٰذا تمام اشیاء میں باہمی رابطہ ہے۔ اشیاء کی ماہیت سمجھنے سے مفہوم یہ ہے کہ ہم اس بنیادی رابطہ کو سمجھ لیں جس سے یہ اشیاء باہم مربوط ہیں۔ اسی رابطہ کو قانونِ فطرت کہتے ہیں۔ لہٰذا علمائے سائنس کا کام یہ نہیں کہ وہ فطرت (Nature) کے افعال کے متعلق اپنے مشاہدات قلمبند کرتے جائیں بلکہ ان کا فریضہ ہے کہ وہ اس ربط دروں کو تلاش کریں۔

۲۔ Imposed Law (عائد شدہ قانون) اس نظریہ کا ملخص یہ ہے کہ ہر شے ایک منفرد خصوصیت رکھتی ہے اور اس کی ہستی اسی خصوصیت سے قائم ہے۔ لہٰذا اپنی ہستی کے لیے کوئی شے کسی دوسری شے کی محتاج نہیں لیکن ان تمام اشیاء پر خارج سے ایک قانون عائد کر دیا گیا ہے کہ وہ باہم دگر ربط وضبط رکھیں۔ اس خارج سے عائدہ کردہ قانون کا نام قانونِ فطرت ہے۔ نیوٹن اور ڈیکارٹ وغیرہ کے نزدیک یہ خارجی قانون خدا کا عائد کردہ ہے یا یوں سمجھیے کہ خود خدا ہے۔ الٰہیات میں اس تصور کو Deism (الٰہیت) سے تعبیر کیا جاتا ہے۔ یعنی God as a Person (خدا انسان کی حیثیت سے) کا تصور جو کائنات سے باہر بیٹھا اپنے قوانین کی رو سے کائنات کی مشینری چلا رہا ہے۔

۳۔ Observed Order of Succession۔ (ترتیب وار سلسلہ نظم مشاہدہ) اس نظریہ سے مقصود یہ ہے کہ ہمارا کام یہ ہے کہ ہم دیکھتے جائیں کہ کائنات میں کیا کچھ ہو رہا ہے اور جس طرح کوئی واقعہ ہوتا چلا جائے اس کے متعلق اپنے مشاہدات قلمبند کرتے جائیں۔ اس مشاہدات کی رو سے جو نتائج مرتب ہوں وہی قوانینِ فطرت ہیں۔ یہ میکانکی قوانین کا نظریہ ہے اور اسے سائنس کی دنیا میں Positivism (اثباتیت) کہا جاتا ہے۔

۴۔ Conventional Interpretation۔ (تقلیدی توجیہ) یہ درحقیقت الگ نظریہ نہیں بلکہ حکمائے یونان و مصر کے اتباع میں ایک قسم کا تقلیدی مسلک ہے اس لیے بحث صرف اول الذکر تین نظریوں تک ہی محدود ہو جاتی ہے۔

مندرجہ بالا تینوں نظریوں میں تیسرا نظریہ علمائے سائنس کے نزدیک سب سے زیادہ قابلِ قبول رہا ہے اور اِس کی بنا پر سائنس کے میکانکی قوانین مرتب ہوتے ہیں۔

[2] اس کے قانون کی کتاب میں ضبط ہوتا جاتا ہے۔

[3] یہ تو تمہاری چائے ہی نہ بننے دیں، کہیں کہ ہمیں تو اپنے حنفیوں کی ہی آگ درکار ہے۔

ذٰلِکَ فِیۡ کِتٰبٍ (22:70) جو کچھ صحیفہ کائنات میں ہوتا ہے' سب اس کے قانون کی کتاب میں ضبط ہوتا چلا جاتا ہے۔عزیزانِ من! اب یہ بات کہ یہ اتنی بڑی عالمِ انسانیت ہے اور اس میں یہ سارا کچھ ہے' اب اس میں ایسے احکام دینا کہ جن کی اطاعت میں کوئی اختلاف ہی پیدا نہ ہو' تو اِس سے سلطنت کا سر چکرا جاتا ہے۔ کہا کہ ٹھیک ہے اس سے تمہارا سر چکرا جاتا ہے۔ ہمارا نہیں کیونکہ **اِنَّ ذٰلِکَ عَلَی اللّٰہِ یَسِیۡرٌ** (22:70)۔ ہمارے لیے ایسا کرنا بہت ہی آسان ہے۔صاحب! اس کائنات کا احاطہ ہی نہیں کر سکتے۔ کائنات پہ غور کرنے والے تو یوں کھڑے ہوئے محوِ حیرت رہ جاتے ہیں۔ کسی نے ماہر فلکیات سے کائنات کے متعلق پوچھا کہ کیا کہتے ہو؟ کہنے لگا کہ تم کائنات کہہ رہے ہو میں تو ایک ستارے کے متعلق بھی ابھی آخر تک نہیں پہنچا۔ جسے تم یہ کہکشاں کہتے ہو' تمہارے ذہن میں تو یہ ایک کائنات ہے حالانکہ کروڑوں کائناتیں اس کے اندر پوشیدہ ہیں۔ آپ نے The Expanding Universe کتاب پڑھی ہوگی جس میں وہ کہتا ہے کہ یہ کائنات اب بھی پھیل رہی ہے' بڑھ رہی ہے' اس میں اضافہ ہو رہا ہے۔قرآن نے کہا ہے کہ **یَزِیۡدُ فِی الۡخَلۡقِ مَا یَشَآءُ** (35:1)۔ وہ اپنی مشیت کے مطابق اس خلق میں اضافے کرتا چلا جاتا ہے۔ یہ Expanding Universe تو پھیلتی ہوئی چلی جا رہی ہے۔تم اس کا اس قدر احاطہ ہمارے الفاظ میں کرتے ہو اِس لامنتہٰی کائنات میں کہیں اختلاف نہیں ہے۔ یہ چاند پہ بھی پہنچے ہیں تو وہاں بھی وہی قوانین تھے جو انہوں نے یہاں دیکھے تھے اور خدا کیلیے یہ کوئی مشکل بات ہی نہیں ہے۔ **اِنَّ ذٰلِکَ عَلَی اللّٰہِ یَسِیۡرٌ** (22:70)۔ خدا کے لیے ایسا کرنا چنداں مشکل نہیں' اس کے لیے ایسا کرنا تو بہت آسان ہے۔

کوئی حکومت بھی خامیوں سے مبرا قانون نہیں بنا سکتی

عزیزانِ من! اللہ کیلیے ایسی کتاب' ایسا ضابطہ قوانین نافذ کرنا بہت آسان ہے جو **وَ تَمَّتۡ کَلِمَتُ رَبِّکَ صِدۡقًا وَّ عَدۡلًا ؕ لَا مُبَدِّلَ لِکَلِمٰتِہٖ** (6:116) تمام صداقتوں کو اپنے اندر لیے اور عدل و توازن کے تقاضوں کو پورا کرتے ہوئے مکمل ہو چکا ہے۔ اب ان قوانینِ خداوندی میں کوئی تغیر و تبدل کرنے والا نہیں ہے۔یعنی یہ ایسا مکمل ہے کہ اِس میں اضافے کی گنجائش نہیں اور محکم ایسا کہ اس میں کسی تغیر و تبدل کی ضرورت نہیں۔ اس کے برعکس انسانوں کی کوئی حکومت' ایسا قانون یا ضابطہ نہیں بنا سکتی جس کے متعلق وہ کہہ دے کہ یہ فائنل ہے' یہ مکمل ہے' اور اس میں کسی Amendment (ترمیم) کی ضرورت نہیں' اور نہ کبھی ہوگی۔ کسی سے ایسا قانون بن ہی نہیں سکا' اور بن ہی نہیں سکتا۔ یہ قرآن ہی ایک ضابطہ ہے جو مکمل ہے' جس میں تبدیلی کی کوئی ضرورت نہیں' کوئی تبدیلی کر نہیں سکے گا اور اس کا محافظ بھی خدا ہوگا (اور ہے) اور یہ اختلافی بات نہیں۔ یہ اس نے کہہ دیا کہ اس کے منجانب اللہ ہونے کی دلیل یہ ہے کہ اس میں کوئی چیز اختلافی نہیں ہے۔ تو کہا کہ تمہارے لیے تو اس قسم کا ضابطہ بنانا ناممکن ہے لیکن **اِنَّ ذٰلِکَ عَلَی اللّٰہِ یَسِیۡرٌ** (22:70) ہمارے لیے کچھ مشکل نہیں۔ کیا بات ہے! کہا کہ یہ جو ساری مشکلات تم نے کھڑی کی ہوئی ہیں' یہ سب تمہاری ہی Create (پیدا) کی ہوئی ہیں اور اس

کی وجہ ایک ہی ہے۔آؤ تمہیں بتاؤں کہ یہ اختلافات کیوں ہیں؟ یہ اس لیے ہیں کہ **وَيَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطٰنًا** (22:71) یہ ان چیزوں کی محکومیت اختیار کرتے ہیں' ان کے تابع چلتے ہیں' جن کیلیے خدا نے کوئی سند نازل نہیں کی۔ یہ بڑی چیز ہے۔ان میں سے ہر ایک کا دعویٰ یہی ہے کہ ہم خدا کے عطا کردہ دین کے مطابق' قرآن کے مطابق' ہی عمل کرتے ہیں اور پھر کتاب و سنت یا فقہ کے متعلق بھی یہی بات ہے۔سوچیے' عزیزانِ من! اگر یہ کہا جائے کہ ہر فرقہ کتاب اللہ کے مطابق ہے تو ان فرقوں کا وجود کس دعوے کی تردید کر رہا ہے؟ ذرا سوچیے۔ بات کہاں تک پہنچی؟ اور کم از کم وہ تہتر فرقوں والی بات تو نبی اکرم ﷺ کی طرف منسوب ایک روایت میں بھی آ چکی ہوئی ہے تو ایسی کتاب کہ جو ان تہتر فرقوں کو اپنی طرف سے سند دیتی چلی جائے اور دعویٰ یہ کرے کہ میرے منجانب اللہ ہونے کا ثبوت یہ ہے کہ اس میں کوئی اختلافی بات نہیں ہے۔کیا کبھی کوئی اس پہ سوچتا ہے؟

ہمارے ہاں مذہبی معاملات میں سوچنے والوں کو بولنے کی اجازت نہیں

عزیزانِ من! ہمارے ہاں تو سوچنے والوں کو بولنے کی اجازت [1] نہیں ہے۔ پوچھو تو سہی کہ اگر یہ کچھ کتاب کے مطابق ہے' اگر ہر فرقہ کتاب اللہ (قرآنِ کریم) کے مطابق ہے تو کتاب تو یہ کہتی ہے کہ مجھ میں اختلاف ہی نہیں' تو تم میں یہ اختلاف کیوں ہے؟ وہ ساری بات خدا نے بتا دی کہ **وَيَعْبُدُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ مَا لَمْ يُنَزِّلْ بِهٖ سُلْطٰنًا** (22:71) غیر اللہ کی پیروی کرتے ہیں' ان چیزوں کا اتباع کرتے ہیں جن کے لیے خدا نے کوئی سند نہیں نازل کی۔اگر خدائی سند ساتھ ہو جائے تو دو انسانوں میں' دو عقیدوں میں' دو مصلحتوں میں' فرق ہی نہیں ہو سکتا' اختلاف ہی نہیں ہو سکتا۔اختلاف ہو جائے تو عزیزانِ من! قرآن کا یہ دعویٰ' معاذ اللہ' باطل قرار پا جاتا ہے کہ مجھ میں کوئی اختلافی بات نہیں ہے۔**وَمَا لَيْسَ لَهُمْ بِهٖ عِلْمٌ** (22:71) اور نہ ہی یہ ان کی حقیقت سے خود واقف ہیں۔ان کی کیفیت یہ ہے کہ یہ جو بیچارے عوام لگے ہوئے ہیں' ان کو اس کا علم بھی نہیں ہوتا۔انہیں وہ کہہ دیتے ہیں کہ یہ خدا کی اطاعت ہے۔ارشادِ خداوندی' احکامِ خداوندی کی اطاعت ہوتی جا رہی ہے۔اور یہ جو قرآن نے کہا ہے کہ اللہ نے کہا ہے کہ اس کی سند خدا کی طرف سے نہیں ملتی' اس پر کوئی غور نہیں کرتا۔ان فرقوں کے متعلق کوئی بھی' خواہ ان کے ہاں کی فقہ ہو' یا روایات ہوں' ان میں سے کوئی بھی یہ نہیں دیکھتا کہ ان کی کوئی سند (Authority) خدا کی طرف سے نہیں ہے۔آپ دیکھیے کہ ان کی سند (Authority) آخر میں کسی نہ کسی انسان یا شخصیت کے اوپر جا کے ختم ہو جائے گی۔ان کی کوئی بات براہِ راست کسی طرح بھی قرآن کی سند کے ساتھ نہیں ہے۔جب بھی کہیے کہ صاحب! وہ تو خدا کے احکام قرآن میں ہیں' یہ ان کے متعلق ہے تو وہ کہنے لگتے ہیں کہ یہ جو اسلاف ہیں' یہ بھی تو قرآن کو تم سے' ہم سے' سب سے' بہتر جانتے تھے۔یہ دیکھو کہ جی! یہ امام صاحب' قرآن نہیں جانتے تھے۔یہ زیادہ قرآن جانتے ہیں۔چل بھئی معاملہ ختم ہوا! یہاں سوال کم یا زیادہ

---

[1] یہ کہتے ہیں کہ مذہب میں عقل کا دخل نہیں ہے۔

جاننے کا نہیں ہے۔ قرآن نے کہا ہے کہ ہم نے ان فرقوں کی سند نازل نہیں کی' تم ان کی سند قرآن سے دیدو مگر وہ ہیں کہ کہتے ہیں کہ جی نہیں۔ وہ ہم سے زیادہ جانتے تھے۔ کہا کہ یہ کچھ یہ کرتے ہیں اور اس کے بعد نتیجہ بھگتتے ہیں اور قرآن کا لفظ ہے: **وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ نَّصِيْرٍ** (22:71)۔ ایسی قوم کا تو دنیا میں کوئی مددگار نہیں ہوتا۔ جو قوم ایک قوم کہلانے کی بھی مدعی ہو' اور کیفیت یہ ہو کہ ان کے ہاں ضوابطِ آئین اور قوانین اور احکام مختلف ہوں' تو پھر جو اختلاف پہ سر پھٹول ہوتی ہے' اس کا نتیجہ یہ قوم بھگتی ہے۔ قرآن کہتا ہے کہ اس صورت میں کوئی بھی ان کی مدد نہیں کر سکتا۔ اب قرآن یہاں لفظ ظالمین لے آیا۔ آپ کو معلوم ہے' میں نے کئی دفعہ بتایا ہے کہ ظلم کے معنی ہیں کہ ''جس چیز کو جس مقام پہ ہونا چاہیے اسے وہاں نہ رکھنا۔'' دین میں مقام یہ تھا کہ سند خدا کی طرف سے نازل کردہ ہونی چاہیے۔ اسے اس مقام پہ نہ رکھنا جس مقام پہ رکھنے کی سند قرآن نہیں دیتا۔ یہ ظلم کے زمرے میں آتا ہے یہ جتنے ہمارے بزرگانِ مذہب گزرے ہیں' فہمِ قرآن ان کا چلتا ہے۔ قرآنِ کریم کی سند نہیں۔

قرآن کے متعلق مروجہ عقیدہ

عزیزانِ من! یہ ہمارے جتنے اسلاف گزرے ہیں ان کا علم' ان کا تقویٰ' ان کی پرہیزگاری' جیسے کہی جاتی ہے' ہمارے سر آنکھوں پر' اس کے باوجود دین میں وہ سند نہیں ہو سکتے۔ سند (Authority) کے لیے خدا نے یہ کہا ہے کہ یہ **منزل من اللہ** ہونی چاہیے۔ منزل من اللہ کو ہم نے ان اسلاف کے تابع رکھا' اسلاف کی روایات کے نیچے رکھا۔ آج منزل من اللہ یہ روایات ہیں جن کے متعلق خود ان کا بھی دعویٰ نہیں ہے کہ یہ براہِ راست نبی اکرم ﷺ کے ارشادات ہیں۔ وہ یقینی طور پہ ہر حدیث کے آخر میں کہتے ہیں: اوکما قال رسول اللہ یعنی ''یا جیسے رسول اللہ نے فرمایا۔'' روایات کا انداز یہ ہوتا ہے کہ پہلے یہ کہتے ہیں ''قال رسول اللہ ﷺ'' یعنی رسول اللہ ﷺ نے فرمایا۔ آگے وہ متن ہوتا ہے اور آخر میں ہوتا ہے ''اوکما قال رسول اللہ ﷺ'' یعنی یہ یا جیسے رسول اللہ ﷺ نے فرمایا ہو۔ ہر حدیث کے آخر میں یہ ہوتا ہے۔ خود یہ بھی یقینی طور پہ یوں نہیں کہتے کہ رسول اللہ ﷺ کی یقینی طور پہ یہ چیز ہے۔ اور حیرت انگیز یہ ہے کہ اس قسم کی جو چیز ہے اس کے متعلق عقیدہ یہ ہے کہ یہ قرآن کی آیت کو منسوخ کر سکتی ہے۔ اس کا منزل من اللہ کی سند ہونا تو ایک طرف رہا' یہ تو خود سند منزل من اللہ' جو کہ قرآنِ کریم کی صورت میں موجود ہے' کو منسوخ کر سکتی ہے۔ ہمارے ہاں کے اہلِ فقہ کا عقیدہ یہ ہے کہ ہمارے آئمہ [1] کی جو فقہ ہے وہ قرآن و حدیث پر مبنی ہے لیکن اگر ان کی فقہ کے کسی فیصلے میں اور آپ کو قرآن میں یا حدیث میں اختلاف نظر آئے تو ان کا عقیدہ یہ ہے کہ پہلے کوشش تو یہ کرو کہ کسی طرح سے قرآن کی یا حدیث کی ایسی تاویل کی جائے کہ وہ اس کے مطابق ہو جائے اور اگر یہ

---

[1] چونکہ کوئی مرکزی اتھارٹی نہیں تھی اس لیے مختلف فقہا نے اپنے اپنے طور پر قوانین مرتب کر لیے اور ان کے معتقدین نے ان قوانین کا اتباع اپنے اوپر لازم قرار دے لیا۔ اس طرح یہ امت فرقوں میں بٹ گئی۔

ناممکن ہو تو پھر قرآن کریم کی وہ آیت منسوخ ہوگی اور فیصلہ فقہ کا ہوگا۔ اب یہاں دیکھیے کہ قرآنِ کریم نے اس آیت (22:71) میں ظالمین کا لفظ استعمال کیا۔ یہ ظلم سے ماخوذ ہے۔ اس کے معنی ہیں کہ ''جس مقام پہ کسی کو ہونا چاہیے اس کو اس مقام پہ رکھا جائے تو وہ عدل ہوگا اور اگر اسے اس مقام پہ نہ رکھا جائے تو یہ ظلم ہو جائے گا'' مذہب کی دنیا میں رہتے ہوئے یہی کچھ ہوا ہے۔

فرقوں کے باہمی اختلافات کا نتیجہ: پھر کوئی مدد کو نہیں آتا

عزیزانِ من! فرقوں کے آپس میں اختلافات قوم کو اس قدر ذلت اور پستی کی حالت پر پہنچا دیتے ہیں کہ قرآن کہتا ہے کہ پھر ان کی کوئی مدد نہیں کر سکتا۔ **وَمَا لِلظّٰلِمِيْنَ مِنْ نَّصِيْرٍ** (22:71)۔ (یہ محض آباء واجداد کی تقلید سے ایسا کیے چلے جاتے ہیں۔ 10:39) لیکن انہیں سمجھ رکھنا چاہیے کہ جو لوگ خدا کے قوانین سے سرکشی برتتے ہیں' اُن کا کوئی مددگار نہیں ہو سکتا۔ کلیجہ چھن گیا جب کل ہی یہاں خبر آئی کہ ہندوستان میں مسلمانوں پہ کیا بیت رہی ہے۔ ہم اس پر خون کے آنسو روتے ہیں۔ چلیے' یہی سہی کہ بھئی! جسے یہ اپنے اپنے ہاں مذہبی آزادی کہتے ہیں' یہ امن چین سے رہیں۔ اگر یہی چیز ہے تو پھر لکھنؤ میں شیعہ اور سنی کا آپس میں کیوں جھگڑا ہوا ہے۔ اس میں کتنی ہی موتیں ہو گئی ہیں' کتنے زخمی ہوئے ہیں' اور پھر کتنی گرفتاریاں ہو گئیں۔ ان کے متعلق کہا جاتا ہے کہ انہیں فرقے نہ کہیے' جی! یہ مکاتبِ فکر ہیں!! یہ مکاتبِ فکر ایک دوسرے کو چھریوں سے ہلاک کرتے پھر رہے ہیں۔ یہ ہے' عزیزانِ من! صورتِ حال۔ میں نے عرض کیا تھا کہ یہ بڑی اہم چیز قرآن میں آئی ہے جو اس نے یعنی قرآنِ کریم نے مناسک میں اور ''الامر'' میں فرق کر کے بتایا ہے۔ مذہب میں جو مناسک ہیں وہ مقصود بالذات (End in itself) ہو جاتے ہیں جب کہ دین میں جو مناسک ہیں وہ ایک مقصد و منتہٰی کے حاصل کرنے کا ذریعہ ہوتے ہیں (Means to the Achievement of an Ultimate End) جب وہ مقصد اور منتہٰی نگاہوں سے اوجھل ہو جائے تو یہ ذرائع مقصود بالذات بن جاتے ہیں' اسے مذہب کہا جاتا ہے۔ ان اختلافات کو کوئی نہیں مٹا سکتا۔ اور جس قوم میں یہ اختلافات موجود ہوں تو پھر وہی کچھ ہوتا ہے جیسا قرآن نے کہا ہے کہ اس قوم کی پھر کوئی مدد نہیں کر سکتا۔ یہ اپنے ہاتھوں ایک دوسرے کا گلا کاٹ کے مر جاتے ہیں۔ آگے جو بات کہی ہے' وہ یہی چیز کہی تھی کہ منزل من اللہ کی سند ہونی چاہیے۔ یہ ہے دین میں لم ساری اور پھر اگلی ہی آیت میں اس کی مزید تشریح کی گئی ہے کہ قرآنِ واحد کی طرف دعوت دینے سے کیا ہوتا ہے۔ یہ جو انہوں نے اپنے اپنے معبود اور بت بنائے ہوئے ہیں' وہ گرتے نظر آتے ہیں تو پھر ان کی حفاظت میں یہ لوگ کیا کچھ کر گزرتے ہیں' وہ یہی ہوتا ہے کہ کہیں دین قائم نہ ہو سکے۔ یہ بڑا ہی اہم مقام ہے' اسے ہم آئندہ لیں گے۔

عزیزانِ من! سورۃ الحج کی آیت 71 تک ہم آئے۔ 72 ویں آیت سے ہم آئندہ اتوار کو لیں گے۔ شکریہ

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّآ ط اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ط

❀❀ ...... ❀❀❀ ...... ❀❀

بارھواں باب: **سورۃ الحج** (آیات 72 تا 74)

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

لَعَمۡرُكَ اِنَّهُمۡ لَفِىۡ سَكۡرَتِهِمۡ يَعۡمَهُوۡنَ ﴿۷۲﴾

فَاَخَذَتۡهُمُ الصَّيۡحَةُ مُشۡرِقِيۡنَۙ ﴿۷۳﴾

فَجَعَلۡنَا عَالِيَهَا سَافِلَهَا وَاَمۡطَرۡنَا عَلَيۡهِمۡ حِجَارَةً مِّنۡ سِجِّيۡلٍؕ ﴿۷۴﴾

عزیزانِ من! آج مارچ 1977ء کی 13 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ الحج کی آیت 72 سے ہو رہا ہے: (22:72)۔

مذہب میں سند کسی شخصیت کی رہینِ منت ہوتی ہے

سابقہ آیات میں جو باہمی کشمکش چلی آ رہی تھی اس سلسلے کی آخری آیت میں کہا گیا تھا کہ **وَيَعۡبُدُوۡنَ مِنۡ دُوۡنِ اللّٰهِ مَا لَمۡ يُنَزِّلۡ بِهٖ سُلۡطٰنًا** (22:71)۔ اِن کے اختلافات کی وجہ یہ ہے کہ یہ قانونِ خداوندی کو چھوڑ کر، اُن قوتوں کی محکومیت اختیار کرتے، اور اُن احکام کی اطاعت کرتے ہیں، جن کے لیے اللہ نے کوئی سند نازل نہیں کی ہے۔ حقیقت میں اللہ کی نازل کردہ سند ہی مذہب اور دین میں خطِ امتیاز ہے۔ جس میں خدا کی طرف سے کوئی سند (Authority) نہ ہو، وہ مذہب ہوتا ہے۔ اس میں جن چیزوں کو شریعت کے احکام یا احکامِ خداوندی کہا جاتا ہے، کہ ان کی سند کسی نہ کسی شخصیت پہ جا کے ختم ہو جاتی ہے اور دین وہ تھا کہ جس میں ہر معاملے کی سند براہِ راست خدا کی کتاب [1] سے، **مَا اَنۡزَلَ اللّٰهُ** [2] سے ہے۔ یہ تھا وہ فرق اور یہ تھی وہ دعوت، جو نبی اکرم ﷺ کی طرف سے دی جا رہی تھی کہ

---

[1] قرآن کریم

[2] جو خدا نے وحی کیا ہے یعنی قرآنِ کریم

اطاعت صرف اس کی ہے جس کی سند خدا کی طرف سے نازل کردہ میں ہو' اس کے سوا کسی اور کی اطاعت نہیں ہے۔ احکامِ خداوندی وہی ہیں جو خدا نے نازل کیے ہیں اور جو خدا کی اس کتاب کے اندر ہیں۔ اسی کا نام دین ہے' اسی کی اطاعت کا حکم ہے' اسی کو حق حاصل ہے کہ وہ دوسروں سے اپنی اطاعت کرائے۔ اقتدار اسی کیلیے ہے جس کے پاس **ما انزل الله** کی سند ہو۔

اب اگلی ہی آیت میں' جہاں سے آج کا درس شروع ہو رہا ہے کہا کہ ان کی کیفیت یہ ہے کہ **وَاِذَا تُتۡلٰی عَلَیۡهِمۡ اٰیٰتُنَا بَیِّنٰتٍ تَعۡرِفُ فِیۡ وُجُوۡهِ الَّذِیۡنَ کَفَرُوا الۡمُنۡکَرَ** (22:72)۔ جب ان کے پاس ہمارا قانونِ وحی پیش کیا جاتا ہے تو اُن کے دل میں نفرت اور سرکشی کے جذبات اس شدت سے مشتعل ہو جاتے ہیں کہ اس کے آثار ان کے چہروں سے نمایاں ہو جاتے ہیں۔ عزیزانِ من! اسے پھر سن لیجیے کہ جب ان کے سامنے قرآن کے احکام پیش کیے جاتے ہیں' قرآن کے اصول پیش کیے جاتے ہیں' تو ان کے دلوں میں بڑی نفرت پیدا ہو جاتی ہے' جس کا اظہار ان کے چہروں سے بھی نمودار ہو جاتا ہے' اور اتنا ہی نہیں کہ دلوں میں نفرت پیدا ہو جاتی ہے' ان کی کیفیت اور ردِ عمل کو دیکھ کر ایسا معلوم ہوتا ہے کہ **یَکَادُوۡنَ یَسۡطُوۡنَ بِالَّذِیۡنَ یَتۡلُوۡنَ عَلَیۡهِمۡ اٰیٰتِنَا** (22:72)۔ یہ ان لوگوں پر ہلہ بول دیں گے جو ان کے سامنے ہمارا قانون پیش کرتے ہیں۔ یہ چاہتے ہیں کہ جو ان کے سامنے قرآن پیش کر رہا ہے اس پر جھپٹ پڑو اور ان کی تکا بوٹی کر دو۔

آخر یہ مَا اَنۡزَلَ اللّٰهُ کی مخالفت کیوں؟

عزیزانِ من! یہاں یہ چیز قابلِ غور ہے کہ بالآخر قرآن میں وہ کیا ہے جسے پیش کرنے کے خلاف ان کا ردِ عمل یہ ہوتا ہے کہ قرآن پیش کرنے والے کے خلاف ان کے دلوں میں بغض و عناد کے جذبات بھڑک اٹھتے ہیں اور یہ کیفیت ہو جاتی ہے کہ وہ اس پر حملہ آور ہو جائیں گے' جھپٹ پڑیں گے۔ تاریخ ہمیں بتاتی ہے کہ نبی اکرم ﷺ کی جو مدنی زندگی ہے' اس میں سات آٹھ سال تک' غزوات اور جنگوں کو ملا کر' قریباً اسی بیاسی مقامات پر' انہوں نے لڑائیاں لڑیں۔ یہ کیا بات تھی؟ یہ مخالفت کیوں تھی اور مخالفت بھی اس شدت کی کہ میدانِ جنگ تک میں اتر آئے۔ یہ جو قرآن پیش کرنے والے لوگ تھے وہ کہیں باہر سے تو نہیں آئے تھے' اُنہی میں سے تھے' انہی کے اندر رہتے تھے' نوے فیصد کے قریب تو اسی قریش کے Tribe (قبیلہ) میں' سے تھے۔ یہ لوگ وہیں کے رہنے والے تھے' ہر ایک کی آپس میں رشتہ داریاں تھیں' نہایت امن و امان سے آپس میں رہتے تھے۔ پھر یہ کیا ہو گیا؟ یہ کیا بلا تھی؟ بقول ان کے یہ کیا چیز تھی جو پیش کی ہے؟ بس وہ ایک آگ ہے جو سینوں میں بھڑک اٹھی ہے۔ ہر مقام پر مخالفت کی جا رہی ہے' حملہ آور ہو رہے ہیں' جنگیں کی جا رہی ہیں' لڑائیاں لڑی جا رہی ہیں۔ اگر یہ اختلاف صرف مذہب کا ہی تھا تو اسی عرب کے اندر عیسائی بھی رہتے تھے' وہیں یہودی بھی رہتے تھے' ان عرب کی سرحدوں کے جو مقامات تھے وہاں بہرحال مجوسی بھی تھے' یہ اہلِ مذاہب تو پہلے ہی وہاں موجود تھے' یہودیوں اور عیسائیوں کی تو بہرحال

مدینے کے اندر بڑی آبادی تھی' ان یہودیوں کا تو وہاں بڑا غلبہ تھا۔ یہ مدت سے وہاں رہتے چلے آرہے تھے' اپنے اپنے مذہب پہ قائم تھے۔ ان کے خلاف تو کبھی انہوں نے انگلی تک نہ اٹھائی' ایک لفظ تک نہ کہا۔ اختلاف اگر محض مذہب کا تھا' تو ان قریش نے' ان عربوں نے' انہیں کیسے برداشت کر لیا تھا' وہ وہاں صدیوں سے رہ رہے تھے' ان کی حفاظت میں رہ رہے تھے۔ ان کے خلاف تو کبھی یہ کچھ نہ کیا۔ آج کی اصطلاح میں یہ بھی تو ایک مذہبی سی چیز تھی جو قرآن پیش کیا گیا۔ اس کے خلاف خاص طور پہ اتنی بڑی مخالفت کی' ان کے خلاف اتنا بڑا ردِعمل ہوا۔ سوال یہ ہے کہ یہ کیوں ہوا؟ یہ سوچنے کی بات ہے۔ اگر یہی کچھ ہوتا جو آج ہمارے ہاں کا اسلام ہے تو اس کی آزادی تھی۔ تو وہ تو وہی کچھ ہے کہ جب جنگِ آزادی 1857ء کے بعد انگریز نے تسلط قائم کیا ہے تو پہلے منشور میں' Proclamation میں' برطانیہ سے اس کا اعتراف آ گیا تھا' اس کی ضمانت آ گئی تھی کہ تمہیں مذہبی آزادی حاصل ہوگی۔ انگریز نے بھی آپ کو مذہبی آزادی دی تھی یہ جو انگریز کے چلے جانے کے بعد ہندوستان میں جمہوری نظام حکومت قائم کیے جانے کا نقشہ بن رہا تھا' اس میں تمام ہندوستان کے باشندوں کو مذہبی حفاظت کی گارنٹی دی جا رہی تھی۔ نیشنلسٹ علما کہتے یہ تھے کہ تم مذہب کے نام پہ ایک تحریک چلا رہے ہو' مذہب کی تو آزادی مل رہی ہے' وہ ضمانت دے رہے ہیں' وہ بھی تو کوئی مخالفت نہیں کر رہے' کہیں بھی مخالفت نہیں ہو رہی' جہاں کہیں بھی آپ دوسرے ممالک میں بستے ہیں' مذہب کے پیرو ہیں' اس بنا پہ کہیں بھی مخالفت نہیں ہو رہی' تو یہ کیا چیز تھی جس کی بنا پہ یہ عرب میں' قریش میں' بالخصوص ان علاقوں میں' وہاں کے رہنے والوں میں' اس کے خلاف اتنا شدید ردِعمل ہوا کہ وہ آخر تک لڑائیاں لڑتے رہے' جنگ لڑتے رہے اور یہ مخالفت اس وقت ختم ہوئی ہے جب مکہ فتح ہوا ہے اور انہیں شکستِ فاش ہوئی ہے۔

مخالفت کی اصل وجہ مذہب نہیں' دین تھا بلکہ دین کا نظام تھا

عزیزانِ من! آخر میں جا کے نظر آیا کہ یہ جسے ہم آج کی اصطلاح میں مذہب کہتے ہیں' یہ کوئی مذہبی بات نہیں تھی' یہ مذہب تھا ہی نہیں' یہ دین تھا' یہ ایک نیا نظام لا رہا تھا اور اس نظام کی خصوصیت یہ تھی کہ

موت کا پیغام ہر نوعِ غلامی کے لیے (1)

جب انسانوں کا ایک طبقہ دوسرے طبقے کا استحصال کرتا تھا' Exploit کرتا تھا' جو بھی اس کی شکل تھی' تو یہ ان کے لیے موت کا پیغام تھا۔ جسے اقبالؒ (1877-1938) نے ہر نوعِ غلامی کیلیے موت کا پیغام کہا ہے۔ یہ بڑی جامع چیز ہے۔ یہ ملوکیت کی غلامی تھی' سرمایہ داری کی غلامی تھی' مذہبی پیشوائیت کی غلامی تھی' طبقاتی غلامی تھی' یہ ہندوؤں کے ہاں کی ذات اور برادری کی غلامی تھی' اور اس قسم کی یہ ذاتیں اور

---

(1) موت کا پیغام ہر نوعِ غلامی کے لیے — نے کوئی فغفور و خاقاں' نے فقیرِ رہ نشین
(اقبالؒ: ارمغانِ حجاز اردو' نیشنل بک فاؤنڈیشن' اسلام آباد' 1996' ص۔30)

برادریاں تو عرب کے ہاں بھی تھیں' یہ جس کو آپ قبائلی تفریق کہتے ہیں وہاں بھی یہ چیزیں موجود تھیں' انسانوں کا ایک طبقہ دوسرے طبقے کو اس معنی میں غلام' محکوم بنائے ہوئے تھا' ان کا استحصال کر رہا تھا' یہ ان سب کیلیے موت کا پیغام تھا۔ یہ وجہ مخاصمت تھی۔ کوئی مفاد پرست گروہ بھی اپنے مفاد کو آسانی سے اپنے ہاتھ سے نہیں جانے دینا چاہتا۔ یہ وجہ تھی جو اتنی مخالفت ہو رہی تھی۔ یہ کہا کہ جب ان کے سامنے یہ قرآن پیش کیا جاتا ہے تو تم دیکھو گے کہ ان کے سینے کے اندر چھپے ہوئے نفرت و انتقام کے جذبات کس طرح ان کی پیشانیوں سے نمودار ہو جاتے ہیں۔ نظر آتا ہے کہ یہ آیت پیش کرنے والوں پر جھپٹ پڑیں گے۔

ہر سو قرآن کی مخالفت

عزیزانِ من! اب یہاں آیا ہے کہ **یَسۡطُوۡنَ بِالَّذِیۡنَ یَتۡلُوۡنَ عَلَیۡہِمۡ اٰیٰتِنَا** (22:72) ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ ان لوگوں پر ہلہ بول دیں گے جو ان کے سامنے ہمارا قانون پیش کرتے ہیں۔ یہ تنہا نبی اکرم ﷺ کیلیے نہیں ہے۔ اس آیت میں ضمیر جمع کی ہے۔ جو لوگ بھی قرآن پیش کرتے ہیں' یہ ردِ عمل ان کے خلاف ہوگا۔ یہ لوگوں کی بات نہیں ہے کہ یہ کس کے خلاف ہیں۔ یہ تو قرآن کے خلاف ردِ عمل ہے۔ جو کچھ وہ پیش کرتے ہیں' اس کے خلاف یہ ردِ عمل ہے۔ یہ ایک بڑا' بہت ہی بڑا' انقلابی پیغام تھا' جو کسی قسم کی Exploitation (استحصال) کو چھوڑتا ہی نہیں تھا۔ وہ قریش یا دوسرے اور قبائل دیکھ رہے تھے کہ عیسائیت ہو' یہودیت ہو' ملوکیت ہو' ان کے رہنے سے ہمارے مفاد پہ کسی قسم کی زد ہی نہیں پڑتی۔ وہ بھی اسی طرح سے مذہبی پیشوائیت میں کعبے کے بھی متولی چلے آتے تھے' بڑی بڑی تجارتوں کے مالک چلے آتے تھے۔ ہر قسم کی زمینداریاں اور جاگیرداریاں ان کے پاس موجود چلی آ رہی تھیں' جہاں بادشاہتیں تھیں وہاں ملوکیت چلی آ رہی تھی۔ یہ سب چیزیں چلی آ رہی تھیں۔ مذاہب موجود تھے' وہاں ساتھ ہی ایران جیسا ملک تھا جس کے اندر مذہبِ مجوسیت اپنے زمانے میں بڑے زور سے' بڑی شان سے تھا' سارے ایران کا مذہب تھا' وہاں ملوکیت موجود تھی۔ بازنطینی حکومت [1] جسے

---

[1] عرب کے مشرق میں خلیج فارس' جنوب میں بحیرۂ عرب اور مغرب میں بحیرۂ قلزم واقعہ ہے۔ اس اعتبار سے اسے جزیرہ نمائے عرب کہا جاتا ہے۔ اس کے شمال میں دریائے دجلہ اور فرات بہتے ہیں۔ ظہورِ اسلام کے وقت' خلیج فارس کے اُس پار مجوسیوں کی قدیم اور عظیم سلطنت (ایران) تھی اور شمال میں عیسائیوں کی وسیع مملکت (بازنطین)۔ رومن امپائر (مملکت روم) قدیم دنیا کی وسیع وعریض اور نہایت متمدن مملکت تھی۔ قیصر قسطنطین (Constantine) نے عیسائیت قبول کر کے' بازنطین کو اپنا دار الخلافہ بنایا جو قسطنطنیہ کے نام سے مشہور ہوا۔ چوتھی صدی عیسوی میں' سلطنت روما دو حصوں میں بٹ گئی تو مغربی حصے کا دار الخلافہ روم (Rome) قرار پایا اور مشرقی حصے کا قسطنطنیہ۔ اس مشرقی مملکت کو بازنطینی حکومت بھی کہتے ہیں اور اِسی سے مسلمانوں کو واسطہ پڑا تھا۔ ویسے مورخین کبھی انہیں رومی کہہ دیتے ہیں اور کبھی بازنطینی۔ بعثتِ نبوی کے زمانے میں ہرقل' بازنطینی مملکت کا شاہنشاہ تھا۔ شام' فلسطین اور مصر وغیرہ کے علاقے سب اس کے زیرِ نگیں تھے۔ حدودِ شام پر قدیم عربی قبائل بستے تھے جنہوں نے مذہب عیسائیت اختیار کر لیا تھا۔ انہی قبائل کے رؤساء ہرقل کی طرف سے' ان علاقوں کے حکمران تھے۔ انہیں غسانی کہا جاتا تھا۔ مسلمانون کے جس قدر تصادمات

[باقی اگلے صفحے پر]

آپ کے ہاں رومن ایمپائر کہتے ہیں' موجود تھی' وہاں عیسائیت اتنے زوروں پہ تھی کہ خود بادشاہ نے بھی عیسائیت اختیار کی ہوئی تھی' عیسائیت تو اس قدر پرورش پا رہی تھی' ملوکیت وہاں موجود تھی۔ ہندوستان جیسا مذہب پرست طبقہ جو آج بھی دنیا کے جدید ترین مذہب پرست طبقوں میں شمار ہوتا ہے وہاں موجود تھا' وہاں بھی اسی قسم کی ملوکیت تھی' وہی راجے' وہی مہاراجے' وہی برہموں کی بادشاہتیں تھیں۔ یہ سارا کچھ وہاں موجود تھا' اس کے ساتھ مذہب بھی موجود تھا۔ مذہب کی موجودگی ان چیزوں پر کسی طرح بھی اثر انداز نہیں ہوتی اس لیے مفاد پرست لوگ مذہب کے خلاف کبھی نہیں اٹھتے۔ مگر یہاں تو ہر سُو قرآنِ کریم کی مخالفت تھی۔

مذہب کے خلاف مذہب نہیں لڑتا' مذہب ہمیشہ دین سے لڑتا ہے

عزیزانِ من! یہ صحیح ہے کہ مذہبی گروہ آپس میں لڑتے جھگڑتے رہتے ہیں مگر اس گروہ بندی سے مقصد صرف جنگی برتری ہوتا ہے۔ حقیقت میں اپنے اپنے متبعین کو اپنے ساتھ رکھنے کے لیے یہ بھی ضروری ہوتا ہے۔ بہرحال یہ ان کی آپس کی چپقلش ہوتی ہے۔ یہ چپقلش مفاد پرست گروہ کے خلاف نہیں ہوتی یا اس گروہ کا ان کے خلاف کوئی تصادم نہیں ہوتا۔ مذہب تو ان میں دخل ہی نہیں دیتا' بھلے لوٹتے رہو بلکہ یہ تو اِس مفاد پرست گروہ کے حق میں ہوتا ہے' اسکو تو تائید ملتی ہے۔ وہ لوٹتے چلے جاتے ہیں یہ ان کو تھپکیاں دے کر سلاتے چلے جاتے ہیں کہ کوئی بات نہیں ہے' دنیا چند روزہ ہے' ان کو کر لینے دو جو کچھ یہ کر رہے ہیں' یہ تو لاش ہے' دنیا مردار ہے' ان کو یہ مردار کا گوشت کھانے دو' آخرت تمہارے لیے ہے' جنت تمہارے لیے ہے' وہ ان کو تسلیاں دے دے کر سلاتے رہتے ہیں۔ یہ کچھ تو ان مفاد پرست گروہوں کے حق میں جاتا ہے۔ اس لیے ہر معاشرے میں' آپ دیکھیے' ہر حکومت میں آپ دیکھیے' مذہب کی ہمیشہ پرورش ہوتی ہے' حفاظت ہوتی ہے' تائید ہوتی ہے۔

[گزشتہ سے پیوستہ] ان علاقوں میں ہوئے' وہ بالواسطہ ہرقل کے ساتھ تھے کہ وہی اس سرزمین کا شاہنشاہ تھا' لیکن بلاواسطہ غسانی حکمرانوں سے ہوئے جو وہاں ہرقل کی نیابت کرتے تھے۔

ایران اور روم کی سلطنتوں کی باہمی آویزش کا سلسلہ تو ہمیشہ جاری رہتا تھا کہ دونوں برابر کی ٹکر کی طاقتیں تھیں لیکن عرب بیرونی مداخلت سے مامون تھا۔ اس بے برگ وگیاہ قطعۂ زمین کو لے کر کسی نے کیا کرنا تھا البتہ یمن کا علاقہ جو سرسبز وشاداب تھا' ان آویزشوں کی آماجگاہ بنا رہتا تھا۔ جہاں تک اندرونی نظم ونسق کا تعلق تھا' عرب کبھی ایک مملکت بنا ہی نہیں تھا۔ وہاں کی بیشتر آبادی خانہ بدوش قبائل پر مشتمل تھی۔ جن کا نظام بھی (سیدھا سادہ) قبائلی تھا۔ ان کی سب سے بڑی خصوصیت یہ تھی کہ یہ کبھی کسی کے محکوم نہیں ہوئے تھے۔ لیکن اس کے ساتھ ہی' سب سے بڑی کمزوری یہ تھی کہ یہ اجتماعی زندگی کے تصور تک سے ناآشنا تھے۔ اسلام نے نہ صرف انہیں اجتماعی زندگی سے آشنا کیا بلکہ پورے ملک کو ایک مملکت میں تبدیل کر دیا اور جب یہ ملک ایک مملکت کی شکل اختیار کر گیا تو ظاہر ہے کہ اس کا وجود ایران اور روم (بازنطین) دونوں کی نگاہوں میں کھٹکنے لگا۔ (ان مقامات کی مزید تشریح کے لیے دیکھیے: پرویزؒ: شاہکارِ رسالت......عمر فاروق رضی اللہ عنہ......ادارہ طلوعِ اسلام رجسٹرڈ' لاہور' 1987' ص ص۔ 167 - 163)۔

مذہب کے اندر انسانی تصورات و مصروفیات

عزیزانِ من! انگریز کے دورِ حکومت میں بھی اس نے جو آزادی دی تھی وہ صرف آزادی ہی نہیں تھی بلکہ مذہب کو حفاظت دی تھی۔ اسی طرح اگر آپ قرآن کی بھی ایک مذہبی کتاب کی طرح تلاوت کرتے رہیں اس کیلیے انتظام کرتے رہیں کہ یہ صحیح بھی چھپے گا اور اس کی بے حرمتی بھی نہیں ہوگی' کاغذ زمین پہ گرے گا تو دیوار میں رکھ دیا جائے گا' اس کے پڑھنے سے' ایک ایک آیت کے پڑھنے سے' اتنی نیکیوں کا ثواب ہوگا تو کوئی مفاد پرست گروہ اس میں دخیل نہیں ہوتا۔ اس طرح کرنے سے ان کا کچھ نہیں بگڑتا مگر جب آپ قرآن کا جو نظام ہے' اسے پیش کرتے ہیں تو اسے پھر کوئی بھی مفاد پرست گروہ برداشت نہیں کرتا۔ اگر آپ قرآن کو صرف ایک مذہبی کتاب کی حیثیت سے پیش کریں' یعنی جسے آپ فقہی مسائل کہتے ہیں اسے آپ وہیں تک محدود رکھیں' نظام کی حیثیت سے بات نہ کریں تو اس پہ بھی کوئی مخالفت نہیں کرتا۔

مولانا عبداللہ چکڑالوی کی غلط سوچ کا نتیجہ

میں کبھی کبھی ہمارے اپنے ہی دَور کی بات کیا کرتا ہوں۔ وہ بات ہی ایسی ہے جو مجھے چھیڑنی پڑتی ہے۔ یہاں ایک شخص' جنہیں مولانا عبداللہ چکڑالوی کہتے ہیں' کے ذہن میں یہ بات اٹھی کہ مذہب میں یہ غلط فقہی احکام اور غلط روایات ہیں۔ اِن غلط فقہی احکام وروایات نے اس مذہب کو بگاڑ رکھا ہے۔ صحیح طور پہ ان کے ذہن میں یہ بات آئی کہ قرآن سند ہونا چاہیے۔ لیکن قرآن کا نظام کی حیثیت سے ہونا ان کے ذہن میں بھی نہیں تھا۔ وہ قرآن سے فقہی احکام نکالنے لگے مثلاً کوا حلال ہے' طوطا حرام ہے' انڈا کھانا چاہیے یا نہیں کھانا چاہیے' رکعتیں پانچ نہیں' چار نہیں' دو ہیں۔ یعنی یہ احکام یا اسی قبیل کے احکام تھے جو وہ نکالنے لگے۔ آپ دیکھیں گے کہ حکومت نے اس کا کوئی نوٹس نہیں لیا' کسی مفاد پرست گروہ نے بھی اس کی مخالفت نہیں کی۔ مذہبی فرقوں کی طرف سے' جو ان کا ایک دوسرے کے ساتھ تقاضا ہوا کرتا تھا ان کے ساتھ کوئی تنازعہ ہوا اور وہ بھی یوں کہ مثلاً وہ اہلحدیث کی مسجد میں گئے' وہاں سے نکال دیئے گئے اور آج بھی نکال دیئے جاتے ہیں۔ وہ آج بھی اہلِ قرآن کے نام سے آپ کے ہاں بیٹھے ہوئے ہیں۔ کبھی اس پہ بھی ذرا غور کیجیے گا کہ اگر یہ جسے انکارِ حدیث کہا جاتا ہے' لیا جائے تو سب سے جدید ترین یہ گروہ ہے جسے آپ اہلِ قرآن کہتے ہیں۔ یہ کسی حکم کو بھی تسلیم نہیں کرتے لیکن یہیں سے یعنی قرآن کریم سے نئے نئے فقہی احکام نکال رہے ہیں۔ وہ قرآنِ کریم سے وہی' اسی قبیل کے' فقہی احکام نکال رہے ہیں کہ مثلاً کوا حرام ہے یا حلال ہے؟ یہ وہی مسائلِ نماز ہیں کہ چار رکعتیں ہیں یا دو رکعتیں ہیں' ایک رکعت میں ایک سجدہ ہے یا دو سجدے ہیں' رکوع میں یہ نہیں پڑھنا چاہیے یہ پڑھنا چاہیے' سجدے میں یہ نہیں پڑھنا چاہیے یہ کرنا چاہیے۔ یہ مسائل ہیں' جو وہ قرآن کریم سے نکال رہے ہیں۔ آپ نے یہ دیکھا کہ مفاد پرست گروہ ہو یا یہ گروہ ہو کوئی ان کی کہیں مخالفت نہیں کر رہا۔ یہ غور طلب چیز ہے کہ یہ طلوعِ اسلام تو اس حد تک جاتا ہی نہیں ہے' یہ کبھی بھی نماز کے اوقات میں' اسکی رکعتوں میں' اس کے سجدے میں' اس کے رکوع کے مسائل کو چھیڑتا ہی نہیں۔ یہ کہتا ہے کہ

جس طرح سے امت میں ہوتا چلا آ رہا ہے' سرِ دست اس کو ہونے دو' جب تک خلافت علیٰ منہاج رسالت قائم نہیں ہوتی' جب تک یہ قرآن کا نظام قائم نہیں ہوتا' ان مسائل میں نہ الجھو' اسے نہ چھیڑو۔ یہ ہے جو وہ کہتا ہے لیکن آپ دیکھیں کہ ہر جگہ اس کی مخالفت ہو رہی ہے۔ کبھی آپ نے غور کیا ہے کہ یہ کیا بات ہے۔ چلیے' یہ مذہب پرست طبقے' مختلف فقہ والے' مختلف روایات والے' ممکن ہے وہ یہ چیز کہیں کہ صاحب! یہ فقہ پہ بھی' روایت پہ بھی تنقید کرتے ہیں۔ یہ جتنے ملک کے اندر باقی مفاد پرست گروہ ہیں ہر ایک کی طرف سے مخالفت ہو رہی ہے۔ آپ کہیں جا کے بیٹھے' کہیں آپ طلوعِ اسلام کے نام کی صحیح بات کیجیے وہ کہتا ہے صاحب! اسے چھوڑ دیجیے۔ ❶ کوئی اس کا پرچہ اٹھانے کیلیے تیار نہیں' دیکھنے کیلیے تیار نہیں' کسی کے ہاتھ میں نظر آ جاتا ہے تو اسے کہتے ہیں کہ اچھا اچھا آپ بھی پرویزی ہو گئے۔ کبھی غور کیجیے کہ یہ پرویزی ہو جانا کیا چیز ہے؟ یہ کیوں ہے کہ وہ اتنا بڑا فرقہ ❷ یعنی اتنا متشدد فرقہ کہ جو ان کے ہاں کے ہر فقہی حکم کی مخالفت کر رہا ہے اور کہتا ہے کہ یہ غلط ہے' اپنے نئے فقہی احکام دے رہا ہے' وہ بیٹھا ہوا الگ نماز پڑھ رہا ہے' الگ جمعہ پڑھ رہا ہے' حرمِ کعبہ کے اندر جا کے بھی ان کے ساتھ نماز نہیں پڑھ سکتا' مذاہب سے اتنا بڑا اختلاف ہے' ان کے خلاف بھی کبھی کسی دفتر میں' کسی ورکشاپ میں' بازار میں' کسی جگہ' کسی کے ساتھ ملتے ہوئے آپ نے آواز سنی ہے۔ آپ نے کبھی اس کا نام نہیں سنا ہوگا۔

آخر طلوعِ اسلام کی ہی مخالفت کیوں؟

خود یہ جو ہمارے ہاں کے اہلِ مذہب کے مختلف فرقے ہیں' ان کے ہاں بھی کبھی اس قسم کی بات نہیں سنی ہوگی۔ ہر جگہ طلوعِ اسلام کی کیوں مخالفت ہوتی ہے؟ یہ وہی مخالفت ہے جس کا ذکر قرآن کرتا ہے کہ صدرِ اول ❸ میں جب یہ پیش کیا گیا تھا تو اس کی مخالفت مذہب پرست طبقے کی طرف سے تو ہونی تھی کہ وہ پیشوائیت چلی آ رہی تھی' ہر مفاد پرست طبقے کی طرف سے مخالفت ہوئی۔ اس لیے کہ یہ طلوعِ اسلام قرآن کو دین کی حیثیت سے پیش کر رہا ہے' قرآن کا جو نظام ہے یہ اسے پیش کر رہا ہے اور یہ وہ نظام ہے جو موت کا پیغام ہے ہر نوعِ غلامی کیلیے۔ اور اس میں یہ کسی کے ساتھ Compromise (مصالحت) کرنے کیلیے تیار نہیں کہ قرآنِ کریم میں یہ موجود ہے کہ وہ

---

❶ ماہنامہ طلوعِ اسلام کا پہلا شمارہ 8/اپریل 1938ء کو شائع ہوا تھا لیکن انتظامی سہولت کی خاطر اسے ماہ مئی کا پرچہ قرار دیا گیا تھا۔ اس کے پیش لفظ اور افتتاحیہ سے اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ حضرت علامہ اقبالؒ (1877-1938) کی ذاتِ گرامی اور حضرت قائداعظم محمد علی جناحؒ (1876-1948) کے ساتھ اس کے کیا معنوی تعلقات وابستہ تھے۔ اس کے اغراض و مقاصد ہندوستان کی سیاسی اور اجتماعی کشاکش میں ''اسلامی رائے'' کی ترجمانی تھا۔ اس کے پہلے شمارہ میں محترم پرویزؒ (1903 - 1985) کے دو مضامین بہ عنوان ''دینِ فطرت'' اور ''نظریہ قومیت'' شائع ہوئے تھے۔ (محمد اسلام: تحریک پاکستان اور پرویزؒ' طلوع اسلام (ٹرسٹ) لاہور' (اس پمفلٹ پر سالِ اشاعت درج نہیں ہے)' ص-6۔

❷ یہ اشارہ فرقہ اہل قرآن کی طرف ہے۔

❸ پاکستان بننے سے قبل کا دور (1937ء تا 1938ء)

لوگ رسول اللہ ﷺ سے آ کے کہتے تھے کہ اس قرآن کی جگہ کوئی دوسرا قرآن لے آؤ' یہ نہیں کر سکتے تو اس میں کچھ تبدیلی کر لو یعنی Compromise (مصالحت) کیلیے وہ آ رہے تھے اور حضور ﷺ اس کے جواب میں یا قرآن اس کے جواب میں یہ کہتا تھا کہ میں اسمیں کوئی تبدیلی نہیں کر سکتا' یہ میری کتاب نہیں یہ تو خدا کی نازل کردہ کتاب ہے' میں اس میں کیسے تبدیلی کر دوں؟ کیسے میں تمہارے ساتھ Compromise (مصالحت) کر لوں؟

علامہ اقبال رحمۃ اللہ علیہ کی فکر کے برعکس مولانا حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا ابوالکلام آزادؒ کی سوچ

عزیزانِ من! آپ کو وہ معرکہ دین و وطن یاد ہوگا جو وطنیت کے نام پر علامہ ڈاکٹر محمد اقبالؒ (1877-38) اور مولانا حسین احمد مدنی مرحوم (1879-1957) کے درمیان ہوا تھا۔ حضرتِ علامہ رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے جواب میں یہ چیز لکھی تھی کہ اسلام دین کی حیثیت سے اپنے اصولوں میں کوئی لچک نہیں رکھتا اور پھر اس پہ مولانا حسین احمد مرحوم نے پھبتیاں اڑائیں اور طنز کیے ہیں کہ لو' کہتے ہیں کہ اسلام اپنے اندر لچک ہی نہیں رکھتا۔ ان کے ہاں تو لچک کی کیفیت مولانا ابوالکلام آزاد ❶ (1888-1958) کی سی تھی کہ ایسی لچک دیتے دیتے انہوں نے وہ ختم ہی کر دی' اِس کی وہ لکڑی ہی ختم کر دی اور کہہ دیا کہ عالمگیر سچائیاں تمام مذاہب میں یکساں طور پہ پائی جاتی ہیں۔ چلو' بھئی! چھٹی ہوئی۔ وہ جو وہاں موہن داس گاندھی جی (1948 -1869) ❷ کی تعلیمی اسکیم تھی۔ جسے ذاکر حسین مرحوم نے مرتب کیا تھا اور گاندھی جی

---

❶ اِن کا اصل نام احمد محی الدین تھا۔ انہوں نے ابوالکلام آزاد کے نام سے شہرت پائی۔

❷ تاریخ عالم کے زمانۂ قدیم پر نگاہ ڈالیے تو آپ کو نظر آئے گا کہ قوت وسطوت کی مالک قومیں دوسری قوموں کو تباہ و برباد کرنے کے لیے قتل و غارت گری اور کشت و خون کے کیا کیا طریقے اختیار کرتی ہیں۔ چنگیز و ہلاکو کی خونچکاں داستانیں صفحاتِ تاریخ پر خون کے حروف سے لکھی ملتی ہیں۔ فرعون و نمرودٗ شداد و ہامان کے جور و استبداد کے واقعات پڑھنے والے کی روح میں کپکپی پیدا کر دیتے ہیں۔ یہ دورِ جہالت تھا۔ اعلانیہ سبعیت و بربریت کا زمانہ تھا۔ عصرِ حاضر کا مہذب انسان اس دورِ وحشت کو سخت نفرت و حقارت کی نگاہ سے دیکھتا ہے اور اپنے زمانہ کو خدا کی رحمتوں اور برکتوں کا زمانہ سمجھتا ہے کہ جس میں قتل و خون ریزی کی وہ داستانیں نہیں دھرائی جاتیں جس میں اسے انسانیت تڑپتی پھڑکتی نظر آئے۔ لیکن وہ لوگ جو حقائقِ اشیاء کو گہری نظر سے دیکھتے ہیں ان پر یہ حقیقت بے نقاب ہو جاتی ہے کہ عصر حاضر کا مہذب انسان بھی دوسروں کی ہلاکت اور بربادی میں عہد جاہلیت کے وحشی انسان سے کسی حالت میں کم نہیں۔ فرق صرف اتنا ہے کہ وہ عہدِ جاہلیت تھا جس میں انسان نے ابھی یہ نہ سیکھا تھا کہ اپنی ستم کوشیوں اور ظلم رانیوں کو کس طرح اصلاح و بہبود کے خوش آئند نقاب اوڑھائے۔ وہ جو کچھ کرتا تھا کھلم کھلا کرتا تھا۔ بتا کر' جتا کر' دکھا کر' کرتا تھا۔ لیکن آج انسان علم و حکمت میں بہت ترقی کر چکا ہے۔ آج اسی طرح کھلم کھلا ہوسِ خون آشامی کو پورا کرنا حماقت سمجھا جاتا ہے۔ آج سب سے زیادہ مدبر' سب سے زیادہ ہوشیار' وہ ہے جو دوسروں کا خون اس انداز سے پی جائے کہ اس کا دھبہ تک نظر نہ آئے۔ وہ ناصح و مصلح کے معصوم لباس میں قوم کی قوم کو تباہ کر جائے۔ دریں حالت کہ لٹنے والوں کو پتہ ہی نہ چلے کہ ہمارے ساتھ کیا ہو رہا ہے۔ وہ دورِ جہالت کا وحشی اور ظالم انسان آج تک بدنام چلا آتا ہے کہ جس کی طغیانیوں کو اندھے بھی دیکھتے ہیں اور جس کی شور انگیزیوں کو بہرے بھی سنتے ہیں لیکن دورِ حاضر کے مہذب انسان کی ابلیسانہ چالیں ایک پُرسکوت دریا کی مانند ہیں کہ جس کی روانیوں میں شور ہے' [باقی اگلے صفحے پر]

کے نام سے آگے چل رہی تھی' اُس کے تعلیمی نصاب میں اسلام بحیثیت مذہب موجود تھا۔ اقبالؒ نے اس تعلیمی اسکیم کی سخت مخالفت کی تھی۔

عزیزانِ من! آپ نے دیکھا کہ دین اور مذہب میں کیا فرق ہوتا ہے۔ اب قرآن کی مذہب کی سطح پر جتنی بھی چاہے اشاعت کیجیے اسے جتنا بھی اول رکھیے مگر اس کا استعمال صرف ثواب ہی کیلیے یا مردے کی جان نہ نکلتی ہو تو اسے یٰسین سنانے کیلیے رکھیے اور یا پھر اس سے کوئی اور مذہب کی چیز لینی ہو مثلاً فقہی احکام اس سے لیتے چلے جایئے' وراثت کے احکام لے لیجیے' طلاق نکاح کے' عدت مہر کے' فقہی احکام لے لیجیے۔ یہ کچھ لیتے چلیے' کوئی اس میں مداخلت نہیں کرے گا' ان معاملوں میں مذہبی فرقے آپس میں ایک دوسرے کے ساتھ جھگڑیں گے مگر کوئی مفاد پرست گروہ اس میں دخیل ہی نہیں ہوگا لیکن جونہی آپ نے قرآن کو دین کی حیثیت سے' ایک نظامِ زندگی کی حیثیت سے' پیش کیا تو پھر ہر نظام کی طرف سے اس کی مخالفت ہوگی کیونکہ یہ اس نظام کے سوا ہر نظام کو باطل قرار دیتا ہے۔

باطل کا قرآنی مفہوم

عزیزانِ من! یہاں سوال یہ ہے کہ باطل کے کیا معنی ہیں؟ وہ کہتا ہے کہ ہر نظام نوعِ انسانی کے کسی نہ کسی طبقے کا استحصال کرتا ہے' Exploit کرتا ہے' محکوم بناتا ہے' اس کی کمائی کو نچوڑتا ہے اس لیے جب قرآن کو بحیثیت نظام کے پیش کیا جائے گا تو ہر نظام اس کی مخالفت کرے گا۔ یہاں' اس آیت (22:72) میں یہ کہا کہ جب قرآن کی آیات ان کے سامنے پیش کی جاتی ہیں تو ان کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ سینے میں دبے ہوئے بغض' عناد' اور انتقام کی آگ بھڑک کر سامنے آجاتی ہے اور نظر آتا ہے کہ بس ابھی کچھ ہوا۔ ❶ قرآن نے

[گزشتہ سے پیوستہ] نہ تموج' لیکن سطح آب کے نیچے ایسے ایسے خوفناک مگرمچھ چھپے چلے آتے ہیں کہ قوم کی قوم کو نگل جائیں لیکن نہ دیکھنے والی آنکھیں دیکھ سکیں اور نہ سننے والے کان سن سکیں اس پُرسکوت طریق تخریب اور آتشِ خاموش میں سب سے بڑا حصہ تعلیم کو حاصل ہے۔ آپ جس قوم کو تباہ و برباد کرنا چاہیں' نہایت خاموشی سے اس کے طریق تعلیم کو بدل دیجیے' وہ رفتہ رفتہ غیر محسوس طور پر ہلاکت و بربادی کے عمیق و مہیب غاروں میں کھنچی چلی جائے گی اور اُسے اس وقت پتہ چلے گا جب وہ موت کی ہچکیاں لے رہی ہوگی۔

تعلیم کی یہ اہمیت ہندو قوم کے سب سے بڑے راہنما موہن داس گاندھی (1948-1869) کے پیشِ نظر تھی۔ اس نے محسوس کیا کہ مسلمانوں کی آئندہ نسلوں پر حکومت کرنا ممکن نہ ہوگا' جب تک ان کے ذہنی تصورات کو نہ بدل دیا جائے اور اس کی آسان ترین شکل یہ ہے کہ ان کے نصاب (Curriculum) کو بدل دیا جائے۔ چنانچہ اس مقصد کے پیشِ نظر ایک تعلیمی کمیٹی تشکیل ہوئی جس نے شروع 1938ء میں اپنی رپورٹ پیش کی۔ اس اسکیم کا نام ''واردھا کی تعلیمی اسکیم'' تھا۔ یہ ڈاکٹر ذاکر حسین نے تیار کی تھی۔ اس کا مقصد بچوں میں ''متحدہ ہندوستانی قومیت'' کی تعمیر تھا۔ یہ مسلمانوں کو ''شدھی'' کرنے کی اسکیم تھی اور اس میں ایسے ایسے زہریلے نشتر چھپا رکھے تھے کہ اگر یہ خدانکردہ کہیں مسلمانوں میں رائج ہو جاتی تو یہ نشتر ان کی آئندہ نسلوں کے رگِ جان میں پیوست ہو جاتے۔ اگست 1938ء کے طلوعِ اسلام میں اس دامِ ہمرنگ زمین کا محترم پرویزؒ (1985 -1903) نے اس وضاحت سے اس کا تجزیہ پیش کیا کہ ہندو کی خفیہ تدبیریں سب برباد ہو گئیں۔

❶ یہاں قرآنِ کریم نے يَسْطُوْنَ (22:72) کا لفظ استعمال کیا ہے۔ اس کا مادہ ''س ط و'' ہے۔ سَطَا عَلَيْهِ وَبِهٖ سَطْوًا وَسَطْوَةً۔ [باقی اگلے صفحے پر]

خود بتایا ہے کہ ان لوگوں کی' اس کے خلاف' تنقید کیا ہے' اور تکنیک کیا ہوتی ہے۔ اب اس چیز کو سامنے رکھ کر آپ نے یہ سمجھ لیا کہ اس کی مخالفت کیوں ہوتی تھی۔

فکرِ قرآنی سے دُور رکھنے کی تکنیک: قرآن نہ سنو

عزیزانِ من! اب یہ باتیں سمجھ میں آئیں گی کہ یہ کیوں نہیں چاہتے تھے کہ قرآن کی آواز بلند ہو اور لوگوں کے کانوں میں پڑے۔ چنانچہ یہ نہیں چاہتے تھے کہ یہ تعلیم کسی طرح سے بھی عام ہو۔ لہٰذا جب یہ بات ان کی سمجھ میں آ جائے گی تو پھر یہ بھی سمجھ میں آ جائے گا کہ وہ اس کیلیے کیا تکنیک اختیار کرتے تھے۔ پہلی تکنیک تو وہی ہے جس میں کہا ہے کہ **وَقَالَ الَّذِيْنَ كَفَرُوْا لَا تَسْمَعُوْا لِهٰذَا الْقُرْاٰنِ وَالْغَوْا فِيْهِ** (41:26)۔ اور جو لوگ قانونِ خداوندی سے انکار اور سرکشی برتتے ہیں' وہ اپنے لوگوں کو تاکید کرتے رہتے ہیں کہ دیکھنا! تم کہیں قرآن کو نہ سن لینا (اس سے تمہارے عقائد خراب ہو جائیں گے) بلکہ جہاں دیکھو کہ کوئی شخص قرآن کی بات پیش کرتا ہے' وہاں شور مچادو' کائیں کائیں کرنے لگ جاؤ۔ آپ نے دیکھا کہ یہ چیز کتنی خطرناک تھی کہ قرآن کو کوئی نہ سنے۔ یہ فکرِ قرآن سے دُور رکھنے کی ایک مؤثر تکنیک تھی۔

جوق در جوق قاریوں کی آمد' سننے والوں کا شوق اور قرآن کی آواز کو دبانے کا طریق

عزیزانِ من! آگے بڑھیے۔ اب آپ کے ہاں کے یہ قاری جوق در جوق آتے ہیں تو غیر مسلم بھی ان کو سننے کیلیے بیٹھ جاتے ہیں۔ میں نے اپنے بچپن میں یہ دیکھا کہ ہماری مسجد میں تراویح میں ایک حافظ صاحب آیا کرتے تھے۔ یہ جہلم کے علاقے کے بڑے خوش الحان تھے اور ان کی آواز میں خاص جاذبیت ہوتی تھی۔ تراویح اور پھر ابتدائی دنوں کی تو کم از کم دو تین گھنٹے لے لیتی تھیں۔ وہ مسجد کے اندر تراویح میں قرآن پڑھا کرتے تھے۔ مسجد کے باہر' بند دکانوں پر جسے تھڑا کہتے ہیں' ہندو یہاں سے وہاں تک بیٹھے ہوئے ہوتے تھے' قرآن خاموشی سے سن رہے تھے۔ ویسے اب کہا جائے گا کہ صاحب! وہ سمجھ تو نہیں رہے تھے تو سن کیا رہے تھے۔ وہ تو ایک بات تھی' مسجد کے اندر کھڑے تھے وہ کونسا سمجھ رہے تھے۔ لیکن میں نے یہ کہا ہے کہ یہ جو اس طرح سے وہ سن لینا ہے یہ کوئی ایسی چیز نہیں ہے

[گزشتہ سے پیوستہ] کسی پر حملہ کرنا یا سخت گرفت کے ساتھ غلبہ حاصل کرنا۔ امام راغب اصفہانی نے اپنی مشہور تصنیف ''المفردات فی غریب القرآن'' میں لکھا ہے کہ کسی پر ہاتھ اٹھا کر حملہ کرنے کو سَطْوَةٌ کہتے ہیں۔ دراصل یہ سَطَا الْفَرَسُ سے ماخوذ ہے جس کے معنی ہیں گھوڑے کا اپنی اگلی ٹانگیں اٹھا کر پچھلی ٹانگوں پر کھڑے ہو جانا۔ یہاں اس آیت میں قرآنِ کریم میں ہے يَكَادُوْنَ يَسْطُوْنَ (22:72)۔ قریب ہے کہ وہ اُن پر حملہ کر دیں' ان پر دست درازی کریں۔ ابن فارس نے اپنی ''مقاییس اللغۃ'' میں لکھا ہے کہ اس کے بنیادی معنی قہر و غلبہ اور بلندی کے ہوتے ہیں۔ سَطَا الْمَاءُ کے معنی ہیں پانی بہت بڑھ گیا۔ (اس کی مزید تفصیل کے لیے دیکھیے: پرویزؒ: لغات القرآن (جلد دوم)' ادارہ طلوعِ اسلام' لاہور' 1960' ص۔ 874)۔

لیکن وہ ان لوگوں سے یہ کہتے تھے کہ دیکھنا! اس قرآن کو مت سننا۔ وہ یہ جانتے تھے کہ جو قرآن ہے اگر اسکی آواز کسی کے کان میں پڑ گئی اور اس نے یہ اتنی چیز سن لی کہ شودر، برہمن، کھشتری اور ویش کے سارے تفرقے ان بدبختوں نے خود ڈالے ہوئے ہیں جبکہ خدا کا حکم تو یہ ہے کہ ہر انسان پیدائش کے اعتبار سے یکساں واجب التکریم ہے، اگر اتنا سا ٹکڑا بھی ان میں سے کسی کے کان میں پڑ گیا تو وہ بغاوت کیلیے اٹھ کھڑا ہوگا۔ پہلی چیز یہ تھی کہ قرآن کو سنو ہی نہیں، خود تو سنو نہیں۔ اب یہ چیز ہے کہ صاحب! تم تو نہ سنو بھئی! اور لوگ تو سنیں گے۔ کہا کہ نہیں...... **وَ الْغَوْا فِيْهِ** (41:26)...... جہاں کہیں قرآن کی آواز بلند ہو، چیں چیں کر اٹھو۔ یہ **اَلْـلَّغَا** ہوتا ہے۔ یہ چڑیاں جس طرح سے بولتی ہیں اس طرح سے کائیں کائیں کرو کہ کوئی نہ سننے پائے۔ آج کے دور میں اس کو پروپیگنڈہ کہتے ہیں۔ اس کے خلاف ایسا پروپیگنڈہ کرو خود تو تم سنو نہیں اور ایسا پروپیگنڈہ کرو کہ کوئی اسے سننے نہ پائے۔ جونہی تم نے ذرا کسی سے کہا کہ طلوعِ اسلام تو انہوں نے کہا کہ نہ بھئی! اس سے ایمان چلا جاتا ہے۔ یہ ہے اس دور کا کائیں کائیں۔ اسے سنو نہیں، کسی اور کو سننے نہ دو۔ اب آگے وہ بات آتی ہے جس کے لیے سب کچھ کیا جاتا ہے۔ کہا **لَعَلَّكُمْ تَغْلِبُوْنَ** (41:26) اس طرح کچھ امید ہو سکتی ہے کہ تم ان لوگوں پر غالب آ سکو، ورنہ یہ نا ممکن ہے کہ لوگ قرآنِ کریم کی باتیں سنیں اور اس سے متاثر نہ ہوں۔

دنیا کی نوے فیصد آبادی کی سمجھ بوجھ

عزیزانِ من! یہاں کہا کہ بس یہ ایک طریقہ ہے کہ جس سے تم ان پہ غالب آ سکتے ہو ورنہ اگر قرآن تم نے سن لیا یا دوسروں کو سننے دیا تو پھر تم ان پر غالب نہیں آ سکتے۔ کیا بات ہے صاحب! یہ تو ایک ایسی موثر چیز تھی اور یہ بات بھی ٹھیک ہے۔ یہ Exploit (استحصال) کرنے والا طبقہ بہت تھوڑی تعداد میں ہوتا ہے۔ دنیا کے بیشتر آبادی، نوے فیصد سے بھی زیادہ، کچلی ہوئی آبادی ہوتی ہے۔ ان میں سے اگر کسی کے کان میں یہ آواز پڑ جائے کہ کسی کو حق حاصل نہیں ہے کہ دوسرے کی محنت کی کمائی پر آپ خوشگواری کی زندگی بسر کرے کہ کسی انسان کو حق حاصل نہیں کہ دوسرے انسان پر حکومت کرے، وہ حقِ حکومت صرف خدا کے احکام کو ہے، اگر یہ نیچے کا نوے فیصد سے بھی زیادہ جو طبقہ ہے، کہیں وہ کسی ملک میں ہو، کسی قوم میں، کسی ملوکیت کے تابع ہو اور اگر ان کے کان میں قرآن کی یہ آواز پڑ جائے تو اس کے باوجود بھی وہ اپنے اس باطل نظام کے خلاف بغاوت کے جذبات اپنے دل میں محسوس نہیں کرینگے۔ اس لیے ان کی تکنیک یہ تھی کہ خود مت سنو کہ تم بھی نہ کہیں اس کا اثر لے لو اور ایسا اندازِ طریق اختیار کرو کہ کوئی اور بھی اسے نہ سننے پائے۔ یہی چیز ہے جو چلی آ رہی ہے۔ قرآن کا نظام تو ان کے علی الرغم قائم ہوا کیونکہ اس نے کہہ دیا تھا کہ **لِيُظْهِرَهٗ عَلَى الدِّيْنِ كُلِّهٖ** (9:33)۔ یہ نظام تمام نظامہائے عالم پر غالب آئے گا۔ یہ غالب آئے گا اور بقیہ نظامہائے عالم ناکام رہیں گے لیکن اس کے بعد جب قرآنی نظام کے خلاف یہ سازشیں ہوئی ہیں اور جب یہ قرآن کا نظام مذہب میں بدل گیا تو اس کے بعد آپ دیکھیے گا کہ پھر قرآن کی مخالفتیں قطعاً نہیں رہیں۔ انہوں نے سمجھ لیا

کہ یہ غیر موثر ہوگیا ہے۔ پھر رہ گئی رسمِ اذاں کیونکہ انہیں پتہ تھا کہ روحِ بلالی نہیں رہی۔ نظام کی حیثیت سے یہ دین نہیں رہا' یہ قرآن نظام کا ضابطہ نہیں رہا' مذہب کی کتاب بن گیا اور مذہب کی کتاب کی حیثیت سے ہی تو ابوالکلام آزاد (1958-1888) نے کہا تھا کہ ''عالمگیر سچائیاں تمام مذاہب میں یکساں طور پہ پائی جاتی ہیں۔'' تو ٹھیک ہے مذہب کی کتاب ہے۔ گاندھی [1] شام کی پرارتھنا میں یہی کیا کرتا تھا وہ تورات' انجیل' مجوسیوں کی کتابیں' دساتیر' ہندوؤں کے ویداور آپ کے ہاں کا قرآن' یہ تمام چیزیں اس نے اکٹھی کر رکھی تھیں۔ اس اکٹھا کرنے سے اسے نقصان بھی کیا پہنچتا تھا۔

محمد علی جناح رحمۃ اللہ علیہ سے مخالفت کی وجہ

عزیزانِ من! دین اور مذہب کے اس الجھائے ہوئے دَور میں قرآن کی آواز بلند کرنے والا ایک محمد علی جناحؒ (1948-1876) اٹھا تھا پھر آپ نے دیکھا کہ کس طرح سے ساری دنیا اس اکیلے کے خلاف ہوگئی تھی۔ آپ کو معلوم ہے کہ تحریکِ پاکستان کے آخری دنوں میں جب اسے کامیابی ہو رہی تھی ہندوستان کے ہندوؤں کی طرف سے آواز بلند ہوئی تھی جس کے میں نے ریفرنسز دیئے ہیں۔ انہوں نے یہ کہا تھا کہ اگر جناحؒ اس پاکستان کو اسلامی مملکت بنانے کے دعوے سے باز آجائے تو ہم الگ مملکت بنانے کا جو اس کا مطالبہ ہے اس کی مخالفت نہیں کریں گے۔ یہ بیشک الگ مملکت بنالیں۔ وہ جو کہا جاتا ہے کہ ہندو تحریکِ پاکستان کی مخالفت کرتا تھا کیونکہ یہ ہماری ماتا بھومی کے ٹکڑے کر رہا ہے' یہ ساری چیزیں ختم ہوگئی تھیں۔ اصل چیز تو پھر زبان پہ آئی' جب بلی تھیلے سے باہر آئی۔ انہوں نے یہ چیز کہی۔ ان کے بڑے بڑے لیڈروں کی زبان سے یہ باتیں نکلی تھیں کہ اسلامی مملکت بنانے کا جو یہ دعویٰ کر رہا ہے اگر یہ اس سے باز آئے اور الگ مملکت بنانا چاہے تو ہم کوئی مخالفت نہیں کرتے بیشک الگ مملکت بنالیں۔ اب یہ اسلامی مملکت کیا تھی؟ یہ آپ کو معلوم ہے' انہیں معلوم تھا کہ اسلام کے دعویدار تو ان کے ہاں کے نیشنلسٹ علما بھی تھے۔ یہ سارے بڑے بڑے علماء ان کے ساتھ تھے' انہیں کوئی خطرہ ہی محسوس نہیں ہوتا تھا۔ یہ بھی تو مذہب پرست طبقہ تھا اور اِدھر کے مسٹروں سے تو زیادہ مذہب پرست طبقہ تھا۔ تو سوال یہ ہے کہ اس مذہب پرست طبقے سے ان کو کیوں کوئی خطرہ محسوس نہیں ہو رہا تھا؟ اِدھر یہ محمد علی جناحؒ جو مملکت بنانا چاہتا تھا' اس کے متعلق وہ کیوں کہتے تھے کہ اسلامی مملکت نہ بناؤ' صرف مملکت بناؤ تو پتہ لگا کہ وہ جو وہاں کا مذہب پرست طبقہ تھا' وہ جانتے تھے کہ یہ مذہب کچھ اور چیز ہے' یہ خطرناک بات نہیں ہے اور جسے یہ اسلامی مملکت کہتا ہے' یہ بڑے خطرے کی موجب ہے کیونکہ یہ ''موت کا پیغام ہر نوعِ آبادی کیلیے ہے۔'' وہ جانتے تھے کہ اگر صحیح معنی میں اسلامی نظام کبھی کہیں اتنے سے ٹکڑے کے اندر بھی قائم ہوگیا تو ہندوستان کی کم از کم ساٹھ ستر فیصد غلامی کہ جنہیں انہوں نے ہزاروں برس سے کچل رکھا ہے اس نظام کی طرف لپک کر آجائے گی۔ انہیں وہ دَور معلوم تھا جس کے متعلق قرآن کریم نے کہا

---

[1] موہن داس گاندھی (1948 - 1869)

ہے کہ **یَدْخُلُوْنَ فِیْ دِیْنِ اللّٰہِ اَفْوَاجًا** (110:2)۔لوگ جوق در جوق اس نظام میں داخل ہوتے چلے جا رہے ہیں۔ یہاں بھی ایسا ہی ہوگا۔ یہ اسلامی نظام کیا تھا؟ آج بھی ہر جگہ اسلامی نظام' اسلامی نظام کہا جا رہا ہے۔ آپ کہیں گے کہ اگر یہ خطرہ تھا تو آج ہمارے ہاں کا یہ مذہب پرست طبقہ بھی تو اسلامی نظام کہہ رہا ہے۔ عزیزانِ من! یہ وہی اسلامی نظام ہے جسے وہاں کا نیشنلسٹ علماء اسلامی کہتا تھا۔ یہ صرف مذہبی آزادی تھی اِس کے برعکس وہ لوگ جانتے تھے کہ اسلامی کے معنی کیا ہیں۔

1941ء میں مسٹر منشی کو خدشہ

عزیزانِ من! آپ کو معلوم ہے کہ مسٹر منشی نیشنلسٹ ہندوؤں کا غالباً بمبئی کا بہت بڑا لیڈر تھا' اس کے بعد وہ صدر بھی رہا۔ اس نے 1941ء میں لدھیانے میں اکھنڈ بھارت کانفرنس کی صدارت کرتے ہوئے اپنی صدارتی تقریر میں یہ بات کہی تھی کہ ان لوگوں کو کچھ معلوم ہے کہ مسٹر جناح' جو تحریک لے کر اٹھا ہے' اُس تحریک کا مقصود و مطلوب و منتہی کیا ہے' یہ کیا چیز چاہتا ہے؟ اس (مسٹر منشی) نے اس زمانے میں یہ کہا تھا کہ اس سے مقصد یہ ہے کہ ان علاقوں میں ایک ایسی مملکت قائم ہو جائے' سنیئے عزیزانِ من! ایسی مملکت قائم ہو جائے' جس میں قرآنی نظام نافذ ❶ ہو۔ وہ (یعنی مسٹر منشی) یہ چیز کہہ رہا تھا اور لدھیانہ میں منعقدہ اکھنڈ بھارت کانفرنس کے اس خطبے میں اس نے یہ کہا تھا کہ تمہیں کچھ معلوم بھی ہے کہ پاکستان ہے کیا؟ پھر اس قرآنی نظام کے تابع کیا ہوگا؟ 1941ء میں اِس ایک ہندو لیڈر کو معلوم تھا کہ یہ جس کا نام اسلامی مملکت لیا جا رہا ہے اس سے مقصد قرآن کا نظام نافذ کرنا ہے اور یہ کچھ ہندو لیڈر کو معلوم تھا اور وہ اپنے ہاں کے لوگوں کو کس خطرے سے محفوظ رکھنے کیلیے جگہ جگہ جا کر وارننگ دے رہا تھا۔ اس لیڈر نے کہاں سے یہ بات لی تھی؟ اس تحریک کے داعی مسٹر جناحؒ سے۔ اور مسٹر جناحؒ یہ چیز جگہ جگہ' ایک ایک جلسے میں' ایک ایک میٹنگ میں' ایک ایک تقریر میں کہتے ہیں' کہ یاد رکھو! اسلامی حکومت' قرآنی اصولوں اور احکام کی حکمرانی ہے۔ اس میں اطاعت اور وفا کیشی کا مرجع خدا کی ذات ہے' جس کی تعمیل کا واحد ذریعہ قرآن مجید کے احکام اور اصول ہیں۔ وہ جوان کا انٹرویو حیدر آباد دکن کا 1941ء کا ہے' اس میں انہوں نے یہ کہا ہے۔ تو جیسا میں بار

---

❶ 1941ء میں اکھنڈ بھارت کانفرنس منعقدہ اجلاس لدھیانہ میں مسٹر منشی کے خطبہ صدارت کے اپنے الفاظ یہ تھے: ''تمہیں کچھ معلوم بھی ہے کہ پاکستان ہے کیا؟ نہیں معلوم تو سن لیجیے کہ پاکستان سے مفہوم یہ ہے کہ مسلمانوں کو اس کا حق حاصل ہے کہ وہ ملک کے ایک یا ایک سے زیادہ علاقوں میں اپنے لیے ایسے مسکن بنائیں جہاں طرز حکومت قرآنی اصولوں کے ڈھانچے میں ڈھل سکے اور جہاں اردو ان کی قومی زبان بن سکے۔ مختصر یوں سمجھیے کہ پاکستان مسلمانوں کا ایک ایسا خطہ ارض ہوگا جہاں اسلامی حکومت قائم ہوگی۔ (ٹریبیون 1941-11-02) اسی کے دیگر حوالہ جات

ا۔ عبدالقدیر کرنل (ر): دل دل پاکستان' میسرز اکمل قدیر اینڈ کو' 1998' ص۔190۔

۲۔ پرویز رحمۃ اللہ علیہ: اسلام کے مقابل اسلام (قائداعظم کے یوم پیدائش کی تقریب' منعقدہ 24 دسمبر 1982ء ادارہ طلوع اسلام' لاہور' ص8۔

۳۔ کیا قائداعظم پاکستان کو سیکولر سٹیٹ بنانا چاہتے تھے؟ ادارہ طلوعِ اسلام' لاہور' ص۔13۔

بار لکھ بھی چکا ہوں' کہہ بھی چکا ہوں اگر کبھی ہماری قسمت نے یاوری کی اور یہاں قرآن کے نظام کی طرف نگاہ آئی تو اسکے لیے یہ چند الفاظ ہیں کہ جو آپ کو ہر ایوانِ حکومت کے اوپر کندہ کر کے رکھنے پڑیں گے۔اس سے زیادہ جامع الفاظ میں نے کہیں کسی کی تحریر یا تقریر کے اندر نہیں دیکھے۔

قائداعظمؒ کے نزدیک اسلامی حکومت کی امتیازی خصوصیت

عزیزانِ من! جب قائداعظم نے حیدرآباد (دکن) میں عثمانیہ یونیورسٹی کے طلباء کو 1941ء میں انٹرویو دیا تو ان سے پوچھا گیا تھا کہ باقی نظامِ حکومت کے مقابلے میں اسلامی حکومت کی امتیازی اور منفرد خصوصیت کیا ہے؟ انہوں نے کہا کہ خصوصیت یہ ہے کہ اس حکومت میں خدا کے سوا کسی کی اطاعت جائز نہیں۔ ❶ لیکن وہ جناحؒ تھا اسے معلوم تھا کہ خدا کی اطاعت کے کیا کیا معنی نہیں پہنائے جاتے۔اس کے بعد اس نے کہا تھا کہ میں یہ بتادوں کہ اس میں کسی بادشاہ کی اطاعت نہیں' کسی پارلیمان کی اطاعت نہیں' کسی جمہوریت کی اطاعت نہیں' کسی فرد کی اطاعت نہیں' کسی ادارے کی اطاعت نہیں۔کہا کہ پھر وہ کیسے ہوگا؟ اس نے جواب میں کہا کہ خدا کی اطاعت ہوگی اور اس کا عملی ذریعہ خدا کی کتاب کے احکام کو عملاً نافذ کرنا ہے اور ان کا اگلا فقرہ یہ تھا کہ ہماری پابندی اور آزادی کی حدود خدا کی کتاب متعین کرتی ہے۔اس کے سوا کسی کو حق حاصل نہیں ہے کہ کوئی پابندی عائد کرے یا کسی پابندی کو توڑے۔یہ شخص 1941ء میں یہ کہہ رہا تھا اور یہ تھی وہ وارننگ جو ہندو لیڈر اپنی قوم کو دے رہے تھے اور یہ تھی وہ چیز جس پر آخر میں وہ یہ کہنے کیلیے آ گئے تھے کہ اگر یہ مسٹر جناحؒ اس مملکت کو اسلامی مملکت بنانے کے دعوے سے باز آ جائے' چھوڑ دے تو ہم اِس کی اس الگ مملکت بنانے کی مخالفت چھوڑ دیں گے۔ہم اس کی تائید کریں گے۔عزیزانِ من! یہ ہے قرآن! ہمیں کیا معلوم ہے کہ یہ قرآن کیا ہے؟ اس کا ابوجہل سے پوچھیے' ابولہب سے پوچھیے' قریشِ مکہ سے پوچھیے کہ سات سال تک اسی نوے لڑائیاں لڑیں' اپنے فرزندوں تک کو کٹوا دیا' سب کچھ کرا دیا اس بات کیلیے کہ کہیں

---

❶ جب وہ اگست 1941ء میں حیدرآباد (دکن) گئے تو عثمانیہ یونیورسٹی کے طالب علموں نے ان سے کچھ سوالات پوچھے۔ان میں سے ایک سوال یہ پوچھا گیا تھا کہ ''اسلامی حکومت کے تصور کی امتیازی خصوصیت کیا ہے؟'' انہوں نے فرمایا تھا: ''اسلامی حکومت کے تصور کا یہ امتیاز ہمیشہ پیش نظر رہنا چاہیے کہ اس میں اطاعت اور وفا کیشی کا مرجع خدا کی ذات ہے جس کی تعمیل کا واحد ذریعہ قرآن مجید کے اصول واحکام ہیں۔اسلام میں اصلاً نہ کسی بادشاہ کی اطاعت ہے نہ کسی پارلیمان کی' نہ کسی اور شخص یا ادارہ کی۔قرآنِ کریم کے احکام ہی سیاست یا معاشرت میں ہماری آزادی اور پابندی کے حدود متعین کرتے ہیں۔اسلامی حکومت دوسرے الفاظ میں قرآنی اصول اور احکام کی حکمرانی ہے اور حکمرانی کے لیے آپ کو علاقہ اور مملکت کی ضرورت ہے۔(حوالہ روزنامہ انقلاب' لاہور' مورخہ 8 فروری 1942)

(یہ اقتباس معماران پاکستان بتقریب یوم آزادی۔اگست 1976ء کے عنوان سے پرویزؒ کے خطاب سے لیا گیا ہے۔یہ خطاب ادارہ طلوع اسلام لاہور کی طرف سے چھپ کر منظر عام پر آیا تھا۔اس پر سال اشاعت درج نہیں ہے۔)

قرآن کا نظام نہ قائم ہو جائے' عیسائیت برداشت کی' یہودیت برداشت کی' مجوسیت برداشت کی۔ ان کے خلاف کچھ نہیں کہا۔ ان لوگوں کے اندر یہ لوگ بستے تھے' ان کے اندر اپنی عبادت کرتے تھے' پوجا پاٹ کرتے تھے' پرستش کرتے تھے' کبھی انہوں نے ان کی مداخلت نہیں کی۔ اس میں سب کچھ انہیں دیا لیکن قرآن کی آواز لے کے جو اٹھا ہے تو اِسے حرم کعبہ کے اندر کھڑے نہیں ہونے دیا گیا۔ اسی لیے قرآن کہتا ہے کہ يَكَادُونَ يَسْطُونَ بِالَّذِينَ يَتْلُونَ عَلَيْهِمْ ايٰتِنَا (22:72)۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ یہ ان لوگوں پر ہلہ بول دیں گے' جو ان کے سامنے ہمارا قانون پیش کرتے ہیں۔

مخالفت کی یہ شدت صرف رسول اکرم ﷺ تک محدود نہ تھی

عزیزانِ من! یہاں اس آیت میں جمع کا صیغہ آیا ہے۔ قرآن عجیب بات کہتا ہے۔ کہتا ہے کہ یہ ایک رسول تک کی ہی بات نہیں تھی کہ اسی کے ساتھ یہ کچھ ہوا۔ یہاں یہ کہا گیا ہے کہ جب اور جہاں بھی کوئی قرآن کی آوازِ خالص کو لے کر اٹھے گا' اس کے ساتھ یہی کچھ ہوگا' ان کی اس مخالفت کے متعلق قرآنِ کریم نے دوسرے مقام پہ کہا ہے۔ ریفرنس (72:18-19) نکال لیجیے بات تو پیچھے سے عجیب چلی آ رہی ہے کہ ان سے واضح طور پر کہہ دو کہ دین کی اصل و بنیاد یہ ہے کہ وَاَنَّ الْمَسٰجِدَ لِلّٰهِ فَلَا تَدْعُوْا مَعَ اللّٰهِ اَحَدًا (72:18)۔ اطاعت و فرماں پذیری صرف قوانین خداوندی کی ہو سکتی ہے۔ جھکنا صرف انہی قوانین کے سامنے چاہیے۔ اس کے ساتھ کسی اور کے قانون کو شامل نہیں کرنا چاہیے۔ کسی اور کی اطاعت اختیار نہیں کرنی چاہیے کہ مسجدیں اللہ کیلیے ہیں' اس میں اللہ کے سوا کسی کو نہ پکارو۔ بات یہاں ہوگئی کہ یہاں بت پرستی نہ کرو' کچھ اور چیز نہ ہو۔ مسجد کے معنی یہی لے لیے گئے۔ اس کے معنی قرآن سے پوچھیے اور یہ خود ہی ہمیں بتایا کرتے ہیں کہ مسجدِ نبوی ہمارے ہاں کی پارلیمان بھی تھی۔ سجدے [1] کے معنی ہی ''اطاعتِ خداوندی'' ہیں اور مسجد وہ مقام

---

[1] تاج العروس میں لکھا ہے کہ سَجَدَ الْبَعِيْرُ کے معنی ہیں اونٹ نے اپنا سر جھکا دیا تا کہ سوار اس پر بیٹھ جائے۔ اس مادہ کے معنی طبعی طور پر (Physically) انسان کے سر (یا کسی اور چیز) کے جھک جانے کے ہیں۔ لیکن انسانی جسم کی حرکات و سکنات کے پیچھے ایک فلسفہ کارفرما ہے جسے دورِ حاضر کی علمی اصطلاح میں متوازیت یا Parallelism کہتے ہیں۔ جس طرح سجدہ سے مراد صرف سر کو زمین پر رکھنا نہیں بلکہ اس سے مفہوم قوانینِ خداوندی کے سامنے سر جھکا دینا بھی ہے۔ اسی طرح مسجد سے مراد بھی بالخصوص وہ عمارت نہیں جس میں نماز ادا کی جائے۔ اس سے مراد وہ مقام ہے جو اس نظام کا مرکز ہو جس کی رو سے قوانین خداوندی کی اطاعت کی یا کرائی جائے۔ کعبے کو جو مسجد الحرام (48:27) کہا گیا ہے تو اس جہت سے نہیں کہ وہ ایسی عمارت ہے جس میں سجدہ کیا جاتا ہے بلکہ اس کے لیے وہ خدا کے نظامِ توحید کا مرکز ہے۔ وہ اس امت کا مرکز محسوس ہے جس کی خصوصیت مُسْلِمَةً لَّكَ (2:128) بتائی گئی ہے۔ یعنی قوانینِ خداوندی کے سامنے جھکنے والی۔ ان معانی سے یہ حقیقت سامنے آتی ہے کہ مسجد کی عمارت بھی صرف نماز پڑھنے کے کام کے لیے مخصوص نہیں۔ اس میں اسلامی مملکت کے مختلف امور سرانجام دیئے جا سکتے ہیں۔ اصل میں قرآنِ کریم کی رو سے ''عبادت'' اور عام دنیوی امور میں فرق ہی نہیں کیا جا سکتا۔ عبادت کے معنی اطاعت کے ہیں اور دنیا کا کوئی کام جو قوانینِ خداوندی کے مطابق کیا جائے عبادت ہو جاتا ہے۔ اجتماعاتِ صلوٰۃ بھی چونکہ قانونِ خداوندی کی اطاعت ہے اس لیے وہ بھی عبادت ہے۔ ''عبادت'' کے لیے کسی ایسے الگ مکان کی ضرورت نہیں جس میں اور کچھ نہ کیا جا سکے۔ (مزید تشریح کے لیے دیکھیے: پرویزؒ: لغات القرآن (جلد دوم)' ادارہ طلوع اسلام لاہور' 1960' ص ص۔ 851-844)۔

ہے جہاں اطاعت خداوندی کے متعلق گفتگو کی جائے' مشاورت کی جائے۔ یہ چیز قرآن میں ہے۔ جہاں کہا ہے کہ **اَمۡرُهُمۡ شُوۡرٰى بَيۡنَهُمۡ** (42:38)۔ تمام امور کے فیصلے' قوانین خداوندی کی حدود میں رہتے ہوئے' باہمی مشاورت سے ہونے چاہییں' وہاں اس کے پہلے یہ الفاظ آئے ہیں کہ **وَالَّذِيۡنَ اسۡتَجَابُوۡا لِرَبِّهِمۡ وَاَقَامُوا الصَّلٰوةَ** (42:38)۔ یہ وہ لوگ ہیں جو خدا کے نظامِ ربوبیت کی دعوت پر لبیک کہتے ہوئے آگے بڑھتے ہیں' اُس کے قوانین کی اطاعت کرتے ہیں' نظامِ صلوٰۃ پر کاربند رہتے ہیں جو انہیں یہ سکھاتا ہے کہ ''تمام امور کے فیصلے باہمی مشاورت سے ہونے چاہییں۔'' اس کا ذریعہ یہ مسجد ہوگی تو یہ صرف نماز پڑھنے کیلیے ہی نہیں ہوگی۔ جب دین یہ مذہب بن گیا تو یہ اس وقت کی خصوصیت یا اصطلاح بن گئی' ورنہ ہر وہ مقام جہاں خدا کی اطاعت کے متعلق گفتگو ہوگی' غور و فکر ہوگا' تدبر ہوگا' قانون بنیں گے' آئین بنیں گے' جہاں بھی یہ چیز ہوگی' وہ مسجد کہلائے گی۔ اس لیے کہ اس کا مقصد اسلامی مملکت کے مختلف امور سرانجام دینا ہے۔ خدا کے حضور سجدے کے معنی اطاعت ہیں۔ وہاں خدا کی اطاعت کے متعلق گفتگو ہوگی اور یہاں پہلے یہ بات کہی کہ اس میں خالص اللہ کی اطاعت کی بات ہونی چاہیے۔ اس لیے کہا کہ **فَلَا تَدۡعُوۡا مَعَ اللّٰهِ اَحَدًا** (72:18)۔ اس میں کسی قسم کی آمیزش نہیں ہونی چاہیے کہ کچھ وہاں سے لیا اور کچھ اِدھر سے لیا۔ اسے تو قرآن شرک قرار دیتا ہے۔ یہ جو مختلف قسم کے نظاموں کو ملا کے ایک ملغوبہ بنایا جاتا ہے قرآن اسے بدترین ہیئت قرار دیتا ہے۔ وہ کہتا ہے! اوکم بختو! اگر اسلام خالص نہیں تو کفرِ خالص ہی رکھو اور اس آیت سے آگے ہے کہ ان لوگوں کی حالت یہ ہے کہ خود خدا کے قوانین کے سامنے جھکنا تو ایک طرف **وَاَنَّهٗ لَمَّا قَامَ عَبۡدُ اللّٰهِ يَدۡعُوۡهُ كَادُوۡا يَكُوۡنُوۡنَ عَلَيۡهِ لِبَدًا** (72:19)۔ جب خدا کا ایک بندہ (رسول اللہ) اس دعوت کو لے کر اٹھا تو یہ لوگ مخالفتوں کے ہجوم کے ساتھ اس پر یوں امنڈ پڑے گویا اسے کچل ہی ڈالیں گے۔

ہمارے ہاں کے غلط تراجم

عزیزانِ من! ہمارے ہاں اس آیت کا ترجمہ کیا جاتا ہے کہ جب اللہ کا بندہ یعنی رسول اللہ ﷺ نماز کیلیے کھڑے ہوتے تھے تو یہ اس پر حملہ آور ہو جاتے تھے۔ میں نے عرض کیا ہے کہ یہ جسے آپ صرف نماز یا پرستش کہتے ہیں' خود ان قریش کے ہاں بھی تھی۔ یہ دوسرے جتنے بھی غیر مذاہب تھے' وہ اپنے اپنے طور پر پرستش کرتے تھے' اپنے طور پر نمازیں پڑھتے تھے اور مجوسیوں کے ہاں تو نماز کہتے ہی عبادت کو ہیں۔ یہ تو ان کی زبان کا لفظ ہے۔ انہوں نے کبھی اس میں مداخلت نہیں کی' اس میں کبھی کوئی تعرض نہیں کیا' پھر یہ کیا بات تھی کہ جب آپ ﷺ نماز کے لیے کھڑے ہوں تو وہ چاروں طرف سے جھپٹ پڑتے تھے؟ یہ کون سی نماز تھی؟

حضرتِ شعیب علیہ السلام کی صلوٰۃ

عزیزانِ من! یہ تو وہ صلوٰۃ تھی جو حضرتِ شعیبؑ کے ضمن میں قرآن نے کہا ہے۔ کہا یہ ہے کہ جب انہوں نے ان لوگوں سے' اپنی

قوم سے کہا جوان کی بڑی مخالفت کرتی تھی تو انہوں نے کہا کہ اچھی بات ہے جی! ہم آپ کو اس صلوٰۃ کی جسے Worship یعنی پرستش، پوجا پاٹ کہا جاتا ہے، کی اجازت دیتے ہیں۔ٹھیک ہے صلوٰۃ کا لفظ قرآن میں آیا ہے۔اس کے بعد جب انہوں نے وہ صلوٰۃ قائم کی تو یہ قوم ان پہ اکٹھی ہو کے آ گئی۔ کہنے لگی کہ شعیب! یہ کیا کرتے ہو؟ وہ کہنے لگے کہ میں صلوٰۃ قائم کر رہا ہوں۔ان کی قوم کے افراد کہنے لگے:صلوٰۃ؟ یہ تمہاری صلوٰۃ کس قسم کی ہے؟ سنیے گا الفاظ عزیزانِ من! قرآن ان کے الفاظ بیان کر رہا ہے کہ **قَالُوۡا یٰشُعَیۡبُ اَصَلٰوتُکَ تَاۡمُرُکَ اَنۡ نَّتۡرُکَ مَا یَعۡبُدُ اٰبَآؤُنَاۤ اَوۡ اَنۡ نَّفۡعَلَ فِیۡۤ اَمۡوَالِنَا مَا نَشٰٓؤُا** (11:87) ''یہ کس قسم کی صلوٰۃ ہے جو ہمیں اس کی بھی اجازت نہیں دیتی کہ ہم اپنے مال کو بھی اپنی مرضی کے مطابق خرچ کریں۔عجیب صلوٰۃ ہے تمہاری!'' کیا بات ہے، قرآن کیسے بتاتا ہے کہ یہ اصطلاحیں ہیں اور دین میں ان کا یہ مفہوم کیا ہے۔حضرت شعیب علیہ السلام کی قوم کے وہ افراد کہتے ہیں: یہ کس قسم کی صلوٰۃ ہے؟ ہم تو یہ سمجھے تھے کہ ٹھیک ہے وہ سنکھا[1] بجاتے ہیں، وہ گھنٹا بجاتے ہیں، وہ کچھ ڈھولک بجاتے ہیں، وہ ہیمز (Hymns) گاتے ہیں، تم بھی اس قسم کا کچھ کر لیا کرو، ہمارا کیا بگڑتا ہے! لیکن تمہاری صلوٰۃ عجیب قسم کی ہے!! قرآن کے الفاظ ہیں کہ وہ کہنے لگے کہ یہ عجیب قسم کی صلوٰۃ ہے جو ہمیں اس کی بھی اجازت نہیں دیتی کہ ہم اپنے مال کو اپنی مرضی کے مطابق خرچ کر سکیں۔کہا کہ اس کی تو اجازت نہیں دی جا سکتی۔ٹھیک ہے، یہ صلوٰۃ ہے۔اب یہاں جو آیا ہے کہ جب ''عبداللہ''[2] اس دعوت کو لے کر اٹھا تو یہ اس پر امڈ پڑے گویا اسے کچل ہی ڈالیں گے۔یہ ''عبداللہ'' کیا ہے؟ قرآنِ کریم یہاں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم بھی کہہ سکتا تھا، خدا کا نبی بھی کہہ سکتا تھا، نام لے سکتا تھا مگر یہ عبداللہ یہاں خاص طور پہ کہا ہے یعنی وہ جو صرف خدا کی محکومیت اختیار کیے ہوئے تھا۔قرآن نے یہاں یہ لفظ استعمال کیا ہے: ''عبد'، وہ جو صرف خدا کی محکومیت اختیار کیے ہوئے تھا اور آگے لفظ ''یدعوہ'' آیا ہے۔یہ بات نہیں ہے کہ وہ جو نماز کے لیے کھڑا ہوتا تھا تو یہ لوگ اس طرح سے اس کی مخالفت کرتے تھے۔سوال یہ ہے کہ کاہے کیلیے یہ مخالفت تھی؟ کہا کہ **یَدۡعُوۡهُ** (72:19) وہ انہیں اس بات کی دعوت دیتا تھا کہ بھئی! صرف اس کی محکومیت اختیار کیجیے۔یہ دعوت دینے کیلیے، جب وہ کھڑا ہوتا تھا تو **کَادُوۡا یَکُوۡنُوۡنَ عَلَیۡهِ لِبَدًا** (72:19)۔نظر آتا تھا کہ وہ اسے جان سے ہی مار دیں گے۔عزیزانِ من! کوئی کم انقلاب آفریں دعوت نہیں تھی۔**یدعوہ** کسی اور کی محکومیت نہیں، صرف اسی کی محکومیت اختیار کرو۔''یدعوہ'' کی دعوت دینے والے سے بڑا باغی دنیا میں اور کون ہو سکتا ہے۔جہاں بھی کھڑا ہو کے یہ بات کہے گا، تو وہاں کوئی نہ کوئی نظامِ حکومت پہلے ہی ہوگا خواہ وہ قریش کا پنچائتی نظام ہی کیوں نہ ہو، کوئی تو نظام ہوگا۔ہر نظام کے متعلق یہ کہنا کہ اس کی اطاعت ناجائز ہے، اطاعت صرف خدا کے احکام کی ہوگی۔ان کے نزدیک یہ ایک بڑی بغاوت تھی۔قرآنِ کریم نے اگلی ہی آیت میں یہ بات صاف کر دی۔کہا کہ **قُلۡ اِنَّمَاۤ اَدۡعُوۡا رَبِّیۡ وَلَاۤ اُشۡرِکُ بِهٖۤ اَحَدًا** (72:20)۔ان سے برملا کہہ دو

---

1. ناقوس۔بڑی کوڑی جو مندروں میں بجائی جاتی ہے۔
2. خدا کا ایک بندہ یعنی رسول اللہ جو صرف اور صرف خدا کی محکومیت اختیار کیے ہوئے تھا۔یہ الفاظ (72:19) میں آئے ہیں۔

کہ میں تو صرف اپنے رب کے احکام کی اطاعت کی دعوت دیتا ہوں۔ اور سن رکھو کہ میں اس معاملے میں' کسی کے ساتھ کسی Compromise (مفاہمت) کیلیے تیار نہیں ہوں۔ شرک کے معنی Compromise (مفاہمت) کرنا ہوتا ہے۔ عزیزانِ من! ان اصولوں میں' یہ جو نظام کے ستون ہیں' ان میں کچھ کہیں سے اور کچھ کہیں سے لے لیے اور ان کو ملا کے اس نظام کو اپنا لو یعنی Compromise (مفاہمت) کیلیے وہ یہ کچھ کہہ رہے تھے۔ لیکن آپ ﷺ بار بار ان کو کہہ رہے تھے کہ وَلَآ اُشْرِكُ بِهٖٓ اَحَدًا (72:20) اور میں اس میں کسی دوسرے کے قانون اور فیصلے کو شریک نہیں کرتا۔

شرک کے معنی ہیں کہ خدا کے نظام کے مقابلے میں کوئی دوسرا نظام قائم کرنا

عزیزانِ من! جب ہم مذہب کی دنیا میں آئے تو ہم سے کہہ دیا گیا کہ شرک کے تو معنی بت پرستی ہیں اور یہاں (72:20) میں کہا ہے کہ میں بت پرستی نہیں کرونگا۔ صاحب! نہ کرو' عیسائی بھی تو ان قریش کے بتوں کو نہیں پوجتے تھے' یہودی بھی تو ان کے بتوں کو نہیں پوجتے تھے۔ یہ قریش ان سے کیوں مخالفت و مخاصمت نہیں کرتے تھے۔ انہی کے متعلق یہ چیز کیوں ہوگئی۔ اگر وہ یہی بات کرتے تھے کہ میں تمہارے بتوں کو نہیں مانتا تو یہ بھی تو دیکھیے کہ حرمِ کعبہ کے اندر بھی بت تھے جہاں ان کی اپنی روایت تھی کہ یہاں جو بھی آئے گا' وہ محفوظ ہوگا لیکن حرمِ کعبہ کے اندر بھی وہ کہتے تھے کہ ہم یہ آواز بلند نہیں کرنے دینگے' ہاں البتہ وہ آپ سے Compromise (مصالحت ومفاہمت) کیلیے ضرور کہتے تھے۔ یہ ہے جو کہا ہے کہ وَلَآ اُشْرِكُ بِهٖٓ اَحَدًا (72:20)۔ اور میں اتباع قوانین خداوندی میں کسی دوسرے کے قانون اور فیصلے کو شریک نہیں کرتا۔ اور اگلے ہی فقرے میں کیسی عجیب بات کہہ دی ہے کہ یہ جو میں دعوت دے رہا ہوں کہیں تمہارے ذہن میں یہ نہ آجائے کہ میں کوئی ایسا نظامِ حکومت قائم کررہا ہوں جس میں حکمران یا سربراہ میں بنوں گا اور سارا اقتدار میرے ہاتھ میں ہوگا اور جس کو چاہونگا نقصان پہنچاؤنگا' جس کو چاہونگا نفع پہنچاؤنگا' تمہارے ذہن میں یہ بات نہ آجائے کہ میں اس کیلیے کررہا ہوں۔ کہا کہ قُلْ اِنِّىْ لَآ اَمْلِكُ لَكُمْ ضَرًّا وَّلَا رَشَدًا (72:21)۔ انہیں کہہ دو کہ میں خود بھی کوئی اختیار اور اقتدار نہیں رکھتا کہ تمہیں کسی قسم کا نفع یا نقصان پہنچا سکوں۔ یہ سب کچھ خدا کے قانون کے مطابق ہوتا ہے۔

نبی اکرم ﷺ کا ارشاد ہے کہ میں کسی کیلیے نفع یا نقصان کا اختیار نہیں رکھتا

عزیزانِ من! اس آیت (72:21) میں واضح کرکے کہہ دیا۔ کہ ان سے کہہ دو کہ میں اس نظام کا حاکمِ اعلیٰ یا سربراہ ہونے کی حیثیت سے بھی کسی کیلیے کسی نفع ونقصان کا اختیار نہیں رکھونگا۔ دوسری جگہ تو قرآن نے یہ کہا ہے کہ حضور ﷺ نے فرمایا کہ میں اپنی ذات کیلیے بھی کسی نفع ونقصان کا کوئی اختیارِ ذاتی نہیں رکھونگا۔ خدا کے احکام' جو نفع دینگے وہ نفع ہوگا' جو نقصان پہنچائیں گے وہ میرے لیے نقصان ہوگا اور قرآن میں ہے کہ حضور ﷺ نے خود کہا ہے کہ اگر میں بھی ان احکام کی معصیت یا سرکشی برتونگا' یا نافرمانی کرونگا تو میں بھی خدا کے

عذابِ الیم سے ڈرتا ہوں۔ وہ یہاں ہی ہے کہ کسی کو نفع یا نقصان پہنچانا تو ایک طرف' اگر میں خود بھی خدا کے قانون کی خلاف ورزی کروں تو **قُلْ اِنِّیْ لَنْ یُّجِیْرَنِیْ مِنَ اللّٰہِ اَحَدٌ وَّلَنْ اَجِدَ مِنْ دُوْنِہٖ مُلْتَحَدًا** (72:22)۔ ان سے کہہ دو کہ نہ تو دنیا میں کوئی قوت ایسی ہے جو مجھے اس کے خلاف پناہ دے سکے اور نہ ہی میں اپنی کوشش سے کوئی پناہ گاہ تلاش کرسکوں گا۔ اگر مجھے پناہ مل سکتی ہے تو صرف خدا کے قانون کے سائے میں مل سکتی ہے۔ عزیزانِ من! کیسے واضح کرکے بتا دیا کہ نفع اور نقصان پہنچانا تو ایک طرف رہا' میں بھی اگر اس کی خلاف ورزی کرونگا تو یقین مانیے میں اعلان کیے دیتا ہوں کہ دنیا میں کوئی مجھے Protection (تحفظ) نہیں دے سکے گا۔ نظام یہ ہونا چاہیے' عزیزانِ من! کہ کسے باشد' کوئی بھی ہو' اگر وہ اس نظام کے کسی قانون کی خلاف ورزی کرتا ہے' تو دنیا میں کوئی اسے Protection (تحفظ) نہ دے سکے گا۔ یہ اعلانات ہو رہے ہیں۔ ہاں تو عزیزانِ من! میں کہہ یہ رہا تھا کہ مخالفت جو ہو رہی تھی' وہ اس بات کی ہو رہی تھی۔ دو ایک مقام پہ قرآن نے اِس کی اور وضاحت کی ہے کہ خالصتاً احکامِ خداوندی کی اطاعت کرنا' اسکے سوا کسی اور کی نہیں' اور اس میں کسی اور کو بھی شامل نہیں کرنا اور کسی کو اس نظام میں ملانا بھی نہیں' کسی قسم کا کوئی اور نظام قائم نہیں کرنا اور پھر قائم کرنے کے متعلق تو آپ قرآنِ کریم میں وہ (2:85) آیت دیکھیے وہ اس مقام کو اور زیادہ واضح کر دیتی ہے۔

نظامِ خداوندی کے غیر متبدل اصولوں میں کوئی کمی بیشی نہیں ہوسکتی

عزیزانِ من! قرآن کہتا ہے کہ **اَفَتُؤْمِنُوْنَ بِبَعْضِ الْکِتٰبِ وَتَکْفُرُوْنَ بِبَعْضٍ** (2:85)۔ کیا تم یہ چاہتے ہو کہ اس کا کچھ حصہ اِدھر سے لے لیا جائے اور کچھ حصہ اپنی طرف سے ملا لیا جائے اور اس طرح سے ملا کے ایک نظام قائم کیا جائے اور اسے کہا جائے کہ یہ ہے نظامِ خداوندی اور یہ ہے وہ مذہب کا نظام۔ وہاں یہ ہے کہ جو شخص بھی ایسا کرے گا اس کا نتیجہ اس کے سوا کچھ نہیں ہوگا کہ اس زندگی میں بھی **خِزْیٌ فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا** (2:85) اس زندگی میں بھی اُسے ذلت اور رسوائیاں ملیں گی اور **وَیَوْمَ الْقِیٰمَۃِ یُرَدُّوْنَ اِلٰٓی اَشَدِّ الْعَذَابِ** (2:85) اور آخرت میں بھی اس کے لیے شدید تریں عذاب ہوگا حالانکہ بظاہر یہ نظر آتا ہے کہ جتنے پرسنٹ (فی صد) خدا کے احکام اس کے اندر شامل کر دیئے اتنے نمبر تو اس کو دیدیئے۔ سو نمبر کا حساب کا پرچہ تھا اسمیں سے اگر اس کے پچاس نمبر ٹھیک نکل آئے ہیں پچاس تو دیجئے' باقی پچاس کاٹ لیجیے لیکن یہاں تو حکم خداوندی ہے کہ اگر اس کے اندر آپ نے ذرا سا بھی Compromise (مفاہمت و مصالحت) کیا تو یہی نہیں ہے کہ رائیگاں گیا بلکہ یہ ہے کہ اس کا نتیجہ **خِزْیٌ فِی الْحَیٰوۃِ الدُّنْیَا** (2:85) اس دنیا کی زندگی میں بھی ذلت ہے اور آخرت کا عذاب تو اور بات رہی۔ یہ کیا چیز ہوتی ہے' جسے ہم کہتے ہیں کہ کچھ اِدھر سے ملایا کچھ اُدھر سے ملایا؟ یہ Compromises (مصالح) ہیں۔ دراصل یہ اپنی مفاد پرستیوں کی حفاظت کیلیے طریقے ہیں۔ گاندھی جی بھی خوش رہیں' راضی رہے' سرکار بھی۔ ٹھیک ہے جی' یہ کچھ اسلامی ہے۔ چلیے وہ جو اسلام والے ہیں وہ بھی خوش رہیں' راضی رہیں' اور یہ چیز جمہوری ہے۔ یہ وہاں سے

لی ہے۔ یہ کچھ کرلیا ہے۔ مفاد بھی محفوظ رہے' اسلام والے بھی راضی رہیں مگر قرآن اس عمل کو شرک کہتا ہے جو دین کی ایک اصطلاح ہے۔ چنانچہ اس سلسلہ میں ارشاد ہے کہ **وَاِذَا ذُكِرَ اللّٰهُ وَحْدَهُ اشْمَاَزَّتْ قُلُوْبُ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ** (39:45) اور جو لوگ خدا کے قانونِ مکافات اور حیاتِ اُخروی پر یقین نہیں رکھتے' جب ان سے کہا جاتا ہے کہ جملہ اقتدار اور اختیار صرف خدا کو حاصل ہے' اس میں اس کا کوئی شریک و سہیم نہیں تو انہیں یہ بات سخت ناگوار گزرتی ہے۔ عزیزانِ من! اندازہ لگایئے کہ کیا بات کہی ہے۔ کہا ہے کہ جب ان سے کہا جاتا ہے خالص خدا کے احکام کی حکومت قائم کرنا تو اس سے ان کے دلوں میں اتنی کبیدگی پیدا ہوتی ہے اور آگے قرآن یہ کیا بات کہہ گیا ہے! کہا کہ اصل بات یہ ہے کہ یہ آخرت پر ایمان ہی نہیں رکھتے۔ ان کے سامنے ساری بات بنیادی مفاد کی ہوتی ہے۔ یہ اس سے بڑے کبیدہ خاطر ہوتے ہیں کہ صرف یہ کچھ کرنا ہے اور کچھ ساتھ نہیں ملانا اور پھر آگے قرآنِ کریم نے کہا کہ **وَاِذَا ذُكِرَ الَّذِيْنَ مِنْ دُوْنِهٖٓ اِذَا هُمْ يَسْتَبْشِرُوْنَ** (39:45) اور جب اس کے ساتھ دوسروں کو ملا کے' اس قسم کا ایک ملغوبہ بنالیا جائے تو وہ بڑے خوش ہوتے ہیں۔ کہتے ہیں کہ گل ہوئی نا جی فیر۔ اے ہے چلن والی گل جیہڑی اے ہن ایس دنیا اچ جی۔ او مذہب والی گل پرانی جیہڑی ہے او پرانی ہوگئی۔ ٹھیک ہے اے جیہڑ یاں چنگیاں چنگیاں گلاں نے اوہدے وچوں او لے لؤ جیہڑ یاں چیزاں چنگیاں تہانوں ہور لبدیاں ہیگیاں اونال ملالو۔ ❶ قرآن کہتا ہے کہ جب یہ کیا جائے تو اس پہ بڑے خوش ہوتے ہیں۔ اللہ تیرے بچے جیون۔ گل کتی نا جی' سواد آ یا اینوں کیندے نیں۔ ❷ جب ان سے کہا گیا کہ اسلام اپنے نظام کے اصولوں میں کوئی لچک نہیں رکھتا تو اس کا جواب مولانا حسین احمد مدنی (1879-1957) سے سنیے۔ وہ جواب یہ تھا کہ Personal Laws (شخصی قوانین) کی جو آزادی ہے وہ تو مذہب ہوگیا اور جو باقی ہے وہ جمہوریت ہوگئی ان دونوں کو اکٹھا کیا تو حکومت تشکیل پائی جس میں مذہبی امور مذہبی پیشوائیت کے حوالہ اور باقی حکومتِ وقت کے۔ سبحان اللہ کیا بات ہے! لیکن اس کے برعکس جب یہ کہا جاتا تھا کہ نہیں' ہماری آزادی اور پابندی کی حدود صرف خدا کی کتاب (یعنی قرآن) مقرر کرے گی تو اسکے خلاف اڈ پڑتے تھے اور جب یہ کہا جاتا کہ ہاں یہ نظام شخصی قوانین کی آزادی دیتا ہے ...... پرسنل لاز ...... (شخصی قوانین) کی پروٹیکشن (حفاظت) کی ضمانت دیتا ہے اور باقی جمہوریت تو کہتے ہی تھے کہ رہے گی تو اس پر قرآن کہتا ہے کہ بات ہوئی نا صاحب! **يَسْتَبْشِرُوْنَ** (39:45) تو خوشی سے ان کی باچھیں کھل جاتی ہیں۔ چودہ سو سال پیشتر' عزیزانِ من! یہ قرآن کسی ماضی کا قصہ نہیں بیان کر رہا بلکہ حقیقت تو یہ ہے کہ

---

❶ واہ! کیا خوب بات ہوئی پھر! یہ جواب اس دنیا کی بات ہے بس یہی چلنے والی ہے۔ وہ مذہب والی بات جو پرانی ہے وہ تو اب قصۂ پارینہ ہوئی۔ یہ ٹھیک ہے کہ اس میں جو اچھی اچھی باتیں ہیں وہ لے لو اور جو دیگر باتیں آپ کو اچھی لگتی ہیں وہ وہاں سے لے لو۔

❷ اللہ تیرے بچے سدا جیتے رہیں۔ کیسی مزے والی بات کی ہے۔ کیا خوب مزا آیا!

ارے دل! یہ تو اپنی داستاں معلوم ہوتی ہے

ہر دَور میں یہی کچھ ہوگا۔ خالص خدا کی محکومیت کی طرف (نہیں آنے دیتے) مفاد پرستوں کے یہ گروہ آنے ہی نہیں دیتے۔ اس قسم کی آیات قرآنِ کریم میں تو بیشتر ہیں۔ وقت کا تقاضا ہوتا ہے کہ میں اختصار بھی کروں' مجھے درس میں آگے بھی چلنا ہوتا ہے۔ ایک آدھ اور ریفرنس لے لیجیے۔ سورۃ بنی اسرائیل ہے۔ کیا بات کہی ہے کہ جو لوگ قرآن کے متعلق پہلے ہی اپنے دل میں جذباتِ نفرت لے کر آتے ہیں **وَاِذَا قَرَاْتَ الْقُرْاٰنَ جَعَلْنَا بَيْنَكَ وَبَيْنَ الَّذِيْنَ لَا يُؤْمِنُوْنَ بِالْاٰخِرَةِ حِجَابًا مَّسْتُوْرًا o وَّجَعَلْنَا عَلٰى قُلُوْبِهِمْ اَكِنَّةً اَنْ يَّفْقَهُوْهُ وَفِيْٓ اٰذَانِهِمْ وَقْرًا** (17:45-46)۔ اور مستقبل کی زندگی پر جن کا ایمان نہیں ہوتا' ان کی حالت یہ ہوتی ہے کہ جب تو ان کے سامنے قرآن پیش کرتا ہے تو تمہارے اور اُن لوگوں کے درمیان ایک ایسا (نفسیاتی) پردہ حائل ہو جاتا ہے جو عام نگاہوں سے دیکھا نہیں جا سکتا۔ اور ان کے دلوں پر ایسے غلاف چڑھ جاتے ہیں جن کی وجہ سے ان کی سمجھ بوجھ کچھ کام نہیں دیتی اور اُن کے کانوں میں ایسے ڈاٹ لگ جاتے ہیں (جس سے سچی بات ان کے دل تک پہنچ ہی نہیں پاتی۔) نفرت کے جذبات انسان کو اس طرح اندھے اور بہرے بنا دیتے ہیں۔ عزیزانِ من! بات کو کیا خوب سمجھایا کہ جب قرآنِ خالص ان کے سامنے پیش کیا جائے تو یوں نظر آتا ہے جیسا کہ قرآن پیش کرنے والے اور ان سامعین کے سامنے حجابِ مستور آ گیا ہے۔ حجاب تو کہتے ہی پردے کو ہیں اور مستور بھی وہ چیز ہے جسے پردہ ہی کہتے ہیں۔ یہ ایک ایسا پردہ لٹک جاتا ہے کہ جو بظاہر نظر نہیں آتا کہ یہ پردہ لٹکا ہوا ہے۔ یہ پردہ بڑا سخت ہوتا ہے' مگر دکھائی نہیں دیتا۔ اس لیے کہ اگر کوئی غیر مسلم ہے' ہندو ہے' عیسائی ہے' یہودی ہے' اس کے سامنے قرآن پیش کرو تو سامنے نظر آتا ہے: وہ کہتا ہے کہ میں اس کو منزل من اللہ نہیں مانتا۔ یہ سامنے نہیں ہوتا اور اِدھر یہ ہے کہ قرآن کو خدا کی کتاب بھی مان رہے ہیں' اسلام اپنا مذہب بھی مان رہے ہیں' دین بھی مان رہے ہیں لیکن جب قرآن پیش کیا جاتا ہے تو وہ کہتے ہیں کہ وہ ایک ایسا پردہ حائل ہو جاتا ہے۔ **حِجَابًا مَّسْتُوْرًا** (17:45) ہے۔ یہ عام نگاہوں سے دیکھا نہیں جا سکتا۔ اسے چہرے کی فزیکل آنکھیں بھی دیکھ نہیں سکتیں۔ یہ چھپا ہوا پردہ ہے۔ عزیزانِ من! کیا بتاؤں اس قرآن کی لذت! یہ یہی کہہ سکتا تھا کہ **حِجَابًا مَّسْتُوْرًا** اور پھر ان کے جو دل ہیں ان پر ایک غلاف سا چڑھ جاتا ہے اور ان کے کانوں میں ڈاٹ لگ جاتے ہیں۔ کاہے کیلیے؟ کہا کہ **اَنْ يَّفْقَهُوْهُ** تاکہ یہ اسے سمجھ نہ سکیں کہ بات کیا کہتا ہے۔

خود ساختہ شریعت کفر سے زیادہ خطرناک ہوتی ہے

عزیزانِ من! اگر دیکھا جائے تو قرآن حکیم کا کہنا یہ ہے کہ **وَاِذَا ذَكَرْتَ رَبَّكَ فِى الْقُرْاٰنِ وَحْدَهٗ وَلَّوْا عَلٰٓى اَدْبَارِهِمْ نُفُوْرًا** (17:46)۔ انہی جذباتِ نفرت کا نتیجہ ہے کہ جب تو قرآن میں صرف خدا کا ذکر کرتا ہے اور اس کے ساتھ اِن کے باطل معبودوں اور پیشواؤں کو نہیں ملاتا تو یہ منہ پھیر کر چل دیتے ہیں۔ اس سے قرآن کا کہنا یہ ہے کہ محکومیت صرف خدا کے احکام کی ہے اور

کسی کی نہیں ہے۔ یہ بات ان کے دل میں نفرت پیدا کر رہی ہے۔ اب اگر اس کے ساتھ کچھ اور ملا دو اور پھر دیکھو یہ کیسے خوش ہوتے ہیں' یہ تمہاری آواز کو کیسے سنتے ہیں۔ یہ جو اس کے ساتھ کچھ اور ملا کے ایک نظامِ اسلامی بنانے یا اسلامی شریعت بنانے والی بات ہے' یہ عزیزانِ من! خالص کفر کی بنیادوں پر' جو کچھ بنتا ہے' اس سے بھی کہیں زیادہ خطرناک ہے کیونکہ اس کفرِ خالص میں کوئی حجابِ مستور نہیں ہوتا' کھلی ہوئی سی ایک بات ہوتی ہے۔ وہ جسے جمہوریت کہیں گے کہ یہ ہماری سیکولر اسٹیٹ ہے ٹھیک ہے اس میں پرسنل لاز (شخصی قوانین) کی آزادی ہوگی' ہماری اسٹیٹ سیکولر ہوگی۔ سیکولر کے معنی یہ ہیں کہ جس قسم کے بھی ہم قانون چاہیں گے یا اچھے سمجھیں گے ان کو اختیار کر لیں گے۔ اس میں کوئی پردہ داری نہیں' کوئی راز داری نہیں۔ لیکن جب صورت یہ ہو کہ آپ اسی قسم کی چیز کریں مگر نام مذہب کا رکھیں تو معاملات خراب ہو جاتے ہیں کیونکہ اس میں آپ مذہب کے نام پر سب کچھ کرتے ہیں۔ آپ کے ہاں بھی مذہب کے تصور میں Personal Laws (شخصی قوانین) ہی ہوں گے اور قوانین سازی کی صورت یہ چیز ہوگی کہ آپ اس عمل کے ساتھ نام اسلام کا لیتے چلے جائیں گے: اسلامی شریعت' اسلامی قانون' اسلامی نظام۔ اب اگر یہ تمام چیزیں الحق پر مبنی نہ ہوں تو پھر تو یہ سوچ اور یہ عمل حجابِ مستور پیدا کرتا ہے جسکے فریب میں دنیا آ جاتی ہے لیکن یہ بڑی عجیب چیز ہے۔ مومن اور مشرک تو بہرحال آپ سمجھیں گے کہ یہ دو بالکل مابہ الامتیاز Terms (اصطلاحات) ہیں۔ مومن مومن ہے اور مشرک مشرک ہے۔ یہ دونوں اکٹھے ہی نہیں ہوسکتے لیکن یہ جو Compromise (مفاہمت) کا انداز ہے جسے میں نے یہ کہا ہے اسے بھی لے لو اور اُسے بھی کچھ ملا لو اور کچھ اس قسم کی چیز بنا لو تو سنیے قرآنِ کریم ان دو ٹرمز (اصطلاحات) کو کیسے اکٹھا کر رہا ہے۔ (12:106) عجیب آیت ہے' عزیزانِ من! اور جیسا میں نے کہا ہے کہ یہ وہ آیتیں ہیں کہ جن پہ میں نگاہ ڈالتا ہوں تو واقعی کلیجہ شق ہو جاتا ہے کہ یہ تو ہماری داستان ہے۔ اس میں کہا کہ **وَمَا يُؤْمِنُ أَكْثَرُهُمْ بِاللّٰهِ إِلَّا وَهُمْ مُّشْرِكُوْنَ** (12:106)۔ اِن میں کچھ تو ایسے ہیں کہ قوانین خداوندی سے یکسر انکار کرتے ہیں اور اکثر ایسے کہ وہ خدا کے قانون کو مانتے تو ہیں لیکن اس کے ساتھ اور قوتوں کو بھی صاحبِ اختیار و اقتدار تسلیم کرتے ہیں اور اس طرح مومن کہلانے کے باوجود مشرک کے مشرک رہتے ہیں۔ قرآن کہتا ہے کہ اس طرح تم ان کی اکثریت کی آبادی کو جو مذہب کا نام لینے والے ہیں یہ کہتے ہوئے دیکھو گے کہ ہم ایمان لائے ہوئے ہیں' ہم مسلمان ہیں' ہم مومن ہیں۔ ان میں کی اکثریت کی کیفیت یہ ہے کہ ایمان کا دعویٰ کرنے کے باوجود وہ مشرک کے مشرک رہتے ہیں۔ کوئی بھی مسلمان بت کے سامنے تو سجدہ نہیں کرتا۔ عزیزانِ من! کبھی بھی ایسا نہیں ہوگا۔ شرک اگر وہی ہے تو وہ تو یہ بات ہے ہی نہیں۔

ظالم' کافر اور مشرک کے متعلق قرآنِ حکیم کی واضح وضاحت

عزیزانِ من! قرآن اکثر کہتا ہے کہ ان کی اکثریت کی کیفیت یہ ہے کہ اِن کا دعویٰ ایمان بھی ہے مگر **وَهُمْ مُّشْرِكُوْنَ** (12:106) اور وہ مشرک کے مشرک ہیں۔ سوال یہ ہے کہ یہ شرک کیا ہے؟ یہ کفر کیا ہے؟ یہاں وہ آیت جو بار بار دہرائی جاتی ہے' اُسے پھر

سامنے لائیے۔ **وَمَنۡ لَّمۡ يَحۡكُمۡ بِمَآ اَنۡزَلَ اللّٰهُ فَاُولٰٓـئِكَ هُمُ الۡكٰفِرُوۡنَ** (5:44)۔ یاد رکھو! جو شخص اس قانون کے مطابق فیصلے نہیں کرتا جسے خدا نے نازل کیا ہے، وہ کافر ہے۔ کہا کہ تم پوچھتے ہو کہ کافر کسے کہتے ہیں؟ اس کے لیے بحثیں کرتے ہو کہ مسلمان کی Definition کیا ہے؟ منیر ❶ کمیٹی پوچھتی ہے اور کوئی نہیں بتاتا۔ قرآن کہتا ہے کہ آؤ، ہم تمہیں بتاتے ہیں کہ کافر کسے کہتے ہیں؟ جب یہ بتا دیا جائے کہ کافر کسے کہتے ہیں تو بات صاف ہو گئی کہ پھر مسلمان کسے کہتے ہیں؟ کسے کافر کہتے ہیں؟ اس کے لیے کہا کہ **مَنۡ لَّمۡ يَحۡكُمۡ بِمَآ اَنۡزَلَ اللّٰهُ** (5:44)۔ جو خدا کی کتاب کے مطابق حکومت قائم نہیں کرتے۔ **اُولٰٓـئِكَ هُمُ الۡكٰفِرُوۡنَ** (5:44)۔ وہ کافر ہیں۔ تو یہی تو ہیں جنہیں کافر کہا جاتا ہے۔ عربی جاننے والے جانتے ہیں کہ یہ Construction (ساخت) کیسی خوبصورت ہے! **اُولٰٓـئِكَ هُمُ الۡكٰفِرُوۡنَ** (5:44)۔ یہی تو ہیں۔ یہاں **هُمۡ** کہا گیا کہ اکثر ایمان کے دعوے کے باوجود مشرک کے مشرک ہی رہتے ہیں۔ وہاں کہا گیا کہ جو ایسا نہیں کرتے ہیں، یعنی جو قرآن کے مطابق فیصلے نہیں کرتے ہیں، وہی تو ہیں جنہیں کافر کہا جاتا ہے۔ تو بات یہاں سے چل رہی تھی، عزیزانِ من! کہ جب تُو قرآن ان کے سامنے پیش کرے گا یہ اسے برداشت نہیں کر سکیں گے۔ یہ قریش کی بات نہیں تھی، کسی غیر مذہب والوں کی بات نہیں تھی۔ کہا ہے کہ جب تو قرآنِ خالص پیش کرے گا، اُس قرآن کے ساتھ اور کچھ نہیں ملائے گا تو ان کی کیفیت یہ ہو جائے گی کہ وہ لپک پڑیں گے، حملہ کرنے کو تیار ہو جائیں گے، مار ڈالیں گے، جنگ کریں گے، لڑائیاں کریں گے کہ یہ نہیں ہونے دیا جا سکتا۔ یہ ہے وہ شرک جس کا قرآن ذکر کرتا ہے یعنی قرآنِ خالص کے ساتھ کسی اور کو ملا دینا۔ اگر کچھ اور نہیں ملاؤ گے تو حملہ کر دیں گے۔ انہوں نے کہا کہ ٹھیک ہے حملہ کر دو گے۔ یہ آواز دینے والا جو ہے، یہ زیادہ سے زیادہ یہی ہے۔ اس کی آواز کو دبا دو گے، اس کو ختم کر دو گے۔ **قُلۡ اَفَاُنَبِّئُكُمۡ بِشَرٍّ مِّنۡ ذٰلِكُمۡ** (22:72)۔ ان سے کہو کہ کیا میں اس سے ایک بدتر صورتِ حال کی خبر دوں؟ یہ آواز جو دے رہا ہے، یہ تمہیں بڑی نقصان دہ چیز نظر آ رہی ہے، شر انگیز نظر آ رہی ہے۔ شر کے معنی ''چنگاری'' ہوتا ہے۔ تم اسے سمجھتے ہو کہ یہ ہمارے خرمنِ مفادات کے اندر چنگاری پھینک رہا ہے۔ کہا کہ آؤ! تمہیں بتاؤں یہ تو ایک چنگاری ہے۔ آؤ! تمہیں اس سے بھی بڑی بات بتاؤں اور وہ بڑی بات کیا ہے؟ **اَلنَّارُ** (22:72) ہے۔ بھڑکتا ہوا جہنم۔ چنگاری تو پھر بھی بھسم کرتے ہوئے وقت لے گی، ایک انقلاب کا جہنم آتا ہے، اس کے بڑھتے ہوئے شعلے آگ کے ہوتے ہیں۔ کہا کہ **وَعَدَهَا اللّٰهُ الَّذِيۡنَ كَفَرُوۡا** (22:72)۔ یہ تباہ کن عذاب (النار) جو ہر شے کو راکھ کا ڈھیر بنا کر رکھ دیتا ہے، خدا کے قانونِ مکافات کے مطابق ان لوگوں کے لیے مقرر ہے جو اس کے قوانین

---

❶ جسٹس محمد منیر (پیدائش 3 مئی ...... 1895) جو 1942ء میں لاہور ہائی کورٹ کے جج بنے۔ 23 مئی 1947 کو لاہور ہائی کورٹ کے چیف جسٹس بنے، اور سب سے بڑھ کر یہ کہ احمدیوں کے خلاف تحریک کے سلسلے میں جو ٹریبونل قائم ہوا تھا اس کے صدر بنے اور 29 جون 1954ء تا 3 مئی 1960ء سپریم کورٹ کے چیف جسٹس رہے۔ انہوں نے ہی منیر کمیٹی میں علما سے پوچھا تھا کہ مسلمان کی تعریف کیا ہے؟

کی صداقت سے انکار کرتے ہیں اور اس سے سرکشی برتتے ہیں۔ قرآن کے نظام سے انکار کرنے والوں کیلیے خدا نے یہ قانون مقرر کر رکھا ہے۔ **وَعَدَهَا** کے معنی ''خدا کا قانون'' ہوتا ہے۔ **وَبِئْسَ الْمَصِيْرُ** (22:72)۔ یہ بہت ہی بُرا مقام ہے۔ اس کے بعد جہاں یہ بھاگ کے بھی جانا چاہیں گے' وہ اس سے بھی بُری جگہ ہوگی۔ خواہ وہ اس آگ کے شعلوں سے بچ کے کہیں بھی چلے جائیں۔ آگے قرآن یہ بتاتا ہے کہ ایک انسان دوسرے انسان کی محکومیت اور اطاعت اختیار کرتا ہے' اسے صاحبِ اختیار' صاحبِ اقتدار سمجھتا ہے کہ اس میں کچھ اقتدار ہے لیکن یہ انسان کی عقلی سطح کے مطابق ہی بات سمجھاتا ہے۔

قرآن کی بیان کردہ تشبیہات نہایت سادہ بھی ہوتی ہیں اور بڑی پُر مغز بھی

عزیزانِ من! قرآن بات اس سطح پر سمجھاتا ہے کہ جہاں ایک صحرانشین بدو' اونٹ چرانے والا' بھی سمجھ لے' ہمارے ہاں کا ایک دیہاتی بھی سمجھ لے اور آئن سٹائن (1955-1879) بھی سمجھ لے۔ قرآن کا یہ انداز ہے کہ جب وہ مثالیں بیان کرتا ہے' جب کسی چیز کو تشبیہاً بیان کرتا ہے تو اس کی تشبیہات یا مثالیں اس عام فہم انداز کی ہوا کرتی ہیں اور اگر علم کی بلند ترین بارگاہ میں لے جایئے تو وہاں بھی وہ ایسی حقیقت پیش کرتا ہے کہ جس سے کوئی انکار ہی نہ کرے۔ کہا کہ یہ کہتے ہو کہ انسان کے اندر کچھ اقتدار ہوتا ہے' ذاتی اختیار ہوتا ہے' اس کے اپنے اندر یہ اختیار ہوتا ہے۔ کہنے لگا کہ کیا کہتے ہو؟ **يٰٓاَيُّهَا النَّاسُ ضُرِبَ مَثَلٌ فَاسْتَمِعُوْا لَهٗ** (22:73)۔ آؤ! تمہیں ایک مثال سے باتیں سمجھائیں۔ اسے دل کے کانوں سے سنو! **اِنَّ الَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰهِ** (22:73)۔ جنہیں تم بھی خدا کے سوا صاحبِ اختیار اور صاحب اقتدار سمجھتے ہو کہ ان کے اندر بھی قوتیں ہیں' اقتدار اور اختیار ہے۔ یہ بات نہیں ہے۔ دراصل' انہوں نے کچھ قوتیں اکٹھی کر رکھی ہیں' کچھ ذرائع اکٹھے کر رکھے ہیں' ان کے ذریعے سے اسے دبا دیا' اسے مروا دیا' اس کو یہ کر دیا اور اُس کو وہ کر دیا۔ کہا کہ کیا تم ان کی بے بسی کا عالم دیکھنا چاہتے ہو؟ کیا اُن کا حقیقی اختیار و اقتدار دیکھنا چاہتے ہو؟

اقتدار صرف اس کا ہے جو اس کائنات کو عدم سے وجود میں لانے والا ہے

کہا کہ اگر حقیقی اختیار و اقتدار دیکھنا ہو تو اس سے دیکھا جاتا ہے کہ انہوں نے کیا تخلیق کیا ہے۔ ان کی بے بسی کا عالم تو یہ ہے کہ **لَنْ يَّخْلُقُوْا ذُبَابًا** (22:73)۔ وہ ایک مکھی جیسی شے بھی پیدا نہیں کر سکتے۔ ان کا اختیار و اقتدار تو جب مانیں کہ خدا تو اتنی عظیم کائنات کو عدم سے وجود میں لے آیا۔ یہ ہے بات قوت کی اور اقتدار کی اور اس کے برعکس ان سے کہیے کہ یہ ایک مکھی تو پیدا کر کے بتا دیں یعنی قرآنِ کریم اس تخلیقِ کائنات کے تقابل میں مکھی کی تخلیق والی بات لایا ہے۔ عام طور پہ ہر زبان میں مکھی ہی بڑی ناچیز سی بات سمجھی جاتی ہے: بڑی ضعیف سی چیز' ناتواں سی چیز ...... مکھی مارائے تے ساڈے وی کیندے نے [1] ...... یعنی جس نے مکھی تخلیق کی ہے' اسکا اقتدار ہے۔ اس کو

---

[1] ''مکھی مار'' تو ہمارے ہاں بھی کہا جاتا ہے۔

تخلیق کہتے ہیں۔

اقتدار کا دعویٰ کرنے والوں کی بے اختیاری کی حالت

پھر کہا کہ **وَلَوِ اجۡتَمَعُوۡا لَهٗ** (22:73)۔خواہ اس کے لیے وہ سب مل کر بھی کیوں نہ کوشش کرلیں۔یعنی ایک ہی نہیں بلکہ ان سے کہیے کہ سب اکٹھے ہوجائیں' مل کے ایک Limited Concern (محدود سا ادارہ) بنالیں' ورکشاپ کھول لیں' ایک بہت بڑی لیبارٹری بنالیں اور پھر عدم سے ایک ننھی سی کوئی مکھی وجود میں لا کے بتائیں اور اتنی ہی بات نہیں' ان کی بے اختیاری کا تو یہ عالم ہے کہ **وَاِنۡ يَّسۡلُبۡهُمُ الذُّبَابُ شَيۡـًٔا لَّا يَسۡتَنۡقِذُوۡهُ مِنۡهُ** (22:73)۔اگر کوئی مکھی ان سے کچھ چھین کرلے جائے (اور ہضم کرلے) تو ان میں اتنی بھی قدرت نہیں کہ اُسے اُس سے واپس لے سکیں۔اسے یوں سمجھو کہ اگر بالفرض محال کوئی مکھی ان کی میز پہ' جہاں یہ چائے پی رہے ہیں' چینی کا ایک دانہ لے کے نگل جائے' تو ان سے کہو کہ سب اکٹھے ہو کے یہ چینی کا دانہ ذرا باہر نکال دیں۔کہا کہ ان کے ذاتی اقتدار اور قوت کی تو یہ کیفیت ہے۔عزیزانِ من! آگے دو لفظ کہے گئے ہیں۔قرآن کو سامنے رکھیے جھوم جھوم جائیے۔**ضَعُفَ الطَّالِبُ وَالۡمَطۡلُوۡبُ** (22:73)۔اب تم خود ہی سوچو کہ ان معبودوں کی اور تمہاری' جو اس قسم کے معبودوں کو خدا بنائے ہوئے ہو' بے بسی کہاں تک پہنچی ہوئی ہے؟ ان معبودوں کی بے بسی یہ ہے' جن کی اطاعت اختیار کیے ہوئے ہیں' ان کے ضعف اور کمزوری اور بے اختیاری اور بے ساختگی کی کیفیت یہ ہے کہ مکھی جیسی چیز بھی اگر ان کے ہاں سے جھپٹ کے کوئی ایک دانہ چینی کا لے کر نکل جائے' تو اسے بھی اس سے نہ چھڑا سکیں۔یہ جن کی اطاعت اختیار کیے ہوئے ہیں وہ اتنے کمزور ہیں۔تو کہا کہ یہ لوگ ایسے کمزوروں کو صاحبِ اقتدار ماننے والے ہیں اور ان کو خدا ماننے والے ہیں...... ایناں داتے اللہ ای حافظ اے [1] ......یعنی کیا لفظ ہیں! **ضَعُفَ الطَّالِبُ وَالۡمَطۡلُوۡبُ** (22:73)۔ان معبودوں کی یہ بے بسی کہ وہ مکھی جیسی شے پر بھی قدرت نہیں رکھتے' ان خداؤں کی یہ کیفیت کہ اتنے ضعیف' ناتواں اور بے اختیار' تو جو ایسوں کو خدا سمجھے۔ان کے متعلق سوچو کہ وہ کیا ہوئے! اور تمہاری بے بسی یہ کہ تم اِن جیسے بے بس معبودوں سے اپنی مرادیں طلب کرتے ہو۔

اس قسم کے اقتدار کو تسلیم کرنے والوں کی سوچ کی پستی

عزیزانِ من! یہ معبود برف کے تودے ہیں' ان کے سامنے سجدے کرتے چلے جایئے' ان کی خدائی قائم ہے مگر جب بھی ان کے سامنے مقابلے کے لیے کھڑے ہوجایئے یہ ختم ہوجائیں گے۔لیکن یہاں بات یہ کہی گئی ہے کہ جو ان کو خدا ماننے والے ہیں ان کے متعلق

---

[1] ان کا تو خدا ہی حافظ ونگہبان ہے۔

بھی یہ ہے کہ انہیں تو تم چھوڑ دو لیکن اپنی حالت پہ غور کرو کہ جو ان جیسوں کو صاحبِ اقتدار و اختیار مانیں' ان کی اپنی بے بسی اور بے اختیاری کا کیا عالم ہوگا۔ یہی وجہ ہے' عزیزانِ من! کہ مذہب پرست قوم یعنی انسانوں کو صاحبِ اختیار و اقتدار ماننے والی قوم جب تک مذہب پرست رہتی ہے دنیا میں کبھی بھی سرفرازی اور سربلندی کی زندگی حاصل نہیں کر سکتی' ہمیشہ زوال میں رہتی ہے۔ نوعِ انسان کی ساری تاریخ اس پہ شاہد ہے۔ وہ جو اپنے ہاتھوں کے بنائے ہوئے مٹی کے بتوں یا اپنے جیسے جو انسان ہیں' ان کو صاحبِ اقتدار مان کر ان کے سامنے سجدہ ریز ہو جائے' وہ قوم دنیا میں کیسے سرفراز ہو سکتی ہے؟ نہیں ہو سکتی۔ باقی کچھ نہیں رہتا: جب جھکا تو غیر کے آگے نہ تن تیرا نہ من۔ ❶ دونوں ہی باتیں ختم ہو جاتی ہیں۔ یہاں کہا کہ **ضَعُفَ الطَّالِبُ وَالْمَطْلُوْبُ** (22:73) ان کی تو کیفیت یہ ہے جنہیں یہ خدا بنائے بیٹھے ہیں۔ اور کیا ہے؟ **مَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ** (22:74)۔ حقیقت یہ ہے کہ ان لوگوں نے اللہ کے متعلق صحیح اندازہ لگایا ہی نہیں جیسا کہ اندازہ لگانا چاہیے۔ اسے بس یوں سمجھو کہ بات یہ ہے کہ انہوں نے کبھی خدا کا اندازہ ہی نہیں لگایا کہ خدا کہتے کسے ہیں اور وہ ہوتا کیا ہے۔ انہوں نے کبھی اسکا اندازہ ہی نہیں لگایا۔ یہاں تو حاکم اور محکوم جتنے بھی ہیں' تابع اور متبوع جتنے بھی ہیں' ان کی تو یہ کیفیت ہے کہ دونوں اس قدر ناتواں' ضعیف' بے بس اور بے اختیار ہیں اور ان کے مقابل میں خدا نے ایک لفظ کہہ دیا ہے کہ اور کیا کہا جائے۔ انہوں نے کبھی اندازہ ہی نہیں لگایا کہ خدا کیا ہے؟

مذہب میں خدا کا تصور

عزیزانِ من! میں یہ عرض کر دوں کہ قرآنِ کریم یا دین کی اصل کو سمجھنے کیلیے بنیادی چیز یہ ہے کہ خدا کا صحیح تصور آپ کے ذہن میں آئے۔ جب تک خدا کا تصور یہ ہوگا جو مذہب نے دے رکھا ہے کہ وہاں نہ کوئی قاعدہ ہے' نہ قانون ہے' یہ بتاتے ہیں کہ وہ قادرِ مطلق ہے' جو جی میں آئے کرتا ہے: لَکھوں کَکھ کردے ککھوں لکھ کرداا ے۔ اوتھے کی پرواہ اے۔ اوتھے بے پروائیاں' پھڑ لے عملاں والیاں نوں' چھڈ دے اوگنہارنوں۔ ❷ یہ ہے خدا کا تصور جو مذہب نے قائم کیا ہوا ہے۔ ہنیر پیا ہویا صاحب! کوئی نہ قاعدہ نہ قانون۔ ❸ آپ کو معلوم ہے کہ مذہب نے یہ تصور کیوں عام دیا ہوا ہے۔ مذہب میں اس کے ساتھ ایک اور ٹکڑا جوڑ دیا گیا ہے کہ **اَلسُّلْطَانُ ظِلُّ اللّٰهِ عَلَی الْاَرْضِ** بادشاہ زمین پر خدا کا سایہ ہوتا ہے۔ مذہب نے جب خدا کا یہ تصور دیا تو بادشاہ خود بخود زمین پر

---

❶ پانی پانی کر گئی مجھ کو قلندر کی یہ بات — تُو جھکا جب غیر کے آگے' نہ تن تیرا نہ من (اقبال رحمہ اللہ)

❷ شاہوں کو گدا کر دے اور گداؤں کو شاہ کر دے۔ ایسا کرنے کے لیے اس کے ہاں کوئی پرخاش واحتیاط نہیں ہے' وہ بے پرواہ ہے چاہے تو صاحب عمل کو گرفتار بلا کر دے اور چاہے تو بے عمل کو بخش دے۔

❸ حضور! اندھیر نگری چوپٹ راج ہے۔ اُس کے ہاں نہ قاعدہ' نہ قانون۔

اس کا سایہ ہوگیا۔اسی قسم کی آمریت کے لیے یہ چیز وضع کی گئی۔لہٰذا بادشاہ کو خدا بتایا ہی اس لیے تھا کہ چونکہ خدا کسی قاعدے قانون کا پابند نہیں ہے اس لیے اس کا جو سایہ یعنی انسان اس زمین کے اوپر ہے' جسے بادشاہ یا حاکم کہتے ہیں اس کے متعلق یہ چیز ہو کہ جیسا وہ خدا ہے' اسی قسم کا یہ ہونا چاہیے تھا۔اوذ راوڈا خدا ہیگا' اے چھوٹا سہی۔ [1]

اِن چھوٹے خداؤں کا محاسبہ نہیں ہوسکتا

لیکن بہرحال' عزیزانِ من! اے چھوٹا وی تے کم نہیں ہوندا۔اے تے بوہتا ای لاگے ہوندا اے۔ پنجابی اچ محاورہ ہیگا [2] جس کا مطلب یہ ہے کہ یہ تو خدائی صفات کے مالک ہیں جیسے آپ خدا کو نہیں پوچھ سکتے کہ آپ ایسا کیوں کر رہے ہیں' یہ ایسا کیوں کیا گیا' اُسی طرح سے یہ سوال ہی نہیں ہے کہ آپ زمین کے ان چھوٹے خداؤں سے یہ کچھ پوچھ سکیں اس لیے ان سے بھی نہیں پوچھا جاتا۔اس کے بعد تو آپ کے ہاں یہ شریعت کا مسئلہ مسلمہ بن جاتا ہے۔ان کے ہاں اگر یہ چیز تھی کہ The King can commit no mistake یعنی بادشاہ کبھی غلطی نہیں کرسکتا۔آپ کے ہاں بھی یہ شریعت کا ایک مسلمہ بن گیا ہے کہ جو سربراہ ہے' اس سے سوائے قتل کے جرم کے' کوئی جرم بھی سرزد ہوجائے تو اُسے اس کی سزا نہیں دی جاسکتی۔یہ آپ کی فقہ کا مسئلہ ہے: جیسے جی میں آئے کرے' حکم حاکم مرگِ مفاجات۔ سوال ہی نہیں ہے کہ اُس سے کسی بھی قسم کی باز پرس کی جاسکے۔یہ اس آسمان والے خدا کا زمین پہ سایہ ہوتا ہے۔اسی لیے قرآنِ کریم نے کہا کہ مَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ (22:74)۔حقیقت یہ ہے کہ ان لوگوں نے اللہ کے متعلق صحیح اندازہ لگایا ہی نہیں' جیسا کہ اندازہ لگانا چاہیے۔ان کے ضعف کی تو یہ کیفیت ہے کہ انہوں نے اندازہ ہی نہیں لگایا اور اس کے مقابل میں خدا کی کیفیت' اگر تم چاہتے ہو' تو یہ ہے کہ اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِیٌّ عَزِیْزٌ (22:74)۔وہ بڑی قوتوں والا' بڑے غلبے والا ہے لیکن اس کے ساتھ ہی آپ کو معلوم ہے کہ وہ اپنے آپ کو حکیم بھی کہتا ہے کیونکہ اس کی قوت اور غلبہ دھاندلی کا نہیں ہے' ہمیشہ Reason (دلیل و برہان) پہ مبنی ہے' قانون پہ مبنی ہے اور اس پر اگلی چیز یہ ہے کہ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا (33:62)۔تُو خدا کے قانون میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں پائے گا۔اس نے قوانین مقرر کیے ہوئے ہیں اور وہ ان کی خلاف ورزی کبھی نہیں کرتا' باقی رہا یہ کہ جو اس قدر صاحبِ اقتدار خدا ہے پھر اس کی اطاعت کیسے کی

---

[1] وہ ذرا اونچے درجے کا خدا ہے اور یہ نچلے درجے کا۔ ہیں بس دونوں ہی خدا۔

[2] یہ نچلے درجے کے خدا بھی تو کم نہیں ہوتے۔یہ تو اور بھی اس اونچے درجے کے خدا کے مقرب ہوتے ہیں۔اس کا پنجابی زبان میں ایک محاورہ بھی ہے۔

جائے گی۔ یہ بات پھر ہم آگے لیں گے کہ یہ جو اتنا بڑا صاحبِ اقتدار و اختیار خدا ہے اس کی اطاعت اس زمین پر کیسے کی جائے؟ اگر یہ انسان بادشاہ کی صورت میں **ظل اللہ** نہیں ہیں تو پھر اس کی اطاعت کیسے کی جائے گی؟ اس نے خود اگلی آیات میں یہ پروگرام بتایا ہے کہ پھر ہماری اطاعت کا طریقہ کیا ہے۔ عزیزانِ من! ہم سورۃ الحج کی آیت 74 تک آ گئے' 75 ویں آیت سے ہم آئندہ لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلْ مِنَّآ ط اِنَّکَ اَنْتَ السَّمِیْعُ الْعَلِیْمُ ط

❀❀ ...... ❀❀❀ ...... ❀❀

تیرھواں باب: سورۃ الحج (آیات 75 تا اختتام)

بسم اللہ الرحمن الرحیم

إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَاتٍ لِّلْمُتَوَسِّمِينَ ﴿٧٥﴾ وَإِنَّهَا لَبِسَبِيلٍ مُّقِيمٍ ﴿٧٦﴾ إِنَّ فِي ذَٰلِكَ لَآيَةً لِّلْمُؤْمِنِينَ ﴿٧٧﴾ وَإِن كَانَ أَصْحَابُ الْأَيْكَةِ
لَظَالِمِينَ ﴿٧٨﴾ فَانتَقَمْنَا مِنْهُمْ ۘ وَإِنَّهُمَا لَبِإِمَامٍ مُّبِينٍ ﴿٧٩﴾ وَلَقَدْ كَذَّبَ أَصْحَابُ الْحِجْرِ الْمُرْسَلِينَ ﴿٨٠﴾ وَآتَيْنَاهُمْ آيَاتِنَا فَكَانُوا عَنْهَا
مُعْرِضِينَ ﴿٨١﴾ وَكَانُوا يَنْحِتُونَ مِنَ الْجِبَالِ بُيُوتًا آمِنِينَ ﴿٨٢﴾ فَأَخَذَتْهُمُ الصَّيْحَةُ مُصْبِحِينَ ﴿٨٣﴾ فَمَا أَغْنَىٰ عَنْهُم مَّا كَانُوا يَكْسِبُونَ ﴿٨٤﴾
وَمَا خَلَقْنَا السَّمَاوَاتِ وَالْأَرْضَ وَمَا بَيْنَهُمَا إِلَّا بِالْحَقِّ ۗ وَإِنَّ السَّاعَةَ لَآتِيَةٌ ۖ فَاصْفَحِ الصَّفْحَ الْجَمِيلَ ﴿٨٥﴾ إِنَّ رَبَّكَ هُوَ الْخَلَّاقُ
الْعَلِيمُ ﴿٨٦﴾ وَلَقَدْ آتَيْنَاكَ سَبْعًا مِّنَ الْمَثَانِي وَالْقُرْآنَ الْعَظِيمَ ﴿٨٧﴾ لَا تَمُدَّنَّ عَيْنَيْكَ إِلَىٰ مَا مَتَّعْنَا بِهِ أَزْوَاجًا مِّنْهُمْ وَلَا تَحْزَنْ
عَلَيْهِمْ وَاخْفِضْ جَنَاحَكَ لِلْمُؤْمِنِينَ ﴿٨٨﴾ وَقُلْ إِنِّي أَنَا النَّذِيرُ الْمُبِينُ ﴿٨٩﴾ كَمَا أَنزَلْنَا عَلَى الْمُقْتَسِمِينَ ﴿٩٠﴾ الَّذِينَ جَعَلُوا الْقُرْآنَ
عِضِينَ ﴿٩١﴾ فَوَرَبِّكَ لَنَسْأَلَنَّهُمْ أَجْمَعِينَ ﴿٩٢﴾ عَمَّا كَانُوا يَعْمَلُونَ ﴿٩٣﴾ فَاصْدَعْ بِمَا تُؤْمَرُ وَأَعْرِضْ عَنِ الْمُشْرِكِينَ ﴿٩٤﴾ إِنَّا كَفَيْنَاكَ
الْمُسْتَهْزِئِينَ ﴿٩٥﴾ الَّذِينَ يَجْعَلُونَ مَعَ اللَّهِ إِلَٰهًا آخَرَ ۚ فَسَوْفَ يَعْلَمُونَ ﴿٩٦﴾ وَلَقَدْ نَعْلَمُ أَنَّكَ يَضِيقُ صَدْرُكَ بِمَا يَقُولُونَ ﴿٩٧﴾ فَسَبِّحْ بِحَمْدِ
رَبِّكَ وَكُن مِّنَ السَّاجِدِينَ ﴿٩٨﴾ وَاعْبُدْ رَبَّكَ حَتَّىٰ يَأْتِيَكَ الْيَقِينُ ﴿٩٩﴾

عزیزانِ من! آج مارچ 1977ء کی 20 تاریخ ہے اور درسِ قرآنِ کریم کا آغاز سورۃ الحج کی آیت 75 سے ہو رہا ہے: (22:75)۔

قرآن فہمی کے سلسلہ میں قرآنی تشبیہات کی اہمیت

تجدیدِ یادداشت کے لیے یہ دہرادوں کہ سابقہ آیت میں بات یہاں تک پہنچی تھی کہ **ضَعُفَ الطَّالِبُ وَالْمَطْلُوبُ** (22:73) اب تم سوچو کہ اِن معبودوں کی' اور تمہاری' جو اِس قسم کے معبودوں کو خدا بنائے ہوئے ہو' بے بسی کہاں تک پہنچی ہوئی ہے۔ ان معبودوں کی بے بسی یہ ہے کہ وہ مکھی جیسی شے پر بھی قدرت نہیں رکھتے اور تمہاری بے بسی یہ کہ تم ان جیسے بے بس معبودوں سے اپنی مرادیں طلب کرتے ہو۔ بات یوں ہے کہ جب انسان دوسرے انسانوں کی اطاعت اختیار کرتا ہے تو کہا کہ پہلے تو انہیں لیجیے جن کی اطاعت اختیار کی جاتی ہے۔ یہ بتایا تھا کہ انہیں اپنی قوتوں کے دعوے تو اتنے ہوتے ہیں لیکن بے بسی کا یہ عالم ہوتا ہے۔ جیسا کہ وہ قرآن میں ایک عام فہم تشبیہ کے طور پر سمجھایا تھا کہ ایک ادنیٰ سی بے حد ناتواں چیز جسے خود یہ لوگ مکھی کہتے ہیں اگر وہ ان کی چینی کا ایک دانہ نگل جائے' تو یہ سارے مل کر بھی اس چینی کو اس کے پیٹ سے برآمد نہیں کر سکتے۔ میں ابھی عرض کرونگا کہ یہ تشبیہات درحقیقت کیا معنی رکھتی ہیں لیکن قرآن تو ایسی تشبیہات دیتا ہے کہ جو عام سطح کے ایک آدمی کی بھی سمجھ میں آ جائیں اور جب آپ سائنس کے طریقے پر بلند ترین

یہ عالم ہے۔ پھر نہایت دلچسپ انداز میں دونوں کے متعلق یہ کہہ دیا کہ مَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ (22:74)۔ انہوں نے اصل میں خدا کا اندازہ ہی نہیں لگایا اور اس چیز کے لیے قرآنِ کریم میں متعدد مقامات پہ یہ الفاظ آتے ہیں کہ خدا کا صحیح اندازہ جسے آج ہم تصورِ خدا کہتے ہیں یعنی Concept of God کہتے ہیں' وہ دین کی بنیاد کو سمجھنے کے لیے بڑا ہی اہم ہے۔

دین کی بنیاد خدا کے صحیح تصور پر ہے

عزیزانِ من! میں نے عرض کیا تھا کہ دین کی بنیاد خدا کے صحیح تصور پر ہے۔ جسے ہم باطل کا مذہب کہتے ہیں' اس کی بنیاد خدا کا غلط تصور ہوتا ہے۔ جسے ہم صحیح دین یعنی الاسلام یا قرآنِ کریم پر مبنی دین کہتے ہیں' اس کی بنیاد خدا کے صحیح تصور پر ہے۔ اب پہلے تو اس نے یہ گنا دیا کہ جن کی اطاعت کی جائے اور جو اطاعت کرنے والے ہیں' ان کی بے بسی' بے اختیاری' ضعف اور ناتوانی کی کیفیت تو آپ نے سمجھ لی۔ اس میں تو یہ سارے انسان آ گئے اور اس کے بعد یہ کہا کہ اصل یہ ہے کہ یہ خدا کا صحیح تصور نہیں رکھتے۔ اس کے بعد کہا ہے کہ اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِيٌّ عَزِيْزٌ (22:74)۔ اللہ بڑی قوتوں کا مالک اور ہر ایک پر غالب ہے۔ اللہ کو ایسا ہونا چاہیے' نہ کہ ویسا جیسا تم نے تصور کر رکھا ہے۔ اب یہاں بات یوں ہوئی ہے کہ وہاں (22:73) ضعف اور بے بسی تھی' یہاں (22:74) کہا کہ یہ قوت اور غلبہ تو خدا کے لیے ہے۔ اب یہیں سے یہ بات سمجھ میں آ جائے گی' اگر سمجھ لیا جائے' کہ قرآن دو دو لفظوں میں کہتا کیا ہے۔ عزیزانِ من! قرآن بڑے بڑے اہم مسائل حل کر جاتا ہے۔ اور میں سمجھتا ہوں کہ آج کل اس کے سمجھنے کی ویسے بھی پہلے سے کہیں زیادہ ضرورت ہے۔

خدا کے تصور کو سمجھنے میں پیدا ہونے والی مشکلات

عزیزانِ من! یہاں یہ کہا جاتا ہے کہ قوتِ خدا کے لیے ہمارے ہاں دین کا تصور نہیں ہے۔ لہٰذا اس کے معنی یہ ہوئے کہ ہمارے ہاں خدا کا صحیح تصور نہیں رہا اور اس کا نتیجہ یہ ہے کہ ہمارے ہاں ایک طرف سے یہ آواز بلند ہوتی ہے کہ قوت کا سرچشمہ عوام ہیں جب کہ مخالفوں کی کیفیت یہ ہوتی ہے کہ جو کچھ ایک فریق کہے تو اس کے خلاف دوسرا فریق بھی کچھ کہے چنانچہ ہمارے ہاں لڑائیاں ہی اِسی قسم کی ہوتی ہیں۔ یہ نہیں ہوتا کہ کوئی ایک بات بھی مان لی جائے کہ بھئی! ہاں یہ بات اس نے سچی کہی ہے' نہیں' بلکہ اس کے خلاف کوئی دوسری بات کہنا ضروری خیال کی جاتی ہے۔ لہٰذا دوسری طرف ہمارے ہاں مذہب پرست طبقہ کی طرف سے ایک فقرہ آتا ہے کہ نہیں' قوت کا سرچشمہ خدا ہے۔ اور یہ الفاظ صحیح بھی ہیں اور مذہب پرست قوم کو زیادہ اپیل بھی کرتے ہیں۔ لیکن ان دونوں سے پوچھیے: پہلے نعرے والوں سے بھی اور دوسرے نعروں والوں سے بھی کہ اس قوت کے سرچشمہ کے معنی کیا ہیں؟ کھڑے ہو کر سوچنے سے بات دو منٹ میں سمجھ میں آ جاتی ہے۔ دراصل یہ سلوگن Slogan (نعرہ) مغرب کی جمہوریت نے پیدا کیا۔ ملوکیت میں تو یہ اندازِ حکومت پہلے سے ہی چلا آتا تھا اور اگر دیکھا جائے تو ملوکیت میں قوت کا سرچشمہ ایک فرد کے ہاتھ میں ہوتا ہے۔ اُسے حاکم یا بادشاہ کہیے' شہنشاہ کہیے'

حکمران کہیے' ڈکٹیٹر کہیے۔ وہاں ایک فرد کی حکومت ہوتی تھی اور اس کا حکم قانون ہوتا تھا' فیصلہ ہوتا تھا اور ساری قوت اس کے ہاتھ میں ہوتی تھی: اس کو پھانسی پہ چڑھا دیجیے' اس کو چھوڑ دیجیے' یہ ضبط کر لیجیے' تو وہ ضبط ہو گیا' اور یہ تباہ کر دیجیے' تو وہ تباہ ہو گیا۔ قوت کا سرچشمہ اس کے ہاتھ میں ہوتا تھا۔

انقلابِ فرانس کا جذبہ محرکہ

عزیزانِ من! قوت کے اس سرچشمہ کے خلاف بغاوت ہوئی' ایک انقلاب برپا ہوا۔ اِسے عام طور پہ انقلابِ فرانس ❶ کہتے ہیں۔ وہاں کے لوگوں کا شعور بیدار ہوا' انہوں نے کہا کہ یہ تو بڑا غلط ہے کہ کسی ایک فرد کے ہاتھ میں ایسی لامتناہی قوت دیدی جائے۔ یہ بات تو نہیں ہونی چاہیے ❷ تو بہرحال وہاں کے لوگوں نے اس ملوکیت کے خلاف بغاوت کی۔ دراصل ہوا یوں تھا کہ امریکہ میں برطانیہ کے نوآبادیاتی نظام کے خلاف انقلاب برپا کیا۔ اسی زمانے سے کہیں پہلے یونانِ قدیم کے وقت نظریہ میثاق ❸ ابھرا تھا۔ جس میں مملکت

---

❶ The French Revolution of 1789

❷ تاریخِ عالم میں 1775ء اور 1900ء کے درمیان کے زمانے کو سماجی اور سیاسی انقلابات کا عہد قرار دیا جاتا ہے۔ اس زمانے میں امریکہ نے آزادی کی جنگ کی اور مادرِ وطن برطانیہ سے آزادی حاصل کی۔ امریکہ میں برطانیہ کے نوآبادیاتی نظام کے خلاف انقلاب 1775ء میں رونما ہوا۔ یہ انقلاب کامیابی کے ساتھ 1783ء میں اختتام پذیر ہوا۔

❸ نظریہ میثاق (Theory of Social Contract) یعنی یہ نظریہ کہ مختلف افراد باہمی رضامندی سے یہ فیصلہ کرتے ہیں کہ ہم سب مل کر ایک اجتماعی نظام قائم کریں۔ یہ افراد کے فرائض وواجبات ہوں گے اور یہ مملکت کے فرائض وواجبات۔ یہ نظریہ یونانِ قدیم کے وقت سے چلا آرہا تھا لیکن اسے اٹھارویں صدی میں یورپ میں ہابز (Hobbes 1588- 1679)' لاک (Locke 1632-1704) اور روسو (Rousseau 1712-1778) نے خاص طور پر فروغ دیا۔ موجودہ Democracy (جمہوریت) کی بنیاد اسی نظریہ پر ہے: ''لوگوں کی حکومت باہمی رضامندی سے۔'' نظریہ میثاق (Theory of Social Contract) کی رو سے تصور یہ کیا جاتا ہے کہ مملکت (State) اور افرادِ مملکت میں ایک میثاق (Contract) ہوتا ہے جس کی رو سے افراد اپنے ذمہ کچھ فرائض لیتے ہیں اور اُن کے بدلے میں مملکت اپنے ذمے افراد کے حقوق لے لیتی ہے لیکن مملکت کوئی الگ چیز نہیں ہوتی جس سے افراد معاہدہ کرتے ہیں بلکہ وہ ایک اجتماعی ادارہ ہوتا ہے۔ خود افراد ہی پر مشتمل ہوتا ہے۔ اسی مقام سے اس نظریہ کی پیچیدگی شروع ہو جاتی ہے۔ یعنی اگر مملکت اور افراد دو الگ الگ پارٹیاں ہوں تو اُن کے مابین معاہدہ کا تصور ذہن میں آسکتا ہے لیکن جب خود افراد ہی مملکت ہوں تو افراد کا اپنے ہی ساتھ معاہدہ کرنا کچھ عجیب سا نظر آتا ہے یعنی اس صورت میں معاہدہ کے فریقین کے بجائے صرف ایک ہی فریق رہ جاتا ہے اور یہ ظاہر ہے کہ جب تک دوسرا فریق موجود نہ ہو معاہدہ کا تصور ہی باطل ہو جاتا ہے۔ اس ضمن میں سب سے پہلے ہابز (Hobbes 1588- 1679) آتا ہے۔ اس کے اس نظریہ کی تفصیل اس کی کتاب Leviathan میں ملتی ہے۔

اور افرادِ مملکت کے [1] تعلق کی بات کی گئی تھی۔ اس میں ہابز (Hobbes 1588-1679) سرفہرست تھا۔ یہ وہی ہابز ہے جسے اس نظامِ جمہوریت کا بانی قرار دیا جاتا ہے۔ اُس نے یا اس زمانے کے سمجھدار طبقے نے اس پہ غور کیا تو انہوں نے کہا کہ ملوکیت کے ہاتھوں سے تو یہ اقتدار چھیننا چاہیے۔ اب یہ اقتدار دینا کس کے ہاتھ میں چاہیے یہ بڑا ہی اہم سوال تھا۔ غور وفکر کے بعد انہوں نے کہا کہ یہ تو عوام کے معاملے ہیں، عوام ہی ان کو حل کریں گے، قوت اور اقتدار عوام کے پاس ہونی چاہیے۔ یہاں سے یہ Slogan (نعرہ) اٹھا اور اس کے لیے انہوں نے یہ مشینری وضع کی کہ بھئی! عوام کی اب یہ صورت ہے کہ اگر آپ یہ شرط لگا دیں کہ سو فیصد عوام جو فیصلہ دیدیں وہ قوت بنے گا تو پھر یہ تو ناممکن العمل ہوگا۔ یعنی یہ چیز بحیثیت ایک اصول تو انہوں نے اختیار کی کہ ''قوت کا سرچشمہ عوام ہیں'' لیکن اس کے لیے مشینری کونسی ہو؟ اس کے لیے انہوں نے موجودہ مغرب کی جمہوریت کو مشینری کے طور پر اپنے ہاں رائج کیا کہ بھئی! کسی آبادی کی جو اکثریت ہے وہ جن لوگوں کے ہاتھ میں یہ اختیارات دیدے تو اقتدار ان کے ہاتھ میں ہوگا، حکمرانی ان کے پاس ہوگی، کیونکہ عوام کی اکثریت نے انہیں ایسے اختیارات دیدیئے ہیں۔ تو گویا انہوں نے بھی یہ کہا کہ ہمارے یہ اختیار خود نہیں ہیں، ان کے دیئے ہوئے ہیں یعنی عوام کی اکثریت کے دیئے ہوئے ہیں یا یوں کہیے کہ 51 فیصد کے دیئے ہوئے ہیں۔ یہ وہاں کی یعنی مغرب کی جمہوریت تھی۔ عملاً اختیارات تو، بہرحال ان کے ہی ہاتھ میں رہتے تھے جنہیں یوں کہیے کہ جمہوری طور پہ منتخب کیا جاتا تھا لیکن نظری طور پہ اصول یہی تھا کہ یہ ان کے اپنے ذاتی اختیارات نہیں ہیں بلکہ عوام نے ان کو دیئے ہیں۔ تو اس اعتبار سے وہاں یہ بات چلی کہ قوت کا سرچشمہ عوام ہیں۔

آپ نے سمجھ لیا کہ یہ جو مغرب کا نظامِ جمہوریت ہے محض اس کو سمجھانے کے لیے یا اس کی خاطر یہ تصور Create (پیدا) کیا گیا اور پھر اسے عام کیا گیا کہ قوت کا سرچشمہ عوام ہیں۔ میں پہلے اسی تصور کو لیتا ہوں۔ اس میں بھی بنیادی غلطی ہے کہ قوت نہ عوام کے پاس ہوتی ہے، نہ یہ عوام کے مقرر یا منتخب کردہ حکمران طبقہ یعنی اربابِ اقتدار کے ہاتھ میں ہوتی ہے۔ اس نظام کے ذریعے ایک Constitutional

---

[1] افراد اور مملکت کے تعلق کے باب میں چھ مختلف نظریات ہیں مثلاً:

1۔ نظریۂ وحدت (Monoistic Theory) یعنی افراد مملکت کا جزو ہوتے ہیں اور اپنا کوئی الگ وجود نہیں رکھتے۔

2۔ نظریۂ افرادیت (Monadistic Theory) جس کی رو سے یہ تسلیم کیا جاتا ہے کہ مملکت محض افراد کے مجموعہ کا نام ہے۔ ان میں حقیقی وحدت نہیں ہے۔

3۔ نظریۂ ثنویت (Qualistic Theory) اس میں افراد کا جداگانہ وجود ہے لیکن وہ اپنی فلاح و بہبود کے لیے معاشرہ یا مملکت کے محتاج بھی ہیں۔

4۔ نظریۂ نامیت (Organic Theory) یعنی مملکت اور افراد کی مثال جسم اور اس کے مختلف اعضاء و جوارح کی ہے۔ جسم اعضاء ہی کے مجموعہ کا نام ہے لیکن خود عضو نہیں۔ اعضاء جسم ہی کے ذریعہ سے زندہ اور قائم ہیں لیکن عضو فی ذاتہٖ جسم نہیں۔

5۔ نظریۂ افادیت (Utilitarian Thoery) مملکت کا وجود زیادہ سے زیادہ افراد کی زیادہ سے زیادہ مرفہ الحالی کے لیے ہے۔

6۔ نظریۂ مطلقیت (Absolute or Idealistic Theory) مملکت اپنا مستقل اور مطلق وجود رکھتی ہے۔ افراد کے ارادے اور خواہشات، ان کی انفرادیت اور تشخص سب مملکت کے سامنے سجدہ ریز ہونے چاہئیں۔ مملکت کے مقابلہ میں فرد کا کوئی حق نہیں ہے۔ ہیگل اس نظریہ کا حامل تھا۔

یعنی آئینی یا قانونی نظامِ حکومت قائم ہوتا ہے۔ اسے Government by Law (قانون کے ذریعہ کی ہوئی حکومت) کہتے ہیں۔ یہ حکومت Established by Law (قانون کے ذریعے قائم کی ہوئی) ہوتی ہے۔ اس میں قدم قدم پہ Constitution (آئین) آتا ہے، قدم قدم پر ہر حکم (By Law (Order (قانون کے ذریعے) آتا ہے۔ ذرا سا کھڑے ہو کے غور کیجیے تو بات سمجھ میں آ جائے گی کہ قوت درحقیقت قانون میں ہوتی ہے۔ یہ اگلی بات ہے کہ قانون وضع کرنے کا اختیار کس کو ہوتا ہے۔ قوت بہر حال قانون میں ہوتی ہے۔ عام مثال لے لیجیے۔ یہاں کوئی شخص کسی ایک فعل کا مرتکب ہوتا ہے جو کو ناجائز یا غلط ہوتا ہے مگر اس کی سزا کے لیے قانون نہیں ہے اس لیے وہ صاف بچ نکلتا ہے۔ اس صورت میں یہ برسرِ اقتدار طبقہ، جس کے متعلق ہمارے ذہن میں ہے کہ یہ بڑی قوتوں کا مالک ہے، فوج اس کے پاس، پولیس اس کے پاس، جیل خانے اس کے پاس، یہ سب کچھ اس کے پاس ہے، وہ شخص جو کسی فعل کا مرتکب ہوتا ہے، حکومت کی نگاہوں میں وہ فعل ناجائز ہوتا ہے تو حکومت کے پاس تو اتنی قوت موجود ہے کہ وہ جسے ناجائز یا غلط سمجھتی ہے وہ اس کو روک دے مگر حکمران طبقہ اس پر ہاتھ نہیں ڈال سکتا کیونکہ اس کے لیے قانون موجود نہیں۔ میں جہاں بات کر رہا ہوں Government established by law کی یعنی قانون کی رو سے جو حکومت قائم ہو، یہاں میں اس کی بات کر رہا ہوں۔ اتنی بڑی قوتوں کا مالک، صاحبِ اقتدار طبقہ، حکمران طبقہ، اس شخص پہ ہاتھ نہیں ڈال سکتا کیونکہ اس کے لیے قانون موجود نہیں ہے۔ Government established by law (قانونی حکومت) بے بس ہو جاتی ہے۔ اتنی بڑی قوتیں اس کے ہاتھ میں ہوتی ہیں، وہ اس کا مواخذہ نہیں کر سکتی۔ اس کے لیے ضروری ہوتا ہے کہ پہلے قانون بنایا جائے۔ قانون بنانے کے بعد پھر آگے یہ چیز آتی ہے کہ اس کا مواخذہ کیا جا سکتا ہے مگر وہ بھی ایسی صورت ہے کہ اس قانون کو بھی کسی پہلی تاریخ سے نافذ کیا جائے، اگرچہ Constitution یا آئین کے اندر یہ چیزیں موجود ہوتی ہیں کہ اس قسم کا قانون کسی سابقہ تاریخ سے نہیں بنایا جا سکتا۔ یہ تو ہوتا ہے کہ اس کے بعد اگر کسی شخص نے ایسا کچھ کیا تو وہ قانون کی زد میں آ جائے گا۔ لیکن بہرحال میں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ اگر اس وقت قانون موجود نہیں ہے تو ایک قانونی حکومت کے پاس کتنی ہی قوت کیوں نہ ہو وہ اس پر گرفت نہیں کر سکتی۔ بات آپ کی سمجھ میں آئی کہ یہ قوت تھی، نہ تو 51% یا 100% عوام کے پاس تھی جنہوں نے ان کو حکمران منتخب کیا تھا، نہ اِس صاحبِ اقتدار طبقہ کے پاس۔ قوت ہے، قانون کے پاس ہے۔ انہوں نے قانون کی رو سے کسی کو ملزم قرار دیا، عدالت نے اسے قانون کی رو سے مجرم قرار دیا، قانون کی رو سے اسے سزا دی، اسے جیل خانے بھجوا دیا۔ اگر سارے ملک کے عوام مل کر اس کے خلاف اٹھ کھڑے ہوں اور وہ کہیں کہ ہم اپنی قوت کے زور سے اس مجرم کو وہاں سے چھڑا کے لے آئیں گے تو بھی یہ جیل خانے سے نہیں چھڑا سکتے۔ سوال یہ ہے: کیوں نہیں چھڑا سکتے؟ اگر قوت کا سرچشمہ عوام ہیں تو یہ تو قوت کو لے کر اٹھ کھڑے ہوئے ہیں، اس قوت کو کیوں برسرِ اقتدار نہیں آنے دیا جاتا۔ اس وقت یہ عوام اپنی قوت کے زور سے اُسے کیوں نہیں چھڑا سکتے؟ اس لیے کہ قانون اس کو چھوڑنے کی اجازت نہیں دیتا۔ ان کے راستے میں قانون کی قوت حائل ہے۔ یہ وہی حکومت تھی کہ جب قانون نہیں تھا تو وہ اس ایک فرد پہ

بھی ہاتھ نہیں ڈال سکتی ہے۔اب وہی حکومت ہے کہ اگر قانون موجود ہے اور اس کی رو سے یہ فیصلہ ہوا ہے کہ پورے کے پورے ملک کے عوام بھی اگر چاہیں کہ اس کے خلاف اس مجرم کو چھڑائیں تو نہیں چھڑا سکتے کیونکہ قوت قانون کی ہے اور قانون اس کی اجازت نہیں دیتا تو قوت درحقیقت قانون کی ہوتی ہے البتہ جہاں لاقانونیت ہو جائے تو لاقانونیت میں اگر کوئی فرد برسرِاقتدار ہے تو اس کے ہاتھ میں قوت ہوگی اور اگر ایسی لاقانونیت ہے کہ کوئی فرد بھی نہیں ہے جس کے ہاتھ میں اقتدار ہو تو یہ ہے وہ کیفیت جسے آپ کہیں گے کہ عوام کے ہاتھ میں قوت آجاتی ہے۔لیکن یہ جو قوت کا تصور ہے اس کو تو ساری دنیا کے جتنے بھی نظام ہیں وہ سارے رد کریں گے Condemn (ملامت ومذمت) کریں گے کوئی نظام بھی اس کو برداشت نہیں کر سکتا کہ قوت عوام کے ہاتھ میں آجائے اور اگر ایسا ہو جائے یعنی عملاً عوام کے ہاتھ میں قوت آجائے تو پھر وہ سارا کچھ ہوتا ہے مظاہرے ہوتے ہیں فسادات ہوتے ہیں اشتعال انگیزیاں خلفشار مار دھاڑ پکڑ دھکڑ سب کچھ تہس نہس ہو جاتا ہے۔یہ تصور غلط ہے۔تو وہاں کہنے کی یہ بات ہونی چاہیے کہ اس نظام کے تابع حکومت جسے جمہوریت کہتے ہیں قانون سازی کا اختیار دیا گیا ہے چنانچہ اس طرح تو قوت کا سرچشمہ قانون ہی ہے۔لہٰذا قوم کو سمجھانا یہ چاہیے کہ قوت کا سرچشمہ دراصل قانون ہوتا ہے۔اس لیے میں نے عرض کیا ہے کہ ہمیں یہ گفتگو کرنا ہوگی کہ قانون سازی کا اختیار کسے ہے؟ بہرحال جس نظام میں بھی آپ کہتے ہیں کہ قانون سازی کا اختیار کسی خاص گروپ کے ہاتھ میں ہے اس کے ہاتھ میں بھی قوت نہیں ہوتی عوام کے ہاتھ میں بھی قوت نہیں ہوتی قوت قانون کے ہاتھ میں ہوتی ہے اسی لیے جسے آپ Rule of the law کہتے ہیں یعنی قانون کی حکمرانی یہ صحیح نظام حکومت [1] میں ہوتا ہے۔لیکن جہاں Lawlessness (لاقانونیت) ہو اسمیں عوام کے ہاتھ میں قوت چلی جاتی ہے جس کا نتیجہ فساد ہوتا ہے۔مگر اصل قوت تو قانون کی حکمرانی کو حاصل ہے۔لیکن سوال یہ ہے کہ کسی ایک انسان کو یا انسانوں کی جماعت کو کیا حق پہنچتا ہے کہ وہ دوسرے انسانوں سے اپنے فیصلے منوائے؟

---

[1] یونانِ قدیم میں ارسطو نے حکومت کو تین انواع میں تقسیم کیا تھا: (۱) شخصِ واحد کی حکومت (۲) چند افراد کی حکومت اور (۳) بہت سے افراد کی حکومت۔ میکیاوَلی (Machiavelli: 1469-1527) نے ان تین انواع پر ایک اور نوع کا اضافہ کیا جسے وہ ''مرکب حکومت'' قرار دیتا ہے۔جین بوڈن (Jean Bodin) نے اسلوبِ حکومت کی اس طرح تقسیم کی:

(ا) ملوکیت (Monarchy) جس کی تین قسمیں ہیں: (۱) استبداد (Despotic) جس میں رعایا کو غلام تصور کیا جاتا ہے۔(ب) تاج سے وفادار (Royal Crown) جس میں بادشاہ قوانین وضوابط کی رو سے حکومت کرتا ہے۔ (ج) قہرمانیت (Tyranny) جس میں حکومت بادشاہ کی مفاد پرستیوں اور کامرانیوں کے لیے ہوتی ہے۔

(۲) امراء کی حکومت (Aristocracy)

(۳) جمہوریت (Democracy) عوام کی حکومت۔اس کی قسمیں ہیں: مثلاً (۱) وحدانی (Unitary) (ب) وفاقی (Federal) ان میں اسلوب حکومت پارلیمانی ہوتا ہے یا صدارتی۔

(۴) جرمن سیاستدان بلنچلی (Bluntschli) اس پر چوتھی نوع ''تھیاکریسی'' کا بھی اضافہ کرتا ہے یعنی خدا کے اختیارات کے مطابق حکومت۔

ہمیں یہ سمجھنا ہوگا کہ خدا کیسے قوت کا سرچشمہ ہے

عزیزانِ من! میں قرآنِ کریم کے اس ٹکڑے پہ ہوں جہاں اس نے کہا ہے کہ انہیں خدا کا صحیح تصور نہیں ہے۔ مَا قَدَرُوا اللّٰہَ حَقَّ قَدْرِہٖ (22:24)۔ حقیقت یہ ہے کہ ان لوگوں نے اللہ کے متعلق صحیح اندازہ لگایا ہی نہیں جیسا کہ اندازہ لگانا چاہیے۔ آپ یہ کہتے ہیں کہ قوت کا سرچشمہ تو خدا ہے۔ انہوں نے الفاظ تو یہ بول دیئے' ان سے پوچھیے کہ اس کا مفہوم کیا ہے؟ عملاً اس کے معنی کیا ہیں کہ قوت کا سرچشمہ خدا ہے۔ یہ کچھ نہیں بتا سکیں گے۔ آپ یہ سن کر حیران ہونگے جو میں کہہ رہا ہوں' اس لیے کہ عملاً نہ کبھی انہوں نے دیکھا ہے' نہ انہوں نے کبھی دکھایا ہے' نہ کبھی یہ ماننے والوں نے دیکھا ہے کہ وہ جو خدا ہے اس کی قوت کا مظاہرہ کہاں ہو رہا ہے۔ وہ کیسے سمجھیں گے کہ قوت کا سرچشمہ خدا ہے۔ میں نے عرض کیا کہ یہ بات صحیح ہے لیکن اسے بھی مذہب پرست طبقے نے ایجاد کیا تھا۔ اس کی بھی عیسائیت میں' چرچ میں' کلیسا میں' مذہبی پیشوائیت میں' ایک ضرورت پیش آئی جب یہ مذہب پرست طبقہ وہاں غالب آیا ہے تو چرچ والوں نے اقتدار اپنے ہاتھ میں لینا چاہا لیکن مقابلے میں تو بادشاہت تھی وہ اقتدار تو یوں چھوڑ نہیں سکتی تھی اس دور میں ابھی جمہوریت والے نظام کا تصور نہیں آیا تھا۔ تو چرچ' اربابِ کلیسا یا مذہبی پیشوائیت' یہ اقتدار اپنے ہاتھ میں کس طرح لیتی چنانچہ انہیں کچھ تو ملوکیت کے مقابلے میں کہنا پڑا۔ اور جو کہا اس کے بڑے دُور رس مضمرات نکلے۔

اقتدار کے سلسلہ میں مذہبی پیشوائیت کا دعویٰ

عزیزانِ من! مذہبی پیشوائیت نے یہ کہا کہ اقتدار بادشاہ کے ہاتھ میں نہیں ہوتا' اقتدار خدا کے ہاتھ میں ہوتا ہے لیکن خدا نے اپنا یہ اقتدار اور قوت ہمیں تفویض کر دیا ہے' ہم خدا کی قوت کو Exercise (نافذ) کرتے ہیں یعنی خدا کی قوت کا استعمال ہم کرتے ہیں' یہ ہمارے Through (ذریعے) ہوتا ہے۔ بات تو وہیں آ گئی کہ کچھ انسان ہیں جن کے ہاتھ میں اقتدار آ گیا۔ اِس درس میں یہ بات آگے چل کر آئے گی۔ ملوکیت نے بھی جب مذہب کا نقاب اوڑھا ہے تو وہاں بھی یہ چیز ہوگئی کہ اَلسُّلْطٰنُ ظِلُّ اللّٰہِ عَلَی الْاَرْضِ بادشاہ اس کرہ ارض پر خدا کا سایہ [1] ہوتا ہے۔ اس نے بھی یہ نقاب اٹھایا کہ اصل میں قوت خدا ہی کے ہاتھ میں ہوتی ہے اور

---

[1] یہ مملکت کے ابتدائی تصورات میں سے ایک تصور ہے۔ اس کا نام ہے: خدائی اختیارات کا نظریہ (Theory of Divine Rights)۔ انسان کی ابتدائی زندگی میں پروہتوں (Priests) کو بہت بڑا مقام حاصل تھا۔ وہ مافوق الفطرت قوتوں کے حامل اور دیوتاؤں کی اولاد یا اُن کے نائب تصور کیے جاتے تھے۔ ہر شخص اُن سے ڈرتا اور کانپتا تھا اور اُن کے حکم کی خلاف ورزی کا تصور بھی نہیں کر سکتا تھا۔ رفتہ رفتہ پروہتوں کے انہی اختیارات نے اجتماعی شکل اختیار کر لی اور سمجھ لیا گیا کہ انہیں دیگر انسانوں پر حکومت کا حق حاصل ہے۔ یہ تھی ''الوہیاتی اختیارات'' کے تصور کی ابتداء۔ عیسائیت نے اس تصور سے بڑا فائدہ اٹھایا اور پادریوں نے نمائندگانِ خداوندی کی حیثیت سے باضابطہ حکومت شروع کر دی۔ بادشاہوں نے دیکھا کہ لوگوں سے اپنی اطاعت کرانے کا یہ طریق بہت آسان اور کامیاب ہے' اس لیے کہ اس میں جسموں کے بجائے دلوں پر فرمانروائی ہوتی ہے جس کے لیے نہ فوج کی ضرورت پڑتی ہے نہ پولیس کی چنانچہ انہوں نے بھی نیابتِ خداوندی کا دعویٰ کر دیا اور رفتہ رفتہ یہ تسلیم کرا لیا کہ بادشاہ زمین پر ''خدا کا سایہ'' اور ''ایشور کا اوتار'' ہوتا ہے۔ خدائی اختیارات کا یہ تصور مملکت کے استحکام کا موجب بن گیا۔ (پرویزؒ: انسان نے کیا سوچا؟ ادارہ طلوعِ اسلام' کراچی' 1955' ص۔172)۔

اس نے یہ قوت ایک فرد کو تفویض کر دی ہے۔ کلیسا نے یعنی مذہبی پیشوائیت نے کہا کہ نہیں، خدا نے یہ اختیارات ہمیں سونپ دیئے ہیں، ہم اس کے نمائندہ ہیں، اس لیے ہم جو کچھ بھی فیصلہ کریں گے وہ خدا کا فیصلہ ماننا پڑے گا اور اس کی اطاعت کرنا پڑے گی۔

قرآن کا فرمان ہے کہ قوت کا سرچشمہ قانون ہوتا ہے

عزیزانِ من! ان نظریاتِ مملکت کے لحاظ سے بات گھوم پھر کر وہیں آ گئی کہ انسانوں کو انسانوں کی اطاعت کرنا پڑے گی۔ یہ تو وہی ''طالب و مطلوب'' (22:73) والی بات آ گئی جو قرآن کہتا ہے۔ یہ تصور کہ قوت کا سرچشمہ درحقیقت قانون ہوتا ہے قرآن نے آ کر دیا۔ یہ قرآن بہت بڑی انقلابی کتاب ہے۔ عزیزانِ من! اگر تاریخ کا کوئی گوشہ بھی آپ کے سامنے ہو تو آپ کو معلوم ہوگا کہ جو غلط تصورات پہلے سے چلے آ رہے تھے، ان کے برعکس قرآن نے یہ تصورات دے کر انسانی سوچ میں کتنی بڑی انقلابی تبدیلیاں پیدا کیں۔ یعنی یہ تصور کہ قوت کا سرچشمہ قانون ہے، قوت قانون میں ہے، یہ بات قرآن نے آ کر دی۔ یہ بات بڑے ہی دوررس نتائج کی حامل ہے۔

اب دیکھنا یہ ہے کہ قانون وضع کون کرے گا؟

عزیزانِ من! فکرِ انسانی میں اب بات صرف یہاں آ گئی کہ قانون کے وضع کرنے کے اختیارات کس کو ہیں؟ یہاں آ کر قرآنِ کریم نے ملوکیت، مغربی جمہوریت اور کلیسا کی تمام جڑیں کاٹ کر رکھ دیں۔ اس نے کہا کہ قانون وضع کرنے کے اختیارات صرف خدا کو حاصل ہیں، اور قوت قانون میں ہے۔ اب اس بات کے یہ معنی ہوگئے کہ قوت کا سرچشمہ خدا ہے۔ قانون سازی، لفظی اعتبار سے قانون سازی کہا جاتا ہے، شاید خدا کے متعلق یہ لفظ موزوں بھی نہ ہو، کا یہ اختیار نہ کسی انسان کو ہے، نہ ملوکیت کو، نہ کلیسا کو، نہ عوام کو۔ یہ اختیار سوائے خدا کے کسی کو بھی حاصل نہیں ہے۔

قانونِ فطرت کی نمود کا ثمر

عزیزانِ من! اب دیکھیے کہ قرآن بات کیسے سمجھاتا ہے۔ وہ محسوسات کو سامنے لاتا ہے۔ یہ جسے ہم نظامِ فطرت اور قوانینِ فطرت، Laws of Nature کہتے ہیں، اُس کے بارے میں پہلے تو ہمیں صرف اتنا ہی پتہ تھا کہ گھٹائیں کیسے آتی ہیں، جھکڑ کیسے چلتے ہیں، سیلاب کیسے آتے ہیں، ان میں کتنی بڑی لامنتہیٰ قوتیں ہیں، لیکن اس دور میں قانونِ فطرت کی مضمر قوتیں مشہود ہو کر سامنے آ رہی ہیں۔ آپ کو معلوم ہے کہ ایک ایٹم (Atom) کے اندر کتنی قوت ہوتی ہے۔ اس قوت کی نمود قانونِ فطرت کے مطابق ہوتی ہے جو خدا کے بنائے ہوئے ہیں۔ ورنہ تمام ایٹم (Atoms) تو جب سے کائنات بنی ہے، قانونِ خداوندی کے مطابق پھیلے ہوئے تھے۔ اب جب اس ایٹم کا استعمال ہونا شروع ہوا ہے، آپ دیکھیے کہ اس کی قوتیں کتنی لامنتہا ہیں۔ اگر اسے تباہی کی لیے استعمال کرتے ہیں تو آپ نے دیکھ لیا کہ ایک ایٹم کا بم ہیروشیما کو تباہ کر دیتا ہے۔ دنیا کی سب بڑی بڑی Big Powers (بڑی قوتیں) اپنی اپنی جگہ کانپ رہی ہیں کہ ان کے

ہاتھ میں ایٹم ہے۔ جسے Atomic Energy (ایٹمی توانائی) کہتے ہیں اگر اس کو رفاہ کے لیے استعمال کیا جاتا ہے تو ان گاڑیوں کو آسمان اور چاند پہ لے جاتا ہے۔ یہ قوانینِ فطرت کے مظاہرے ہورہے ہیں۔ یہ وہ چیزیں ہیں جو بڑی آسانی سے ہماری سمجھ میں آجاتی ہیں۔اس لیے جب قرآن سمجھاتا ہے کہ جسے آپ قدرت یا طاقت کا سرچشمہ خدا کہتے ہیں تو اس نے اپنی اس طاقت کی نمود اس کائنات میں، قوانین کے ذریعے کی ہوئی ہے۔اور کائنات کے اندر اور نظامِ فطرت کے سلسلے میں قوانین کی طاقت کی متعدد مثالیں دی ہیں۔مثلاً سورۃ بقرۃ کی آیت 164 دیکھیے، اس میں کہا ہے کہ **اِنَّ فِیۡ خَلۡقِ السَّمٰوٰتِ وَالۡاَرۡضِ وَاخۡتِلَافِ الَّیۡلِ وَالنَّهَارِ وَالۡفُلۡكِ الَّتِیۡ تَجۡرِیۡ فِی الۡبَحۡرِ بِمَا یَنۡفَعُ النَّاسَ وَمَاۤ اَنۡزَلَ اللّٰهُ مِنَ السَّمَآءِ مِنۡ مَّآءٍ فَاَحۡیَا بِهِ الۡاَرۡضَ بَعۡدَ مَوۡتِهَا وَبَثَّ فِیۡهَا مِنۡ كُلِّ دَآبَّةٍ وَّتَصۡرِیۡفِ الرِّیٰحِ وَالسَّحَابِ الۡمُسَخَّرِ بَیۡنَ السَّمَآءِ وَالۡاَرۡضِ لَاٰیٰتٍ لِّقَوۡمٍ یَّعۡقِلُوۡنَ** (2:164)۔تم نے یہ دیکھنا ہو کہ کائنات میں کس طرح خدائے واحد کا قانون کارفرما ہے، اور وہ قانون کس طرح تعمیری نتائج مرتب کرتا ہے، تو اس کے لیے کائنات کی حیرت انگیز مشینری پر غور کرو اور دیکھو کہ اس کی پستیوں اور بلندیوں کی تخلیق کس طرح عمل میں آئی ہے۔ دن اور رات کی گردشِ مدام کس نظم وضبط سے جاری ہے۔ اتنے بڑے بڑے جہاز، منفعت بخش سامان سے لدے ہوئے، کس طرح سینۂ بحر پر تیرتے پھرتے ہیں اور وہ کونسا قانون ہے جو انہیں اس طرح تھامے ہوئے ہے۔اس صاف اور شفاف پانی کو دیکھو جو بادلوں سے برستا ہے اور زمینِ مردہ کو حیاتِ تازہ عطا کرتا ہے۔ نیز اس حقیقت پر بھی غور کرو کہ صفحۂ ارض پر، انواع واقسام کے چلنے پھرنے والے ذی حیات کس طرح پھیل رہے ہیں۔ ہوائیں کس طرح، خاص خاص موسموں میں، اپنی سمت بدلتی ہیں۔ بادل کس طرح زمین اور آسمان کی درمیانی فضا میں، قانونِ فطرت کی زنجیروں میں جکڑے اِدھر سے اُدھر کھنچے چلے جاتے ہیں۔ان تمام مظاہرِ فطرت پر غور کرنے سے انسان ایک ہی نتیجے پر پہنچ سکتا ہے۔اور وہ یہ کہ کائنات میں نظم وضبط ایک ذی اقتدار ہستی کے کنٹرول میں ہے لیکن اس نتیجہ پر وہی لوگ پہنچ سکتے ہیں جو عقل وفکر سے کام لیں۔

انسانوں کو طاقت کا سرچشمہ بنانے والوں کی لیے لمحہ فکریہ

عزیزانِ من! یہ ساری بات کہنے کے بعد اگلی آیت میں کہا کہ انسانوں کو طاقت کا سرچشمہ بنانے والے یا تصور کرنے والے ذرا سوچیں تو سہی کہ یہ جتنے قوانینِ فطرت ہیں کیا یہ انسانوں کے بنائے ہوئے ہیں یا کیا ان کے تابع تسخیر چل رہے ہیں؟ ان کے اندر اتنی بڑی قوت کس نے رکھی ہے؟ کیا یہ قوت انسانوں نے رکھی ہے؟ کہا کہ اگر عقل وفکر سے کام لوگے تو یہ حقیقت سامنے آجائے گی کہ ان میں انسان کی قوت کا کوئی دخل نہیں ہے۔ یہ خدا کے بنائے ہوئے قوانین ہیں جن کے تابع یہ اتنی بڑی قوتوں کے مظاہر تمہارے سامنے آتے ہیں۔ یہ کہنے کے بعد کہا کہ اب یہ بات تمہاری سمجھ میں آجائے گی۔ سنیے، عزیزانِ من! کہا کہ **اَنَّ الۡقُوَّةَ لِلّٰهِ جَمِیۡعًا** (2:165)۔

فی الواقعہ کائنات میں اقتدار و اختیار صرف خدا کو حاصل ہے۔ اُس کے سوا اور کسی کو نہیں ہے۔ یہ قوت کسی انسان کے پاس نہیں، نہ ایک فرد کے پاس، نہ تمام عوام کے پاس، نہ اقتدار والے طبقے کے پاس۔ قوت خدا کے ہاتھ میں ہے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ قرآن یہ آیت کہاں لایا ہے۔ یہ جو ان الفاظ کو Slogan (نعرے) کی طرح دہرانے والے ہیں، ان کے سامنے تو قوانینِ فطرت Laws of Nature کا سوال ہی نہیں ہے۔ وہ تو فطرت کا نام لینے والے کے پیچھے پڑ جاتے ہیں۔ تاریخ شاہد ہے کہ ایک دیدہ ور سرسید [1] نے یہ بات کہدی تھی کہ اے اللہ کے بندو! ذرا نیچر کے ان قوانین کو تو دیکھو جو اس کائنات میں کارفرما ہیں۔ تو اس کی اس بات کے خلاف اس پر کفر کے فتوے لگا دیئے گئے اور اسے نیچری کہا گیا۔

سرسیدؒ کو نیچری کے طور پر نیچری فرقہ قرار دیدیا گیا

عزیزانِ من! آج بھی جس نے سرسیدؒ کی بات مان لی وہ ان کے نزدیک نیچری ہو گیا۔ سرسیدؒ بار بار کہتا رہا کہ میں جو کچھ کہہ رہا ہوں خدارا آپ اس پر غور کریں لیکن افسوس انہوں نے نیچری کے نام پر ایک فرقہ بنا دیا۔ انہیں کیا پتہ کہ نیچر کیا ہے، نیچر کے قوانین کیا ہیں؟ انہیں کیا پتہ کہ قرآنِ کریم ان آیات میں کیا کہہ گیا ہے۔ یہ سب کچھ کہنے کے بعد جب قرآنِ کریم نے یہ کہا ہے کہ **اَنَّ الْقُوَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا** (2:165)۔ کائنات میں اقتدار و اختیار صرف خدا کو حاصل ہے اس کے سوا کسی کو نہیں ہے۔ سوال یہ ہے کہ اس کے معنی کیا ہیں؟ اس کے لیے تو وہ اِس سے پچھلی آیت میں کہتا ہے کہ **لَاٰيٰتٍ لِّقَوْمٍ يَّعْقِلُوْنَ** (2:164)۔ یہ بات تو ان کی سمجھ میں آئے گی جو عقل و فکر سے کام لیں گے، مگر ہمارے ہاں یہ کہا جاتا ہے کہ شرع وچ تے نہ شرم ہوندی اے، نہ عقل ہوندی اے۔ سیدھی گل اے۔ [2] اِس کے برعکس قرآن کہتا ہے کہ عقل و فکر سے کام لینے والوں کی سمجھ میں یہ سارا نظامِ فطرت، نیچر کے قوانین آئیں گے، اس کے بعد یہ نتیجہ اخذ کیا جائے گا کہ قوت کا سرچشمہ خدا ہے اور اس کے معنی کیا ہونگے۔ اس کے لیے عقل و فکر سے کام لینا ہوگا اور صرف عقل و فکر سے کام لینے والے ہی یہ سمجھیں گے کہ یہ سارا نظام قوانینِ خداوندی پر چل رہا ہے۔ اور ان قوانینِ خداوندی کے بارے میں کہہ دیا گیا ہے کہ **وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيْلًا** (33:62)۔ اور تو، خدا کے قوانین میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں پائے گا۔ یہ قوانین انسانوں کے بنائے ہوئے نہیں ہیں، خدا کے بنائے ہوئے غیر متبدل ہیں۔ اب قرآنِ کریم نے خارجی کائنات کے متعلق یہ ساری چیزیں، مشہود، محسوس مثالوں کے ذریعے سمجھا کر، یہ کہا کہ یہاں، اِن مظاہرِ فطرت میں تو تم مانتے ہو کہ قوت کا سرچشمہ خدا کی ذات ہے۔ اِسی سے سمجھ لو کہ اس کے عملی طور پر معنی یہ ہیں کہ اس کے بنائے ہوئے قوانین میں یہ قوت موجود ہے۔ اب یہاں سے وہ نگاہ کا رخ انسانی دنیا کی طرف موڑ دیتا ہے اور کہتا

---

[1] سرسید احمد خانؒ (1898 - 1817)

[2] شرع میں نہ شرم نام کی کوئی چیز ہوتی ہے نہ عقل نام کی۔ بس یہ ہے سیدھی سی بات

یہ ہے کہ جس خدا نے کائنات کا نظام چلانے کی لیے' اس قسم کے اشیائے فطرت کے قوانین بنائے ہیں' جن میں بڑی قوت ہے' اسی خدا نے انسانی زندگی کے لیے بھی قوانین دیئے ہیں۔ کائنات کے وجود میں آنے کے ساتھ ہی اشیائے فطرت کے یہ قوانین بھی وجود میں آ گئے تھے۔ یہ سب کے سب قوانین خدا کے بنائے ہوئے ہیں' انسان کے بنائے ہوئے نہیں ہیں۔ یہ سارا نظامِ کائنات اس حسن وخوبی سے اس لیے چل رہا ہے کہ یہ ان قوانین کی پابندی کر رہا ہے۔ اس نے کہا کہ اسی قسم کے قوانین ہیں جو ہم نے انسانی زندگی کے لیے بھی دیئے ہیں۔ ساری قوت ان قوانین کے اندر ہے۔ اِسی لیے اس نے ان قوانین کے متعلق کہا کہ وَلَنْ تَجِدَ لِسُنَّةِ اللّٰهِ تَبْدِيلاً (33:62)۔ تُو خدا کے قوانین میں کسی قسم کی تبدیلی نہیں پائے گا۔ خدا ان قوانین میں کوئی تبدیلی نہیں کرے گا۔ اس نے قوانین انسانوں کی زندگی کے متعلق دیئے ہیں۔ ان کے متعلق بھی کہا کہ لَا مُبَدِّلَ لِكَلِمٰتِ اللّٰهِ (6:34)۔ خدا کے قوانین اٹل ہیں۔ اُن میں کوئی ردوبدل نہیں کر سکتا۔

کلمات اللہ اور سنت اللہ کا قرآنی مفہوم اور فرق

عزیزانِ من! کیا بات ہے قرآن کی! ان دو آیات میں قرآن نے کلمات اللہ اور سنت اللہ کے الفاظ استعمال کیے ہیں۔ اسے یوں سمجھیے کہ یہ جو نظامِ فطرت ہے' جہاں اس کے قوانین آئے ہیں' قرآن نے انہیں سنت اللہ کہا ہے اور انسانوں کے متعلق اس نے جو قوانین وحی کے ذریعے دیئے ہیں انہیں کلمات اللہ کہا ہے۔ ان میں ایک بڑا ہی عجیب لطیف فرق ہوتا ہے۔ سنت وہ قانون ہوتا ہے جو مشہود ہو کر سامنے آ جائے اور کلمہ وہ قانون ہوتا ہے جو نظریئے کے طور پہ دیا گیا ہو۔ یہ اس لیے ہے کہ یہ جو قرآنِ کریم نے انسانوں کے لیے قوانین دیئے ہیں یہ نظری حیثیت سے دیئے ہیں۔ عملی حیثیت سے انہیں انسانوں نے خود اپنے معاشرے کے اندر نافذ کرنا ہے۔ جب یہ ان قوانین کو معاشرے میں نافذ کر دیں گے تو یہ سنت اللہ ہو جائیں گے۔ انسانی زندگی کے لیے بھی اس نے قوانین دیئے ہیں۔ اب پوری قوت نہ کسی ایک فرد میں ہے' جسے آپ ملوکیت کہتے ہیں' نہ انسانوں کی پوری جماعت کے اندر ہے جسے آپ جمہوریت کہتے ہیں۔ اکاون فیصد تو ایک طرف رہے جسے آپ سو فیصد کہتے ہیں جو مغرب کی جمہوریت ہے اُس میں بھی یہ پوری قوت نہیں ہے' نہ ہی وہ پوری قوت کلیسا یا چرچ یا مذہبی پیشواؤں کے پاس ہے۔ انہوں نے کہا کہ ہمیں خدا کی نیابت حاصل ہے' نمائندگی حاصل ہے اور یہ بھی کہا ہے کہ خدا نے ہمیں اختیارات تفویض کر دیئے ہیں۔ یہ سب غلط ہے۔

قوانینِ فطرت ہوں یا انسانی زندگی کے قوانین ہوں' ان سب کو خدا نے اپنے کنٹرول میں رکھا ہے

عزیزانِ من! جس طرح اس نے قوانینِ فطرت کسی کو تفویض نہیں کیے' انہیں اپنے ہی ہاتھ میں رکھا ہے' اسی طرح یہ قوانین جو انسانی زندگی کے لیے دیئے گئے ہیں' یہ بھی کسی کو تفویض نہیں کیے گئے۔ یہ ایک ضابطہ قوانین ہے اور جب بھی کوئی مملکت وجود میں آتی ہے تو اس مملکت کے آئین کا ایک ضابطہ قانون ہوتا ہے' جسے آپ قوتِ نافذہ کہتے ہیں' دراصل یہ وہ اتھارٹی ہوتی ہے جسے آپ حکومت کہتے

ہیں۔اس حکومت کا کام ان قوانین کو نافذ کرنا ہوتا ہے۔اس طرح جسے آپ اسلامی مملکت یا قرآنی نظام کہیں گے اس کا کام صرف یہ ہوگا کہ وہ خدا کے اِس دیئے ہوئے ضابطۂ قوانین کو عملاً معاشرے کے اندر صرف نافذ کرے۔اِس نافذ کرنے والوں کے پاس اپنی کوئی ذاتی قوت نہیں ہوتی۔یہ نکتہ غور طلب ہے۔

انجن کو چلانے کی قوت اسٹیم میں ہوتی ہے ڈرائیور میں نہیں ہوتی

عزیزانِ من! میں نے کہا ہے کہ ان قوانین کو نافذ کرنے والوں کے پاس اپنی ذاتی کوئی قوت نہیں ہوتی۔وہ جو کھڑا ہوا ڈرائیور اتنے بڑے انجن کو چلاتا ہے اس کے پاس اپنی کوئی قوت نہیں ہوتی۔قوت اس اسٹیم (بھاپ) کے اندر ہوتی ہے جس پہ وہ کنٹرول رکھے ہوئے ہوتا ہے جسے وہ نافذ کررہا ہوتا ہے۔قرآن کی رو سے نظام یہ ہے۔آپ کے ہاں سیاست اور حکمرانی کی پوری کی پوری قوت قوانینِ خداوندی میں ہے جو اس نے وحی کے ذریعے آپ کو دیئے ہیں۔وہ اس کے ضابطہ ہدایت یا کتاب اللہ یا کلام اللہ یا قرآنِ مجید کے اندر دیئے ہوئے قوانین ہیں۔قوت ان قوانین کے اندر ہے۔یہ قوانین نافذ نہیں ہیں تو پھر جس کا جی چاہے اپنے ہاتھ میں وہ قوت لے لے۔وہ غیر اللہ کہلائے گا اور اگر حقیقت میں ایمان یہ ہے کہ اَنَّ الْقُوَّةَ لِلّٰهِ جَمِيْعًا (2:165)۔فی الواقعہ کائنات میں اقتدار و اختیار صرف خدا کو حاصل ہے اس کے سوا کسی اور کو نہیں ساری قوت خدا کے ہاتھ میں ہے تو اس کے معنی یہ ہونگے کہ قوانینِ خداوندی کو نافذ کیا جائے۔یوں یہ ساری قوت ان قوانین کو حاصل ہوگی اور قرآن کے الفاظ میں یہ قوت خدا کو حاصل ہو جائے گی۔یہ ہے جو قرآن نے کہا تھا کہ مَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ (22:74)۔حقیقت یہ ہے کہ ان لوگوں نے اللہ کے متعلق صحیح اندازہ لگایا ہی نہیں جیسا کہ لگانا چاہیے۔اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِيٌّ عَزِيْزٌ (22:74)۔وہ بڑی قوتوں کا مالک ہے اور ہر ایک پر غالب ہے۔اللہ کو ایسا ہونا چاہیے نہ کہ ویسا جیسا تم نے تصور کر رکھا ہے۔

خدا کے صحیح تصور کی اہمیت

عزیزانِ من! ان کے ہاں خدا کا تصور صحیح نہیں ہے۔خدا کا یہ تصور صحیح کر کے لے آیئے آپ دیکھیے کہ یہ جتنے اہم مسائل ہیں وہ کس طرح آسانی سے حل ہوتے چلے جاتے ہیں۔میں پھر اس چیز کو دہرادوں کہ قرآن کا ارشاد ہے کہ ایک سے زیادہ اِلٰـــہ مقرر کر لینے سے فساد رونما ہوتا ہے (45:23)۔غور کیجیے کہ آج یہ جو ہر طرف فساد ہی فساد رونما ہو رہا ہے تو کیا اس کی یہی وجہ نہیں کہ ہر انسانی قلب صنم کدہ بن رہا ہے؟ ہر گروہ اور ہر قوم اپنی اپنی خواہشات کو خدا بنائے بیٹھی ہے اور اس ''خدائے خواہشات وجذبات'' کے تغلب وتسلط میں جائز وناجائز کی کوئی تمیز باقی نہیں رکھتی؟ جائز بقول لینن (1924-1870) اور میکیاؤلی (1527-1469) وہ ہے جس سے مقصد حاصل ہو جائے اور ناجائز وہ جو حصولِ مقاصد میں مخل ہو۔یہ ہیں وہ بت جنہوں نے دنیا کو جہنم بنا رکھا ہے۔ان بتوں کی تعمیر کسی سنگ تراش کے ہاں نہیں ہوتی بلکہ یہ ذہن انسانی کے کارخانے میں ڈھلتے ہیں۔ان کا مسکن کوئی مندر نہیں قلب انسانی ہے۔مال اور اولاد کا بت

عزت ووجاہت کا بت، دولت وثروت کا بت، حکومت وسلطنت کا بت، ملک ونسب کا بت اور خدا جانے کون کون سے لات ومنات اور کون کون سے ہبل وعزیٰ انسانی دماغ میں ہر آن تراشے جاتے ہیں۔

می تراشد فکر ما ہر دم خداوندے دگر
رست از یک بند تا افتاد در بندے دگر

(اقبال رحمہ اللہ)

عزیزانِ من! اللہ پر ایمان کا اہم مقصد یہ ہے کہ قرآنِ کریم کی رو سے، انسان کا نصب العین حیات اس زمین پر خدا کی حکومت کا قیام ہے۔ انسان کو تمام مخلوق سے اشرف اور جملہ اشیائے فطرت کا مخدوم پیدا کیا گیا ہے۔ اس کا فریضۂ زندگی یہ ہے کہ کائنات کی ہر شے کو اپنے تابع فرمان بنائے اور خود اللہ تعالیٰ کے قوانین کے تابع رہے اور اس طرح اپنی ذات میں استحکام پیدا کر کے قوانینِ خداوندی کو ساری دنیا پر نافذ کر دے۔ وہ جماعت جو اس فریضہ انسانیت کی تکمیل کرتی ہے، وہ ذات وصفاتِ خداوندی (Attributes of God) پر قرآنی تعلیم کے مطابق ایمان رکھتی ہے۔ اس لیے یہ ضروری ہے کہ اس جماعت کے افراد میں، بشریت کی حدود کے اندر، اپنی امکانی وسعتوں کے ساتھ، صفاتِ خداوندی کا پرتو جھلک رہا ہو، اس کے آئینۂ قلب میں اُس کے نور کا عکس مرتسم ہو۔ اس بے مثل و بے ہمتا، اس ''برتر از قیاس وخیال وگمان ووہم'' خدائے عرش کی صفاتِ جلیلہ کا خاکہ اس قدسی نفس جماعت کے محسوس پیکروں میں فرش زمین پر منقوش نظر آتا ہو۔ اِس جماعت کے پیرہنِ قلوب واذہان (Heart and Mind)، اس صنّاعِ نادرہ کار کے حسین وجمیل رنگ میں رنگے ہوئے ہوں۔ یعنی صِبْغَةَ اللّٰهِ وَمَنْ اَحْسَنُ مِنَ اللّٰهِ صِبْغَةً (2:138) ❶

رنگ او برکن مثال او شوی!
در جہاں عکس جمال او شوی!

(اقبال رحمہ اللہ)

عزیزانِ من! خدا کے اس راز کو پانے کے جو عابد وزاہد مدعی ہیں انہوں نے تو کسی سے یہ بتایا ہی نہیں تھا کہ سعادت قانون خداوندی سے یک رنگ وہم آہنگ ہونے سے حاصل ہوتی ہے۔ اِس رنگ سے زیادہ حسین رنگ اور کون سا ہو سکتا ہے؟ ہمیں حیرت ہے کہ یہ جو بادہ کش ❷ ہیں، انہوں نے یہ کچھ کہاں سے سن لیا۔

---

❶ نجات وسعادت رنگ چھڑکنے (بچوں کو بپتسمہ دینے) سے حاصل نہیں ہوتی۔ یہ قانونِ خداوندی سے یک رنگ وہم آہنگ ہونے سے حاصل ہوتی ہے۔ اس رنگ سے زیادہ حسین رنگ اور کونسا ہوسکتا ہے؟

❷ (در حیرتم کہ بادہ کشاں از کجا شنید) یہ قائداعظم محمد علی جناحؒ (1876-1948) کی طرف اشارہ ہے۔

قائداعظم رحمۃ اللہ علیہ کا فرمان: قانون کی قوت' قانون کی حکمرانی

عزیزانِ من! مجھے تو حیرت نہیں ہوتی کیونکہ مجھے اس شخص کے قریب رہنے کی یہ سعادت حاصل تھی جسے مسٹر محمد علی جناحؒ (1876-1948) کہہ کے پکارتے رہے' جس کے متعلق کہتے رہے کہ اس کے خیالات اور نظریات میں اسلام کی چھینٹ تک نہیں گئی۔ ❶ میں کہتا ہوں کہ اتنی بڑی تشریح جتنی میں نے اتنے عرصے میں کی ہے' اور جسے کئی ہفتے' کئی دن' کئی مہینے تشریح در تشریح کرتے ہوئے لگ جائیں گے اس نے ایک فقرے میں بات کہدی کہ اسلامی حکومت کی یہ امتیازی خصوصیت پیشِ نظر رکھیے کہ اس میں' ہماری پابندی اور آزادی کے' حدود وقوانینِ خداوندی مقرر کرتے ہیں۔ ❷

عزیزانِ من! قوت کے معنی یہی ہیں کہ وہ پابندی اور آزادی کی حدود مقرر کرے۔ قائداعظم محمد علی جناح نے قرآن کریم سے واضح کیا تھا کہ یہ نہیں کرنا' یہ کرسکتے ہو' یہاں تک جاسکتے ہو' اس سے آگے نہیں جاسکتے' یہ قانون کے مطابق ہے' یہ خلافِ قانون ہے' خلافِ قانون ہے تو مواخذہ ہوگا' قانون کے مطابق ہے تو مواخذہ بالکل نہیں ہوگا۔ اسی کو آزادی اور پابندی کہتے ہیں۔ اس نے اس خطہ زمین کے حصول کے لیے یا اس کی آزادی کے لیے Fight (حرب وضرب) نہیں کیا تھا' اس نے یہ ساری جنگ اس لیے لڑی تھی کہ انسانوں پر پابندی اور آزادی لگانے کا اختیار صرف قانونِ خداوندی کے لیے ہو' کسی انسان کی لیے نہ رہے۔ یہ تھی جنگ' عزیزانِ من! جو وہاں تحریکِ پاکستان میں لڑی گئی تھی۔ اب میں عمر کے اس حصے میں ہوں جہاں مجھے یہ چیزیں کہنی چاہئیں۔ اگر عمر کا یہ حصہ نہ ہوتا تو میں یہ چیزیں کبھی نہیں کہتا۔

---

❶ یہ بات سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ (1903-1978) نے کہی تھی۔ ان کے اصل الفاظ یہ تھے:
''ان کے خیالات' نظریات اور طرزِ سیاست اور قیادت میں خوردبین لگا کر بھی اسلامیت کی کوئی چھینٹ نہیں دیکھی جاسکتی۔ ان کا یہ خیال ہے کہ چھوٹے سے چھوٹے مسائل سے لے کر بڑے سے بڑے مسائل تک کسی معاملہ میں بھی انہیں قرآن کا نقطۂ نظر نہ تو معلوم ہی ہے اور نہ ہی اسے تلاش کرنے کی ضرورت محسوس کرتے ہیں۔ انہیں نورِ ہدایت صرف مغربی قوانین ودساتیر ہی میں ملتا ہے۔ (ترجمان القرآن۔ ذی الحجہ 1359ھ' ص۔474)۔''

❷ جب قائداعظم محمد علی جناحؒ اگست 1941ء میں حیدرآباد (دکن) گئے تو عثمانیہ یونیورسٹی کے طالب علموں نے ان سے کچھ سوالات پوچھے۔ ان کا ایک سوال یہ تھا کہ اسلامی حکومت کے تصور کی امتیازی خصوصیت کیا ہے؟ ان کا جواب تھا کہ ''اسلامی حکومت کے تصور کا یہ امتیاز ہمیشہ پیشِ نظر رہنا چاہیے کہ اس میں اطاعت اور وفاکیشی کا مرجع خدا کی ذات ہے' جس کی تعلیم کا عملی ذریعہ' قرآن مجید کے احکام اور اصول ہیں۔ اسلام میں اصلاً نہ کسی بادشاہ کی اطاعت ہے' نہ پارلیمان کی اور نہ کسی اور شخص یا ادارہ کی۔ قرآنِ کریم کے احکام ہی سیاست ومعاشرت میں ہماری آزادی اور پابندی کے حدود متعین کرتے ہیں۔ اسلامی حکومت دوسرے الفاظ میں قرآنی اصول اور احکام کی حکمرانی ہے اور حکمرانی کے لیے آپ کو لامحالہ علاقہ اور مملکت کی ضرورت ہے۔''
(پرویزؒ: پمفلٹ ''معمارانِ پاکستان (بتقریب یوم آزادی۔ اگست 1976ء)'' ادارہ طلوع اسلام' لاہور' (سال اشاعت درج نہیں ہے' ص۔16)

قائد اعظم رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ دس سال تک کام کرنے کی سعادت

عزیزانِ من! مجھے قائد اعظم محمد علی جناح ؒ (1876-1948) کی زیر سرپرستی 10 سال تک کام کرنے کی سعادت حاصل ہوئی۔ ان کے ساتھ گھنٹوں ان موضوعات پر گفتگو ہوتی تھی۔ ان کا ایک فقرہ ہے کہ درحقیقت اسلام کے نقطۂ نگاہ سے طاقت کا سرچشمہ نہ بادشاہ نہ حکمرانوں کی جماعت' نہ عوام' نہ مذہبی پیشوا' کوئی بھی نہیں۔ آزادی اور پابندی کے حدود قوانینِ خداوندی مقرر کرتے ہیں۔ یہ ہے سارا راز۔ یہ ہے اسلامی مملکت کی بنیاد۔ یہ ہے دین۔ یہ ہے قرآن کا پیغام۔ یہ ہے اصلِ حقیقت۔ اب آزادی اور پابندی کی حدود مقرر کرنے کی یہی تو قوت ہوتی ہے۔ یہ اس نے کہا۔ اور یہ بات اس شخص نے اس Message (پیغام) کے اندر سمجھائی کہ اطاعت درحقیقت خدا کی ہے' لیکن اس کا عملی ذریعہ اس کے قوانین ہیں' جو اس نے قرآن میں دیئے ہیں۔ اب دیکھیے کہ بات کتنی صاف کردی ورنہ کہنے کے لیے تو یہ آج بھی کہتے ہیں کہ قوت کا سرچشمہ اللہ تعالیٰ کی ذات ہے' لیکن ان سے پوچھیے تو بتا نہیں سکتے کہ اس کے معنی کیا ہیں۔ اس کے معنی اس شخص نے بتائے۔ یہ تھا وہ نصب العین جس کے لیے یہ مملکت لی تھی۔ ہاں تو' عزیزانِ من! میں کہہ یہ رہا تھا کہ اگر خدا کے متعلق صحیح تصور قرآن کی رو سے سامنے آجائے تو یہ سارے مسائل حل ہوجاتے ہیں' کچھ دشواری نہیں رہتی ❶ لیکن اس کا کیا علاج کہ

تیرا ہی جی نہ چاہے تو باتیں ہزار ہیں

قرآن کریم نے بروقت کہا تھا کہ مَا قَدَرُوا اللّٰهَ حَقَّ قَدْرِهٖ (22:74)۔ حقیقت یہ ہے کہ ان لوگوں نے اللہ کے متعلق صحیح اندازہ لگایا ہی نہیں' جیسا کہ اندازہ لگانا چاہیے۔ اور اس کے بعد کہا کہ اِنَّ اللّٰهَ لَقَوِيٌّ عَزِيْزٌ (22:74)۔ یاد رکھو! قوت کسی کے ہاتھ میں نہیں ہے' یہ صرف اور صرف خدا کے ہاتھ میں ہے۔

انسانوں کی دنیا میں قوت کے نفاذ کا طریق کیا ہوگا؟

عزیزانِ من! یہ کچھ اس طرح سمجھنا ان کے بس کی بات نہیں۔ ان کے نزدیک تو قرآن میں ربط ہی نہیں مگر یہ تو دیکھیے کہ قرآن کیسے حسین اشارے میں بات کرگیا کہ اب انسانوں کی دنیا کے اندر خدا کی یہ قوت کیسے عمل میں آئے گی' عملاً اس قوت کا نفاذ کس طرح سے ہوگا۔ اس کے لیے کہا کہ اس نے طریقہ یہ مقرر کیا ہے کہ اَللّٰهُ يَصْطَفِيْ مِنَ الْمَلٰٓئِكَةِ رُسُلًا وَّمِنَ النَّاسِ ❷ (22:75)۔

---

❶ تیرے سوا کوئی شائستۂ وفا بھی تو ہو!! میں ترے دَر سے جو اٹھوں تو کس کے دَر جاؤں

❷ اِس آیت کا مفہوم یہ ہے کہ ''اللہ ان ملائکہ (Cosmic Forces) میں سے بعض کو اس کام کے لیے چن لیتا ہے کہ وہ اس کی وحی رسولوں تک پہنچائیں اور ان انسانوں میں سے بعض منتخب کرلیتا ہے کہ وہ اس وحی کو دوسرے انسانوں تک پہنچا دیں۔ (یہ ہستیاں نہ تو خود قدرت رکھتی ہیں اور نہ ہی لوگوں کی حاجتوں کو خدا تک پہنچانے کا ذریعہ بنتی ہیں' اس لیے کہ خدا کو ان ذرائع کی ضرورت ہی نہیں۔)

کائنات کی قوتیں اشیائے کائنات میں ہیں یعنی اشیائے کائنات میں تو اس نے اپنے قوانین از خود وحی کر دیئے ہیں' انہیں اشیائے کائنات میں براہِ راست وحی کر دیا ہے' ہر شے کو اس کی پیدائش کے ساتھ ہی بتا دیا ہے کہ اس کا دائرہ کار کیا ہے مثلاً بطخ کے بچے کو بتا دیا ہے کہ تم پانی میں تیرو گے' مرغی کے بچے کو بتا دیا ہے کہ پانی کی طرف نہ جانا' ہلاک ہو جاؤ گے۔ اس لیے ان کی طرف کسی نبی کے بھیجنے کی ضرورت نہیں' ان کے پاس کوئی رسول نہیں آتا' بھیڑوں کی طرف کوئی رسول یہ کہنے کے لیے نہیں آتا کہ تم نے گھاس چرنا ہے گوشت نہیں کھانا۔ نظامِ کائنات کے اندر نبوت یا رسالت کے تصور کی کوئی ضرورت نہیں ہے' یہ کچھ ان اشیائے کائنات کے ہاں براہِ راست آتا ہے مثلاً شہد کی مکھی کے لیے کہا کہ **اَوۡحٰی رَبُّکَ اِلَی النَّحۡلِ** (16:68)۔ ہم نے شہد کی مکھی کی طرف براہِ راست وحی کر رکھی ہے لیکن انسانوں کی طرف وحی کے لیے اس نے کہا کہ اس طرح سے براہِ راست ہر فرد کو یہ وحی نہیں مل گئی۔ اس کے لیے ہمارا طریقہ یہ ہے کہ اس مقصد کے لیے ہم خود انسانوں میں سے منتخب کرتے ہیں۔ خود ''ملک'' کے معنی بھی پیغامبر کے ہیں۔ کہا کہ ہم انہیں اس مقصد کے لیے منتخب کرتے ہیں کہ وہ ہمارے قوانین انسانوں تک پہنچائیں لیکن وہ تمام انسانوں تک آگے نہیں پہنچاتے۔

انسانوں تک قوانین پہنچانے کا طریق ایک حکمت پر مبنی ہے

رُسُلًا وَّمِنَ النَّاسِ اور انسانوں میں سے ہم نے ایک شخصیت کو منتخب کیا ہوتا ہے۔ پیغامبرانِ خداوندی آ کر وہ پیغامات اُسے پہنچاتے ہیں۔ یہاں ہم نے اپنے قوانین کو انسانوں تک پہنچانے کا یہ طریق اختیار کر رکھا ہے۔ خدا اپنے قوانین اشیائے کائنات کی طرح ان انسانوں کے اندر از خود نافذ نہیں کرتا۔ میں بتا چکا ہوں کہ اس عمل کے اندر تو بڑی لم ہے۔ اشیائے کائنات مجبور پیدا کی گئی ہیں' ان کو اختیار و ارادہ نہیں دیا گیا' وہ جبراً اور طوعاً کرھاً ان قوانین کی اطاعت کرتی ہیں یا طبعاً یا جسے آپ فطرتاً کہتے ہیں' ان کی اطاعت کرتی ہیں۔ انسانوں کے متعلق یہ تھا کہ یہ اپنے اختیار و ارادہ سے یہ کچھ کرے' اس لیے کہ انسان کو جو انسانی ذات یا خودی یا نفس دیا گیا ہے اس کی نشوونما' ارادے کے استعمال سے' اختیار کے استعمال سے ہوتی ہے۔ اس لیے جہاں اس نے خود براہِ راست اپنے قوانین اپنی طرف سے' دیئے ہیں تو اس میں اشیائے کائنات کو قوانین دینے کا طریقہ اپنایا ہے لیکن انسانوں کے لیے اس نے دوسرا طریقہ اختیار کیا۔ پہلے ایک منتخب شخصیت یعنی رسول کسی رسول تک پہنچائے' رسول نے انسانوں تک پہنچانے کا طریق اختیار کیا اور پھر اس کے بعد ان سے کہہ دیا گیا کہ **فَمَنۡ شَآءَ فَلۡیُؤۡمِنۡ وَّمَنۡ شَآءَ فَلۡیَکۡفُرۡ** (18:29)۔ یہ قوانین ہیں۔ تم اپنے اختیار و ارادے سے' جس کا جی چاہے اس کے مطابق زندگی بسر کرو' جس کا جی چاہے اس کی خلاف ورزی کرو۔ اگر تم نے صرف قوت خدا کے ہاتھ سے لینی ہے' تو ان قوانین کے تابع زندگی بسر کرو' ایسا نظام وضع کرو کہ یہاں یہ قوانین عملاً نافذ ہو جائیں۔ اگر تم ایسا نہیں چاہتے' انسانوں کی ہی اطاعت چاہتے ہو' انسان ہی دوسروں کو اپنا محکوم بنانا چاہتے ہیں تو ٹھیک ہے ان قوانینِ خداوندی کو دھرا رہنے دو۔ اس سلسلہ میں جیسے تمہارے جی میں آئے' کرو' نتیجہ

بہرحال بھگتنا پڑے گا۔ اِن کے تابع زندگی بسر کرو گے تو کائنات کے نظام میں حسن اور تمہاری اپنی زندگی کے اندر رعنائیاں، نکہتیں اور خوبصورتیاں پیدا ہوجائیں گی اِن کی خلاف ورزی کرو گے تو اس کا نتیجہ فساد، انتشار اور ظلم ہوگا، یہ سارا کچھ ہوگا۔ اب تمہارے جی میں آئے تو یہ اختیار کرلو، تمہارے جی میں آئے تو اُسے اختیار کرلو۔ ہم نے یہ چیزیں دیدیں۔ اس کے بعد پھر یہ نہیں ہے کہ اندھا قانون دیدیا ہے کہ معلوم نہیں اس کے وہ نتائج نکلیں یا نہ نکلیں۔ اِنَّ اللّٰہَ سَمِیۡعٌ بَصِیۡرٌ (22:75)۔ اللہ سب کچھ سننے والا، دیکھنے والا ہے۔

کائنات کے متعلق یورپ کا تصور

عزیزانِ من! قانون دینے والے کا ایک تصور یورپ میں بھی ہے کہ خدا نے کائنات کو یہ قوانین تو دیدیئے ہیں اب اطمینان سے سو رہا ہے یا کسی اور کام میں مشغول ہے۔ کہتے ہیں کہ یہ بالکل ایسے ہی ہے جیسے آٹھویں دن ایک دفعہ گھڑی کو چابی دیتے ہیں تو پھر آٹھ دن تک اس کو دیکھنے کی ضرورت ہی نہیں پڑتی، اسی طرح ان اہل یورپ کا وہ تصور ہے کہ خدا نے ایک دفعہ کائنات میں یہ چابی دیدی ہے اور اب اطمینان سے سو رہا ہے یا کسی اور کام میں مشغول ہو رہا ہے، اب اس کی طرف اسکی کوئی توجہ نہیں، اس کو اس کی ضرورت ہی نہیں گویا ویلا ہوگیا...... معاذ اللہ...... تاش کھیڈن بہہ گیا۔ [1] قطعاً نہیں، قانون کے پیچھے جو قوت نافذہ ہوتی ہے، عزیزانِ من! اس کے لیے تو اسے ہر وقت بڑا الرٹ (ہوشیار، چوکنا) رہنا پڑتا ہے۔ ذرا قانون کی طرف سے قانون نافذ کرنے والی ہستی کی آنکھ چوکی، وہ قانون خود لاقانونیت ہوجاتا ہے، بے نتیجہ ہو کے رہ جاتا ہے۔ اسی لیے یہ کہا کہ قانون ہم نے دیدیئے لیکن اس دینے کے بعد یہ نہیں ہے کہ پھر ہم کہیں اور چلے گئے اور کام ختم ہوگیا، یہ اندھی قوت نہیں ہے یہ Blind Nature (اندھی فطرت) نہیں کیونکہ اِنَّ اللّٰہَ سَمِیۡعٌ بَصِیۡرٌ (22:75)۔ اللہ سب کچھ سننے والا، دیکھنے والا ہے۔

ذاتِ خداوندی ہر وقت علیم و خبیر ہے

عزیزانِ من! خدا حقیقتِ حال سے کہہ رہا ہے کہ میں سب کچھ دیکھتا ہوں، سب کچھ سنتا ہوں اور مزید یہ کہ یَعۡلَمُ مَا بَیۡنَ اَیۡدِیۡهِمۡ وَمَا خَلۡفَهُمۡ (22:76)۔ وہ تمام نوعِ انسان کے حال اور مستقبل تک سے واقف ہے۔ وہ خدا ماضی کا بھی علم رکھتا ہے، مستقبل تک کا علم رکھتا ہے، جانتا ہے کہ یہ جو کچھ کرتے ہیں اس کا نتیجہ اس کے قوانین کے مطابق کیا نکلنا ہوگا۔ یاد رکھو! قانون دینے کے بعد یہ نہیں ہے کہ تم قوانین کی خلاف ورزی کرو اور نتائج اپنی مرضی کے مطابق نکال لو۔ تمہیں یہ تو اختیار حاصل ہے کہ جی چاہے تم مصری کی ڈلی کھالو اور جی چاہے تو سنکھیا کی پڑیا پھانک لو۔ یہ تو تمہارے اختیار میں ہے۔ یہ تمہارے اختیار میں نہیں ہے کہ سنکھیا پھانکو اور نتیجہ مصری کی

---

[1] کام سے فارغ ہو بیٹھا...... معاذ اللہ...... لگا کھیلنے تاش۔

ڈلی کا نکال لو۔نہیں، یہاں تمہارا اختیار ختم ہو جاتا ہے کیونکہ وَاِلَى اللّٰهِ تُرْجَعُ الْاُمُوْرُ (22:76)۔تمام معاملات کے فیصلے ہمارے قانون ہی کے مطابق ہوتے ہیں۔کائنات کے جملہ امور ہمارے ہی مرکزی اقتدار کے گرد گردش کرتے ہیں۔کوئی بات ہمارے حیطۂ اقتدار سے باہر نہیں جاسکتی۔عزیزانِ من! آپ نے غور فرمایا کہ "قَوِیٌّ عَزِیْزٌ" (22:74) کہہ کے ضَعُفَ الطَّالِبُ وَالْمَطْلُوْبُ (22:73) کہہ کر' اس کے بعد یہ کہہ دیا کہ ہم نے اپنے قوانین کو انسانوں تک پہنچانے کا کیا طریق اختیار کیا۔کتنے اہم مسائل ہیں جو قرآن' ان الفاظ میں' ان آیات میں' حل کرتا چلا جاتا ہے۔قرآن تو قدم قدم پہ چار آیتوں کے بعد یَعْقِلُوْنَ' یَتَفَکَّرُوْنَ' یَشْعُرُوْنَ' یَتَدَبَّرُوْنَ' کی تاکید کرتا چلا جاتا ہے یعنی اوغور کرو' فکر کرو' شعور سے کام لو' تدبر سے کام لو' علم سے بصیرت سے کام لو۔وہ ان پر کیوں زور دیتا چلا جاتا ہے؟ مذہب میں تو کسی معاملے میں بھی آپ کو عقل و فکر کی ضرورت نہیں ہوتی۔وہاں تو آپ "کیوں" پوچھ ہی نہیں سکتے۔یہاں قدم قدم پر وہ "کیوں" کی بات کر رہا ہے۔وہ اس لیے کہ یہ وہ آیات ہیں جن پر آپ جب بھی غور و فکر کریں گے تو آپ دیکھیں گے کہ یہ معاملات انہی کے اندر چھپے ہوئے ہوتے ہیں۔انہی میں موجود ہمارے ہاں کا بنیادی مسئلہ' نظامِ سیاست' بڑا ہی اہم مسئلہ ہے۔آپ دیکھیں گے کہ یہ کس طرح سے حل کرتا ہوا چلا جاتا ہے۔اب جیسا کہ میں کہا کرتا ہوں کہ ہر سورۃ کی آخری آیات میں قرآن اس ساری تعلیم کو جو پوری سورۃ میں دی ہوئی ہوتی ہے Sum-up (تلخیص) کر کے رکھ دیتا ہے۔ہم سورۃ الحج کی آخری دو آیات پہ آ گئے۔یہاں تک پہنچ گئے کہ قوت کا سرچشمہ قوانینِ خداوندی ہے' اِن قوانینِ خداوندی کو ہم نے رسولوں کے ذریعے انسانوں تک پہنچا دیا۔ملائکہ رسل یعنی پیغامبر تھے' انہوں نے ان قوانینِ خداوندی کو کسی ایک رسول تک پہنچا دیا' اس رسول نے پیغامبری کا فریضہ ادا کیا' اپنے وقت کے تمام انسانوں تک پہنچا دیا۔نبوت یعنی خدا کی طرف سے قوانین ملنے کا طریقہ ختم ہو گیا کیونکہ وہ قوانین قرآنِ کریم میں مکمل ہو گئے' غیر متبدل ہو گئے' محفوظ ہو گئے۔اِن قوانین کی طرح کے مزید قوانین کے آنے کی ضرورت نہ رہی۔اب باقی کام ان کی اطاعت کرنے اور انہیں دوسروں تک پہنچانے کا رہ گیا۔

ختمِ نبوت کے بعد کا طریق

عزیزانِ من! اب اس کے لیے خدا کی طرف سے کوئی نبی یا رسول نہیں آئے گا۔اس کی ضرورت نہیں ہے۔سوال یہ ہے کہ اب کیا کیا جائے گا؟ کہا گیا کہ پہلے تو سن رکھو۔اب خطاب آ رہا ہے' بالخصوص ان کی طرف جو اس حقیقت پر ایمان رکھتے ہیں' اس کی صداقت پر یقین رکھتے ہیں کہ ہمارے ہاں کی سیاست کا' تمدن کا' معاشرت کا اور معیشت کا نظام یہ ہے کہ قوت کا اصل سرچشمہ قانونِ خداوندی ہے لہٰذا ہمارے ہاں انہی کو نافذ کرنا ہیئتِ اجتماعیہ کا فریضہ ہے۔دراصل ان کے اندر یہ قوت موجود ہے اس لیے مخاطب کر کے کہا کہ یٰۤاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا (22:77)۔اے ایمان والو! اے وہ افرادِ انسانیہ جو حقیقت پر ایمان رکھتے ہیں' اس پہ یقین رکھتے ہیں کہ ارْكَعُوْا وَ

اسْجُدُوْا وَاعْبُدُوْا رَبَّكُمْ (22:77)۔تم خدا کی عبودیت (محکومیت) اختیار کرو؛ اس کے قوانین کے سامنے جھکو اور ان کی پوری پوری اطاعت کرو۔

لفظ رب کا عملی مفہوم

عزیزانِ من! کیا انداز ہے! سورہ الحج کی آخری دو آیات ہیں؛ اس آیت کے الفاظ ہیں کہ وَاعْبُدُوْا رَبَّكُمْ (22:77)۔ اطاعت اختیار کرو؛ کامل محکومیت اختیار کرو۔ سوال یہ ہے کہ کس کی؟ جواب میں لفظ رب کہا ہے یعنی وہ جو تمہاری نشوونما چاہتا ہے۔ کیا بات ہے! نشوونما اور پرورش قوانین کے اتباع سے ہوتی ہے۔ فزیکل لائف (طبعی زندگی) میں آپ صحت کے متعلق قوانین؛ غذا کے متعلق قوانین؛ لباس رہنا سہنا سانس لینا سب کے لیے قوانین دیکھ لیجیے۔ ان کے مطابق زندگی بسر کرتے چلے جاؤ تو پرورش ہوتی چلی جائے گی۔ ان کی خلاف ورزی کرو؛ صحت بگڑے گی؛ بیماریاں آئیں گی؛ قبل از وقت موت آ جائے گی۔ یہ تو سیدھی سی بات ہے۔ ربوبیت ہے تو ربوبیت کا ایک پہلو تو طبعی زندگی کا ہے۔ اس پہ تو اتنا زور دیا جاتا ہے۔ یہ طبعی زندگی تو حیوانی زندگی ہے۔ یہ قوانین تو آپ کی گائے؛ بھینس؛ گدھے؛ گھوڑے؛ سب پر لاگو ہوتے ہیں۔ اسی قسم کے لاگو ہوتے ہیں جیسے ہم پہ لاگو ہوتے ہیں۔ Rationally (استدلالی انداز میں) ہاسپٹل (ہسپتال) میں بھی وہی دوائیاں دی جاتی ہیں جو ان مویشیوں کو؛ جانوروں کو؛ انسانوں کو؛ ان امراض میں دی جاتی ہیں بس انسانوں کے لیے وہ ذرا سا خوراک (Dose) کا فرق ہوتا ہے۔ انسانوں کو وہاں ہسپتال میں گرام یا تولوں میں دیتے ہیں۔ اور حیوانوں کو پا پکا تے سیر پکا دیدیندے نیں۔ [1] طبعی زندگی جہاں بھی ہے قانون وہی لاگو ہوتا ہے لیکن جو یہاں "رَبَّكُمْ" کہا گیا ہے اس میں انسانوں کی بحیثیت انسان زندگی جو حیوان سے کہیں اونچی ہے؛ اس کی ربوبیت بھی اس کے اندر آتی ہے۔ اور وہی اصل شے ہے۔ اس کے لیے ان قوانین کی ضرورت پڑتی ہے۔ طبعی قوانین تو ویسے بھی سائنس کے ذریعے معلوم کیے جا سکتے ہیں۔ یہاں کہا ہے کہ وَاعْبُدُوْا رَبَّكُمْ (22:77)۔ اپنے نشوونما دینے والے کی عبودیت (محکومیت) اختیار کرو۔ آپ اندازہ لگائیے کہ یہ دو لفظ ہیں جن میں حکومت کا پورا نظام سمٹ کر آ گیا ہے۔

قوانینِ خداوندی کا رکوع اور سجدے کے ساتھ باہمی ربط

عزیزانِ من! وَاعْبُدُوْا رَبَّكُمْ سے پہلے ایمان والوں کو مخاطب کر کے کہا گیا ہے کہ ارْكَعُوْا وَاسْجُدُوْا (22:77)۔ اس کا یہ ترجمہ کیا جاتا ہے کہ رکوع کرو اور سجدہ کرو۔ اس کا مفہوم ہمارے سامنے ہے کہ نماز میں پہلے رکوع کرو پھر سجدہ کرو۔

---

[1] پورا پورا ایک پاؤ (ایک سیر کا چوتھا حصہ) یا پورا ایک سیر دیتے ہیں۔

بنیادی طور پہ تو اِن دونوں الفاظ کے معنی ہی ''خدا کے قوانین کے سامنے جھک جانا' سرِتسلیم خم کر دینا ہے'' لیکن نماز میں جو اِن کی عملی شکل ہے اس میں آپ دیکھیے کہ پہلے رکوع ہے پھر سجدہ ہے۔ رکوع میں جھکاؤ پہلے ہوتا ہے یہ جھکاؤ ابھی کامل نہیں ہوتا۔ بقول امام راغب اصفہانی۔ ❶ ''رکوع'' کے معنی جھکنے کے ہیں خواہ اس میں گھٹنے زمین پر لگیں یا نہ لگیں البتہ سر ضرور جھک جائے۔ ❷ اس کے بعد کامل جھکاؤ ہوتا ہے جسے آپ سجدہ کہتے ہیں۔ یہ جو نظامِ خداوندی یا قوانینِ خداوندی کے مطابق نظام قائم ہونا ہے اس میں ان قوانین پہ عمل کرایا جائے گا مگر یہ عمل بتدریج ہوگا۔ قرآن کریم اس پر شبا شب انقلاب نہیں لاتا' لا سکتا ہی نہیں بلکہ یوں کہیے کہ لانا چاہتا ہی نہیں' اس لیے لائے گا ہی نہیں کیونکہ قرآن یہ انقلاب تغیرِ نفس سے لاتا ہے۔ اس نے کہا ہے کہ اِنَّ اللّٰـهَ لَا يُغَيِّرُ مَا بِقَوْمٍ حَتّٰى يُغَيِّرُوْا مَا بِاَنْفُسِهِمْ (13:11)۔ اللہ کسی قوم کی حالت کو نہیں بدلتا جب تک وہ قوم خود اپنی حالت کو نہ بدلے۔ اسے یوں کہو کہ جب تک ذہنیت کے اندر تبدیلی نہیں ہوتی' وہ کہتا ہے کہ خارج کی تبدیلی کچھ معنی نہیں رکھتی۔ مگر ہمارے ہاں اور عالمی سطح پر بھی یہ اندر کی تبدیلی کیے بغیر قوانین منواتے ہیں۔ اس سے سطحِ ارض پر بسنے والوں کی حالت غیر ہوتی جا رہی ہے۔

تغیرِ نفس کے بغیر قوت کے زور پر دنیا کی حالتِ زار

عزیزانِ من! اس اندر کی تبدیلی کے بغیر قوانین منوانے سے اس ساری دنیا کا جو آج حشر ہو رہا ہے' وہ ہمارے سامنے ہے۔ اندرونی تبدیلی کے بغیر بیرونی انقلاب لانے کا عمل سب سے بڑا فریب تھا جو ہمیں دیا جا رہا تھا۔ روس میں تو بہرحال وہ بے نقاب ہو کر رہ گئے۔ جو کچھ انہوں نے اپنے ملک میں کیا ہے وہ یہ ہے کہ جب بھی کوئی ذرا سا اختلاف کرنے والا ابھرا' اس کا پتہ ہی نہیں چلا کہ وہ کہاں گیا۔ یہ وہی ہے جسے کہتے ہیں کہ وہ ختم ہی کر دیا۔ ایسے مخالف تحلیل کر دیئے گئے۔ پتہ ہی نہیں کہ وہاں کیا ہوتا ہے۔ چائنا (چین) کے اندر یہ چیز تھی کہ ماؤزے تنگ (Mao Tse-T`ung: 1893-1976) اپنی پارٹی سے یہ کہہ گیا تھا کہ جب تک آپ ذہنوں کے اندر تبدیلی پیدا نہیں کرتے' یہ انقلاب نہیں آ سکتا۔ چونکہ وحی کی رو سے قوانین وہاں بھی نہیں تھے' اسے مرے ہوئے ابھی چار دن ❸ ہوئے ہیں' دیکھیں کہ اس کے بغیر وہاں کیا کچھ ہو رہا ہے۔ گو کہ ان کے ہاں انہوں نے اتنے بڑے سربراہ کو اتنی بڑی حیثیت دی ہوئی تھی' اب

---

❶ یہ معنی امام راغب اصفہانی کی مشہور تصنیف ''المفردات فی غریب القرآن'' میں دیا گیا ہے۔ یہ قرآنی الفاظ کا مقبول و مشہور لغت ہے۔

❷ تاج العروس کے مؤلف محبّ الدین نے اپنی اس معرکہ آرا لغت میں زمخشری کے حوالے سے لکھا ہے کہ رَاكِعٌ اِلَى اللّٰهِ کے معنی تھے: ''وہ اللہ کی طرف متوجہ ہو کر مطمئن ہو گیا۔'' رَاكِعٌ کی جمع رُكَّعٌ آتی ہے۔ پرویزؒ نے اپنی لغات القرآن جلد دوم میں لکھا ہے رُكُوْعٌ وَسُجُوْدٌ درحقیقت قوانین خداوندی کے سامنے سرِتسلیم خم کرنے کا نام ہے۔ سجدہ میں رکوع کی نسبت زیادہ شدت پائی جاتی ہے یعنی کامل اطاعت۔

❸ یہ ۲۰ مارچ ۱۹۷۷ء کی بات ہے۔

روز خبریں آ رہی ہیں کہ کتنوں کو موت کی سزا دی جا رہی ہے۔ تغیرِ نفس کے بغیر' عزیزانِ من! خالص قوت کے زور پر قانون کی اطاعت نہیں کرائی جا سکتی۔ ایسا کرنا سب سے بڑا فریب ہے جو آج دیا جا رہا ہے۔

نبی اکرم ﷺ کا عہد زریں

عزیزانِ من! قرآن کا یہ نظام بتدریج ذہنیت کے اندر تبدیلی پیدا کرتا ہے اور جوں جوں یہ تبدیلی ہوتی جاتی ہے' اس کے مطابق وہ ان قوانین کی اطاعت کراتا ہے۔ تیرہ سال حضور نبی اکرم ﷺ کو اس اندرونی تبدیلی لانے کو لگ گئے۔ یہ مدت نبوت کی زندگی کا 50% سے بھی زیادہ حصہ ہے۔ مکے کی زندگی میں ان قوانین کی حکمرانی قائم نہیں ہو سکی۔ اس کے لیے تیاریاں ہو رہی تھیں۔ اس کے لیے وہاں جھکاؤ بھی تھا لیکن وہیں تک تھا جہاں تک وہاں کے حالات اس کی اجازت دے رہے تھے۔ تغیرِ نفس کا پروگرام عمل میں آ رہا تھا اور اس کے تابع جہاں تک وہاں امکان تھا انکی اطاعت کی جا رہی تھی۔ جب مدنی زندگی میں پہنچے ہیں' تو وہاں ان کے اندر یہ تغیرِ نفس ہو چکا تھا۔ یہاں آ کے مملکت قائم کی۔ اب ان قوانین کی کامل اطاعت یہاں ہوئی۔ میں اپنی بصیرت کے مطابق یہ سمجھتا ہوں کہ ان ابتدائی مراحل کے اندر' تدریجی طور پر' جب ان پر عمل کیا جاتا ہے وہ مکمل اطاعت شبا شب نہیں ہوتی۔ یہ عمل بتدریج ہوتا ہے۔ اسے قرآن نے رکوع کے لفظ سے ظاہر کیا ہے اور جب مملکت کے قیام کے بعد' پورے کے پورے قوانین کی اطاعت یعنی کامل اطاعت آ جاتی ہے تو اسے اس قرآن کریم نے سجدہ کہا ہے۔ اب یہ ہے وہ عمل جو یہاں کہا جا رہا ہے کہ **يَآأَيُّهَا الَّذِينَ آمَنُوا ارْكَعُوا وَاسْجُدُوا** (22:77)۔ اے ایمان والو! تم خدا کے قوانین کے سامنے جھکو اور ان کی پوری پوری اطاعت کرو۔ اس کا مقصد یہ ہے **وَاعْبُدُوا رَبَّكُمْ** (22:77)۔ تم اس کی عبودیت (محکومیت) اختیار کرو جو تمہیں نشو و نما دینے والا ہے۔ اس محکومیتِ خداوندی سے مقصد یہ ہے کہ تم **وَافْعَلُوا الْخَيْرَ** (22:77)۔ ایسے کام کرو جن سے نوعِ انسان کا بھلا ہو اور خود تمہاری ذات میں وسعتیں پیدا ہو جائیں۔

نیک کاموں کا تصور اور مسلمان طبقے کی تباہ حالی

عزیزانِ من! یہاں لفظ ''خیر'' آیا ہے۔ اب ہمارے ہاں اس کا ترجمہ ہوتا ہے: نیک کام کرو اور جب ''نیک کام کرو'' کی بات ہو گئی تو آپ نے نیک عملی کے عمل کو تو متعین کیا نہیں۔ مولانا ابوالکلام آزاد مرحوم (1888-1958) نے سیدھی سی بات یہ کر دی کہ ''خدا پرستی اور نیک عملی کی زندگی اسلام ہے'' اور یہ نیک کام تمام مذاہب میں یکساں طور پہ پایا جاتا ہے' اور وہاں ان مذاہب کی نیکیاں تو یہ تھیں کہ اوتے آٹا پوندے پھردے سن' چڑیاں لئی چوگا رکھدے پھردے ہیگے سن' گائیاں واسطے لون دی اک ڈلی رکھی ہوئی سی' گھوڑیاں لئی وی۔ [1]

---

[1] وہ آٹا ڈالا کرتے تھے' چڑیوں کے کھانے کے لیے کچھ دانہ دنکا رکھا کرتے تھے' گائے گھوڑی وغیرہم کے لیے نمک کی ڈلیہ رکھا کرتے تھے۔ یہ تھیں نیکیاں اور بس۔

یہ سارا غریب مسلمان زمیندار کا طبقہ تھا۔ شاید آپ کو یہ اعداد و شمار معلوم نہیں ہیں کہ پنجاب کا' زمیندار کا' یہ طبقہ وہاں ہندو بنیوں کا از حد مقروض تھا' دیوالیے کی حد تک مقروض ہو چکا تھا۔ وہ ہندو بنیے انسانوں کا خون نچوڑتے تھے۔ وہاں گھوڑوں کو پانی پلانے کا کام خیرات کا کام تھا اور پھر خیر سے خیرات بن گیا۔ اس کے معنی ہی بدل گئے۔

خیر خیرات کے لیے بھک منگوں کا مستقل وجود قائم ہو گیا

عزیزانِ من! عربی کے اس لفظ ''خیر'' سے ہمارے ہاں خیرات آ گئی۔ چل بھئی! کہنے لگے کہ میاں کچھ خیر خیرات بھی کر دیا کرو۔ خیرات وی کچھ ہتھوں دیا کرو۔ [1] اپنے ہاں بھک منگوں کا ایک طبقہ مستقل طور پہ رکھو اور اس کے بعد پھر ان کو خیرات دیا کرو۔ اب درمیان ہی میں ایک بات یاد آ جاتی ہے۔ یہ دلچسپ بات ہے۔ آپ کے ہاں چور کے ہاتھ کاٹ دینے والی بحث ہے۔ اس کے متعلق ہمارے ہاں کے مفسر [2] مودودی جن کے متعلق کہتے ہیں کہ وہ ہر بات بڑی دلیل اور Rationale (لم۔ حکمت) اور Reason (دلیل و برہان) سے کرتے ہیں' کہتے ہیں کہ سوال پیدا ہو گیا کہ ایک ہاتھ تو کاٹ دیا تو پھر وہ کمائے گا کیسے؟ کہا کہ وہ ایک ہاتھ سے کام کرے گا۔ دوسری دفعہ چوری کی تو اس کا وہ دوسرا ہاتھ کاٹ دیا۔ پھر اس سلسلہ میں تاویلیں بیان ہوتی ہیں چنانچہ اس کے بعد [3] وہ لکھتے یہ ہیں کہ اسلامی نظام کا یہ فریضہ ہو گا کہ ایسے لوگ جو کام کرنے سے یوں محروم ہو جائیں ان کے لیے ان کی بھیک کا اور ان کی خیرات کا انتظام کرے۔ یا للعجب! وہ جو اس آیت میں ''خیر'' آیا تھا کہ وَافۡعَلُوا الۡخَيۡرَ (22:77)۔ ''ایسے کام کرو جن سے نوعِ انسان کا بھلا ہو اور خود تمہاری ذات میں وسعتیں پیدا ہوں۔'' وہ خیرات [4] ہو گیا۔

قوتِ گویائی کا کمال: الفاظ کا کرشمہ

عزیزانِ من! الفاظ بڑی طلسماتی چیز ہیں۔ یہ ساری چیز ہی بیان کی ہے۔ قرآن نے کہا تھا کہ خَلَقَ الۡاِنۡسَانَ عَلَّمَهُ الۡبَيَانَ (55:3-4)۔ (خدا نے) انسان کو پیدا کیا اور اُسے اظہارِ خیال (قوتِ گویائی) عطا کی جو کسی اور نوع کو حاصل نہیں۔ یہ جو انسان کو بہت بڑی خصوصیت دی تھی وہ قوتِ گویائی تھی' بیان تھا' یہ الفاظ تھے' لیکن جیسے انسان خدا کی دی ہوئی ہر قوت کو غلط استعمال کرتا ہے تو پوچھو نہیں کہ اس کی کیا تباہیاں مچتی ہیں! یہ بیان کی قوت ہی ہے جو تباہیاں لاتی ہے۔ اس کے برعکس حیوان اس لیے اچھا ہے کہ اس کے پاس بیان کی

---

[1] اپنے ہاتھوں سے کچھ خیرات یعنی صدقہ' دان بھی دیا کرو۔

[2] سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ (1978 - 1903)

[3] یہ اشارہ سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ (1978 - 1903) کی طرف ہے۔

[4] صدقہ' دان

قوت نہیں۔کوئی حیوان جھوٹ نہیں بول سکتا۔کدی بولدا ای نئیں۔کدی تسی دیکھیا ای نئیں ہوناں' کسی بکری نوں او کہئے کہ نئیں جی میں تے نئیں سی کھادا۔ (1) حیوان جھوٹ نہیں بول سکتا۔جس کو قوتِ گویائی دی تھی اس کے ہاں پہلی بات یہ ہوتی ہے کہ جھوٹ بولتا ہے اور پھر شرعی فیصلہ ہو جاتا ہے کہ اہم ضرورتوں کی لیے جھوٹ بولنا شرعاً واجب ہو جاتا ہے۔ (2) یہ ان کے ہاں کا فیصلہ بھی ہے۔عزیزانِ من! میں نے کہا کہ یہ جو الفاظ ہیں یہ بڑا گورکھ دھندہ پیدا کرتے ہیں۔ بیان کی قوت کو جب ناجائز استعمال کیا جائے تو عجیب عجیب چیزیں پیدا ہو جاتی ہیں۔اُس کی بہترین مثال آپ کے ہاں ''خیر'' کا یہ لفظ ہے۔اساڈے گھراں اچ تے خیر سدھی جئی گل اے۔ہن تے بہرحال اے ایتھے تے کدی سنیا نئیں ہیگا کہ وہ منگن والا سویرنوں آوے تے اوتھوں او ماں اپنے کمرے اچوں ای کیندے اے کڑی نوں: نی! پا خیر تھوڑا جیا' باہر سٹیں اینوں منگن والے نوں' اجے تے روٹی پکی نئیں ہیگی۔کہن لگی: منگن والیاں نوں رات دی روٹی پائی دی ہوندی اے' او رات دی باسی روٹی۔ (3)

خیرات کی تازہ روٹی باسی شکل اختیار کر لیتی ہے

عزیزانِ من! ہر وہ شخص جس کو آپ خیرات دینگے۔اونوں تسی تازی روٹی وی دیو گے تے اونوں باسی ہو کے لگے گی۔ (4) نبی اکرم ﷺ کی یہ چمکتی ہوئی حدیث ہے کہ خیرات سے' خیرات دینے والے اور لینے والے' دونوں کے دل پتھر کے ہو جاتے ہیں۔اس سے غیرتِ نفس مٹ جاتی ہے' دینے والے کے دل میں تکبر پیدا ہو جاتا ہے۔عزیزانِ من! یہ تو اس دَور کی چیزیں ہیں جب آپ کا نظام ابھی قائم نہیں ہو رہا تھا۔نظام کے قائم ہونے کے بعد یہ چیز جسے آپ خیرات کہتے ہیں وہ کام ہے' جن سے انسان کے اختیارات میں وسعتیں پیدا ہوتی ہیں اور اس کی ذات میں بالیدگی پیدا ہو جاتی ہے۔میں نے جیسا بتایا ہوا ہے کہ خیر کا تو مادہ ہی وہ ہے جو اختیار لفظ کا ہے۔اس کا مادہ ''خ ی ر'' ہے۔اپنے بنیادی معنوں میں یہ زیادہ سے زیادہ انسانوں کی آزادی چاہتا ہے' صرف ان حدود کی پابندی چاہتا ہے جو خدا نے مقرر کی ہوئی ہیں' ان حدود کے اندر رہتے ہوئے وہ ہر فرد کو آزاد دیکھنا چاہتا ہے۔یہ جسے آپ خیرات کہتے ہیں' جسے خیر کہتے ہیں اس

---

(1) (کوئی حیوان) کبھی (جھوٹ) نہیں بولتا۔آپ نے کبھی بھی کسی بکری کو نہیں دیکھا ہوگا جو یہ کہے کہ نہیں جی! میں نے تو نہیں کھایا۔

(2) یہ اشارہ مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ کے اس بیان کی طرف ہے جس میں انہوں نے کہا تھا کہ ''زندگی کی اہم ضروریات کے لیے جھوٹ بولنا جائز ہی نہیں' بلکہ واجب ہو جاتا ہے۔''

(3) ہمارے گھروں میں تو ''خیر'' ایک سیدھی سادی سی بات ہے گو کہ اب یہاں تو یہ سنا ہی نہیں کہ جب بھیک مانگنے والے علی الصبح آئے تو ماں اپنے کمرے میں ہی بیٹھی ہوئی کہے کہ اے بیٹی! اسے ''خیر'' ڈال دو۔اس مانگنے والے کو باہر ہی سے چلتا کرو۔ابھی تو کھانا بھی نہیں پکا۔کہنے لگی کہ مانگنے والوں کو رات کی بچی ہوئی باسی روٹی ہی دی جاتی ہے۔

(4) اُسے اگر آپ تازہ روٹی بھی دیں گے تو بھی اُسے وہ باسی ہو کر ہی لگے گی۔

کے متعلق قرآن کہتا ہے کہ وَافْعَلُوا الْخَيْرَ (22:77)۔ یہ وہ کام ہیں جن سے انسان کے اختیارات میں اپنے ہی نہیں انسانیت کے لیے بھی وسعتیں پیدا ہوتی ہیں۔ وہ یہ کہتا ہے کہ ایسے کام کرو جن سے انسانیت کی غلامی کی زنجیریں ٹوٹ جائیں' ان کے اختیارات میں وسعتیں پیدا ہوجائیں لیکن اختیارات بیباک نہ ہوجائیں' حد مقرر کردی کہ یہاں تک کرو۔ قرآن کریم کے الفاظ میں یوں کہا کہ وَافْعَلُوا الْخَيْرَ (22:77)۔ ایسے کام کرو جن سے نوعِ انسانی کا بھلا ہو اور خود تمہاری ذات میں وسعتیں پیدا ہوں۔ اور پھر اگلا فقرہ ایک لفظ ہے جس کے لیے ہم سر جوڑ کے بیٹھتے ہیں' کانفرنسیں کرتے ہیں مشاورتیں ہوتی ہیں کہ صاحب! بالآخر اس مصیبت میں ہم پھنس گئے ہیں اس سے نکلنے کا کوئی راستہ بھی ہے' مسلمان کہیں کامیاب بھی ہوسکے گا' اس کو کہیں غلبہ بھی نصیب ہوسکے گا۔ قرآنِ کریم نے یہ سارا کچھ کہنے کے بعد کہا کہ یہ کچھ کرو: لَعَلَّكُمْ تُفْلِحُونَ (22:77)۔ اس سے تمہاری کھیتیاں پروان چڑھیں گی۔ تمہیں کامیابیاں اور کامرانیاں حاصل ہوں گی۔ اب یہاں پھر وہی لفظ ''تُفْلِحُونَ'' آیا ہے جس کا عام ترجمہ کرو گے تو یہی ہوگا کہ تم کامیاب ہوجاؤ گے لیکن یہاں تو پھر وہی لفظ ''فلاح'' ہے۔ ہمارے ہاں تو ''خیر'' یہ استعمال نہیں ہوتا' عام عربی میں ہوتا ہے۔ دراصل یہ لفظ کھیتی اگانے کے معنی میں آتا ہے۔ قرآنِ کریم انسانوں کو ان چیزوں کی مثال ہی ہمیشہ کھیتی سے دیتا ہے۔ تُفْلِحُونَ کے معنی یہ ہیں کہ ''تاکہ تمہاری کھیتیاں برومند ہوں' ثمر بار ہوں' کامیاب ہوں۔''

عمل کے ننھے سے بیج کی وسعتیں

عزیزانِ من! سوال یہ ہے کہ کھیتی کیا ہوتی ہے؟ آپ جانتے ہیں کہ ایک ننھا سا بیج ہوتا ہے۔ اس کی ساری صلاحیتیں اور استعداد اس کے اندر موجود ہوتی ہیں۔ وہ سب کچھ اس بیج کے اندر محدود ہوتی ہیں' چھپی ہوئی ہوتی ہیں' ان کو اختیار نہیں ہوتا کہ باہر نکل آئیں' ان کو آزادی نہیں ملتی۔ اب مناسب نشوونما سے' اچھی زمین پانی حرارت روشنی وغیرہ سے' یہ بیج پھوٹتا ہے۔ آپ دیکھتے ہیں کہ پھر اس کے اختیار کی وسعتیں کس طرح بڑھتی ہیں' کونپل نکلتی ہے اور بڑھتی ہے' پودا بنتا ہے اور زیادہ اختیارات کی وسعتیں بڑھتی ہیں' اور آخر الامر وہ ثمر بار ہوتا ہے۔ قرآن نے عملِ خیر کی تشبیہ ہمیشہ کھیتی سے دی ہے کہ تمہارے اس عمل کے ننھے سے بیج کے اندر کتنی بڑی بڑی وسعتیں' کتنی زیادہ صلاحیتیں مضمر ہوتی ہیں۔ کہا کہ وَاعْبُدُوا رَبَّكُمْ (22:77)۔ ربوبیت دینے والے کے قوانین کا اتباع اس طرح سے کرو جیسے کھیتی برومند ہوتی ہے۔ اس طرح سے تمہارے اعمال برومند ہوجائیں گے۔ فلاح کا تصور ہی یہ ہے۔ اب سوال یہ ہے کہ اس کے لیے کرنا کیا ہے؟ اس کے لیے پروگرام دے دیا۔ اب اس سورۃ الحج کی ایک ہی آخری آیت ہے' اس کے چند الفاظ ہیں' اجازت دو گے تو دو چار منٹ زیادہ بھی ہوجائیں گے لیکن آیت ختم ہوجائے گی۔ وہ پروگرام ہے کہ وَجَاهِدُوا فِي اللَّهِ حَقَّ جِهَادِهِ (22:78)۔ اس نظامِ خداوندی کے قیام و بقا کے لیے مسلسل جدوجہد کرتے رہو جیسا کہ جدوجہد کرنے کا حق ہے۔

جہاد اور قتال کا مفہوم

عزیزانِ من! ہمارے ہاں ''جہاد'' کا لفظ اصطلاح کے طور پہ تو اس جنگ کے لیے استعمال ہوتا ہے جو دشمن کے مقابلے میں کی جائے اور انہی کی لیے ہے جو حق کی مدافعت میں' باطل کے مقابلے میں' عمداً' جان بوجھ کر' بطیبِ خاطر' ہنستے ہوئے جان دیدیتے ہیں۔ قرآن نے تو ان کو **قُتِلُوۡا فِیۡ سَبِیۡلِ اللّٰہِ** (47:4) ہی کہا ہے یعنی خدا کی راہ میں قتل ہونیوالے۔ ہمارے ہاں اصطلاح میں انہیں شہید کہا جاتا ہے۔ یہ بہت بڑی چیز ہے' جسے قتال کہا گیا ہے۔ لیکن جو جہاد کا لفظ ہے اس کے معنی وہ قتال ہے جو اس کے لیے آخری عمل ہے۔ اس آخری عمل یعنی قتال کو بھی جہاد کہتے ہیں۔ یہاں کہا کہ **جَاھِدُوۡا فِی اللّٰہِ حَقَّ جِھَادِہٖ** (22:78)۔ نظامِ خداوندی کے قیام وبقا کے لیے مسلسل اس طرح جدوجہد کرتے رہو جس طرح جدوجہد کرنے کا حق ہے۔ پروگرامِ خداوندی کی لیے اس جہاد کا معنی ہوتا ہے ''کوشش کرتے رہنا' جدوجہد کرتے رہنا' تگ وتاز کرتے رہنا' مسلسل تگ وتاز کرتے رہنا'' عزیزانِ من! یہ کوئی پانچ وقت کی نماز پڑھنے کی بات یعنی صرف نیک ہوجانا نہیں ہے۔ مومن کی تو ساری زندگی مسلسل تگ وتاز کی اور جہادِ فی سبیل اللہ کی زندگی ہے۔ باطل کی قوتیں تو ہر جگہ صف آرا ہونگی اس لیے یہ کہا ہے کہ یہ بات کوئی خاص میدانِ جنگ تک محدود نہیں۔ جہاد کی آخری منزل وہ قتال ہے جسے ہم جنگ کہتے ہیں کیونکہ وہ آخری منزل ہوتی ہے۔ اس کے لیے بھی ہمارے ہاں اصطلاح جہاد کی آ گئی ہے۔ اس منزل کی لیے جہاد قرآن میں بھی ہے لیکن صرف یہ قتال نہیں ہے' اس کے لیے پوری جدوجہد ہے۔ میں نے کہا تھا کہ نبوت نبی اکرم ﷺ کی ذات پہ ختم ہوگئی لیکن جو رسالت ہے یعنی اس پہ عمل کرنا' نظام قائم کرنا' اور اسے دوسروں تک پہنچانا' یہ تو حضور ﷺ کی ذات تک ختم نہیں ہوا۔ قرآن تو قیامت تک کے لیے ہے اور اس کے لیے قرآن نے امت تشکیل کی۔ اب یہ امت کا فریضہ ہے۔ اب آپ الفاظ دیکھیے پہلی آیت میں تھا کہ **اَللّٰہُ یَصۡطَفِیۡ** (22:75)۔ اللہ چن لیتا ہے۔ اصطفیٰ کے معنی ہیں: انتخاب کرلینا' منتخب کرلینا' چن لینا' اس کے لیے ایک فرد چن لیا' اس لیے کہ نبوت یا خدا کے احکام اس کے فرشتے اس تک پہنچائیں اور آگے ہے۔ **ھُوَ اجۡتَبٰکُمۡ** (22:78)۔ اس نے تمہیں' اس منصبِ جلیلہ کے لیے منتخب کیا ہے۔ عزیزانِ من! اجتبا اور اصطفا ایک ہی بات ہے: منتخب کرلینا کسی کو۔ اس نے اب تمہیں اس مقصد کے لیے منتخب کیا ہے۔ یہ امت عام قوم نہیں ہے۔ یہ ایک مقصد کے حصول کے لیے منتخب افراد پر مشتمل ایک امت ہے' ایک ملت ہے جس کا فریضہ وہی ہے جو نبی اکرم ﷺ نے رسالت کے ذریعے سے سرانجام دیا۔ اور یہ جو چیز ہم کہہ رہے ہیں وہ یہ ہے کہ **وَمَا جَعَلَ عَلَیۡکُمۡ فِی الدِّیۡنِ مِنۡ حَرَجٍ** (22:78)۔ یہ نہ سمجھو کہ خدا نے اپنا کوئی کام آپ سے کرانا ہے اس لیے تم سے بیگار لے رہا ہے۔ او! یہ تو سب کچھ تمہاری ہی نشوونما کی لیے کیا جارہا ہے۔ مریض کو تو زبردستی کی دوائی پلانی پڑتی ہے' اس کے چیختے دھاڑتے بھی اس کی سرجری کرنی پڑتی ہے لیکن یہاں تو وہاں تک کا سوال نہیں ہے۔ کہا کہ یہ کوئی بیگار کی بات نہیں ہے۔ یہ تو تمہارے ہی اپنے فائدے کی چیزیں ہیں

جو ہم کہہ رہے ہیں۔ وہ ''ربکم'' جو کہا ہے وہ نشو ونما کرنے کا طریقہ اور یہ کوئی نئی بات نہیں جو تم سے کہی جائے۔ نہ ہی یہ کوئی نیا نظام ہے۔ **مِلَّةَ اَبِيْكُمْ اِبْرٰهِيْمَ** (22:78)۔ یہ وہی نظام ہے جسے تمہارے مورثِ اعلیٰ ابراہیم علیہ السلام کے ہاتھوں قائم کیا گیا تھا۔ ویسے بھی ''ابیکم'' عربوں کو کہا گیا کیونکہ حجاز کے عرب تو بنی اسماعیل میں سے تھے۔ ان کے جدِ امجد ویسے ہی حضرتِ ابراہیم علیہ السلام تھے لیکن ایک نظام کی حیثیت میں جو دین سامنے آتا ہے' وہ حضرتِ ابراہیم علیہ السلام کی زندگی میں ہی ہمارے سامنے آتا ہے اس لیے اسے ہمیشہ ملتِ ابراہیمی علیہ السلام کہہ کر پکارا جاتا ہے اور اس میں کہا کہ یہ یاد رکھو! اب تمہیں ایک امت بنایا ہے۔

امتِ مسلمہ کی حقیقت

عزیزانِ من! میں کئی دفعہ کہہ چکا ہوں کہ اسلامی مملکت یا اسلامی نظام کی بنیادی نشانی یہ ہوگی کہ اس میں ایک امت ہوگی' اس میں کوئی فرقے نہیں ہونگے' کوئی مختلف قسم کے احزاب نہیں ہونگے' مختلف پارٹیاں نہیں ہونگی' مختلف گروہ نہیں ہونگے' مختلف نسلیں نہیں ہونگی' مختلف برادریاں نہیں ہونگی۔ ایک امت ہوگی۔ یہ اس کی پہلی نشانی ہے۔ اگر وہ امت امتِ واحدہ نہیں' اس کے اندر مختلف فرقے اور پارٹیاں موجود ہیں' تو وہ اسلامی ملت نہیں ہے' وہ اسلامی نظام نہیں ہوگا۔

فرقہ بندی کے لحاظ سے مسلمان کی پہچان: تباہی کا پیش خیمہ

عزیزانِ من! ایک فرد کا ایک ہی نام ہوتا ہے۔ اُسی نام سے وہ پہچانا جاتا ہے۔ اس کے برعکس مختلف افراد کے مختلف نام ہوتے ہیں اور وہ مختلف ناموں سے پہچانے جاتے ہیں۔ اگر ایک ہی نام کے دو فرد کہیں ایک ہی جگہ رہتے ہوں تو ہر وقت ایک الجھاؤ پیدا ہوتا رہتا ہے: اور ریاض نے کیا سی۔ کیہڑے ریاض نے؟ جے اکو ای ہووے محلے اچ ریاض' تے کوئی نئیں پچھدا کیہڑے ریاض نے۔ فیر اگے دسناں پیندا اے' پئی کیہڑے ریاض نے؟ او چاچا امام دین والا۔ ❶ یعنی اس کے لیے آپ الگ بولیے تو پتا چلے گا۔ فرقہ بندی کے لحاظ سے آپ کسی سے پوچھ لیجیے کہ آپ کون ہیں؟ اگر وہ کہے کہ مسلمان ہوں تو کہا جائے گا کہ مسلمان! ''کیہڑا ابھئی! کیہڑا مسلمان؟ کیہڑا ریاض' الحمد للہ۔ جی سُنی مسلمان ہوں۔ اچھا! چاچے امام دین والا۔ اے سنی' کیہڑا سنی؟ یا اللہ...... تے نظر اوندا پئی' محلے اچ پنج ست ریاض نے۔ کیہڑا سنی؟ میں جی اہلِ فقہ......؟ اہلِ فقہ! کیہڑی فقہ دا منن والا؟ کہ جی' او فقہ حنفی دا متبع آں۔ اچھا اچھا بڑی خوشی ہیگی اے' فقہ حنفی دا متبع ایں آ۔ کیہڑی فقہ دا: دیوبندی یا بریلوی فقہ دا؟ ...... یا میرے اللہ...... دیوبندی یا بریلوی؟ اچھا اچھا کسے سلسلے اچ خیر نال بیعت وی ہیگے او تسی؟ ایہدے بغیر تے مکمل ای نئیں ناہوندا۔ ریاض داناں کہ جی ہاں کیہڑا؟ کیہڑے سلسلے اچ ہیگے ہو؟ اے چشتیہ سلسلے اچ۔

---

❶ وہ ریاض نے کہا تھا۔ کس ریاض نے کہا تھا؟ اگر محلے میں ایک ہی ریاض ہو تو پھر کوئی نہیں پوچھتا کہ کس ریاض نے کہا تھا۔ (اگر دو ہوں) تو پھر بتانا پڑتا ہے کہ کس ریاض نے کہا تھا: ارے بھئی! اس چچا امام دین والے نے کہا تھا۔

آہو بڑی خوشی دی گل اے۔ اے کیہڑے سلسلے اچ: چشتیہ اچ' نظامیہ اچ' صابر یہ اچ؟ امت میں جب تفرقہ پیدا ہوتا ہے' عزیزانِ من! تو فیر اے کچھ اوس ریاض دے متعلق دسنا پیندا اے ❶ ۔ اور جس نے یہ امت بنائی تھی تشبیہاً جس باپ کا یہ بیٹا تھا۔ **هُوَ سَمّٰكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ** (22:78)۔ اس نے تمہارا نام صرف مسلم رکھا ہے: صرف ایک نام اور ماں باپ تو ایک ہی نام رکھتے ہیں۔ یہ مسلمان نام کسی فرد کا دیا ہوا نہیں ہے۔ عزیزانِ من! اس نام کو بڑی اہمیت ہے۔ **هُوَ سَمّٰكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ** (22:78)۔ اس نے تمہارا نام مسلمان رکھا۔ اے ہن خدا دا نام جیہڑا رکھیا اے اوہدے متعلق پچھدے نیں بہ اے کیہڑا مسلمان۔ ❷ یعنی وہ جو اس نے نام رکھا تھا' وہ کافی نہیں ہے۔ تو پھر یہ سلسلہ' جتنا کچھ کہ ہم نے بتایا ہے آگے ہی آگے ❸ چلتا چلا جاتا ہے جب کہ بنانے والا کہتا ہے کہ ہم نے تمہارا نام صرف مسلمان رکھا ہے۔

---

❶ کونسا مسلمان؟ بھئی! (وہی بات کہ) کونسا ریاض؟ الحمدللہ' سُنّی مسلمان ہوں۔ (وہی بات کہ) پچا امام دین والا (ریاض) یہ سُنّی ہے۔ (پھر پوچھا کہ) کونسا سُنّی؟ یا اللہ! نظر آتا ہے کہ محلے میں پانچ سات ریاض ہیں۔ (پوچھا کہ) کونسا سنی؟ (کہا کہ) جی میں اہل فقہ...... (والا ہوں) ارے فقہ؟ بھئی کس فقہ کے ماننے والے ہو؟ (اُس نے کہا کہ) فقہ حنفی کا ماننے والا ہوں۔ (کہا کہ) اچھا بڑی خوشی ہوئی کہ یہ فقہ حنفی کا ماننے والا ہے۔ (پھر پوچھا کہ) کس فقہ کے ہو: دیو بندی یا بریلوی؟ یا میرے اللہ (بات کہاں سے کہاں پہنچ رہی ہے۔) دیو بندی یا بریلوی؟ پھر پوچھا کہ ماشاء اللہ کس سلسلے میں بیعت ہو؟ اس کے بغیر تو شاید یہ مکمل ہی نہیں ہوتا۔ وہی ریاض کے نام والی بات کہ کونسا ریاض؟ وہی سلسلہ بیعت والی بات کہ کس سلسے میں ہو؟ (کہا) کہ سلسلۂ چشتیہ میں ہوں۔ کہا کہ اوہ خوب' بڑی اچھی بات ہے۔ پھر پوچھا کہ سلسلۂ چشتیہ میں بھی کون سا سلسلہ: چشتیۂ نظامیہ یا صابر یہ؟ امت میں جب فرقہ پیدا ہوتا ہے' عزیزانِ من! تو پھر یہ کچھ ریاض کے بارے میں بتانا پڑتا ہے۔

❷ یہ اب خدا کے رکھے ہوئے نام کے بارے میں پوچھتے ہیں کہ یہ کونسے والا مسلمان ہے۔

❸

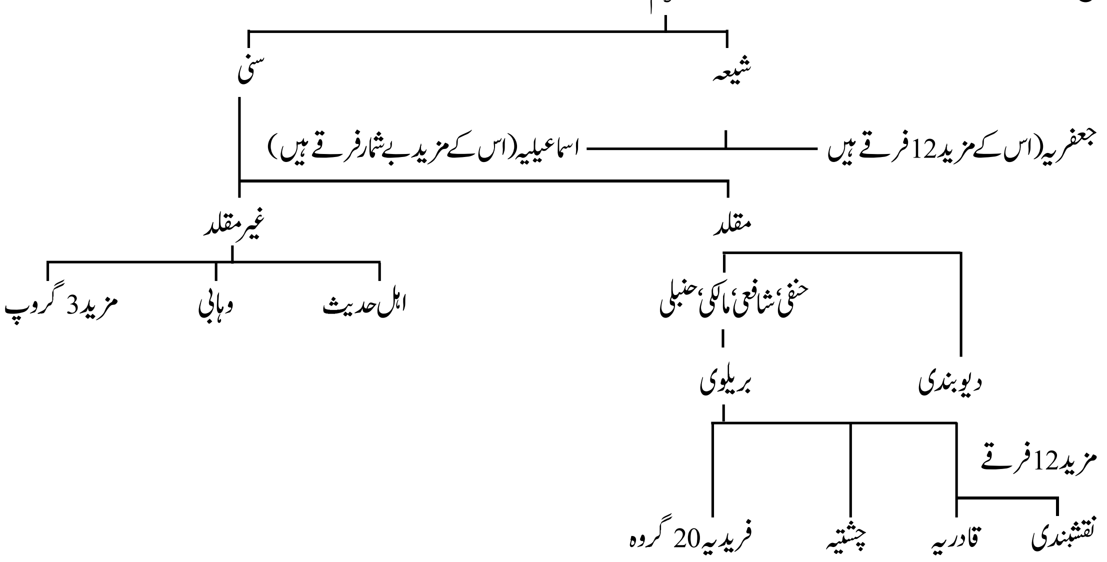

(ماخذ عبدالقادر (ر) کرنل: دل دل پاکستان' میسرز اکمل قدیر اینڈ کمپنی' لاہور' 1998' ص۔ 238)

خدا نے تمہارا نام صرف مسلم رکھا تھا تا کہ تم تمام اقوام عالم کی نگرانی کرو

عزیزانِ من! اب مسلم سے تو بات ہی نہیں پہچانی جاتی جب کہ خدا کہتا ہے کہ **هُوَ سَمّٰكُمُ الْمُسْلِمِيْنَ** (22:78)۔اس نے پہلے ہی تمہارا نام مسلمان رکھا ہے۔اور کہا کہ یہ آج کی بات نہیں ہے کہ تمہارا ہی نام ہم نے یہ رکھا: **مِنْ قَبْلُ وَفِيْ هٰذَا** (22:78)۔اس سے پہلے بھی جنہوں نے اس نظام کی اطاعت کی اور اس کے مطابق عمل کیا انہیں بھی ہم نے مسلمان ہی پکارا اور تمہارا نام بھی مسلم پکارا تھا' ہم نے مسلم ہی رکھا ہے۔اس نظام کے قیام کا عملی پروگرام یہ ہے کہ **لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِيْدًا عَلَيْكُمْ وَتَكُوْنُوْا شُهَدَآءَ عَلَى النَّاسِ** (22:78)۔تمہارے اعمال کی نگرانی تمہارا رسول (اور اس کے بعد' تمہارا مرکزِ ملت) کرے اور تم نوعِ انسان کے اعمال کی نگرانی کرو۔تمہارا فریضہ زندگی یہ ہے۔قرآن نے کہا تھا کہ **اجْتَبٰكُمْ** (22:78)۔ہم نے تمہیں اس کے لیے منتخب کر لیا ہے' برگزیدہ کر لیا ہے' ایک مقصد کے لیے چن لیا ہے۔وہ مقصد یہ ہے کہ تم تمام اقوامِ عالم کے اعمال کی نگرانی کرو......اللہ اکبر......دیکھو کہ کہاں ظلم ہو رہا ہے' کہاں بے انصافی ہو رہی ہے' کہاں دھاندلی ہو رہی ہے' تم ساری دنیا کے اعمال کے اوپر نگران ہو۔اس مقصد کے لیے تمہیں چن لیا ہے۔اور **لِيَكُوْنَ الرَّسُوْلُ شَهِيْدًا** (22:78)۔تمہارے اعمال کی نگرانی تمہارا رسول (اور اس کے بعد' تمہارا مرکزِ ملت) کرے۔

ایک خدا' ایک رسول' ایک نظام' اور ایک امت

عزیزانِ من! تمہارا رسول تمہارے اوپر نگران رہے گا' ہر نظام اور ہر ملت کے لیے ایک نگران کی ضرورت ہوتی ہے۔اسی کو مرکزِ ملت کہتے ہیں۔رسول اللہ ﷺ کی وفات کے بعد یہ بات نہیں تھی کہ اب امت کو کسی نگران کی ضرورت نہیں رہی تھی۔امت بغیر نگران کے ایسے ہو جاتی ہے جیسے بغیر گڈریئے کے ریوڑ رہ جاتا ہے۔وہ نظام اسی طرح سے قائم رہنا تھا۔یہ وہ نظام تھا جسے ہم خلافتِ راشدہ (11-40AH بمطابق 632-661AD) کہتے ہیں۔اس نظام کے نہ رہنے کا نتیجہ تھا کہ پھر نہ مسلمان کا نام کافی رہا' نہ کوئی ایک امت امتِ واحدہ رہی' یہ سب ٹکڑے ٹکڑے ہو گئے اور اتنے اتنے نام الگ پڑ گئے۔یہ صرف اس مرکز کے نہ رہنے کی وجہ سے ہے۔اور اس کے بعد جب بھی اسلام کا نظام آئے گا اس کی یہی شکل ہو گی۔عزیزانِ من! ایک امت' ایک نظام' ایک ضابطہ قانون قرآنِ مجید' اس کے اوپر چلانے والی ایک قوتِ نافذہ کی ضرورت ہوتی ہے۔نظام کے لیے وہ قوتِ نافذہ ہو گی جسے ہم خلافت علیٰ منہاج رسالت کہتے ہیں' جسے میں عام طور پہ مرکزِ ملت کہا کرتا ہوں' یہ قائم ہو گی' پھر اسلامی نظام قائم ہو گا۔ان کا فریضہ یہ ہو گا: **فَاَقِيْمُوا الصَّلٰوةَ وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ** (22:78)۔اس کے لیے تم صلوٰۃ کا نظام قائم کرو اور نوعِ انسان کی نشو ونما کا سامان بہم پہنچاؤ۔

عزیزانِ من! میں صلوٰۃ اور زکوٰۃ کی قرآنی اصطلاحات کی تشریح متعدد بار کر چکا ہوں کہ اقامتِ صلوٰۃ کیا ہے؟ یہ کہ فرائضِ خداوندی کا اتباع کیے جانا اور **وَاٰتُوا الزَّكٰوةَ** اور اس کا مقصد اس عالمگیر نشو ونما کے سامان بہم پہنچاتے چلے جانا۔یہ تمہارا فریضہ ہے۔

پھرآخر میں کہا کہ **وَاعۡتَصِمُوۡا بِاللّٰهِ** (22:78)۔خدا کے نازل کردہ ضابطۂ قوانین (قرآن کریم) کو مضبوطی سے تھامے رکھو۔اِسے پھر سن لو کہ وہاں کہا تھا کہ **وَاعۡبُدُوۡا رَبَّكُمۡ** (22:77)۔ایک خدا کے قانون کی اطاعت کرو۔ پھر یہاں کہا کہ سن رکھو! تم نے مضبوطی سے صرف قوانینِ خداوندی کو پکڑنا ہے۔ یہ ہے تمہارا نظام۔ یادرکھو! **هُوَ مَوۡلٰٮكُمۡ** (22:78)۔خدا اور صرف خدا ہی تمہارا کارساز ونگران وحاکم ہے۔تمہارا کوئی دوسرا نظام نہیں' تمہارا کوئی حافظ نہیں' صرف وہی مولا' وہی آقا' ہے' وہی حاکم ہے۔اب تو قدم قدم پر یہ حضرات اپنے آپ کو مولانا کہلوانے والے ملتے ہیں۔ وہ کہتا ہے۔**هُوَ مَوۡلٰٮكُمۡ** وہ تو تمہارا مولا ہے' کسی اور کا بھی نہیں ہے۔اور پھر جب الفاظ عام اصطلاح میں آتے ہیں تو پھر وہ یوں ہوتے ہیں جیسے یہ ''میرے مولا ویکھیا' فیر کی ہویا[1] ۔اندازہ لگاؤ کہاں چلے جاتے ہیں۔**هُوَ مَوۡلٰٮكُمۡ فَنِعۡمَ الۡمَوۡلٰى** (22:78)۔جس کا آقا اور حاکم اس قسم کا ہو' کتنی خوشگواریاں اس کے حصے میں آتی ہیں! نعم کے یہ معنی ہوتے ہیں کہ جو اپنی اطاعت نہیں کراتا' قانون کی اطاعت کراتا ہے۔کہا: **وَنِعۡمَ النَّصِيۡرُ** (22:78)۔وہ بہت ہی اچھا کارساز اور بہت ہی اچھا مددگار ہے اور پھر تمہاری ہر مشکل میں تمہاری مدد بھی وہی کرتا ہے۔کسی اور کی طرف نہ دیکھو' نہ اس نظام میں کوئی کسی انسان کا محکوم ہوتا ہے' نہ محتاج ہوتا ہے۔ **نِعۡمَ الۡمَوۡلٰى وَنِعۡمَ النَّصِيۡرُ** وہی ہوتا ہے۔ عزیزانِ من! سورۃ الحج ختم ہوگئی سورۃ المومنون سے ہم آئندہ لیں گے۔

رَبَّنَا تَقَبَّلۡ مِنَّآ ؕ اِنَّكَ اَنۡتَ السَّمِيۡعُ الۡعَلِيۡمُ ؕ

❀❀ ...... ❀❀❀ ...... ❀❀

---

[1] دیکھا میرے مولا! کہ پھر کیا ہوا؟

کتابیات (حصہ اردو)

۱۔ پرویز: انسان نے کیا سوچا؟ ادارہ طلوع اسلام، کراچی، ۱۹۵۵ء

۲۔ پرویز: لغات القرآن جلد اول، ادارہ طلوع اسلام، لاہور، ۱۹۶۰ء

۳۔ پرویز: لغات القرآن جلد دوم، ادارہ طلوع اسلام، لاہور، ۱۹۶۰ء

۴۔ پرویز: لغات القرآن جلد سوم، ادارہ طلوع اسلام، لاہور، ۱۹۶۱ء

۵۔ پرویز: لغات القرآن جلد چہارم، ادارہ طلوع اسلام، لاہور، ۱۹۶۱ء

۶۔ پرویز: جوئے نور، طلوع اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ)، لاہور، ۱۹۹۴ء

۷۔ پرویز: شعلہ مستور، طلوع اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ)، لاہور، ۱۹۹۴ء

۸۔ پرویز: برق طور، ادارہ طلوع اسلام، لاہور، ۱۹۹۳ء

۹۔ پرویز: ابلیس و آدم، ادارہ طلوع اسلام، لاہور، ۱۹۸۳ء

۱۰۔ پرویز: مجلس اقبال (شرح مثنوی اسرار خودی و رموز بے خودی)، طلوع اسلام ٹرسٹ، لاہور، ۱۹۹۶

۱۱۔ پرویز: مجلس اقبال (حصہ دوم) (شرح مثنوی پس چہ باید کرد اے اقوام شرق)، طلوع اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ)، لاہور ۱۹۹۷ء

۱۲۔ پرویز: جہان فردا، ادارہ طلوع اسلام، لاہور ۱۹۶۹ء

۱۳۔ پرویز: کتاب التقدیر، ادارہ طلوع اسلام (رجسٹرڈ)، لاہور ۱۹۸۶ء

۱۴۔ پرویز: مطالب الفرقان جلد اول تا ششم، ادارہ طلوع اسلام، لاہور ۱۹۸۷، ۱۹۸۳، ۱۹۷۹، ۱۹۸۱، ۱۹۸۲، اور ۱۹۸۵ء

۱۵۔ پرویز: شاہکار رسالت، ادارہ طلوع اسلام (رجسٹرڈ)، لاہور، ۱۹۸۷ء

۱۶۔ پرویز: معراج انسانیت، ادارہ طلوع اسلام، کراچی، ۱۹۴۹

۱۷۔ پرویز: مفہوم القرآن، طلوع اسلام ٹرسٹ، لاہور

۱۸۔ پرویز: مذاہب عالم کی آسمانی کتابیں، طلوع اسلام ٹرسٹ (رجسٹرڈ)، لاہور ۱۹۹۶ء۔

۱۹۔ پرویز: سلیم کے نام جلد سوم، ادارہ طلوع اسلام، لاہور ۱۹۸۶ء

۲۰۔ پروفیسر ڈاکٹر منظور الحق (ادارت) مطالب الفرقان فی دروس القرآن: سورۃ بنی اسرائیل، ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ، لاہور ۲۰۰۴

۲۱۔ پروفیسر ڈاکٹر منظور الحق (مدیر)، مطالب القرآن فی دروس الفرقان: سورۃ الکہف اور مریم، ادارہ طلوع اسلام رجسٹرڈ، لاہور ۲۰۰۴

۲۲۔ محمد اشرف ظفر: مذہبی اور سیاسی فرقہ بندی (اضافہ شدہ ایڈیشن)، اشرف پبلی کیشنز: لاہور (سال اشاعت درج نہیں ہے)

۲۳۔ تمنا عمادی: امام زہری و امام طبری، تصویر کا دوسرا رخ، الرحمٰن پبلشنگ ٹرسٹ (رجسٹرڈ)، کراچی (سال اشاعت درج نہیں ہے)

۲۴۔ مرزا اسد اللہ خاں غالب: دیوان غالب، جہانگیر بک ڈپو، لاہور ۲۰۰۲ء

۲۵۔ شعبہ اردو: تحقیق، سندھ یونیورسٹی، جام شورو، ۱۹۹۵-۱۹۹۴

۲۶۔ مولوی وحید الدین سلیم مرحوم: وضع اصطلاحات، انجمن ترقی اردو، کراچی، ۱۹۶۵ء

۲۷۔ انوار ہاشمی: تہذیب کی کہانی، کراچی بک سنٹر، کراچی ۱۹۷۹ء

۲۸۔ عزیز احمد صدیقی (مؤلف): ہندو مذہب کی تاریخ اور ہندی مسلمان، پوسٹ بکس نمبر ۸۱، کراچی، ۲۰۰۰

۲۹۔ حفیظ گوہر: پاکستانی شخصیات کا انسائیکلوپیڈیا، گوہر پبلی کیشنز، لاہور (سال اشاعت درج نہیں ہے)

۳۰۔ حالی، مولانا الطاف حسین: مسدس حالی، تاج کمپنی لمیٹڈ، لاہور (سن اشاعت درج نہیں ہے)

۳۱۔ مولانا عنایت اللہ اثری وزیر آبادی: حصول تیسیر البیان (اعلیٰ) اصول تفسیر القرآن، گجرات، ۱۹۵۵ء

۳۲۔ شبیر احمد: تعلیم کی کہانی، کفایت اکیڈمی، کراچی، ۱۹۷۴ء

۳۳۔ مجلّہ طلوع اسلام، نومبر ۱۹۸۵ء، لاہور

۳۴۔ طلوع اسلام جنوری ۱۹۸۳ء، فروری ۱۹۸۳ء

۳۵۔ طلوع اسلام، جولائی ۱۹۶۸ء ادارہ طلوع اسلام لاہور

۳۶۔ طلوع اسلام جنوری ۱۹۶۸ء ادارہ طلوع اسلام لاہور

۳۷۔ ابوالاعلیٰ مودودی: مسلمان اور موجودہ سیاسی کشمکش حصہ سوم ۱۹۴۱ء ایڈیشن

۳۸۔ روئداد جماعت اسلامی حصہ پنجم

۳۹۔ روزنامہ امروز یکم ستمبر ۱۹۵۵ء

۴۰۔ تسنیم ۱۶، ۲۰ دسمبر ۱۹۵۵ء

۴۱۔ ترجمان القرآن کی پہلی پاکستانی اشاعت، بابت جون ۱۹۴۸ء اگست ۱۹۴۸ء

۴۲۔ فیروز اللغات اردو جدید (نیا ایڈیشن)، فیروز سنز لمیٹڈ، کراچی

۴۳۔ ازھرازھری، ڈاکٹر حافظ شاہد اقبال: قرآن اور حدیث، مرکز تحقیقات اسلامی، کراچی، ۲۰۰۴

۴۴۔ اکبرالہ آبادی: دیوان اکبر، مشتاق بک کارنر، لاہور (سال اشاعت درج نہیں ہے)

۴۵۔ اقبال: ارمغان حجاز اردو، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۱۹۹۶ء

۴۶۔ اقبال: ضرب کلیم، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۱۹۹۶ء

۴۷۔ اقبال: بال جبریل، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۱۹۹۶ء

۴۸۔ اقبال: بانگ درا، نیشنل بک فاؤنڈیشن، اسلام آباد، ۱۹۹۶ء

۴۹۔ علامہ اقبال اوپن یونیورسٹی، ''مطالعہ پاکستان'' (لازمی) یونٹ ۹-۱، جدید بک ڈپو لاہور (تاریخ اشاعت درج نہیں ہے)

۵۰۔ سید تصدق حسین: لغات کشوری (سال اشاعت درج نہیں ویسے مؤلف نے ۱۸۷۲ء میں اِس پر کام شروع کیا)

۵۱۔ اخبار سیرت لاہور، بابت ۳۰ مئی ۱۹۶۸ء

۵۲۔ خلیق الزمان چوہدری: شاہرہ پاکستان (اشاعت اول)، انجمن اسلامیہ پاکستان، کراچی ۱۹۶۷ء

English Section

1. Chaudhry, Muhammad Ali: The Emergence of Pakistan, Research Society of Pakistan, Lahore.
2. Covey, Stephen R. : The Sever Habits of Highly Effective People, Simon & Schuster, London, 1994.
3. Fromm, Erich: The Sane Society, Holt, Rinehart and Winston, Canada, 1983.
4. Fullright, J. William: The Arrogance of Power, Vintage Book, NY, 1966.
5. Haroon-ur-Rasheed: Pakistan: The Successful Culmination, Publishers Euporian, Lahore, 1996.
6. Iqbal, Alama Muhammad: Reconstruction of Religious Thought in Islam, Iqbal Academy Pakistan Lahore, 1989.
7. Lane, Edward W. : An Arabic-English Lexicon, Librairie Du Liban, Beirut, 1968.
8. Morris, Desmond : The Naked Ape, Mclgraw Book Company, NY, 1969.
9. Munir Muhammad : The Universe Beyond, Pangraphies (Private) Ltd. Islamabad, 1994.
10. Reader's Digest: Universal Dictionary, 1990
11. Rauf, Abdur Dr.: Illustrated History of Islam, Ferozsons (Pvt.) Ltd, Lahore, 1994
12. Skinner, B.F.: Beyond Freedom & Dignity, Vintage Books, NY, 1972.
13. The Illustrated Encyclopaedia of Knowledge, Volume 8, The Educational Book Guild, Inc., USA, 1955.

مجھے اپنے فہمِ قرآن کے متعلق کبھی یہ دعویٰ نہیں ہوسکتا کہ وہ سہو وخطا سے منزہ ہے۔ یہ قرآن فہمی کی ایک انسانی کوشش ہے اور ہر انسانی کوشش کی طرح اس میں غلطیوں کا امکان ہے۔ لہٰذا! میری تحریر میں جو کچھ آپ کو صحیح نظر آئے، وہ نورِ قرآنی کا تصدق ہے اور جہاں کہیں سہو وخطا دکھائی دے، وہ میرے ذہن کی نارسائی۔

(پرویز۔ معراجِ انسانیت)